بسم اللہ

الناظر

نمبر ۱ جلد ۱۶ یکم جنوری ۱۹۱۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۹۱ جلد ۱۶ — یکم جنوری سنہ ۱۹۱۷ء

ڈاکٹر بوس اور اُن کے حیرتناک کارنامے

آج یورپ، امریکہ اور جاپان کا غالباً کوئی حصہ ایسا نہ ہوگا جہاں گھر گھر ڈاکٹر بوس اور ان کے حیرت ناک اکتشافات کا چرچا نہ ہوتا ہو۔ تمام مہذب ممالک میں وہ مدعو ہوئے اور جہاں گئے فضلائے عصر نے ان کو آنکھوں پر جگہ دی۔ مگر کوئی پوچھے کہ ہندوستان کے کن کن شہروں میں ان کی دعوت ہوئی؟ علمی لکچر تو الگ رہے، کتنے لوگ ان سے اور ان کے کارناموں سے واقف ہیں؟ باستثنائے بنگلہ کن کن دیسی زبانوں میں ان کے حالات شایع ہوئے؟ ممکن ہے کہ ہندی و گجراتی کے میگزینوں میں کچھ حالات لکھے گئے ہوں۔ مگر "ہندوستان کی مشترک علمی زبان" کے متعلق تو جہاں تک علم ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر ایک مضمون شایع نہیں ہوا۔ اس ایک بحث پر کیا موقوف ہے ہمارے "علمی" رسالوں میں جتنے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں اُن میں سے کتنے واقعی مفید ہوتے ہیں اور کتنے بھرتی اور عامیانہ مذاق کے؟ علت پوچھی جائے تو ہم اُردو پریس پر الزام رکھیں گے اور اُردو پریس پبلک کے سر۔ اس امر کی تنقیح کہ یہ الزام کس پر کہاں تک بجا ہے، ایک ناگوار بحث ہے اور سردست ہمارے مقصد سے باہر بھی۔ بہر کیف

وجہ جو کچھ ہو واقعہ قابلِ افسوس ہے۔

میں مندرجہ ذیل مضمون میں ڈاکٹر بوس اور اُن کے کاموں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتا ہوں جو موضوع کی اہمیت و عظمت کے لحاظ سے بالکل ناکافی بلکہ ناتمام ہے۔ شاید اس کو دیکھ کر اُن اصحاب کو قلم اُٹھانے کا خیال پیدا ہو جو اس خدمت کے لیے مجھ سے زیادہ اہل ہیں۔ مبادیاتِ سائنس سے اُردو داں پبلک کی ناآشنائی، مصطلحات کی قلت اور زیادہ تر اپنی کم مائگی کی بدولت میں ڈاکٹر صاحب کے انکشافات کو زیادہ منکشف نہ کر سکا اور ایک اجمالی تذکرے پر قناعت کی۔ ضرورت اور کافی گنجایش ہے کہ ڈاکٹر بوس کے کارناموں پر ابھی اُردو میں بیسیوں مضامین اور مستقل رسالے لکھے جائیں۔

محمد مسلم عظیم آبادی

اکتسابِ علمی | جگدیش چندر بوس سنہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوے۔ اولاً سینٹ زیویر کالج کلکتہ پھر پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں تعلیم پائی جہاں سے بی اے پاس کیا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد وہ کیمبرج چلے گئے جہاں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر لندن یونیورسٹی سے بی ایس سی کا امتحان بھی پاس کیا اور کچھ عرصہ کے بعد اسی یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف سائنس (ڈی ایس سی) کا اعزاز عطا کیا۔ انگلستان میں پانچ سال بسر کرنے کے بعد وہ سنہ ۱۸۹۴ء میں ہندوستان واپس آئے اور صیغۂ تعلیم میں بحال ہو گئے۔ اُس زمانہ میں ہندوستان میں سائنس کی تعلیم کا معیار بہت پست تھا اور لیبوریٹری (دارالتجربہ) میں کافی سامان مہیا نہ تھے۔ ڈاکٹر بوس نے مختصر سے پیمانے پر ایک دارالتجربہ قائم کیا اور خود چند آلات بنائے جن سے حیرتناک نتائج برآمد ہوے۔

(۱) روشنی کی نوعیت برقی | سنہ ۱۹۰۰ء تک وہ برقی روشنی کی شعاعوں کی حرکتِ عکسی کے متعلق تحقیقات میں مصروف رہے۔ اس عرصے میں اُنھوں نے تقریباً ۱۲ مضامین اس موضوع پر لکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور برطانیہ، فرانس، جرمنی اور امریکہ کی دوسری سائنٹفک تعلیم گاہوں کو بھیجے۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں رائل انسٹیٹیوٹ لندن نے فرائڈے ایوننگ ڈسکورس میں لکچر دینے کے لیے دعوت کی۔ اس انجمن میں تقریر کی عزت دُنیا کے سب سے بڑے ماہرِ سائنس اور اُستادِ عصر کے لیے مخصوص ہے۔ اُنھوں نے برقی

امواج پر لکچر دیے جو بالاتفاق دُنیا کی سائنٹفک معلومات پر ایک مہتم بالشان اضافہ تسلیم کیا گیا۔ جرمن یونیورسٹی اور فرانس کی مشہور اکیڈمی نے بھی دعوت کی۔ آخرالذکر مجلس میں اُنھوں نے اپنا خود ساختہ آلہ پیش کیا جس سے برقی امواج کے انعکاس اور قدرتی میلانِ اندفاع کی عملی آزمایش کی جا سکتی تھی۔

(۲) نباتات کی زندگی اور قوتِ حاسّہ | مگر جس چیز نے ڈاکٹر بوس کو چار دانگ عالم میں مشہور کر دیا وہ ایک اور تحقیق تھی۔ اُنھوں نے یہ ثابت کر کے دُنیا کو متحیر کر رکھا ہے کہ برقی عمل سے نباتات کی زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ بے جان چیزیں مثلاً رانگ اور پلیٹنیم (ایک دھات) بھی حیوانات میں داخل ہیں۔ اس پر یہ اعتراض پیدا ہُوا کہ ممکن ہے کہ یہ حیات عارضی ہو اور نتیجہ ہو اُسی برقی تحریک کا جس کی مدد سے حیات ثابت کی جاتی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے رانگ کے ٹکڑے یا پودے کو آگ میں جُھلس کر یا زہر دے کر وہی عمل کرنا چاہا تو کوئی حرکت صادر نہ ہوئی۔ اس تجربہ نے ان کا دعوےٰ گویا بالبداہت ثابت کر دیا۔ نباتات کے احساس و ادراک کی تحقیق نہایت تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ حواس کچھ نباتات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ رانگ اور پلیٹنیم بھی تھکتے، تازہ دَم ہوتے، مضمحل و سُست ہوتے، بیہوشی کی دوا سے غش کرتے اور زہر سے مر جاتے ہیں۔

آلات | اُنھوں نے اپنے دعوے کی عینی شہادت و تصدیق کی غرض سے غایت نازک آلات بھی بنائے ہیں جن کے ذریعہ سے پودوں کی نبض کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت یا سینہ کی دھڑک صاف اور متیقن طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی رفتارِ نبض ایک سکنڈ کے ہزار دس حصہ تک شمار کی جا سکتی ہے۔ اس طلسمی آلہ سے پودوں کی حالتِ نزع، ان کی نیند، تھکن، یہاں تک کہ اگر شراب پلا دی جائے تو ستی بھی صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً چھوئی موئی کے درخت پر یہ آلہ دن رات میں ہر ہر گھنٹہ لگا کر دیکھا گیا تو یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یہ پودا صبح کو بہت آہستہ آہستہ بیدار ہوتا ہے، دوپہر کو پورا بیدار اور ہوشیار رہتا ہے۔ نصف شب تک جاگتا رہتا ہے اور نصف شب کے بعد سوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تازہ سیاحتِ امریکہ کے دَوران میں ایک نظم شایع کی تھی:—

سودائی مزاج پودے کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ تمھیں اس کی نازک مزاجی اور زنانہ فطرت کا ضرور لحاظ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر قسم کی آواز پر یہ غش ہو جاتا ہے۔

نازنین سبزے کے پاس آہستہ بولو۔ تم آنکھ سے دیکھ سکتے ہو کہ یہ شوروغل کی آواز پر ڈر سے کانپ جاتا ہے اور جب سنسان ہوتا ہے تو خوب سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔

ربڑ کے پودے سے ہشیار رہو۔ جب کسی دوست سے راز کی گفتگو کرو تو اسکے سامنے سے ہٹ جاؤ بعض وقت تم دیکھوگے کہ کوئی واقفِ راز نہیں اور بات پھوٹ پڑی۔

پودوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ ایک بڑا ماہر نباتات کہتا ہے کہ یہ بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں۔ اگر ان کے قریب کسی لڑکی کا بوسہ لے لیا جائے تو انھیں بڑا صدمہ ہوتا ہے اور غیرت کے مارے مرجاتے ہیں۔

قدردانی۔ سیاحتِ عالم

انگلستان | اس انکشاف کی اشاعت کے بعد گورنمنٹ برطانیہ نے سائنٹفک انجمنوں کے اصرار پر ڈاکٹر بوس کی یورپ میں دعوت کی کہ وہ اپنی تحقیقات کے نتائج ان انجمنوں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ آخری بار ۱۴ر اپریل ۱۹۱۴ء کو وہ انگلستان روانہ ہوئے۔ آکسفورڈ، کیمبرج اور لندن کی یونیورسٹیوں میں اپنے نظریات کو عملی تجربوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ ثابت کیا۔ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی وسیع تحقیقات کو ایک باقاعدہ نصاب کی صورت میں پیش کریں۔ فرائیڈی ایوننگ ڈسکورس میں تقریر کرنے کے لیے ان کی دوبارہ دعوت کی گئی۔

یورپ | انگلستان سے وہ کونٹیننٹ (آسٹریا جرمنی فرانس وغیرہ) پہنچے۔ وائنا کی یونیورسٹی میں لکچر دینے کے بعد وہاں کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ (امیدواران ایم اے، ایم اس سی، پی ایچ ڈی، ڈی اس سی وغیرہ) نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی شاگردی میں قبول کرکے انھیں کلکتہ میں اپنی لیبوریٹری سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ پیرس میں بھی ایسی ہی گرمجوشی ظاہر کی گئی۔ وہ بون، اسٹراسبرگ، میونخ، لیپزگ اور برلن کی یونیورسٹیوں میں بھی مدعو ہوئے۔ مگر یکم اگست ۱۹۱۴ء

کوبون میں پہلا لکچر قرار پایا تھا کہ جنگ چھڑ گئی اور وہ گرفتاری سے بال بال بچ نکلے۔

امریکہ | کونٹیننٹ سے وہ امریکہ روانہ ہوگئے۔ واشنگٹن کی طرح کولمبیا کی یونیورسٹی نے بھی ان سے باقاعدہ درخواست کی کہ وہ یونیورسٹی مذکور کے طلبہ کو تعلیم دینے پر راضی ہوں تو آیندہ بجائے جرمنی کے یہ طلبہ کلکتہ ہی بھیجے جایا کریں۔ تمام امریکۂ شمالی و جنوبی کی شاید کوئی یونیورسٹی نہ تھی جس نے ڈاکٹر کو دعوت نہ کیا ہو۔ وہاں کے لکچروں کے سلسلۂ لامتناہی نے ان کی صحت پر مُضر اثر پیدا کیا۔

جاپان | چنانچہ جب وہ امریکہ سے جاپان پہنچے تو ٹوکیو کے اطبا نے انھیں کامل آرام کرنے کی مؤکد ہدایت کی۔ آخر ساری قرارداد یں توڑ دینا پڑیں۔ تاہم ٹوکیو یونیورسٹی کی درخواست ان سے رد نہ کی جا سکی۔ اہلِ جاپان کے ذوق و شوق کا اندازہ اس معمولی سے واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اسسٹنٹ ایک لکچر کی تیاری کے لیے چند اور ہندوستانیوں کے ہمراہ ایک پھولوں کی دوکان سے کچھ پودے خریدنے گئے۔ دوکاندار کو جب معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر بوس کے آدمی ہیں، تو صرف یہی نہیں کہ اُن سے قیمت نہ لی بلکہ ان سب کو سر سے پاؤں تک پھولوں سے لاد دیا۔

ہندوستان میں | فی الحال گورنمنٹ نے خاص ان کی ذاتی لیبورٹری کے اخراجات کے لیے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا ہے جہاں وہ آج تک رازِ قدرت کی تلاش میں طلسمی آلات کی ایجاد میں منہمک ہیں۔

ڈاکٹر بوس کی پند آموز زندگی

حُبِّ وطن | ہمارے لیڈروں میں سے ایک نہایت سربرآوردہ بزرگ ایک معزز عہدے پر سرفراز ہو کر انگلستان جانے لگے اُس وقت جو اسپیچ آپ نے فرمائی تھی اُس سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ ایک انگریز سویلین اپنی مدتِ ملازمت تمام کر کے وطن واپس جا رہا ہے۔ ڈاکٹر بوس کی سی عزت صاحب ممدوح کو کیا آج تک کسی ہندوستانی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی ناموری ہندستان یا برٹش عملداری تک محدود نہیں بلکہ تمام عالم میں جہاں تہذیب کی کچھ بھی بو ہے ان کی شہرت کا آوازہ گونج رہا ہے۔ مگر ڈاکٹر بوس جو نہ لیڈری کے مدعی ہیں، نہ سیاسیات سے کوئی علاقہ رکھتے ہیں اپنے دورانِ سیاحت میں کبھی ہندوستان کو نہیں بھولے۔ ان کی سیاحت نہ تھی برات شادی تھی۔ وہ وہ دُلھن بیاہ لانے

گئے تھے جس سے زیادہ دلربا معشوق پردۂ زمین پر موجود نہیں، یعنی ناموری۔ مگر یہ خوش قسمت نوشاہ اس خوشی میں اپنی بوڑھی ماں (مادرِ ہند) کو کبھی نہ بھولا۔ یہ ہیں چلن ایک سپوت بیٹے کے۔

امریکہ کے قیام کے زمانہ میں بیکانیر کے ایک دولتمند تاجر کے صاحبزادے نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تبرکاً ان کے دست خاص کی تحریر کی درخواست کی۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ مَیں اصولاً اپنی دستخطی تحریر لوگوں کو دیا نہیں کرتا، اور اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ہے۔ بھلا اب مجھے کیا قیمت دیں گے؟ نوجوان طالب علم نے جواب دیا کہ "مَیں وطن کی خدمت کے لیے اپنی جان سے حاضر ہوں"۔ ڈاکٹر نے خوش ہو کر فرمایا "جزاک اللہ! تم میری تحریر کے مستحق ہو"۔ دَورانِ سفر میں وہ جس ہندوستانی طالب علم سے ملتے تھے یہ نصیحت ضرور کرتے تھے کہ تم اپنے کو ہندوستان کی کسی نہ کسی خدمت کے لیے مخصوص کر لو۔

مسز بوس | نامناسب نہ ہوگا اگر ڈاکٹر بوس کے ساتھ ان کی اہلیہ (جو ان کی ہمسفر تھیں) کے حُبِ وطن کا تذکرہ بھی ضمناً کر دیا جائے۔ مسز بوس اپنے نامور شوہر کے ساتھ تمام مہذب دنیا میں پھریں اور سوسائٹیوں میں صرف ملی جُلیں نہیں بلکہ اُن کو غائر نظر سے دیکھا ہے۔ وہ ہر معاشرتی مسئلہ پر اپنی ایک رائے رکھتی ہیں مگر انھوں نے ہماری اور بہنوں کے خلاف انگریزی لباس کبھی استعمال نہ کیا۔ وہی قومی وضع، زردوزی کے کام کی ریشمی ساڑی اور ریشمی کُرتا زیبِ تن رہا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قومیت پسندی نتیجہ ہے تعصب یا تنگ خیالی کا؟ اس تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون نے اپنے اثنائے سفر میں زیادہ تر اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ ہندوستان کے لیے تعلیم نسواں کا بہترین عنوان کیا ہو سکتا ہے اس نظر سے انھوں نے یورپی اور امریکی دونوں طریق تعلیم کو نکتہ بیں نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے وسکونسن یونیورسٹی کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ امریکن خاتون کو اس غرض سے مقرر کر لیا ہے کہ ہندوستان کی زنانہ تعلیم گاہ میں ان سے استفادہ کیا جائے۔

وہ کہا کرتی ہیں کہ "تمام مغربی طریق زندگی ایک شور و شغب اور بے لگامی کی زندگی ہے۔ تمام قوم ایک لچھمی جی (خدائے زر) کی پرستش اور حکومت، خطاب اور وحشیانہ طاقت (آلاتِ تباہی) کی تحصیل

میں پُروائی ہو رہی ہے اور بیہودہ معاشرتی کشاکش میں مبتلا ہے۔ کون کہتا ہے کہ مغرب میں ذات پات کا جھگڑا نہیں؟ اگر مشرق میں ذات کا جھگڑا صرف نسل تک محدود ہے تو مغرب میں ذات کے امتیاز کی بنا روپے اور چمڑے کے رنگ پر ہے۔"

نہایت قیمتی نصیحت

ڈاکٹر بوس جہاں گئے انھوں نے ہندوستانی طلبہ کو یہی نصیحت کی: "تم اپنی تعلیم کا ایک خاص مقصد پیش نظر رکھو۔ تمھاری زندگی کا ایک خاص خواب ہونا چاہیے اور جب تک یہ خواب صادق نہ آئے کوشش کیے جاؤ۔ اگر تم میں قوتِ ارادی ہے تو کوئی کام محال نہیں۔ دنیا میں بلا محنت و جفاکشی کے کوئی بڑا کام نہیں ہوا۔ تمھیں بہت کچھ مصیبتیں سہنا پڑیں گی مگر نتیجہ بے ملے نہیں رہ سکتا۔ اور ذہانت؟ ذہانت نام ہے ایسے کام کا جو خوب سمجھ کر شروع کیا جائے اور محنتِ شاقہ کے ساتھ انجام کو پہنچایا جائے۔ پس تم میں سے جو چاہے ذہین بنے۔"

"تم خود مرد بنو اور دوسروں کو بنانے کی کوشش کرو۔ زندگی مختصر ہے۔ لحظہ لحظہ کو غنیمت سمجھو۔ تجارتی کامیابی انسان کی حقیقی قابلیت کا کوئی عمدہ ثبوت نہیں۔ وہ اس خیال پر بہت نفریں کرتے ہیں کہ دولت انسان کے اصلی جوہر کا مقتضیٰ قرار دیا جائے۔"

ڈاکٹر بوس کی زندگی ہمت، جفاکشی اور قوتِ ارادی کے اعجاز کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ انکی کامیابی میں کوئی حصہ کسی شخص یا حکومت کی حوصلہ افزائی کا نہ تھا۔ انھوں نے اپنی ساری کمائی اپنی ذاتی لیبوریٹری کے قیام اور اپنے آلات کی تیاری پر صرف کر دی۔ تمام دنیاوی راحتوں سے منھ پھیر لیا تو کامیابی نے منھ دکھایا۔ دنیا نے حسبِ عادت اُس وقت قدر کی جب انکی کامیابی دیکھ لی۔ اس پر وہ ہمارے ہاں کے شعرا کی طرح کبھی قدر دانی کا رونا نہیں روئے۔ چمکیلے تمغے یا خطاب یا نوبل پرائز کبھی ان کا مقصد نہیں رہا۔ ان چیزوں کی پروا وہ ایک پن کے برابر بھی نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ "علم کو علم کی خاطر پڑھو نہ کہ انعام کے لالچ سے۔ جب کچھ کرو تو یہ امید نہ رکھو کہ دنیا تمھارے اعزاز میں فوراً آتشبازیاں چھوڑنے لگے گی، بینڈ بجنے لگیں گے اور جھنڈیاں اُڑائی جائیں گی۔ بلا انعام کی طمع کے کام کرو گے تو کامیاب ہو گے اور یہی اصل کامیابی ہے۔"

محمد مُسلم عظیم آبادی (از کلکتہ)

ہدیہ

بخدمت اربابِ کانفرنس ۱۶ء

گزرانیدۂ حکیم محمد یوسف المتخلص بہ نیّر متوطن اورنگ آباد (بلند شہر)

بتاؤں کیا کہ مجھ پر بن گئی اے رازداں کیسی
امانت ہو گئی حق میں مرے بارِ گراں کیسی

کسی کو کیا خبر؟ جکڑا ہوا ہے بند بند اپنا
اسیرِ حرصِ دُنیا کے لیے آزادیاں کیسی

اگر سمجھے تو ہم سمجھے یہ گُر الحق مُرّ کا
"دروغِ مصلحت آمیز میں ہیں خوبیاں کیسی"

خوشامد کا ثمر اور اُس کی لذت و کیا کہوں ہمدم
رہینِ منتِ احساس ہے میری زباں کیسی!

کوئی الزام دے ملت فروشی کا تو دینے دو
وبائے عام میں تخصیص کیا؟ حد بندیاں کیسی؟

خمارِ نشۂ خوابِ گراں سے چونکنے والو
یہ ہے کابوس بیداری، یہاں بیداریاں کیسی

بہت مشکل ہے چڑھنا بھینٹ، قربان گاہِ قومی پہ
یہ قبل از مرگ واویلا، یہ آہ و زاریاں کیسی

اُمیدِ چارہ سازی اور پھر مجبورِ مطلق سے!
ہیں عقلِ نارسا کی دیکھنا، لاچاریاں کیسی

سمونا جھوٹ کا سچ میں اگر اب بھی نہ ہم سیکھے
تو ہوں دنیا میں جینے کی بھلا تیاریاں کیسی

خطاب اور نوکری یا اور ایسی ہی کوئی قوت
نہ ہو گر ہاتھ میں اپنے تو برخورداریاں کیسی!

ہے پبلک خوٗ دعیارانِ لیڈروں کی حضرت نیّر
لباسِ شیر میں کرتے ہیں روباہ بازیاں کیسی

محرّم نامہ

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کا اِس نام سے ایک جدید رسالہ چھپ کر شایع ہوا ہے۔ لوح پر رسالہ کا سرنامہ یہ لکھا گیا ہے "محرّم کی مجلسوں میں پڑھنے کی سب سے معتبر اور مستند کتاب"۔ میں اس سب سے معتبر اور مستند کتاب پر کچھ لکھنے کی جرأت کرتا ہوں، لیکن دانشمندی سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مولانا شبلی مرحوم پر اس میں دانشمند مورخ ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے میں اُس کے خون کا طالب ہوں، حاشا کہ یہ چند سطریں صرف اسلام کی محبت کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔

رسالہ کا موضوع اور اس کی اہمیت اُردو ادب پر خواجہ صاحب کے جو احسانات ہیں اُن کا مجکو اعتراف ہے اُن کا خاص اسلوب کوہِ زیتون کے مقدس واعظ سے کم مؤثر نہیں۔ خطابیات کے مخصوص طرز تحریر کے وہ مخترع ہیں، اور اُن کے اس دلگداز نہجِ بیان نے ایک عالم کو مسحور کر رکھا ہے۔ لیکن کیا ہر لائق انشا پرداز اور اُردو کے ہر مؤثر البیان ادیب کو یہ حق حاصل ہے کہ تاریخِ اسلام کے مشکل اور دقیق ابواب پر بے محابا قلم اُٹھا کر "محرّم کی مجلسوں میں پڑھنے کی سب سے معتبر اور مستند کتاب" لکھ دے، اور وہ بھی اس زود رقمی کے ساتھ کہ ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ کی ۱۲ تاریخ کو شروع کی جائے اور ذیحجہ ۱۳۳۴ھ کی ۱۷ تاریخ کو ختم کردی جائے۔ یعنی ۲۷ دن کی قلیل فرصت میں مؤلف نے اسلام کی تاریخ کی سب سے زیادہ سنگلاخ، سب سے زیادہ پُرخطر، سب سے زیادہ دشوار گذار راہ کو طے کرنے کی کوشش کی، جس سے محتاط اور تحقیق طلب قلم شاید برسوں کی زحمت کشی کے بعد عہدہ برآ ہو سکتا۔

محرّم نامہ کے عنوان سے عام ناظرین نے سمجھا ہوگا کہ شاید یہ اسلام کے غمناک و پُر درد ترین واقعۂ کربلا کی تصویر ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، خواجہ صاحب کے ہمہ گیر قلم نے ایک نگارخانہ یا مرقع طیار کیا ہے، جس میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذی النورین، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت زُبیر حواریِ رسول اللہ، حضرت طلحہ، اُم المومنین حضرت عائشہ، امیر معاویہ، حضرت عمرو بن العاص،

حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عمار بن یاسر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی جابجا خود اپنی نقاشی اور عکس گیری سے تصویریں سجائی ہیں:

پورا رسالہ ۱۹۶ صفحہ پر ختم ہوتا ہے، جس میں اصل موضوع یعنی "بیان کربلا" کے لیے صرف ساٹھ صفحے نذر کیے گئے ہیں، بقیہ رسالہ یعنی کتاب کے ۱۳۶ صفحے خلفاے اربعہ کے واقعاتِ خلافت حضرت عثمان کی شہادت، جنگ جمل، جنگِ صفین اور بعض صحابہ کے طعن و تعریض میں صرف ہوے ہیں۔ اب تک تو محرم کی مجلسوں میں صرف حسینؑ کے پُردرد حالات اور اُن کی بیکیانہ شہادت کا ماتم ہوتا تھا، جس کے لیے ہر سنّی کی آنکھیں بھی اُسی طرح وقفِ اشکباری ہیں جس طرح ہر شیعی کی زبان و دہن، نالۂ و شیون، اور ہاتھ سینہ کوبی کے لیے، اس موسم میں بیقرار رہتے ہیں۔ اسلام کے یہ چپ وراست کے دست بازو، مسرت اور خوشی کے لیے تو مدت سے ایک ساتھ نہیں اُٹھتے، لیکن صرف یہ دس دن تھے جن میں دونوں ہاتھ برابر ماتم گساری میں مصروف رہتے تھے، خواجہ صاحب چاہتے ہیں کہ اس حزن و ملال اور غم و الم کی داستان سرائی میں بھی یہ اتحادِ عمل باقی نہ رہے کہ اب آئندہ شہادتِ حسین مظلوم کا افسانہ، یزید کی تخت نشینی سے نہیں، بلکہ صدیق اکبر کے واقعۂ خلافت سے، بلکہ آں حضرت صلعم کی وفات اور واقعۂ قرطاس و وصیت سے شروع ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہیں کہ محرم نامہ کا موضوع بیان کربلا نہیں، بلکہ اہل سنت اور شیعہ کے اختلافات باہمی کا ذکر و بحث۔ فیا ومعۃ علی الاسلام ویا دمعۃ علی المسلمین۔

ماخذ خواجہ صاحب نے اس کتاب پر "سب سے معتبر اور مستند" ہونے کی مہر ثبت کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "اعتبار و استناد" کی یہ سر بفلک عمارت کس اساسِ محکم پر قائم کی گئی ہے، ازراہِ عنایت خواجہ صاحب نے خلافِ دستور، اپنے ماخذ بھی گنا دیے ہیں، برادرانِ شیعہ کی کتابوں میں سے "اخبار ماتم" جس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے کہ "شیعوں کے ایک مستند عالم کی لکھی ہوئی ہے اور جس کو ریاستِ رامپور نے چھپوایا ہے" اور اہل سنت کی کتب تاریخی میں سے طبری، ابن خلدون، اسماء الرجال، اور تاریخ الخلفا، اور دونوں فرقوں کی مشترک کتابوں میں سے "تمام تذکرہ جات شہادت"۔

"اخبار ماتم" کی حقیقت سے میں واقف نہیں، اس کے معیار صحت کا فیصلہ مجتہدین عظام فرما سکتے ہیں، تاہم اتنا ہر شخص سوال کر سکتا ہے کہ "اخبار ماتم" جو اس متاخر عہد کی تصنیف ہے، کن قدیم کتب تاریخ پر مبنی ہے؟ جہاں تک ہم کو معلوم ہے ابتدائی صدیوں کی تاریخ سُنی شیعوں کی علیحدہ علیحدہ مدون نہیں، کہ اول قرونِ خیر میں فرقہ بندی کا خط، دیوار اور فصیل کا حکم نہیں رکھتا تھا۔

خواجہ صاحب نے تمام "تذکرہ جات شہادت" کو بھی اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ جس سے مقصود عناصر الشہادتین، وذکر الشہادتین وغیرہ عامیانہ اور بے احتیاط کتابیں ہوں گی، تو شاید اگر انھیں سیرۃ نبوی لکھنے کا موقع پیش آئے تو وفات نامہ، قصۂ حلیمہ دائی، ہرنی کا قصہ، اُن کے لیے بہترین ماخذ ہوگا۔ اور حسنین علیہما السلام کی سوانح نگاری کے لیے، معجزۂ آلِ نبی سے درگزر تو قطعاً محال ہوگا۔

خواجہ صاحب عربی زبان سے کمتر واقف ہیں یا بالکل واقف نہیں، اس بنا پر یہ سوال طلب امر ہے کہ اصل تاریخ طبری، ابن خلدون اور تاریخ الخلفا سے وہ کیونکر استفادہ کر سکے، شاید ان کے تراجم مقصود ہوں، جن میں سے طبری کا فارسی ترجمہ تو بالکل غیر معتبر ہے، اگر خواجہ صاحب حقیقت میں ان کتابوں کو مطالعہ فرماتے تو تاریخ کی کم از کم فاش غلطیوں سے اُن کا معصوم قلم آلودہ نہ ہوتا!

یاد ش بخیر کتاب اسماء الرجال! اس نام کی کسی کتاب سے تاریخ اسلام گوش آشنا نہیں، اگر یہ نادرۂ روزگار کتاب کسی خوش قسمت کتب خانہ میں موجود ہو تو اس انکشافِ علمی سے ازراہِ عنایت دیگر علمائے اسلام کو بھی ضرور ممنون فرمائیے۔ ہاں علم اسماء الرجال کے ایک فن ہونے کا مجکو اعتراف ضرور ہے لیکن سلسلۂ کتب میں اس کا نام لینا، میں نہیں کہہ سکتا کہ علما کی اصطلاح میں اس کو کیا کہتے ہیں؟ ایک موقع پر کتاب کے حاشیہ میں اسماء الرجال مصنفۂ صاحب مشکوٰۃ کا حوالہ آیا ہے، اور تمام کتاب میں یہی خوش قسمت صفحہ ہے جس کو حوالۂ اصل کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ شاید اس سے وہ ایک مختصر رسالہ مراد ہوگا جو ولی الدین خطیب نے مشکوٰۃ کے راویوں کے حال میں لکھا ہے۔ لیکن معاف کیجیے اگر پوچھوں کہ محرم نامہ کے ماخذ کے طور پر اس فن کے مطولاتِ قدیمہ کو چھوڑ کر اس مختصر اور محدود الموضوع رسالہ کو آپ نے کیوں منتخب کیا؟ کیا محرم نامہ میں مشکوٰۃ کے راویوں کی تحقیق مطلوب تھی؟ ایک دو مقام کے

سوا بقیہ تمام کتاب حوالوں کے ذکر سے خالی ہے، شاید اس معتبر و مستند کتاب کے لیے اس کی ضرورت بھی اگر تاریخ الخلفا کو خواجہ صاحب کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوتا تو کیسر بلا استثنا تمام بنو امیہ کو منافق و کافر کہنے کی جسارت نہ ہوتی، کہ اسی خاندان سے شہید مدینہ عثمان غنیؓ کا انتساب ہے، نازش اسلام عمر ثانیؒ حضرت عمر بن عبد العزیز اسی خانوادہ کا آغوش پروردہ اور اسی تخت حکومت کا ایک فرمانرو تھا، عبد الملک سلیمان و ہشام کے احسانات سے بھی اسلام کچھ کم گراں بار نہیں، بیچارہ ابن خلدون اگر خواجہ صاحب کے حجرۂ خلوت میں بار پا سکتا تو حضرت عثمان کی شہادت کے اسباب معلوم کرنے میں اُنھیں دشواری نہ ہوتی، وہ بتاتا کہ یہ شہادت حضرت ابوذر اور مکہ معظمہ میں قصر صلوٰۃ نہ کرنے کا نتیجہ نہ تھی بلکہ عام قریش کے استیلا اور دیگر قبائل حرب کی بلند حوصلگی کا نتیجہ تھی۔

اگر مورخ طبری کو اُن شبہائے تار میں جن میں خواجہ صاحب کو محرم نامہ تحریر فرمانے کا دعوےٰ ہے، بے اذن اندر آنے کی اجازت ہوتی تو غریب اتنا تو کہہ سکتا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بلد دشمنان مرتضیٰؓ اور منتقمین خون عثمانؓ میں کم از کم میرے حوالہ سے داخل نہ فرمائیے،

طرز تحریر | خواجہ صاحب کا ایک خاص طرز تحریر ہے۔ وہ بیشک خیالی اور خطابی مضامین کے لیے موزوں ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں حضرت عثمان کی شہادت اور ہنگامۂ کربلا کے موقع پر نہایت پُر زور و پُر اثر ہے، لیکن تاریخ جیسا متین و سنجیدہ موضوع اس کے لیے موزوں نہیں، مولوی نذیر احمد مرحوم بھی اسی گناہ کے مجرم ہیں جس قلم نے مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو، وہ الفرائض، اجتہاد، ترجمۂ قرآن اور اُمہات الامۃ کے لیے متانت کلام، سنجیدگی عبارت اور ثقاہت بیان کہاں سے لائے گا؟ خواجہ صاحب بھی اب تک خطیبانہ طرز تحریر کے عادی رہے ہیں، اور یہی میدان اب تک اُن کے ہاتھ رہا ہے، پھر تعجب نہیں اگر تاریخ کی متانت و ثقاہت کو وہ نباہ نہ کر سکیں۔

ایک خطیب اپنے تخیل کے عالم میں ہر بڑی سی بڑی ہستی کو تو کہہ سکتا ہے، لیکن مورخ ایک ایک طرف جھانک کر اور اچھی طرح تول کر اور ہر ایک کی شخصیت کو پہچان کر اُسکی شان کے مطابق

گفتگو کرتا ہے، آں حضرت صلعم نے وفات کے وقت جب دوات و کاغذ طلب فرمایا اور لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا، آں حضرت صلعم نے فرمایا قُومُوا "اٹھ جاؤ" (بخاری ذکر وفات) خواجہ صاحب لفظ قُومُوا کی ترجمانی کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اُٹھ جاؤ، کھڑے ہو جاؤ، میرے پاس سے جاؤ، یہاں گڑبڑ نہ کرو،

علاوہ اضافہ ہائے ناجائز کے، "گڑبڑ" آپ خود بولیے، لیکن ایک پیغمبر کی زبان سے تو ادا نہ فرمائیے۔

حضرت عثمان کے انتخاب کے موقع پر امیدواران خلافت، عمرو بن العاص اور حضرت علی کی تقریریں نقل کی ہیں، ہر پڑھنے والے کو نظر آئے گا کہ صحابۂ کرام اور یاران پیغمبر کا مجمع القدس نہیں، بلکہ بازاری اوباشوں کا ایک جمگھٹا ہے۔ اور ہر شخص سر بازار ارے ترے کرکے باتیں کر رہا ہے۔

مالک اشتر (جو صحابی نہ تھے) حضرت علی سے کہتے ہیں کہ "ان لوگوں میں سے کوئی ابو موسیٰ کو ٹھیک نہ کر سکے گا، مجکو بھیجیے۔ میں سب کو درست کر دوں گا" علاوہ ازیں کہ یہ مالک کے الفاظ ہیں خواجہ صاحب! سمجھتے ہیں کہ کس کو ٹھیک کرتے ہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعری کو، جو دربار رسالت کے قاری ہیں اور جن کی مشایعت آپ نے بنفس نفیس فرمائی ہے، اور جن کو آں حضرت صلعم نے امیر نصب فرمایا تھا، اسی طرح صفین کے موقع پر امیر معاویہ اور عمرو کی گفتگو بھی سوقی بول چال سے زیادہ نہیں خواجہ صاحب جب مزے میں آتے ہیں اُن کی نوک قلم سے نادانستہ اس قسم کے فقرے ٹپک پڑتے ہیں۔

اغلاط تاریخی غلطیہا ے مضامیں مت پوچھ، اگر اغلاط تاریخی کی تفصیل کی جائے تو شاید ایک نیا محرم نامہ تیار ہو جائے، عموماً واقعات میں، لوگوں کے اقوال میں، غیر محتاط اضافے ہیں۔ حضرت طلحہ اور زبیر کی شرکت جنگ بھی ثابت نہیں، اغلاط کی تفصیل تو اس مختصر مضمون میں سما نہیں سکتی، اس لیے انواع غلطی پر اکتفا کرتا ہوں۔ تمام کتاب عموماً تین قسم کی غلطیوں یا بے احتیاطیوں سے مملو ہے۔

(۱) قدیم اور اصل تاریخ کی کتابوں میں اکثر ایک ہی واقعہ کے متعلق مختلف صحیح و غلط روایات پہلو بہ پہلو مروی ہوتے ہیں، اب صاحب فن اور ناقد کا کام ہے کہ روایت و درایت کے ذریعہ سے واقعہ کی صحیح صورت تک پہنچ جائے۔ خواجہ صاحب نے اس موقع پر عموماً بے احتیاطی کی ہے۔ لکھا ہے

کہ حضرت ابو بکر صدیق کو ایک یہودیہ نے ایک ایسا زہر کھلا دیا تھا جس کا اثر سال بھر کے بعد ہوتا ہے، چنانچہ جس دن زہر کھایا تھا، سال بھر بعد ٹھیک اسی دن آیا، انتقال ہوگیا؛ یہ روایت، طبری اور ابن سعد میں مذکور ہے۔ لیکن علاوہ غیر معقول ہونے کے صحیح روایت سے حضرت عائشہ سے ثابت ہے جو آپ کی تیمارداری میں بھی تھیں کہ ٹھنڈے دن میں نہانے سے مرض کی ابتدا ہوئی، مروان کے خط اور حضرت عثمان کی مہر کا واقعہ بھی مشکوک ہے؛ اس نوع کی بے احتیاطیاں پائی جاتی ہیں، حضرت عائشہ اور حضرت علی کے درمیان واقعۂ افک کی بنا پر ناگواری خاطر، بنو امیہ کی ایجاد ہے اور آپ نے بھی اس کو قبول کر لیا،

(۲) بعض واقعات بالکل غلط درج ہوگئے ہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعری کی نسبت لکھا ہے کہ اُنھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خونِ عثمانؓ کے انتقام کے لیے اہلِ کوفہ کو آمادہ کیا۔ یہ بیان سرتاپا غلط ہے۔ متفقاً ثابت ہے کہ وہ ناطرفدار جماعت میں تھے، اُن کی تلقین صرف یہ تھی کہ فتنہ کا زمانہ ہے اور اس میں خانہ نشینی، مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔ حضرت ابن عمر بھی ناطرفداروں میں تھے، جنگِ صفین میں ان کا نام لینا قصورِ نظر ہے۔ شاید خواجہ صاحب کو عبداللہ بن عمرو بن العاص کا دھوکا ہوا۔ وہ بھی گو لڑائی میں شریک نہ تھے تاہم اپنے باپ کے ساتھ امیر معاویہ کے کیمپ میں ضرور تھے، لیکن اُن کو "ابن عمر" نہیں کہتے، ابن عمر صرف عبداللہ بن عمر بن خطاب کا عرف ہے، بہرحال عبداللہ بن عمرو کی طرف سے امیر معاویہ کے جواب میں جو تقریر نقل کی ہے، وہ حضرت علی کا مقولہ ہے؛

محرم نامہ میں یہ واقعہ دیکھ کر کہ "حضرت امام حسن کے جنازے کو روکنے کے لیے حضرت عائشہ ایک مسلح جماعت کے ساتھ سوار ہو کر باہر نکلیں، اور اُن کے ساتھیوں نے اس قدر تیر برسائے کہ جنازے کے ٹکڑے ہوگئے"۔ دل کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ کیا خواجہ صاحب کا قلم ان سطروں کو لکھتے وقت کانپ نہیں اُٹھا؟ کاش وہ یہ سمجھ کر لکھتے کہ وہ کس شمعِ نبوت کی نسبت "افکِ مبین" کا اعادہ کر رہے ہیں!

(۳) کربلا کے جو واقعات لکھے ہیں. اگر مجھ سے پوچھو تو طبری وابن خلدون اور تاریخ الخلفا کی بجائے شاید مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں کے بند کے بند انھوں نے نثر کر ڈالے ہیں، خواجہ صاحب کیا تاریخ اور شاعری کے فرق کو سمجھتے ہیں؟ تاریخوں میں تو یہ ہے کہ مخالفین میں سے صرف ۸۸ آدمی مارے گئے تھے۔

حضرت ابوسفیان کے اسلام میں آپ کو تذبذب ہے، لیکن چند ہی صفحوں کے بعد آں حضرت صلعم کی وفات پر اُن کا دردناک مرثیہ آپ نے نقل کیا ہے، حالانکہ جس طرح پہلا واقعہ غلط ہے' دوسرا بھی مشکوک ہے، امیر معاویہ کے اسلام سے آپ خاموش ہیں صرف خدمت نبوی میں "آنا جانا" آپ کے نزدیک ثابت ہے، پھر اُن محدثینِ اہلِ سنت کو آپ کیا کہیں گے جو اُنکے ذریعہ روایت احادیث سے کرتے ہیں! پھر اس سے زیادہ، اُن صحابۂ کبار کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے، جنھوں نے عام الاجتماع میں اُن کی خلافت پر بیعت کی۔کیا ایک غیر ثابت الاسلام کو وہ جانشینِ پیغمبر تسلیم کر سکتے تھے،

خواجہ صاحب کے نزدیک امیر معاویہ کے "کاتبِ نبوی" ہونے کی روایت بھی ضعیف اور قولِ بعض ہے، ازراہِ عنایت وہ منکرین کی سند وحوالہ سے مطلع فرمائیں،

حضرت عمرو بن العاص کو وہ تمام فتنوں کا بانی سمجھتے ہیں، حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان کے مقابلے میں حضرت علی کا عدم انتخاب، وہ کہتے ہیں کہ عمرو بن العاص کے خادعانہ مشورہ کا نتیجہ تھا۔ حضرت عثمان کے انتخاب کا واقعہ بخاری میں مروی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کتابِ صحیح میں خواجہ صاحب کی تحقیق مجکو نظر نہیں آتی، وغیر ذلک من الخرافات،

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم، اور بنی فاطمۂ کرام سے کس مسلمان کو محبت نہیں، جو دل ان کی محبت سے خالی، وہ اسلام کی دولت سے تہی مایہ ہے۔ لیکن اس کا اثر یہ نہیں کہ ہم اُن کے دشمنوں پر افترا پردازی کریں، جب خود اُن پاک بزرگوں نے اپنے دشمنوں کے لعن و تعریض سے اپنے لب آلودہ نہ کیے، تو اُن کی پیروی کا دم بھر کر ہم کیوں اپنا دہن پُر خاک کریں۔

(۴) واقعات کا تقدّم وتأخّر خواجہ صاحب ایک معمولی بات سمجھتے ہیں، حالانکہ اُس سے سلسلۂ علل ومعلول کا انقلاب ہو جاتا ہے۔ جنگ جمل میں یہ غلطی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دیگر اغلاطِ بیاں سے قطع نظر کرکے میں رسالہ کا آخری صفحہ یہ کہ کر الٹ دیتا ہوں

راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

سید سلیمان (ندوی)

غزل

بڑھتی نہ احتیاط دلِ ناصبور کی ۔۔۔ یہ آگ ہے لگائی ہوئی برقِ طور کی
جنبش میں ہے حجاب، لبوں میں ہے اضطراب ۔۔۔ یہ سب علامتیں ہیں کسی کے ظہور کی
دیکھے بہ غور کوئی وسیع النظر اگر ۔۔۔ صحرا ہے اعتبار ہے خاک ان قبور کی
جس نے سنا کبھی مرے مرنے کا واقعہ ۔۔۔ ہمدرد بنکے اُن سے شکایت ضرور کی
بیمارِ غم پہ آپ نے احسان تو کیا ۔۔۔ اتنا مگر کہوں گا کہ غفلت ضرور کی
کانٹے زبانِ حضرتِ واعظ میں پڑ گئے ۔۔۔ تعریف کرتے کہتے شرابِ طہور کی
شکوہ ہے مجھ کو فطرتِ ہستی فریب سے ۔۔۔ اُس کو تو اطلاع تھی ان سب امور کی
ہوتا نہیں ہے کوئی زمانے میں کیا جواں ۔۔۔ اللہ کوئی حد ہے تمھارے غرور کی
مدت سے جذب ہو رہی تھی آنکھ و شوق ۔۔۔ آخر کو شکل بن ہی گئی برقِ طور کی
وہ مشت خاک کیوں نہ جہنم میں جھونک دی ۔۔۔ جس سے بنا ہوئی تھی دلِ ناصبور کی
دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال ۔۔۔ ہاں ہاں محبت آپ کی اور ضرور کی

اک بات تھی کہ چبھ گئی دل میں مرے عزیز
بھولوں گا میں ہنسی نہ شکستہ قبور کی

مرزا محمد ہادی عزیز (لکھنوی)

قبطیانِ مصر اور اسلامی حکومتیں

(بہ سلسلۂ اشاعت الناظر ماہِ جولائی ۱۹۱۳ء)

اہلِ قبط، دولتِ بنی طولون، دولتِ بنی فاطمہ اور دولتِ بنی ایوب میں ابتدائے ۲۵۴ لغایۃ ۶۴۸ ہجری

مصر سے خاندانِ عباسیہ کا تسلط اُٹھ کر بنی طولون کا سکہ رواں ہُوا۔

اِس خاندان کا پہلا تاجدار احمد بن طولون تھا، جس نے حکومت سے سیاستِ جبریّہ کے عنصر کو خارج کر کے آشتی و لینت سے شیرازۂ نظم و نسق مرتب کرنا شروع کیا۔ لگان و ٹکس کی از سرِ نو تشخیص کی اور مناسب تشخیص کی۔ تحصیل کی سختیوں کا انسداد کیا۔ سنواتی بقایا کے متعلق مہلتیں دیں۔ جو رقوم قابلِ معافی تھیں ان کی معافی میں دریغ نہ کیا۔

ابن المدبّر کے نام سے بوجہ اُس کی سخت گیریوں اور تشددات کے خواہ مخواہ رعایا کا نپتی تھی، لہٰذا اُن کی اطمینان بخشی کے لیے اُس کو یک لخت ولایت مصر سے معزول کر دیا۔ اور ابن المدبر کے بعد کوئی غیر جنس والی نہ مقرر کیا گیا۔ خود قبطیان اہلِ دیار و امصار میں سے والی و دیگر عمال مقرر کیے گئے۔

یہ ایک ایسا عملدرآمد تھا جس نے قبطیوں کی حالت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ دوسری قسم کی آسانیاں اُن کو کسی نہ کسی دورِ حکومت میں حاصل رہیں مگر تحصیل و تشخیص ٹکس کی حکومت آج تک اُن کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس کے پاتے ہی دولتِ بنی طولون کے ساتھ اُن کی رعیتانہ عقیدت و جوشِ انقیاد کی انتہا نہ رہی۔ بطریق اور اسقف سبھی اُن کے اثر سے سرِ اخلاص و اطاعت خم کیے ہوئے دربارِ خلافت تک کشاں کشاں پہونچ گئے۔ اساطینِ مذہب کا رُسوخ قبطیوں کی خوش بختی کی توثیق اور حکومت کے ساتھ تعلقات کے استحکام کی ایک معتبر ضمانت تھی۔ اُن لوگوں کی اُن کے مذہبی درجے کے مطابق توقیر کی گئی۔ دربار میں بجائے

حاشیہ نشینی کے پہلو نشینی کا فخر اُنھیں حاصل ہوا۔

احمد ابن طولون کے بعد اُس کے وارثِ تخت و تاج خمارویہ ابن احمد کے عہد میں بھی یہی امن چین رہا۔ اسقف طغا الاب باخوم نے اپنے حُسنِ عمل سے دربار کی اُس عزت میں فرق نہ آنے دیا۔ اور خمارویہ کی سرکار کا خاص معتمد خاص بنا رہا۔ جس کی وجہ سے اور مزید رعایتیں بھی قبطیوں کو حاصل ہوئیں۔ علاوہ ٹیکس کے پل اور بازارات کے اجارے (ٹھیکہ جات) اور زائد علی الزائد رقوم سائر و حقوق سلطنت کے علاوہ مالگذاری کی تحصیل کی خدمات بھی اُن کو تفویض ہوئیں۔

بہرنوع یہ دَور قبطیوں کے لیے بہا غنیمت گذرا۔ خمارویہ ابن احمد بن طولون کے مرنے کے بعد ہی شیرازۂ نظم و نسق پراگندہ ہوگیا۔ اور طوائف الملوکی و غدر کے سامان ہر طرف نظر آنے لگے۔ جس کا خاتمہ اُس وقت ہوا جبکہ دولتِ فاطمیہ کا عمل و دخل پورے طور پر ہوگیا اور اُس کی شاہی کو سب نے مان لیا۔ دَورِ گذشتہ کا آغاز ۲۵۷ھ اور امتداد ۳۶۲ھ ہجری تک سمجھنا چاہیے۔

دولتِ فاطمیہ ۳۶۳ھ ہجری سے فاطمی دَور کا آغاز ہوا۔ چونکہ خلفاے فاطمیہ کے مصالح خاص مقتضی تھے کہ اہل قبط کو اطلاق و آزادی بخشی جائے۔ تاکہ اُن کی گذشتہ سلبِ آزادی کا معاوضہ بن سکے۔ اور وہ مستقل قوم بن کر فرائض سلطنت اطاعت و خلوص سے بجا لاسکیں۔ لہذا فی الواقع قبطیوں کی تاریخ میں زندگی و بیداری کے آثار اسی زمانہ سے شروع ہوے۔ ورنہ اب تک وہ مردہ قوم اور ایک بے روح کا قالب تھی۔ جس پر زمانہ کی طرف سے جو آفت آئی اُس نے بلا مزاحمت اُس کو آنے دیا۔ جو مصیبت پڑی اُس کو چار و ناچار جھیلا۔

اِس دَور میں اُن کی نہفتہ ملکاتِ فکر و عمل میں جنبش و حرکت پیدا ہوئی۔ اطمینانِ خاطر اور کارخانۂ عالم میں کارآزمائی کا جو موقعہ ملا۔ تو ہر شعبۂ عمل میں ان میں سے کاملین پیدا ہونے لگے مصنف، شاعر، سیاست داں، اہل تدبیر، صاحب جاہ وغیرہ وغیرہ!

چونکہ اقتصادی و معاشرتی پستی نے اُن کی آبادی و شمارِ نفوس کو بے حد نقصان پہونچایا تھا، پس آزادی و اطمینان پاتے ہی اُس میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ آغازِ دولت فاطمیہ میں اُن کا شمار

صرف وہ ملین تھا۔ مگر اب وہ ملک کا سوادِ اعظم تھی۔ جن شعبوں میں اس وقت انھوں نے مبتدیانہ قدم رکھا تھا۔ اب ان میں ان کی اُستادی مسلّم ہوگئی اور ملک ان کی شاگردی کو فخر جاننے لگا۔ دفاتر، ملکی نظم ونسق، صنعت وحرفت، تجارت وزراعت کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آگئیں۔ قبطیوں میں سے سیاست وتدبیر کے باب میں جن لوگوں نے خاص اعتماد و درجہ حاصل کیا۔ اور رعایا و بادشاہ دونوں نے ان کی خاص عزت کی۔ ان میں دو قابل ذکر شخص قزمان ابن مینا۔ عیسیٰ ابن نسطوروس ہیں۔ یہ دونوں کوئی بڑے منصبدار یا مالدار نہ تھے۔ مگر انتظامِ سلطنت کی کل کو جدھر چاہتے تھے اپنے فیصلہ نویس قلم کی گردش سے پھیر دیتے تھے۔

قبطیوں کے اس نفوذ واقتدار پر ان کے معاصرین کو رشک تھا۔ چنانچہ یعقوب ابن کلس دستورِ اعظم خلیفہ عزیز باللہ نے جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا بطریق کی بابت خود بلا واسطہ خلیفۂ وقت سے کسی باغیانہ ومتمردانہ کارروائی کا انتساب کیا۔ خلیفہ نے بطریق کو سردربار طلب کرکے خود بہ نفسِ نفیس تحقیقات فرمائی۔ تحقیقات میں یعقوب ابن کلس کی لغویت ثابت ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبطیوں کا اعتماد ووثوق اور ترقی کرگیا۔ وہ ہوشیار ہوگئے اور شکوہ سنجوں کے ہاتھ میں شکایت کی گھاتیں نہ رہیں

اس کے بعد حاکم بامراللہ کے عہد میں جس نے زیادہ داد شہرت پائی وہ فہد ابن ابراہیم تھا۔ خواہ دلی عزت کی وجہ سے یا پیار سے خلیفہ اسے ابوالعلاء کہتے تھے۔ جس کی وجہ سے اسکا نام ہی ابوالعلاء پڑگیا تھا۔ اور پھر اس خلیفہ نے ایسی علو مرتبت بھی بخشی کہ وزیرِ اعظم ہی کے درجے پر فائز کیا۔

حکومت اسلامیہ کا یہ شخص پہلا قبطی وزیرِ اعظم تھا۔

مگر سوء اختتام دیکھیے کہ اسی حاکم بامراللہ نے اپنے خللِ دماغی کے عالم میں قبطیوں اور نصاریٰ وغیرہ پر (جن کے سپرد اس نے اپنے تمام اسرار ومکنونات تک کر رکھے تھے) فرشتۂ عذاب بن کر وہ وہ مظالم روا رکھے جن کے خیال سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ فہد ابن ابراہیم اور عیسیٰ ابن

ابن بطوروس کو خوں آشام تلوار کے گھاٹ اُتار کر دم لیا۔ عام نصاریٰ اور قبطیوں کے مظالم کا رونا کہاں تک رویا جا سکتا ہے۔ ہزار ہا کلیسائیں اور عبادت کدے جڑ سے اُکھڑوا دیے۔

چونکہ ظالم کی رسّی ہمیشہ خدا دراز نہیں کرتا۔ لہذا حاکم بامر اللہ کے طرز حکمرانی کو زیادہ ثبات و قرار نہ رہ سکا۔ اور جلد تر اُسکو خود بھی اُسی گھاٹ اُترنا پڑا جس گھاٹ اُس کے مقتولان جفا اُتر چکے تھے۔

حاکم کے بعد خلیفہ ظاہر باللہ کا زمانہ آیا۔ جس نے ایک عام مجمع رعایا کے روبرو قبطیوں اور دوسرے فرقہاے رعایا کے ساتھ سابقہ رعایات ملحوظ رکھنے کا اعلان کیا۔ اُس کا نفاذ بھی ہوا۔ چنانچہ عیدوں کی مجالس برپا کرنے، اور دیگر مراسم مذہبی حسب سابق ادا کرنے کی آزادی عطا کی گئی۔ جو پیشیرو خلیفہ کے جبری عہد میں سلب کر لی گئی تھی۔

الظاہر کا عہد گزر کر مستنصر باللہ کا دور آیا۔ جس میں ظلم، جبر، اور تشدد کے ہولناک اور پریشان خواب عموماً عام رعایا اور خصوصاً اہل قبط کو دکھائی دینے لگے۔ اسی زمانے میں ایک طوفان چند فوجی دستوں کی تنخواہوں کی رقوم خورد برد ہو جانے سے مُلک میں برپا ہو گیا۔ فوجی دستوں کی باہم آویزش و خونناک تصادم نے اس ہنگامہ کو بہت شدید کر دیا تمام نظم و نسق درہم برہم ہو گیا جس کے فرو کرنے کی بیشیا، کوششیں ہوئیں مگر جس کی سرنوشت میں یہ نیکنامی مقدر تھی اُس کے سوا کسی دوسرے کو کیونکر حاصل ہو سکتی تھی۔ آخر بدر جمالی نے یوں فرو کیا کہ دفتر محاسبی و فوج کو چند ماہرین فن قبطیوں کے سپرد کیا کہ گذشتہ حسابی پیچیدگیوں کو پہلے دفع کریں۔ پھر منتظم اور باقاعدہ طور سے کُل حسابات طیار کریں۔ اور آئندہ دفتر کی تنظیم نہایت عمدہ اصول سے کریں کہ تنقیح کرنے والوں کو کوئی دقت نہ واقع ہو سکے۔

تہذیب دفتر ہو چکی۔ اُلجھی ہوئی گتھیاں سُلجھ گئیں۔ مُلک میں امن بدستور قائم ہو گیا۔ سررشتہ مالگذاری اور محاسبی کے کُل اختیارات وضع قوانین مال و محاسبی، عمال کا عزل و نصب جزو کُل قبطیوں کے تحت میں آگیا۔

اُنھوں نے مجموعہ قوانین وگشتیات بھی عربی زبان میں مرتب کرکے شایع کیے - اور درباروں پر پہلے سے زیادہ اپنی کارگزاری اورنیکنامی کے سکّے بٹھائے - جس کے صلہ میں علاوہ منصبِ جاہ کے خطابات مخصوص بہ وزراء و امراء مثل شیخ، رئیس - امجد - اسعد - فخرالدولہ، تاج الدولہ - نجیب الدولہ وغیرہ سے سرفراز کیے گئے -

اُن چند مشاہیر اولوالعزم اربابِ سیاست وجاہ کے نام زیب قلم کیے جاتے ہیں جنھوں نے اس خیرالقرون میں درباری مدارجِ اعتماد و وثوق حاصل کیے -

۱ - معلم سرور الجلال - یہ شخص عہدِ بنی فاطمہ میں بڑا صاحبِ ثروت، ذی وجاہت اور مدبر ہوا ہے۔

۲ - شیخ سعید ابوالفخر - المعروف بابن صاعد - یہ پہلے ایک معمولی اہلکار تھا، مگر اپنی دماغی صلاحیت اور لیاقت کی بدولت رئیس مجلس کے عہدہ تک ترقی کی جو وہی اُسکے لیے انتہائے عروج تھا۔

۳ - شیخ وجیہ ابوالحسن - خلیفہ حافظ باللہ کے عہد میں صیغۂ راز کی کتابت اس کے سپرد تھی۔ جو بلحاظ اعتماد سب میں بڑی جگہ تھی -

۴ - اسعد ابوالخیر - جرجہ ابن ابی وہب المعروف بابن المیقات - نہایت ذی ثروت و صاحبِ وجاہت شخص تھا -

۵ - ابوالیمن یوسف ابن کر المعروف بہ امین الامناء - امین (خزانچی) خزانہ تھا۔

۶ - ابوسعید بن ابوالیمین - (۷) شیخ صفی الدولہ ابن ابی یاسر (۸) شیخ ابوالفضل المعروف بابن اسقف -

۹ - معلم تردین (۱۰) ابوالطیب (۱۱) شیخ الاحرم (۱۲) ابوالبرکات ابن ابی اللیث - رئیس الدیوان

۱۳ - ابوالملیح - خیروبرکات اور دولت وثروت میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا - وغیرہ وغیرہ

اس قوم کی اقبال مندی کا یہ بھی ایک کرشمہ تھا کہ باوجود اسکے کہ ان کے ہاتھ میں زمام سلطنت تھی - مگر اس قوم نے محض علوم متعارفہ کی تحصیل اور اُس کے بعد حصول ملازمت کو اپنا منتہائے مقصد نہ قرار دیا - بلکہ کسبِ ہنر اور صنائع ملکی میں درک و مہارت کی بھی اُنھیں دُھن رہی - جہاں اُن میں بیدار مغز مدبر اور نکتہ دانان سیاست پیدا ہوے، وہاں جوہر شناسان الماس و گہر بھی

بھی ہوے - اگر اس قوم سے مشاہیر اربابِ قلم اُٹھے تو یگانۂ روزگار مرقع نویس ونقاش بھی ہو گزرے - اگر ایسے لوگ پیدا ہوے جو اپنے زورِ خطابت سے دلوں میں خاص اغراض ومقاصد کی بنیادیں قائم کر دیتے تھے تو ایسے بھی ہوے جنھوں نے صفحۂ زمیں پر ایسی سر بفلک عمارتیں طیار کر دیں جن کی رفعت وزیبایش کی مثال فردوسِ بریں سے دی جانے لگی -

ہر ایک مرضِ انسانی کے حاذق اطبا، امراضِ چوپایہ کے ماہر بیطار (سلوتری) ہندسی شیشہ گر - پیدا ہوے جن کے کمالات کی اُس وقت دھوم تھی اور اُن کے اذکار اب جو باقی ہیں اور آثار جو اُن کے قدیم معبدوں میں محفوظ ہیں مثل کنیسہ باب زویلہ - حارۃ الروم - اور مصرِ قدیم وغیرہ اُن کو دیکھ اور سُن کر اربابِ زمانہ کی عقل چرخ ہوتی ہے -

فاطمیئین کا آخری عہد بھی (جس کا اختتام ۵۶۷ھ ہجری پر ہوتا ہے) قبطیوں کے حق میں فراغت واطمیناں کا عہد ہوتا اگر صلیبی جنگوں کا ہوش رُبا ہنگامہ نہ چھڑ جاتا - اور مذہبی جنگ ہونے کی وجہ سے متہم کنندگاں کو یہ برمحل اتہام اُن پر چسپاں کرنے کا موقع نہ مل جاتا کہ قبطی فرنگیوں کی کمک پر ہیں اور مسلمانوں سے خار رکھتے ہیں - اس خیال پر جو خمیازہ اُن کو بھگتنا چاہیے تھا وہ بھگتنا پڑا - مذہبی معاملہ ہونے کی وجہ سے اُن بگڑے دل مسلمانوں نے جہاں تک اُنکی تحقیقات وتفتیش کی ہوگی وہ بھی ظاہر ہے - بہرحال بہت دن آزادی واطمینان سے بسر کرنے کے بعد پھر کچھ نہ کچھ مشقت کا زمانہ اُن کے لیے آموجود ہوا -

---

جواد علی خاں - عالی

اللہ معرفت کا دُرِ بے بہا سے ملے — یہ قطرہ موجِ قلزمِ وحدت سے جا ملے
وارفتۂ خرام ہو جان دل قتیلِ ناز — دونوں شہیدِ بُرّشِ تیغِ ادا ملے
ناآشنائے عشق سے مخفی ہے اپنا بھید — میں دردِ دل کہوں جو کوئی آشنا ملے
دیر و حرم کی رہ میں بھٹکنے سے فائدہ — نادان دل میں ڈھونڈھ جو تجھکو خدا ملے
وہ کس ادا سے کہتے ہیں سُنکر غمِ فراق — اچھا ہے دل لگانے کی کچھ تو سزا ملے

(نتیجہ طبع ابوالحسن خان)

معارفِ عریاں

جلوہ ہے ہر جگہ پر نزدیک دور تیرا
شعلہ ہے قلبِ مضطر اے شمعِ طور تیرا

ذرّوں میں ہے جو تاباں خورشید میں درخشاں
دونوں جہاں میں یارب پھیلا ہے نور تیرا

آرائشِ جہاں کو دیکھے جو چشمِ بینا
عالم میں ہر طرف ہے نور و ظہور تیرا

نیرنگِ بزمِ قدرت دامن کشِ نظر ہیں
اور جلوہ دیکھتے ہیں اہلِ شعور تیرا

سیرِ فضائے جنت حاصل ہو خاک زاہد
دل ہو نہ جائے جب تک زخموں سے چور تیرا

پُتلا ہے خاک کا یا پانی کا بلبلا ہے
ٹوٹے گا آخر انساں اک دن غرور تیرا

ملتی نہیں ہے راحت دُنیا کے مخمصوں میں
لیکن ہے ذکر یارب وجہِ سُرور تیرا

ہر صبح بام و در پہ کس ذوق سے کبوتر
پڑھتے ہیں کلمہ کیسا ربِّ غفور تیرا

گاتی ہیں حمد تیری صحرا کی آبشاریں
کرتے ہیں ذکر ہر دم کیا کیا طیور تیرا

تاروں کی روشنی میں پھولوں کی تازگی میں
پیدا ہے شان تیری پنہاں ہے نور تیرا

ذرہ نواز تجھ سا کب کوئی دوسرا ہے
اک بندۂ کرم ہوں اے رشکِ حور تیرا

ٹوٹے ہوئے دلوں کا بس تو ہی آسرا ہے
شبہائے تارِ غم میں بجلی ہے نور تیرا

فخر الدین احمد سفیر (کاکوری)

تڑپ رہے ہیں شبِ انتظار سونے دے
نہ چھیڑ ہم کو دلِ بیقرار سونے دے

قفس میں آنکھ لگی ہے ابھی اسیروں کی
گرج نہ باغ میں ابرِ بہار سونے دے

ابھی تو سوئے ہیں یادِ چمن میں اہلِ قفس
جگا نہ ان کو نسیمِ بہار سونے دے

اُڑا نہ خاک لحد خوابِ مرگ طاری ہے
شہیدِ عشق کو زیرِ مزار سونے دے

تڑپ رہی ہے تمنائے خواب آنکھوں میں
نہ چھیڑ تاجورِ دلفگار سونے دے

تاجور (نجیب آبادی)

دروازہ

میری جان ہمیشہ آفت میں رہتی ہے۔ اول تو گھر کے لڑکے دم نہیں لینے دیتے۔ میرے دونوں پٹوں کو زور سے ٹکرانا اُنکا کھیل ہے۔ اور میری پسلیاں چور ہو جاتی ہیں۔ دوسرے ہوا کے تیز جھونکے اور بھی بلائے جان۔ اس بے رحمی سے مجھے زیر وزبر کرتے ہیں کہ الاماں! اس پرطرہ یہ کہ میری فغان دردپر صاحب خانہ کو بھی ترس نہیں آتا۔ وہ اُلٹے مجھی پر ناراض ہوتے ہیں!

میں گھر کا رازدار ہوں۔ اور ظاہرداری کو نبھانا میرا کام ہے۔ اکثر گھر میں صاحب خانہ کے موجود ہونے پر بھی مجھے بند کر دیا جاتا ہے۔ خاص کر کسی چندے کی وصولی یا بزاز کے تقاضہ کے دن مجھے بند کر دیا جاتا ہے۔ اور اپنا سا مُنھ لے کر لوٹ جاتے ہیں۔ میں سینہ سپر ہو کر اپنے آقا کو ندامت اور حیلہ سازی سے بچا لیتا ہوں۔ مگر پچھلے دنوں جب مجھے بند دیکھ کر ڈاکیہ منی آرڈر واپس لے گیا تو صاحب خانہ مجھی کو کوسنے لگے۔ میری نیکیوں کا کوئی نام نہیں لیتا۔ مگر برائیوں پر سب کے سب برہم ہو جاتے ہیں!

زمانہ کا عجب ڈھنگ ہے۔ مجھے اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے میں کتنی گالیاں کھانا پڑتی ہیں۔ مجھے بند پاکر لقمۂ لذیذ کی خواہش سے بیتاب کُتے کتنے برہم ہو جاتے ہیں اور کتنے مایوس۔ اور چور تو میری جان کے گاہک ہیں۔ کبھی بغلی گھونسے مارتے ہیں، کبھی چول کھسکا دیتے ہیں، کبھی کچھ! حتیٰ کہ گداگروں کو بھی مجھ سے بغض للہ۔ مجھے بند پا کر کوستے ہیں اور ناکام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

آہ! عمر رفتہ کی یاد کتنی حسرتناک ہے۔ میں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، وہ دن نہیں بھولتا جب مالکہ نئی نویلی دُلھن بنی، گہنے سے لدی، شرم سے سر جھکائے پالکی سے

اُتری تھیں۔ اُس وقت پہلے میں نے ہی اُن کے رُخِ روشن کا نظارہ کیا تھا اور اُن کے کنول کے سے نازک پیروں کا بوسہ لیا تھا۔

ایک روز جب بابو جی شام کو کسی وجہ سے گھر نہیں آئے تو انتظار میں بیٹھے بیٹھے اُکتا کر وہ نویلی دُلھن، حیا سے گردن جھکائے دیواروں سے لجاتی، میری گود میں آ کر کھڑی ہوگئی اور کتنی دیر تک میرے پہلوؤں سے لپٹی ہوئی سامنے کے وسیع میدان کی طرف تاکتی رہی۔ اس کے دل میں اُس وقت کیسی دھڑک تھی۔ اور آنکھوں میں کتنا فکر آمیز اشتیاق۔ بابو صاحب کو آتے سے آتے دیکھ کر وہ کس طرح خوشی سے اُڑی ہوئی جلدی سے گھر میں چلی گئی! یہ پُر مزہ باتیں کبھی بھول سکتی ہیں!

بابو جی جوں جوں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں اُنھیں مجھ سے اُنس ہوتا جاتا ہے! اب وہ اکثر میرے پہلو میں بیٹھے رہتے ہیں! شاید اُنھیں میری جدائی کا غم ستایا کرتا ہے۔ ابھی جب وہ بیمار تھے تو مالکن کتنی بار مجھ سے لپٹ لپٹ کے روئی تھیں۔ معلوم نہیں کیوں! اس گھر میں کون قدم رکھے گا اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ اُسے کبھی یہاں سے جانے کا اختیار نہیں ہے! میں گھر اور باہر کے بیچ کی کڑی ہوں۔ باہر کتنا وسیع میدان ہے! کیسے سُہانے سبزہ زار، کیسی مسکراتی ہوئی آبادیاں کتنی وسیع دنیا! گھر محدود ہے۔ باہر کی کوئی انتہا نہیں۔ محدود اور غیر محدود کے درمیان رشتۂ اتصال ہوں، قطرے کو بحر سے ملانا میرا کام ہے۔ میں ایک کشتی ہوں، فنا سے بقا کو لے جانے کے لیے۔

پریم چند

کسی کی مہربانی کچھ ہمارے حال پر ہونا
عیاں کرتا ہے جذبِ عشق میں پیدا اثر ہونا

نہ پوچھا ایک دن بھی مر گیا بیمارِ غم آخر
کسی بے مہر کا اللہ اتنا بے خبر ہونا

کسی دن دیکھ لینا چونک اُٹھو گے خوابِ راحت سے
غلط ہے نالہاے نیم شب کا بے اثر ہونا

نہ گھبرا جائے ایذا میں کہ دل ہے نازپروردہ
ابھی ہے ابتدا تھم تھم کے اے دردِ جگر ہونا

چراغِ زندگی بے ضو نہ ہو پیری میں کیوں آخر
اُداسی چاہیے کچھ شمع پر وقتِ سحر ہونا

گویا جہان آبادی

تعمیر نہر پناما پر ایک نظر

(۱)

جب سے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تب ہی سے بحر الکاہل سے بحر اطلانٹک تک جلد پہونچنے کے طریقے سوچے جانے لگے۔ اُس زمانے میں نہر کا خیال تو ناممکنات سے تھا البتہ سب سے پہلے بلباؤ* نے خاکنائے کے اس سرے سے اُس سرے تک جنگل کاٹ کر ۳۰ میل لمبی ایک سڑک تعمیر کی۔ یہ سب سے پہلی سڑک تھی جو اہل یورپ نے بحر الکاہل (بحر پاسفک) اور بحر اطلانٹک کو ملانے کی غرض سے تعمیر کی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سڑک ترک کر دی گئی کیونکہ اس پر کوئی شہر آباد نہ ہو سکا۔ مگر جب گورنر پڈری اس نے شہر پناما آباد کیا تو اُس نے ایک پختہ سڑک پناما اور پورٹو بیلو (خاکنائے کے دوسرے سرے پر) کے درمیان تیار کی۔ اُس کی لمبائی پچاس میل تھی اور اتنی چوڑی تھی کہ دو گاڑیاں بہ آسانی چل سکتی تھیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ وہ سڑک مسافروں اور تاجروں کے واسطے آرام دہ ہو۔

لیکن ۱۵۲۵ء میں مکسیکو کے ہسپانی حکمراں کارٹس کو معلوم ہوا کہ خلیج مکسیکو اور خلیج ٹیوانٹاپک تک صرف ۱۲۰ میل کا فاصلہ ہے اور پہاڑوں کے درمیان درے صرف ۸۰۰ فیٹ سطح سمندر سے بلند ہیں اس لیے اُس نے ایک سڑک یہاں تعمیر کی جو "ٹیوانٹاپک کی سڑک" کے نام سے مشہور ہے۔ اُس زمانے سے اس وقت تک اس سڑک پر کافی طور سے تجارت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہسپانی زمانۂ حکومت میں اور اُس کے بعد بھی یہی دو سڑکیں وسط امریکہ میں تھیں۔ جن سے کہ مسافر ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک جا سکتے تھے۔

---

* Balbao ۱۴۷۵ سے ۱۵۱۷ تک اسپین کی جانب سے وسط امریکہ کا گورنر رہا اور آخرکار پڈری اس کے ہاتھوں مارا گیا۔

ٹیوانٹاپیک کی سڑک کی تعمیر کے دو سو برس بعد مکسکو اور ریاستہائے متحدہ سے جنگ چھڑ گئی جس میں ریاستہائے متحدہ کو اریزونا، مکسکو جدید، اور کیلیفورنیا ملے۔ لیکن یہ اضلاع مرکز حکومت سے دُور تھے اور ریل کا سلسلہ بھی اُس وقت تک بہت ہی کم تھا۔ امریکہ کے اصلی باشندے جو "انڈین" کہے جاتے ہیں لڑنے کو مستعد تھے اس واسطے ان صوبہ جات تک جانے کو کسی آسان راستے کی سخت ضرورت محسوس کی گئی تاکہ فوج اور ڈاک جا سکے۔ اسی عرصے میں کیلیفورنیا میں سونے کی دریافت ہوئی۔ اب لوگوں نے عام طور پر قسمت آزمائی کی غرض سے کیلیفورنیا جانا شروع کیا۔ وہاں جانے کے دو راستے تھے۔ ایک تو وادی مس سی پی (شمالی امریکہ کا بہت بڑا دریا) کے میدانوں اور جنگلوں میں ہوکر، دوسرا براہ پناما سمندر سے۔ لیکن دونوں راستوں میں یکساں خطرات تھے۔ اگر خشکی کا راستہ جنگلی جانوروں، جاہل اور وحشی باشندوں، دشوار گزار دَرّوں، اور ناقابلِ گزر گھاٹیوں سے تھا تو اِس طرف بھی کیریبین (Carrabian) کی متلون سطح پر جہاز کا ڈوبنا، اور خاکنائے کی گرم آب و ہوا میں سیکڑوں کا مر جانا معمولی باتیں تھیں۔ شمار کیا گیا تھا کہ صرف ۱۸۵۲ء میں سونے کے متلاشیوں میں سے ۰۰ ۵ ہیضہ کا شکار ہوئے۔

باوجود اِن تمام خطرات کے سمندر کا راستہ آسان سمجھا جاتا تھا اور زیادہ تر متلاشیانِ طلا نے یہی راستہ اختیار کیا۔ خاکنائے پر تجارت کا کاروبار بڑھنے لگا۔ کثرت سامان تجارت کیلیفورنیا کو بھیجا جانے لگا۔ اس لیے نیویارک میں ایک جماعت کو اس کا خیال ہوا کہ ایک ریل کی سڑک کولون سے پناما تک تعمیر کی جاوے۔ سڑک کی تعمیر کے حقوق کولمبیا کی گورنمنٹ سے طے ہوئے کیونکہ پناما اُس وقت میں کولمبیا میں شامل تھا۔

(۲)

چنانچہ ۱۸۴۹ء میں اسی سڑک پر جو ایک زمانے میں اہلِ ہسپانیہ نے تعمیر کی تھی، تعمیر شروع ہوئی لیکن گرم و مرطوب آب و ہوا جیسی کہ منطقہ حارہ میں ہُوا کرتی ہے کام کرنے والوں کے واسطے وبالِ جان تھی۔ دِق، ملیریا، طاعون، اور زرد بخار عام طور پر مزدوروں کے واسطے

مصیبت کی بیماریاں تھیں۔ ۸۰ لاکھ ڈالر (تقریباً ایک کرور ۶۰ لاکھ روپیہ) ۵ سال کی سخت محنت اور ایک ہزار کے قریب جانیں، یہ تھی قیمت جو ریاستہائے متحدہ کے لوگوں نے ۸۴ میل کی سڑک کی تعمیر میں ادا کی! لیکن اس سڑک سے آمدنی بہت تھی۔ حتیٰ کہ سڑک کے زمانۂ تعمیر ہی میں کمپنی کو ۲۰ لاکھ ڈالر (۴۰ لاکھ روپیہ) ملے اور پہلے ۴۲ سال میں اس چھوٹی سڑک سے ۳ کرور ۸۰ لاکھ ڈالر (۸ کرور روپے کے قریب) فائدہ ہوا!

(۳)

وسط امریکہ میں نہر کا خیال، کولمبس کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ افسوس اُس وقت ہوا جب اُس کو معلوم ہوا کہ وسط امریکہ کے مشرقی حصص سے ایشیا پہنچنے کا آسان بحری راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ اسکا اصل مقصد ہند کا دریافت کرنا تھا۔

ہسپانی ۱۵۲۱ء میں پناما سے جھیل نکاراگوا (Nicaragua) تک گیا جس کا رقبہ تین ہزار مربع میل ہے اور وہاں سے سان جوان (San Juan) میں ہو کر اطلانٹک تک۔ یہ راستہ صرف ۱۷۰ میل لمبا تھا جس میں جھیل اور دریا بھی شامل ہیں۔ اور خیال کیا گیا تھا کہ نکاراگوا پر ایک نہر کی تعمیر جاری کی جائے۔ لیکن شاہ ہسپین نے خیال کیا کہ اگر نہر تعمیر ہو جائے گی تو دوسری اقوام کو زیادہ کامیابی ہوگی اور اس طرح اسپین کا اقتدار امریکہ میں کم ہو جائے گا۔ لہذا نہر کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اس کے قریب پونے دو سو برس بعد اسکاٹ لینڈ کے ایک مشہور باشندے ولیم پیٹرسن (William Paterson) نے خیال کیا کہ اگر خلیج ڈیرین میں ایک سکاچ لوگوں کی الگ نوآبادی قائم کی جائے تو رفتہ رفتہ پناما کا اُس کے قبضے میں آجانا ممکن ہے۔ اُس نے یہ بھی خیال کیا کہ اگر نوآبادی قائم کرنے میں کامیابی ہوگئی تو اسکاٹ لینڈ کی طرف سے ایک نہر اس جگہ تعمیر کر دی جائے گی۔ لیکن اُس کو سخت ناکامیابی ہوئی۔ اہل اسکاٹ لینڈ آئے۔ کامیابی کے ساتھ اُنھوں نے قبضہ کر لیا۔ لیکن گرم و مرطوب آب و ہوا کو وہ نہ برداشت کر سکے۔ کچھ موت کا شکار

ہوے اور باقیوں کو اہل ہسپانیہ نے جانے پر مجبور کر دیا۔

اسکاٹ لینڈ کے بعد انگلینڈ کا نمبر آیا۔ ٹریفلگار کی لڑائی سے ۲۵ سال قبل نلسن جھیل نکاراگوا پر قبضہ کرنے کو روانہ کیا گیا۔ وہ قبضہ کرنے میں اہل ہسپانیہ کے مقابلے میں کامیاب ہوا لیکن آب و ہوا کو کیا کیا جائے، جس نے اُس کے دو تین سَو ساتھیوں میں سے صرف دس بارہ کو باقی چھوڑا۔ اس لیے وہ مجبوراً واپس آیا۔ تاہم انگلستان کو نا امیدی نہ ہوئی۔ مدت دراز تک جھیل نکاراگوا اور اُس کے نواح میں تعمیر نہر کے واسطے پیمایش جاری رہی۔ حتیٰ کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک انگلستان کا خیال نہر تعمیر کرنے کا تھا!

(۴)

نہر سوئز کی تعمیر کے بعد سے فرانسیسیوں کو بھی نہر پناما کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا اور ۱۸۸۲ء سے فرانسیسی شروع ہوئی۔ ایک کمپنی فرنچ پناما کمپنی کے نام سے قائم ہوئی۔ بڈھے ڈی لسپس (De Lessepse) کو یہ کام سپرد کیا گیا۔ کام بڑے زور شور سے شروع ہوا، بڑے بڑے دولتمندوں سے لے کر ٹکے ٹکے کے مزدوروں تک نے دل کھول کر کمپنی کے حصے خریدنا شروع کیے۔ لیکن ناکامیابی کے تین اسباب تھے:۔

اوّلاً اہل فرانس نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ وہاں کی آب ہوا کا کیا علاج کیا جائے گا۔ صرف دو ہسپتال ایسے خراب آب و ہوا کے مُلک میں تھے، ایک پناما میں اور دوسرا کولون میں۔ کُل ۸۶۰۰۰ آدمی کام کرتے تھے جن میں سے قریب ۵۲۰۰۰ کے بیمار رہ چکے تھے! اور ۲۳ سال میں ۲۸۲۶۳ آدمی اجل کا شکار ہوے! دوسرے نہر سوئز کی کامیابی اہل فرانس کو اس بات کا لیسنس نظر آتی تھی کہ خواہ وہ کسی حصہ دنیا میں نہر تعمیر کرنا چاہیں بہ آسانی تعمیر ہوسکتی ہے اس لیے ذرائع کامیابی اور دوسری اقوام کی ناکامیابی کے اسباب کا انھوں نے بغور مطالعہ کیے بغیر کام شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہر پناما کی تعمیر نہر سوئز سے کہیں زیادہ مشکل تھی۔ تعمیر نہر میں ترقی نہایت آہستہ آہستہ ہوتی تھی، لیکن اہل فرانس کو اطلاع دی گئی کہ نہر عنقریب ختم ہونے والی ہے۔

اس لیے وہ برابر روپیہ بھیجتے رہے۔ تیسری بات یہ تھی کہ ڈی لس سپس خود بے ایمان نہ تھا، لیکن بڑھاپے کے باعث وہ اس عظیم الشان مہم کے نا قابل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک تہائی روپیہ نقد تو خزانے ہی سے چوری گیا۔ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے مزدور تک چوری اور رشوت ستانی کا شکار رہے۔

سات سال تک بیماری، غبن اور فضول خرچی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ لیکن اس مدت کے تمام ہونے پر کُل کام کا بمشکل ۱/۴ حصہ ختم ہوا تھا۔ اگرچہ کُل ۴۰ کروڑ ڈالر (تقریباً ۸۰ کرور روپیہ) باقاعدہ خرچ ہوا ہوتا تو نہر تعمیر ہو چکی ہوتی۔ آخر کار اہل فرانس کی نظروں سے ڈی لس سپس کے اعتبار کا پردہ اُٹھ گیا: وہ چونکے، اور اُن کو شروع سے آخر تک سکیم کی ناکامیابی کا حال معلوم ہوا۔ سیکڑوں گھر برباد ہو گئے۔ آخرکار نتیجہ وہی ہُوا۔ نہ روپیہ ہی واپس مل سکا اور نہ نہر ہی تعمیر ہوئی!

آخرکار تحقیقات شروع ہوئی۔ کمپنی کے بہت سے ممبروں کو جرمانہ ہوا، بہتوں کو سزا جھیلنا پڑی، اور بڈھے نہر سویز کے معمار کا حشر؟ جب اُس کو پانچ سال کی قید کا حکم سنایا گیا، اُس کے حواس جاتے رہے۔ وہ شخص، جس کا بُت نہر سویز کے ایک سرے پر کھڑا ہوا انگلی سے اشارہ کر رہا ہے کہ دیکھو، یہ ہے وہ کام، جس کو میں نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا! جب یہ سنتا ہے کہ پانچ سال ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بسر کرنا ہوگا! اُس کا پاگل ہو جانا لازمی ہے۔ آخرکار اُس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ ایک پاگل خانے میں مصیبت اور بدنامی کی موت مر گیا!

(۵)

اہل مغرب کی کوشش، اُن کی اَن تھک محنت، اور اُن کے استقلال میں ترقی کا راز مضمر ہے۔ پناما کے ۴۸ میل لمبے لیکن مُردم خوار خطے کا خیال کیجیے اور ذرا اہل مغرب کی کوشش پر دھیان دیجیے۔ تعمیرِ نہر کے واسطے کس کس نے کوشش نہیں کی؟ ہسپانی آئے اور چلے گئے۔ اہل سکاٹلینڈ

کو بھاگنا پڑا۔ جنگ نیل اور ٹریفلگار کے سورماؤں نے نیچا دیکھا۔ آخر کار سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ کروفر اور ساز و سامان سے اہلِ فرانس نے قدم رکھا، روپیہ پانی کی طرح بہا دیا، لیکن نتیجہ؟ ناکامیابی! اس کے بعد دوسری قوموں کو خیال ہونا چاہیے تھا کہ نہر قابلِ عمل ہے، لیکن نہیں، امریکہ اُٹھا اور اُس نے نئے ایجاد شدہ آلات اور نئی ادویات کی مدد سے زمین کی خرابیاں اور مزدوروں کی بیماریاں رفع کیں۔ اور آخر کار تکمیل نہر سے دکھلا دیا کہ اہلِ مغرب کسی کام کو یوں ختم کرتے ہیں!

فرانس کی ناکامیابی کے بعد ہی سے امریکہ کو تعمیر نہر کا خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ ریاستہائے متحدہ کا تعلق دونوں سمندروں سے تھا: بحرالکاہل سے ایشیائی تجارت کا سلسلہ اور اطلانٹک یورپ پہنچنے کا ذریعہ لیکن دونوں سمندر سے بحری راستے سے بہت دور۔ دو بیڑے رکھنا پڑتے ایک مشرقی ساحل کی دیکھ بھال کرتا دوسرا مغربی ساحل کی حفاظت کرتا۔ اس لیے دونوں سمندروں کے ملانے والے راستے کی سخت ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے دو تجاویز پیش کی گئیں۔ ایک یہ کہ نہر براہِ نکاراگوا بنائی جائے اور دوسری تجویز یہ کہ براہِ پناما۔ نکاراگوا کا راستہ خراب تھا، اس واسطے طے پایا کہ پناما کا راستہ اختیار کیا جائے۔ فرانسیسی کمپنی کا تمام سامان ۴ کروڑ ڈالر پر خرید کیا گیا اور فروری ۱۹۰۴ء کو پناما کی جمہوری حکومت نے ریاستہائے متحدہ کے ہاتھ دس میل چوڑا اور پچاس میل لمبا حصۂ زمین ایک کروڑ ڈالر کو فروخت کیا اور مئی ۱۹۰۴ء میں ریاستہائے متحدہ نے اُس حصۂ زمین پر سوائے کولون اور پناما کے قبضہ کر لیا۔ اس طرح امریکہ کے مقبوضات میں ایک نیا حصۂ زمین زیادہ ہُوا جس کی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔

تعمیر نہر کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہر کی اقسام کا ذکر کیا جائے۔ نہریں عموماً دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک تو (Sea Level Canal*) جن میں پانی

---

* جناب نظام الدین حسن صاحب بی۔اے، بی ایل نے (Sea Level Canal) کا ترجمہ نہر سطح بحری اور (Lock Canal) کا ترجمہ نہر متقل کرنے کی مجھ کو صلاح دی ہے۔

کی سطح سمندر کی سطح آب کے برابر ہوتی ہے۔ یہ نہریں ایک چھوٹی آبنائے سے مشابہ ہیں۔ اور دُنیا کی قابل جہازرانی نہروں میں سے تین اسی قسم کی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک نہر سویز ہے۔ دوسری (Lock Canal) یہ نہریں اُن جگہوں پر تعمیر کی جاتی ہیں، جہاں وہ دو پانی کے حصّے جو ملائے جاتے ہیں ایک سطح پر نہیں ہوتے یا اُن کے درمیان ایسی زمین ہوتی ہو جس کا کھدنا مشکل ہو۔

مان لیا جائے کہ دو جھیلیں ا و ب ایک دوسری سے ملاتی ہیں جن میں سے اب سے ۲۰ فیٹ اونچی ہے، تو جہاز جو آ سے بَ کو جائے گا نہر کے کسی نہ کسی حصہ میں ۲۰ فیٹ نیچے لے جانا ہوگا۔ یا اگر بَ سے ا کی طرف جائے گا تو کہیں نہ کہیں ۲۰ فیٹ اونچا کرنا ہوگا۔ نہر عموماً کئی حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے اور ایک حصہ دوسرے حصہ سے مضبوط پھاٹک کے ذریعہ سے ملا رہتا ہے جو مشین کے ذریعہ سے حرکت کرتے ہیں۔ فرض کیا کہ آ و بَ کے درمیان جو نہر ہے وہ تین حصوں پر منقسم ہے، اور جہاز ا سے جا رہا ہے تو پہلے اور دوسرے حصہ کے پانی کو ایک سطح میں پھاٹک کھول کر کر دینگے، تب دوسرے اور تیسرے حصہ کے درمیان کا پھاٹک کھول کر پانی کی سطح برابر کر کے جہاز کو بہ آسانی نکال دیں گے۔

ڈی لس سپس نے اصل میں سویز کے طرز کی نہر تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن کام چھوڑنے سے پہلے ہی اُس نے اپنی رائے بدل دی تھی۔ یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ اگر سویز کی طرز کی نہر تعمیر کیجاتی تو ۳۰ کرور مکعب گز مٹی کی کھُدائی کرنا پڑتی۔ یعنی اگر ایک دیوار ۲۰ فیٹ اونچی اور ۳ فیٹ چوڑی تعمیر کی جاتی تو خط استوا پر سارے کُرۂ زمین کو گھیر لیتی۔ ایسی نہر کم از کم ۱۸ سال میں ۶۰ کرور ڈالر خرچ کر کے تیار ہوتی۔ لیکن دوسری قسم کی نہر کی تعمیر میں ۹ برس کی مدت اور صرف ۴۰ کرور ڈالر خرچ ہوتے۔

اس لیے بہت اختلاف رائے کے بعد طے ہوا کہ موخر الذکر قسم کی نہر تعمیر کی جائے۔ تعمیر کا سلسلہ نہایت ہی استقلال اور خوش انتظامی سے شروع ہوا۔ آب و ہوا کی خرابی رفع کرنے کو نئی دریافت شدہ ادویہ کا استعمال کیا گیا۔ کولون اور پناما کے علاوہ بھی بعض مقامات پر اسپتال قائم کیے گئے اور

وہ بیماریاں، جو ہر ایک قوم کی ترقی کی سدِ راہ تھیں، اہلِ امریکہ کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں*۔

(۶)

کسی نہر کے طے کرنے میں جہاز کو جو محصول ادا کرنا ہوتا ہے وہ ایک مقررہ رقم فی ٹن (۸ من) کے حساب سے ہوتی ہے۔ نہر سویز میں ۷۰ ا ڈالر فی ٹن دینا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ دو ڈالر فی مسافر۔ اوسط درجے کے جہاز کو نہر سویز سے گزرنے میں بیس ہزار روپے سے زیادہ نہیں دینا ہوتا۔ یہ رقم گو بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن راس امید (Cape of Good Hope) کے طے کرنے میں اس سے زیادہ اخراجات ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے نہر پناما میں گو محصول زیادہ ادا کرنا ہوتا ہے لیکن وہ اُن اخراجات سے بہت کم ہے جو جنوبی امریکہ کے گرد چکر کر کے آبنائے میگلین سے جانے میں ہوتے۔

نہر پناما سے ذیل کے فوائد مختلف اقوام اور ممالک کو ہوتے ہیں :۔

زمانۂ جنگ میں نہر پناما، ریاستہائے متحدہ کے واسطے بہت کار آمد ہے۔ اب تک اُسے جنگی جہازوں کے دو بیڑے رکھنا ہوتے تھے، ایک اطلانٹک میں، دوسرا بحر الکاہل میں۔ اب نہر کے سبب سے ایک بڑا بیڑا دونوں طرف کے ساحل کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اُن جہازوں کو جو سان فرانسسکو سے نیویارک آبنائے میگلین ہو کر جاتے ہیں، ۱۳۰۹۰ میل طے کرنا ہوتے ہیں، لیکن براہ پناما صرف ۵۲۰۰ میل یعنی ۷۸۹۰ میل کم! اسی طرح اُن بندرگاہوں کا راستہ جو بحر الکاہل کی جانب ہیں، یورپ سے ۵۰۰۰ میل کم ہو جائیگا۔

نہر پناما ہو کر ۱۶ میل فی گھنٹہ چلنے والا جہاز سان فرانسسکو سے نیویارک صرف ۱۴ دن میں پہنچے گا، جبکہ قدیم راستے سے ۶۰ دن میں۔

نہر سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وادی مس سی پی اور جنوبی و مشرقی ریاستیں مشرقی ایشیا

* نہر پر کُل کام کرنے والے تیس یا چالیس ہزار کے قریب تھے۔ مزدوری کی رقم مہینے میں ایک بار ریل پر آتی تھی۔ کُل سکوں کا وزن، جو چاندی کے ہوتے تھے، سوا ہزار من ہوتا تھا!

کے زرخیز حصوں اور جنوبی امریکہ کے مغربی حصوں سے بہت نزدیک ہو جائیں گی۔

دُنیا کے نصف سے زیادہ لوگ بحرالکاہل کی ساحلی زمین پر آباد ہیں اور امریکہ (ریاستہائے متحدہ) سے ان مقامات کو کوئلہ، لوہا، اور روئی اور ہر قسم کی مصنوعی اشیا اتنی ہی ارزاں قیمت پر جا سکتی ہیں جتنی قیمت پر کہ یورپ بھیج سکتا ہے۔ لیکن جنوبی امریکہ کے مغربی حصص بہ نسبت یورپ کے امریکہ سے ... ۳ میل نزدیک ہو جائیں گے۔ اس واسطے ان حصص میں امریکہ بہت ارزاں مال روانہ کر سکتا ہے۔

نہر جہاں حالتِ جنگ میں اور مسافروں کے واسطے وقت کی بچت کا ایک آلہ ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح تجارتی دنیا میں بھی اس نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ وہ بازاریں جہاں یورپ کی گرم بازاری تھی، اب امریکہ اور جاپان کے ہاتھ میں چلی گئیں۔ گو کہ دنیا کی تمام مہذب اقوام اس نہر سے فائدہ ہوا ہے، لیکن ریاستہائے متحدہ نے نہایت استقلال سے اس کام کو شروع کیا اور بہت ہی خوبی سے انجام کو پہنچایا اور فائدہ بھی اس نہر سے سب سے زیادہ ریاستہائے متحدہ ہی کو ہوا۔

یوسف الزماں (آسیونی)

اُس مصحفِ عارض کا اگر دھیان نہیں ہے
زاہد ترا قرآن پہ ایمان نہیں ہے

اسلام کا دعویٰ ہے پرستش ہے بتوں کی
مجھ سا بھی زمانے میں مسلمان نہیں ہے

مقصود نہیں شہرۂ وحشت ہمیں ورنہ
کیا ہاتھ نہیں ہے کہ گریبان نہیں ہے

ملنا جو کوئی چاہتا ہے تم نہیں ملتے
اربابِ مروت کی تو یہ شان نہیں ہے

پوچھا نہ مزاج اُس نے تو اس میں بھی ہے اک مزہ
یعنی وہ مرے حال سے انجان نہیں ہے

لی جائے گی عشاق کے سینوں کی تلاشی
ناوک میں کماندار کے پیکان نہیں ہے

اے عشق ترے ہاتھ سے جز شہرِ خموشاں
وہ کون سی بستی ہے جو ویران نہیں ہے

آئی نہ اگر موت تو کیا گزرے گی ہجر؟
اُف - اس کا تصور بھی تو آسان نہیں ہے

ملے وہ کہ ترا شیوہ ہے اُمید برآری
کیا دل میں رقمؔ کے کوئی ارمان نہیں ہے؟

امیر علی رقم (لکھنوی)

گورِ غریباں

دُنیا، منزلِ عدم کے جانے والوں کی فرودگاہ ہی۔ اس کا ثبات اُتنا ہی ہی جتنا پانی پر کے بُلبُلوں یا گرتے تاروں کا ہوتا ہی۔ مگر با اینہمہ صورتگرِ ازل نے اس پیرِ زال میں ایسی رعنائی کوٹ کوٹ کر بھردی ہی کہ دَم بھر کو بھی اس کے نظر فریب تماشوں کا آنکھوں سے اوجھل ہونا گوارا نہیں۔ جس کو دیکھو اسی کا دیوانہ اسی کا مفتوں ہی! اگرچہ آئے دن کے واقعات اور حوادث ڈنکے کی چوٹ بتلا رہے ہیں کہ یہ وادیِ مرگ انجام دلبستگی کا مقام نہیں ہی اور اس خرابۂ جنت نما کی دلفریبی ایک دھوکے کی ٹٹی ہی، اگرچہ شبانہ روز کی عبرتیں ہانکے پکارے اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ یہ دُنیا دُنیا والوں سے نہایت تیزی کے ساتھ رُوکش ہو رہی ہی، یہ وہ مکان ہی جس کے مکینوں کے لیے فنا تقدیر ہو چکی ہی، یہ وہ شیرینی ہی جس کا مزہ آخر میں نہایت تلخ ہی، یہ وہ نوش ہی جس کے ساتھ ساتھ نیش لگا ہوا ہی، مگر واہ رے ہم! یہاں تو کان پر جوں نہیں رینگتی۔ گویا حق تعالیٰ نے ہمیں چشمِ عبرت بیں اور گوشِ حق نیوش عطا ہی نہیں فرمائے ہیں!

میں اسی اُدھیڑ بُن میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتًا خیال آیا کہ اب تک عیش و عشرت کی بہت سی محفلوں میں شریک رہے، رقص و سرود کی مجلسوں کا بہت کچھ لطف اُٹھا چکے، میلے تماشے بہت دیکھ ڈالے، شاداب باغوں اور پُرفضا چمنوں کی گلگشت کا حظ پا چکے، عجائب گھروں اور نمایش گاہوں کی سیر کر چکے، اب ذرا چل کر ہمیں گورِ غریباں کی بھی سیر کرنی چاہیے! خیال کا آنا ہی تھا کہ ایک ہُوک اُٹھی اور بس اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک عجیب محویت کے عالم میں گھر سے نکلکر شہر کے اُس پار آبادی سے ہٹ کر گورِ غریباں کی راہ لی۔ شام کا سماں تھا۔ نیرِ گیتی فروز دن بھر سلسلۂ مسافت طے کر کے گوشۂ مغرب میں ستانے کے لیے سرعت کے ساتھ جا رہا تھا۔

مرغزاروں میں خوش نوا پرندے شام کلیان چھیڑ رہے تھے۔ داہنے بائیں خودرو ہریاول پر تختۂ زمردیں کا دھوکا ہوتا تھا۔ غرض اس سے بھی آگے بڑھ کر میں ایک میدان میں داخل ہوا جہاں چاروں طرف ہُو کا عالم سناٹے کی حالت تھی۔ آواز تو کہیں سے کچھ سُنائی نہ دیتی تھی البتہ جنگل کی ہَوا سائیں سائیں کرکے سکوت توڑ دیتی تھی۔ اسی میدان میں ایک جانب کئی کہنہ اور شکستہ قبریں تھیں۔ نہایت انتشار کے عالم میں میں نے قبروں کی جانب رُخ کیا۔ وہاں کی حالت بس کچھ نہ پوچھیے! خاموشی کا وہ عالم کہ پناہ بخدا! مزاروں کی وہ سُونی حالت کہ الٰہی توبہ! منظر ایسا بھیانک کہ عیاذاً باللہ! میں اس قدر محو اور خود فراموش تھا کہ مجھے اُس ہُو کے میدان میں سوائے ذاتِ پاک باری تعالیٰ عزاسمہٗ کے اور کوئی شے کارفرما نظر نہیں آتی تھی قبروں کی حالت ازبس فرسودہ تھی۔ حسرت مجاور، یاس جاروب کش، اور خس و خاشاک قبر پوش تھا۔ بعض قبریں تو ایسی ٹوٹی پھوٹی تھیں کہ ان میں کاسہ ہائے سر اور مندرس ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ افسوس! کون جانے کہ وہ ہڈیاں کس کے نازک جسم کی تھیں اور وہ کاسۂ سر کس شخص کے تن کی زینت تھا! اُن ہڈیوں کی نشو و نما کن کن چاؤ چونچلوں سے ہوئی ہوگی اور اُس سر کے کیا کیا صدقے سیلے نہ ہوئے ہوں گے۔ مگر آج وہی ہڈیاں خاک تُو اور مٹی کا ڈھیر ہو رہی ہیں، وہی سر آج پامال اور ٹھکرایا جا رہا ہے! فاعتبروا یا اولی الابصار!

قبرستان کے بیچوں بیچ ایک بوسیدہ قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب تھا جس پر کچھ لکھا تھا۔ امتدادِ زمانہ نے حرفوں پر مٹی جما دی تھی اور بایں وجہ صاف معلوم نہ ہوتا تھا کہ کیا منقوش ہے۔ میں نے چاہا کہ شاید متوفی کے متعلق اس کتبہ سے کچھ پتہ چل سکے پس اپنے رومال سے اُس کو صاف کیا اور حرفوں کی مٹی دور کر دی۔ اب میں اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔ کہ اُس پر کیا لکھا ہے! پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ قبر کسی خاتون محترمہ کی آرام گاہ تھی جو عین عالمِ شباب میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر بیشمار تمناؤں اور لاتعداد ارمانوں کو ساتھ لیے ہوئے پیوندِ زمیں ہو گئی۔ کتبہ پڑھنے کے بعد میرا رومال آنسوؤں سے شرابور ہو گیا اور زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ میری نظر

کے سامنے کھنچ گیا - وہ کتبہ کیا تھا؟ یہ دو شعر تھے! شعر نہیں، بلکہ یاس اور کس مپرسی کا مرقع کہا جائے تو بجا ہے:

کون کہتا ہے کہ دو آنسو بہاتے جانا　　کون کہتا ہے کہ دو پھول چڑھاتے جانا
اے سرِ ناز سے مرقد پہ گزرنے والے　　اک ذرا دیر کو دو ہاتھ اٹھاتے جانا

ہم کو اس کی خبر نہیں کہ کل مرحومہ کس آغوش کی زینت، کس بزم کی شمع، کس محل کی رونق، اور کس کاشانے کی ضیاء تھی- مگر ہاں اس کی خبر ہے کہ آج اُس کا حسن گلو سوز، اس کی زیب وزینت اور شمع روئی ایک سنسان اور ڈراؤنے کھنڈر میں تودۂ خاک کا جھیس لیے ہوئے ہے جس پر حسرت بہ ہزاراں حسرت فاتحہ پڑھ رہی ہے۔ اور بالیں پر ایک پتھر اُس عبرت انگیز صورتِ حال کے تماشائیوں کو رُلانے کے لیے سرو قد استادہ ہے!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

قبرستان میں چاروں طرف وحشت کا سکہ چل رہا تھا- بہت سی چھوٹی چھوٹی قبریں بھی نظر پڑیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ وہ گلشن ایجاد کے اُن نوخاستہ نخلوں کی یادگاریں ہیں جنھیں ہستی کے بعد ہی نیستی کا شکار ہونا پڑا اور جو اس گلشن میں بادِ بہاری کے خوشگوار جھونکوں سے پھلنے پھولنے نہ پائے تھے کہ بادِ خزاں کی تُند اور تیز لپیٹ سے جل کر خاک ہوگئے - وہ اُن ننھے مُنے لاڈلوں کا مقامِ استراحت تھا جو کبھی کسی کے نورِ عین اور سرورِ دل تھے، جن کی پرورش بڑے ناز و نعم، چاؤ چونچلوں اور منّت مرادوں سے کی جاتی تھی مگر بے وفا زمانے کی چشم زخم اور حضرت ملک الموت کی دست درازی نے اُن معصوم جانوں پر بھی کچھ ترس نہ کھایا اور بہت جلد اُنھیں آغوشِ مادر سے چھڑا کر آغوشِ لحد میں لا سلایا!

حیف ہے بلبلِ ناشاد کی بربادی پر　　نکہتِ گل بھی نہ سونگھی تھی کہ صیاد آیا

اُن سیکڑوں ٹوٹی پھوٹی قبروں میں سے ممکن ہے کہ بعض قبریں عاشقانِ جاں باز کی آرامگاہ بھی ہوں گی جنھوں نے اپنی زندگی کسی کے لیے وقف کر دی تھی- صہبائے محبت کے

متوالے، کسی کے حسنِ عالم آشوب کے مفتوں، کسی کی نگاہِ غلط انداز کے گھائل، کسی کے خندہ شکرریز کے بسمل، کسی کے نازِ فتنہ پرور پر لوٹ تھے! جنھوں نے اپنی حیات اور موت کا تصفیہ کسی ستم ایجاد، بیگانہ خو کی 'ہاں' یا 'نہیں' پر رکھ چھوڑا تھا، آستانۂ یار جن کی جبیں سائی کا مستقر تھا، غرض جنکی زیست ہی سرتاپا کسی تغافل کیش کی یاد پر موقوف تھی! مگر اب اِن باتوں میں سے ایک بات بھی باقی نہیں رہی، انھیں منزلِ مقصود کو پہونچے مدت ہوگئی۔ حیات کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ مسرت و انبساط کے نازک پھول مرجھا گئے۔ اب صرف اتنا ہی پتہ ملتا ہے کہ بقا کی آب و ہوا میں پلنے والی روح قفسِ عنصری سے اُڑگئی اور جسدِ خاکی ایک مٹی کے ڈھیر میں دبا پڑا ہے۔ جو یا تو خاک ہونے والا ہے یا ہوگیا۔ وہ اُمنگیں جو کل ایک زندہ دل کی بستی تھیں، آج تہ زمیں ہوگئی ہیں اور وہ ارمان جو رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لیتے تھے آج خاک میں دبے ہوئے ہیں۔

کئی ایک متکبر اور سرکش ہستیاں بھی اُس اُجڑے دیار میں جا بسی ہوں گی جنھوں نے اپنی ناپائدار زندگی میں کبر اور نخوت کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ حوادثِ روزگار نے اگرچہ اُنکے روبرو عبرت کے دفتر کھول رکھے تھے مگر وہ بدمستانِ بادۂ پندار ایسے کہاں جو اپنی حقیقت پر نظر ڈالتے، واقعاتِ عالم کو بہ اِمعانِ نظر دیکھتے اور ماضی پر غور کرکے اپنا مستقبل سنوارتے!

الغرض بہت دیر تک میں عالمِ انتشار میں قبرستان کا سماں دیکھتا رہا۔ اس مشاہدے کا اثر جو مجھ پر ہوا وہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ میرے تخیل نے اُس وقت مجھے اس دنیا سے الگ کرکے اس عالمِ ناسوت میں لا چھوڑا تھا جہاں 'اللہ بس باقی ہوس' کا گہرا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا۔ بہت چاہا کہ اُن متوطنانِ دیارِ عدم سے اُن کا حال پوچھوں، اُن کی سرگزشت معلوم کروں۔ مگر افسوس! کیا خاک پوچھتا! کہیں سے جواب کے ملنے کی توقع ہی نہ تھی۔ چونکہ شام کی تاریکی زیادہ مسلط ہوچکی تھی پس اُسی عالمِ استغراق و محویت میں میں نے فاتحہ پڑھی اور وہاں سے رخصت ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ قبرستان سے بڑھ کر عالمِ سکوت کا اور کوئی موقع نہیں ہوسکتا

مگر وہ لوگ جو چشم بینا اور سامعۂ باطنی سے بہرہ مند ہیں گورِغریباں کے سکوتِ بجیاں میں بھی گویائی کا رنگ دیکھتے ہیں۔ خود وہاں کی خموشی زبانِ حال سے آیۂ کُلّ من علیہا فانٍ کی تفسیر بتاتی اور دُنیا کے گذشتنی اور گذاشتنی ہونے کی ہدایت دیتی ہے۔ وہاں کی حالت اُن کے لیے تازیانۂ عبرت ہے!

اے خداوندانِ قال الاعتذار الاعتذار اے خداوندانِ جاہ الاعتبار الاعتبار

ایک زمانہ ہوا کہ یہاں سے جانے والے چلے گئے۔ اُن کی اولاد، اُن کے عزیز و اقارب، اُن کے دوست آشنا اُن کی مرگ پر آنسو بہاتے رہے اور کچھ عرصے تک اُن کا ماتم ہوتا رہا۔ اب ایامِ فراموشی کا عمل دخل شروع ہوا۔ نہ اشکباری رہی اور نہ کوئی سوگ باقی رہا بلکہ اُن کی یاد تک صفحۂ دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ اُن کے ہاتھوں کی محنت شاقہ یا تو خس و خاشاک کے نیچے دب گئی ہے یا زمانہ کے ہاتھوں نے اُسے بالکل ویران کر دیا ہے۔ ہم اِنھیں آبا و اجداد کی اولاد ہیں اور اس حیرت انگیز اور ہیبت ناک نصیبے کے وارث۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جبکہ ہمارے سر بھی اسی زمین کی نذر کر دیے جائیں گے جس پر آج ہم اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔ سبزہ اُن کا قبرپوش ہوگا۔ آیندہ نسل کے لیے ہماری قبریں جولاں گاہ ہوں گی۔ وہ ہمارے لیے کچھ دنوں روتے رہیں گے اور چند سال یاد بھی رکھیں گے۔ پھر اس کے بعد ہمارا نام اس دارِ ہستی سے مٹ جائے گا۔ اور کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہے گا۔

مرنے والوں نے جس بات کا مشاہدہ کیا ہے وہ اک سربستہ راز ہے جس کا انکشاف اب تک ہم پر نہیں ہوا۔ ہاں وہ وقت قریب اور بالکل قریب ہے کہ یہ راز ہم پر فاش ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم بصیرت سے بہرہ اندوز ہیں تو وہ سارے اسرار ایک ایک کر کے ہم کو بتا دیے گئے ہیں۔ اس سرائے فانی کی عبرتوں نے سرگذشتِ رفتگاں اور احوالِ پیشینیاں کو ہم پر صورتِ آئینہ عیاں کر دیا ہے۔ غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف سے عبرت کی

تلقین ہو رہی ہے۔ یہ دنیاوی نقش ونگار جو ہماری نظر میں ہیں وہ محض ایک فریب ہیں۔

اے مغرور انساں! اے سرائے فانی کے مسافر! اے اپنی حقیقت سے غافل مُشتِ استخواں! جا اور گورغریباں دیکھ! حصولِ ہدایت کے لیے عبرت بیں نگاہوں سے وہاں کا مشاہدہ کر! حقیقت کے کانوں سے سُن کہ وہاں کی خموشی زبانِ حال سے کیا کہہ رہی ہے! سمجھ اور اچھی طرح سمجھ کہ یہ باشندگانِ شہرِ خاموشی اُس رہگذر کے پیشرو ہیں، جہاں سے ایک دن تجھ کو بھی گذرنا ہے۔ دیکھ اور خوب دیکھ کہ اُس سنسان ویرانے میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے اندر تجھ جیسے بلکہ تجھ سے کہیں زبردست اور مغرور انسانوں کی ہڈیاں خاک آلود پڑی ہیں اور اُن کے کاسہ ہائے سر اِدھر اُدھر ٹھکرائے جا رہے ہیں! اے مکروہاتِ دنیوی میں پھنس کر خدا کو بھول جانے والے انسان! یاد رکھ، یہ تیری ہستی جس کے زعم میں تو آپے سے باہر ہوا جاتا ہے ایک خوابِ گراں ہے! تیری اُمنگیں اور تیرے ارمان خیالی فانوس سے کم نہیں! حالتِ زیست فی الواقع حالتِ خواب کا نقشہ ہے! تجھے ایک ایسی دنیا میں جانا ہے جہاں کی کیفیتیں اس ہستی سے بالکل نرالی ہیں۔ یہ دُنیا جس میں تو رہتا ہے ایک خیالی طلسم ہے۔ یہ عیش و آرام کا مسکن، خوشی اور مسرت کا گھر۔ دلچسپی اور دلبستگی کا شیرازہ نہیں ہے بلکہ وہم یا دھوکا، خیال کا نتیجہ اور محض آزمایش کا مقام ہے! اگر مسرت جاوید کا حصول تیرا نصب العین ہے اور فی الواقع یہی نصب العین ہونا بھی چاہیے، تو اعمالِ حسنہ کی توفیق اور قبولِ ہدایت کی استعداد پیدا کر اور بس۔ وما علینا الا البلاغ۔

سید عمر ابو طالب شمس (حیدرآباد دکن)

اے خالقِ ذوالجلال و اے بار خدا — تا چند روم در بدر و جا بجا

یا خانہ امید بار را در بند — یا قفلِ مہمات مرا در بکشا

یادِ مستقبل

حدکا شوقِ میکشی اظہر عیاں ہونے کو ہے
نقدِ جاں نذرِ شہِ پیرِ مغاں ہونے کو ہے

یاس کہتی ہے کہ کر دوں زندگی کا خاتمہ
آس کہتی ہے کہ آساں کارِ جاں ہونے کو ہے

میرے دل میں ہے خلش اندوزِ مستقبل کی یاد
کیونکہ مستقبل پہ ماضی کا گماں ہونے کو ہے

صبر سے مشکل مری آسان ہوگی جلد تر
خار سے پیدا گُلِ مقصودِ جاں ہونے کو ہے

آتشِ جاں سوز بن جائے گی گلزارِ خلیل
شعلۂ جوّالہ بھی اب گُل فشاں ہونے کو ہے

فکرِ مستقبل کی ہے ظلمت زدائے جہلِ دل
واقعی روشن چراغِ جسم و جاں ہونے کو ہے

آ رہی ہیں غیب سے پیہم صدائیں خوشگوار
اب کوئی دم میں نزولِ قدسیاں ہونے کو ہے

رونق افزائے چمن ہوگا وہ گلرو سرو قد
باغِ عالم رشکِ گلزارِ جناں ہونے کو ہے

نونہالانِ چمن باہم گلے مل جائیں گے
باغِ عالم میں بہارِ بے خزاں ہونے کو ہے

یاد آیا ہے کہ ہو جائے گی دنیا پُر ضیا
یاد آیا ہے کہ وہ جلوہ کناں ہونے کو ہے

یاد آیا ہے کہ اظہر ہوگا مستقبل عیاں
ختم ماضی کی پُرانی داستاں ہونے کو ہے

کاش ہم بھی دیکھتے وہ شان و شوکت کی گھڑی
سنتے ہیں اب اور تہذیبِ جہاں ہونے کو ہے

رشید علی اظہر مخدومی

یارب دلِ من ز معرفت دانا کُن (۱) چشمم بہ جمالِ مصطفےٰ بینا کُن
روزے کہ چو لالہ سر برآرم از خاک در روضۂ مصطفےٰ مرا ما وا کُن

یارب چو شود روزِ قیامت ظاہر (۲) وز ہر طرفے شود ملامت ظاہر
در روضۂ مصطفےٰ بر انگیز مرا کز حضرتِ او شود سلامت ظاہر

خرقِ عادت

میاں رشید کوئی معمولی خاندان کے آدمی نہ تھے۔ شریف زادے تھے۔ باپ عالم فاضل تھا وکیل تھا۔ اور وکالت بھی کیسی جو دلالوں کی امداد کی محتاج نہ تھی بلکہ ذاتی قابلیت سے چلتی تھی۔ تمام شہر میں وکیل صاحب کا اعزاز تھا۔ ہر فرد بشر ان کو جانتا تھا مانتا تھا۔ ہر محفل میں ہر انجمن میں ان کی ذات نمایاں طور سے معلوم ہوتی۔ اُن کے پند و نصائح کا اثر کچھ دیر تک تو سننے والوں کو ضرور مبہوت کر دیتا۔ کچھ ذاتی وجاہت، کچھ آواز کا زوردار با اثر لہجہ، کچھ انکی خوبیوں کا اثر حصولِ مقصد میں ان کی امداد کرتا۔ ہاں کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان کی شہرت میں دھبہ لگاتی۔ مگر بھلا ہو میاں رشید کا کہ انھوں نے اپنی سعادت سے ان کی پر لطف زندگی کو عذاب سے تبدیل کیا۔ رشید جاہل نہ تھے۔ انگریزی کی سند حاصل کر چکے تھے۔ ابھی مدارجِ ترقی حاصل کرنے کے لیے باپ کا روپیہ اُسی رنگ سے خرچ ہو رہا تھا۔ جس طرح اب تک صرف ہوا تھا۔ مگر رشید کی طبیعت اب پڑھنے سے گھبراتی۔ جی اُچٹ گیا ہے۔ صحبت نے رفتہ رفتہ اثر کیا خوب رنگ چڑھا۔ کتابیں طاقِ نسیاں پر رکھ دیں درسِ الفت لینے لگے۔ رشید نمی ایک شاہد بازاری سے لو لگی۔ اقلیدس کی اب کسی شکل سے ان کو سروکار نہ تھا۔ مگر ایک شکل تھی جو ان کے دل پر نقش تھی اور جس کی یاد آٹھوں پہر تھی۔ تصور تھا کہ جاتا ہی نہ تھا۔ تمام وقت اسی خبط میں صرف ہوتا۔ اُف رشید سے کوئی یہ کہتا کہ جس ہستی پر تم جان دیتے ہو کبھی اس کی بابت غور تو کر لو۔ تم اس کو تمام عالم سے پاک صاف سمجھتے ہو۔ مگر وہ سراپا ملوث ہے۔ تم اس کو اپنی سمجھتے ہو۔ اپنی۔ اور اپنے کو اُس کا تنہا گاہک تصور کرتے ہو۔ مگر اس کے نہ معلوم کتنے خریدار ہیں۔ ان کے واسطے یہ گراں نہیں۔ وہ تم سے کم خوش قسمت نہیں۔ اس کے وہ برقی قوت رکھنے والے اعضا جن کو تم پاک سمجھ کر بیخودی کے عالم میں پیار کرتے ہو، ملوث ہیں۔ ناپاک ہیں۔ پھر لطف یہ۔ طرہ یہ کہ تم کو فخر ہے۔ ناز ہے۔ کاش تم اسے باقاعدہ اپنی ہی کر لیتے۔ تب بھی غنیمت تھا۔ اوا ندھی ہستی۔ انجام

سے بخبر ہستی۔ سوچ تو، تو کس کی محبت میں سرگرداں ہو؟ ایک ناپاک ناکارہ شے کی! تو اس کے مکروزور میں آگیا۔ فریب آمیز لگاوٹ میں نہ سمجھا۔ ہاں تو اندھا ہوگیا ہو اندھا!

تجھے کچھ اپنی عصمت مآب بیوی کے حقوق کا بھی خیال نہ آیا، جس کو تیرے ماں باپ اس دن سے بخبر، خوشی خوشی بیاہ کر لائے تھے۔ کیا تجھ کو انکار تھا؟ نہیں نہیں یہ تو سب تیری رضامندی سے ہوا۔ سرِ محفل تو نے اقبال کیا۔ عہدِ وفا باندھا۔ وکیل۔ شاہد سب موجود ہیں۔ وہ غریب سنتی ہو اور کلیجہ پر صبر کی سِل رکھے ہے۔ کیا ایک بےگناہ کو یوں آٹھ آٹھ آنسو رُلانا اچھا ہے؟ نہیں نہیں۔ تو ظالم ہے ستمگر ہے۔ جو تیرے سہارے پر ہو اُسے یوں چھوڑ دینا زیبا ہے؟ نہیں نہیں، تو بیوفا ہو۔ بزدل ہو۔ تو اُس بھولی بھالی ہستی سے اول اول اپنی لغزشیں چھپاتا رہا، اُس کو بہلاتا رہا۔ مگر کہاں تک؟ آخر سارا راز آشکارا ہو کر رہا۔ طشت از بام ہوا۔ وہ نیک بخت سنتی ہو گر پھر بھی اپنے منھ سے کچھ نہیں کہتی۔ اُس کو تجھ سے ہمدردی ہے۔ تیری بابت بُرا بھلا سُن کر اب بھی اُس کا دل کڑھتا ہے!

سنگدل! کیا تجھے اُن ننھے ننھے بچوں کا بھی خیال نہ آیا، جو ابّا کی یاد میں بلک بلک کر روتے ہیں اور جب رات بڑھ جاتی ہے تو مایوسی کی حالت میں سو جاتے ہیں۔ صبح پھر تجھے یوں ہی یاد کرتے ہیں مگر اُف تو مہینوں صورت نہیں دکھاتا۔ خدایا رحم رحم۔ تو نے معصوموں پر بھی ظلم کیا۔ اپنے گناہوں کو سوچ اور گریبان میں سر ڈال۔

(۲)

یوں ہی رشید کے دن گزرتے تھے۔ ہر صبح جس رنگ میں اسے پاتی تھی اُسی طرح شام کے سپرد کر جاتی تھی۔ غرضکہ اس بندۂ خدا کی حالت میں ذرہ برابر تغیر نہ ہوا۔ سرشار تھا، مدہوش تھا۔ نشہ ہرن نہ ہوا۔ یوں ہی ہفتے گزرتے گزرتے سال کی نوبت آئی۔ باپ نے بہت کچھ تدارک کیا مگر بیسود۔ دریا کا بہاؤ اور طبیعت کا رُخ روکنا غیر ممکن ہو۔ احباب کے ذریعے سے بہت کچھ پند و نصائح کے باب اُن پر کھولے گئے مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگی۔ رشید وہ رند تھا جس پر پیرِ مغاں کیا تمام میکدے کو فخر تھا۔ رشید وہ پجاری تھا کہ جس پہ بتخانے کو ناز تھا۔ ہاں جب اس کی نیازمندی حد کو پہونچی

تو بتوں کو بھی محبت ہونے لگی۔ دَیر کے لیے وقف تھا۔ یار کا کوچہ تھا اور یہ۔ اس کے لیے یہ کوچہ نجد کی گلیوں سے کم نہ تھا۔ کوہِ بے ستوں کی فضا یہیں تھی۔ گلزار کا نقشہ اسی جگہ موجود تھا۔ اس سے جدا ہونا کیا معنی؟

ہاں جب ضروریاتِ زمانہ مجبور کرتیں تو ہمارا وارفتۂ محبت اُس کو کچھ عرصہ کے لیے خیرباد کہتا اور چل نکلتا۔ اس کی متجسسانہ نگاہیں اس بات کو صاف ظاہر کرتیں کہ کسی چیز کی تلاش میں ہے۔ سیدھا گھر پہونچتا۔ جو چیز ہاتھ آتی لے بھاگتا۔ کبھی کبھی زنان خانے میں پہونچ جاتا۔ ماں بہن کا زیور زبردستی چھین لیتا اور چلتا دکھائی دیتا۔ اُس کو لیکر پھر منزلِ مقصود کو واپس جاتا اور کچھ دنوں بےفکری اور چین کی زندگی بسر کرتا۔ یہ تھی اس کے رازقہ کی صورت۔ یہ تھا اس کی بسرِ اوقات کا ڈھنگ۔ یہی ذرایع، یہی نئے نئے منصوبے اس کے اخراجات کے کفیل ہوتے۔ پھر جب ضرورت ہوتی حسب معمول دورہ کرتا۔ ہاں ایک بات تھی اس نے کبھی غیر کی چیز پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ جو لاتا، اپنے گھر سے سینہ زوری سے لے آتا۔ باپ جب ان واقعات کو سنتا سخت پریشان ہوتا۔ ہر قسم کی کوشش کی کہ اس کی یہ حرکتیں موقوف ہوں مگر بے سود۔ کام کرنے والے آنکھ بچا کر کام کر ہی جاتے۔ نوکروں اور سارے ملازموں سے تاکید ہوئی کہ یہ ڈیوڑھی کے اندر قدم نہ رکھنے پائے ڈیوڑھی سے بھگا دیا جائے۔ مگر ملازمین غریب جس کو گودوں کھلا چکے تھے اُس کو کیونکر دھکے مار کر نکال دیتے؟ خدا جانے یہ روش کب تک قائم رہی۔ آخر کار جب وکیل صاحب بالکل پریشان ہوے اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو اپنے احباب سے جو پولیس میں ملازم تھے امداد چاہی اور کوشش کی کہ اس کی شہرت مصادرت کر دی جائے اور یہ کبھی یہاں نہ آنے پائے۔ یہ تدبیر ایک حد تک کارگر ہوئی۔ مگر رشید کے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ تنہا نکل چلے اور جس کے لیے یہ دن دیکھنا پڑا ہے اُس کو چھوڑ جائے۔ دونوں میں کچھ ایسا ساز ہوا کہ دونوں چھپ کر شہر سے نکل کھڑے ہوے۔ جب یہ ظاہر ہوا کہ میاں رشید اکیلے نہیں گئے بلکہ اُس کو بھی ساتھ لے گئے تو اُس کے ماں باپ نے سر پیٹ ڈالا کہ روزی کا سہارا ہی گیا۔ دوکان سرد ہو گئی۔ ساتھ ہی اسکے اپنا

تمام زیور بھی لے گئی۔ اس وقت رشید ان کی آنکھوں میں خار تھا۔ اُنھوں نے جس صیاد کے ذریعہ سے اس کا شکار کیا تھا وہ آخر کار خود صید ہو کر ساتھ ہو لیا۔ کیا کرتے؟ رو پیٹ کر بیٹھ رہے مگر اس کا رنج جو کچھ ان کو ہوا اس کا بیان کرنا غیر ممکن۔ ہاں ہاں گویا خلاف امید دیوالہ نکل گیا۔

(۳)

رشید تو گئے مگر ان کی مفارقت پر کوئی اظہار حسرت و افسوس کرنے والا نہ تھا۔ کیونکہ ان کی عدم موجودگی سے غریب الدین کو ایک گونہ اطمینان قلبی حاصل ہوا۔ آٹھوں پہر کا دھڑکا جاتا رہا سچ ہے آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔ ان کی قابل نفریں روش نے عزیز و اقارب کا کلیجہ پکا دیا تھا۔ رات دن رسوائی اور بدنامی کی خبریں سننے سے اچھا تھا کہ ان کی خبر نہ ملے۔ وہی جو کہ ان کی صورت نہ دیکھنے سے بےچین ہو جاتے تھے۔ وہی جو کہ ان کی ایک پل کی جدائی کو قیامت سمجھتے تھے۔ ان کی مفقود الخبری سے خوش تھے! زیادہ مجبوری میں صبر کے سوا کیا چارہ ہے؟ ادھر دیکھیے میاں رشید نے نکل کر کدھر کا رخ کیا؟ ٹھیک ٹھیک بتانا غیر ممکن۔ مگر اس میں شک نہیں کہ نہ معلوم کتنے قصبوں اور شہروں کی خاک چھانتے رہے۔ خود تنہا نہ تھے۔ گلے کا ہار بھی تھا۔ مستقل قیام کہیں نہ رہا۔ دس روز یہاں تو دس روز وہاں۔ نہ معلوم کتنے مسافر خانے، سرائیں، ہوٹل قیامگاہ رہے۔ کچھ دن ایک جگہ رہ کر شہر کی آب ہوا کا لطف اُٹھایا۔ وہاں کی عمارات دیکھیں، بازار دیکھے، دلکش مناظر کا لطف اُٹھایا۔ جب طبیعت سیر ہو گئی دوسری جگہ چل دیے۔ یہ طوائف الملوکی کا عالم یا پیروں کا سنیچر بہت دنوں تک رہا۔ ہر قصبہ ان کے لیے نئی دلچسپیاں پیدا کرتا۔ ہر شہر ان کے لیے نئی دلفریبیاں پیش کرتا۔ یہ تھے کہ مست و سرشار، اپنی دُھن میں مگن۔ گھر کا خیال بھول کر بھی نہ آتا۔ ہاں آتا مگر کس وقت جب ضرورتیں مجبور کرتیں۔ جیب خالی ہوتی نظر آتی۔ گلے کا ہار چھوڑ آپ اُڑتے اور سیدھے منزل مقصود کا راستہ لیتے۔ کہاں پہونچتے، باپ کے پاس۔ توبہ توبہ میں غلطی پر ہوں، باپ کا اس سعادتمندی پر کیا سامنا کرتے۔ جب باپ مکان

پڑے ہوتے تو چھپ کر اندر پہونچتے۔ سب ان کی اچانک آمد سے متحیر ہو جاتے۔ ان کو نہ ماں کو سلام کرنے سے کام نہ بہن کی خیریت پوچھنے سے مطلب نہ صابر و شاکر بیوی کی حالت سے غرض۔ سیدھے در آئے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جو چیز سمجھ میں آئی لے بھاگے، جو چیز مناسب معلوم ہوئی اُٹھالی۔ زیادہ تر زیورات پر دستِ تعدّی دراز ہوتا تھا اور چشم زدن میں غائب۔ دیکھتے دیکھتے رفو چکر۔ گویا آئے ہی نہ تھے۔ ایک بجلی تھی کہ چمک گئی۔ ماں غریب کی ممتا کچھ دیر کے لیے تازہ ہو جاتی، محبت جوش کرتی مگر ان کی حرکات کا جب خیال آتا صبر آجاتا۔ رشید کا کیا کہنا جو کچھ ہاتھ آیا لے کر خوش خوش واپس آتے اور اُس غارت گرِ دین و ایماں سے ساری کیفیت بیان کرتے۔ یہ ایک دو دفعہ کا واقعہ نہیں۔ بارہا ایسا ہوا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دُور از وطن اسی غربت کی حالت میں بالکل تنگدست ہو گئے۔ کچھ نہ سوجھی پھر بھی کہنا چاہیے کہ خوب سوجھی۔ جہاں آپ کا قیام تھا اُسی ضلع سے متصل دوسرے ضلع میں ایک قریبی رشتہ کی بہن بیاہی تھیں۔ بہنوئی خوش حال تھے۔ سرکاری ملازم تھے۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ بس خیال کا آنا تھا کہ اُڑے۔ راستہ میں سیکڑوں منصوبے سوچے کہ کیونکر کام چلے۔ آخر پہونچے اور کس وقت؟ ٹھیک اُس وقت جب ان کے بہنوئی کچہری میں تھے۔ گھر میں بہن تنہا تھیں۔ پہونچتے ہی چھری نکالی کہ کُل زیور اُتار دو ورنہ خیر نہیں۔ پہلے انھوں نے بہت منت سماجت کی مگر جب دیکھا کہ کسی طرح ٹلتا ہوا نظر نہیں آتا تو غریب نے کُل زیور اُتار دیا اور ان کی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ بہنوئی نے جب آکر سنا خاموش ہو گئے۔ یہ تھے کہ لے کر چل دیے۔ پھر ٹھہرنا کیسا۔ واپس آکر اپنی کامیابی کی داستان سنائی۔ اب کیا تھا؟ کچھ دنوں کا اطمینان تھا۔ پھر وہی بے فکری۔ پھر وہی عیش و عشرت۔ پھر وہی جشن۔

(۴)

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ باہر سے آئے تو اپنی جان سے زیادہ عزیز محبوبہ کو رنجیدہ دیکھا۔ صورت دیکھتے ہی استفسارِ حال کیا۔ کیفیت پوچھی مگر اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب یہ بہت مُصر

ہوئے تو اُس نے کہا کہ ہاں کہوں تو۔ وجہ، سبب سب کچھ بتاؤں اگر تم سنو" انھوں نے کہا" ہاں ہاں سنوں گا کیوں نہیں۔ تم بھی کمال کرتی ہو، تمہاری باتیں اور سنوں نہیں۔ یہ آج تمھیں ہو کیا گیا۔ میں نے تو کوئی بات ایسی نہیں کی کہ تم کو ملال ہو۔ بلّٰہ جلد کہو" کہنے لگی کہ "صرف سننے کی شرط نہیں۔ اگر مانو بھی" اب تو یہ بہت بیتاب ہوئے اور کہا "کہو ملّٰہ کہو میں ضرور مانوں گا" اُس نے سچی سنجیدگی اور درد آمیز لہجے سے کہنا شروع کیا کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ ہماری تمہاری یہ روش کب تک رہے گی۔ یہ رویّہ قائم رہنے کا نہیں۔ یہ طرز زندگی کب تک رہے گا۔ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ تم گھر سے نکال دیے گئے، میں ماں باپ کو چھوڑ کر چلی آئی۔ نہ تم اپنے والدین کو مُنھ دکھا سکتے ہو، نہ میں اپنے ماں باپ کے پاس جا سکتی ہوں۔ آمدنی کا ذریعہ سوا اس کے کوئی نہیں کہ تم اپنے گھر سے چور ڈاکو کی طرح چھین جھپٹ کر لے آؤ۔ سو یہ کب تک؟ ایک دن یہ ہونا ہے کہ تم دراصل چوری کرو۔ ڈاکہ مارو۔ دوسروں کی چیزوں پر اندھیرے اُجالے ہاتھ ڈالو۔ انجام کار کسی نہ کسی روز پکڑے جاؤ۔ گرفتار ہو۔ جیلخانے کی ہوا کھاؤ۔ اور میں یا تو تمھارے بعد در در کی ٹھوکریں کھاؤں۔ بھیک مانگوں یا دوسرے کے ہاتھ عصمت فروشی کروں۔ مگر اب تمھارے ساتھ اتنے دن رہ کر مجھ سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس گئی گزری حالت میں اور اضافہ کروں۔ یوں ہی کیا کم ذلیل اور خوار ہوں۔ لہٰذا تم کوئی ایسی بات کرو کہ رازق کی مستقل صورت ہو جائے۔ تم اپنے قوتِ بازو سے حاصل کر سکو۔ ورنہ یہ عیش عارضی ہے۔ عارضی کیا بالکل تھوڑے دنوں کا ہے۔ جلد ہی مصیبت آنے والی ہے۔ اس لیے اگر ابھی سے ہم لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں تو اچھا ہے۔ جس طرح اُس اندھیری رات میں جس میں ہاتھ نہیں سوجھتا۔ ستاروں کی روشنی یک گونہ باقی رہتی ہے۔ جس طرح ساون بھادوں کی راتوں میں جب ستارے رُوپوش ہو جاتے ہیں۔ پردۂ خفا میں منھ چھپا لیتے ہیں تو کبھی کبھی بجلی اپنی خیرہ کر دینے والی چمک سے ایک نظر تمام عالم کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح گو کہ اس عورت کا دل تاریک ہو چکا تھا مگر اب بھی روشنی کا ایک ذرہ باقی تھا جس نے اسے راہِ راست دکھانی شروع کی اور جس کی بدولت

وہ بادی اور ناصح مشفق کا کام کرنے لگی۔ وہ یہ سب کچھ کہہ کر رو اُٹھی۔ رشید کو کہاں ضبط تھا بیخودی میں اُس سے لپٹ گئے اور آب دیدہ ہو کر بولے کہ اچھا بتاؤ میں کیا کروں؟

شیدا۔ "تم کیا کرو! خدا کے فضل سے تمھارے پاس انگریزی کی سند ہو۔ تم تھوڑی محنت کر کے مختاری کے امتحان میں کیوں نہ شریک ہو جاؤ۔ خدا چاہے گا تو کامیاب ہو جاؤ گے"۔

رشید۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ کجا تمھاری محبت کا سودا کجا مختاری کا امتحان۔ یہ دردِ سر مول لینا اور اپنا عیش منغص کرنا آسان نہیں۔ تم میری مختار رہو ہی۔ اب مجھے بھی مختار رہنا چاہتی ہو میں مختار ہوتا تو تمھارا سودا ہی کیوں اپنے سر لیتا۔ حضرت دل کے کہنے ہی میں کیوں آتا۔

شیدا۔ (سنجیدگی سے) پیارے رشید یہ دل لگی کی بات نہیں۔ اس وقت مذاق رہنے دو۔ میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہوں اور اگر در اصل تمھیں میری محبت ہو اور میرا کہنا ماننا چاہتے ہو تو کمرِ ہمت باندھ کر کچھ دن مشقت کر ڈالو۔ تمھیں میری محبت کی قسم سچ بتاؤ ارادہ ہو کہ نہیں؟

رشید۔ اچھا میں نے تمھارا کہنا مانا مگر اُس کے خرچ کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔ کتابیں لینا ہوں گی۔ فیس جمع کرنا ہوگی۔ سیکڑوں کھیڑے ہیں ایک ہو تو کہوں۔

شیدا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اس کی فکر میں کر لوں گی۔ آخر یہ میرا زیور کس کام آئے گا۔ اس کو بیچ کر کل صرفے ہوں گے۔ عرصہ تک کفایت کرے گا۔

رشید۔ یہ تو دل گوارا نہیں کرتا۔ خیر یہ بھی سہی مگر خدانخواستہ میں اگر ناکامیاب رہا۔ تو؟

شیدا۔ "تو کیا" بفرضِ محال اگر ایسا ہوا بھی تو دوسری بار پھر امتحان دینا۔ اللہ چاہے گا کامیابی ہوگی۔ ہمت ہارنا، مرد کا کام نہیں۔

اب تو رشید سے کوئی جواب نہ بن آیا بولے جو کچھ تمھاری مرضی ہو۔ مجھے منظور ہے۔

شیدا۔ مگر ایک بات ہے کہ چل کر اپنے والد ہی کے شہر میں رہو۔ وہیں ٹھیک ہے۔

رشید۔ "وہیں ٹھیک ہے" کیا غضب کرتی ہو۔ میری صورت کے وہ روادار نہیں۔ اگر اُن کو کہیں معلوم ہو گیا کہ میں کمبخت پھر اُس سرزمین پہ پہونچ گیا تو آفت ہی ہو جائے گی۔

شیدا۔ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کو جتایا جائے۔ ایک مکان کرایہ پر لیں گے۔ شہر کے ایک گوشہ میں علٰحدہ رہیں گے۔ جہاں تک ممکن ہوگا اپنے کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔

غرضکہ بعد ردو قدح تمام باتیں طے ہوگئیں۔ دوسرے ہی دن دونوں روانہ ہوگئے۔ وہاں پہونچ کر شہر کے ایک کنارے پر مکان لیا۔ کچھ زیور بیچ کر تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کی گئیں کتابیں خریدی گئیں۔ میز و کرسی ضروری فرنیچر بہم پہونچایا گیا۔ سب سے بڑھ کر شیدا نے خود اپنا ٹائم ٹیبل بنایا تاکہ پابندی اوقات کا اہتمام رہے۔ مگر ٹائم ٹیبل دیکھ کر رشید کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اپنی تفریح اور لہو و لعب کے لیے جتنا وقت وہ چاہتے تھے، نہ تھا۔ کہاں چوبیس گھنٹے عیش پرستی میں گزرتے تھے کہاں یہ حال۔ زمین و آسمان کا فرق۔ ان کا خیال تھا پڑھنا برائے بیت رہے گا۔ بولے۔ اول ہی ظلم کیا کم تھا کہ مجھے نئے سرے طالب علمی عطا کی گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ میری تفریح کے لیے بھی واجبی ہی واجبی وقت رکھا گیا۔ تمھارے انصاف کی داد دینے کے لیے نوشیرواں زیر زمین بے چین ہے۔ کیوں نہ ہو۔

شیدا۔ اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کوئی غیر مناسب بات نہیں کی۔ اور یہ سب ہم دونوں کی بہبودی کے لیے ہے۔ اگر اپنی اور میری محبت ہے تو ایسا ہی کرو۔ میں تم سے تعلیم کے اوقات میں بات بھی کرنا نہیں چاہتی اور شاید تم خود بھی پسند نہ کرو۔

(۵)

لیجیے تعلیم شروع ہوگئی۔ اوّل اوّل رشید کو بہت پریشانی رہی۔ آخر طبیعت جم گئی۔ وہ خدا کی بندی کبھی مخل نہ ہوتی بلکہ نگراں رہتی۔ کہ ان کا وقت ضائع نہ ہو۔ داخلہ کی فیس بھیج دی گئی۔ امتحان میں شریک ہوئے۔ پرچے بھی کچھ برے نہ ہوئے۔ اب کچھ دنوں پھر فرصت نصیب ہوئی مگر نتیجہ کا بے چینی سے دونوں کو انتظار تھا۔ وہ وقت بھی آگیا۔ گزٹ نکلا۔ مگر غریب رشید کی تمناؤں کا خون کرتا ہوا۔ حسرتوں کو خاک میں ملاتا ہوا۔ ارمانوں پر بجلی گراتا ہوا۔ تصویر یاس و حسرت بن کر گھر آئے۔ ناکامیابی کا منحوس لفظ جوں توں اپنے منہ سے ادا کیا۔ یہ

کیونکر کہا جائے کہ رشیدہ کو رنج نہ ہوا۔ مگر صبر سے کام لے کر اور طبیعت کو سنبھال کر بولی۔ خیر۔ خدا کا شکر۔ مشیت ایزدی یوں ہی تھی۔ پھر سہی۔ ایک بار اور قسمت آزمائی کیجیے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ انشاء اللہ محنت ٹھکانے ضرور لگتی ہے۔

رشید نے پہلے کچھ ہوں ہاں کی۔ مگر اس کے اصرار سے مجبور ہوئے۔ اس کی تسلی اور تشفی سے ڈھارس بندھی۔ پھر کتابیں دیکھنا شروع کیں۔ دل پر چوٹ لگنے سے ان کو بھی زیادہ خیال ہوا پورے انہماک سے امتحان کی تیاری کی۔ پھر فیس بھیجی۔ امتحان میں شریک ہوئے۔ اب کی پرچے بہت اچھے کیے۔ نتیجے کی امید میں دن گزرنے لگے۔ خدا خدا کر کے وقت آیا۔ گزٹ پھر نکلا۔ مگر پہلا سا نہیں۔ اول تو خبر مرگ کا پیغام بن کر آیا تھا مگر ابکی مژدۂ جاں فزا سنانے۔ امید بر آئی۔ تمنا پوری ہوئی۔ دل کی کلی کھل گئی۔ شگفتہ شگفتہ گھر آئے۔ رشیدہ نے ان کے تبسم زیر لب سے نتیجہ نکال لیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ محنت ٹھکانے لگی۔

(۶)

ادھر کا ذکر سنیے۔ ان کے والد کچھ دن پہلے ہی سن چکے تھے کہ میاں رشید مختاری کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ ایک شہر کی بات کہاں تک چھپتی۔ مگر باور نہیں آتا تھا۔ خیر چونکہ رشید اب ان کو ستانے نہ جاتے تھے۔ وہ بھی خبر نہ ہوئے۔ نہ کچھ کھوج کیا۔ حسن اتفاق ہی ہفتے کا گزٹ جس میں مختاری کا نتیجہ نکلا تھا، باہر کوٹھی میں بیٹھے دیکھ رہے تھے کہ یکایک رشید کے نام پر نظر پڑی۔ حیرت سے اچھل پڑے۔ بولے کہ لوگ مجھ سے سچ کہتے تھے۔ دراصل یہ امتحان میں شریک ہوا اور کامیاب ہوا۔ مگر جیسا میں نے سنا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کارگزاری، یہ ساری نیک نفسی، یہ تمام دور اندیشی اسی بازاری عورت کی ہے۔ دراصل یہ کسی شریف کے صلب سے ہے ورنہ اس فرقے سے وفا معلوم۔

گزٹ ہاتھ میں لیے خوش خوش اندر گئے۔ بولے۔ کچھ اور سنا؟ تمہارے صاحبزادے نے تو مختاری کا امتحان پاس کیا ہے۔ بڑی بھل منسی کی بڑی راست روی اختیار کی۔ میں جھوٹ نہیں کہتا

یہ دیکھو گزٹ میں نام موجود ہے۔ میں نے ابھی ابھی دیکھا تمھیں خوشخبری سنانے چلا آیا۔ مگر یہ بھی کچھ معلوم ہے کہ یہ سب کس کی بدولت ہوا؟ اُسی عورت کی بدولت۔ ورنہ ان سے یہ کہاں اُمید تھی۔ غرضکہ سارا ماجرا کہہ سنایا۔

دوسرے دن گاڑی پر سوار ہو کر رشید کی قیام گاہ پر پہونچے۔ باپ کو دیکھنا تھا کہ رشید مکان کی دیوار پھاند کر بھاگے۔ گو کہ باپ نے ہزاروں آوازیں دیں کہ میاں رشید تم سے کچھ کہنا ہے میں تمھیں لعنت ملامت کرنے نہیں آیا ہوں۔ سنو تو سہی۔ مگر وہاں کون سنتا تھا۔ وہ غریب کیونکر منھ دکھاتا۔ خیر۔ رشید اسکے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے ایسی نیک نفسی سے کام لیا۔ اب اُٹھو میرے ساتھ چلو۔ سوار کراکے اُسے لے آئے۔ اور اپنے مکان کے متصل ایک مکان میں اُتروا دیا۔ اب رشید کی تلاش شروع ہوئی۔ کئی روز بعد یہ ہزار خرابی کہیں پکڑ ملے۔ باپ کے سامنے لائے گئے۔ سر نیچا کیے کھڑے رہے۔ اپنے مہربان باپ کی سب باتیں سنتے رہے۔ سوائے خاموشی کے کچھ جواب نہ دیا۔ آخر میں آہستہ سے شرماتے شرماتے رو کر کہا کہ در اصل میں بڑا نالائق ہوں۔

دوسرے روز رشید کا شیدا سے عقد کر دیا گیا۔ اور شیدا نے پھر اوقات کی پابندی کا وعدہ لیا کہ چار روز آپ اپنے محل میں رہیں تو دو چار روز میرے یہاں۔ میں ان کی روا دار نہیں کہ آپ میرے ہی یہاں بنے رہیں۔ رشید نے منظور کیا۔ اور اب ان کو خدا کے فضل سے اچھی خاصی آمدنی ہے۔ ان کی مختاری خوب چمکی۔ سچ ہے کہ جو بگڑ کر بنتا ہے خوب بنتا ہے۔ مگر خدا نہ کرے کہ بگڑ کر بننے کی نوبت آئے۔ بنا رہے یہی اچھا ہے۔

باسط۔ بھوپال

اللہ بفریاد من بیکس رس ۔ لطف و کرمت یار من بیکس رس

ہر کس بہ کسے و حضرتے می نازد ۔ جز حضرت تو ندارد این بیکس رس

نظرے خوش گزرے

اُردو کانفرنس کا پہلا اجلاس

اُردو کانفرنس، جس کے انعقاد کی تدبیر میں تین مہینے سے مسلسل جد و جہد ہو رہی تھی، بالآخر ۲۹ر دسمبر کی صبح کو ٹھیک ۹ بجے قیصر باغ کی خوشنما بارہ دری میں منعقد ہوئی۔ بارہ دری مذکور کی آرایش کا اہتمام کارکنانِ آل انڈیا مسلم لیگ و عالی جناب سر راجہ صاحب محمود آباد کے اسٹاف کی نگرانی میں تھا اور اگرچہ اس سبب سے کہ لیگ کا سالانہ جلسہ ایک روز بعد سے شروع ہونے والا تھا تمام انتظامات مکمل نہ ہوے تھے، تاہم بارہ دری کی محرابوں اور ستونوں پر رنگین کاغذ کی پھول پتیاں جس خوش سلیقگی کے ساتھ لگائی گئی تھیں اُن سے ایک خاص دل آویزی کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ بارہ دری کے وسطی کمرے میں جانبِ مغرب ایک بلند و وسیع پلیٹ فارم (چبوترہ) مقتدر اور نمایاں شرکاے جلسہ کے واسطے بنایا گیا تھا جس پر کوچیں اور گدے دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس چبوترے کی پشت پر ایک دوسرا چبوترہ خاص اُردو کانفرنس میں شریک ہونے والی خواتین کے لیے تیار کیا گیا تھا جہاں پردے کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ شاید اس سے پہلے کسی جلسے میں نہیں کیا گیا۔ اور اس حُسنِ انتظام کے تمام تر ذمہ دار ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ وہ چیز جسے ہم "مادری زبان" کے پیارے نام سے موسوم کرتے ہوں، اُس وقت تک پوری طرح ترقی پذیر نہیں ہو سکتی جب تک خود ہماری 'ماؤں' کو اس تحریک میں پوری دلچسپی نہ ہو۔ اسی خیال کی بنا پر ہم نے اس بات کا خاص اہتمام کیا تھا کہ طبقۂ ذکور کے ساتھ ساتھ طبقۂ اناث کی نمایندگی سے بھی اس جلسے کو بہرۂ وافر حاصل رہے۔ اور اگرچہ خواتین کے پاس ہماری دعوت کسی قدر دیر میں پہونچی اور ایک حد تک اُسے لکھنؤ ہی کی خواتین تک محدود رکھنا پڑا تاہم لکھنؤ اور مضافاتِ لکھنؤ کی تقریباً

پچیس تیس خواتین اُردو کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک رہیں۔

۸ بجے سے بارہ دری میں مجمع ہونے لگا اور ۹ بجے سے پہلے پہلے وسطی کمرہ اور ڈیس کی سب کرسیاں پُر ہوگئی تھیں۔ ٹھیک ۹ بجے جناب نواب سید نصیر حسین صاحب خیال رئیس پٹنہ رونق افروز ہوے اور پُر جوش نعرہاے آفریں کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ جلسے میں ہر صوبے کے معزز اصحاب شریک تھے جن میں سے خاص خاص اصحاب کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

عالی جناب سر راجہ صاحب جہانگیر آباد۔ آنریبل مسٹر محمد علی جناح۔ آنریبل مسٹر مظہر الحق۔ سید نبی اللہ صاحب۔ آنریبل مسٹر یعقوب حسن سیٹھ۔ صفی الدولہ نواب علی حسن خاں صاحب۔ شیخ شاہد حسین صاحب۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب۔ مسٹر مارگولیتھ (جو یورپ کے مشہور عالم ہیں اور آج کل ہندوستان کی سیاحت کر رہے ہیں) آنریبل نواب نواب علی چودھری صاحب۔ نواب حاجی محمد شفیع خاں صاحب۔ آنریبل میاں فضل حسین صاحب۔ نواب سلطان علی خاں صاحب۔ منشی احتشام علی صاحب۔ آنریبل مسٹر فضل الحق۔ مولانا آزاد سُبحانی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب۔ مسٹر ممتاز حسین۔ حاجی موسیٰ خاں صاحب۔ نواب فتح علی خاں صاحب قزلباش۔ سید حبیب اللہ صاحب۔ مسز نائڈو (انگریزی زبان کی مشہور شاعرہ) وغیرہ۔

سب سے پہلے عالی جناب نواب ذو القدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا صدر مجلس استقبالیہ نے ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر صدارت پڑھی جس کے مطبوعہ نسخے تمام حاضرین کو تقسیم کر دیے گئے تھے۔ اس خطبے میں خیر مقدم اور بعض رسمی تذکروں کے علاوہ مختصراً اُن متعدد مباحث پر ایک سرسری بحث کی گئی تھی جو زبان اُردو کی توسیع و ترقی کے لیے تمام اہل مُلک کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہ صدارتی خطبہ ایسی سلیس و فصیح عبارت میں لکھا گیا تھا کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ مصنف خطبہ نے ادب اُردو کا ایک نہایت ہی پاکیزہ نمونہ پیش کیا ہے جو محض اپنی ادبی خوبیوں کی بنا پر اس قابل ہے کہ تمام اُردو خواں اصحاب اس سے لطف اندوز ہوں۔ کچھ جلدیں اس مطبوعہ خطبے کی تقسیم سے بچ رہی تھیں جو ۲؍ کے ٹکٹ بھیجنے پر دفتر اشاعت انجمن ترقی اُردو لکھنؤ سے منگائی جا سکتی ہیں۔

نواب ذو القدر جنگ بہادر کی تقریر کے خاتمہ پر سید نبی اللہ صاحب ایم اے ایل ایل ایم بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے ایک مختصر تقریر میں تحریکِ صدارت کی اور لکھنؤ کے مشہور شاعر مولانا سید علی نقی صاحب صفیؔ نے حسبِ ذیل شعر میں جو فی البدیہ موزوں کیا گیا تھا اس تحریک کی تائید کی۔

صفیؔ کل ہمزبانوں سے یہی امید کرتا ہوں تہِ دل سے میں اس تحریک کی تائید کرتا ہوں

جس کے بعد نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ نے جن کی صدارت کا پہلے سے اعلان ہو چکا تھا کرسیِ صدارت کو زینت بخشی اور ایک مختصر تقریر میں اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر کے اپنا صدارتی خطبہ پڑھنا شروع فرمایا۔ یہ خطبہ نہایت طولانی ہے اور زبان اردو کی قدیم تاریخ کے متعلق قیمتی معلومات کا اسے ایک قابلِ قدر ذخیرہ اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ اس خطبے میں چھاپے کی بے انتہا غلطیاں تھیں اور اسی وجہ سے اس کی اشاعت بہت محدود رکھی گئی۔ تاہم نواب صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ جلد اُسے بعد کامل تصحیح شائع فرمائیں گے۔ کیونکہ حقیقت میں یہ کوئی رسمی خطبہ نہیں ہے بلکہ زبانِ اردو کی ایک مستقل تاریخ اگر اسے کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ خطبہ کی طوالت۔ اپنی صحت کی خرابی۔ اور سب سے بڑھ کر وقت کی تنگی کے باعث نواب صاحب موصوف چند صفحات سے زیادہ نہیں پڑھ سکے۔ لیکن چونکہ مطبوعہ نسخے اکثر اصحاب کو دے دیے گئے تھے اس وجہ سے یقین ہے کہ جن اصحاب نے اس خطبہ کو بالاستیعاب پڑھا ہوگا وہ بہت محظوظ ہوے ہوں گے۔

خطبۂ صدارت کے بعد ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کا حسبِ ذیل تار پڑھ کر سنایا گیا جو اُنھوں نے اردو کانفرنس کے صدر نشین کے نام روانہ فرمایا تھا:۔

(مضمونِ تار)

"اردو کانفرنس کے اغراض و مقاصد نہایت قابلِ تحسین ہیں اور مجھے اس میں شبہہ نہیں کہ آپ کی (یعنی صدرِ جلسہ کی) رہنمائی میں جو کارروائی اُن کو کامیاب بنانے کے متعلق کی جائے گی وہ بہت پسند کی جائے گی۔ میں کانفرنس کی کامیابی کا بدل خواہاں ہوں۔"

اس کے بعد حسبِ ذیل تجاویز منجانب صدر پیش ہوئیں جو باتفاق آرا و کمال جوش منظور ہوئیں

(الف) یہ کانفرنس سید علی محمد عارف یادگار جناب انیس مرحوم، اور مشہور محب وطن پنڈت بشن نرائن در المتخلص بہ آبر اور نواب سید محمد صاحب آزاد رئیس کلکتہ اور آنریبل منشی پراگ نرائن بھارگو رائے بہادر کی وفات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے کہ بزرگان موصوف قوم کے مایۂ فخر اور زبان اردو کے محسن و سرپرست تھے۔

(ب) یہ کانفرنس اس بیش قرار عطیہ کا کمال احسان مندی کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہے جو حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی علم پرور اور دریا دل سرکار نے پانچ ہزار روپے سالانہ کی صورت میں انجمن ترقی اردو کو دینا منظور فرمایا ہے۔ اس برمحل امداد نے درحقیقت انجمن کی بنیادیں مستحکم کر دیں اور کام کرنے والوں کی ہمت اور حوصلے بڑھا دیے ہیں۔

(ج) ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ خلد اللہ آثارہا کے ان احسانات عظیم کا جو ممدوحہ نے اردو و علم ادب اور خاص کر انجمن ترقی اردو پر کیے ہیں، اعتراف کرنا یہ کانفرنس اپنا فرض سمجھتی ہے علاوہ اور گراں قدر عطیوں کے سرکار عالیہ نے ایک معقول سالانہ رقم حال میں انجمن ترقی اردو کے واسطے عطا کی ہے جس کا یہ جلسہ شکریہ ادا کرتا ہے اور اس ضمن میں جناب ممدوحہ کی تصانیف اردو پر جو حضور کی علمی ذوق کی سب سے نمایاں دلیل ہے نہایت مسرت کے ساتھ خراج تحسین پیش کرنے کی جرأت کرتی ہے۔

بعد ازاں مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے مختصراً انجمن ترقی اردو کی گذشتہ کیفیتوں۔ موجودہ کارروائیوں۔ اور پیش نظر تجویزوں پر تقریر کرکے شرکائے کانفرنس کو انجمن کے اغراض و مقاصد پر توجہ دلائی اور اس کی تنگی حیثیت کو اپنے نہایت موثر لفظوں میں بیان کرکے کہ "چندہ مانگنے والا دنیا میں سب سے برا سمجھا جاتا ہے لہذا میں چندہ نہیں مانگنا چاہتا" اپنی تقریر کو ختم فرمایا۔

پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک نہایت ہی فصیح۔ مدلل اور پر اثر تقریر فرما کر حسب ذیل تجویز جلسہ کے سامنے پیش کی:۔

اس جلسے کی رائے میں نہایت ضروری ہے کہ زبان اردو کا ایک مرکزی کتب خانہ وسیع پیمانے پر بنایا جائے اور اس کے قائم کرنے کے لیے کم سے کم دس ہزار روپیہ نقد اور مصارف دائمی کے واسطے معقول سالانہ

رقم کا انتظام کیا جائے۔ یہ کام ایک منتخب جماعت کے سپرد ہو جو اس وقت سے سرمایہ کی فراہمی اور پھر کسی مناسب مقام پر کتب خانہ قائم کرے۔"

اس تجویز کی تائید مختصراً مولانا آزاد سبحانی صاحب، پروفیسر مرزا محمد ہادی بی اے رُسوا اور خواجہ امیر احمد صاحب انصاری نے فرمائی اور تحریک باتفاق رائے منظور ہوئی۔

اس دوران میں چونکہ گیارہ بج چکے تھے اور کانگریس کے آخری جلسہ کی شرکت کے واسطے حاضرین جلسہ میں سے بعض اصحاب اُٹھنے لگے تھے لہذا مزید کارروائی ملتوی رکھی گئی اور جلاس اول ختم کرکے اعلان کر دیا گیا کہ اجلاس ثانی دوسرے دن شام کو ۶ بجے سے ہوگا۔

دوسرا اجلاس

حسب قرارداد روز اول دوسرا اجلاس ٹھیک ۶ بجے شروع کر دیا گیا۔ اس مجلس میں اگرچہ بعض وہ اصحاب شریک نہیں تھے جو پہلے دن رونق افروز ہوئے تھے لیکن مجمع پہلے دن سے بھی زیادہ تھا۔ اور ہندو اصحاب کی تعداد اس مجمع میں یقیناً بڑھ گئی تھی۔ جناب نواب نصیر حسین صاحب کو تشریف لانے میں چونکہ کسی قدر توقف ہوا اس وجہ سے جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب کی صدارت میں کارروائی جلسہ شروع ہو گئی۔ مگر دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ نواب صاحب تشریف لے آئے اور اُنکی صدارت میں بقیہ کارروائی ہوتی رہی۔

پہلے انجمن ترقی اُردو کی شاخ بمبئی کے نمائندے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب نے ایک تقریر کے ذریعے سے مندرجہ ذیل تحریک جلسے کے سامنے پیش کی:-

"اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس زور دیتا ہے کہ شہر احمد آباد کی جماعت تعلیم المعلمین اُردو (اُردو ٹریننگ کلاس) جو بمبئی گورنمنٹ نے تین سال سے بطور آزمائش جاری کی ہے آئندہ بہت جلد مستقل کر دی جائے۔"

جس کی تائید جناب حاجی ریاض الدین صاحب نے فرمائی اور اپنی تقریر کے دوران میں حاجی صاحب نے مختصراً اُن کوششوں کا بھی حوالہ دیا جو صوبۂ بمبئی میں اشاعتِ اُردو کے متعلق ہو رہی ہیں۔

اب جناب پروفیسر گھوشال صاحب ایم اے نے "ترقیِ زبان بذریعہ تراجم" پر اپنا قابل قدر

مضمون پڑھنا شروع کیا۔ جس میں ہمارے اسلاف کی علمی کوششوں کا ایسی فیاضی کے ساتھ اعتراف کیا گیا تھا کہ ہر طرف سے بنگالی مقرر کی انصاف پسندی اور رواداری پر تحسین و آفرین کی بارش ہو رہی تھی اور تمام اصحاب حتیٰ کہ ہمارے محترم آنریبل مسٹر مظہر الحق بھی اس بات پر سخت متحیر تھے کہ ایک بنگالی نژاد شخص کیسے ایسی سلاست اور لہجے کی ملائمت کے ساتھ ایسا عالمانہ مضمون اُردو میں پڑھ سکتا ہے اور اسلامی علوم اور مسلمانوں کی بینظیر علمی خدمات پر اس درجہ کیسے حاوی ہو سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عموماً اس مضمون کو پڑھ کر اور خصوصاً پروفیسر صاحب کی زبان سے سن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی غیر مسلم یا بنگالی شخص کا لکھا ہوا ہے۔ مسٹر گھوشال ریاست بھوپال کے متوطین میں سے ہیں اور اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے علوم سے اُنھیں پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مضمون کی عبارت اور طرز ادا پر اُن کے مذہب و وطن کا کوئی اثر نمایاں نہ تھا۔ صاحب صدر جلسہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس مضمون کو وہ اپنے صرف سے طبع کرا دیں گے۔

اس مضمون کے خاتمے پر خواجہ امیر احمد صاحب انصاری نے ایک پُر زور اور مدلل تقریر کر کے حسب ذیل تحریک جلسے کے سامنے پیش کی۔

> "چونکہ اس صوبے کی یونیورسٹی میں اہل مُلک اور گورنمنٹ کی بار بار سفارش کے باوجود ابھی تک ان صوبجات کی زبان کو کالج کے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے، لہذا یہ جلسہ گورنمنٹ اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے باصرار درخواست کرتا ہے کہ کالج کے نصاب میں اُردو کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔"

تحریک مندرجہ بالا کی تائید جناب پروفیسر مرزا احمد ہادی صاحب بی اے المتخلص بہ رسوا نے نہایت دلچسپ تقریر کے ذریعے سے فرمائی۔ جس میں اُنھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یونیورسٹی کے امتحانات میں السنۂ مشرقیہ کے جو پرچے ہوتے ہیں اُن میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ ترجمے یا جواب مضمون انگریزی میں لکھے جائیں۔ اور چونکہ مشرقی ادب کو انگریزی لباس پہنانا دشوار بلکہ محال ہے (یہاں اُنھوں نے فارسی سے انگریزی ترجموں کی بعض

نہایت پُر لطف مثالیں بیان کیں جنھیں سُن کر لوگ خوب ہنسے) اس وجہ سے یونیورسٹی کی اس ہدایت کا نتیجہ اول تو یہ ہوتا ہے کہ مشرقی علم ادب میں ان طلبہ کو کوئی معقول دستگاہ نہیں ہونے پاتی۔ دوسرے ان کی ذہنی ترقی پر، بوجہ اس کے کہ اس ذریعہ سے سمجھ کر یاد کرنے کے بجائے رٹنے کی ضرورت زیادہ ہو جاتی ہے نہایت خراب اور مضر اثر پڑتا ہے۔ مرزا صاحب موصوف کی پہلے یہ خواہش تھی کہ کانفرنس کی طرف سے جو رزولیوشن پیش ہو وہ صرف اسی ایک پہلو پر یونیورسٹی کو توجہ دلائے۔ مگر خواجہ امیر احمد صاحب کا رزولیوشن چونکہ زیادہ جامع تھا اس لیے انھوں نے اسی کی تائید کے سلسلے میں اپنے خیالات کو بوضاحت ظاہر کرنے کے لیے موقع نکال لیا۔

ہاں یہ تو لکھنے سے رہ ہی گیا کہ دوسرے جلسہ کی کارروائی شروع ہونے کے بعد سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کا مندرجۂ ذیل تار پڑھ کر سنایا گیا جو موصوف نے اپنے بندی خانے واقعہ رانچی سے صدر اُردو کانفرنس کے نام بھیجا تھا۔

(مضمون تار)

میں تہِ دل سے اس پہلی آزاد مجلس کو مبارکباد کہتا ہوں جو قومی زبان کی ترقی کے لیے منعقد ہوئی ہے اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کے عزائم۔ رُجحان کار اور طریق عمل میں رفعت ودیعت فرمائے۔

مولانا عبدالحلیم صاحب شررؔ نے ایک بیش قیمت مضمون لکھا تھا جس کی سرخی تھی "ہندوؤں کا تعلق زبان اُردو سے" صاحب موصوف نے جلسہ میں تقسیم کرنے کی غرض سے اُس کو چھپوا بھی لیا تھا اب مولانا نے اپنا پُرمغز مضمون پڑھنا شروع کیا۔ مگر بوجہ اس کے کہ صاحبِ موصوف کی آواز اس سارے مجمع تک نہیں پہونچ سکتی تھی لوگوں کی خواہش ہوئی کہ مولانا کے بجائے کوئی دوسرے صاحب اسے پڑھیں۔ چنانچہ ہماری استدعا پر جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے اس خدمت کو انجام دیا۔ افسوس ہے کہ وقت کم تھا اور ابھی کئی تحریکات

باقی تھیں اس وجہ سے مضمون تمام وکمال نہیں پڑھا جا سکا۔ آیندہ ہم ناظرین الناظر کو اُسکے مطالب سے بتفصیل آگاہ کرسکیں گے۔

ختم مضمون پر ایک صاحب نے جو غالباً فرنگی محل کے مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ اعلان کیا کہ مشہور شاعر مولانا رضا فرنگی محلی نے اپنے دیوان کے پچاس نسخے انجمن ترقی اُردو کو عنایت فرمائے ہیں۔

اس کے بعد مولانا عبد الحلیم صاحب شررؔ نے ایک مختصر تقریر کے ذریعہ سے حسب ذیل رزولیوشن طلبہ کی منظوری کے لیے پیش کیا۔

> یہ کانفرنس اُردو انسائیکلوپیڈیا تیار کیے جانے کی اُس تحریک کو جو لکھنؤ کے بعض ذی علم حضرات نے شروع کی ہے، بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور تمام اہل وطن کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اس کارعظیم میں جہاں تک ممکن ہوسکے امداد کریں۔

مولانا نے اپنی مختصر تقریر کے دوران میں یہ بھی بیان فرمایا کہ راجہ صاحب محمودآباد نے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے واسطے ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور یہ خبر اُن کی زبان سے نکل کر اب عام طور پر اخبارات میں گشت کر رہی ہے۔ ذمہ دار اصحاب خصوصاً انسائیکلوپیڈیا کے (چیف ایڈیٹرس!!) مدیران خصوصی کو جن کے نام سے اخبارات میں اس کے متعلق اعلانات شایع ہوے ہیں اس کی تردید کرنا چاہیے تھی۔ کیونکہ راجہ صاحب ممدوح نے ہرگز اس قدر رقم دینے کا وعدہ نہیں فرمایا ہے۔ لیکن جس قوم کی ترقی کا عروج یہی ہو کہ ابلہ فریبیوں اور جھوٹی امیدوں پر سہارا کیے اُس کے لیے غالباً اس قسم کی طفل تسلیاں جائز سمجھی جاتی ہوں گی۔ اور اس وجہ سے شاید ہمارے لائق احباب جن کے واسطے بساطِ شبلی کی حاشیہ نشینی بس کرتی ہے غلط افواہوں کی اشاعت سے فائدہ اُٹھانے کو اس قدر بُرا نہ سمجھتے ہوں جتنا کہ ہم غلامان اسلام کے نزدیک یہ مذموم ہے —— بہرحال ہم اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر اس غلط افواہ کی تردید کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا آشر کے بعد سید سجاد حیدر صاحب (پرائیوٹ سکرٹری راجہ صاحب محمود آباد) اور سید سلیمان صاحب (جانشین علامہ شبلی) نے مختصراً اس رزولیوشن کی تائید فرمائی یہ رزولیوشن ختم ہوا تو جناب سید سجاد حیدر صاحب (یلدرم) نے حسب ذیل تحریک پیش کی

یہ کانفرنس ترقی واشاعت اُردو کے لیے نہایت ضروری سمجھتی ہے کہ بتدریج ہماری کتابیں اور اخبارات ٹائپ (سیسے کے حروف) میں چھاپے جائیں اور لوگوں کو ٹائپ سے مانوس کیا جائے۔

سید صاحب موصوف جو ماشاءاللہ تعلیم جدید کے خوش ترین ثمرات میں سے ہیں اور مغربی تہذیب و لوازم تہذیب کے بدل شیفتہ، پس اُن کی طرف سے اس قسم کی تجویز کا پیش ہونا چنداں مضائقہ نہ رکھتا تھا مگر ستم یہ ہوا کہ انجمن ترقی اُردو کے لائق سکرٹری بھی اُن کے ہم آہنگ ہوگئے جنھیں اب اُردو کتابوں کے چھپوانے کا تلخ تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ اور انھوں نے اُردو زبان کی اشاعت عام کے لیے اس کی ضرورت جتا کر اس تحریک کی تائید فرمائی۔ سید جالب صاحب ایڈیٹر ہمدم نے اُن تجربات کی بنا پر جو لیتھو پریس کے متعلق اُنھیں ایک اخبار نویس کی حیثیت میں اتنی مدت سے حاصل ہو رہے ہیں اور نیز اُن عملی دشواریوں کے سبب سے جن کا ہمدرد مرحوم کے سلسلہ میں اُن کو اور مسٹر محمد علی مالک ایڈیٹر ہمدم کو سامنا کرنا پڑا، اس تحریک کی مخالفت کی اور اس مخالفت کی تائید ایڈیٹر الناظر نے کی۔

یہ مسئلہ حقیقتاً اس قدر اہم اور اتنے پہلو رکھتا ہے کہ اس قسم کی کانفرنسوں میں اس کا پیش کرنا کچھ مفید نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں ضرورت ہے اُن لوگوں کی رایوں کی جنھوں نے سنگی چھاپہ اور ٹائپ کے چھاپوں کے متعلق کافی تجربات حاصل کیے اور اس مسئلہ پر بحیثیت ایک ماہر فن کے غور کیا ہو۔ جنھوں نے خط نستعلیق کے محاسن و معائب پر اور اُس ایک بدنما خط سے بدلنے کے مفاد و مضرت پر گہری نظر ڈالی ہو۔ جنھوں نے اُس اثر کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کی ہو جو مختلف قسم کے حروف کے مطالعہ سے انسان کی قوت باصرہ پر پڑتا ہے۔ اور جنھوں نے اس مسئلہ کی تحقیق پر اپنے وقتِ عزیز کا کوئی گران قدر حصہ صرف کیا ہو کہ ٹائپ کے رواج سے

اُن ملکوں کو کیا اقتصادی منافع حاصل ہوے جن میں اُردو کی ہم مشرب و ہم رنگ نے بانیں ایجاز اس تحریک پر بہت سے اصحاب بحث کرنے کو تیار تھے. مگر وقت کہاں تھا کہ کسی کی کچھ سُنی جاتی ۔ لہٰذا بالآخر یہ طے کیا گیا کہ سردست اس مسئلہ کو ملتوی کیا جائے اور کسی اور موقع یا جلسے پر اس کی بحث اُٹھائی جائے ۔

اس کے بعد سید جالب نے حسب ذیل تحریک پیش کی :۔

یہ جلسہ قرار دیتا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت میں زبان اُردو کی ترقی و تقویت کا کام تمام فرقہاے آبادی کی اعانت سے سرانجام دینے کے قابل بنانے کے لیے انجمن ترقی اُردو کو جس پیمانہ تک وسعت دینے کی ضرورت ہے اُس کی تدابیر سوچنے اور عمل میں لانے کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی مامور کی جائے اور اُس کو حسب ضرورت اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا اختیار دیا جائے ؛ ۔نواب نصیر حسین صاحب خیال ۔ مولانا عبدالحلیم صاحب شرر ۔ پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے مسٹر ظفر الملک ایڈیٹر الناظر ۔ شمس العلما خان بہادر مولوی محمد یوسف جعفری رنجور ہیڈ مولوی ۔ پریذیڈنسی کالج آف انگریزی کلکتہ ۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ۔ سید سجاد حیدر صاحب ۔ مسٹر دیا نرائن نگم ۔ سید جالب دہلوی ۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی اے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب ۔ سید ہاشمی صاحب ۔ مسٹر آصف علی صاحب بیرسٹر ۔ پنڈت برج نرائن چکبست ۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی ۔ مسٹر محمد الدین خلیقی دہلوی

پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی نے اس کی تائید کرتے ہوے یہ صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ہندوؤں سے اس بات کی توقع رکھنا نامناسب ہوگا کہ وہ انجمن ترقی اُردو میں اُس وقت تک پوری دلچسپی ظاہر کریں گے جب تک کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کا ایک شعبہ بنی ہوئی ہے اور ہندوؤں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے ۔ کیونکہ مسلمانوں سے کون توقع رکھتا ہے کہ وہ ہندو سبھا

کے کسی شعبے میں کبھی کوئی دلچسپی لے سکیں گے۔

یہ تحریک بہ اتفاق رائے منظور ہوئی۔ اور وہیں یہ بھی طے پا گیا کہ پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی اس کمیٹی کے سکرٹری مقرر ہوں۔

اس موقع پر کلکتہ کے ایک بزرگ نے جن کا نام نامی غالباً ملا صالح داؤد ہے اہل کلکتہ کی طرف سے کانفرنس کو آئندہ سال کلکتہ میں اجلاس کرنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد جناب مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے صاحب صدر جلسہ اور دیگر مہمانان کانفرنس کا شکریہ مناسب الفاظ میں ادا کیا اور جناب صدر نے آخری الفاظ میں یہ توقع ظاہر کی کہ آئندہ سال جب پھر اُردو کانفرنس کا انعقاد ہوگا تو ہم اس وقت سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

اب کہ ۹ ½ بج چکے تھے صاحب صدر نے جلسہ کو برخاست کیا۔ اُس کے بعد بعض اصحاب کی خواہش کی بنا پر تحریک کی گئی کہ بزم مشاعرہ قائم ہو۔ چنانچہ بہ اتفاق مرزا محمد ہادی صاحب رسوا اُس جلسہ کے صدر منتخب ہوے۔ بزم مشاعرہ میں سب سے پہلے مولانا صفی نے اپنی وہ نظم سُنائی جو فی الحقیقت اُنھوں نے اُردو کانفرنس میں پڑھنے کے لیے لکھی تھی جس کا موقع منتظمین کانفرنس دَوران اجلاس میں نہ دے سکے۔ اُسکے بعد مسٹر ظفر علی آزاد نے جن کی بیگم صاحبہ رسالہ پیام اُمید نکال رہی ہیں اپنی نظم 'برق' کے چند بند سنائے۔ چونکہ رات زیادہ آگئی تھی اور لوگ کھانا کھا کر نہیں آئے تھے۔ اس لیے بزم مشاعرہ جلد ختم کر دی گئی۔

الناظر کی اشاعت میں اس دفعہ پھر غیر معمولی تعویق ہوئی۔ اول تو اس سبب سے کہ ۳۱ دسمبر تک جلسوں سے فراغت نہ ملی اور اُردو کانفرنس کی روداد سے ناظرین الناظر کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ جنوری کا پہلا ہفتہ تو اس سبب سے ٹلا۔ اُس کے بعد یہ یاد آیا کہ دسمبر میں ڈاک خانہ سے رجسٹری کی تجدید ہونا چاہیے تھی جو کانفرنس کی مصروفیتوں میں نظرانداز ہو گئی۔ اس سے آٹھ دن کی اور دیر ہوئی۔ پھر بھی ہم پوسٹ ماسٹر جنرل صاحب صوبۂ متحدہ کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے باوجود میعاد گزر جانے کے حاکم ضلع کی تحریر کے بغیر (جو پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کی رو سے اب لازمی ہے) الناظر کی رجسٹری کر لی۔ ورنہ الناظر کی اشاعت میں اس سے زیادہ تعویق ہو جاتی۔ بہرحال اب تو امید ہے کہ فروری سے الناظر حسب سابق کے وقت کی پوری پابندی سے شائع ہو سکے گا۔

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم خانشل در یونیو سکرٹری دولت آصفیہ اُن چند عالی دماغ لوگوں میں بھی غالباً دِقت نظر اور فلسفیانہ استدلال کے لحاظ سے ممتاز ہیں جو غدر کے بعد مسلمانان ہند کی علمی دنیا کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ایک یورپین عالم دین یورنڈ ملکم میکال نے بڑے شد و مد کے ساتھ دعوے کیا تھا کہ "مذہب اسلام مانع ترقی ہے۔ مولوی چراغ علی نے اُسکے اعتراضات کی تردید میں قرآن [illegible] احادیث نبوی اور فقہ و تاریخ کے روسے نہایت عالمانہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام روحانی اخلاقی اور دماغی ترقی کا حامی، تغیرات زمانہ کے ساتھ نئے تمدن و سیاست کا ساتھ دینے والا۔ اور ضروریات کے مطابق ہر قسم کے قوانین کی بنیاد ڈالنے کی صلاحیت رکھنے والا مذہب ہے اور اسکی فطرت جمود و خمود کے منافی ہے۔ اسی ضمن میں دوسرے بہت سے یورپین مصنفین کی غلط بیانیوں کی اصلاح مشرقی اور مغربی حوالوں سے کی گئی ہے اور صدہا اسلامی مسائل متعلق بہ معاشرت و سیاست پر عالمانہ و مجتہدانہ بحث کیگئی ہے۔ مسلمانوں کے لیے اعظم الکلام کا مطالعہ دینی اور دنیاوی ترقیوں کے لحاظ سے بہت ضروری ہے کہ اسکے بغور دیکھنے سے اُنکے خیالات اور جذبات میں جوش اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ سلاست کے لیے مولوی عبدالحق صاحب کا نام نامی کافی ہے۔ جنھوں نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور اُسپر ایک عالمانہ مقدمہ اضافہ کیا ہے۔ قیمت ہر دو حصہ تین روپے (ﷺ)

ابن مسلم

مسٹر سلطان حیدر جوش (علیگ) کے اس لاجواب ناول پر رسالہ اسوۂ حسنہ میرٹھ میں جو ریویو شایع ہوا ہے اُسکے اقتباسات ذیل بہترین سفارش ہیں:۔ "ہماری نظروں سے اب تک کوئی ناول ایسا نہیں گزرا جو ابن مسلم کی طرح اپنی مختلف النوع اثر اندازیوں سے ہمارے دل و دماغ کو اس قدر متاثر و محظوظ کرتا۔ زبان کی لطافت و نظافت، طرز بیان و استدلال کی خوش اسلوبی، خیالات کی بلند پروازی و پاکیزگی، واقعات و مکالمات نگاری میں جذبات انسانی اور قوانین فطرت کی پابندی، حسن قدرت کے مناظر کی دلآویز نقاشی، تسلسل قصہ کی غیر معمولی اور صبر آزما دلچسپی۔ فلسفیانہ حقائق اور مسائل سماجی کی برمحل اور مناسب وقت توضیح، علمی اور اصلاحی اشارات کی دزدیدہ نظری، انقلابات ایام کی سبق آموزی عبرت انگیزی اور سب سے بڑھکر ناول کے ہیرو سلمان ہیرو اور اُسکی پاکباز و شریف النفس محبوبہ کے بینظیر کیرکٹر کی دلربائی، اس قسم کی بہت سی کششوں کا ایک ہی وقت میں کسی سلیم المذاق اور نکتہ رس طبیعت کی توجہ واحد کو اپنی اپنی طرف کھینچنا ابن مسلم کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اسکے لیے حواس خمسہ ظاہری و باطنی کو ہمہ تن وقف کر دینا ہوتا ہے اور پھر بھی ایک ایک مضمون کو دو دو تین تین دفعہ پڑھے بغیر چین نہیں پڑتا۔" ایک جلد ضرور منگائیے قیمت ۱۲؍

مطبوعات الناظر پریس

قواعد اردو	۸ر	جمیل و شبینہ (کہانی)	۳ر
محاربات صلیبی	۸ر	سیگفرن ولوسی (")	۴ر
تسخیر فرانس	۸ر	مصنوعی شہزادی (")	۲ر
الاحسان	۸ر	اتفاقات زمانہ (کہانی)	ار
میلاد ابن جوزی	۴ر	دشوکیہ (")	ار
حیات نظامی	۴ر	ایک نادان خدا پرست (کہانی)	ار

تذکرۂ گلشن ہند

میرزا علی لطف نے اب سے ایک سو پندرہ برس پیشتر ایک تذکرہ اُسوقت تک کے اُن اُردو شعرا کا لکھا تھا جن کے حالات اور کلام سے اُنکو واقفیت حاصل ہو سکی اور جن کے کلام کا اس تذکرہ کے سوا کوئی ماخذ نہیں معلوم ہوتا اُس زمانہ میں ڈاک و ریل کی یہ آسانیاں نہیں تھیں اس وجہ سے تحقیقات و تلاش میں جو دشواریاں اُٹھانی پڑتی ہونگی اُس کا صحیح اندازہ مشکل ہے تاہم اُسکی قدر کرنا چاہیے - یہ تذکرہ ناپید تھا اور محض اتفاق سے مولوی شبلی صاحب کے ہاتھ آگیا جنھوں نے اُسکی تصحیح و تحشی کر کے مولانا عبدالحق صاحب بی اے (موجودہ سکرٹری انجمن ترقی اُردو) سے ایک دلچسپ مقدمہ لکھوا کر اسے شایع کرا دیا - قیمت عہ

کلیات اکبر الہ آبادی

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی کا پہلا دیوان تو اب جب تک دوبارہ نہ چھپے نہیں مل سکتا یہ حصۂ دوم البتہ ابھی مل جاتا ہے۔ لہذا جن صاحب کو اس باکمال شاعر کے کلام سے اپنے کتب خانوں کی زینت افزائی کرنا ہو وہ فوراً منگالیں۔ قیمت عہ

مکمل دیوان حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی کا پہلا دیوان چھپ کر شایع ہو چکا ہے اب پہلا اور دوسرا دیوان ملا کر (معہ ایک ضمیمہ کے جس میں اُن کا ابتدائی کلام ہے) شایع کیا گیا ہے۔ شائقین اور قدردان حسرت فوراً منگالیں۔ بلکہ جو خاص ہمدرد ہوں اُنھیں زیادہ تعداد میں خرید کر یہ کوشش حسرت ہانی کی موجودہ مصیبتوں میں اعانت کرنا چاہیے۔ قیمت ۱۲ر

جمیلہ کی ناکامیابی

یہ بینظیر ناول، جس کے متعلق مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی ایڈیٹر اردوے معلی جیسے نقاد سخن کی یہ رائے ہو کہ "اُردو زبان میں اس سے بہتر کوئی ناول نہیں لکھا گیا" افسوس کہ علحدہ نہیں چھپا - البتہ رسالۂ معلومات لکھنؤ جس میں یہ چھپا تھا، اُسکے ۵ پرچوں کی مکمل جلد مل سکتی ہے جن میں اس پورے ناول کے علاوہ بہت سے بیش قیمت علمی و ادبی مضامین بھی ہیں لیکن یہ جلدیں بھی تھوڑی ہی رہ گئی ہیں اس لیے شائقین فوراً طلب کریں - قیمت عہ مجلد عہ

ہاجرہ کی کامیابی

جس کے ابتدائی اجزا رسالۂ الناظر میں شایع ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکے ہیں - یہ دلچسپ ناول کتابی صورت میں موجود ہے - اور اگرچہ پہلے ۱۱ر فی جلد فروخت ہوتا تھا مگر اب اس خیال سے کہ جلد دوسرا ایڈیشن چھپوایا جاسکے صرف ۸ر میں دیا جائیگا۔

ولایتی پرستان

انگلستان کے جادو نگار ناول نویس رینالڈز کی مسٹریز آف لندن (لندن کے اسرار) کا ترجمہ جس میں حسن و عشق کی نیرنگیوں، رازونیاز کی باتوں بوالہوس امیروں کی پرلطف چالبازیوں، دغا و فریب کاریوں اور جعلسازیوں کے عبرت خیز مرقع اور خفیہ رازوں کے حیرت انگیز اور پر اسرار واقعات کا ہولناک نظارہ - غرضکہ ہر باب دیکھنے کے لایق ہے - اسی کتاب کی بدولت مشہور ہے کہ رینالڈز کا نام انگلستان کی اعلیٰ سوسائٹی میں کسی کے منہ سے نکل جاتا تو اُسے سخت حقارت کا سامنا ہوتا حالانکہ حورتیں اور مقدسین کلیسا میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو راتوں کو بستر خواب پر چھپا کر اس کتاب کے تمام وکمال مطالعہ کے بغیر رہ سکتا - مقبولیت عام اسی کو کہتے ہیں - قیمت حصہ اول عہ جزو عہ حصہ دوم ۱۲ر باقی اجزا زیر طبع ہیں-

تصانیف پروفیسر شہباز مرحوم

- کلیات نظیر اکبرآبادی — ۱۲ر
- زندگانی بے نظیر — ۱۲ر

تصانیف مولوی عبداللہ العمادی

- کتاب المعارف — ۱۲ر
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر

تصانیف مولوی ابوالحسن فریدآبادی مرحوم

- معلم السیاست — ۱۲ر
- تاریخ مصر جدید — ۱۲ر

تصانیف حافظ عبدالرحمن امرتسری مرحوم

- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ۱۲ر
- الصدیق — عہ
- المرتضیٰ — عہ
- سیاحت ہند — ۸ر

تصانیف مولوی حامد علی صدیقی

- تاریخ اندلس — ۱۲ر
- اقصائے مغرب — ۱۲ر

تصانیف منشی دیبی پرشاد دلشاد

- نفائس التواریخ — ۶ر
- تذکرہ آثار الشعرائے ہنود — عہ

تصانیف مولوی رشید احمد انصاری

- تحریر الامراۃ — عہ
- المدنیۃ دار السلام — ۱۲ر

تصانیف حکیم محمد علیخاں اڈیٹر مرقع عالم

- عبرت ہر سہ حصہ — ۱ہ
- حسن سرور ” — ۱ہ
- دیول دیوی — عہ
- گورا — ۱۲ر
- نیل کا سانپ — ۱۲ر
- جعفر و عباسہ — ۱۲ر
- اختر و حسینہ ہر دو حصہ — ۱۲ر
- مسیحائے عالم — ۸ر

تصانیف مولوی عزیز مرزا مرحوم

- خیالات عزیز — عہ
- وکرم اروسی — عہ

تصانیف مولوی ظفر علیخاں اڈیٹر زمیندار

- جنگل میں منگل — ۱۲ر
- سیر ظلمات — عہ
- ترانۂ ظفر — ۱۲ر
- معاشرت — ۶ر
- ڈراما جنگ روس و جاپان — عہ
- فلسفۂ ابن سینا — ۱۲ر
- اپریل فول — ۱۲ر

تصانیف مولوی مصباح الدین احمد

- انہار دین — عہ
- معارکہ فرانس و پرشیا — ۱۲ر
- مصباح الادب — ۸ر

تصانیف مفتی انوارالحق ایم اے

- تاریخ ابوالبشر — ۱ہ
- اثبات واجب الوجود — عہ
- قوت خیال — ۱۲ر
- اصول خانہ داری ۲ حصے — ۱۲ر

تصانیف مولوی محمد رفیع موہانی

- دستار و کلاہ — ۸ر
- گنج شائگاں (۲ حصے) — ۱۲ر
- تاج و نشان (”) — ۱۲ر

تصانیف جناب شفیق عماد پوری

- تحقیق سخن — ۸ر
- غنچۂ نوبہار — ۶ر
- کنز المعانی — ۲ر
- حدیقۂ آخرت — ۴ر
- آئینۂ پیغمبر — ۱ر
- ثمرۂ عقیدت — ۲ر
- ریاض شفیق — ۸ر

تصانیف مولوی عبدالحی وکیل

- تذکرۃ الصلحا — ۴ر
- خیر الکلام فی حال العرب و الاسلام — عہ

تصانیف سید محمد ابراہیم عجمی

- جاپان — ۴ر
- جنگ روس و جاپان — ۸ر

تصانیف مولانا محب حسین

- گلزار معرفت — ۱ہ
- مسدس توحید — ۲ر
- عالم آخرت — ۲ر
- عالم خیال — ۲ر
- میرا پہلا جرم — صہ
- دیوان محب — عہ
- جذبات محب — ۱۲ر

تصانیف مہاشے پرکاش دیوجی

- سوانحعمری حضرت محمد صلعم — ۸ر
- برہمو دیوجی کی سوانحعمری — ۱۲ر
- بچوں کیلئے مفید اور نصیحت آمیز کہانیاں — ۱۲ر
- سیرت المستورات — ۱۲ر

تصانیف منشی غلام قادر فصیح

- عمر یا شاہ ۲ جلد — ۱۲ر
- شیر میسور (ڈراما) — ۸ر
- وطن پر قربانی — ۸ر
- خوشحال ہندوستان — صہ
- ہندوستان کی کہانی — ۱۲ر

تصانیف مولوی محمد ظفر عالم ابروی

- وکیل نسواں — ۸ر
- حیات النذیر — ۱ہ

تصانیف مولوی معین الدین شاہجہانپوری

- اورنگ زیب — ۱۲ر
- بدمزاج شوہر — ۱ر
- رانا کہ سنگھ — ۱ر

الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ

تصانیف مولوی عبدالرزاق کانپوری — نظام الملک طوسی — صہ — البرامکہ — ۱ہ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

تصانیف جناب امیر مینائی مرحوم

- صنم خانۂ عشق — ۱۲ر
- مراۃ الغیب — ۱۰ر
- خیابان آفرینش — ۱۲ر
- خطوط منشی امیر احمد — ۱۲ر

تصانیف منشی رجب علی بیگ سرور

- فسانۂ عجائب جلی قلم وضخ — ۹ر
- الف لیلہ — ۱۲ر
- گلزار سرور — ۸ر
- انشاے سرور — ۶ر

تصانیف مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی

- جنید بغدادی — عہ
- ابو بکر شبلی — عہ
- عصر قدیم
- حروب صلیبیہ
- تاریخ بغداد
- تاریخ سندھ (۲ جلد)
- ملکۂ زنوبیہ
- الحکم الرفاعیہ
- آغائی صاحب
- سکینہ بنت حسین
- مخدرات
- زوال بغداد
- غیب دانی دولھن
- حسن بن صباح
- افسانۂ قیس

- مقدس نازنین — ۸ر
- قیس و لبنیٰ — ۱۲ر
- ایام عرب — ۱۲ر
- فردوس بریں — ۸ر
- حسن انجلینا — ۸ر
- منصور موہنا — ۸ر
- دلکش — ۸ر
- میوۂ تلخ — ۴ر
- ماہ ملک — ۱۲ر
- شوقین ملکہ — ۱۲ر
- ملک العزیز ورجنا — ۱۲ر
- رومتہ الکبریٰ — ۱۲ر
- فلورا فلورنڈا — ۱۲ر
- فتح اندلس — ۱۲ر
- یوسف و نجمہ — ۱۲ر
- آغا صادق کی شادی — ۱۰ر
- بدر النسا کی مصیبت — ۱۲ر
- حسن کا ڈاکو (۲ حصے) — ۱۲ر
- دربار حرام پور کے اسرار حصہ ۲ — ۵ر
- خوفناک محبت — ۵ر
- الفانسو — ۱۲ر

تصانیف مرزا محمد ہادی بی اے رسوا

- امراؤ جان ادا — ۱۲ر
- شریف زادہ — ۱۲ر
- ذات شریف — عہ
- مرقع لیلیٰ مجنوں — ۶ر

تصانیف منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ

- احمق الذین — ۸ر
- حاجی بغلول — ۱۵ر
- پیاری دنیا — ۴ر
- طرحدار لونڈی — ۸ر
- طلسمی فانوس — ۱۲ر
- میٹھی چھری — ۴ر
- کایا پلٹ — ۶ر

تصانیف پنڈت رتن ناتھ سرشار

- ہشو — ۲ر
- بچھڑی ہوئی دولھن — ۱۰ر
- کڑم دھم — ۸ر
- پی کہاں — ۸ر
- طوفان بے تمیزی — ۱۲ر
- کامنی — ۱۲ر
- جام سرشار — عہ
- سیر کہسار — عہ
- خدائی فوجدار — ۱۲ر
- فسانۂ آزاد — عہ

تصانیف شوق قدوائی لکھنوی

- ترانۂ شوق — ۶ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- عالم خیال (۲ نظمیں) — ۲ر
- بیگم نسا و لوسی — ۴ر
- جمیل (ڈراما) — ۴ر

تصانیف جلال لکھنوی

- رسالۂ تذکیر و تانیث — ۱۰ر
- دیوان جلال (چہارم) — ۱۲ر

تصانیف منشی جوالا پرشاد برق بی اے

- مرزا لنی — ۱۰ر
- مار آستین — ۱۲ر
- بنگالی دولھن — ۶ر
- پرتاب — ۶ر
- معشوقۂ فرنگ — ۶ر
- بروگ — ۴ر
- آتھیلو — ۵ر
- روہنی — ۸ر

تصانیف منشی احمد علی بی اے

- شباب لکھنؤ مجلد — ۸ر
- حرماں نصیب — ۱۲ر
- مرقع اودھ — ۶ر

تصانیف منشی محمد لطیف بی اے

- اکبر — عہ
- اورنگ زیب — عہ

تصانیف شیخ احمد علی کامل

- رادھا رانی — ۳ر
- پاربتی — ۳ر
- کلثوم — ۳ر
- دو پھول — ۳ر

الناظر ایجنسی چوک لکھنؤ

جمیلہ کی ناکامیابی مصنفہ مسٹر عبد الولی بی اے ۸ر / ہاجرہ کی کامیابی مصنفہ مسٹر انیس احمد عباسی — ۶ر

(بسم اللہ)

الناظر

نمبر ۹۲ جلد ۱۶ ——— یکم فروری ۱۹۱۷ء

نوٹ :- ڈاکٹر ایس کے برمن کی کارآمد جنتری ۱۹۱۷ء کی خوبصورت تیار ہوئی ہے - دس شریف لکھے پڑھے اشخاص کا نام اور پورا پتہ لکھنے پر جنتری بلا قیمت و محصولڈاک بھیجی جاتی ہے -

امراض مستورات کی دوا امراض مستورات کی دوا

عورتوں کی بیماری میں ماہرین ملک کی نہایت مشہور دوائیں دائی برنیم اور قدیم ویدک زمانے کی مشہور اسوک وغیرہ کئی ایک دوائیوں کو ملاکر یہ دوا تیار کی گئی ہے اور اسکی آزمایش بھی واقعی طور سے ہوتی ہوئی آئی ہے - یہ ہر اقسام کے امراض مستورات کی دوا ہے - کمزور رحم (بچہ دان) کو طاقت دیتی ہے اور صاف رکھتی ہے - اسلیے رحم کی کل بیماریوں میں فائدہ کرتی ہے اس سے حیض کی کل خرابیاں یعنی کم یا زیادہ دنوں میں حیض اور پھوکا ہونا - کمر - پیڑو - جانگھوں اور سر میں درد ہونا - جی متلانا وغیرہ یہ سب شکایتیں دور ہوجاتی ہیں - پردہ میں سفید اور سرخ پانی کی طرح مواد نکلتا ہے خواہ رقیق یا جما ہوا زیادہ یا کم آتا درد وغیرہ کی تکالیف اس دوا سے رفع ہوجاتی ہیں - رحم کی کمزوری کی وجہ سے حمل بیوقت ضایع ہوجاتا ہو - نطفہ قرار پانے سے تیسرے چوتھے مہینے میں ضایع ہوجاتا ہو - ایسی حالت میں اس دوا کا استعمال کچھ دنوں تک کرنے سے رحم کی سب شکایتیں دور ہوکر رحم میں طاقت پہونچتی ہے - جسم قوی ہوتا ہے اور حمل قرار پاتا ہے - قیمت فی شیشی ۱۶ خوراک کی عہ محصولڈاک وغیرہ ۶/

دیکھیے اس دوا کے متعلق اسسٹنٹ آف دی فیملی ہوسپٹل ریاست رامپور کیا تحریر فرماتی ہیں آپ نے دو شیشی امراض مستورات کی دوا جو روانہ کی اُس سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا - براہ مہربانی تین شیشی اور روانہ فرمائیے -

قوت کی گولیاں

۳۲ - برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہورہی ہیں - طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس اگنیشیا ڈامینا ملاکر یہ گولیاں بنی ہیں اس لیے مغز - ریڑھ - رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعوی رکھتی ہیں - زیادہ محنت جوانی کی خرابی دیبے اعتدالیوں خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز فایدہ ظہور میں آتا ہے - بدن میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے چہرہ پر رونق جوانی میں ضعیفی کی سی حالت ڈھلتے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے - قیمت ۳۰ گولیوں کی شیشی دو ہفتے کی خوراک کا ایک روپیہ محصول ڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵/

دیکھیے جناب ایڈیٹر صاحب مخبر دکن کیا فرماتے ہیں - ہمنے ڈاکٹر صاحب کی تعریف پر خیال کر کے ہر گولیاں منگائیں اسکی تیر بہدف اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہیں تو ان گولیوں کی قیمت بجائے ایک روپے کے تین روپے رکھنی چاہیے تھی -

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۱۶ — یکم فروری سنہ ۱۹۱۷ء

دریا کا گھاٹ

سر رابندر ناتھ ٹیگور کے بنگالی قصہ کا ترجمہ

اگر واقعات پتھروں پر منقوش ہو جایا کرتے تو تم میری سیڑھیوں پر صدیوں کے پرانے حالات کا مطالعہ کر لیتے۔ اگر صدہا برس کے گزشتہ واقعات سننا چاہتے ہو تو میری سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ، لہروں کی آواز پر کان لگاؤ اور پھر بہت سے بھولے ہوئے قصے آج سے ہزاروں برس پہلے کے سُن لو۔ آہ! مجھے ایک اور دن یاد آگیا۔ بھادوں شروع ہونے کو تھا، صبح کی ہلکی ہلکی ہوا جس کی لطافت و نزہت اُس کے نقیب سرما ہونے کی وجہ سے تھی، اُن سونے والوں کو نئی زندگی بخش رہی تھی جو گو جاگ رہے تھے مگر پڑے ہوئے تھے۔ پتوں کو بلا سبب ایک خفیف حرکت تھی، دریا پوری تیزی سے بہ رہا تھا اور میرے صرف تین ہی قدم سطح آب سے اوپر جھانکتے ہوئے نظر پڑتے تھے۔ گویا پانی و زمین بہم دست و بغل کھڑے ہیں۔ پانی ساحل کے نشیبی کنارے تک پہنچ گیا تھا اور درختوں کے سایہ کے نیچے جو دریائی گھاس تھی اُس سے بیخودانہ ٹکراتا تھا، کشتیاں جن کو کنارے پر ببول کے درخت سے باندھ دیا تھا صبح ہوتے ہی دریا کی تیز دھار پر تیرنے لگتیں —— گویا لہریں اپنی اُمنگوں کے جوش میں اُن کو تمسخرانہ گدگداتی تھیں اور محبت آمیز تبسم سے اُن کی گوشمالی کر رہی تھیں

ملاحوں نے اپنی کشتیاں کھول دی ہیں چھوٹے بجرے اپنے ننھے ننھے بادبانوں کو، جس طرح چڑیاں آسمان کی بلندی پر اُڑتی ہیں، ہوا میں اُڑتے ہوئے بطوں کی طرح تیرتے چلے جاتے ہیں۔ پوجاری برہمن ٹھیک اپنے وقت پر آن پہنچا ہے اور عورتیں ایک ایک دو دو کرکے پانی لینے کو دریا میں کودتی ہیں۔

اس کو بہت زمانہ نہیں گزرا، تم شاید خیال کرو کہ مدتیں ہوگئیں، لیکن مجھے یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ میرے ایام زندگی دریا کے بہاؤ کے ساتھ کھیلتے چلے جاتے ہیں۔ میں اُنکو مدتوں سے بہ غور دیکھ رہا ہوں اور اسی لیے وہ دن مجھے بہت نہیں معلوم ہوتے۔ روزانہ میرا چمکدار عکس پانی میں نظر آتا ہے اور ہر شب میرا چہرہ سطح آب پر منقش ہوتا ہے لیکن اگلے ہی روز وہ غائب ہوجاتے ہیں اور اُن کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے گو میں بڈھا نظر آتا ہوں گر میرا دل جوان ہے۔ زمانہ درازکی یادنے مجھ کو دریائی گھاس کے نیچے دبا نہیں دیا ہے اور اس طرح میری مسرتوں کے خاتمہ کا باعث نہیں ہوئی ہیں، بلکہ اگر کوئی پودا یا خس و خاشاک کسی طرف سے بہ کر مجھ تک پہنچ جاتے ہیں تو پانی کا بہاؤ اُن کو فوراً ہی الگ کر دیتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ میں خس و خاشاک سے بالکل آزاد ہوں۔ میرے اُن شگافوں میں جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا ہے خس و خاشاک اور آبی پودوں نے اپنا گھر بنا لیا ہے، یہ پودے میری قدامت کے گواہ ہیں، اور انھیں نے وقت کو اپنے پنجہ میں مضبوطی سے پکڑ لیا ہے تاکہ وہ ہمیشہ تازہ، شیریں اور مسرت بخش رہے۔

اس موسم میں روزانہ دریا آگے بڑھ جاتا ہے اور گھاٹ کی ایک سیڑھی خالی کر دیتا ہے۔ میری عمر بھی بحساب ایک سیڑھی روزانہ کے بڑھ رہی ہے۔

دیکھو! وہ بڑی بی اشنان کرکے گھر جا رہی ہیں۔ سردی سے کانپتی جاتی ہیں اور ہاتھ میں مالا لٹک رہی ہے۔ اس کی دادی اُس وقت ایک ذرا سی بچی تھی جو اپنا گھر اپنے پیچھے رکھ کر پانی میں کاغذی کشتیاں ڈالتی اور بھنور میں اُن کا گھومنا دیکھتی رہتی یہاں تک کہ وہ غائب ہوجاتیں۔

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اب تو وہ بڑھی چڑھی ماں ہوگئی اور اپنی چھوٹی لڑکی کو گود میں لیے پانی بھرنے آتی ہے۔ تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ وہ بچی بڑی بوڑھی ہوگئی اور اُن بچوں کو جو دریا کے کنارے کھیلتے اور دوڑتے تھے خوب گوشمالی کرتی اور نصیحتیں کرنے لگی، اُس وقت میں اس بچی کا کھیلنا یاد کرتا اور اس منظر کے تمسخر پر ہنستا!

میں سمجھتا ہوں کہ جو قصہ مجھے بیان کرنا ہے اُس تک میں نہ پہنچوں گا، جب میں ایک واقعہ کہنا چاہتا ہوں تو فوراً ہی دوسرا یاد آجاتا ہے۔ بات میں بات نکلے ہی جاتی ہے اور زبان رُکتی نہیں۔

مندر کے متصل جہاں اب گوشائیں کا مویشی خانہ ہے ایک ببول کا درخت تھا اسی درخت کے نیچے ہر ہفتہ بازار لگتا تھا، اُس وقت تک گوشائیں یہاں آباد نہ ہوئے تھے اور اس عالیشان مندر کے بجائے جو اب نظر آرہا ہے اُس وقت صرف ایک چھپر یہاں پڑا ہوا تھا۔

گو میں عمر رسیدہ ہوں مگر اُسی طرح تنا کھڑا ہوں۔ اب میری کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور میں ضعیف و معذور ہوتا جاتا ہوں اور ہزاروں شگافوں نے میرے جسم پر جھریاں ڈال دی ہیں، اور میرے سوراخوں میں تمام دُنیا کے مینڈکوں نے اپنا گھر بنا لیا ہے تاکہ جاڑوں میں آرام کریں۔ مگر اُس وقت میری یہ حالت نہ تھی، صرف دو اینٹیں میرے بائیں بازو سے نکل گئی تھیں اور اُس سوراخ میں ایک چڑیا رہنے لگی تھی۔ صبح کو جب وہ کروٹیں بدلتی اور اُٹھ کر انگڑائی لینے میں اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی اور پھر گاتی ہوئی اُڑ جاتی تو میں جانتا کہ اب کُسوم کے آنے کا وقت ہوگیا۔

گھاٹ پر دوسری لڑکیاں اس کو کُسوم کہتی تھیں اور میرے خیال میں یہ ہی اُس کا نام تھا۔ میرے پانی پر جب اُس کے ننھے سے جسم کا عکس پڑتا تو میں اُس کو بے اختیار پکڑنا چاہتا اور اپنے پتھر پر منقش دیکھنا پسند کرتا، کیونکہ اُس کا حُسن اتنا ہی دلفریب تھا۔ جب وہ میری سیڑھیوں پر قدم رکھتی اور اُس کی پازیب بجتی تو خوشی کی ایک لہر میرے کائی کے جسم پر دوڑ جاتی اور میں

بے اختیار ہو جاتا۔ نہ تو وہ کھیلتی ہی زیادہ تھی اور نہ باتیں لاتی، اور نہ ہر وقت ہنسا کرتی، مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ اُس کے ساتھ ہجولیاں بہت ہوتیں اور ساری تیز لڑکیاں اُس کے ساتھ لگی رہتیں۔ کسی نے اُس کا نام خوشی رکھا اور کوئی کُسی کہتا اور کوئی رکھوسی پکارتا۔ اُس کی ماں اُسے کُسمی کہتی تھی۔ ہر وقت میں لڑکی کو دریا کے پاس بیٹھے ہوئے پانی کو دیکھنے میں مشغول پاتا۔ حقیقت میں اُس کو پانی سے بے انتہا محبت تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ نظر نہ پڑی۔ سوارتا اور شانتی گھاٹ پر اُس کا ذکر کرنے لگیں کہ اُن کی کُسی۔ خوسی۔ رکھوسی، بہت دُور اپنی سُسرال چلی گئی، جہاں نہ سڑکیں ہیں، نہ مکانات ہیں، اور نہ کوئی دیکھا بھالا آدمی ہے، نہ یہاں کی سی باتیں ہیں۔ آہ! اُنھوں نے پانی کے پھول کو ریگستان میں پہنچا دیا!

رفتہ رفتہ کُسوم میرے خیال سے اُتر گئی، اور اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ گھاٹ پر عورتوں کی زبانی بھی کبھی اُس کا ذکر نہیں سُنا۔ مگر ایک روز شام کو یکبارگی میں ایک جانے بوجھے پاؤں کی آہٹ سے چونک پڑا، مجھے خیال ہوا کہ یہ تو کُسوم کا ایسا پاؤں پڑ رہا ہے۔ آہ! ٹھیک ہے، مگر اب اُن پاؤں میں پازیب نہ تھی اور اُن کا وہ نغمہ غائب ہو گیا تھا! اتنے دنوں سے اُس کا قدم بغیر پازیب کی جھنکار کے کبھی سُنا ہی نہ تھا، اب جو دفعۃً اس آواز کو اُس قدم سے جدا پایا تو پانی کے تموج کی آواز میرے کانوں کو نوحۂ غم اور پتوں کی حرکت کا نغمہ صدائے ماتم سنائی دیا۔ افسوس! کُسوم بیوہ ہو گئی! اُس کا شوہر کہیں باہر کام کرتا تھا، اور کُسوم کو صرف ایک ہی دو مرتبہ اُسے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا کہ ایک خط سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ انتقال کر گیا۔ کُسوم کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، اُس کا سُہاگ جاتا رہا۔ اور اُس کی نامراد زندگی اس کی عمر کے آٹھویں سال دائمی ناکامی میں تبدیل ہو گئی۔

جب وہ گھر لوٹ کر آئی تو یہاں بھی اُس کی سہیلیاں اور ساتھ کی لڑکیاں سب بیاہی جا چکی تھیں اور اپنی اپنی سُسرال میں تھیں۔ یہاں صرف سَرَت باقی تھی اور وہ بھی آتے جاڑوں سسرال کو سدھار جائے گی۔ کسوم اب بالکل اکیلی رہ گئی، وہ میری سیڑھیوں پر آ بیٹھتی اور اپنے سر کو

گھنٹوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہتی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لہریں اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے فرطِ شوق میں اُسے کُسُمی، خوسی۔ کھوسی کہ کر پکار رہی ہیں۔

اسی طرح پورے دس سال گزرے اور کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ کتنا زمانہ گزر گیا۔ بالکل ایسا ہی موسم تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا چل رہی تھی۔ صبح کو ایک خوبصورت، نوجوان سنیاسی جو بظاہر نہایت ذہین اور سنجیدہ معلوم ہوتا تھا خدا جانے کہاں سے آیا اور اُس سامنے والے مندر میں ٹھیر گیا۔ فقیر کا آنا تھا کہ اُس کی خبر سارے گاؤں کو ہوگئی اور عورتیں اپنے اپنے گھڑے چھوڑ اُسکی زیارت کو جوق جوق آنا شروع ہوئیں۔ وہ نہایت ہی حسین تھا مگر کسی کو آزار نہ پہنچاتا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس کا اثر نہایت بڑھ گیا۔

سنیاسی دریا میں آتا اور وہاں کھڑے ہو کر منتر پڑھتا رہتا اور اُس کی نگاہ برابر صبح کے ستارے پر جمی رہتی۔ صبح کی روشنی اپنا چمکدار چہرہ پھول کی طرح آسمان کی جھیل میں دکھلاتی، افق پہ درختوں کی چوٹیاں پوری طرح منقوش ہوجاتیں، ہَوا جاگ اُٹھتی، آسمان نیلا پڑجاتا اور آخرکار عالمِ عدم سے، جو درختوں کی قطاروں میں پوشیدہ ہے، صبح کا دھویا ہوا آفتاب جھلملاتا رفتہ رفتہ بلند ہوکر آسمان پر چڑھ جاتا، ــــــ گویا جبکہ وہ زبردست انسان دریا میں کھڑے ہوکر اپنا منتر پڑھ رہا تھا تو اُس کے ہر لفظ میں وہ عجیب طاقت تھی جس نے رات کا طلسم توڑ دیا، چاند اور ستارے مغرب میں ڈوب گئے، آفتاب نے مشرق سے سر نکالا اور تمام عالم کا منظر بدل گیا! الاے

لے سنیاسی تو بڑا ساحر ہے!

اسی طرح مہینے گزر گئے اپریل میں جب ببول کے نیچے بازار لگا تو عورتوں کا مجمع بہت زیادہ ہُوا اُسی میں ایک گروہ اُس گاؤں کی عورتوں کا بھی تھا جہاں کسوم بیاہی گئی تھی۔ یہ صبح کا وقت تھا اور سنیاسی میری سیڑھیوں پر بیٹھا مالا جپ رہا تھا کہ دفعۃً ایک عورت نے دوسری کو اشارہ کیا اور وہ کہنے لگی "ایں! یہ تو ہماری کسوم کا شوہر ہے؟" تیسری نے دو انگلیوں سے

اپنے گھونگھٹ کو ذرا اُٹھایا اور بولی "لے ٹھیک! یہ تو وہی کسوم کا شوہر ہے چٹرجی کا چھوٹا بیٹا یہ ہی تو ہے" تیسری نے کہا کہ "دیکھو تو اُس کا آنکھ نقشہ سب وہی ہے" مگر ایک اور جس نے سنیاسی کی طرف مُنھ پھیر کے دیکھا بھی نہیں اور اپنے گھڑے سے تنکے ہٹانے کے شغل میں مصروف تھی، کہنے لگی کہ "آہ! اب وہ کہاں، کسوم کی قسمت اگر اب وہ لوٹ کر نہیں آسکتا" اتنے ہی میں دوسری نے اعتراض کیا "مگر اُس کے اتنی بڑی داڑھی تو نہ تھی اور نہ وہ اتنا دُبلا تھا" "اور وہ اتنا لانبا بھی تو نہیں تھا" دوسری آواز آئی۔ اور یہیں بات ختم ہوگئی اور معاملہ طے ہوگیا۔

سب ہی عورتیں گانوں کی نئے سنیاسی کو دیکھنے آئیں مگر کسوم اب تک نہ آئی تھی۔ ایک روز رات کو شاید میں اُسے یاد آیا اور وہ گھر سے چل کھڑی ہوئی۔ گھاٹ پر اُس وقت کوئی نہ تھا۔ جھینگے اور مچھر برابر اُڑ رہے تھے، گھڑیال اور گھنٹیوں کی آوازیں اُسی وقت مندر میں موقوف ہوئی تھیں اور اُن کی گونج رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی تھی اور لہریں زور شور سے اُٹھ رہی تھیں۔ کسوم بیٹھی تھی اور اُس کا عکس مجھ پر پڑ رہا تھا، ہوا کو مطلق جنبش نہ تھی، اور درخت غیر متحرک تھے، اُسکے سامنے گنگا کی بغل میں نہایت دلفریب غیر محدود چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے اِدھر اُدھر، کسی جھاڑی یا کسی گنجان درخت میں، مندر کے نیچے، شکستہ مکانات کے قریب، تالاب کے کنارے اور کھجور کے باغ کے پاس اندھیرا تھا اور وہ تاریکی اُس کے استغراقِ خیالات میں چٹکیاں لے رہی تھی، رات کا بادشاہ (بوم صحرائی) اپنی بھیانک آوازیں درخت پر چلّا رہا تھا اور آبادی کے قریب گیدڑوں کی آوازیں گونجتی تھیں اور پھر غائب ہو جاتی تھیں۔

اسی وقت سنیاسی مندر سے آہستہ آہستہ آتا ہوا دِکھائی دیا کچھ ہی سیڑھیاں وہ طے کر پایا ہوگا کہ اُس نے لوٹنے کا قصد کیا، اتنے ہی میں کسوم نے سر اُٹھایا اور مُنھ پھیر کر پیچھے کو دیکھا گھونگھٹ اُس کے ہاتھ سے چھُٹ گیا اور چاندنی جس طرح کسی خوبصورت پھول پر گرتی ہے اسی طرح وہ اُس کے بے نقاب چہرے پر پڑی۔ اُس وقت اُن دونوں کی آنکھیں اس طرح ملیں گویا وہ ایک

دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ اُلّو زور سے بول کر اُڑ گیا، اُس کی آواز سے کسُوم چونکی تو اُس نے اپنا گھونگھٹ درست کیا اور جُھک کر سنیاسی سے قدمبوس ہوئی۔ سنیاسی نے اُس کو دعا دی اور پوچھا کہ "تم کون ہو؟" "میرا نام کسُوم ہے" اُس نے جواب دیا۔

اس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ سُننے میں نہیں آیا۔ کسُوم اپنے گھر چلی گئی مگر سنیاسی اُسی طرح میری سیڑھیوں پر بیٹھا رہا، آخرکار جب چاند کا سفر بھی مشرق سے مغرب تک ختم ہو گیا اور اُس کا سایہ بھی پانی سے غائب ہو گیا تو وہ اُٹھا اور مندر میں داخل ہُوا۔

اگلے دن سے کسُوم روز اُس کی قدمبوسی کو حاضر ہوتی اور جب وہ وید کی تعلیم میں مصروف ہوتا تو وہ ایک گوشے میں خاموش کھڑی رہتی۔ صبح کی عبادت کے بعد وہ خود اُسے بُلاتا اور مذہب کے متعلق گفتگو کرتا رہتا، وہ گو سمجھ نہ سکتی تھی مگر خاموشی سے ہمہ تن گوش بنی رہتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی۔ روز وہ مندر کی خدمت کرتی اور پوجا کے لیے پھول جمع کر کر کے لاتی اور گنگا سے پانی لا کر مندر کا فرش دھویا کرتی۔

میری سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی وہ سنیاسی کی باتوں پر غور کر رہی تھی کہ بتدریج اُس کے خیالات میں ایک تلاطم ہوا۔ اور اُس کی امیدوں میں بلا کا ہیجان۔ اُس کو وہ خواب نظر آنے لگے جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے، اور اُس کے کان وہ آوازیں سُننے لگے جن کے وہ کبھی آشنا نہ تھے۔ اور اُس کے ملول چہرے کی اُداسی یک بیک غائب ہو گئی، وہ ایک نازک حسین پھول کی طرح چمکنے لگا —— اور فی الحقیقت صبح کو جب وہ سنیاسی کے قدموں پر جُھکی تو وہ ایک پھول تھی جو قربان گاہ پر چڑھایا گیا ہو، اور تمام دن اُس کے چہرے پر وہ مسرت باقی رہی۔

جاڑے ختم ہو چلے تھے اور موسم بہار کا رنگ جمتا جاتا تھا مگر کسُوم کے نظر نہ پڑنے کا مجھے برابر خیال رہتا تھا اس لیے کہ کچھ عرصے سے اُس نے مندر و گھاٹ و سنیاسی سب کی ملاقات موقوف کر دی تھی۔ پھر کیا ہُوا —— مجھے کچھ علم نہیں، مگر کچھ عرصہ بعد دونوں میرے گھاٹ پر ملے۔

جھکی ہوئی نظروں سے کسوم نے پوچھا "بابا، کیا آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟"

"ہاں۔ اب تم کیوں نہیں نظر پڑتیں، اور خدا کی عبادت میں کیوں نہیں شریک ہوتیں؟"

وہ خاموش تھی۔

جو کچھ تمہارے دل میں ہو صاف صاف کہو۔"

اُس نے اپنا چہرہ ذرا اٹھا لیا اور دبی آواز سے بولی کہ "بابا! میں گنہگار ہوں عبادت کے لائق نہیں"

سنیاسی نے نہایت ہی محبت آمیز لہجے میں کہا "کسوم، مجھے معلوم ہے تیرا دل بے چین ہے۔"

کسوم ذرا جھجکی، اور اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے، وہ سوچنے لگی کہ کیا واقعی اُس کو سب معلوم ہے۔ آخر وہ وہیں بیٹھ گئی اور اپنے دوپٹے کے ایک آنچل کو اپنے چہرے کے لیے پردہ بنا کر رونے لگی۔

وہ وہاں سے کسی قدر ہٹ گیا اور پوچھنے لگا کہ "جو اصل تکلیف ہو وہ مجھ سے بیان کرو اور میں تمھیں اُس کا علاج بتاؤں گا۔"

اُس نے اپنے غیر متزلزل اعتقاد کی بنا پر کہنا تو شروع کیا مگر اُس کے پاس الفاظ کافی نہ تھے اور وہ بار بار رُک جاتی۔

"بابا، آپ کے حکم کی تعمیل مجھ پر فرض ہے۔ گو مجھ سے کہا نہیں جاتا، بہر حال حضور پر سب روشن ہے میرا ایک سرتاج تھا جس کی پرستش میں نے ہمیشہ اپنا فرض سمجھا اور اسی عقیدے نے میرے دل کو ہمیشہ مسرور رکھا۔ ایک رات میں نے اُس کو خواب میں دیکھا کہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے محبت و شوق کی باتیں کر رہا ہے، باتیں برابر ہوتی رہیں اور میں عالم محویت میں خاموش سنا کی آخر خواب ختم ہوا اور وہ ... تصویر آنکھوں سے ... غائب ہو گئی۔ مگر آہ! وہ غائب ہی نہیں ہوئی بلکہ اپنے ساتھ میری ساری مسرتیں، تمام اُمیدیں اور آرزوئیں بھی لے گئی، اور اب میری زندگی ایک سیاہ خانۂ غم ہے۔"

جبکہ وہ عرض حال کر رہی تھی اور اپنے آنسوؤں کو دامن سے خشک کرتی جاتی تھی میں نے

خوب غور کیا کہ سنیاسی اپنے پاؤں سے میری سنگین سطح کو برابر دبا رہا تھا۔ اُس کی تقریر ختم ہوئی تو سنیاسی نے سوال کیا کہ "تم کو یہ ضرور کہنا چاہیے کہ "وہ کون تھا"

(ہاتھ باندھ کر) "میں عرض نہیں کر سکتی"

"نہیں، میں تمھارے ہی فائدہ کے لیے پوچھتا ہوں۔ بتاؤ وہ کون شخص تھا؟"

"کیا مجھے بتانا ہی پڑے گا؟"

"ہاں ضرور"

"بابا، وہ تو ہی ہے" وہ بے ساختہ بول اُٹھی۔ اور ان الفاظ کی آواز جوں ہی خود اُس کے کان میں پہنچی کہ وہ فوراً بیہوش پتھر پر گر پڑی۔

سنیاسی بُت بنا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس کو ہوش آیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھی تب سنیاسی نے آہستگی سے کہنا شروع کیا "اب تک تم نے میرے سب احکام کی تعمیل کی ہے، ایک بات اور کہتا ہوں اور اس کو تمھیں ضرور ماننا پڑے گا۔ میں آج رات اس مقام کو خیرباد کہتا ہوں، اور پھر کبھی تم مجھے یہاں نہ دیکھو گی۔ تم مجھے بھول جاؤ اور یہ وعدہ کرو کہ آج ہی سے بھول جانے کی کوشش شروع کر دو گی"

کسوم ساکت کھڑی تھی اور سنیاسی کے چہرے کو برابر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے جواب دیا "بابا، میں ضرور تعمیل کروں گی" اس پر سنیاسی نے کہا "بس، میں رخصت" کسوم خاموشی سے قدمبوس ہوئی اُس کی خاکِ قدم کو سر پر چڑھایا، اور وہ فوراً ہی غائب ہو گیا۔

کسوم اپنے دل میں سوچنے لگی کہ "یہ حکم ہے کہ میں بھول جاؤں" اور پھر آہستگی سے دریا میں اُتری ——

دریا نے ہمیشہ کسوم کے لیے اپنے محبت بھرے ہاتھ بڑھائے ہیں۔ وہ ذرا سی بچی تھی اور دریا اُس سے محبت کرتا تھا، پھر آج اگر وہ اُس کے لیے اپنی گود نہ کھولے تو اور کون اُس کی مدد کو آئے گا۔

چاند ڈوب چکا ہے اور رات بالکل اندھیاری ہے کہ پانی میں ایک آواز ہوتی ہے مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا اُس تاریکی میں زور شور سے ماتم کر رہی ہے اور گویا یہ چاہتی ہے کہ سارے تاروں کو گرادے اور کسی ایک تارے کو بھی آسمان پر اس المناک منظر کو نہ دیکھنے دے!

وہ جو بچپن سے آج تک میری گودوں میں کھیلتی رہی ہے، آج اپنا تماشا ختم کر چکی اور میں نہیں جانتا کہ کہاں چلی گئی۔

نورالرحمٰن (بچھراونی)

خوفِ دوزخ کا نہ ساقی شیخ کے دل میں رہے　　مے بہارِ خلد بنکر تیری محفل میں رہے
زلف میں دل گیسوؤں والا مرے دل میں رہے　　اس طرح دل عمر بھر قیدِ سلاسل میں رہے
مجھ لیا ہو دل کوئی کیا خاک اس دل میں رہے　　شمع رویوں کی بلا سنسان محفل میں رہے
میان سے باہر ہو تیغِ یار تو دل میں رہے　　گھر سے نکلے سیر کو لیلیٰ تو محمل میں رہے
آگئیں آخر کہاں سے اس غضب کی شوخیاں　　آپ کیا دم بھر کسی بیتاب کے دل میں رہے
ہو کے بسمل بسملوں سے مل گئی مقتل میں ہائے　　ہم بھی دم بھر تیرے بیتابوں کی محفل میں رہے
میان میں خنجر رہے کیوں یہ تو ایسی چیز ہے　　یا مرے دل میں رہے یا دستِ قاتل میں رہے
جوش میں آکر یہ کہتا ہے ترا بحرِ کرم　　میں نہیں وہ بحر جو آغوشِ ساحل میں رہے
لے چلا مجھ وحشیِ گیسو کو یہ کہہ کر جنوں　　چل بھی اب تیری بلا قیدِ سلاسل میں رہے
جو لحد میں تھی وہی محشر میں ہو دل کی تڑپ　　مضطرب خلوت میں ہم بیتاب محفل میں رہے
چاند نکلے چرخ پر پھیلے زمیں پر چاندنی　　آنکھ میں وہ عکسِ حسن اس کا مرے دل میں رہے
چھپ کے ماتم آرزوے دل کا ہو لے دردِ عشق　　حسرتوں کی سینہ کوبی کی صدا دل میں رہے

جمع سب آتش زباں سحر البیاں ہیں اے وسیم
ہم بھی جا کر حضرت ساحرؔ* کی محفل میں رہے

سید محمد عسکری وسیم

× تخلص راجہ صاحب محمود آباد

شیرازہ

اُن کو دیکھا اُنس پیدا ہوگیا
پھر وہ تبدیل تمنا ہوگیا
دل میں اک طوفان برپا ہوگیا
یعنے قطرہ بڑھ کے دریا ہوگیا

خواہشوں کی اب تو ارزانی ہوئی
آرزوؤں کی فراوانی ہوئی
حسرت و ارماں کی طغیانی ہوئی
کشتیِ جذبات طوفانی ہوئی

ہوگیا سب پر ظہورِ آرزو
چھا گیا ہر سمت نورِ آرزو
بڑھ گیا حد سے وفورِ آرزو
لے اُڑا ذوقِ سرورِ آرزو

دل کو قدرِ عالمِ امکاں ہوئی
جانِ محوِ لذتِ پنہاں ہوئی
رُوح غرقِ لطفِ بے پایاں ہوئی
میری ہستی پیکرِ خنداں ہوئی

اُن سے اظہارِ وفا ہونے لگا
مطلبِ پنہاں ادا ہونے لگا
ذکرِ اُلفت بر ملا ہونے لگا
یعنے عرضِ مدعا ہونے لگا

عشق کی دیکھیں جو خوش اسلوبیاں
حُسن میں آئیں نئی محبوبیاں
رنگ لائیں سالکانہ خوبیاں
بن گئیں منظوریاں، محبوبیاں

تھا تقاضائے نہادِ حُسن و عشق
ہوگیا یوں اتحادِ حُسن و عشق
مل گئی آخر کو دادِ حُسن و عشق
تھی یہی ارشد مرادِ حُسن و عشق

ارشد (تھانوی)

فرد اور قوم

دعوٰے قومیت کا لاحاصل ہے پھر　　　　گر نہیں رکھتے ہو عصبیت کی رُوح

قوم افراد سے بنتی ہے اور افراد کی عزت اور احترام قوم کی مجموعی عزت اور احترام سے ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کی مجموعی یا اجتماعی عزت اور احترام اُس پایہ پر پہنچ چکا ہے کہ جو تنازع للبقا کی ضروریات کے واسطے کافی ہے تو اُس قوم کے بعض افراد کا ناقص ہونا ہی منافی اُس قومی عزت اور قومی احترام یا اجتماعی عزت و احترام کے نہیں۔ انفرادی نقص اور کمی اس صورت میں محسوس ہوتی ہے جب اجتماعی کمی اور نقص موجود ہو۔

جب کسی قوم کے افراد سمجھ لیتے ہیں کہ بہ اصول تنازع للبقا یہ قوم یا قومیت اُسی صورت میں قوی اور محترم شمار ہو سکتی ہے کہ جب قوم کا اقدام اجتماعی قوی اور محترم ہو۔ تو پھر قوم بننی شروع ہو جاتی ہے۔

وہ قوم ذلیل اور کمزور شمار نہیں ہوتی جس کے چند یا بعض افراد ذلیل اور کمزور ہوں۔ کیونکہ منجملہ ساری قوم کے افراد کے بعض کا ناقص اور کمزور ہونا اجتماعی قوت کے منافی نہیں ہو سکتا۔ نقص یہ ہے کہ قوم کی اجتماعی حالت ناقص ہو۔ اس صورت میں چند افراد کا ترقی پانا یا قوی ہونا، اجتماعی ترقی یا اجتماعی قوت میں محسوب نہیں ہو سکتا۔ کبھی کوئی قوم محض تعداد اور نمبر کے اعتبار سے قوی اور ترقی یافتہ شمار نہیں ہوتی۔ ہمیشہ وہ قوم ترقی یافتہ اور قوی شمار ہوتی ہے جو قومی حیثیت سے ایک اجتماعی احترام اور اجتماعی قوت رکھتی ہو۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر فرد اور ہر شخصیت قوم یا قومیت کا ایک جزو یا ایک کڑی ہے مگر جب ایسے اجزا اور ایسی کڑیوں سے فی صدی ۹۹ جزو اور ۹۹ کڑیاں ناقص اور بودی ہوں تو اُن کی پائداری اور قیمت کیا کچھ ہو گی اور تنازع للبقا کی مہم کس طرح سر ہو سکتی ہے۔

افراد کی زندگی ایک جداگانہ زندگی ہے جس کی میعاد بہت ہی کم یا معمولی ہے۔ اور قوم کی یا اجتماعی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کی عمر صدہا سال تک بھی ہے۔ قوم کے مرنے سے افراد مرجاتے ہیں لیکن افراد کے مرنے سے قوم نہیں مرتی۔ جب ایک شخصیت فنا ہو جاتی ہے تو قومی زندگی کا ایک ذرہ منجملہ کروروں ذرات کے دوسرے رنگ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ لیکن جب قوم فنا ہوتی ہے تو سب افراد کی احترامی اور اجتماعی عزت فنا ہوجاتی ہے۔

دنیا میں اس وقت جس قدر تنزل یافتہ قومیں موجود ہیں یا تنازع للبقا کی معرکۃ الآرا بازی ہار چکی ہیں اُن کی موجودہ حالت بہ زبان حال یہ منادی کررہی ہے کہ قوم کی اجتماعی ذلت سے افراد کی ذلت متصور ہے۔ اور باوجود اس کے کہ افراد میں سے بعض افراد ممتاز بھی ہوتے ہیں پھر بھی اصلی عزت اور احترام باقی نہیں رہتا۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے یہ کہا ہے

چو از قومے یکے بید انشی کرد　　نہ کہ را منزلت باشد نہ مہ را

یہ کلیہ نہیں ہوسکتا۔ کلیہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم اجتماعاً پایۂ احترام واکرام سے گرجاتی ہے تو پھر حسب قول حضرت سعدی شیرازی افراد کی وقعت اور حرمت کم ہو جاتی ہے۔ جو قوم قومیت کے پایۂ سے گرگئی اُس کے افراد بھی گرگئے۔

قومیت کا پایہ کیا ہے؟ اجتماعی رنگ میں قومی اوصاف، قومی سیرت اور قومی عصبیت و قومی کیرکٹر کا مضبوط زندہ اور پائدار ہونا اور اس رنگ میں کسی قوم کا زندہ ہونا، قومی زندگی سے مراد عرفی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی جو قومی زندگی کہی جاسکتی ہے۔ زندگی تین قسم کی ہے

(الف)　عرفی یا معمولی زندگی۔

(ب)　حسی زندگی یا روحی زندگی

(ج)　قومی عصبیت کی زندگی۔ ملتی زندگی۔

عرفی اور معمولی زندگی تو ایک چیونٹی بھی رکھتی ہے۔ یہ تو ہر فرد یا ہر جاندار کا حصہ ہے۔ حسی زندگی وہ ہے جو ایک قوم کی اجتماعی زندگی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے افراد میں ایک زندگی

رکھتی ہیں۔ بڑی بھاری علامت ایسی زندگی کی یہ ہو کہ بعض افراد کی کمزوری یا نقص سے بھی قوم زندہ ہو اور تنازع للبقا کے امتحان میں پوری اُترے اور قومی عصبیت یا اجتماعی عصبیت رکھتی ہو۔ حُسنِ اتفاق سے ہمیں چند شعر جنھیں ہم فخر کے ساتھ ذیل میں نقل کرتے ہیں، ترجمانِ حقیقت حضرت ڈاکٹر اقبال لاہوری کے مل گئے ہیں۔ ان اشعار سے ناظرین معلوم کر سکتے ہیں کہ انفرادی ہستی، اجتماعی ہستی، اجتماعی عصبیت یا ملی عصبیت میں کیا کچھ فرق یا کیا کچھ نسبت ہے :-

فرد ہم می خیزد از مُشتِ گلے — قوم زاید از دلِ صاحبدلے
فرد پُر شِصت و ہفتاد ست و بس — قوم را صد سال مثلِ یک نفس
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن — زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات — مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

شعر تو چار ہی ہیں مگر اس قدر مضامین لیے ہوئے ہیں کہ کوئی لکھنے والا انھیں چار بیسیوں صفحے لکھ سکتا ہے اور اُن مطالب پر جو قومی ترقی اور ادبار سے وابستہ ہیں۔

اللہ اللہ اس ترجمانِ حقیقت کی طبع رسا کہاں تک پہنچی ہے اور کن کن مضامین کا چند الفاظ میں خاکہ اُتارا گیا ہے۔ ایں کار از تو آید و شاعر چنیں کنند۔

(۱) حضرتِ اقبال پہلے شعر میں فرماتے ہیں " فرد کی ہستی فرد کا وجود اور فرد کی زندگی با اعتبار ایک جزو، ایک ذرہ اور ایک منفرد مسبب ہونے کے گویا ایک مشت گل یا معمولی ہوتی ہے۔ گو وہ بجائے خود ایک ہستی ہوتی ہو مگر اُس کی حقیقت من حیث الفرد فرد نہیں ہوتی۔ ایک فرد کا وجود اور ایک فرد کی ہستی اس امر کی متقاضی نہیں کہ اُس کا منبع یا اُس کی بنیاد بجائے خود کوئی خصوصیت یا کوئی امتیاز رکھتی ہو کیونکہ منجملہ لاکھوں افراد کے وہ بھی ایک فرد ہوتی ہے اور اگر فرداً فرداً دیکھا جاوے تو ہر فرد من حیث الفرد کوئی حقیقت نہیں رکھتی اگرچہ وہ زندہ ہوتی ہے اور ایک وجود بھی رکھتی ہے مگر اُس کی یہ منفرد زندگی اور متفرد وجود کوئی وقعت نہیں رکھتا

بہ الفاظِ حضرتِ اقبالؔ محض ایک مشتِ گِل ہوتا ہے ۔

اس کے مقابلہ میں قوم کب وجود پذیر ہوتی ہے ، قوم کب زندگی پاتی ہے ، قوم کب پیدا ہوتی اور کب بنتی ہے ؟ جب افراد میں کوئی صاحبِ دل پیدا ہو جائے ۔ جب کوئی ایسی فرد نکل آئے ۔ جب کوئی ایسی ہستی ظہور پذیر ہو جو ایک دل رکھتی ہو ، ایک رُوح رکھتی ہو ، ایک دماغ رکھتی ہو اور ایک ہمت اور استقلال رکھتی ہو ۔ ایک فرد کی زندگی اور قیام و ثبات محض سانس اور دَم سے ہے یا یہ ایک دَم کا کھیل ہے لیکن قوم کی بنیاد ، قوم کا کھیل کسی نہ کسی صاحبِ دل کے ساتھ مربوط ہوتا ہے ۔ کوئی قوم اُس وقت تک نہیں بنتی جب تک اُس کے افراد میں کوئی صاحبِ دل نہ پیدا ہو ۔

عرب میں ایک ہی صاحب دل ، صاحبِ دماغ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اُنھیں کے دَم قدم سے عرب کی کایا پلٹ گئی ۔ نہ صرف عرب ہی کی بلکہ چار دانگِ عالم کی ۔ عرب کا خطہ اور عرب کی قوم اس صاحبِ دل کی وجہ اور برکت سے مردہ سے زندہ ہو گئی ۔ اور ایسی زندگی پائی کہ دوسری مردہ قوموں کو بھی زندہ کر دکھایا ۔ اور ایسی رُوح پھونک دی کہ مادرِ دنیا دو تک ایسی قومیں پیدا نہ کر سکی ۔

از خوبی آفریدہ سراپائے اورا　　در حیرتم کہ گویم وصف کجائے اورا

جو قومیں بدبختیِ ایام سے گر جاتی ہیں اُس کی بڑی وجہ یہ کہی جا سکتی ہے کہ اُس میں سے صاحبِ دل کوئی نہیں پیدا ہوتا یا صاحبِ دل کی روشنی سے وہ خود کو گم کر دیتی ہیں ۔ دل تو ہر شخص رکھتا ہے لیکن دراصل دل وہ ہے جو دل کہلانے کا حق رکھتا ہے ۔ محض برائے نام لیڈری سے کوئی شخص صاحبِ دل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ دِل دِل کی حقیقت نہ رکھتا ہو ۔ کون سے دل ؟ جن میں خلوص ہو ، یُمن ہو ۔ برکت ہو ۔ ہمدردی ہو ۔ درد ہو ۔ استقلال ہو ۔ ہمت ہو ۔ بلند ہمت ہو ۔ سب سے زیادہ یہ کہ صاحبِ سیرت ہو ، صاحبِ بصیرت ہو ، صاحبِ عقیدت ہو ، صاحبِ دل ہو اور صاحبِ عصبیت ۔

بداغِ درد و غم شُد آشنا دل　　خوشا دل حبذا دل مرحبا دل

ایک صاحبِ دل صدہا دلوں کو زندہ کرتا اور اُن میں ایک رُوح پھونکتا ہے جس قوم کے افراد دل پیدا کرتے ہیں اور زندہ دل رکھتے ہیں وہ قوم کبھی نہ کبھی مرکر بھی جی اُٹھتی ہے

خوشم از نعرۂ مستانۂ دل خدا آباد دارد خانۂ دل

صاحبِ دل کسی قوم میں اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہی جب کسی قوم کے افراد بانیِ قوم یا مورثِ قوم اور دوسرے الفاظ میں پہلے صاحبدل کے نقشِ قدم پر چلیں وہی راہ لیں جس راہ سے اُنکے اسلاف گزرے ہیں، اُنھیں روایات کے گرویدہ اور پرستار ہوں جو قوم کی عزت و احترام اور وقعت و اکرام کی زندہ یادگار رہیں وہی شان پیدا کریں جو اسٹ ہے۔ وہی سکہ جا ئیں جو خوش آیندہ دنوں میں جم چکا ہے۔

(۲) دوسرے شعر میں حضرت اقبال فرماتے ہیں " فرد پورِشصت و ہفتا دست بس" یعنے بمصداق حدیث شریف " اعمار امتی بین ستین وسبعین" یا اوسطاً افراد کی عمر ساٹھ اور ستر کے قریب قریب ہوتی ہے۔ لیکن قوم کی زندگی اور قوم کی عمر کی میعاد کا ادنیٰ پیمانہ یہ ہی کہ اُسکی ایک صدی مثل ایک نفس کے ہوتی ہے۔ " قوم را صد سال مثلِ یک نفس" قوم صدہا سال میں بنتی اور قومی خصوصیات میں نشوونما پاتی ہے۔ افراد پیدا ہوتے اور اپنے اپنے وقت پر رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ قوم باوجود اس کے بھی باقی رہتی ہے۔ صدہا زندگیاں اور صدہا قومی فردیں گزر جاتی ہیں تو قوم محترم زندگی پاتی ہے۔ قوم کی بھی ایک عمر ہوتی ہے بمصداق " لکلِ اُمۃٍ اجل" ہر ایک قوم قومی حیثیت سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں ایک فرد کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر دُنیا میں صدہا قومیں ہیں یا دو چار قومیں تو وہ مقابلۃً ایک فرد ہیں۔ کیسی فرد؟ جو ایک اجتماعی رنگ رکھتی ہے۔ کیسی فرد؟ جو باوجود ایک فرد ہونے کے کُل افراد کی جامع ہو اور جس میں ایک اجتماعی رنگ اور اجتماعی عصبیت، انفرادی رنگ اور انفرادی عصبیت کے مقابلہ میں پایا جاتا ہے۔

ساٹھ ستر سال کی عمر میں انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اتنے نشیب فراز لیے ہوتا ہے

کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ قومیں جن کی ایک صدی مثل ایک نفس کے ہوتی ہے اُن کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے اُس کا اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے۔ صد ہا نشیب و فراز سے گزر کر قوم قوم بنتی ہے صد ہا مشکلات کا سامنا ہو کر قومیت کی نوبت آتی ہے۔ قوموں کی ترقی اور عروج باوجود صد ہا سال کے گزرنے کے بھی اس قدر پائدار اور استوار نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اُس پر اعتبار کر سکے۔ اگرچہ بعض وقت قومی تنزل اور قومی اعتبار سرسبز اور پائدار معلوم ہوتا ہے مگر اُس کی اندرونی کلیں اور اندرونی پُرزے بگڑ چکے ہوتے ہیں۔ افراد نظر نہیں کرتے اور شخصیتوں کو اُس طرف خیال اور توجہ نہیں ہوتی۔

جب تک کوئی صاحبِ دل پیدا نہ ہو تب تک ایسی قوم کی قسمت نہیں پلٹتی۔ جب تک کوئی مضبوط کشش نہ ہو تب تک نصیب نہیں جاگتا۔

تا کے خرد ز وسوسہ بیروں کشد مرا　　کو عشق تا ز محبلہ بیروں کشد مرا

(۳) تیسرے شعر میں شاعر یہ تھیوری بیان کرتا ہے کہ ایک شخصیت یا ایک فرد کی ذات اور وجود روح اور تن کے ارتباط سے ہستی پذیر ہوتا ہے، جب روح نکل جاتی ہے تو تن باقی نہیں رہتا، اور جب تن اپنا وقت پورا کر چکتا ہے تو روح نکل جاتی ہے۔ یہ تو جان و تن کا رشتہ ہے۔ لیکن قوم کی زندگی بہ ہیئتِ اجتماعی اُس رُوح اور اُس جان سے ہے جو ناموسِ کہن سے تعبیر پاتی ہے۔ ناموسِ کہن کیا ہے؟ عصبیت۔ عصبیت۔ عصبیت! جو قوم اپنی روایاتِ قومی اور کارنامہ ہائے اسلاف اور قومی غیرت یا ناموس اور اجتماعی عصبیت کی قدر اور حفظ نہیں کرتی، جس قوم کے افراد کی اس طرف توجہ عملی رنگ میں نہیں ہوتی وہ قوم اور اُس قوم کی قومیت ثابت نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ ہر قوم کی زندگی ثانی غیرت و ناموس و اجتماعی عصبیت ہے۔ وہ غیرت اور ناموس جو بصورتِ روایاتِ قومی شروع سے مایۂ قوم اور نازِ قوم رہا ہے، ناموسِ کہن سے وہی غیرت اور وہی ناموس مراد ہے جس پر قوم کی بنیاد قائم ہو چکی ہے اور جو سرمایۂ روایاتِ قومی ہے۔ جب کسی قوم کی بنیاد پڑتی ہے تو بنیاد قائم کرنے والوں میں ایک نہیں کئی ایک صاحبِ دل

ہوتے ہیں صاحبِ دل ہی نہیں بلکہ خدا کا ہاتھ اُن کے ساتھ ہوتا ہے خدا اُن کی مدد پر کھڑا ہوجاتا ہے
جب کوئی قوم ترقی کرتے کرتے رُک جاتی ہے تو اُس کی بڑی بھاری اور ابتدائی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پچھلی نسلیں روایاتِ قومی سے بیگانہ اور ناموسِ کہن سے ایک بڑی حد تک ناآشنا ہو جاتی ہیں روایاتِ قومی اور ناموسِ کہن کی بنیاد غیرت۔ حمیت اور خودداری و اجتماعی عصبیت پر ہوتی ہے۔ مابعد کے افراد یا مابعد کی نسلیں جب خودداری سے دُور جا پڑتی ہیں تو ناموسِ کہن اُڑ جاتا ہے۔

جدت پسندی ہر ایک قوم کے واسطے ایک فالِ نیک ہے اور اس کی بہرحال ضرورت ہے لیکن جدت پسندی کے ساتھ روایاتِ قومی اور ناموسِ کہن کی عزت و احترام اور حفظ ایک لازمی اور مقدم امر ہے۔ ناموسِ کہن و اجتماعی عصبیت یا ملی عصبیت ایک بنیاد ہے اور جدت پسندی دیوار کی تعمیر جب تک بنیاد استوار نہ ہو تب تک دیوار کی تعمیر مستحکم نہیں ہو سکتی۔ ناموسِ کہن جو صدیوں سے وجود پذیر ہوتا ہے ایک ایسی داغ بیل ہوتی ہے جس سے مختلف راہیں نکل سکتی ہیں اور وہی سب راہوں کا شروع ہوتا ہے۔ اگر یہی منفذ اور یہی داغ بیل بند ہو جاوے تو زائد راہیں یا زائد تعمیرات جاری نہیں رہ سکتیں۔ اور نہ اپنی جگہ لے سکتی ہیں۔ ناموسِ کہن ایک اعلیٰ پایہ کی حس یا حرارتِ غریزی ہے۔ جب تک قومی کالبد میں حس اور حرارتِ غریزی نہ ہو تب تک وہ کس طرح ثابت اور قائم رہ سکتا ہے۔

ہمیشہ وہ قوم گھاٹے میں رہتی ہے جو اپنی پہلی مثبتہ مفید روایات کی قدر نہیں کرتی اور ناموسِ کہن سے بیگانہ رہتی ہے۔ تحریکاتِ خارجی یا تحریکاتِ بیرونی کو اپنے دل و دماغ پر متصرف اور غالب ہونے دینا اور تحریکاتِ ناموسِ کہن سے ناآشنا ہو جانا قوم کے واسطے ایک ایسی تکلیف دہ اور شرمناک روش ہے کہ کسی نہ کسی وقت قوم کو اس کا خمیازہ مختلف رنگوں میں بھگتنا پڑتا ہے۔ قوم کی پُرانی روایات جو ایک صحیح پہلو سے ثابت ہو چکی ہوں اور جن پر قومی فخر اور قومی احترام کی بنیاد پڑ چکی ہو۔ دوسرے الفاظ میں ایک ناموسِ کہن ہے جب تک ایسے ناموسِ کہن کی ہوا خواہی میں افرادِ قومی خلوص اور ہمت سے متوجہ نہ ہوں تب تک قوم کا اقدام اور قوم کی شہرت قائم

اور ثابت نہیں رہ سکتی۔ لازمی ہے کہ قوم کی کل شخصیتیں جداگانہ پہلو سے اپنے اپنے رنگ میں اجتماعی قوت بہم پہنچا کر قومیت کی بنیاد استوار کریں اور قوم کو اُس پایہ پر کھڑا کردیں جو اُس کے ناموس کہن کے مطابق ہو۔

قوم کے بہت سے افراد بعض وقت تحریکات بیرونی کی وجہ سے ناموس کہن اور گزشتہ قومی روایات کو چھوڑ کر بعض ایسی باتوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو حفظِ ناموس کہن کے مخالف ہوتی ہیں۔ شروع شروع میں ایسی روش موزوں معلوم دیتی ہے لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اُسکا اثر زہر ہلاہل سے کم نہیں۔

(۴) چوتھے شعر میں حضرت ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ فردِ قوم کی مرگ تو رودِ حیات کے خشک ہو جانے سے وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن مرگِ قوم مقصودِ حیات کے کھو جانے سے وقوع میں آتی ہے۔ جب کوئی قوم مقصودِ حیات ترک کر دیتی ہے تو قدرت اُس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

فرداً فرداً رودِ حیات اپنے اپنے وقت پر بند ہوتی رہتی ہے اور اس کی بندش سے افراد نوبت بہ نوبت جامِ فنا پی کر ہمیشہ کے واسطے سبکدوش ہوتے جاتے ہیں۔ علم تشریح اور علم الحیات بتاتا ہے کہ جان دار اشیا اور موجودات کے جسم لاکھوں ذرّوں سے ترکیب یافتہ ہیں جن میں سے ہر ذرّہ بطور خود یا بنفسہ ایک زندگی رکھتا ہے اور اپنی تجدید بھی کرتا ہے اور ہر ذرّہ کی زندگی اُس عضو سے کم ہے جس کا وہ ایک جزو ہے۔ اسی طرح قوم بھی ایک جان دار مجسمہ ہے جو ہزارہا منفردہ اجزا سے بنا ہُوا ہے جس میں تجدید ہوتی رہتی ہے۔ ہر فرد قوم کی ایک ذاتی زندگی ہے جو مثل زندگی ذرّہ کے تھوڑی ہوتی ہے لیکن قوم بحیثیت مجموعی (بمصداق لکل اُمۃٍ اجل) ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے اور اُس میں وہ مجموعی خصائص ہوتی ہیں جو اُس کے افراد میں منفرداً پائی جاتی ہیں۔ اس بحث میں ناموس کہن کی طرح اہم سوال یہ ہے کہ مقصودِ حیات کیا ہے اور اسے ناموس کہن سے کیا تشابہ اور تعلق ہے؟

اکثر افراد کا مقصودِ حیات یہ ہوتا ہے "طمانیت سے گزرے"۔ "مسرت نصیب ہو"۔ "فارغ البالی رہے"۔ "با اقبال ہوں"۔ "کامیاب ہوں"۔ "امتیاز رہے"۔ "انجام بخیر ہو"۔ یہی

باتیں یا یہی خواہشیں ہیں جو قریباً ہر فرد اور ہر شخصیت کے دل دماغ میں مرکوز اور متمکن ہوتی ہیں ہر پھر کر انھیں پر سب آ رہتے ہیں اور یہی امور سب کا مایۂ ناز یا مایۂ زندگی ہیں۔ اب غور کرو کیا قومی یا اجتماعی رنگ میں بھی انھیں باتوں، انھیں خواہشات اور انھیں امتیازات کی ضرورت ہے اور یہی باتیں کسی قوم کی صحیح زندگی یا مقصودِ حیات ہو سکتی ہیں؟ اگر یہی خواہشات کسی قوم کے واسطے مقصودِ حیات ہو سکتی ہیں اور انھیں کو دائمی زندگی کہا جا سکتا ہو تو ہر فرد بجائے خود ایک قوم ہے اور ہر فرد کی زندگی اور کامرانی ایک قومی زندگی اور قومی کامرانی ہے۔ شاعرِ نازک خیال کا مقصودِ حیات سے یہ مطلب نہیں۔ شاعر اُس مقصودِ حیات کی خبر دیتا ہے جو صحیح معنوں میں ایک یا کسی قوم کا مقصودِ حیات ہو سکتا ہے یا ہونا چاہیے۔

عاشق دل بستۂ وطن نیست پابند چو شمع در لگن نیست

قوم کا اعلیٰ مقصود ہے اجتماعی عصبیت۔ غیرت، حمیت اور قومی محبت، دائمی زندگی۔ جو اُن تمام خواہشات سے بالاتر ہے۔ اُن میں سے کوئی خواہش اور کوئی تمنا بھی دائمی زندگی اور اجتماعی عصبیت کی طرف نہیں لے جاتی۔ دائمی زندگی سے مراد کسی قوم کا من حیث الافراد ہمیشہ زندہ رہنا مراد نہیں بلکہ وہ زندگی جو ایک قوم کو بہ ہیئتِ اجتماعی عصبیت ایک عزت اور ایک احترام کے ساتھ حاصل ہو۔ وہ زندگی جو تنازع للبقاء کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو، وہ زندگی جس کا جوہرِ ممتاز غیرت ہو، جس کا رُکنِ رکین ناموس کہن ہو، جس کی اُفتاد عزت و احترام ہو۔ کیسی عزت اور کیسا احترام جو دوسری قوموں کے مقابلہ میں ممتاز اور محترم ہو۔ جس کی حس کیسی حس قومی مر نہ گئی ہو۔ جس کی قومی روایات اور قومی ناموس اور اجتماعی عصبیت ہر فردِ قومی کے رگ و ریشہ میں سلامتی کے ساتھ ساری ہو۔ جس کا خون بیرونی مواد سے مل کر گندہ نہ ہو گیا ہو۔ جس کے دماغ میں قومی روایات کا خون دورہ کر رہا ہو۔ جس میں عمل کی رُوح متموج اور اور موجود ہو۔ جس کا ضمیر قومی خیالات کو لیے ہوئے روشن اور منیر ہو۔

یہ باتیں ہیں جو اجتماعی رنگ میں قومی حیات کا نشان ہیں اور دوسرے الفاظ میں یہی

مقصود حیات ہو۔ منفردانہ رنگ میں جو زندگیاں اور جو مقاصد ہیں وہ جب تک کہ قومی رنگ یا قومیت میں منتقل نہ ہوں تب تک نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی فرد زندہ ہو یا کوئی قوم زندہ ہے۔

مقصود حیات کیا ہے؟

کسی قوم کا نصب العین	اجتماعی غیرت۔
کسی قوم کا عزم صحیح۔	اجتماعی استقلال۔
کسی قوم کی منزل مقصود	اجتماعی محبت۔
اجتماعی عصبیت۔	ملتی عصبیت۔

جب تک قومی رنگ میں کسی قوم کا کوئی صحیح نصب العین نہ ہو تب تک کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں کہی جا سکتی۔ یہ افراد کا کام ہو کہ وہ یہ سوچیں کہ فرداً فرداً اُن کا نصب العین کیا ہے اور کس طرح پر ایسا نصب العین ایک اجتماعی نقطہ پر ٹھہر کر قومی نصب العین کا رنگ اور درجہ اختیار کر سکتا ہے اور کس طرح اُس کے مقصود حیات میں ایک صحیح اور عملی پہلو سے تاویل ہو سکتی ہے۔ جب تک کوئی قوم بہ ہیئتِ اجتماعی نہیں سوچتی کہ اُس کا نصب العین اور مقصودِ حیات کیا ہے تب تک نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی قوم زندہ ہے۔

جب تک کہ قوم کی سچی محبت ہر فرد قوم کے دل میں پیدا نہ ہو اور ہر فرد قوم قوم یا قومیت ایک اجتماعی فرد سمجھ کر ایسی محبت لازمی نہ سمجھے تب تک قومی شیرازہ قائم نہیں رہ سکتا۔ جس قوم میں اجتماعی ہیئت موجود نہ ہو اور صرف انفرادی عصبیت پائی جاوے وہ قوم کبھی خوشحال نہیں ہو سکتی۔ جس گروہ میں اجتماعی خلوص، اجتماعی محبت اور اجتماعی غیرت نہیں ہوتی وہی گروہ یا وہی قوم قومی احترام اور قومی اکرام سے محروم رہ کر حقیر اور ذلیل ہو جاتی ہے۔

نعمتِ عشق بٹتی ہے لے لے
مستحق ہو جو اس کرامت کا

سُلطان احمدؔ (جہلم)

حضرت محسن کاکوروی

(سلسلہ کے لیے الناظر ماہ نومبر ۱۹ ملاحظہ ہو)

ذیل کی یہ دوسری نظم جس کا نام "صبحِ تجلّی" ہے اور اس میں حضرت رسول مقبولؐ کی ولادت باسعادت کا ذکر ہے، نورافزائے اہلِ بصیرت ہے۔ حضرت محسن نے اپنی اس نورانی نظم سے صفحاتِ کلیات کو وادیِ ایمن بنا دیا ہے۔ اس اُردو نظم میں محسن نے وہ زور پیدا کیا ہے جو فیضی نے اپنی مثنوی نل دمن کی حمد و نعت میں دکھایا ہے یا جامی و [illegible] دکھاتے ہیں۔ محسن بھی اپنے وقت کے جامی ہیں۔ ناظرین خود دادِ سخن دے لیں گے۔ فرماتے ہیں:-

بیضا دیِ صبح کا بیاں ہے	تفسیرِ کتاب آسماں ہے
ہے خاتمۂ شبِ دل افروز	دیباچۂ نگارِ نسخۂ روز
آثارِ سحر ہوئے نمایاں	سیپارہ [illegible] ہوئے ہے دوراں
واللیل کو ختم کر چکا ہے	آمادۂ وردِ والضحیٰ ہے
عنوانِ فلک ہے دُرِّ منثور	لوحِ زریں ہے سورۂ نور
اطرافِ بیاضِ مطلعِ صاف	والفجر کے حاشیہ پہ کشاف
معمورۂ دہر تابیاباں	ہم طالعِ کشورِ بدخشاں
ہر دشت ہے مثلِ دشتِ ایمن	ہر کوہ ہے رنگِ طور روشن

مذکورۂ بالا اشعار میں صبح کی عام حالت دکھائی ہے اور دوسرے شعرا نے بھی قریباً ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے لیکن محسن کو چونکہ ایسے پیغمبر کی صبحِ ولادت کا ذکر کرنا مقصود ہے جس نے خداشناسی، زہد و معرفت اور توحید کی نورانی شعاعیں دنیا میں پھیلائی ہیں اس لیے اُسی کے مناسبِ حال انھوں نے خیالات و جذبات فراہم کیے ہیں۔ الفاظ میں جو اثر بھرا ہے اُس میں اعجازِ سحر

کی کیفیت ہے۔ ممکن نہیں کہ سننے والے کا دل بے چین اور طبیعت متاثر نہ ہو؟ ہر شعر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ بعض مصرعے بجلی کی طرح کوندرہے ہیں اور خرمن صبر کو پھونکے دیتے ہیں۔ اُف ری گرمیِ بیاں۔ سُنیئے۔ فرماتے ہیں۔

ہنگام سپیدۂ وسحر گاہ　　ساعات ہیں روز وشب کے واللہ
اک مخبر صادق البیاں ہے　　پیغمبر آخر الزماں ہے
کیفیتِ وحی میں ہے بلبل　　ہے وقتِ نزول صحف گُل
سبزہ ہے کنارِ آبِ جُو پر　　یا خضر ہے مستعد وضو پر
نوبت ہے صدائے قمریاں کی　　تیاری ہے باغ میں اذاں کی
محوِ تکبیر فاختہ ہے　　قد قامت سروِ دلربا ہے
اک شاخ رکوع کر رہی ہے　　اور دوسری سجدہ میں جھکی ہے
سوسن کی زبان پر مناجات　　جاری لبِ جو سے التحیات
تسبیح شگوفہ یا مصور　　تحریمۂ تاک ربِّ اغفر

حضرت محسن نے جس التزام کے ساتھ ریاحین اشجارِ چمن وغیرہ کو مصروف عبادت وطاعت ظاہر کیا ہے اس نظم کو تمام وکمال دیکھنے کے بعد پورا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ مطلع اولے (بیضا وی صبح) کی معنی خیزی ملاحظہ ہو۔ ایک تو یہ معنی ہوے کہ بیضاوی صبح یعنی صبح کا بیان میں کر رہا ہوں۔ بیضاوی (ایک تفسیر کا بھی نام ہے) بیضاویِ صبح عین صبح ہوئی لیکن بیضاویِ صبح سے مراد جناب رسول خدا ہیں۔ پھر اسی صبح کی یہ تعریف ہے کہ وہ کتاب آسماں کی تفسیر ہے لیکن کتاب آسماں سے مراد (قرآن مجید لیجیے) تو اس کی تفسیر جناب رسول خدا ہوے۔ ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ ایک اردو شعر میں کیا بلاغت پیدا کی ہے۔ علیٰ ہذا ہر شعر مضموں خیز ہے۔ مثلاً یہ شعر سبزہ ہے کنارِ آبِ جو پر۔ الخ۔ کتنا نیا کہا ہے۔ کنارِ آب جو کے سبزہ کو خضر سے تشبیہ دی ہے اور وضو کرنے کی حالت کس خوبی سے بیان کی ہے۔

نوبت ہو صدائے قمریاں کی الخ۔ باغ میں قمریوں کی آواز سے کیا اچھی تشبیہ دی ہے۔ اللہ اکبر، کیا تلاشِ معنوی ہے۔ اس کے بعد کے شعر محو تکبیر فاختہ الخ کو ملاحظہ کیجیے۔ اُس کو تکبیر خواں بنایا ہے اور سرو دلربا کی قدقامت (قد قامت الصلوٰۃ) کو دیکھیے۔

اک شاخ الخ۔ جھکی ہوئی شاخ کا رکوع میں آنا اور جھکی ہوئی شاخ کا سجدہ میں جانا کیسی بدیہی اور قابلِ قبول مثالیں ہیں۔ سبحان اللہ۔

سوسن کی الخ۔ زبان پر مناجات اور لبِ جو پر التحیات کیا سامان نماز ہے گویا باغِ عالم میں تمام نہالانِ چمن اور طائرانِ نغمہ سنج تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو گئے ہیں اور یہ سارا فیض و برکت اُس نخلبندِ ریاضِ توحید (پیغمبر اسلام) کی رونق افزائی کا ہے۔

تسبیح شگوفہ الخ کیسی نئی تسبیح ہے اور اس کا وظیفہ یا مُصور (مصوّر بھی خدا کا نام ہے) پڑھنا اور تاک (درخت یا شاخ انگور) کا تحریمہ ربِ اغفر (اے رب بخش میرے واسطے) کس قدر موزوں ہے۔

حضرت محسن نے ایک سراپا رسول اکرمؐ کا لکھا ہے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:-

اس جا ہے سخن کا اور مرجع
مصرعہ ہے ہر ایک حسن مطلع

حقا کہ وہ جسم سر سے تا پا
ہے شاہدِ غیب کا سراپا

دیکھا ہے خدا نے اپنا عالم
آئینہ بنا کے قدِ آدم

کھینچی بہ کمال حسنِ تدبیر
نقاشِ ازل نے اپنی تصویر

جوہر کا بنا ہوا خزینہ
آئینۂ بے مثال سینہ

اسرارِ نُہ آسماں نظر میں
ڈوبے ہوئے ہفت بحر بر میں

کہتے تھے ملک شنی نہ دیکھی
صورت ہے کہ قدرتِ الٰہی

حضرت محسن کے اشعار ثابت کر رہے ہیں کہ فکرِ سخن کے وقت تائیدِ آسمانی اُنکے شاملِ حال ہوتی تھی اور کیوں نہ ہو مستند طور پر معلوم ہوا ہے کہ وہ تہجد کی نماز کے بعد نعتیہ اشعار باوضو بیٹھ کر لکھتے تھے۔ پھر ایسے شخص کے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کیوں نہ ہو۔ مذکورۂ بالا اشعار میں یہ شعر

دکھایا ہو الخ کس پایہ کا ہو۔ "دکھایا ہو خدانے اپنا عالم" میں عالم کے معنوں کو غور سے دیکھیے عالم کے معنی ایک خاص کیفیت کے ہیں اور عالم سے مراد دنیا بھی ہو۔ مصرعۂ ثانی اسکی تفصیل واقع ہوا ہو۔ جناب رسول خدا کے قدکو قدآدم آئینہ کہا ہو اور بے شک آں حضرت مظہر شان باریتعالےٰ ہیں اور اُسی آئینہ میں اُس نے (خدانے) اپنی قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ فرمایا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور اس عقیدہ کی تائید کلام مجید سے ہوتی ہو کہ اگر جناب رسول خدا نہ پیدا ہوتے تو دنیا نہ پیدا ہوتی۔ آپ کی ذات ظہورِ عالم کی علتِ غائی ہو۔ ہرچند کہ آپ کا ظہور سب نبیوں سے آخر میں ہوا ہو لیکن سب سے پہلے آپ کی خلقت کی خبر دی گئی

دیر آمدۂ زراہِ دُور آمدہ　　　ہرچند کہ آخر بہ ظہور آمدہٗ

علیٰ ہذا دیگر اشعار بھی باعتبار مفہوم صحیح اور بلا مبالغہ ہیں اور اس سے اُن کی مذہبی معلومات اور علمی قابلیت بدرجۂ اتم ثابت ہوتی ہو۔ وہ پامال مضامین کو اپنے کلام میں لانے سے محترز رہتے ہیں۔

ایک اور نظم شفاعت ونجات کے عنوان سے لکھی ہو۔ مضامین کی تازگی اور مصرعوں کی برجستگی ملاحظہ ہو۔ نعت میں یہ مزا اور اتنا گہرا رنگِ تغزل۔ فرماتے ہیں:-

ذرا عشق ادھر دیکھے بھالے ہوئے　　　قدم اے ستمگر سنبھالے ہوئے
نہ چلنا کہیں وہ قیامت کی چال　　　کہ لاشے شہیدوں کے ہوں پائمال
جفا تیری چتون میں اے بیوفا　　　سروہی کے قبضہ میں دستِ قضا

اس نظم میں زیادہ تر اشعار عشق ہی کی تعریف میں ہیں۔ اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر فرماتے ہیں۔ الفاظ کس قدر زور دار اور بندش کتنی چست ہے۔

پڑا جس پہ سایہ فنا ہوگیا　　　پری بن کے تو اک بلا ہوگیا
تپش مہرِ محشر کی بڑھتی ہوئی　　　ترے حُسن کی دھوپ چڑھتی ہوئی

حضرت محسن کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سروقدان گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

اس نعتیہ قصیدہ کی تمہید تشبیب پر شاید بعض لوگوں کا یہ خیال ہو کہ رسول نظم اور توحید پھیلانے والے نبی کے نعتیہ قصیدہ میں گنگا جل اور بتوں کے اشنان کا ذکر بے جوڑ بات ہے۔ اس معترضانہ خیال کی تردید خود مصنف اور حضرت امیر مینائی نے کی ہے اور تشبیب کی نوعیت کو بیان کیا ہے اور اس مستند بیان سے کوئی بدگمانی نہیں باقی رہ سکتی۔ لیکن میں نے جب اس قصیدہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ غالباً یہ قصیدہ شدت باراں کے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ مصنف خود تمہید میں لکھتے ہیں۔

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

اس تمہید پر غور کرنے سے ایک اور لطف جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جناب رسول خدا کی ولادت کے سبب سے ہندوؤں کے ایک قدیم تیرتھ گاہ میں کھلبلی پڑ گئی، اور ان کے کاروبار و مشاغل میں خلل پڑ گیا۔ چنانچہ محسنؒ فرماتے ہیں

دیکھیے ہوگا سری کشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

ایک میلہ تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

شاعر کا مقصود اصلی یہ ہے کہ وہ شان توحید کا غلبہ دکھائے۔ میرے اس خیال پر بھی ایک نکتہ چینی یہ ہو سکتی ہے کہ سری کشن کا زمانہ بہت قبل کا ہے اور جناب رسول خدا کی ولادت بعد کو ہوئی۔ اور مصنف نے تیرہ صدی کے بعد یہ قصیدہ لکھا لیکن چونکہ مصنف ایک پرانی روایت کو نیا لباس پہنا رہا ہے اس لیے وہ متقابلانہ حیثیت سے اُن مسرت آمیز جذبات کو ظاہر کر رہا ہے جن سے نہ صرف خوشی ظاہر ہوتی ہے بلکہ غلبۂ توحید ثابت ہو رہا ہے اور یہ بات قصیدہ کی تمہید سے ظاہر ہے۔ اور مصنف کا یہ کہنا کہ

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانب قبلہ ہوئی ہو یورشِ ابرِ سیاہ کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات وہبل

ان دونوں اشعار کا رخ بھی اُسی زمانہ کی طرف کیوں نہ پھیرا جائے جب عرب میں بھی بتوں کی پرستش ہوتی تھی اور یہ بُت پرستی حضرتؐ کے سبب سے دُور ہوئی اور حضور اقدسؐ کے پردہ فرمانے کے بعد بھی روحانی فیض جاری ہو۔ اگر ابرِ سیاہ یورش کر کے کعبہ کی طرف جاتا ہو تو جائے اس کی آبرو خاک میں مل جائے گی اور اب کعبہ پر لات وہبل کا قبضہ ناممکن ہو۔ بہرحال محسن اس برساتی رنگ کی تشبیب کے بعد فرماتے ہیں

شاہدِ نکہتِ گل کھڑے سے اُٹھائے گھونگھٹ چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

اس کے بعد باغ عالم کی نشو و نما کی حالت بیان کرتے ہیں

فیضِ ترتیبِ ہوا نے یہ دکھائی تاثیر زیرِ محلول ہے اخگر تو کھرل بے منقل
آبِ آئینہ تموج سے بہا جاتا ہے کہیے تصویر سے گر نا نہ کہیں دیکھ سنبھل
آج یہ نشو و نما کا ہے ستارہ چمکا شاخ میں کاہکشاں کے نکل آئی کونپل
ہرن لیتا ہے جو بجلی کے برابر سبزہ چرخ پر بادلا پھیلا ہے زمیں پر مخمل
جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہو نظر مصحفِ گل کے حواشی پہ طلائی جدول
ہمزباں وصفِ چمن میں ہوئے سب اہلِ چمن طوطیوں کی ہو جو تضمین تو بلبل کی غزل

اس طولانی بہاریہ تمہید (جو حد درجہ دلکش ہو) کے بعد وہ عنانِ قلم کو اصلی مفہوم کی طرف پھیرتے ہیں

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی و عربی زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اُس کا مشابہ ہو نہ ہمسر نہ نظیر نہ کوئی اُس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل
اوجِ رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر بحرِ وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول
جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم جس جگہ پاؤں رکھیں سجدہ کریں لات وہبل
نظر آئے اگر احمد میں مجھے دالِ دوئی روزِ محشر ہوں الٰہی مری آنکھیں احول

اب حضرت محسن پھر اپنی تشبیب سے گریز کرتے ہیں۔ یہاں اس تشبیب کی نسبت جو خیال ظاہر کیا ہو

وہ قابل لحاظ ہو اسکی مزید تصدیق ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے۔

پھر اُسی طرز کی مشتاق ہے موزونیِ طبع ــ کہ ہے اس بحر میں اک قافیہ چھایا بادل

کیا جھکا کعبہ کی جانب کو ہے قبلہ بادل ــ سجدہ کرتا ہے سوئے یثرب بطحا بادل

چھوڑ کر میکدہٗ ہند و صنم خانۂ برج ــ آج کعبہ میں بچھائے ہے مصلّا بادل

ان دونوں شعروں سے ثابت ہوگیا کہ پہلے بادلوں کی حالت اور تھی اور اب اُنکی حالت میں یہ تغیر ہوا کہ وہ ظلمتِ کفر سے نکل کر نورِ توحید میں آئے میکدہ اور صنم خانہ کے عوض کعبہ میں مصلّا بچھا دیا۔ اللہ اکبر کیا کایا پلٹ ہوئی۔ محسن کی ان نازک خیالیوں اور معجز بیانیوں کی داد کون دے سکتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا ــ شہسوارِ عربی کے لیے کالا بادل

بحرِ امکاں میں رسولِ عربی دُرِّ یتیم ــ رحمتِ خاصِ خداوند تعالےٰ بادل

قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروے حضور ــ موے سر قبلہ کو گھیرے ہوئے کالا بادل

دُور پہونچی لبِ جاں بخشِ نبیؐ کی شہرت ــ سُن ذرا کہتے ہیں کیا حضرت عیسیٰ بادل

افسوس ہو کہ اس طولانی قصیدہ کے دلکش اشعار طوالت کے لحاظ سے چھوڑ دیے گئے۔ اس قصیدہ کی تضمین جنابِ سحر نے خوب کی ہے۔

"چراغِ کعبہ" جنابِ محسن نے اس عنوان سے بھی ایک دلکش نظم لکھی ہو۔ چند اشعار اس نظم کے بھی قابلِ ملاحظۂ اربابِ سخن ہیں۔

ہے نام خدا سوادِ تحریر ــ واللیل اذا سجیٰ کی تفسیر

دریائے رواں ہو دُرِّ نظم آج ــ ہے بحرِ خفیف و بحرِ موّاج

جاتا ہے کلیم آسماں تک ــ معراجِ سخن ہے لامکاں تک

پھر اسی نظم کے متعلق رات کی تعریف ملاحظہ ہو۔

بھیگی ہوئی رات آبرو سے ــ اشنان ہوئی کعبہ میں وضو سے

اوڑھے ہوئے چادرِ گل اندام — شبنم کی ردا بہ قصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

میں نے اس نظم کے اکثر شعر چھوڑ دیے ہیں۔ یہ شبِ معراج کی تعریف ہے

کیوں شب کا یہ حسن روز افزوں — کیوں ہے یہ صبح اتنی موزوں
یہ کس کی خبر کی مبتدا ہے — موصول کہاں کہاں صلا ہے
ناگاہ خطابِ وحیِ تنزیل — عالی لقب حضور جبریل
وارد ہوئے برق ساں زمیں پر — ساتھ ان کے براق برق پیکر

تعریف براق میں یہ چند شعر ملاحظہ کے قابل ہیں۔

یوں چرخ سے نکلا وہ سبک رَو — فانوس سے جس طرح کہ پرتو
شیشے سے پری چمن سے شبنم — سیپی سے گہر حباب سے دَم
آدم سے ملک تک ایک دم میں — امکاں سے قدم تک اک قدم میں
شوخی میں سلوک شوق کا حال — رفتار میں جذب عشق کی چال

اسی سلسلہ میں معراج کے تمام متعلقہ حالات جس خوبی اور جدت سے حضرت محسن نے لکھے ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین گویا عرش سے اُتر رہے ہیں۔ حضرت محسن کے سمندِ تخیل کی مدد سے شاہدِ سخن کو جو معراج حاصل ہوئی وہ اس کے لیے باعث فخر و سربلندی ہے۔ حضرت محسن نے اکثر اشعار ایسے بلند لکھے ہیں جو شرح و تفسیر کے محتاج ہیں کیونکہ ان میں آیات قرآنی کا حوالہ ہے۔ مولوی محمد نور الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل نے جابجا ان اشعار لطیفہ کی توضیح فرما کر ناظرین کے لیے سہولت پیدا کر دی ہے۔ کلیات محسن محض نعتیہ کلام کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسمیں اصناف سخن کے کل اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ رنگ تغزل بھی ہے، ساقی نامے بھی ہیں، عشق و محبت کی نیرنگیاں اور جذبات بھی ہیں۔ بہار و خزاں، صبح و شام کے مناظر بھی ہیں اور توحید و توصیف کا تو ایک بحر ذخار ہے۔ رباعیاں اور دیگر نظمیں قابل دید ہیں۔ ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی تعریف میں بھی ہے یہ ایسا قصیدہ ہے جس کو واجد علی شاہ نے بار بار پڑھوا کر سنا ہے۔ یہ قصیدہ حضرت محسن نے کسی اور شخص سے بھجوایا تھا۔ غرض یہ کلیات ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

علم ہیئت

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ۔[1]

تاریخ علوم کا یہ ایک مسلمہ ہی کہ انسان کا قدیم ترین سرمایۂ علمی آسمان ہی کے متعلق ہی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بچے جب پوری طرح بولنے لگتے ہیں اور اپنی ماں کے آغوش میں شب کو صحن میں بیٹھتے ہیں تو کون و مافی الکون کے متعلق اُن کے سوالات کا آغاز آسمان اور ستاروں ہی سے ہوتا ہی۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آسمان کیا ہے۔ کیا ستارے اس میں جڑے ہوے ہیں، چاند بھی جڑا ہی، کیا چاند بناہی، کیا اس کے بھی ہماری طرح پانوں ہیں؟ اس کے مقابلہ میں آب و آتش خاک و باد اشجار و اثمار، حیوانات و جمادات یعنی جو چیزیں زمین کے متعلق ہیں ان کی نسبت سوال کی نوبت بمشکل سن شعور تک پہنچنے کے بعد آتی ہوگی۔ نوع انسان کا دماغ بالکل افراد کے دماغ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پس جس طرح کہ افراد کے دماغ پہلے سماء و مافی السماء کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اسی طرح غالباً نوع کا دماغ بھی سب سے پہلے سماء و مافی السماء کی طرف متوجہ ہوا۔ وجہ تقدم خواہ کچھ ہی ہو لیکن تاریخ سے ثابت ہوا ہی کہ انسان کا قدیم ترین علمی سرمایہ افلاک ہی کے متعلق رہا ہے۔ دنیا کے قدیم ترین ماہران علم ہندوستانی، مصری، اور کلدانی ہیں اور تاریخِ علوم کا یہ ایک اہم مبحث رہا ہی کہ ان میں سے اولیت کا شرف کس کو حاصل ہے۔

بہ خیال طوالت اس بحث کو ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ مگر ان تینوں قوموں میں علوم فلکیہ نہایت ترقی کر چکے تھے۔ ان کے جانشیں یونانی ہوے۔ یونانیوں میں بھی علومِ فلکیہ کی گرم بازاری رہی۔ تمام علوم کی طرح علم الافلاک پر بھی تقدم و تأخر اور ترقی و تنزل کے مختلف دور گذرے ہیں۔ ایک

[1] ترجمہ:۔ کیا نہیں دیکھتے وہ آسمان کی طرف کہ واقع ہوا ہے اُن کے اوپر اور کیسا بنایا ہم نے اُسکو اور مزین کیا ہم نے اُسکو ستاروں کے ساتھ؛ اور نہیں ہیں اُس میں کسی قسم کی شگافیں۔

زمانہ وہ تھا کہ نئے ستاروں کی حقیقت، جسامت، رفتار، سمتِ رفتار، ایام طلوع وغروب وغیرہ غیرہ مسائل کی تحقیقات سے اس کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ تنزل شروع ہوا حتیٰ کہ بالآخر رفتار و ترقی جمود و سکون سے بدل گئی۔ اُس وقت علم الافلاک کا سرمایہ صرف اَسلاف کے آرا، و افکار تھے۔ یہی حالت یہاں تک رہی کہ گلیلیو اطالی پیدا ہوا۔ گلیلیو نے اس جمود کو حرکت سے بدلا اور معلوماتِ جدید کی داغ بیل ڈالی جو ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ در اصل اس جدید انکشاف کا سبب وہ چھوٹی دُوربین تھی جو اُس نے ۱۶۰۹ء میں بنائی تھی۔ اس دُوربین سے اُس نے ستاروں کے دیکھنے میں مدد پائی۔ اس تجربے میں جب اُس کو کامیابی ہوئی تو اُسی اصول پر اُس نے ایک بڑی دوربین بنائی۔ اس بڑی دوربین کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ مشتری کے گرد گردش کرنے والے چاند بھی نظر آ گئے۔

گلیلیو کی دوربین ایک خاص حد تک بڑھائی جا سکتی تھی۔ بس اگر آلاتِ رصدیہ کی ترقی اس دُوربین تک محدود ہو جاتی تو یقیناً یہ معلومات اس قدر اہمیت و وسعت اختیار نہ کر سکتی۔ بند ٹوٹ چکا تھا اور عرصہ کے رُکے ہوئے پانی میں حرکت شروع ہو گئی تھی۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی جمودِ طویل کے بعد حرکت شروع ہوتی ہے تو پھر بغیر کسی قوی اثر کے وہ نہیں رُک سکتی۔ چند سال بعد اسی اصول پر بلّور سے دوربینیں بنائی گئیں جو بہت بڑھائی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ اسی زمانے میں ہرشل نے اتنی بڑی دُوربین بنائی جس کا چونگا ۴۰ فٹ لمبا تھا۔ اس دُوربین سے اُس نے وہ ستارے دیکھے جو گو حجم میں آفتاب سے بہت زیادہ بڑے ہیں مگر بایں ہمہ بُعدِ مسافت کی وجہ سے کروڑوں سال میں اُن کی روشنی ہم تک پہونچتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نور کی رفتار فی ثانیہ (سکنڈ) دو لاکھ میل ہے۔ دُوربین کی اس غیرمعمولی ترقی نے انکشافات کا دروازہ کھول دیا اور ایسے ایسے عجیب و غریب حقائق سربستہ بے نقاب ہوئے جن کا وہم و گمان بھی قدما کو نہ تھا۔ تم نے بارہا رات کو صدہا چھوٹے چھوٹے ستارے بکھرے ہوئے دیکھے ہوں گے مگر شاید کبھی تمہیں ان کی حقیقت پر غور کا موقع نہ ملا ہوگا۔ مگر یہ ترقی یافتہ دوربینیں بتاتی ہیں کہ یہ ستارے جو ہمیں اس قدر صغیر الحجم نظر آتے ہیں دراصل بہت بڑے

آفتاب کی طرح بڑے بڑے آفتاب ہیں ان میں سے بعض ایک اور بعض دو کا مجموعہ ہیں۔ ان کے رنگ کی طرح ان کا مادۂ قوام یا مایۂ خمیر بھی مختلف ہے۔ بعض کا قوام گیس سے ہے اور بعض یہ چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہیں۔ اسی طرح ایک ستارہ جسے عرب غُول کہتے ہیں، اس ستارہ کی یہ حالت ہے کہ کبھی کبھی اس قدر ماند پڑ جاتا ہے کہ بمشکل نظر آتا ہے ؎

وَالغُولُ بَیْنَ یَدَیَّ یَظْہَرُ تَارَۃً وَیَکَادُ یَخْفیٰ مِثْلَ ضَوْءِ المُشْعَل

(اور ستارۂ غول کبھی تو اس قدر پُر نور ہوتا ہے کہ خوب واضح نظر آتا ہے اور کبھی اس قدر بے ضو ہو جاتا ہے کہ مشعل کی روشنی کی طرح گویا چھپ جانے کو ہے) اس تغیر ظلمت و نور کے اسباب پہلے غیر معلوم تھے مگر اب تحقیق ہو گئے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس طرح ہماری زمین کے گرد چاند گردش کرتا ہے اسی طرح اس ستارے کے گرد بھی ایک اور ستارہ گردش کرتا ہے۔ یہ دوسرا ستارہ خود روشن نہیں ہے بلکہ تاریک ہے۔ اس لیے جب وہ گردش کرتے کرتے غول کے اُس حصّے کی سامنے آجاتا ہے جو ہماری زمین کے بالمقابل ہے تو غُول کا نُور کم ہو جاتا ہے اور ہماری نظر سے قریباً مخفی و مستور ہو جاتا ہے۔ پھر یہ دوسرا ستارہ جس قدر ہٹتا جاتا ہے اُتنا ہی غُول بھی نظر آتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالکل درخشاں اور جگمگاتا ہوا نمایاں ہو جاتا ہے۔ ستارۂ قطب دراصل چار ستاروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے تین تو نہایت درخشاں ہیں اور ایک کسی قدر کم روشن ہے۔ رِجلُ الجبّار دراصل دو آفتاب ہیں اس میں سے ایک سفید اور دوسرا نیلگوں ہے۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ شب کو چھٹکے ہوئے تاروں میں چند ستاروں کے گچھّے یا جھرمٹ نظر آتے ہیں۔ جدید تحقیق بتاتی ہے کہ اس قسم کے ستارے کم از کم ایک لاکھ چالیس ہزار ہیں۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ تمام ستاروں میں سے ایک ثلث اسی طرح مزدوج ہیں۔ جس طرح ہمارا عالم شمسی ہے اسی طرح ان نجوم مزدوجہ کے بھی عوالم شمسیہ ہیں یعنی جس طرح ہمارے عالم میں ایک آفتاب ہے وہ اپنی جگہ پر ساکن ہے اس کے گرد تمام دوسرے سیارے گردش کر رہے ہیں اسی طرح ان نجوم مزدوجہ میں بھی ایک ستارہ مثل مرکز کے اپنی جگہ پر قائم ہے اور دوسرے ستارے اُس کے گرد پھر رہے ہیں

البتہ ہمارے عالم اور اس ستارے کے عالم میں فرق یہ ہے کہ ہمارے عالم کے ستاروں کے حجم میں باہم بہت فرق ہے۔ مثلاً ہمارا آفتاب مشتری سے ۱۰۴۷ گونہ بڑا ہے اور اپنے تمام سیارات و اقمار سے ۷۰۰ گونہ۔ مگر ان نجوم مزدوجہ کے عالموں میں شاید اس قدر تفاوت نہیں۔ بڑے ستارے چھوٹے ستارے سے چار گونہ بڑے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ان ستاروں میں سے ہر ستارہ ہمارے آفتاب کے مانند ہے یعنی اُتنا ہی یا اُس سے زیادہ بڑا ہے۔ اور اُس کے گرد اور سیارے گردش کرتے ہیں۔ اسی خیال کا جزو اول یعنی کبر حجم تو ایک غیر مختلف فیہ مسئلہ ہے البتہ دوسرا جز یعنی اُس کے گرد ستاروں کی گردش ایک حد تک قابلِ غور ہے کیونکہ اس کے ثبوت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور برعکس اس کے نفی کی تائید میں دلائل ملتے ہیں۔ پہلے رصد کا قاعدہ یہ تھا کہ رصدگاہ میں بیٹھ کے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کس قدر وقت ضائع کرنے والا اور موجب تعب و دقت تھا۔ مگر اختراعات اور آلات کی کثرت نے جہاں اور بہت سے انسانی مصائب کو کم کیا وہاں اس علمی مشکل کو بھی آسان کر دیا۔ علماء ہیئت نے رصدگاہ میں بیٹھنا کم کر دیا اور اس کے بدلے دُوربینوں کو اس طرح رکھا کہ وہ ستاروں کے ساتھ ساتھ گھومتی جائیں۔ پھر وہ ان دوربینوں کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور اجرام سماویہ کے برزخ کا عکس ان آلات پر پڑتا رہے۔ اس طرح بغیر رصدگاہوں میں بیٹھنے کی تکلیف گوارہ کیے وہ تمام باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو کئی کئی دن تک بیٹھنے کے بعد معلوم ہوتی تھیں۔ یہ آلات ستاروں کی ہر نقل و حرکت کی تصویریں لیتے ہیں گویا اب یہی آلات ان علماء راصدین کی قائم مقامی کرتے ہیں جو رصدگاہوں میں لیل و نہار قیام پذیر رہا کرتے تھے۔ اس طریقہ سے علاوہ اختصار وقت و محنت کے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ستارہ خواہ کتنی ہی دور، اُس کا نور چاہے جس قدر کم اور حرکت و تغیر کتنا ہی خفیف ہو مگر لوح تصویر پر ہر نقل و حرکت پوری پوری آجاتی ہے اور وہ دقیق و تاریک چیزیں جو آنکھ کے مشاہدہ سے باہر تھیں اب کسی طرح نہیں رہ سکتیں۔ آلات سازی کی ترقی نے ایسے ایسے حیرت انگیز کرشمے

دکھائے ہیں کہ اگر آج سے کوئی صدی پیشتر یہ آلات ہوتے تو موجد آلات ساحر یا شعبدہ باز سمجھے جاتے۔ ترقی آلات کی ایک مثال وہ آلہ ہو جس کو رنگ نما کہتے ہیں۔ اس آلہ سے نور کے مختلف رنگ جدا کیے جا سکتے ہیں اور ان انوار کے امتحان و تجربے سے اُس جسم منور کے مادے کا سراغ لگایا جاتا ہو۔ مثلاً ایک جسم منور جستی ہے تو اُس کے نور کی تحلیل سے سبز خطوط پیدا ہوں گے یا اگر رنگ کاہی ہو تو نیلگوں خطوط پیدا ہوں گے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس آلہ رنگ نما سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ اس جسم منور کا قوام جامد ہو یا کوئی گیس۔ اور آیا وہ کسی گیس کے حجاب میں ہو یا نہیں۔ جس طرح ٹرین کی سیٹی سے اُس کے قرب بُعد کا اندازہ ہو جاتا ہو اسی طرح اجرام سماویہ کے نور سے اُن کی سمت و سرعتِ رفتار کا بھی علم ہو جاتا ہو۔ صرف شعاعوں یا اُن کے عکس کو دیکھ کے علماء ہیئت معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ ستارہ آرہا ہو یا جارہا ہو۔ ورنیز یہ کہ اس کی رفتار سریع ہو یا بطی۔ غرضکہ اجرام سماویہ کے متعلق ہماری معلومات کا ایک بڑا ذریعہ اُن کا نور ہے صرف ایک نور سے ہم ان کے مادۂ قوام، سمت اور رفتار کی حالت معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن اس آلۂ رنگ نما سے استفادہ آسان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس سے صرف خطوط نظر آتے ہیں اور اُن خطوط سے عناصر کا اندازہ کیا جاتا ہو۔ بعض عنصر مثلاً لوہے سے متعدد اور مختلف اللون خطوط پیدا ہوتے ہیں مگر چاندی کے خطوط اُس سے مختلف، اور سونے کے اُن دونوں سے متبائن ہوتے ہیں۔ پس اصلی نقطہ کار اس امر کی تمیز ہو کہ کون خط کس عنصر کے سبب سے پیدا ہوا ہو اور آیا یہ متعدد خطوط کسی ایک یا چند عنصر کا نتیجہ ہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہو کہ رصدگاہ سے آسمان کا مطالعہ کرنے والا تجربہ کار، دقیق النظر اور وسیع المعلومات ہو۔ اس آلہ رنگ نما کے استعمال سے معلوم ہوا ہو کہ ستارۂ "شعریٰ" جو ہم سے مسافت بعیدہ پر ہے فی ثانیہ (سکنڈ) ۲۶ میل کے حساب سے ہم سے دُور ہوتا ہو۔ ڈیڑھ دن تک یہی حالت رہتی ہو اس کے بعد اسی اندازِ رفتار سے وہ قریب ہونا شروع ہوتا ہو۔ علماء ہیئت نے پچاس ملین تصویریں ایسے ستاروں کی لی ہیں جو مختلف سمت میں منقسم ہیں۔ آلۂ رنگ نما

سے معلوم ہوتا ہو کہ ان دونوں قسموں کی سمتیں بالکل مقابل و محاذی ہیں۔ یہ بھی دریافت ہوا ہو کہ ہمارا نظام شمسی یعنی آفتاب مع اپنے تمام ستاروں کے ۱۳ میل فی ثانیہ (سکنڈ) کے حساب سے سماک رامح کی طرف بڑھ رہا ہو اور جس طرح ہمارا نظام سماک رامح سے ملنے کے لیے اس کی طرف جا رہا ہو اُسی طرح خود سماک رامح بھی ہمارے نظام شمسی کی طرف بسرعت تمام آرہا ہو۔

قدیم علم ہیئت میں صرف ایک آفتاب مانا جاتا تھا، مگر موجودہ علماء نے جدید آلات رصدیہ کی مدد سے ایک ہزار ملین آفتاب دریافت کیے ہیں۔ یہ تمام آفتاب مع اپنے سیارات کے اس فضاے بسیط میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی دو آفتابوں میں تجاذب ہوتا ہو اور وہ قریب آجاتے ہیں تو اُن کی رفتار چار سو میل فی ثانیہ (سکنڈ) ہو جاتی ہو۔ اس حساب سے وہ ایک گھنٹہ سے کم میں مقابل بھی ہو جاتے ہیں اور جدا بھی ہو جاتے ہیں۔ آفتابوں کی کثرت، ان کی گردش اور تجاذب و تقارب کے وقت ان کی سرعتِ رفتار کی بنا پر ہے۔ علماء فلاک کا خیال ہو کہ دو آفتاب خواہ کتنے ہی دور ہوں مگر اُن کا تصادم ہر وقت ممکن ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جس وقت دو ایسے آفتابوں میں جو ۴ سو میل فی ثانیہ (سکنڈ) کے حساب سے چل رہے ہیں تصادم ہوگا تو کیسی قیامت برپا ہوگی؟

یہ ہیں ان صدہا غرائب افلاک میں سے چند عجائبات جو جدید علم الفلاک نے ہمیں بتلائے پس اگر علم الفلاک اپنے قدیم مرکز پر رہتا تو یہ تمام حقائق اسی طرح مستور و مخفی رہتے جس طرح کہ اس دورِ جدید سے پہلے تک رہے۔ یہ جو لکھا گیا صرف علم الفلاک کے بحرِ ذخار سے ایک قطرہ ہے۔

ابوالمعارف محمد فضل الرحمٰن فہیم (حیدرآباد دکن)

فعال بدم زخلق پنہاں می کن   دشوار جہاں بردلم آساں می کن
امروز خوشم بدار فردا با من   انچہ از کرم تو می سزد آں می کن

ڈالی کا جوگ

ایک مختصر فسانہ

(۱)

گنگا کے کنارے موضع اتنشی کے مشرقی حصہ میں، جامن اور فالسہ کے گھنے درختوں میں چھپا ہوا ڈالی کا غریب گھر تھا، سفید مٹی سے پٹی ہوئی کچی اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں عارفانہ سکون و اطمینان کے ساتھ پھونس کے چھپر کو اپنے سروں پر خاموش لیے کھڑی تھیں۔ صاف و شفاف چھوٹے سے آنگن کو محصور کرلینے والی نیچی اور خوشنما دیواروں نے ڈالی کی پرورشگاہ کو تمام بستی سے علٰحدہ کردیا تھا، صحن کے مغربی پہلو میں کھرنی کا گنجان درخت تھا جس کے پتے ہوا کے اثر سے تالیاں بجا بجا کر ڈالی کے سے دل کو ہمیشہ بہلاتے رہے ہیں، گھر کے چاروں طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے جن کی گود میں ڈالی نے پرورش پائی تھی۔

شام کا وقت تھا اور تمام دن کی مسافت طے کرنے کے بعد آفتاب اپنی سنہری خوابگاہ میں آرام کرنے کے لیے جا رہا تھا۔

ایک پریشان اور گھبرائی ہوئی آواز نے بھولی بھالی ڈالی کو اسکی غریب جھونپڑی میں خیالستان کے عالیشان محل سے کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ دروازہ سے باہر اس کی مٹی بٹالی گئی اور آنے والے نے کچھ ایسے متوحش الفاظ سنائے جو متعجب کانوں سے گزرکر غریب ڈالی کے دل و دماغ کے لیے ایک غیر محدود غم و اندوہ کا ذریعہ بن گئے

(۲)

زمین اور آسمان تاریکی کی گہرائیوں میں غرق تھے، پہاڑوں کی بلندیاں اور میدانوں کی پستیاں ایک سطح میں ہو گئی تھیں اور نیلی کملی والا آج کالی کملی اوڑھے ہوئے تھا، اندھیری

رات سکون و خاموشی کا جامہ پہنے ہوئے تھی، مٹی کا چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا چراغ اپنی دُھندلی اور افسردہ روشنی میں ڈالی کے غمزدہ چہرہ کو تک رہا تھا۔

نمبردار کیلاش کی پُر اسرار گمشدگی نے ایک بھولی بھالی بچی کو اُس کے عزیز ترین باپ سے جدا کر دیا تھا کاش وہ اس بھیانک رات کے پہلے حصہ میں اپنے ہرے بھرے کھیتوں کی رکھوالی کو نہ جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ لٹیروں کا گروہ مسلح تھا اور "کولی" جس وقت کھیت کی ڈول پر سے کود کر بھاگا ہے تو بدنصیب نمبردار اُن کے قبضے میں آ چکا تھا۔

لاش کا پتہ نہ ملتا تھا، صدہا دل اُسے اپنے سینوں سے لگانے کے لیے بیچین ہیں، کاش انھیں اتنا موقع مل جاتا کہ اپنے عزیز اور بے گناہ کیلاش پر کسی قسم کی مصیبت آنے سے پہلے وہ اپنی جانیں قربان کر دیتے۔

خون کے چھینٹے بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ ہاں کھیت کے قریب والی زمین کی مٹی تو ضرور اِدھر اُدھر کو ٹی ہوئی ہے جس سے زور آزمائی اور دست بگریبان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

تمام گاؤں میں کہرام مچا ہوا ہے لیکن ڈالی اپنے گم شدہ باپ کو صبر و تحمل کے دشوار گذار راستوں میں تلاش کر رہی تھی۔

(۳)

اس غم انگیز سانحے کے بعد زمین معہ اپنے غیر محدود تغیرات کے چھ مرتبہ آفتاب کے گرد چکر کاٹ چکی ہے۔ کاتک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے، صبح کا وقت ہے، نسیم اُدھر اُدھر کھیلتی پھرتی ہے، اس کے خوشگوار اور دل لبھانے والے جھونکے موسم سرما کے ابتدائی زمانے کا عکس لیے ہوئے ہیں۔ ارتشی کے چند میل کے فاصلے پر اُدھبی پونجی والے کی طرح اُچھل اُچھل کر چلنے والی گنگا کے اُس کنارے ایک پھونس کی چھوٹی سی جھونپڑی زاہدانہ انداز سے خاموش کھڑی ہے۔ ہلکی سُرمئی ساری پہنے ہوئے ایک دوشیزہ جوگن اٹھکھیلیاں کرنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں میں پانی دے رہی ہے، بیلے اور چنبیلی کی خوشنما کلیاں اسکے مقدس اور

سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر مسکرائے دیتی ہیں، سورج جو کچھ دیر پہلے سے اس صنفِ نازک کے پاکباز سنیاسی کو خاموشی کے ساتھ مشرقی پردوں سے منھ نکال کر جھانک رہا تھا، اب آہستگی سے اوپر اُٹھ آیا ہے، کیونکہ اس نے بھانپ لیا ہے کہ ماہتاب کی للچائی ہوئی آنکھیں کھلنے سے پہلے وہ بلا شرکتِ غیرے اس متبرک اور دلچسپ نظارے سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

جوگن اپنی پھونس کی کٹی میں بیٹھی ہے جسے خود اس نے اپنے ننھے اور نازک ہاتھوں سے آٹھ شبانہ روز کی محنت میں بنا کر کھڑا کیا تھا۔

دو تصویریں اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے ہیں وہ زاہدانہ صبر و استقلال کے ساتھ تخیل کی وسیع گہرائیوں سے نکلنا چاہتی ہے کیونکہ یہ وہ عکس نہیں دو ہستیوں کے کاغذی نمونے ہیں جن کے ذریعے سے اس پاکباز جوگن کو وجود کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

(۴)

"ڈالی، آخر آج میرے بچپن کے خواب کی تعبیر نکل آئی۔ تجھے مقدس دیویوں نے پسند کر لیا، پاک خدا تجھ پر مہربان ہیں۔ تو گناہوں سے مبرا ہے، اور تیرے زہد و اتقا کی قسم کھائی جاتی ہے، تیرا جوگ مبارک ہے، اور دیوتاؤں کے بے نیاز مسکن میں تیری آواز سُنی جاتی ہے"

تو جوگن کے بھیس میں کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے، گویا خدائے بزرگ خود تیرے جسمانی مندر میں جلوہ افروز ہے۔ تو شبنم سے دُھلے ہوئے اُس پھول کے مانند پاکیزہ اور دلفریب ہے جو دیوتاؤں پر چڑھانے کے لیے لایا جاتا ہے۔

ڈالی۔ پیاری ڈالی، اُٹھ اور اپنے ہاتھوں سے مجھے برکت دے، میں اب بھی وہی "ڈالی" ہوں جو آپ سے چند سال پیشتر تھا، جب تو میرے لیے ایک حسن کی دیوی تھی مگر اب ــــ

"ڈالی! تم خدا کے لیے گذشتہ واقعات کی یاد کو میرے دل و دماغ میں تازہ نہ کرو جسے میں نے بھلا دیا ہے اُسے اب پھر یاد نہ دلاؤ، میں دنیا کو چھوڑ چکی وہ غم واندوہ کا مسکن ہے۔

میں یہاں آزاد ہوں اور مجھے آزاد رہنے دو۔"

"اور محبت کا وہ عالیشان محل جس کی تعمیر بچپن سے دونوں نے مل کر کی ہے اور جس پر روح افزا وعدوں کی استر کاری ہو رہی ہے، کیا آج بیگناہ ڈانی کے سر پر گرایا جائے گا؟"

"نہیں ڈانی نہیں، میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں میں تمہیں بھولی نہیں ہوں، میں بیوفا نہیں ہوں مگر ہاں اب میں مجاز کے شور و شر سے نکل کر حقیقت کے سکونِ اطمینان میں آگئی ہوں۔"

"مگر ڈانی ایک پرستارِ خاوند کی محبت بھرے پہلو میں تقدس و پاکیزگی پر دھبہ آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"لیکن ڈانی جو خدا کی ہو چکی ہے وہ پھر کیسے کسی اور کی ہو سکتی ہے؟"

"ڈالی شاید تم بھول گئیں کہ تمہارے پتا بھی مجھ پر مہربانی کی نظر رکھتے تھے، کیا تم اُن کی مرضی کے خلاف کرنا پسند کرو گی؟"

"پتا جی کی ہرگز مرضی نہ تھی کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو، وہ تم سے کچھ بدگمان تھے، اُنہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہاری طرف اس نظر سے نہ دیکھوں۔ ڈانی تمہیں وہ دن یاد نہیں جب میں کئی ہفتے متواتر مغموم بیٹھی رہی ہوں، تم مجھ سے میرے تفکر کا باعث پوچھتے تھے اور میں ٹال جاتی تھی۔"

"ڈالی، مجھ پر رحم کرو"

"میں اپنے پیارے پتا کی مرضی کے خلاف کبھی نہ کروں گی۔"

"ڈالی، میں بلا تمہارے زندہ نہیں رہ سکتا ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرتے ہوئے کیوں ایک بیگناہ کا خون اپنی گردن پر لیتی ہو، دونوں وقت ملتے ہیں، ایسے سہانے اور متبرک وقت میری درخواست رد نہ کرو"

"ڈانی، میں مجبور ہوں۔"

جیسے سورج ایک بخیل کی طرح اپنے زیور کو چھپا رہا تھا اسی طرح ڈالی محبت کے جذبات کو اپنے سینے میں دبا رہی تھی۔ ڈانی اب بہت دُور نکل گیا ہے۔ یاس اس کی ساتھی ہے، مایوسی اس کی غمخوار ہے اور موت اس کی رہنما۔

(۵)

ایک روز صبح کی ابتدائی دُھندلی روشنی کے وقت جوگن مقدس گنگا کے پانی میں کھڑی ہوئی ستارۂ سحری کی طرف نظر جمائے ہوئے اپنے پاکیزہ سُروں میں بھجن گا رہی تھی، گنگا کے مشرقی پہلو پر آسمان میں ارغوانی رنگ کی شگفتگی ظاہر ہوئی، تاریکی کھلتی ہوئی کلی کے بالائی نقاب کی طرح ہٹ گئی۔ اور صبح ایک ہلکے سُرخ پھول کے مانند آسمانی جھیل میں شگفتہ ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوگن کے ہر حرف پر صبح کا جادو ٹوٹ رہا ہے۔ چاند اور ستارے مغرب میں غرق ہو رہے ہیں، سورج مشرق میں طلوع ہو رہا ہے، اور اس طرح دنیا کا منظر اس کی سحر افگنی سے تغیرات کے زیر اثر ہے۔

اشنان کے بعد وہ خوبصورت اور پاکباز ہستی دریا کے باہر آئی، پانی اس کے ریشمی بالوں کی جٹا سے ٹپک رہا تھا اور نوزائیدہ سورج کی شعاعیں اُس کے جسم پر منعکس تھیں۔ ایک غصہ سے بھری ہوئی آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ ڈالی صاف نہ سمجھ سکی، پھر وہی آواز سنائی دی "ٹھہر او مکار جوگن ٹھہر" ایک قوی ہیکل انسان ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ہوئے نمودار ہوا۔ ڈالی کے دماغ میں غصہ اور حیرت کا طوفان جوش زن تھا، آواز دینے والا قریب ہوا۔ ڈالی نے اس شکل اور جسم کو کہیں ضرور دیکھا ہے، اسکے کان بھی اس آواز سے مانوس ہیں۔ اس کے دل میں عجیب طرح کے خیالات کا ہجوم تھا، انتہائی ضبط و تحمل کے بعد اُس نے بولنے کی جرأت کی۔ "میں؟"

"ہاں تو، تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کو پناہ دیتی ہے، میں نے اس خطہ کو ان تباہ کن ہستیوں سے پاک کر دیا ہے، ایک "دانی" باقی ہے، سو وہ تیری پناہ میں دیکھا گیا ہے، مجھے اُس کا پتہ دے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھولے"۔

ڈالی ایک مرتبہ پھر خیال کی وسیع اور غیر محدود گہرائیوں میں غائب ہوگئی۔ "بالکل میرے عزیز پتا کی آواز ہے، وہی چہرہ ہے وہی قد ہے، مگر اُن کے داڑھی نہ تھی، تصور مجھے دھوکا نہ دے، میں خواب میں ہوں، تخیل نے ایک پیاری شبیہ بنا کے میرے سامنے کھڑی کر دی ہے، آہ ظالم لٹیرے گروانی اور لٹیرا، ختم کیا——"

آفسر (میرٹھی)

غزلیات

کہاں تک جفا حُسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
لہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے — بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
مریضانِ غم کو حسیں پوچھتے تو — وہ کیا کچھ نہ سُنتے یہ کیا کچھ نہ کہتے
وفا بھی نہ ہوتا۔ تو اچھا تھا وعدہ — گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے
مزاروں پہ ویرانیاں بولتی ہیں — ہماری سمجھتیں تو کچھ ہم بھی کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا — زمانہ ہوا مجھ کو چپ رہتے رہتے
بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے — جو پانی نہ ہوتا۔ تو دریا نہ بہتے
میں جاگوں گا کب تک وہ سوئیں مجھے تاکے — کبھی چیخ اُٹھوں گا غم سہتے سہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
لحد کو شب غم سمجھتے ہیں ثاقبؔ — نہیں ہم۔ اکیلے میں دم بھر نہ رہتے

مرزا ثاقبؔ قزلباش (لکھنوی)

مستی کے پھر آ گئے زمانے — آباد ہوئے شراب خانے
ہر پھول چمن میں زر بکف ہے — بانٹے ہیں بہار نے خزانے
سب ہنس پڑے کھل کھلا کے غنچے — چھیڑا جو لطیفہ صبا نے
سرسبز ہوا نہال غم بھی — پیدا وہ اثر کیا ہوا نے
رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی — واعظ کے نہ چل سکے بہانے
کر دوں گا میں ہر ولی کو میخوار — توفیق مجھے جو دی خدا نے
ہم نے تو نثار کر دیا دل — اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

ایسا تو ہوا کہ ہیں وہ نادم / اتنا تو کیا مری دعا نے
ناحق اُنھیں کر دیا ہے برہم / بیتابیِ شوق برملا نے
دل زخمیِ غم ہوا جگر بھی / اک تیر سے دو اڑے نشانے
مسکن ہے قفس میں بلبلوں کا / ویران پڑے ہیں آشیانے
بیگانۂ مے کیا ہے مجھ کو / ساقی کی نگاہِ آشنا نے
اب دل ہے نہ عاشقی کے چرچے / سب خواب وہ ہو گئے فسانے
باقی نہ رہا وہ غم کا ساماں / جاری نہ رہے وہ کارخانے
اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرت / آغازِ جنوں کے پھر زمانے

حسرت (موہانی)

غایت یہی تھی حسنِ ازل کے ظہور کی / بن جائے عشقِ جان، دلِ ناصبور کی
لذت نہ پوچھ گریۂ شرمِ قصور کی / حسرت رہی نہ خندۂ عیش و سرور کی
بجلی گری ہے جب سے نگاہِ حضور کی / تسکین ہو گئی ہے دلِ ناصبور کی
کھینچ کر شہید ناز سے ملتا ہو وقتِ ذبح / خنجر میں بھی ہیں ساری ادائیں حضور کی
نشتر چبھوئے جاتے ہو نیچی نگاہ سے / اور پھر شکایتیں ہیں دلِ ناصبور کی
واعظ کا طرزِ وصف ہے پاکیزہ کس قدر / گویا زباں ہے موجِ شرابِ طہور کی
اٹھتی ہے ایک موج تو مٹتی ہے دوسری / دریا میں سیر دیکھ فنا و ظہور کی
خلوت میں بھی ہوا نہ تکلف کا خاتمہ / شوخی رہی حریف دلِ ناصبور کی
سن لے فریب خوردۂ ہستی لگا کے کان / آواز آ رہی ہے کچھ اہلِ قبور کی
رگ رگ سے روح نزع میں کھنچتی ہے الاماں / خمیازہ کش ہے جان مری کس سرور کی؟
ساحل محیطِ عشق کا پیدا نہیں ہے جب / اعجاز کیا امید ہو مجھ کو عبور کی

اعجاز (لکھنوی)

جب ہم پہ تیری چشمِ عنایت نہیں رہی　　ہم کو بھی عرضِ حال کی حاجت نہیں رہی
منت طلب ہوں جس سے میں لطفِ زندگی　　اب اُس سے کوئی ملنے کی صورت نہیں رہی
انگڑائی لیکے چل دیے ہم سوے میکدہ　　جو ابر اُٹھا تو صبر کی طاقت نہیں رہی
طرزِ وفائے یار سے دل سرد ہوگیا　　کچھ گرمیِ داغِ محبت نہیں رہی
اب میں ہوں اور حصولِ تمنا کی سعی ہے　　انجام سوچنے کی بھی فرصت نہیں رہی
تھی دل کی خاطر آپ سے ملنے کی آرزو　　دل مرگیا تو پھر کوئی حسرت نہیں رہی
پھر کس لیے یہ کوشش اخفائے حال ہے　　یا رب مجھے جو اُن سے محبت نہیں رہی
اک دل سو وہ جنون زدہ اک میں سو بدحواس　　اب تجھ کو التفات کی حاجت نہیں رہی

محوی یہ عشق اور یہ متانت ۔ یہ خامشی
کیا سچ ترے مزاج میں وحشت نہیں رہی

محمد حسین محوی (لکھنوی)

کم ہو وحشت ہوئی مرے دل کی　　بن پڑی اُس گھڑی جلے دل کی
وہ جو آئے تو کچھ کہا نہ گیا　　دل ہی میں رہ گئی مرے دل کی
بھیجدوں اُن کو میں لفافے میں　　کوئی تصویر کھینچ دے دل کی
تم نے دیکھی ہے ماہیِ بے آب　　ہو بہو نقل ہے مرے دل کی
اب تو ہوتی ہے غیر کی خاطر　　تھیں کبھی خاطریں مرے دل کی
محو ہوں اُس کی یاد میں ایسا　　کچھ خبر ہی نہیں مجھے دل کی
میری تصویر دیکھ کر فوراً　　چھیل ڈالی جگہ مرے دل کی
آگیا دل کشش تمھاری تھی　　اس میں کیا ہے خطا مرے دل کی

سچ بتانا مجھے تو اے فریاد
کچھ خبر ہے تجھے مرے دل کی

مصطفےٰ حسن فریاد (کاکوروی)

زبان اُردو کی تاریخ

اُردو کانفرنس میں پڑھنے کے لیے بعض مضامین نظم و نثر ہمیں وصول ہوے جن کے پڑھنے کا یا تو موقع نہ ملا یا وہ ملے ہی ایسے وقت کہ جلسے ختم ہو چکے تھے۔ بہرحال ہم اُن کی اشاعت الناظر میں کر دینا مناسب جانتے ہیں۔ یہ مضمون اور اس کے بعد کی نظمیں سب اسی سلسلہ میں ہیں۔

ایڈیٹر

تمہید | کسی قوم یا ملک کی ترقی و تنزل کا لحاظ مذہب۔ اخلاق۔ سیاست اور معاشرت اندازہ کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس قوم کی زبان اور ادبیات کا، احساسات و جذبات، کیفیاتِ قلوبِ انسانی اور دیگر گرد و پیش کے حالات بیان کرنے اور آسانی کے ساتھ ہر ایک امر متعلقۂ کائنات کو اظہار کرنے میں کیا پایہ ہے۔

زبان کو اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہو کہ سنسکرت۔ گریک۔ لاطینی اور عربی سب زبانوں میں اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔

ماہرین علم اللسان نے زبانوں کو دو خاندانوں میں تقسیم کیا ہو۔ آریَن اور سامی۔ اول الذکر تینوں زبانیں آریَن ہیں اور آخر الذکر سامی۔

سنسکرت۔ گریک۔ اور لاطینی زبانیں اب زندہ نہیں اگرچہ علمی طور پر ہندوستان کے پنڈت سنسکرت کو اور یورپ کے لوگ گریک اور لاطینی پڑھتے ہیں۔ ان زبانوں کا علم ادب۔ فلسفہ، شاعری اور گرامر آج تک علمی دنیا میں بڑی عزت و وقار کے ساتھ دیکھا جاتا ہو۔ مگر اب موجودہ زمانے میں یہ زبانیں مردہ ہیں۔ یعنی کوئی قوم یا ملک انھیں بول چال، روزمرہ میں استعمال نہیں کرتا۔

سامی زبانوں میں عربی زبان زندہ ہے۔ اور اس میں علوم و فنون اور ادبیات کی اس قدر دلآویزیاں اور دلچسپیاں موجود ہیں، اور اُسکے لغات اس قدر وسیع ہیں کہ ہر ایک احساس۔ جذبہ

اور کیفیت کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اس زبان میں نازل ہوکر اسے حیات جاوید کی سند عطا کی۔ عرب فاتحانہ یا تاجرانہ حیثیت سے جب وطن سے باہر گئے تو اس عجیب، دلاویز، اور دلکش زبان کو جس میں غضب کا مقناطیسی اثر موجود تھا ساتھ لے گئے۔

مغرب میں مصر، ٹیونس، الجیریا اور طرابلس کی مادری زبان عربی بن گئی۔ جو آج تک اُن ممالک میں بولی جاتی ہے اور اس سے اور آگے اندلس یعنی ہسپانیہ کی زبان جب عرب فاتحانہ حیثیت سے اُس میں داخل ہوئے، عربی ہوگئی۔ اور آٹھ سو سال تک عیسائی اور مسلمان اُس ملک میں عربی ہی میں بولتے اور عربی ہی میں سوچتے اور عربی ہی میں تصنیفات و تالیفات کرتے رہے تا آنکہ ابن رشد کے عربی فلسفہ نے جو یونانیوں کے مجموعۂ حکمت پر ایک قابل قدر اضافہ تھا، یورپ کو مسخر کر لیا۔ فرانس ہسپانیہ کے قریب تھا، اس لیے تمام یورپ پر عموماً مگر فرانس پر عربی کا خصوصی اثر پڑا۔ عرب کی شاعری، لٹریچر، فلسفہ، تاریخ اور طرز بیان نے اس ملک میں نفوذ کیا۔ تا آنکہ فرانس کا علم ادب اور طرز ادا عربی سانچے میں ڈھل گیا۔ اور اسی وجہ سے فرانسیسی زبان یورپین زبانوں میں شیریں کہلائی۔ ادھر شمال میں عراق عرب کی زبان عربی ہوگئی۔ کوفی اور بصری علمائے ادب اور اُن کی جدت طرازیاں ادباء و فضلاء سے ہمیشہ خراجِ تحسین وصول کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

مشرق میں جب عربوں نے ایران فتح کیا تو عربی آمیز فارسی نے جنم لیا۔ اعیان و خواص کی زبان "فارسی جدید" یعنی عربی آمیز فارسی بن گئی۔ اور ایشیائی زبانوں میں عربی کی آمیزش کی وجہ سے شیریں کہلائی۔

پھر فارسی جدید کو سامانیہ۔ غزنویہ۔ غوریہ۔ آل بویہ۔ سلاجقہ۔ چنگیزخانیوں۔ اتابکیوں زنگیوں۔ تیموریوں۔ اور صفویہ خاندان کی حکومت میں جو ترقی اور عروج نصیب ہوا اُسکا اندازہ فردوسی کی رزم، نظامی کی بزم، سعدی کے مواعظ و اخلاق، مولانا روم کے تصوف

حافظ کی غزل، خاقانی اور انوری کے قصائد اور دیگر بیسیوں شعرائے باکمال کی تصانیف ہو سکتا ہے۔ یہی فارسی جدید محمود اور غوریوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ اور قطب الدین ایبک سنہ ۶۰۲ھ کے زمانہ سے لیکر ۱۲۶۶ھ تک فاتح سرکاری فارسی زبان میں رہے اور دربار شاہی کی زبان بھی فارسی رہی۔ تمام خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ تصنیفات و تالیفات بھی ہندو مسلمان دونوں فارسی میں کرتے تھے، سیکڑوں شعرائے باکمال ایران سے وارد ہند ہوئے۔ خاص ہندوستان میں امیر خسرو (وفات ۷۲۵ھ) فیضی فیاضی (وفات ۱۰۰۴ھ) مرزا بیدل (وفات ۱۱۳۳ھ) اور غالب (وفات ۱۲۸۵ھ) پیدا ہوئے۔ شیخ علی حزیں متوفی ۱۱۸۰ھ اصفہان سے آیا اور بنارس میں فوت ہوا۔

امیر خسرو کا سوز و گداز، فیضی کی فلسفیانہ اور حزیں کی درد انگیز، بیدل اور غالب کی صوفیانہ نکتہ سنجیاں اور جدت طرازیاں اور ان سب بزرگوں کی مضمون آفرینیاں صاحبان مذاق کو کبھی نہ بھولیں گی۔

سکھوں کا دفتر بھی فارسی تھا گرو گوبند سنگھ صاحب کے خطوط بھی فارسی اور انکا گرنتھ بھی فارسی میں ہے۔ زمانے کے تغیر سے جب ہندو اور مسلمانوں کا میل جول ہوا، دونوں قومیں فارسی پڑھتی تھیں، چنانچہ ہندو بزرگ بھی فارسی میں بڑے پایہ کے صاحب تصنیف ہوئے ٹیک چند کی "بہار عجم" انشائے مادھو رام، ہرکرن، اور نیز کئی دیگر ہندو بزرگوں کی تصنیفات فارسی میں موجود ہیں۔

یہ امر تاریخی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ جب مسلمان ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو ہندوستان کے مختلف قطعات میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں جو سنسکرت کے فنا ہونے پر پراکرت کی شاخوں سے نکلی ہوئی تھیں۔ گو صوبۂ متحدہ میں جو مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا، ہندی بولی جاتی تھی۔ دربار کی زبان فارسی اور گھروں میں ہندی بولی جاتی تھی۔ باہمی اختلاط اور میل جول سے ان دو زبانوں میں بھی سلطان محمود غزنوی کے وقت سے تاثیر و تاثر

فعل و افعال شروع ہو گیا تھا۔ امیر خسرو (ولادت ۶۵۲ھ) کی پہیلیاں، تلسی داس، گرو مصر، سورداس، بھگت کبیر اور گرو نانک صاحب کی مصنفات اسی اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ ہندی اور فارسی کے ملاپ سے کئی "باریاں" تصنیف ہوئیں جن میں امیر خسرو کی خالق باری بہت مشہور ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں، جو ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا، جہاں فارسی شعرا کا قدر دان اور مربی تھا وہاں ہندی شعرا کو بھی انعام و اکرام سے مالا مال کرتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی قانون کے ماتحت فارسی اور بھاشا کے اختلاط سے ایک زبان پیدا ہوئی۔ جس کے افعال تو سب ہندی اور اسماء کچھ ہندی اور کچھ فارسی جدید ہیں جس میں عربی کی آمیزش ہے اور جو سات سو سال سے ہندوستان میں قدم جما کر اب ہند کی مشترکہ زبان ہو گئی ہے جس کا نام شاہجہاں کے عہد میں اُردو رکھا گیا۔ ہندو مسلمان دونوں قومیں اسے آسانی سے بولتیں اور اسی میں تصنیف و تالیف کرتی ہیں۔ اب یہ ہمارا ملکی علم ادب ہے۔ ہر ایک ہی خواہِ ملک کا فرض ہے کہ وہ قومی زبان کی خدمت کرے تاکہ ہندو مسلمان اپنی ہمزبانی کی وجہ سے دو قالب و یک جان ہو جائیں۔

ولی اور سراج دکنی سے لیکر مولانا آزاد اور حالی تک اُردو کے اعلیٰ درجے کے ناظم و ناثر پیدا ہوئے۔ سر سید۔ نواب محسن الملک۔ مولانا شبلی۔ مولانا نذیر احمد۔ مولوی عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اسے علمی زبان بنا دیا۔ محسن الملک اور مولانا نذیر احمد کو میں نے انگریزی اور اُردو داں اصحاب کے مخلوط جلسوں میں دیکھا ہے کہ اُنھوں نے اُردو زبان میں ایسی فصاحت اور روانی سے بیان کیا کہ انگریزی لکچرار اُن کے آگے ماند پڑ گئے۔ آج کل ابوالکلام خواجہ کمال الدین، صاحبزادہ آفتاب احمد اور مسٹر محمد علی، پنڈت دین دیال اور لالہ لاجپت رائے اور دیگر کئی ایک بزرگ فصیح اللسان مقرر ہیں۔ اب اُردو اُس بلند پایہ پر پہنچ گئی ہے کہ اس میں ہر قسم کے علمی مضامین مذہبی، اخلاقی، سیاسی، اور معاشرتی بڑی آسانی سے بیان کیے جا سکتے ہیں۔

بزرگان! نہ عربی ملک کی زبان بن سکتی ہے اور نہ سنسکرت۔ ہاں اُردو ملکی زبان ہو گئی ہے

جو ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کی سات سو سالہ یادگار ہے۔ اگر ہندوستان کو کبھی سیاسی اور اقتصادی ترقی کرنا ہے تو میں بوثوق تمام کہتا ہوں کہ یہ راز مُلک کی متحدہ و مشترکہ زبان اور ہمزبانی میں مضمر ہے۔ دست بدعا ہوں کہ خدائے لبند و برتر ہندو مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس زبان کو جسے اٹھارہ کرور ہندوستانی بولتے اور سمجھتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اور تجارتی اصطلاحیں اور قانون کے ترجمے اور نیز تبادلۂ خیالات میں سہولیت ہو اوجِ کمال پر پہنچائیں۔ آمین ثم آمین۔

تاریخِ اُردو خلیفہ ولید کے عہد میں محمد بن قاسم ثقفی نے ۹۱ھ میں سندھ فتح کیا جسکی حدود اُس زمانہ میں قنوج تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھو مآثر الکرام مولانا غلام علی آزاد بلگرامی۔ سندھی زبان میں اکثر عربی الفاظ ہیں۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی اخیر تک وقتاً فوقتاً اہل اسلام تاجرانہ یا مبلغانہ حیثیت سے جنوبی ہند اور خصوصاً ساحل مالابار پر آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ ان میں مالکِ دینار، اور کئی ایک اور بزرگ بہت مشہور ہیں۔ دیکھو اشاعت اسلام ڈاکٹر آرنلڈ۔ امام مکحول جو دوسری صدی کے جید علما اور مستند ائمہ میں سے ہیں، مُلک سندھ کے باشندے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ابوریحان بیرونی بھی سندھی تھا۔ تاریخ معصومی مولفۂ عہد شاہ اکبر۔ مالابار کے حوالی میں جو زیر اثر اہل اسلام تھے پنڈت شنکراچارج (ولادت ۱۶۱ھ) نے پرورش پائی۔ اس بزرگ نے بھگوت گیتا کی شرح میں مسئلۂ "ادویت" یعنی وحدت وجود پر روشنی ڈالی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مالابار سے لیکر قنوج تک جو زبانیں یا بھاشائیں اُس زمانے بولی جاتی تھیں اُن میں عربی زبان کی آمیزش تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۳ھ میں قنوج و کالنجر فتح کیے تو نندا ہندی شاعر نے سُلطان کی مدح میں ایک قصیدہ منظوم کیا جس میں عربی الفاظ بھی تھے۔ دیکھو خزانۂ عامرہ مطبوعہ مطبع نول کشور۔

مسعود کے زمانہ میں ابوریحان بیرونی کی سولہ سالہ اقامتِ ہند اور تحصیل زبان سنسکرت

اور تصنیف کتاب "کتاب الہند" جو انگریزی میں ترجمہ ہوگئی ہے۔ یہ زبردست شواہد اس امر کے ہیں کہ باہم ہندی اور عربی زبانوں میں تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال شروع ہوگیا تھا۔

بعد میں بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں ابوسعد بن مسعود بن سلیمان ایرانی متوفی ۵۱۵ھ نے جو لاہور میں سکونت پذیر ہوگیا تھا ہندی بھاشا میں کمال پیدا کیا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ علاوہ فارسی کے وہ ہندی زبان کا بھی اعلیٰ شاعر تھا۔ دیکھو خزانۂ عامرہ۔

جب محمد غوری نے ۵۸۸ھ میں راے پتھورا پر بمقام دہلی فتح حاصل کی تو چند کوی نے پرتھی سارا بنایا جس میں فارسی اور عربی الفاظ شامل تھے مثلاً محل، پروردگار، کریم وغیرہ۔ دیکھو آب حیات مولفہ آزاد دہلوی

اب ۶۰۲ھ میں دہلی پایۂ تخت مسلمانوں کا ہے۔ حضرت امیر خسرو ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے جو حسب تصریح مولانا شبلی علاوہ فارسی اور عربی کے ہندی بھاشا میں بھی صاحب کمال تھے اور اُن کا اسی قدر کلام ہندی میں بھی ہے جس قدر کہ فارسی میں۔ اُن کے ہندی گیت، دوہے، پہیلیاں، مکرنیاں، نقل اور ہندی اور فارسی مخلوط غزلیں آج تک زبانزدِ خلائق ہیں۔ یہاں ہم اُنکا ایک نسخہ درج کرتے ہیں

لودھ پھٹکری مردہ سنگ		ہلدی ریزہ ایک ایک ٹنگ
افیوں چنا بھر مرچیں چار		اُردبرابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کری		ترت پیر نینوں کی ہری

انھوں نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ۷۲۵ھ غیاث الدین محمد تغلق کے عہد میں وفات پائی۔ انکی جامعیت اور قادر الکلامی و فصیح البیانی اور زبردست شخصیت نے اُردو کی بنیاد ڈالی۔

ہندوؤں میں شنکر اچارج وجودیہ کے بعد رامانج شہودیہ پھر راما نندرامیہ اور راما نند کا مشہور شاگرد بھگت کبیر جو پندرھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے اپنے کلام میں ہندی اور فارسی مخلوط دوہوں کو تصنیف کرتے رہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس آخر الذکر بزرگ کے اشعار جس میں فارسی الفاظ کثرت ہیں تمام ہند میں عموماً اور شمالی ہند میں خصوصاً زبانوں پر چڑھے ہوے ہیں۔

کایستھوں نے فارسی میں کمال پیدا کرکے شاہی ملازمت اختیار کی۔ گرونانک صاحب کا گرنتھ

جس میں متقدمین مثلاً بابا فرید اور بھگت کبیر وغیرہ اور خود اُن کا کلام درج ہے فارسی اور ہندی اختلاط کی عمدہ مثال ہے (گرونانک متوفی ۹۶۲ھ)

جہاں ہندو فارسی پڑھتے اور ملازمت شاہی حاصل کرتے تھے وہاں مسلمان بھی جنھیں ادبیات سے قدرتی مناسبت ہو، ہندی سیکھتے تھے۔ چنانچہ مَلِک محمدؐ جائسی عہد شیر شاہ سوری میں ایک باکمال ہندی شاعر ہوا ہو جس کی مثنوی "پدماوت" ہندی بھاشا میں مشہور نام ہے۔

شاہ ہمایوں (وفات ۹۶۳ھ) نے جب سُلطان بہادر شاہ والی گجرات پر لشکر کشی کی تو رومی خاں سپہ سالار بہادر شاہ نے ہمایوں سے سازش کرلی۔ ایک طوطا مالِ غنیمت میں آیا جس نے بھرے دربار میں کہا کہ "پھٹ رومی خاں نمک حرام" یہ فقرہ ایک جانور کے مُنھ سے زبردست دلیل اس بات کی ہو کہ ہندی اور فارسی کا اختلاط بڑے شد ومد سے جاری تھا، چنانچہ اُس کا حلقۂ اثر جانوروں تک وسیع ہو گیا تھا۔

دسویں صدی ہجری کے اخیر اور گیارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بابا تلسی داس نے رامائن بھاشا میں منظوم اور بابا سورداس نے کرشن پر نظم لکھی جن میں فارسی اور ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہُوا۔ راجہ ٹوڈرمل وزیر شاہ اکبر نے اپنے متعلقہ کاروبار ال میں اُردو کی بنیادیں مستحکم کیں۔ گردھر کوی رائے یعنی ملک الشعراء ہندی بھاشا کا عہد اکبر ہی میں تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں (وفات ۱۰۳۶ھ) کے جو ہندی میں رحیم اور رحمن تخلص کرتا تھا، دوہے آج تک صاحبان مذاق مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

راجہ جے سنگھ سوائی کا دہلی اور نواحِ دہلی میں فارسی اور ہندی مخلوط بھاشا کا فی دوہا ایک اشرفی انعام دے کر شوق پھیلانا ایک بیّن دلیل اختلاط کی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "نظم" فارسی اور بھاشا مخلوط کی صورت میں نثر اُردو سے کئی صدیاں پہلے ملک ہند میں رائج تھی جسے شاہجہاں کے عہد میں اُردو نام دیا گیا اور ریختہ بھی کہتے تھے۔

اورنگ زیب خلد مکاں کے عہد میں بھی ترقی ہوتی رہی تا آنکہ اورنگ زیب کے اواخر عہد میں

ولی دکنی نے اس زبان میں ایک دیوان مرتب کیا جس کا نام نظم اُردو یا نظم ریختہ تھا۔ ولی کا دیوان اُردو میں بھی ہے اور ہندی میں بھی۔ یہ بزرگ اُردو نظم کا "رودکی" ہے۔ رودکی متنبی عربی مشہور شاعر کا ہمعصر تھا، اور ولی، بیدل اور ناصر علی سرہندی کا ہمزبان۔ جو نسبت رودکی کے سادہ اور سلیس اور صاف فارسی اشعار کو متنبی کی پیچیدہ اور بلیغ تشبیہات سے ہے وہی نسبت ولی کے سادہ اور شیریں کلام کو بیدل اور ناصر علی کے مغلق اور نازک کلام فارسی سے ہے۔ ولی دکنی ۳ سنہ جلوس محمد شاہی میں دلی آیا اس کی غزلیں بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں اور نظم اُردو کو رواج ہوا۔ اس کی وجہ کہ دہلی اور آگرہ کے بجائے جو سلاطین مغلیہ کے پایۂ تخت تھے دکن میں کیوں نظم اُردو کی پہلے پہل بنیاد پڑی، یہ معلوم ہوتی ہے کہ اورنگ زیب نے جب دکن پر چڑھائی کی اور سات سال تک ایک کثیر التعداد فوج جو مختلف النسل، مختلف الاوطان، مختلف الاقوام اور مختلف اللسان لوگوں کا مجموعہ تھی دکن میں مقیم رہی تو بلحاظ ضرورتِ وقت وزمانہ اُردو نظم نے دکن میں جنم لیا۔

اُردو زبان کے ارکان خمسہ مظہر جان جاناں (وفات ۱۱۹۴ھ) میرزا سودا (وفات ۱۱۹۵ھ) میر درد (وفات ۱۱۹۹ھ) میر تقی عمر سو سال (وفات ۱۲۲۵ھ) اور میر انشاء اللہ خاں انشا (وفات ۱۲۳۳ھ) ہیں۔ میر کا رتبہ غزل میں اور سودا کا قصائد میں سب شعرائے اُردو سے بلند ہے۔

مولانا حالی اور مولانا آزاد نے اُردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ جن کی اب نئے والی نسلیں تتبع کرتی ہیں۔ وہ انداز کلام جس نے محمد شاہ، عالم شاہ آفتاب و بہادر شاہ ظفر کے عہد میں عروج پایا تھا اب متروک ہو رہا ہے اور اس کی جگہ کارآمد شاعری لے رہی ہے جس کے پیشرو پنجاب میں ڈاکٹر اقبال اور ممالک متحدہ میں مولانا اکبر، سیماب اکبرآبادی، حسن مارہروی، آغا شاعر دہلوی، پنڈت چکبست اور کئی دیگر بزرگ ہیں۔

ہندوؤں میں رائے سرب سنگھ دیوانہ (وفات ۱۲۶۱ھ) فارسی اور اُردو میں صاحب دیوان اس کے شاگردوں میں جعفر علی حسرت اور حیدر علی حیران بہت مشہور ہیں۔ پنڈت گوری شنکر شاگرد آتش، ہرگوپال تفتہ شاگرد میرزا غالب اور دیگر کئی ایک بزرگ مثلاً سرور جہان آبادی مشہور شعرا گزرے ہیں۔

اگرچہ چند کتابیں فارسی اور ہندی بھاشا سے محکمۂ تراجم کی وساطت سے جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے قائم کیا تھا اُردو نثر میں ترجمہ ہوئیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں علمی لحاظ سے تصنیف و تالیف کو حضرت سرسید احمد خاں نے رواج دیا۔ ان کی سادہ اور دلنشیں انشا پردازی نے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور اقتصادی مضامین کے لحاظ سے جو نہایت فصاحت و بلاغت سے لکھے گئے تھے ہندوستان کو مسخر کر لیا۔ نقاد طبیعتیں ان کے گرد جمع ہوگئیں۔ محسن الملک، مولانا حالی، مولانا آزاد دہلوی، مولانا نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر اور کئی ایک دیگر بزرگ اگرچہ انشا پردازی میں اپنا اپنا انداز خاص رکھتے ہیں مگر امر واقع یہ ہے کہ سرسید ہی نے ان بزرگوں کے خیالات کو کارآمد اور مفید انشا پردازی کی طرف مائل کیا۔

سب سے پہلی کتاب مجلس نام اُردو نثر میں فضلی نے ۱۱۴۵ھ میں لکھی۔ میر تحسین نے چار درویش ترجمہ کتاب امیر خسرو ۱۲۱۳ھ، میر شیر علی افسوس باغ اُردو ۱۲۱۴ھ اور ۱۲۲۰ھ میں آرایش محفل حیدر بخش حیدری نے ۱۲۱۵ھ طوطا کہانی، تذکرۂ اولیاء اللہ، گلِ مغفرت، تاریخ نادری، بہارِ دانش کا ترجمہ گلزارِ دانش۔ حسینی نے مثنوی میر حسن کو نثر میں لکھا اور نثر بےنظیر نام رکھا۔ ۱۲۱۷ھ میں میر امن دہلوی نے کلکتہ میں باغ و بہار ماخوذ از چار درویش امیر خسرو، اور گنج خوبی ترجمۂ اخلاقِ محسنی اور حفیظ الدین احمد نے خرد افروز علاوہ بریں چند کتابیں جان گلگرسٹ اور دیگر انگریز اور فرانسیسی بزرگوں نے لکھیں۔ کچھ کتابیں سنسکرت اور بھاشا سے بھی ترجمہ ہوئیں۔

۱۲۲۲ھ میں میر انشا نے قواعد اُردو اور مولانا شاہ عبدالقادر نے ترجمۂ قرآن کریم اُردو میں اور اس کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید کی تصنیفاتِ مذہبی اُردو میں۔ ۱۸۳۵ء اُردو میں سرکاری دفاتر اور ۱۸۳۶ء میں پہلا اُردو اخبار دہلی میں جاری ہوا۔ ان کتب کی تصنیف و تالیف میں انگریزوں کی سرپرستی کو بڑا دخل ہے۔ ڈاکٹر فیلن اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے بھی اُردو کی حمایت کی۔ ایک مشاعرہ قائم کیا جس میں مولانا حالی اور آزاد نے نیچرل شاعری پر طبع آزمائیاں کیں آخر آزاد شاعری کو چھوڑ کر نثرِ اُردو کی طرف متوجہ ہوئے جو اپنے انداز میں بےنظیر ہے۔ مرزا غالب

کی اُردو سے معلّی بھی منظر رہی۔ سرسید کی تصنیفات اور پرچہ تہذیب الاخلاق نے اُردو میں جان ڈال دی۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اور کئی دیگر اہل قلم کا اُردو زبان پر احسان ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی مترجم تمدن عرب ہند۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم۔ مولوی غلام الحسنین مترجم فلسفۂ تعلیم ہربرٹ اسپنسر۔ مولوی عبدالماجد بی اے مصنف علم النفس اور دیگر کئی ایک بزرگ جو مصروف کار ہیں زبان کی خاص طور پر خدمت کر رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو کئی اعتبارات سے اُردو زبان کا پایہ بلند کر رہے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اور مولانا ابوالکلام آزاد مولانا حسرت موہانی اور دیگر کئی ایک بزرگ جن کی نگرانی میں ہفتہ وار۔ ماہوار اور روزانہ اخبار نکل رہے ہیں، اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

راقم نے ایک بیاض موسوم "بیاض نفیس" مرتب کی ہے اور ایک سو اُردو شعرا کا مختصر حال بہ ترتیب تاریخ وفات اور عہد بادشاہ درج ہے۔ نمونہ کلام میں اُن کے منتخب ادنا در اشعار درج کیے ہیں۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ اس زبان کو ترقی دینے میں سعی بلیغ سے کام لیں والسلام

الف دین نفیس (پنجاب)

گدازِ دل اگر محدود شمعِ بے زباں تک ہے　　تو سوز و ساز بھی پروانۂ آتش بجاں تک ہے
حفاظت کرنے والے خرمنوں کے مطمئن بیٹھیں　　تجلی برق کی محدود میرے آشیاں تک ہے
ستارے ٹوٹتے ہیں کس طرح دیکھو کبھی آ کر　　یہ نیرنگِ تماشا دیدۂ انجم فشاں تک ہے
کتابِ غم میں کیا رکھا ہے اے جذباتِ ناکامی　　یہ رنگینی ہماری داستانِ خونچکاں تک ہے
جھلک دکھلا کے یہ کس نے تلاطم کر دیا پیدا　　کشش ہر ایک ذرہ میں زمیں سے آسماں تک ہے
ملی ہے ذرہ ذرہ میں ہمیں تو اک نئی دنیا　　نہ پوچھو خاک کے پردہ میں آبادی کہاں تک ہے
پریشاں ہوں گے وہ بکھرے گا جب شیرازۂ ہستی　　یہ زلفوں کا سنورنا بھی مریضِ نیم جاں تک ہے
حجابِ قدس ہل جاتا ہے جب میں سانس لیتا ہوں　　خدا جانے مری بیتابیوں کی حد کہاں تک ہے
قیامت کیا عزیز اک نام ہے فریاد کا میری
فروغ اس بزمِ ہستی کا فقط ضبطِ فغاں تک ہے

(مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی)

اُردو زبان

مقدر کے مکاں میں شمع اے اُردو زباں تو ہے
ضیاے بزمِ دل تو ہے فروغِ بزمِ جاں تو ہے

چمن آرائے عالم نے وہ بخشی ہے دل آرائی
گلستانِ سخن میں رنگِ وے گلستاں تو ہے

تجھے سب جانتے ہیں میرؔ و سوداؔ کے زمانہ سے
اسیرؔ و آتشؔ و ناسخؔ کی بھی روح رواں تو ہے

امیرؔ و داغؔ نے تیرے چمن میں گل فشانی کی
وزیرِ فکر ہما کی بہارِ بوستاں تو ہے

تری درگاہ و عالی سے ملا جو کچھ ملا سب کو
مددگارِ انیسؔ و فیض بخشِ شاعراں تو ہے

اُٹھے بزمِ معانی سے ہزاروں مُرح خواں تیرے
اب اُنکے سوگ میں شمعِ مزارِ کشتگاں تو ہے

عزیزِ مصرِ دل تجھ کو کرے گی تیری زیبائی
نہیں کچھ اس کا غم گر یوسفِ بے کارواں تو ہے

زمانہ ہوگا خود قربان تجھ پر مثلِ پروانہ
وہ شمعِ جاں فزا تو ہے وہ شمعِ دلستاں تو ہے

اثر پہنچا ہے تیرا دور تک اطرافِ عالم میں
جلیسِ ہر مکیں تو ہے مکینِ ہر مکاں تو ہے

زبانیں ہیں ہزاروں پاک اے اُردو زباں تو ہے
زبانیں جان ہیں اور اُن سبھوں میں جانِ جاں تو ہے

ترے انداز پر قرباں ہیں سب مغرب سے مشرق تک
ترا سکہ ہے گھر گھر مالکِ ہندوستاں تو ہے

اداؤں میں ہوئی ہے دلفریبی کس قدر پیدا
خدا رکھے ہوئی نام خدا پوری جواں تو ہے

ہماری زندگانی کا سہارا تو ہے دنیا میں
علاجِ خستگاں تو ہے توانِ ناتواں تو ہے

تری عشوہ طرازی خلوت و جلوت میں یکساں ہے
کبھی دل میں نہاں تو ہے کبھی لب پر عیاں تو ہے

فغانِ عاشقانِ خستہ دل لب تک نہیں آتی
دل آرائی میں رشکِ سرمۂ چشمِ بتاں تو ہے

خدا کا شکر ہے تو نے ترقی کی قیامت کی
تجھے معراج کا حاصل ہے رتبہ اب جہاں تو ہے

عطا کر فیض اُسے فیاض اے اُردو زباں تو ہے
جگرؔ پر مہرباں ہو جا جگر کی مہرباں تو ہے

حکیم جگرؔ صدیقی

نظرے خوش گزرے

۲۲ جنوری کو بمقام دہلی تمام صوبجات ہند کے اعلیٰ منتظمان تعلیم کی ایک کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ہز ایکسیلنسی لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے و گورنر جنرل ہندوستان نے غیر زبان میں تعلیم دینے کے مسئلہ پر نہایت کارآمد رائے ظاہر فرمائی ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے قصداً اس بات سے احتراز کیا ہے کہ وہ کسی خاص طریقہ کے اختیار کرنے کے متعلق کوئی قطعی رائے ظاہر فرمائیں لیکن اسلوب بیان سے کسی قدر اُن کے رجحان کا پتہ چلتا ہے اور ایک معزز ہندوستانی کی جو گفتگو انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں نقل فرمائی ہے اُس سے بھی اس بات کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ رائے کس قدر صحیح ہے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پنجاب کے لاٹ صاحب کی جو رائے اس مسئلہ کے متعلق اُن کی تعلیمی رپورٹ کے تبصرہ سے بعض اخبارات میں نقل کی گئی ہے وہ بھی قریب قریب اسی نقطۂ خیال کو ظاہر کرتی ہے۔ اہل ملک میں تو ایک معقول جماعت اس خیال کی پہلے ہی سے موید تھی اب ہمارے نئے وائسرائے اور پنجاب کے لاٹ صاحب بھی اس رائے کی تائید فرما رہے ہیں۔ اس لیے امید بندھتی ہے کہ مادری زبانوں کو تعلیمی ذریعہ بنانے کے لیے جلد عملی تدابیر شروع ہو جائیں گی۔ جسے اس ملک کے باشندوں کے لیے ایک فال نیک سمجھنا چاہیے۔

اس تحریک کو اگر اہل ملک اور گورنمنٹ دونوں مل کر عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی تو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آیندہ پچاس سال میں اس ملک کے لوگوں کی حالت میں ایک نہایت ہی خوشگوار تبدیلی نظر آئیگی جو تمام ہوا خواہان ملک کی نگاہوں میں یقیناً قابل قدر ہوگی۔

انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ جو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڈھ میں ۲۷ دسمبر ۲۱ء کی رات کو پیش ہوئی تھی زیر طبع ہے اور انشاء اللہ آیندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہوگی۔ جس سے اس بات کا کسی قدر اندازہ ہوگا کہ جناب مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے سال گزشتہ کے اندر ترقی اُردو کے متعلق کیا کیا علمی کام کیے ہیں اور کس حد تک اُن کی کوششیں بارآور ہوئی ہیں۔

اسی قسم کی رپورٹ جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جوائنٹ سکرٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی ارباب کانفرنس کی خدمت میں پیش کی تھی۔ حالانکہ اُن پر ہمارے اکثر احباب ہمیشہ یہ الزام لگاتے رہتے ہیں کہ وہ تمام کارروائیاں صیغۂ راز میں رکھتے ہیں اور قوم کو حقیقت حال پر آگاہ نہیں کرتے۔ لیکن ہمیں اپنے دوستوں کی روش پر ہنسی آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صاحب جو اُن کی اور ساری قوم کی سخت سے سخت

نکتہ چینی کے فی الحقیقت سزاوار ہیں سالانہ میلہ کے ہجوم و ہنگامہ کے بعد آج پھر اپنے سراپردۂ غفلت میں معروف خواب ہیں۔

افسوس ہے کہ الناظر سیاسیات کی بحث سے احتراز کرتا رہا ہے ورنہ ہم ہیں تفصیل بتاتے کہ آنریبل سید وزیر حسن صاحب سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے سال گزشتہ کے مانند اب کی دفعہ بھی اجلاس لیگ میں اپنی رپورٹ نہیں پیش کی جو لیگ کے سال بھر کے کاموں پر شرکائے جلسہ یا عام طور پر اہل ملک کوئی رائے ظاہر کرسکتے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ کس کس کو روئیں اور کس کس سے لڑائی مول لیں۔ ایک وزیر حسن صاحب اس میدان کے اکیلے مرد نہیں ہیں بلکہ ہم نے سنا ہے کہ مسٹر مہولکر انڈسٹریل کانفرنس کے سکرٹری صاحب کو بھی رپورٹ تیار کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

مگر یہاں سید وزیر حسن صاحب یا مسٹر مہولکر سے بحث نہیں بلکہ ہمارے مخاطب وہ محترم معاصرین ہیں جو مسلم گزٹ۔ الہلال اور ہمدرد کے بعد لوائے حریت بلند کرکے قوم کے ہمدم و غمخوار بننے کے مدعی ہیں۔ اور اپنی شاندار اور پرزور تحریروں سے ہم خوابیدہ بختوں کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ شاید وہ اسے محسوس نہیں کرتے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ شیخ عبداللہ۔ سید وزیر حسن اور مسٹر مہولکر ہیں سب اسی خاک ہند کی پیداوار۔ جہاں صدیوں تک شخصی حکومت رہی ہے اور جو آج بھی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُنھیں اثرات کی بدولت حریت و آزادی کے اُس معیار سے منزلوں دور ہیں جو ہمارے محترم معاصرین کے پیش نظر ہے اور جسے اہل مغرب نے آج اپنی تمام تحریکات کا اساس اولیں قرار دیا ہے۔

جذبات عامہ کا حقیقی احترام جمہوریت کا اصلی مدعا ہے لیکن اس کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ فرقہ بندیوں اور ذاتی تعلقات کی کشمکش سے آزادی حاصل کی جائے۔ عیب و صواب کی بحث میں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ صاحبزادہ صاحب کے خیالات کیا ہیں اور سید وزیر حسن صاحب کا نصب العین کیا ہے۔ اور ہم بانگ دہل کہتے ہیں کہ جب تک ہم لوگ اس بات سے بے پروا نہ ہو جائیں گے کہ ہماری نکتہ چینی سے کون خوش ہوتا ہے اور کون ناخوش، اعلائے کلمۃ الحق ناممکن ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو نے لیگ میں تقریر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا:۔

در رہِ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بسے ——— شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

ملک کا کوئی اخبار شاید ایسا نہ ہوگا جس نے اس شعر کو نقل کیا ہو اور مسز سروجنی نائیڈو کی توصیف و تعریف میں کالم کے کالم سیاہ نہ کیے ہوں لیکن کاش وہ اس شعر کے دوسرے مفہوم پر بھی غور کرتے اور اپنے طرز عمل کو اس معیار پر جانچتے تو شاید اس سے نہایت قیمتی تحریک پیدا ہوتی اور وہ پہلے سے بہت زیادہ استقلال و ہمت کے ساتھ خدمت قوم و ملک کے لیے آمادہ ہوتے۔ اور حقیقی معنوں میں قوم و ملک کے مجنون و فدائی بننے کی کوشش کرتے۔ قدبر۔

قوت مردمی کے لیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہارون سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ آگئے ہون تو آخر مین اب ایکبار ہماری سفارش کو قبول فرمائین اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف دوا یہ آتنگ نگرہ گولیون کا استعمال فرمائین اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کرین گئی ہوئی اور ہاتھون سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتین از سر نو عود نہ کر آئین تو ہمارا ذمہ۔

صاحبو! اس باب مین زمانہ کے معزز اصحاب تعریف فرمارہے ہین لاکھون کی تعداد مین سرٹفکیٹ موجود ہیں۔ مردون اور عورتون کو یکسان مفید ہین اور نباتات سے مرکب۔ قیمت بھی بہت کم صرف فی بکس ۳۲ گولیون کا ایک روپیہ۔ آزمایش شرط ہے۔ یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپے کی دوا زیادہ ملے گی۔ (پتہ)

وید شاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

مشہور مصنفین لکھنؤ

امیر مینائی مرحوم

- صنم خانۂ عشق — ۸ر
- مرآۃ الغیب — ۱۲ر
- خیابان آفرینش — ۸ر
- خطوط — ۸ر

مولانا شرر

- جنید بغدادی — ۔ر
- ابوبکر شبلی — ۔ر
- خواجہ معین الدین — ۴ر
- عصر قدیم — ۸ر
- حروب صلیبیہ — ۔ر
- تاریخ بغداد — ۶ر
- تاریخ سندھ — ۱۲ر
- ملک زونیبہ — ۳ر
- المحکم الرفاعیہ — ۳ر
- آغائی صاحب — ۔ر
- سلینہ بنت حسین — ۲ر
- مخدرات — ۸ر
- زوال بغداد — ۸ر
- غیب دان دولھن — ۔ر
- حسن بن صباح — ۶ر
- افسانۂ قیس — ۳ر
- مقدس نازنین — ۔ر
- قیس ولبنیٰ — ۸ر
- ایام عرب
- حسن انجلینا
- منصور موہنا — ۸ر
- دلکش — ۹ر
- میوۂ تلخ — ۴ر
- ماہ ملک — ۔ر
- شوقین ملکہ — ۸ر
- ملک العزیز ورجنا — ۸ر
- رومۃ الکبریٰ — ۸ر
- فلورا فلورنڈا — ۔ر
- فتح اندلس — ۔ر
- یوسف ونجمہ — ۸ر
- آغا صادق کی شادی — ۱۰ر
- بدر النساء کی مصیبت — ۳ر
- حسن کا ڈاکو — ۸ر
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- خوفناک محبت — ۸ر
- الفانسو — ۱۲ر
- فلپانا — ۸ر
- فاتح مفتوح — ۸ر
- ہندوستان کی موسیقی — ۴ر
- سرسید کی دینی کتابیں — ۲ر

مرزا رسوا

- امراؤ جان ادا — ۱۰ر
- لیلے مجنوں — ۸ر

شوق قدوائی

- ترانۂ شوق — ۸ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- عالم خیال — ۸ر
- سیفرن ولوسی — ۸ر

سرشار

- بنتو — ۲ر
- بچھڑی دولھن — ۱۰ر
- کرم دھم — ۹ر
- پی کہاں — ۹ر
- طوفان بے تمیزی — ۱۲ر
- کامنی — ۸ر
- جام سرشار — ۔ر
- سیر کہسار — ۔ر
- خدائی فوجدار — ۔ر
- فسانۂ آزاد — ۱۵ر

جلال مرحوم

- منتخب دلکش — ۔ر
- نظم نگاری — ۔ر
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث — ۲ر
- سرمایۂ زبان اردو — ۔ر

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی — ۱۰
- مارتیتی — ۔ر
- بنگالی دولھن — ۲ر
- پرتاب — ۹ر
- معشوقۂ فرنگ — ۲ر
- یوگ — ۵ر
- آنھیلو — ۲ر
- روہنی — ۸ر

منشی احمد علی مرحوم

- تاریخ تمدن — ۴ر
- حرمان نصیب — ۸ر
- شباب لکھنؤ — ۸ر
- مرقع ادوھ — ۲ر

مسٹر عبد الماجد

- فلسفۂ جذبات — ۔ر
- فلسفۂ اجتماع — ۔ر
- مذہب انسانی — ۳ر
- فلسفہ کی تعلیم — ۲ر

منشی محمد لطیف مرحوم

- اکبر — ۔ر
- اورنگ زیب — ۔ر

احسن نگرامی

- خون آرزو — ۱۲ر
- معشوقۂ عرب — ۱۴ر
- محبوس کشت — ۴ر
- چاک گریبان — ۴ر
- زخم جگر — ۴ر

احمد علی کامل

- رادھا رانی — ۳ر
- پاربتی — ۳ر
- کلثوم — ۳ر
- دو پھول — ۳ر

مطبوعات الناظر پریس

- معاشرت — ۔ر
- واقعات انیس — ۔ر
- یادداشت عمل — ۴ر
- ناچیز کی کامیابی — ۲ر
- رامائن کے سین — ۸ر
- خیالات الیان — ۴ر
- حاکم و محکوم — ۴ر
- قواعد اردو — ۔ر
- تجلیات محسن — ۔ر
- تجارت صلیبی — ۔ر
- رموز فطرت — ۔ر
- ازدواج الانبیا — ۔ر
- تسخیر فرانس — ۸ر
- واقعات کربلا — ۸ر
- الاحسان — ۸ر
- میلاد ابن جوزی مترجم — ۴ر
- حیات نظامی — ۴ر
- ہندوستانی تاریخی کہانیاں — ۶ر
- دکن کی تاریخی کہانیاں — ۱۰
- طریق سعادت حصہ اول — ۸ر
- حصہ دوم — ۸ر
- جمیل و شینہ — ۴ر
- سیفرن ولوسی — ۴ر
- انقلاب زمانہ — ۱ر
- شوقیہ
- تاوان خدا پرست — ۱ر
- عطر انتخاب — ۔ر

الناظر بک ایجنسی۔ چوک لکھنؤ سے طلب فرمایئے

الناظر

نمبر ۹۳ جلد ۱۶ — یکم مارچ سنہ ۱۹۱۷ء

نوٹ :- ڈاکٹر ایس۔ کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹۱۷ء کی خوبصورت تیار کی ہوئی ہے۔ دس شریف پڑھے لکھے اشخاص کا نام اور پورا پتہ لکھنے پر جنتری مع ا؎ قیمت و محصولڈاک بھیجی جاتی ہے۔

امراض مستورات کی دوا

عورتوں کی بیماری میں ملک کی نہایت مشہور دوائیں دائی برنیم اور قدیم ویدک زمانے کی مشہور اسوک وغیرہ کئی ایک دوائیوں کو ملا کر یہ دوا تیار کی گئی ہے اور اسکی آزمائش بھی واقعی طور سے ہوتی ہوئی آئی ہے۔ یہ ہر اقسام کے امراض مستورات کی دوا ہے۔ کمزور رحم (بچہ دان) کو طاقت دیکر اور صاف رکھتی ہے۔ اسلیے رحم کی کل بیماریوں میں فائدہ کرتی ہے۔ اس سے حیض کی کل خرابیاں یعنی کم یا زیادہ دنوں میں حیض اور پتھو کا آنا۔ کمر۔ پیڑو۔ جانگھوں اور سر میں درد ہونا۔ جی متلانا۔ وغیرہ یہ سب شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔ پردر جسمیں سفید اور سرخ پانی کی طرح مواد نکلتا ہے خواہ رقیق یا گاڑھا ہو زیادہ یا کم آنا درد وغیرہ کی تکلیف اس دوا سے رفع ہو جاتی ہیں۔ رحم کی کمزوری کی وجہ سے حمل بے وقت ضائع ہو جاتا ہو۔ نطفہ قرار پانے سے تیسرے چوتھے مہینے میں ضائع ہو جاتا ہو۔ ایسی حالت میں اس دوا کا استعمال کچھ دنوں تک کرنے سے رحم کی سب شکایتیں دور ہو کر رحم میں طاقت پہنچتی ہے۔ جسم قوی ہوتا ہے اور حمل قرار پاتا ہے قیمت فی شیشی ۱۶ خوراک کی عہ محصولڈاک وغیرہ ۲ ر

دیکھیے اس دوا کے متعلق اسسٹنٹ آف دی فیملی ہوسپٹل ریاست رامپور کیا تحریر فرماتی ہیں:

آپنے امراض مستورات کی دوا جو روانہ کی اس سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا۔ براہ مہربانی تین شیشی اور روانہ فرمایئے۔

قوت کی گولیاں

۳۲ برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں۔ طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس اسٹرکینیا۔ ڈامینا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں۔ اس لیے مغز۔ ریڑھ۔ رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعوے رکھتی ہیں۔ زیادہ محنت۔ جوانی کی خرابی و بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز فائدہ ظہور میں آتا ہے۔ بدن میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے چہرے پر رونق لاتی ہے ضعیفی میں جوانی کی طاقت ڈوٹتے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے۔ قیمت ۴۰ گولیوں کی شیشی دو ہفتے کی خوراک کا ایک روپیہ محصولڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵ ر دیکھیے جناب ایڈیٹر صاحب مخبر دکن کیا فرماتے ہیں۔ ہمنے ڈاکٹر صاحب کی تعریف پر خیال کر کے ۴۰ گولیاں منگائیں اسکی تیر بہدف اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہیں تو ان گولیوں کی قیمت بجائے ایک روپے کے تیس روپے رکھنی چاہیے تھی۔

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۹۳ جلد ۱۶ — یکم مارچ سنہ ۱۹۱۷ء

فن پرواز کی تاریخ

نمبر ۲

اس سلسلہ کا پہلا مضمون تقریباً ڈیڑھ سال ہوئے کرمی منشی محمد عبد الحق صاحب بی اے۔ ایل ایل بی منصف لکھنؤ نے لکھا تھا۔ جو نومبر ۱۹۱۵ء کے الناظر میں شایع ہوا تھا۔ مضمون کا دوسرا حصّہ جب باوجود تقاضۂ شدید تیار نہو سکا (کیونکہ اس اثنا میں منشی صاحب موصوف ایک مستقل تالیف کی ترتیب میں منہمک ہوگئے) تو منشی صاحب نے ہمارے عزیز دوست مسٹر عزیز الرحمن کے سپرد یہ خدمت کی کہ اُسی مواد کو پیشِ نظر رکھ کر (جس سے مضمون کا پہلا حصّہ مرتب کیا گیا تھا) وہ اس مضمون کی تکمیل کر دیں۔ چنانچہ عزیز موصوف نے اس کی کوشش شروع کر دی ہے اور اُنکی پہلی قسط آج ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

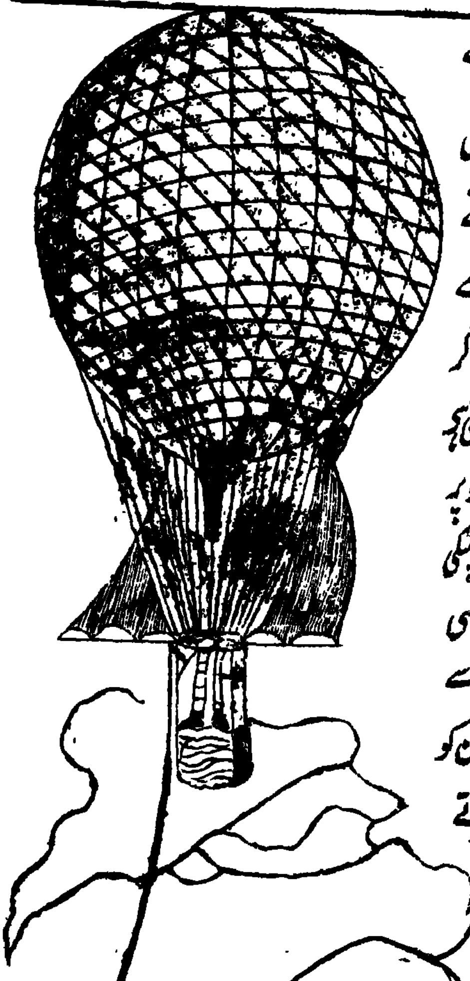
غبارہ دار طیاروں کی ساخت کی ابتدا

انسان سے کبھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ وہ ایک چیز دریافت کرتا ہے، کہ گویا کر اُس کی خامیوں کے

دفع کرنے کی فکر کرتا ہے اور ہر طرح سے اُس کو اپنے قابو میں لانے کے درپے رہتا ہے۔ ہوا پہ اُڑنے کے بعد اب یہ سوجھی کہ غباروں کو اسی طرح قابو میں لایا جائے جیسے کہ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، بیل، جہاز، ریل، موٹر، بائیسکلوں کو جدھر چاہتا ہے لیے لیے پھرتا ہے۔ تاکہ زمین، سمندر، اور فضائے آسمانی سب ہی اس کے زیرِ حکومت آ جائیں۔ لوگوں نے دماغ سوزی کی کی۔ عقلی گھوڑے دوڑائے جانے لگے۔ طرح طرح کی تجویزیں پیش کی جانے لگیں۔ لغو سے لغو اور پوچ سے پوچ تجاویز پر عمل کیا گیا۔ بادشاہ زار قوس کے تخت کا تذکرہ ہم کر ہی چکے ہیں۔ ایک شخص مسمّٰی کیسیر نے جو ملک آسٹریا کا باشندہ تھا، ۱۸۰۱ء میں ایک کتاب شائع کی اور اُس کا نام رکھا "عقابوں کے ذریعے سے غباروں کو اُڑانے کا نیا طریقہ"۔ خیر، پرانے لوگ تھے، پرانی باتیں اُن کو سزاوار تھیں، بیسویں صدی کے عقلا اگر ان پر استہزا کریں تو بجا ہے۔ تاہم اگلے لوگوں کو بُرا کہنا نہیں بھاتا۔ ہنسی تو اس پر آتی ہے کہ ابھی دس اور دس بیس برس بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ ایک جرمن حکیم نے اسی موضوع پر ایک مبسوط اور مدلل کتاب لکھ کر قیصر جرمنی کی خدمت میں پیش کی۔ اپنے طریقوں کو نہایت درجہ محنت و دلسوزی سے اور یقین کامل کے ساتھ ممکن العمل ثابت کر کے اپنے سمندِ عقل کی جولانی کی داد چاہی۔ اس میں اس نے مختلف باب قائم کیے تھے کسی میں طریقۂ تربیت، کسی میں بچوں کی پرورش، کسی میں ساز و سامان، مثل لگام و کاٹھی وغیرہ وغیرہ باتصویر دکھائے تھے۔ لطف یہ ہوا کہ جرمن گورنمنٹ نے اُس کے طریقوں کو پسند کر کے اُن کو پیٹنٹ کرا دیا تاکہ کوئی دوسرا ان کی نقل نہ کر سکے۔ ہم ہندوستانیوں میں سے اگر کسی کو یہ سوجھتی تو لوگ اُس کو زنجیر کے قابل ٹھیراتے اور بریلی کے پاگل خانے کی ہوا راست بتلاتے۔ سچ ہے جس کو پی چاہے وہی سہاگن۔

قاعدہ ہے جب ہم کسی شے کے ایجاد کرنے کا تصور قائم کرتے ہیں تو اول ہماری نظر گرد و پیش کی چیزوں پر پڑتی ہے۔ دماغ اُس شے کو چن لیتا ہے جو ہمارے ذہنی و خیالی تصور سے ملتی جلتی ہوتی ہے یا اُس کے افعال و حرکات مشابہت کا کچھ بھی پہلو لیے نظر آتے ہیں۔

فن طیران کے موجدوں نے جب نظر دوڑائی تو بادبانی جہاز ہی اُن کو ایسے نظر آئے جنکے نمونے کو پیش نظر رکھکر یہ عقدہ حل ہو سکتا تھا، کیونکہ بحر ذخار و ناپیداکنار سمندر کی سطح پر جب وہ ایک جہاز کو چلتے دیکھتے تھے تو اُس کی ہستی اس سے بھی کہیں ناچیز معلوم ہوتی تھی جیسے ایک دریا میں تنکا تیرتا جاتا ہو۔ فرق محض اس قدر تھا کہ عقل انسانی نے چند آلات ایسے ایجاد کر دیے تھے جنکی امداد سے راکب جس طرف چاہتے تھے اُن کو لیجا سکتے تھے چاہے ہَوا مخالف ہو یا موافق، طوفان ہو یا ابر و باد، ہر حالت میں منزل مقصود تک پہونچا ہی دیتے تھے۔ چنانچہ یہ تجویز قرار پائی کہ انھیں آلات کو طیاروں میں بھی لگا کر دیکھا جائے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ آلات کیا تھے؟ ڈانڈ، پتوار و بادبان۔ لیکن مونٹ گر یفر نے جس کا ذکر ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں، اس تجویز کو بے سود اور غیر ممکن العمل بتایا۔ حقیقت میں اُس کا خیال تھا بھی صحیح۔ کیونکہ بیلون بوجہ اپنے درازیِ قامت کے ہَوا کا مقابلہ خود ہی کہیں اس سے زائد کرتے تھے جتنا کہ ڈانڈوں کے ذریعہ سے ممکن تھا۔ ڈانڈ کتنے ہی تعداد میں زائد رکھے جاتے ان میں اتنی قوت ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی تھی کہ بیلون کی قوت پر فوق لے جاتے۔ ہاں اس حالت میں ممکن تھا کہ ڈانڈوں کے کھینے کی رفتار نہایت تیز و بلا وقفہ قائم رہ سکتی۔ لیکن انسانی ہاتھ کہاں تک کام دے سکتے تھے علاوہ بریں زیادہ بلندی پر یہ رفتار کی تیزی بھی بے کار ہو جاتی۔ ایک آلہ تھا ضرور یعنی پراپلر (جہاز کے پچھلے حصہ میں ایک پیچدار پہیہ ہوتا ہے اور اُس میں پتھے لگے ہوتے جس سے جہاز کو حرکت ہوتی ہے) لیکن اس کے چلانے کے لیے بھی سوا اسٹیم کی قوت کے انسانی ہاتھ کام نہیں دے سکتے تھے۔ پتوار و بادبان بھی تجربہ سے بے کار ثابت ہوے تاہم لوگوں نے اس خیال کو قطعاً ترک نہیں کیا۔ ایک شخص مسمی ایڈری نے بیلون کی قوت کم کرنے کی یہ تجویز پیش کی کہ بیلون کی روانگی کے وقت اُس میں چند لانبی لانبی رسیاں باندھ دی جایا کریں جو کچھ دور تک زمین پر گھسلتی جایا کریں گی۔ اس ترکیب سے بیلون کی رفتار شروع میں ہَوا سے کم رہے گی اسی اثنا میں بادبانوں میں اس قدر ہَوا بھر جائے گی کہ وہ بیلون کی قوت کو اپنے زیر اثر لے آئیں گے۔



بیلون معہ بادبان اور راہ نما رسی کے

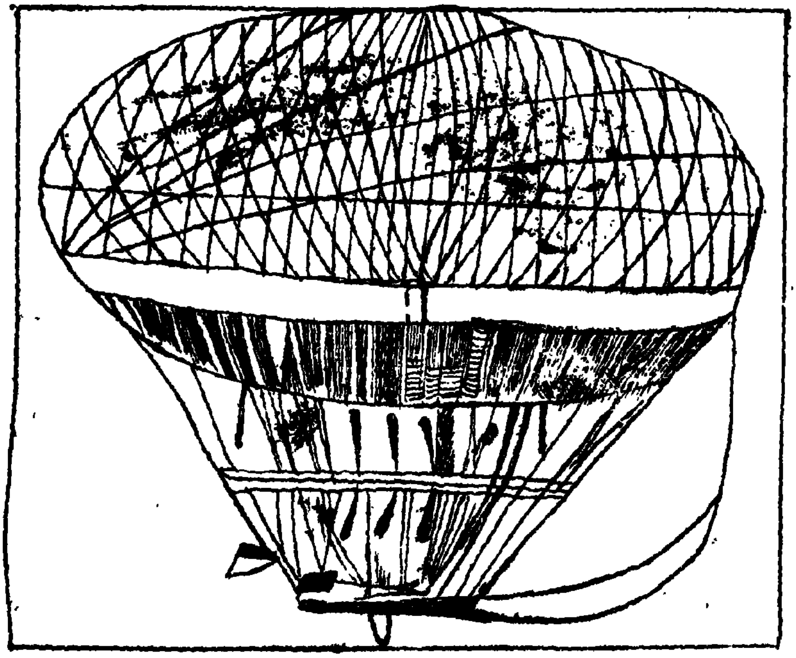
اس وقت تک ہر شخص اپنے خیال کے مطابق تجربہ کر رہا تھا لیکن یہ گتھی سلجھائے نہیں سلجھتی تھی۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں پروفیسر ویلز نے ایک کتاب 'بادبان دار بیلون' کے نام سے شائع کرائی اور اس میں یہ ثابت کیا کہ اگر طیارہ 'ماہی نما' بنایا جائے تو کامیابی ہوسکتی ہے اُس نے یہ دلیل پیش کی کہ جب کوئی شے اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر متوازی الافق پھینکی جاتی ہے تو داہنے بائیں اس میں خفیف سی لغزش ضرور ہوجاتی ہے اور اس جنبش سے فائدہ اُٹھا کر جس سمت کو چاہیں گے بیلون کو لیجا سکیں گے۔ غالباً دریا میں مچھلیوں کو تیرتے دیکھکر اُسنے یہ رائے قائم کی ہوگی۔ اسکا یہ بھی خیال تھا کہ جب طیارہ زیادہ بلندی پر پرواز کرجایا کرے گا تو بیلون کی حدت کو گھٹا بڑھا کر مطلب حاصل کرلیا جائے گا۔ اس کے نزدیک ایک ماہی نما بیلون جس کی لمبائی ۱۵۰ فٹ اور جس کا قطر ۵۰ فٹ ہوگا وہ ۱۰ میل فی گھنٹہ سفر کرسکے گا۔ ٹھیک ایک صدی پیشتر بھی خیال ایک شخص مسمی گاٹی کے ذہن میں قائم ہوا تھا لیکن وہ بیلون کی بیضاوی شکل رکھنے کا قائل تھا۔



اسکاٹ جو ماہی نما بیلون

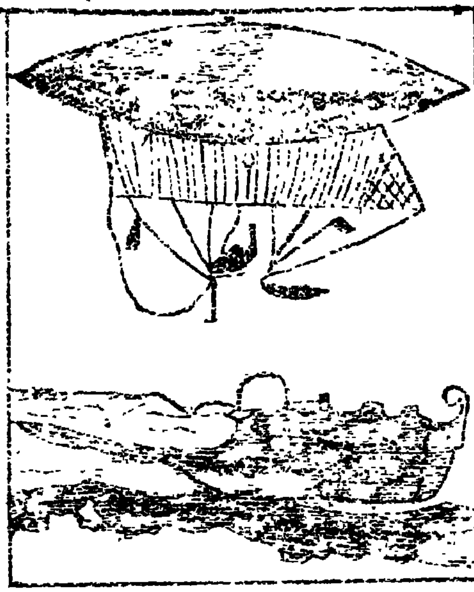
باوجود ان ناکامیوں اور دماغ سوزیوں کے بالآخر اسی پر سب متفق الرائے

ہوے کہ ڈانڈ و پتوار اور بادبان سے مطلب برآری جوئے شیر لانے کے ہم معنی ہوگا۔ کاڑا کی رائے میں مثل جہاز کے طیاروں میں بھی پیڈل وہیل (وہ پہیہ جس کی آروں میں تختے جڑے ہوتے ہیں اور دُھرے کو حرکت دینے سے پانی کو کاٹتے ہیں) لگائے جائیں۔ ڈی جان کی کی کلیۃ الصنعت نے گیاٹن ڈی مارو کو اس مسئلہ کے حل کرنے پر مقرر کیا۔ اس کی تجویز تھی کہ طیارہ میخ نما بنایا جائے۔ ایک طرف نوکدار اور دوسری طرف چپٹا ہو، لیکن چول کسی کے بٹھائے نہ بیٹھی۔ میوسنیر نے گاٹی کے خیال کی تائید کی کہ طیارہ بیضاوی الشکل ہونا چاہیے۔ اپنے طیارے کا جو خیالی نقشہ اس نے قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ بلون میں بجائے ہوا کے ایک بیگ کے کئی بیگ رکھے جایا کریں۔ بین وسط میں تین پر ایئر قائم کیے جائیں۔ جن کے چلانے کے لیے ۸۰ نفر درکار رہوں گے۔ کارکشتی نما ہو۔ نیز اُس کا ذہن اسپر بھی منتقل ہوا کہ طیارے میں دم کی کشش سے بھی کام لیا جائے



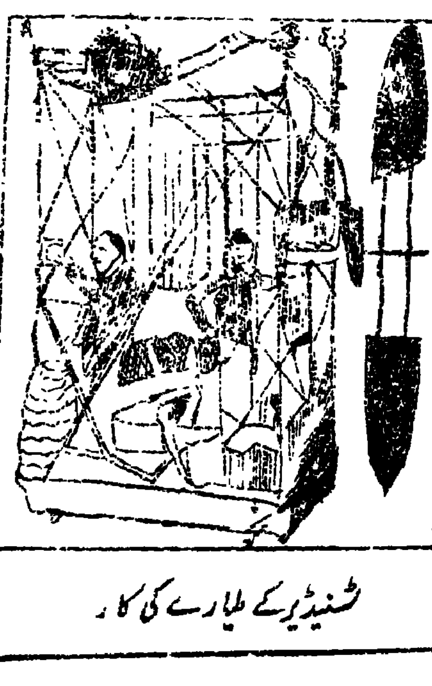
جنرل میوسنیر کا خیالی طیارہ

افسوس کہ جنگ سباستی میں میوسینیر کام آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی غبارہ دار طیاروں کا خیال بھی کچھ عرصہ کے لیے طاق نسیان میں رکھ دیا گیا۔ جس وقت بادشاہ پرشیا کو میوسینیر کے ہلاک ہونے کی خبر پہنچی اس نے اس کے اعزاز میں جنگ کو اس وقت تک ملتوی رکھنے کے لیے احکامات صادر کیے تاوقتیکہ میوسینیر کی تجہیز و تکفین نہ ہو جائے۔ علم و ہنر کی قدر افزائی اس کو کہتے ہیں! بہت عرصہ کے بعد یعنی ۱۸۵۲ء میں ایک شخص مسمی گیفرڈ نے جو اس سے پیشتر اسٹیم بوائلروں کے لیے پچکاری کی ترکیب ایجاد کر چکا تھا اپنی توجہ غبارہ دار طیاروں کی طرف مبذول کی۔ گیفرڈ کو ایک ایسے اسٹیم انجن کے بنانے میں کامیابی ہو گئی جس کی قوت پانچ گھوڑوں کی تھی اور وزن بھی کچھ زیادہ نہ تھا یعنی صرف ایک سو پونڈ۔ گیفرڈ کے لیے فن طیران کا مرد میدان کا لقب زیب دیتا ہے۔ اس نے اپنا طیارہ سگار کی شکل کا بنایا جس کا قطر ۴۰ فٹ کا تھا، لمبائی ۱۴۴ فٹ، اور ۸۸۰۰۰ فٹ مکعب وسعت۔ اس نے ایک گول لکڑی کا ۶۶ فٹ لمبا لٹھا جال سے ۲۰ فٹ کے فاصلہ پر متوازی الافق شکل میں قائم کیا اور اسکو متعدد رسیوں سے بیلون سے باندھ دیا۔ اس لٹھے کے آخری حصہ میں پتوار قائم کیا گیا۔ کار اس لٹھے سے بیس فٹ نیچے لٹکتی رہتی تھی اور اسی میں موٹر و پروپیلر نصب تھے۔ موٹر تین گھوڑوں کی قوت کا تھا، اس موٹر کا وزن ۳۵۰ پونڈ تھا۔ اور وہ پروپیلر کو جس میں تین پنکھے لگے ہوئے تھے اور جس کا قطر ۱۱ فیٹ تھا فی منٹ ۱۱۰ چکر دیتا رہتا تھا۔ طیارے کا مجموعی وزن مع ایک نفر کے ۴۲ من کے اندر ہی رہا۔ گیفرڈ کی خوشی کا کیا پوچھنا تھا۔ صدیوں کی ریاضتوں اور محنتوں کے بعد اس شاہد رعنا کی شکل عروسی کی رونمائی کی نوبت آئی جس کی تمنا میں ہزاروں مشتاقان اجل سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ افسوس کہ پہلی ہی منزل میں ایسی ٹھوکر لگی کہ اگر کوئی کچی ہمت والا ہوتا تو بیٹھ رہتا۔ طیارہ پہلے ہی سفر میں جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ گیفرڈ نے ہمت و استقلال کی باگ ہاتھ سے نہ چھوڑی بلکہ اسکی آتش شوق پر اس ناکامیابی نے تیل کا کام کیا۔ اس نے فوراً ایک دوسرا بیلون طیار کیا۔ بعد ازاں تیسرا۔



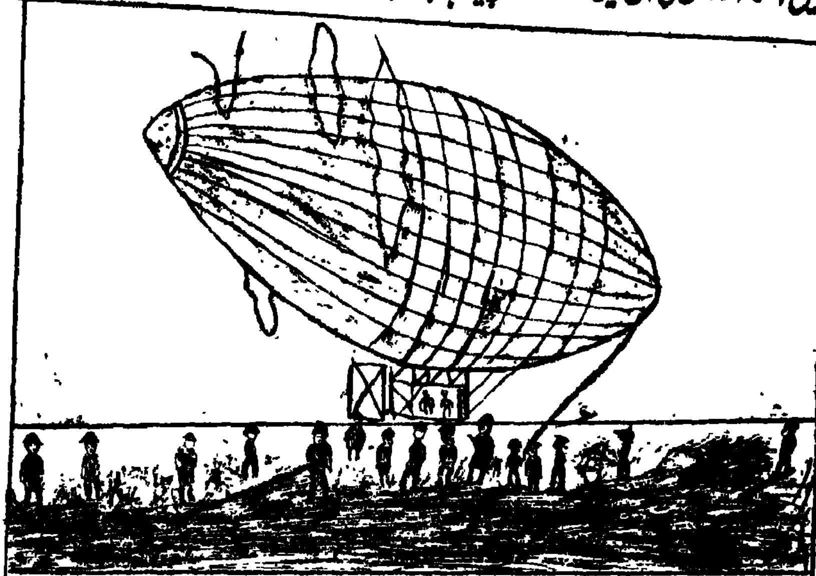
جرمن قوم جس کی جبیں پر اقبال مندی کا ستارہ اس وقت بھی چمک رہا تھا، اس طرف سے غافل تھی۔ فرانس کے غباروں اور طیاروں کی دوڑ پر بیدریغ باتیں بہت ہنستے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص پال ہینلین نے ایک طیارہ بنایا، جو ۱۶۴ فٹ لمبا تھا۔ اس کا قطر ۳۰ فٹ تھا اور وسعت ۸۵ ہزار فٹ تھی۔ بجائے اسٹیم انجن کے اس نے ۴ گھوڑوں کی قوت والا گیس انجن (گیس کا موٹر طیارے پر ۱۸۶۰ء میں لینوائر نے تیار کیا تھا) استعمال کیا۔ پہلی پرواز میں اس کے طیارے کی رفتار ۱۵ فٹ فی سکنڈ رہی۔ البرٹ ٹیسنڈئے اور ٹوکونی ترمیم و تنسیخ نہیں کی البتہ کار اس نے بید کی بنائی اور وہ تجربہ ناکام تھا

سائنس کو ترقی تو ہو ہی رہی تھی، نئی نئی قوتوں کے انجن اور طرح طرح کی مشینیں آئے دن اختراع ہوتی رہتی تھیں۔ فرانس میں ٹسانڈیئر نے بجائے گیس کے موٹر کے برقی موٹر اپنے طیارے میں لگایا۔ اس وقت تک طیارہ بازوں کو ایک بڑی دقت یہ پیش آتی تھی کہ طیارے کے اترتے وقت سخت دھکا محسوس ہوا کرتا تھا۔ اس کے دفعیہ کی اس نے یہ تدبیر نکالی کہ طیارے میں ایک گائیڈ روپ (راہ نما رسی) لگا دی۔ اپنے سفر عروجی میں اس نے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر ۲ ½ میل کا سفر کیا۔ جرمن سائنس داں پام کارٹن نے برقی موٹر کے بجائے بنزائن موٹر لگایا۔ ایک آسٹرین طیارچی مسمی شوارز نے



شنیڈر کے طیارے کی کار

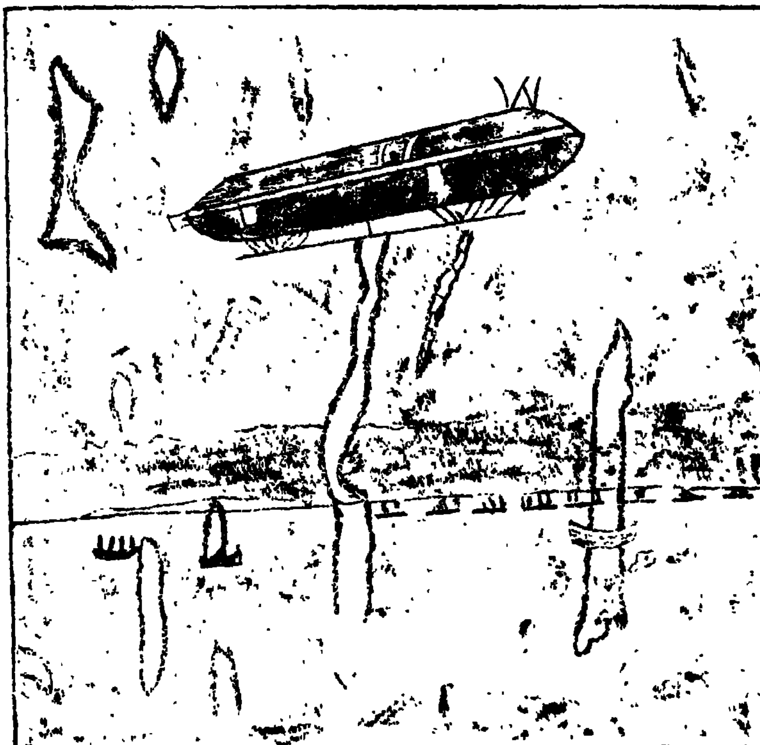
اپنا بیلون المونیم کا بنایا جس کی پلیٹ کی دبازت (۰۰۰۸ء انچ) تھی۔ سوارز کا پہلا طیارہ تباہ ہوکر زمین میں آلگا اور آن کی آن میں لاکھوں روپیوں پر پانی پھر گیا۔



ڈاکٹر ڈوابزٹ کا طیارہ پرواز کرنے کو ہے

اب وہ زمانہ آگیا کہ ایک شخص جس کو فنِ طیران کا اگر خدا کہیں تو کہہ سکتے ہیں، سرزمین جرمنی سے نمودار ہونے کو تھا۔ وہ کون؟ کونٹ وان زیپلین، جس کے طیراتِ حربیہ ہلاکتِ انسان کے لیے آئے دن خروج کرتے رہتے ہیں۔ مرد تھا بڑی ہمت والا اور مستقل مزاج۔ ابتدا میں بیچارہ اس قابل بھی نہ تھا کہ طیاروں کے بنانے کا صرفہ اُٹھا سکتا۔ مجبوراً اس نے ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کرکے اپنے تجربے شروع کیے۔ طُرّہ یہ ہوا کہ پہلی ہی پرواز میں اس نے بھی مُنھ کی کھائی۔ پر ہمت نہ ہارا۔ اس کا طیارہ کوئی معمولی طیارہ نہ تھا۔ اس کی اعجوبگی وحیرت افزائی، ٹھاٹھ، اور خد وخال زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ اس کا صانع کوئی معمولی کاریگر نہ تھا بلکہ مملکت طیران کا بننے والا تاجدار، یا فن طیران کا آنے والا شخص۔ کونٹ موصوف کا طیارہ قد وقامت میں اُن سب طیاروں پر سبقت لے گیا تھا جو اس وقت تک تیار ہو چکے تھے۔ قالب لیومنیم کا تھا، جس پر ریشمی کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ ہوا کے بیگ اس قدر وسیع تھے

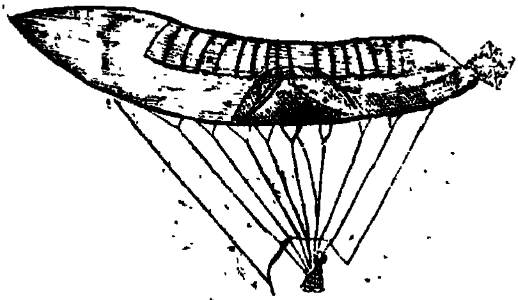
چار لاکھ مکعب فٹ گیس ان میں آسانی بھر جاتی تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے کی لمبائی ۴۲۰ فٹ تھی۔ ایک کار کے بجائے اس نے دو کاریں لگائیں اور ہر ایک کار میں ایک ایک موٹر ۱۶ گھوڑوں کی طاقت کا لگا ہوا تھا جن سے پر اپلر چلتے تھے۔ اس نے اپنا سفر جولائی سنہ ۱۹ء میں کیا۔ کونٹ زپلین کی کوششیں اب تک جاری ہیں۔ یورپ کی جنگ عظمیٰ چھڑ جانے کے بعد سے



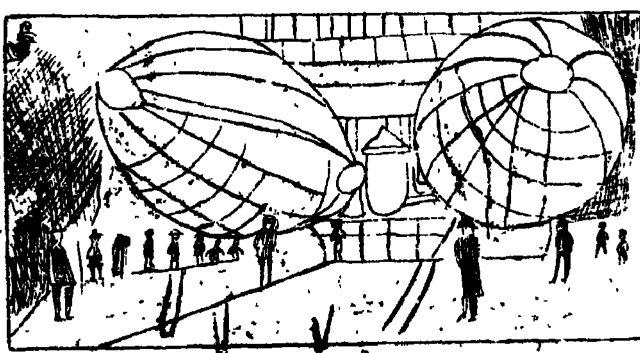
کونٹ زپلین کا مہار دار طیارہ پرواز کرنے کو ہے

سنز زپلین (فوق الجثہ زپلین) کے طیار ہونے کی اطلاعیں ہم کو ملی ہیں۔ ان کی قوت، جسامت، رفتار حقیقت میں کیا ہے؟ ہم ٹھیک ٹھیک بتانے سے قاصر ہیں۔ جب اصول قائم ہو گیا ہے تو جس قدر نہ ترقی اس فن میں ہو جائے تھوڑی ہے۔ کونٹ موصوف کے علاوہ دوسرے ماہران نے بھی اس طرف توجہ بلیغ قائم رکھی اور مختلف الہیئت طیارے تیار کر کے اُڑائے لیکن زپلین پر فوق کسی ایک کو بھی نہ حاصل ہو سکا۔ ہم ذیل میں دیگر طیاروں کی محض شکلیں دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ چونکہ وہ

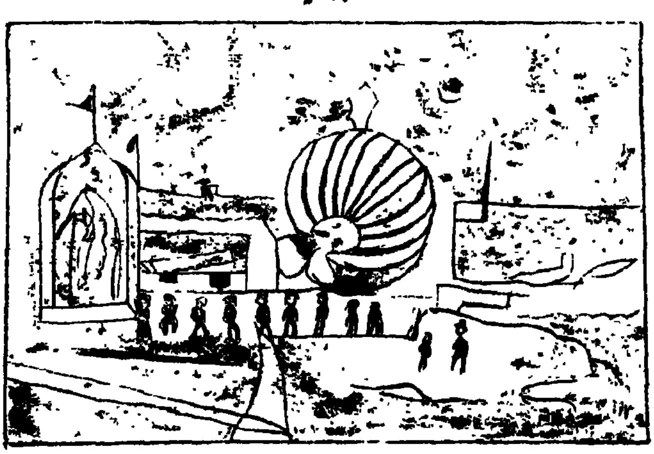
نہیں ہوئے اس لیے ان کا ذکر بھی لاحاصل ہے۔



سینٹوز ڈیومونٹ کا طیارہ



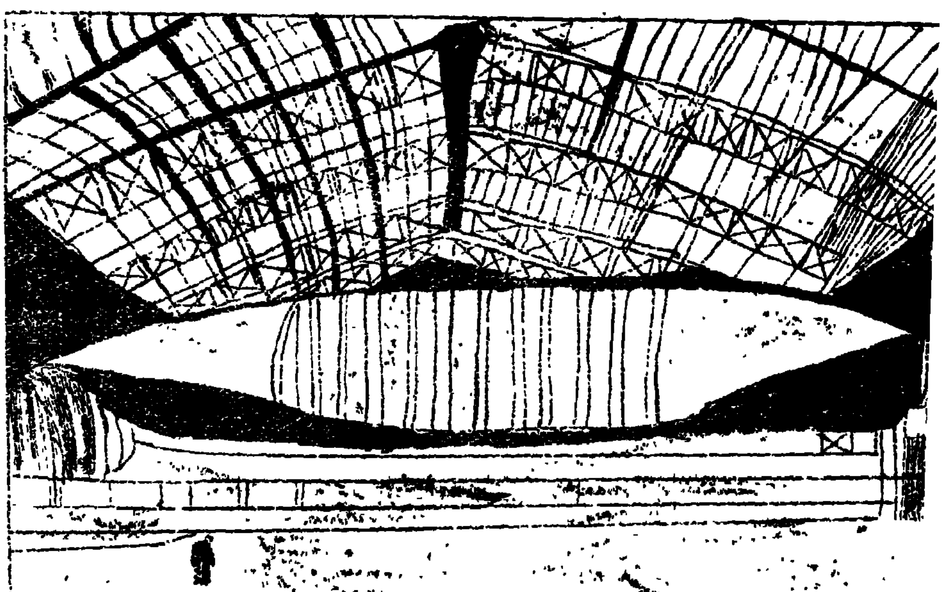
روز کا ڈبل بیلون



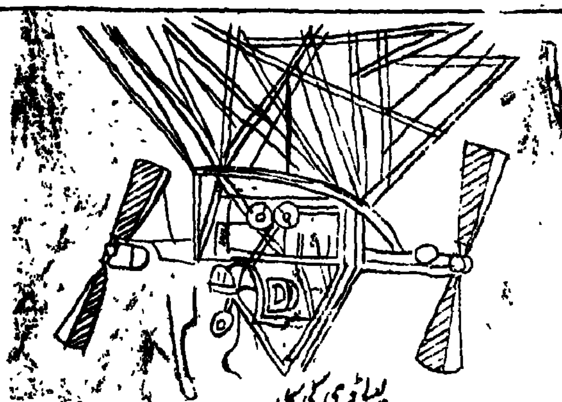
سی دیروز کا بیلون

پچھلے پندرہ بیس برس میں اس فن کی طرف دیگر ممالک کی گورنمنٹوں نیز علما و سائنس دانوں کی توجہ خاص طور سے رہی ہے۔ چنانچہ ہزاروں روپیوں کے انعامات مقرر کیے جاتے رہے۔ قوم کی طرف سے طیارچیوں کی اعانت کافی طور پر ہوتی رہی اور جس وقت سے حکومتوں پر طیاروں کے فوائد فوجی نقطہ خیال سے عیاں ہوئے کوڑیوں کی طرح روپیہ اور گنیاں ان پر بیدردانہ صرف کر رہے ہیں۔ فرانسیسی قوم کے

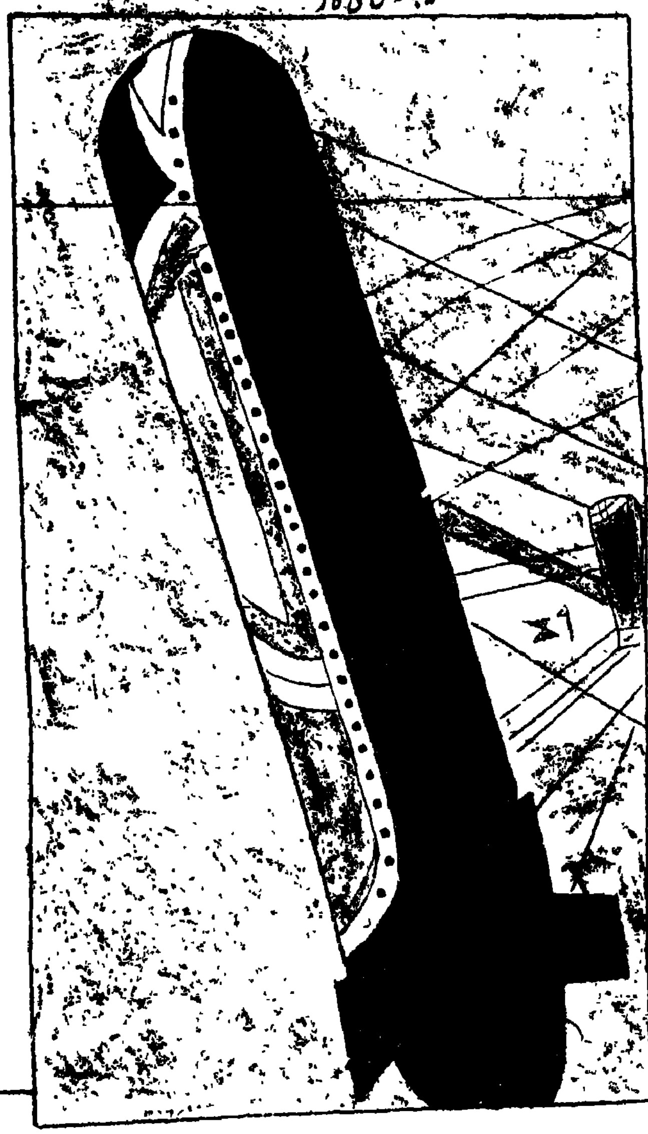
جس کو فن طیران کی لیڈری کا فخر حاصل چلا آتا تھا جرمنی کی سرگرمی دیکھ کر کان کھڑے ہوگئے اور اس نے بھی لیباڈی جیسے کامل الفن طیارچی پیدا کیے۔ لیباڈی نے زپلین کے جواب میں ایک طیارہ تیار کیا جو ۱۸۷ فٹ لانبا تھا جس کا قطر ۳۲ فٹ تھا اور وسعت اس کی اسی ہزار مکعب ۔ تھی۔ اس میں اس نے چالیس گھوڑوں کی قوت کا ڈیلیر طرز کا موٹر لگایا۔ باوجود اس کے دو تہائی حصے میں بنیزائن پانی اور بلاسٹ وغیرہ بھرا تھا۔ اسپر بھی اس کا مجموعی وزن ۲½ ٹن سے متجاوز نہ ہوا۔ لیباڈی اپنے جہاز پر جولائی سنہ ۱۹۰۳ء تک اُنیس بار فضائے آسمانی پر سفر کر چکا تھا۔ اس نے کاریں بھی بہت سی ترمیمیں کیں۔ اس کی آخری کار کی شکل انگریزی حرف V سے بہت مشابہ تھی۔ طیارہ زپلین کی طرح ایلومنیم کا اس کا بھی تھا۔ اس کا آخری سفر جس کا ہم کو علم ہے ۲۴ جون سنہ ۱۹۰۳ء میں ہوا تھا۔ اس سفر میں اسکے ہمرکاب ۴۰- آدمی تھے۔ اس پر اس نے ۶۰ میل ۲ گھنٹے ۴۸ منٹ میں طے کیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نوع کے طیاروں پر دس سے لے کر بارہ ہزار پونڈ تک لاگت آتی ہے۔



لیباڈی کا ہاردار طیارہ



لیباڈی کی کار



بحریہ کی نل کا ہوادار غبارہ

مسلمانانِ اندلس اور ایک بےمثل عالی ظرفی

(حصہ اول)

آہ اسپین میں بھی تھا اسلام — قابلِ احترام اُس کا نام
نور افشاں تھا مہرِ دین بیں — فلکِ مہر اندلس کی زمیں
اوجِ مغرب پہ جو ستارہ تھا — اُس سے کرتا تھا اکتسابِ ضیا
ذرۂ خاک بن گئے اختر — آج یورپ کے ہیں وہ نورِ نظر
باغِ اسلام میں تھا رنگِ بہار — سبز بختی بقسمتِ اشجار
پھول بوٹوں میں تھی عجب نزہت — اُتر آئی تھی چرخ سے جنت
آتشِ گل میں نورِ صبحِ ازل — خوب روشن تھا معرفت کا کنول
ہر طرف شانِ لم یزل کا ظہور — ارضِ اسپین پر تھا جلوۂ طور
قطرہ زن ابرِ رحمتِ باری — چشمۂ فیض ہر طرف جاری
صبح کو جب نسیم آتی تھی — عطر آگیں شمیم آتی تھی
بوے اخلاقِ احمدی تھی شمیم — لایا کرتی درود پڑھ کے نسیم
نونہالانِ باغ سب مسرور — جام میں لالے کے شرابِ طہور
چشمِ نرگس میں سرمۂ مازاغ — عرشِ اعلیٰ پہ باغباں کا داغ
خندۂ گل میں شورِ اللہ ہو — صوتِ بلبل میں لاشریک لہٗ
سروِ دلجو قیام میں تھے اگر — قمریاں ذکرِ حق میں شام و سحر
حمدِ باری زبانِ سوسن پہ — پتے کرتے تھے سجدے گر گر کر
تھا لبِ نہر پر خدا کا نام — ایسا ساری تھا ہر طرف اسلام!!

اندلس میں خدا پرستی تھی — رحمتِ ایزدی برستی تھی

حصہ دوم

قاعدے سے حکومتِ اسلام — تھا خوش اسلوب سلطنت کا نظام
حکمرانی تھی عدل و داد کے ساتھ — خلق کے، رحم کے، وداد کے ساتھ
بے محل تھی نہ سختی و نرمی — بے ضرورت زیادتی نہ کمی
زیر دستوں کے سر پہ دستِ کرم — رعب وہ تھا کہ شل تھے دستِ ستم
صاف و ناطق تھے شرع کے احکام — فیصلوں میں نہیں تھی جائے کلام
تھی شجاعت میں شانِ فیاضی — حیرت انگیز یہ دلیری تھی
تھا مساوات کا عجیب سلوک — ایک سے اہلِ ملک اور ملوک
رائے آزاد شرع کی پابند — بے ضرر، بے گزند، سب کو پسند
قوم میں مذہبی اخوت تھی — یہ اخوت خدا کی رحمت تھی
یک دل و یک زباں تھی ساری قوم — ہائے سب کچھ تھی یہ ہماری قوم!!
پاسداری ہر ایک مذہب کی — امن میں تھے یہود و عیسائی
تھی ترقی پہ صنعت و حرفت — ہر مسلمان صاحبِ دولت
قوم کے ہاتھ میں تھی زر کی کلید — مصرفِ زر تھا قابلِ تقلید
تھے معاش و معاد ہم پہلو — دونوں کی جستجو بطرز نکو
قوم میں شانِ مصطفائی تھی — مصطفائی تھی یا خدائی تھی
اُس کے خوانِ کرم کے ذلّہ رُبا — تھے یتامیٰ بھی اور ذوی القربا
قوم فیّاض دل تھی سب کی کفیل — کوئی مسکین ہو کہ ابنِ سبیل
شکر کرتے تھے عیش و راحت میں — کوئی شکوہ نہیں تھا عسرت میں
نازِ دولت نہ تھا امیروں کو — فقر پہ فخر تھا فقیروں کو

قول یہ تھا کہ مرضیِ مولے　　"از ہمہ انسب ست وہم اولے"
ملک اسپین درس گاہ جہاں　　طالبِ علم ہر جگہ کے وہاں
ہر طرف علم و فضل کا چرچا　　قرطبہ کا تمام میں شہرا
ماسٹر خوب ہی پڑھاتے تھے　　علم کا حوصلہ بڑھاتے تھے
طرزِ تعلیم سہل اور مفید　　ساتھ خوبی کے پڑھنے کی تاکید
اب وہ سائنس و فلسفہ ہے کہاں　　عربی کا ادب وہ لطفِ زباں
آہ وہ یونیورسٹی اگلی　　جس کا فیلو تھا ایک غرناطی
پردۂ خاک میں ہے آج نہاں　　اپنے مدفن میں ہے ابوحیان
خاک میں استخوان ابن رشد　　فلسفہ نوحہ خوان ابن رشد
ہائے عالم وہ فلسفی وہ ادیب　　ہوگئے سب کے سب بہشت نصیب
حیف غرناطہ اور الحمرا　　پڑھتے ہیں آج مرثیہ اپنا
اور ہم سب شریکِ ماتم ہیں　　آہ کیا ہم تھے اور کیا ہم ہیں
تھے صنا دید یہ عرب کے تمام　　ان کی صنعت تھی شوکتِ اسلام
حسن اخلاق میں بھی تھے یکتا　　کون سا وصف ہے جو ہم میں تھا
عہد سب استوار و مستحکم　　سچ ہے یہ بات کے دھنی تھے ہم
نہ پھرے اپنے قول سے اصلا　　کر دکھایا جو ہم نے منھ سے کہا
صفتِ خاص تھی علو ظرفی　　یہ صفت کس میں تھی عرب میں تھی
ہم سے اس وصف کی مثال سنو　　واقعی ہے یہ سارا حال سنو

حصۂ سوم

اک مسیحی سے اک مسلماں سے　　رہنے والے جو اندلس کے تھے
ہوگئی باغچے میں کچھ تکرار　　بڑھ گئی بات اٹھ گئے ہتھیار

وہ مسیحی جو بد دماغ ہُوا — خون سے لالہ زار باغ ہوا
مُسلم نوجوان کو قتل کیا — ہر طرف حشر ہوگیا برپا
دَوڑی بجلی کی طرح سے یہ خبر — سب مسلمان ہوگئے مضطر
چھوڑکر اپنا کام سب دَوڑے — طالبِ انتقام سب دوڑے
ناکہ بندی کچھ اس طرح سے کی — بھاگنے کی کہیں نہ راہ ملی
اُڑگئے ہوش اُسکے بُو کی طرح — ہوگیا خشک وہ لہو کی طرح
ہر طرف پھر رہا تھا عیسائی — چھوٹی دیوار اک طرف پائی
پھاند کر باغ سے ہُوا باہر — گُل جو چھوٹے تو خار آگئے نظر
خار و خاشاک کا تھا اک انبار — اُس میں پوشیدہ ہوگیا ناچار
جان پیاری تھی چھپ گیا اُس میں — مضطرب تھا نہ رہ سکا اُس میں
اُس کے نزدیک تھا عرب کا مکاں — پہونچا وہ در پہ مانگنے کو اماں
تھا جواں مرد، گو عرب تھا ضعیف — نیک باطن، غیور اور شریف
اُس نے روکر کہا کہ "مجرم ہوں — اور اپنی خطا پہ نادم ہوں"
اُس عرب نے کیے بہت سوال — دی اُسے پھر پناہ سُن کر حال
تھا عجب اتفاق وہ مقتول — تھا اُسی شخص کا پسرِ مقبول
ایک ہی تھا یہ اُس کا نورِ نظر — پارۂ قلب اور لختِ جگر
اُس کو یہ بات جب ہوئی معلوم — آہ کی اور ہوگیا مغموم
پہلے کچھ دیر تک رہا خاموش — پھر ہوا دل میں انتقام کا جوش
ہوگیا سُرخ چہرۂ عربی — اور غصے کی انتہا نہ رہی
دفعتًہ پھر خیال کچھ بدلا — رنگ جو سُرخ تھا وہ زرد ہوا
روکے اُس نے کہا کہ "اے جلّاد — تو نے گھر میرا کردیا برباد"

کون روشن کریگا اس میں چراغ — اس ضعیفی میں آہ ایسا داغ
بس یہی ایک تھا میرا بیٹا — بس یہی اک عصاے پیری تھا
میں تو بے موت مرگیا ظالم — جی کے اب میں کرونگا کیا ظالم
کیا کروں یہ نہیں عرب کا شعار — یہاں پر اٹھاؤں کیا ہتھیار
پیروِ دینِ احمدی ہوکر — تجھ کو پہونچاؤں کس طرح سے ضرر
میں نے دی ہے پناہ لے قاتل — ہے یہ اُس کا نباہ لے قاتل"
آئی اتنے میں ظلمتِ شبِ تار — جو سیہ کاریوں کی ہے ستار
چھائی ماتم کدے پہ تاریکی — شب نے پوشاکِ ماتمی پہنی
سوگ میں خاندانِ مردِ عرب — غمزدہ، مبتلاے رنج و تعب
مختصر ہے یہ قصۂ پُر درد — بولا مردِ عرب یہ با دمِ سرد
"دل پہ میرے ہے صدمۂ جانکاہ — اب چلا جا نہیں یہ جاے پناہ
خون تجھ کو معاف کرتا ہوں — رسم کے میں خلاف کرتا ہوں"
خونِ لختِ جگر سے درگذرا — اور چڑھنے کو تیز اونٹ دیا
تھی عرب کی عجب علو ظرفی — ہر طرف دھوم مچ گئی اس کی
ہے یہ قصہ کتاب میں تحریر — آج اس کی نہیں مثال و نظیر
آہ کیا منقلب زمانہ ہے — اب تو کچھ اور کارخانہ ہے
اپنے ہاتھوں ہوے ہیں ہم برباد — رہ گیا ہے فقط فسانہ یاد
کیا عرب اور کیا تھے اُنکے شعار — کیسی عبرت ہے یا اولی الابصار

محمد ارتضا علی شرر (کاکوری)

غازی بہ رہ شہادت اندر تگ و پوست — غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست
در روز قیامت این بداں کے ماند — کیں کشتۂ دشمن ست و آں کشتۂ دوست

ناکام

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رُسوم،
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں — غالب

واقعاتِ مندرجۂ ذیل کی واقعیت یا صحت کے بابت شاید میرے پاس کوئی عذر ہو مگر امورِ مصرحہ کی سوشل اہمیت سے کوئی بیگانہ نہ ہوگا۔ ابنائے زمانہ کی خصوصیات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جو کچھ میرے ہاتھ آیا وہ آپ کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔

جو کچھ میں کہوں گا وہ میرا ایمان ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے افرادِ قوم میرے ہم خیال نہ ہوں لیکن جس طرح میں کسی شخص کو اپنا ہم خیال دیکھ کر، اپنے خیالات اور اعتقادات کی بنا پر اپنے کو فخرِ قوم نہیں سمجھ سکتا، اُسی طرح دُنیا کے بڑے سے بڑے گروہ یا طاقت کو اپنے خلاف پاکر ہراساں بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مجھ کو یقین ہے کہ کسی کی موافقت یا مخالفت، کسی شخص کے خیالات کی لطافت یا کثافت کا سارٹیفکٹ نہیں ہے۔ اچھائی اور بُرائی میں تمیز کرنے کا آلہ — انسان کا ضمیر — ہر شخص کے پاس موجود ہے۔ عقل کی تلوار کو اگر تعصب کے زنگ سے پاک کر لیا جائے تو یقیناً کسی بے گناہ کا خون نہیں ہو سکتا۔

افسانہ کی اصل، واقعہ ہونا ضروری نہیں۔ نفسِ مضمون جو افسانے کی جان ہو، دیکھنا چاہیے کہ اُس میں کہاں تک اصلیت کی جھلک ہے؟ عموماً افسانے میں وہی بیان ہوتا ہے جو روزمرہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس موقع پر میں نہایت گستاخی سے کہوں گا کہ "میرے الفاظ اُسی کے دل تک پہنچ سکتے ہیں جس کو ایسے حالات سے لگاؤ ہے۔" گو میرا مقصد کسی کے زخم پر، دشمنی سے، نشتر لگانا نہیں ہے، بلکہ اُس مواد کو خارج کرنا میری موجودہ کوشش کا نصب العین ہے جو اندر ہی اندر زخم کو بڑھا رہا ہے اور اُسکی بدبو دماغ کو محسوس نہیں

ہوتی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہماری اخلاقی قوت ہمارے تعصبات پر کہاں تک غالب آسکتی ہے۔

پہلا جُـزو

ہمارے وطن قصبۂ کھنوال، (ریاست ہودا) سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی، مگر خوشحال، بلکہ رئیس لوگوں کی بستی ہے۔ اس آبادی کو "درگاہ پیری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک بہت بڑے بزرگ —— حضرت قطب الاقطاب مولانا ضیاء اللہ پیر یزدانی چشتی شہید قدس اللہ سرہ العزیز —— کا مزار ہے۔ سالانہ، عرس کے موقع پر یہاں ایک عظیم الشان مجمع ہوتا ہے جس میں ہر طبقے کے لوگ، بلا قیدِ مذہب و ملت آتے ہیں۔

درگاہ کے اطراف چند مکانات اُن لوگوں کے ہیں جو موصوف کی اولاد میں ہونے کا فخر رکھتے ہیں۔ ان میں ممتاز گھرانا وہ ہے جس میں خلافتِ موروثی چلی آتی ہے۔ اور ہمارے قصے کو اسی گھرانے سے تعلق ہے۔ فی زمانہ جو صاحبِ سجادہ ہیں اُن کو "حفیظا میاں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس خاندان کی بدقسمتی سے اِنھیں لوگوں میں ایک شخص "سعید" نامی ایسا سرکش اُٹھا جس کو گو حفیظا میاں کے بڑے بھائی ہونے کا فخر حاصل تھا لیکن اس خاص گروہ اور اُس کے پیرووں کو اُس سے سخت نفرت تھی۔ یہ شخص تا بہ زندگی ان لوگوں کی لعنت و ملامت کا ہدف بنا رہا کیونکہ وہ اس محدود سوسائٹی میں اپنے انوکھے خیالات کی اشاعت کرتا تھا اور ایک نئی روح پھونکنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ناکام اِن لوگوں کے مقاصد اور اعتقادات کو صدمہ پہونچانے کے لیے زیادہ زندہ نہ رہ سکا اور اپنی نوجوانی کی موت میں اپنی قوتِ بازو سے پیدا کی ہوئی جائداد مع ایک دو سالہ یتیم اور ایک شیرخوار لڑکی کے چھوڑ کر مر گیا۔

اُس نے بسترِ مرگ پر اپنی مُطیع اور محبوب زوجہ کی طرف نگاہِ حسرت سے دیکھا، اور اپنی کمزور آواز میں گلوگیری سے کہا: "آہ! فاطمہ، میرا وقت آخر ہے، اور تم سے میری ایک درخواست ہے کہ تم ننھے سلیم کو، خدا کے لیے، یہاں کی زہرآلود فضا میں نشوونما پانے کے لیے نہ رکھنا۔ سلیم ——سلیم جس سے میری بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں وہ تھوڑی دیر میں یتیم ہو جائے گا۔ تم اُس کو، میرے مرنے کے بعد، اُس کے ماموں کے پاس بھیجدینا۔ وہ اُس کی تعلیم و تربیت میری مرضی کے مطابق کریں گے۔ ...... بس، میں نے تم کو، اپنے پیارے لڑکے سلیم کو اور شیرخوار—— آہ! شیرخوار لڑکی نجمہ کو اپنے معبود کے سپرد کیا۔" اور اُسکی آنکھیں تھوڑی دیر میں بند ہوگئیں۔

سلیم، چھ برس کی عمر میں اپنی ماں کی گود سے الگ کر لیا گیا۔ اور نجمہ، اپنے چچا کے گھر میں، اپنی سوگوار والدہ کے سینے پر مرہم تسکین بنی رہی۔

حفیظ میاں کی بیوی کا برتاؤ اس بیوہ اور یتیمہ کے ساتھ ایسا شریفانہ رہا کہ مدتِ دراز تک نجمہ اپنی چچی (حفیظ میاں کی بیوی) کو اپنی ماں اور اپنی چچا زاد بہن —— شاہدہ —— کو سگی بہن سمجھتی رہی۔ شاہدہ، نجمہ سے چند ماہ چھوٹی تھی اور آپس میں یہ دونوں بہنیں ایسی شیروشکر تھیں کہ سگی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ شاہدہ کی ماں جوان بیکسوں کے لیے فرشتۂ رحمت تھیں، بیحد متمنی تھیں کہ وقت آنے پر شاہدہ سلیم کی بیوی بن جائے۔

سلیم، تکمیلِ تعلیم کے بعد، وطن میں رہنے کے لیے بھیجا گیا۔ ۲۰ سال کے سِن تک، گو اکثر اسکو اپنی ماں کے پاس جانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ لیکن اُس کے ماموں کو برابر یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں اُسکے خاندان والے اُس پر اپنے خیالات کا اثر نہ ڈالیں۔ اس لیے زیادہ قیامِ وطن سے وہ بہت روکا جاتا تھا۔

سلیم شاہدہ سے محبت کرتا تھا۔ اس کے جواب میں شاہدہ اُس کو دل سے چاہتی تھی۔ سلیم جب وطن آتا تو یہ دونوں ایک دوسرے پر جان نثار کرتے اور نجمہ اس خوشگوار منظر کو دیکھکر خوش ہوتی کہ "یا اللہ! میرے خاندان میں ایسے اتحاد والے جمع ہو جائیں گے!"

سلیم کے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پھر وہ شخصیت اپنا دَور دورہ دکھانے لگی جس نے سید کے جسم میں ظاہر ہو کر گذشتہ صدی میں اپنے سارے خاندان میں ہلچل ڈال دی تھی۔ عام نفرت، جو اس کا لازمی نتیجہ ہے، وہ بھی عود کر آئی۔ کچھ دنوں بعد اُمنگوں بھرے نوجوان نے ایک تہلکہ مچا دیا تو اُس پر ہر قسم کی سختیاں کی جانے لگیں جن سے دُنیا کا کوئی مُصلح آج تک نہیں بچ سکا اُسکی زندگی تلخ ہو گئی۔ اور سب سے زیادہ اُس کو صدمہ اور رنج اس بات کا تھا کہ شاہدہ اُس سے ہمیشہ کے لیے چھین لی جائے گی۔ یہ وقت سلیم کے لیے بہت سخت امتحان کا تھا۔

(۱)

بانگِ اللہ اکبر نے شاہدہ کو سوتے سے نہیں جگایا، بلکہ اس کی بیداری پر اُس کو متنبہ کر دیا مقدس آواز کا کان تک پہونچنا تھا کہ فریضۂ صبح کی یاد نے شاہدہ کے تمام مجتمع خیالات کا شیرازہ پھر منتشر کر دیا۔ غمگین اور متفکر لڑکی کے سامنے ایک مسئلے کا فیصلہ کرنا تھا۔ اُس نے اپنی شب بھر کی خیالی ناکامی پر ایک پُرحسرت آہ کھینچی اور مجبوراً تامراد کھڑی ہو گئی۔ ایک اضطراری حرکت کے ساتھ رات بھر کی جلی ہوئی شمع کی ناچیز زندگی کا خاتمہ کر دیا اور ایک مستانہ انگڑائی لے کر شب بیداری کے کسل کو دُور کرنے لگی۔ پھر جلدی جلدی سامنے کے منتشر کاغذات کو یکجا کر کے چوری سے الماری میں مقفل کر دیا اور اپنی ماں کے دالان میں نماز صبح ادا کرنے چلی گئی۔

باوجود اس نقل و حرکت کے، باوجود تمام ارکان عبادت ادا کر چکنے کے اُس کے دل کی خلش اور دماغ کی گرانی دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچتی تھی:

"یا اللہ میرے لیے کیا ہوتا ہے! سلیم کے دو جملوں نے میرے ہوش و حواس عقل سب کا فیصلہ کر دیا۔ میری زندگی میں آج یہ پہلی مصیبت ہے۔ آہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا کرنا چاہیے۔"

شاہدہ اپنا غمگین اور متردد دل لیے ہوئے پھر اپنے کمرے میں ساکت پڑ رہی۔ چاہتی تھی کہ ذرا آنکھ لگ جائے۔ مگر فوراً شریر نجمہ نے اپنی شوخیوں کی مشق کرتے ہوئے کمرے میں ایک ہنگامہ مچا دیا۔ اور شاہدہ سے مخاطب ہوئی:

"شاہدہ۔ اللہ ری نیند! کیوں؟ آج کیوں منہ لپیٹے پڑی ہو؟"

"نجمہ، اس وقت ذرا سو رہنے دو۔ رات بھر میری پلک نہیں لگی"

نجمہ کسی طرح اپنی شرارت سے باز نہ آئی۔ آخر شاہدہ جھنجھلا گئی۔

"تمھاری یہی شرارت تو بُری معلوم ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں تمھیں سمجھ کب آئے گی؟"

"لو! یہ مجھکو نصیحت کرنے بیٹھی ہیں!"

ایک لمحے کے بعد نجمہ کے ہاتھ اور سر شاہدہ کے شانے پر تھے۔ اور وہ کہہ رہی تھی:۔

"کیوں، اللہ میری بہن، بتا دو کہ تم کو رات بھر سونے کو کس نے منع کیا تھا، میں اب تو نہ سونے دونگی"۔ اسی اثنا میں اُس نے دیکھا کہ شاہدہ کے چہرے کا رنگ ارغوانی ہو چلا ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوے ہیں:۔

"ہائیں! ہائیں! شاہدہ! یہ تم کو کیا ہوا ہے؟" شاہدہ رو دی لیکن نجمہ نے آخر مخاطب کر ہی لیا:۔

"میری نجمہ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ نہ ستا، بہن، تو کیوں میرے دُکھ میں شریک ہوتی ہے، تیرے لیے بھی یہی دن رکھا ہے"۔ نجمہ مبہوت تھی اور حیرت سے اُس کا مغموم چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"شاہدہ، بِللہ، صاف کہو۔ کیوں میری جان گھُلائے ڈالتی ہو، اور اپنے کو ہلکان کرتی ہو؟"

"کیا بیان کروں۔ آہ! خدا جانے میرے لیے کیسا زمانہ آنے والا ہے، افسوس! میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ خط بس تو پڑھ لو۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو، یہی میری تقدیر کا لکھا ہے"۔ یہ کہکر زار و قطار رونے لگی۔ اور نجمہ نے خط پڑھنا شروع کیا:۔

میری پیاری پرائی شاہدہ،

تمھیں معلوم ہے کہ چچا صاحب نے تم کو میرے عقد میں دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بخدا تم سے مجھ کو کوئی گلا نہیں۔ مگر تم سے ایک سوال کرتا ہوں:

"باوجود ان میرے انوکھے خیالوں اور طریقوں کے تم کو میرے ساتھ پہلا سا اُنس اب بھی باقی ہے؟ تم مجھکو اب بھی چاہتی ہو؟" میں تمھارے ہر جواب سے بحد خوش ہوں گا۔ تمھاری خوشی میری

عین مرضی ہے۔ "سلیم"

اب دونوں لڑکیاں یکساں متاثر تھیں۔

(۲)

شام کو سعیدہ اور ذکیہ (اسی خاندان کی دو لڑکیاں) شاہدہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور سلیم کے اعتقادات اور رویّہ پر بحث ہو رہی تھی:۔

سعیدہ۔ "ابھی تھوڑے دنوں کا ذکر ہے کہ سلیم بھائی آئے تھے، مگر عرس کے زمانے تک اُن کے خیالات ایسے نہیں تھے!"

ذکیہ۔ خدا اُن کے حال پر رحم کرے، بہن، توبہ کرنے کی جگہ ہے! اب تو سُنا کہ عُرس کے نام سے اُن کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اور افسوس تو اس کا ہے کہ اُن کی انھیں باتوں سے چچا کے گھر کی نسبت چھوٹی جاتی ہے۔ ہائے شاہدہ کی تقدیر! خدا جانے اُس کی قسمت کہاں لڑی ہے"۔

سعیدہ۔ "رنج تو اسی کا ہے! اور میں نے تو سُنا کہ اس سال وہ مولا صاحب کے عرس میں نہیں جائیں گے۔ کہتے ہیں (میں اللہ سے توبہ کرکے کہتی ہوں) کہ عرس میں شریک ہونے والوں پر عذاب ہوگا اور وہاں جانے والے گنہگار ہیں۔ اے ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان بزرگوں سے خدا کے کتنے بندوں کے کام نکلتے ہیں!"

ذکیہ۔ سچ ہے بہن، سیکڑوں اللہ والے، سیکڑوں دُنیا دار آتے ہیں اور فیض لے جاتے ہیں۔ اس سال سُنا ہے کہ کہیں کے راجہ بھی آنے والے ہیں۔ نواب صاحب تو ہر سال آتے ہیں۔ شاہ حمد اللہ صاحب، پیر جلال بخش صاحب، صوفی چشتی بخش صاحب، یہ سب لوگ ہر سال عرس میں کتنی کتنی دُور سے آتے ہیں۔ پھر دیکھو، ہندو، مسلمان، کُل ذاتیں ان پیر کو مانتی ہیں۔ فیض کا دریا جاری ہے!"

سعیدہ۔ بہن مجھ کو بھی جیسا بزرگوں سے اعتقاد ہے ویسا کسی سے نہیں۔ یقین ماننا، میں جو منت مانتی ہوں یہاں کی درگاہ سے پوری ہوتی ہے۔ جمعرات کو اَمّی جان کے ساتھ درگاہ گئی تھی

جی خوش ہوا! میں نے بالوں سے مزار شریف پر جھاڑو دی، قدم چومے۔ حفیظ چچا کے ایک مُریدنی سے آئے ہیں، اُن کی بیوی بھی وہاں موجود تھیں۔ بیچاری بڑی خوش عقیدہ ہیں۔ بڑی دیر تک بیٹھی رہیں۔ وہاں تو جی یہی چاہتا ہے کہ آدمی قدموں کے پاس پڑا رہے۔ سبحان اللہ کیسا نور برستا ہے اور خوشبوئیں آیا کرتی ہیں کہ واہ!

ذکیہ۔ بہن خدا کے لیے اگلی جمعرات کو اگر جانا تو سلیم بھائی کے لیے منت مان آنا۔ شاید کچھ مولا صاحب کا تصرف ہو اور کچھ حالت اُنکی سنبھل جائے ...... لو! نجمہ آرہی ہیں۔ نجمہ تمہیں اپنے بھائی کو سمجھاتیں۔ تمہیں کیا شاہدہ پر ترس نہیں آتا؟ خدا جانے بیچاری کہاں بیاہ جائیں۔ اگر سلیم بھائی کی حالت نہ پلٹ جاتی تو شاہدہ کی قسمت کیوں خراب ہوتی اور کاہیکو گھر چھوٹتا۔"

نجمہ۔ مَیں کیا سمجھاؤں؟ ہم لوگوں کی باتیں اُن کی خطرے میں بھی نہیں آتیں۔ اور میں نے کیا سمجھایا نہیں؟ مجھے اس کا جیسا رنج ہے میرا ہی دل جانتا ہے۔ میرے بھائی کا خدا جانے کیا حشر ہو۔ میں تو دین و مذہب میں بھائی کا ساتھ کبھی نہ دوں گی۔ کیا کروں کیونکر سمجھاؤں؟ میں تو اب سمجھتی ہوں خدانخواستہ، میرے کوئی بھائی نہیں ہے۔ جاتی ہوں پھر سمجھاؤں گی۔" نجمہ چلی گئی اور شاہدہ رونے لگی۔

عورت سی کمزور مخلوق کی زندگی میں، پہلے پہل، سب سے سخت وقت وہ ہوتا ہے جب اُسکو اپنے گھر، ماں باپ اور اپنی ہمجولیوں سے چھوٹنے کا خیال آتا ہے۔ جب زمانہ مُستقبل کے غیر مانوس سوشل سین اُس کے دل کی نگاہوں کے سامنے پیش ہونے لگتے ہیں تو اس نازک جنس کا دل ایک درد کی دُنیا بن جاتا ہے۔ اس خیالی تکلیف اور غم مفارقت کی تصویر کو بھاشا کے شاعروں نے اپنے پُر درد کلام میں اس انداز سے کھینچا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی موم ہو جاتا ہے۔ افسوس! اس ناگزیر جدائی کے بارۂ خاص میں فطرت کس قدر بے رحم واقع ہوئی ہے!

(۳)

بھائی جان، بھائی جان، میں آپ سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔ میں آپ کو تو کچھ

کہوں گی نہیں۔ مگر مجھے یہ سمجھا دیجیے کہ آپ شاہدہ کو چاہتے بھی ہیں اور اُس پر ذرا ترس نہیں آتا۔ آپ اُس کی حالت سے بالکل بے خبر ہیں۔"

سلیم کی کشادہ پیشانی پر متفکرانہ شکن پڑی۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی متجسس نگاہ کو نجمہ کے غمگین اور متردد چہرے پر ڈال کر متانت سے کہا:۔

شاہدہ کی حالت! کیا معنے؟ مَیں نہیں سمجھا۔" سلیم کے تجاہل سے گویا غیر متاثر ہو کر نجمہ نے یہ جملے زور دے کر ادا کیے:

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اُس بیچاری کی قسمت پھوڑ دی۔"

"اُفوہ! نجمہ، یہ الزام تم مجھ پر عائد کر رہی ہو یا شاہدہ کا بھی یہی خیال ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ شاہدہ کا کیا خیال ہے۔ اور کیا آپ شاہدہ کو بالکل گئی گزری سمجھتے ہیں جو اس بارے میں وہ اپنا مُنھ کھولے گی!"

"ہاں، تم نے بھی تو اسی فضا میں پرورش پائی ہے۔ اگر تم میں جہالت کی تاریکی کا اثر نہ ہوگا تو پھر کس میں ہوگا؟" پھر سلیم نے نجمہ سے ایک امتحانی سوال کیا: "اچھا، تم اپنی شادی کے بارے میں کچھ بولوگی یا نہیں؟۔۔۔۔۔۔ جواب دو!" نجمہ کا سر جھک گیا اور وہ خاموش تھی۔

"ہاں، مَیں سمجھا، میں سمجھتا ہوں کہ تم شاہدہ کے خیالات کا آئینہ ہو۔ خیر، کیا تم میرے خط کا جواب لادوگی؟"

"بھائی جان آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ شریفوں کے یہ طریقے نہیں۔ شاہدہ، اور خط کتابت! توبہ! توبہ!"

"نجمہ، نجمہ، تم نہیں جانتیں کہ میرا کیا مقصد ہے۔ مجھے اُس کی مرضی معلوم ہونا چاہیے کہ آیا جو میرا ارادہ ہے اس کو وہ بھی پسند کرتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ مجھ سے عقد کرنے پر راضی ہے تو میں کوشش کروں گا۔ اگر وہ اس کو نہیں پسند کرتی تو مجھے اپنی محبت جتا کے اُس پر دباؤ ڈالنا نہیں مقصود ہے۔ لیکن نجمہ، اگر واقعی شاہدہ کو مجھ سے اُنس ہے تو یقیناً اُس کو میری ہو کر رہنا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں

کہ وہ اپنی ذات کو میرے حوالے نہ کردے۔ مگر خیر، اگر خط کا جواب شریف شاہدہ سے نہیں مل سکتا تو مجھپر احسان کرکے اُس سے زبانی ہی جواب لا دو۔"

"آپ کے سوال کا جواب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ شاہدہ اپنا منھ نہیں کھول سکتی یا اگر، خدانخواستہ، وہ اپنے دل کی بات کہہ بھی ڈالے اور آپ سے شادی کرنے کو اُس کا دل بھی چاہے تو آپ کیا بنا سکتے ہیں۔ ماں باپ کی جو مرضی ہوگی اُس پر شاہدہ کو راضی ہونا پڑے گا ——— (دونوں ہاتھوں سے منھ چھپاکے) اُفوہ! خدا نہ کرے۔ خدا وہ دن نہ کرے کہ کوئی شریف لڑکی شادی بیاہ میں اپنی مرضی ظاہر کرے!"

"افسوس نجمہ، میں تمھاری اصلاح کیونکر کرسکتا ہوں؟ ——— (چونک کر) ——— مگر اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟ تمھاری پرورش اور تربیت اُن مردوں کی صلاح سے ہوئی ہے جو تمھارے حقوق سلب و پامال کرچکے ہیں۔ خیر، تم اپنے قیاس سے بتا سکتی ہو کہ شاہدہ کو اب بھی مجھ سے پہلا سا اُنس و مروت باقی ہے یا نہیں؟ بس۔" نجمہ جھلا کر اور تعصب سے کہنے لگی:

"کسی شریف لڑکی کو مرد سے اُنس ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، یہ میں جانتی ہوں کہ کوئی لڑکی دُنیا میں ایسی نہیں جو ہمیشہ اپنے وطن ہی میں رہنا نہ چاہتی ہو (اور خود بخود کہنے لگی) آہ! خدا جانے اُس کی قسمت اُسے کہاں لے جائے!"

"نجمہ، میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ وہ مجھی سے شادی کرنا چاہتی ہے یا کسی اور کو اپنا شوہر بنانا چاہتی ہے؟ اُس کا دل یہ تو نہیں چاہتا کہ اس خاندان کے کسی اور شخص سے شادی کرکے گھر ہی میں رہے؟ ——— اور ——— اور ——— مَ ——— میرا منشا یہ ہے کہ شاہدہ کو مجھ سے کسی قسم کا دلی لگاؤ ......" بات کاٹ کر نجمہ نے چلتے چلتے کہا:

"دلی لگاؤ کیا؟ بھائی جان آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ ہوگا، مجھ کو نہیں معلوم۔"

"نعوذ باللہ! افسوس ان ناخدا ترس لوگوں نے عورتوں کو کمزور دیکھ کر حیوان مطلق بنا دیا ہے۔ اور پھر یہ مجرم شرافت کا دعوے کرتے ہیں، مگر حفظِ حقوق کے لیے کسی کی رگِ شرافت

نہیں بھڑکتی۔ افسوس!"

متعصب نجمہ سے ایسے سوال کا جواب ملنا غیر ممکن تھا۔ اور سلیم کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرنا غلطی تھی۔ لیکن سلیم نے اپنی کوشش علمی و ذہنی ذرائع سے جاری رکھنے کے ساتھ شاہدہ کے دل سے مشاہدہ کا خیال اور منشا چُراکر معلوم کر لیا۔ اور اُس کو اب اس پر فخر تھا کہ میں نے شاہدہ کا پُر حسرت دل چیر کر دیکھ لیا۔ (باقی آیندہ) (اثر لکھنوی)

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سُننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
کیوں مریضِ عشق کو دادِ وفا دینے لگے — آج یہ کیا تھا کہ تم مجھ کو دعا دینے لگے
دل میں پیکانِ ستم جب کچھ مزا دینے لگے — خود لبِ فریاد ظالم کو دعا دینے لگے
آئیے حالِ دلِ مجروح سُنیے دیکھیے — کیا کہا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے
کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو — زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے
سُننے والے رو دیے سُن کر مریضِ غم کا حال — دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے
جُز زمین کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ — جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے
بے نشانوں کا نشاں اے پوچھنے والے نہ پوچھ — کیوں بھلا اپنا پتہ اہلِ وفا دینے لگے
چھوڑتا ہے عشق کی منزل میں دل کو ہر رفیق — ساتھ والے راستے ہی میں دغا دینے لگے
مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حُسن کا — کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے
ذبح کرنے سے اسیرانِ قفس کے فائدہ؟ — کس خطا پر بے زبانوں کو سزا دینے لگے
چُپکے چُپکے رو کے بھی کٹ جائیگی فرقت کی رات — ہم پکاریں کس لیے وہ کیوں صدا دینے لگے
سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں — اُف کروں تو آگ دُنیا کی ہوا دینے لگے

مرزا ذاکر حسین ثاقب (لکھنوی)

مسٹر محمد علی اور شاعری

اکتوبر کے الناظر میں مسٹر محمد علی کی ایک غزل شایع کرتے وقت وعدہ کیا گیا تھا کہ اُنھوں نے اپنی شاعرانہ زندگی کا جو مختصر خاکہ لکھا ہے وہ بھی آیندہ مہینے میں درج الناظر ہوگا۔ گر بعد کو اس اندیشے کی بنا پر کہ کہیں اس سے مسٹر محمد علی کی موجودہ مشکلات میں اضافہ نہ ہو جائے، تا تحقیقات کامل اس کی اشاعت ملتوی رکھی گئی تھی۔ اب چونکہ ہمیں اس بات کا اطمینان ہوگیا ہے کہ اس تحریر کے شایع کرنے کی کوئی ذمہ داری ہمارے دوست پر نہیں عائد ہو سکتی، سطور ذیل جو مسٹر محمد علی کے ایک پرائیوٹ خط سے نقل کی گئی ہیں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں :- وھوہٰذا

آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہوگئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رام پور میں میں اُس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ - امیر - تسلیم - جلال - عروج - دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز اُستاد داغ کے شاگرد ہوے۔ جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب عظمت اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر تھی "ازراہِ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض "کاربیکاراں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا۔ اس لیے روز اُن کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اُس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اُٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر لکھا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مُشکی خر — آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

(داغ کی غزل یاد کیجیے "آج رخصت جہاں سے داغ ہوا خانۂ عشق بے چراغ ہوا")

اس پر سترا دیہ کہ ذو الفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دُور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں؟ میری عمر بہت ہی کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد ہی کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر اُنھیں سُنا دیے۔ سُن کر پھڑک گئے اور اُس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اُس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا۔ اس کے بعد اگر میں یہ دعوٰے کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعوے تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سُنیے۔ میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، بلکہ اُس کے تو ندیر کودا ہوں، اُسے ہاتھی بنا کر اُسکی پیٹھ پر سوار ہوا ہوں، غرض کوئی بے ادبی اور گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے آواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر گر با معنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری Official biography[ع] (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "اُمّت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرۃ نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ کہ اس لچر پوچ کو ردّی دان بلکہ آتشدان کی نذر کیا جائے یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی یکایک انتقال ہوگیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چرونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ "بھائی ہے تو چڑیا چرونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے، اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے"۔ آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا

ع سرکاری یعنے باضابطہ سوانحعمری۔

اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشنضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دُنیا کو نئی نئی معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالامال کردیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کردو اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن اُستاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔

خیر۔ اب سُنیے کہ گیارہ برس کی عمر میں مَیں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا اُٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اُس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اُس کا مجھے ترجمہ سُنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بُلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اُس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہوگئے تو ایک مصرعۂ طرح اُسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اُسی وقت تیار ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکّہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھیرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب ذرا عمر زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب تازہ آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مُسلم لیگ کے برادرِ اصغر۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدۂ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا (چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش

نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا Lawn[1] جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن سطح صاف ہونے کی راہ دیکھ کر Dining Hall[2] میں کیا گیا۔ اُس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا

فرشِ زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں	لطفِ مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی گر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اُتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ حسن کی کمی نہ تھی مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستورِ عام زہد و تورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچّے دھاگے نے باندھے رکھا، دو برس کسی اور کے خیال نے۔ گو یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض گرد و پیش کا تقاضہ اس کا محرک تھا۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو آئین کی زندگی، بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل کر دیا۔ گذشتہ چند سال میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیے، مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشقِ حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بنایتِ مجبوری کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوتِ قرآن پاک کے) تسکینِ قلب کا رہ گیا ہے۔

چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجوں، اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں۔ یہ Touchstone کی معشوقہ سے زیادہ قابلِ قدر نہیں ہے۔

"A poor thing, but my own."[3]

---

[1] سبزہ زار [2] کھانے کا کمرہ [3] یعنی ع بے حقیقت ہے پھر بھی اپنی ہے۔

نواب وقار الملک مرحوم

کی وفات پر ۳۱ر جنوری ۱۹۱۷ء کو ایک جلسہ حمیدیہ لائبریری ہال میں بصدارت ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پی۔ ایچ ڈی وغیرہ اظہار تعزیت کے لیے ، بجے شب کو منعقد ہوا تھا۔ نواب زادہ میجر حمید اللہ خان بہادر بی اے نے اس جلسے میں پانچ ہزار روپیہ اُن کی یادگار قائم کرنے کے لیے دینے کا اعلان کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو بھی اس جلسے میں موجود تھیں۔ ہمارے دوست حضرت ارشد نے بھی اس موقع پر ایک نظم پڑھی تھی جو ناظرین الناظر کی نذر ہے :۔

آہ یہ مجمع رہینِ صد الم ہے کس لیے
ہر طرف چھایا ہوا اندوہ و غم ہے کس لیے

کون سے صدمے سے دل ہر شخص کا لبریز ہے
واقعہ وہ کیا ہے؟ جو اس درجہ درد انگیز ہے

کس زباں سے آہ بتلائیں کہ کیا ہے حادثہ
مرگِ نوابِ وقار الملک کا ہے حادثہ

جو فدائے قوم تھا جو جاں نثارِ قوم تھا
جس کا سازِ و برگِ ہستی سازگارِ قوم تھا

ذات جس کی وقف تھی اصلاحِ ملت کے لیے
سعی جو کرتا تھا تعمیلِ شریعت کے لیے

قرنِ اُولے کے مسلمانوں کی سی جس شان تھی
اتقا آمیز جس کی ہر ادا ہر آن تھی۔

ہے یہ جلسہ آہ اُسکی تعزیت کے واسطے
مجتمع ہیں سب دعائے مغفرت کے واسطے

اب نہیں گو اس جہاں میں آہ۔ اے مرحوم تو
کر گیا ہے اپنی رحلت سے ہمیں مغموم تو

زیرِ تربت سایۂ رحمت میں آرامیدہ ہے
دل مسلمانوں کا تیرے واسطے غمدیدہ ہے

پھر بھی لیکن کر رہا ہے ہم کو فیض اندوز تو
دے گیا ہم کو مثال اپنی سبق آموز تو

تیرے ارشادات کو بانگِ درا سمجھیں گے ہم
تیرے نقشِ پا کو اپنا رہنما سمجھیں گے ہم

دل میں پیدا کر کے اعلیٰ خواہشیں تیری طرح
حق پژوہی کی کریں گے کوششیں تیری طرح

یہ بھی تو اک یادگارِ بہتریں ہوگی تری
شاد جس سے ہستی جنت نشیں ہوگی تری

آہ۔ یوں ہی مرکزِ امید رکھیں گے تجھے
اس طرح ہم زندۂ جاوید رکھیں گے تجھے

—— ارشد (تھانوی)

کتاب الاغانی

عرب قدیم کے متعلق اسلامی مورخین کے لیے، اشعار و امثال عرب، معلومات کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ اسلامی مورخین میں عبد الملک بن ہشام، ابن قتیبہ، یعقوبی، طبری، مسعودی، ہمدانی، بکری، یاقوت حموی، ابن اثیر، ابو الفداء، ابن خلدون، ابن عبد ربہ، ابو الفرج اصفہانی، نے علاوہ دیگر ذرائع معلومات کے زیادہ تر اسی ذریعے سے عرب قدیم کا حال لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشعار عرب سے ایام عرب، ان کی لڑائیاں، اور اخلاق و عادات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اشعار ایک مدت تک زبانی روایت ہوتے چلے آئے اس بنا پر ان کا اکثر حصہ برباد ہوگیا۔[1] اگرچہ اسلام میں ابو عبیدہ، اور اصمعی وغیرہ اشعار عرب کے سب سے بڑے راوی خیال کیے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں نے بھی جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کا اکثر حصہ ضائع ہوگیا۔[2] تاہم عرب قدیم کے لوگوں کی تاریخ، ان کے عادات و اطوار کے متعلق، لٹریری حیثیت سے، جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ آج تک "کتاب الاغانی" میں محفوظ ہے، جس کو سب سے پہلے گورنمنٹ مصر نے ۱۸۶۸ء میں مطبع بولاق میں طبع کرا کے شائع کیا۔[3]

کتاب مذکور اصل میں "ان سو قسم کی مختلف راگنیوں کے بیان پر مبنی ہے جنکو مغنیوں نے ہارون الرشید کے لیے اختیار کیا تھا۔"[4] لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے، جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، کہ مصنف نے صرف اسی موضوع پر اکتفا کیا ہے، بلکہ "اخبار، اشعار، انساب، و ایام عرب[5]" کے علاوہ ان تمام مغنیوں اور شعراء کے حالات پر، جنکا کلام اس کتاب میں شامل ہے، کافی روشنی ڈالی ہے، اور "بعض بعض مقام پر تاریخ اور سائنس سے بھی

[1] "قدیم عربی شاعری" از مسٹر لائل دیباچہ صفحہ ۲۵۔
[2] ایضاً ایضاً ایضاً
[3] مقدمۂ ابن خلدون طبع مصر صفحہ ۵۵۱
[4] ایضاً

بحث کی ہے۔[۱] اس لحاظ سے یہ نہ صرف موسیقیِ عرب کی انسائیکلوپیڈیا ہے، بلکہ شعرا سے متقدمین و متاخرینِ عرب کی ایک جامع و مانع ڈکشنری ہے، اور بے شبہ تمام عربی لٹریچر میں ایک نہایت اہم اور مشہور کتاب ہے۔"[۲]

مشہور مورخ ابن خلدون لکھتا ہے :-

"بے شبہ اس کتاب کو اہلِ عرب کا "دیوان (دفتر یا رجسٹر) کہنا چاہیے۔ یہ اُن تمام اصنافِ شعر، تاریخ، موسیقی وغیرہ پر ایک جامع کتاب ہے، جو اُنھوں (اہلِ عرب) نے زمانۂ قدیم میں حاصل کیے تھے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی کتاب، اس موضوع پر، اس کی برابری نہیں کر سکتی۔ ایک ادیب کے لیے (یہ کتاب) نہایت کافی ہے، جسکو دیکھ لینے کے بعد اُس کو کسی قسم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"[۳]

"کہا جاتا ہے کہ صاحب بن عبّاد[۴] تیس اونٹ کتابوں کا بوجھ ہر وقت سفر میں مطالعہ کرنے کے لیے ساتھ رکھا کرتا تھا، لیکن جب کتاب الاغانی اُس کو موصول ہوئی تو اُس نے اس ایک کتاب کو ساتھ رکھنے پر اکتفا کیا۔"[۵]

مصنف | اس مشہور کتاب کا مصنف قاضی علی بن حسین بن محمد بن احمد بن ہیثم اموی[۶] مشہور بہ ابی الفرج اصفہانی ہے، جو ۲۸۴ھ مطابق ۸۹۷ء میں اصفہان میں پیدا ہوا۔ وہ عرب عاربۂ قریش کی خاص نسل سے، اور سلاطین اموّیہ کے آخری تاجدار خلیفہ مروان کے خاندان سے[۶] تھا۔ علاوہ اُن اسماء صفاتی (جن سے ابن خلکان نے اس کو متصف کیا ہے) اور دیگر تصانیف متعددہ کے وہ ملقب بہ "اصفہانی"، اور "صاحب کتاب اغانی" کے نام سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔[۷]

---

[۱] "تاریخ عرب" از سید امیر علی طبع لندن صفحہ ۴۶۹ [۲] لٹریری ہسٹری آف عربز از نکلسن صفحہ ۳۴۷ [۳] مقدمۂ ابن خلدون طبع مصر صفحہ ۵۵۱ [۴] یہ خاندان بویہ کے سلاطین فخر الدولہ اور اُس کے بھائی مؤید الدولہ کا وزیر تھا۔ خود بہت بڑا صاحب علم تھا۔ [۵] سعود المطالع طبع مصر مصنفہ شیخ عبدالہادی ابیاری صفحہ ۴۳، [۶] لٹریری ہسٹری آف عربز صفحہ ۳۴۷ [۷] "مصنفین عرب" از آر بھٹناگر صفحہ ۸۷۔

اس کا کنبہ سب اصفہان میں مقیم تھا، مگر اس کا عنفوان شباب زیادہ تر بغداد میں گزرا، جہاں بطور ایک عالم اور مصنف کے اس کی شہرت زیادہ ہوگئی[1]۔ اس کے زمانے میں، اسپین میں سلاطین بنی امیہ کے خاندان سے حکم ثانی (المتوفی ۹۷٦ء) بن عبدالرحمٰن ثالث (ناصر الدین باللہ) بہت بڑا علم دوست اور کتابوں کا جمع کرنے والا تھا۔ اُس کو یہ شوق تھا کہ عباسی خلفاء کے کتب خانے سے اس کا کتب خانہ بڑھ جائے، اس کوشش میں وہ بہت کچھ مال و دولت بھی صرف کیا کرتا تھا۔ جب اُس کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ ابو الفرج کتاب الاغانی کو تصنیف کرچکا ہے تو اُس سے درخواست کی کہ قبل اس کے کہ تم اپنی کتاب کی نقل خلفاء عباسی کو دو مجھے دے دو اور اس کے عوض میں ایک ہزار اشرفیاں بھیجیں[2]۔"

ملوک ہمدانیہ میں سے سیف الدولہ علوم و فنون کا بہت بڑا معاون و مربی، اور ابو الفرج کا سرپرست تھا۔" جب ابو الفرج نے کتاب الاغانی اس کو پیش کی تو اس نے اس کے انعام میں ایک ہزار دینار عطا کیے، اور ساتھ ہی ایک ایسی بیش قیمت کتاب کی تصنیف پر، جس پر مصنف نے اپنی عمر کے پچاس برس کا معتدبہ حصہ صرف کر دیا تھا، ایک قلیل رقم کا عطیہ دینے کے لیے نادمانہ معذرت خواہی کی۔ لیکن اُس کے وزیر نے اس میں اضافہ کرکے اس رقم کو دوگنا کر دیا[3]۔

ابو الفرج نے ۹٦۷ء (مطابق ۳۵٦ھ) میں وفات پائی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسی سال میں اس کے تین بڑے مربیوں اور سرپرستوں (سیف الدولہ حاکم شام، معز الدولہ حاکم عراق، اور کافور اخشدی حاکم مصر) کی وفات واقع ہوئی[4]۔ کہا جاتا ہے کہ وفات سے پیشتر وہ مختل الحواس ہوگیا تھا[5]۔

---

[1] "مصنفین عرب" از آر۔ تجمناٹ صفحہ ۸۷ [2] "علوم عرب" جرجی زیدان ترجمہ اُردو صفحہ ۲۳۳ [3] "اورنیٹل بایوگرافیکل ڈکشنری" از ولیم بیل صفحہ ۲۲ [4] مصنفین عرب صفحہ ۸۷ [5] روزگارڈن آف پرشیا دیباچہ صفحہ ۹ [6] الیضاً

کتاب الاغانی اور یورپ | کتاب الاغانی یورپ میں عام طور پر مقبول ہے اور بڑے بڑے فاضل مستشرقین جو عرب کی تاریخ لکھتے ہیں زیادہ تر اسی کتاب کے حوالے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عرب کی تاریخ، شاعری، اور عادات و خصائل پر اس سے بڑھ کر مستند کتاب کوئی نہیں"۔ یورپ میں یہ کتاب سب سے اول، جب مصر پر فرانس سے جنگ ہوئی اُس وقت مونشیر ریج کو ملی جس کا قلمی نسخہ اب تک پیرس کی رائل لائبریری (شاہی کتب خانہ) میں موجود ہے۔ سنا ہے کہ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

قاضی احمد میاں اختر (جوناگڑھی)

وہ قامتِ بلند نہیں در قبائے ناز — اک سروِ ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز
اُس نازنیں پہ ختم ہیں سب شیوہ ہائے ناز — جس کو بنا کے خود بھی ہو نازاں خدائے ناز
کیا کیا نہ آرزو کے بڑھیں دل میں حوصلے — رکھ دیں کبھی جو فرقِ ہوس پر وہ پائے ناز
اربابِ اشتیاق ہیں اور انتہائے شوق — حالانکہ حسنِ یار ہے اور ابتدائے ناز
ہم پر نگاہِ یار سے گزرا جو تھا کبھی — ہے آج تک وہ پیشِ نظر ماجرائے ناز
کچھ یوں ہی اپنے حسن پہ مغرور تھا وہ شوخ — کچھ لے اُڑی ہے اور بھی اُسکو ہوائے ناز
اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار — اک بات اُن میں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز
اب دیکھی ہے قریب کہ ہونے لگے جفا — وہ شوخیاں تو کرنے لگے ہیں بجائے ناز
پھیلی جو اُن کی برقِ تبسم کی روشنی — لبریزِ نورِ حسن ہوئی سب فضائے ناز
حیراں ہے کارِ حسنِ بتاں سے زبانِ عشق — لیتے وہ مدح غمزہ کرے یا ثنائے ناز
شوقِ لقائے یار سے ڈرتے تو ہو۔ مگر
حسرتؔ۔ جو نقدِ جاں بھی نہ ٹھہرے بہائے ناز

حسرتؔ (موہانی)

نظرے خوش گزرے

خداوند جل وعلا نے اپنے فضل وکرم سے جو گراں قدر نعمتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں اُن کا شکریہ تو ہم سے ادا ہوتا نہیں البتہ جب ان نعمائے الٰہی میں سے کوئی ہم سے واپس لے لی جاتی ہے یا اپنے ہاتھوں رائگاں کر دی جاتی ہے تو اُس وقت ہم کفِ افسوس ملتے اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ بے شبہہ نفس بشری اگر روحانی و اخلاقی ترقیات کی وساطت سے اس قدر بلند ورفیع ہوجائے کہ اُس مبدأ کائنات کی قدرت کاملہ اور اپنی بے بسی ولاچاری کا احساس کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر وثوق حاصل کرلے کہ شادی وغم، کامیابی ومحرومی اور حیات وممات کے تمام واقعات اللہ جل شانہٗ کی مرضی مختار کے تابع اور اُن کی مصلحت وحکمتِ بالغہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس عارضی اور سراب آسا ہستی وبود کی کشاکش اور تلاطم بے سود عافیتِ سکون سے بدل جائے اور انسانی زندگی یکسر و یک رنگ نظر آئے۔ مگر ہم میں کتنے ہی ایسے ہیں جو ہر خفیف سے خفیف تغیر پر ہیجانِ مسرت یا الم سے متاثر ہوکر اپنی حقیقت وماہیت کو فراموش اور اپنے جذبات وحسیات کے توازن کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے حالات میں آج ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہم اور ہمارا خاندان مبتلا ہوگیا ہے۔

۱۸ر فروری روز یکشنبہ کی دوپہر کو جب ہم اپنے وطن سے لکھنؤ آرہے تھے تو دفعۃً راستے میں خبر ملی کہ برادر معظم منشی سخاوت علی صاحب نے صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بھائی، اور وہ بھائی جسے ہم دنیا کی تمام نعمات میں عزیز ترین خیال کرتے تھے، یوں داغِ مفارقت دے جائیں کہ ہمیں اُن کی علالت کی خبر ملے نہ تیمارداری کا موقع، ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس حادثہ نے ہمارے قلب ودماغ میں کیا کچھ تموّج نہ پیدا کر دیا ہوگا۔ حزن وملال کے اُس ہجوم میں تیرگی وانتشار نے ہمارے تمام حواسوں پر قابو پالیا اور دیر تک ہمیں اُس کی حقیقت اور اہمیت پر غور کرنے کے ناقابل بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے اگر ہماری طاقتِ ضبط وتحمل نے برائے چندے جواب دے دیا ہو

اور ہم عالم یاس و مجبوری میں صبر و تحمل کو برطرف کرکے نالہ و فریاد میں مصروف ہوگئے ہوں تو خدائے بزرگ و برتر ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوری اثرات سے قطع نظر کرکے جب ہمیں اس حادثے کے آخری نتائج پر سکون و تنہائی کی حالت میں غور کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ تعلق قلبی سے ماسوا ہمارے بھائی کی ذات کو ہمارے دنیاوی معاملات میں جو گہرا دخل تھا اُس کی وجہ سے آج نہیں بلکہ زندگی کی بقیہ ہر ساعت میں ہمیں اُن کی عدم موجودگی کا نہایت المناک احساس ہوگا۔ کیونکہ اول تو سایۂ پدری سے نہایت کم عمری میں محروم ہو جانے کی وجہ سے ہم سب بھائی بہن اُن کی شفقت بے غایت کے رہین اور اُن کے دامانِ محبت سے وابستہ تھے، پھر ہماری موجودہ متاعِ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اُنکی رہنمائی و اعانت سے ہر وقت بہرہ اندوز نہ ہوئے ہوں۔ خصوصاً ہماری یہ حالت ہے کہ آٹھ برس کے سن سے لیکر ۱۹۱۶ء تک سوائے اُن ایام کے کہ ہم دونوں میں سے کوئی سفر کی حالت میں ہو ہمیشہ اُن کے پاس رہنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس تمام مدت میں اُن کی محبت، اُن کی توجہ، اُن کا وقت اور اُن کا روپیہ ہر وقت ہمارے لیے وقف رہا۔ اور تا وقتِ ارتحال دنیا کا کوئی ایسا معاملہ نہ تھا جس میں اُن کی امداد اور مشورے سے ہم مستغنی ہوتے۔

الناظر اور اُس کے متعلقات جیسا کہ اس سے قبل ہم اعتراف کرتے رہے ہیں محض اُنھیں کی امداد و توجہ کے بدولت معرض وجود میں آئے اور اب سے تین سال پیشتر جبکہ انھوں نے اس کے حقوقِ ملکیت ہمارے سپرد کردیے ان کے قیام وثبات کے تمامتر وہی کفیل تھے۔ اس تین سال کی قلیل مدت میں بھی جب کبھی ضرورت ہوتی تو ہم ہر وقت اُن کی امداد پر بھروسا رکھتے تھے اور جب کبھی افکار و آلام مایوس کن نظر آتے تو اُن کے قیمتی مشوروں اور ہمت افزا باتوں سے ہمارے ارادوں کو ایسی تقویت ملتی تھی کہ ہماری مصروفیتوں میں تعطل اور ہماری جد و جہد میں رکاوٹ نہیں پیدا ہونے پاتی تھی۔ ابھی چند مہینے ہوئے جب لکھنؤ میں انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ منعقد کرنے کی تحریک کی گئی اور ہمیں معلوم ہوا کہ اگر یہاں جلسہ کرنے کی کوشش شروع ہوئی تو سوائے محرومی کے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اسی بنا پر ابتدائً

ہم نے جلسے کا انتظام کرنے کی حامی نہیں بھری اور ہر طریقے پر اپنی معذوری اور بے بسی کا اظہار کر کے چاہا کہ یہ ٹال جائے۔ لیکن جب احباب نے نہ مانا تو مجبوراً ہمیں اپنی مشکلات کو اپنے مرحوم بھائی سے جا کر بیان کرنا پڑا۔ اور یہ محض انھیں کی ہمت افزائی اور امداد کا نتیجہ تھا کہ بالآخر اردو کانفرنس کا اجلاس یہاں منعقد ہو سکا۔

مرحوم کو ملکی اور قومی معاملات سے گہری دلی دلچسپی تھی اور اب چند سال سے تو ان کاموں میں خصوصاً شہر لکھنؤ کی میونسپلٹی اور یہاں کے غریب مسلمانوں کی خدمت میں اس درجہ انہماک انھیں ہو گیا تھا کہ یہ کہنا بالکل واقعات کے مطابق ہوگا کہ اُن کے وقت و افکار کا بیشتر حصہ اس کے لیے وقف رہتا تھا۔

صوبہ جاتِ متحدہ کی میونسپلٹیوں میں جداگانہ اسلامی نیابت کا حق تسلیم کر لینے اور اس کے متعلق جدید قانون کے نفاذ پذیر ہو جانے کی وجہ سے لکھنؤ کی میونسپلٹی نے بالکل ایک نئی اور ناخوشگوار صورت پیدا کر لی ہے کیونکہ جس سرگرمی اور جوش سے ہمارے ہندو بھائیوں نے اس کی مخالفت کی اس کی نوبت یہاں تک بڑھی کہ لکھنؤ اور بعض دوسرے شہروں کی میونسپلٹیوں میں انتخاب کے ذریعے سے جو نشستیں ہندو نمایندوں کے لیے مخصوص تھیں اُن کو پُر کرنے کی تمام کوششوں کی مخالفت کی گئی۔ لکھنؤ ایسے بڑے شہر کی میونسپلٹی کا انتظام اس تحریکِ بے ہنگام کی بدولت صرف ایسے یورپین اور مسلمان ممبروں پر چھوڑ دیا گیا ہے جن میں سے اکثر میونسپلٹی کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے اور ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے نسبتہً بہت تھوڑا وقت پبلک کی خدمت کے لیے لے سکتے یا دیتے ہیں۔ تاہم برادر مرحوم کے غیر معمولی شغف کی وجہ سے کہ وہ معمولی ممبر ہونے کے ماسوا سینیئر وائس چیرمین بھی منتخب ہو گئے تھے ان ناساعد حالات میں بھی میونسپلٹی کے انتظامات میں کچھ خلل نہیں واقع ہو سکا۔ لیکن اب اس بارے میں بہت اندیشہ ہو گیا ہے اور جس بات کا سب سے زیادہ احتمال ہے وہ یہ ہے کہ غیر سرکاری افراد اور اہلِ ہند کے نمایندوں کو جو اقتدار اور قابو میونسپلٹی کے انتظامات میں ہونا چاہیے وہ اس علیحدگی کی روش سے پامال ہو جائے گا اور باضابطہ طور پر نہ سہی مگر عملی طور پر ضرور تمام اختیارات اُس عامل کے حصے میں جا پڑیں گے جسے جدید قانون نے اگزیکیٹو آفیسر کا لقب دیا ہے۔ اب اس کا سدباب کرنا ہمارے خیال میں تمام ہی خواہانِ وطن اور ملکی بہبود و فلاح کے لیے جد و جہد کرنے والوں کا فرضِ اولیں ہونا چاہیے۔ ورنہ گویا ہم اپنے ہاتھوں اپنے

پاؤں پر کلہاڑی مارنے والے ہوں گے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ان معاملات میں ہماری کمزور آواز کو کچھ دخل نہیں اور نہ ہمارے مشوروں کا کوئی اثر ہو سکتا ہے لیکن ہم ادائے فرض سے قاصر رہیں گے اگر اس موقع پر لکھنؤ کے وطن دوست ہندو معززین سے باصرار اس بات کی درخواست نہ کریں کہ اصولی اختلاف کو وہ شوق سے قائم رکھیں اور اس قانون کی ترمیم و تنسیخ کے لیے جتنی چاہیں کوشش کریں لیکن شمالی ہندوستان کے اس سب سے بڑے شہر کو اپنی بے موقع علحدگی کی بدولت ہمارے اپنے اقتدار سے باہر نہ جانے دیں۔ اور کم سے کم اپنی جماعت کے اُن چند افراد کو جنھیں میونسپلٹی کے کاموں کا تجربہ اور اس کے ذریعے سے اہل ملک کی خدمت کا شوق ہو جلد سے جلد ممبر کرا دیں۔ ورنہ لکھنؤ کے در و دیوار کچھ ہی دنوں میں پکار پکار کر کہیں گے کہ

گر ہمیں مکتب ست و ایں مُلّا　　کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اخبار ہمدم میں برادر مرحوم کی خبر وفات پڑھ کر جن احباب و اعزا نے تار اور خطوط کے ذریعے اس الم آگیں حادثے پر اظہارِ رنج و ہمدردی فرمایا ہے اُن کا شکریہ عرض ہے۔ بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ وہ ہمیں اور مرحوم کے دیگر پسماندگاں کو توفیق صبر عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

اسی سلسلے میں چند تاریخہائے وفات موصول ہوئی ہیں جو اظہارِ امتنان کے ساتھ درج ذیل کیجاتی ہیں۔

(۱) از منشی الٰہی بخش اعجاز لکھنوی

آہ آں منشیِ خجستہ صفات　　کہ سخاوت علی است نام او را
بُد عزیزِ خلائق آں مرحوم　　محسنِ دوست و حامیِ غربا
مرض الموت ناگہاں آمد　　کارگر شد نہ ہیچ فکر و دَوا
ساغرِ زندگی چو شُد لبریز　　جرعہ نوشید او ز جامِ قضا
سالِ رحلت رقم نمود اعجاز
شد بخلد بریں ازیں دُنیا
۱۳۳۵ھ

(۲) از منشی ارتضا علی علوی شرر کاکوروی

محمد سخاوت علی نوجواں

۱۳۳۵ھ

سخاوت رفت زیں دنیائے فانی بماند از عقل و ذہنش داستانے
شرر بر مرقدش عبرت رقم کرد مزارِ کشتۂ ارماں جوانے

۱۳۳۵ھ

نوجوانی میں سخاوت چل بسا تھا بڑا عاقل بہت قابل ادیب
آہ ہیں ہندو مسلماں سوگوار جانتے تھے سب اُسے اپنا حبیب
فکر ہے تاریخ کی لکھ دے شرر آج ہے یہ ماتم حسرت نصیب

۱۳۳۵ھ

کس طرح صبر آئے بڑا سانحہ ہوا اس کمسنی میں آئی سخاوت کو آہ موت
تاریخ انتقال کی ہے فکر اے شرر لکھ دو کہ ۔ دن : تھے ابھی مرنے کے واسطے

۱۳۳۵ھ

تقریباً ڈیڑھ سال کا زمانہ گزرا جب ناظرین الناظر کو اطلاع دی گئی تھی کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ایک مبسوط اور جامع کتاب پولیٹیکل اکانومی یا اقتصادیات پر شایع ہوگی۔ اور اکتوبر ۱۵ء کی اشاعت میں اسی کتاب کا ایک باب "کارکردگی" کے عنوان سے بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی کتاب علم الاقتصاد نے اس بحث کو اُردو خواں اصحاب کے پیش نظر کیا تھا مگر یہ مضمون اس قدر اہم، وسیع اور مختلف ضروریات پر حاوی ہے کہ ایک مختصر سی کتاب کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے کرم فرما مسٹر محمد الیاس برنی، ایم اے، ایل ایل بی (جو علیگڈھ کالج میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں) کی عرق ریزی سے آٹھ سو صفحے کے حجم پر کتاب علم المعیشت تیار ہو کر شایع ہوگئی ہے۔ کتاب کی جلد انگریزی کتابوں کی طرح سنہری حروف میں کتاب، مصنف اور انجمن ترقی اردو

ناموں سے مزین ہے اور قیمت عہ مقرر کی گئی ہے۔ وہ اصحاب جنھیں اس شعبۂ علم سے دلچسپی ہے یا جو یہ چاہتے ہیں کہ اُردو زبان ایک علمی زبان کی حیثیت اختیار کرلے اُنھیں انجمن ترقی اُردو کی ان کوششوں کی پوری قدر کرنا چاہیے اور قدر افزائی کی بہترین صورت یہ ہے کہ انجمن کی طرف سے جو اعلیٰ درجے کے مطبوعات شائع ہوں اُن کو سب اصحاب شوق سے خریدیں۔ کتاب دارالاشاعت انجمن ترقی اُردو۔ چوک لکھنو سے مل سکتی ہے۔

جنوری کے پرچے میں اُردو کانفرنس کی روداد میں ظاہر کیا گیا تھا کہ لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب مولانا حافظ محمد برکت اللہ صاحب رضا فرنگی محلی کی طرف سے انجمن ترقی اُردو کو دیوان رضا کے پچاس نسخے مرحمت فرمانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ چنانچہ صاحب موصوف نے وہ پچاس جلدیں ہمارے پاس بھیج دی ہیں۔ یہ دیوان دفتر دارالاشاعت سے عصہ میں مل سکتا ہے شائقین جلد طلب فرمالیں کیونکہ تعداد محدود ہے۔ ارکان انجمن کو بھی اسی قیمت پر یہ کتاب دی جائے گی۔

حکیم سراج الحق صاحب منیجر دلگداز نے سخن سنج کے نام سے دو جزو کا ایک سہ ماہی رسالہ ادب اُردو کی خدمت کے لیے حال ہی میں جاری کیا ہے۔ جس میں نصف اوراق نثر کے لیے اور نصف نظم کے لیے مخصوص رہیں گے۔ پہلے نمبر کے حصۂ نثر میں جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کا مضمون 'قرۃ العین' کے عنوان سے ہے اور حصۂ نظم میں اقبال کی ایک مشہور غزل پر کسی نے مصرع لگائے ہیں۔ اور اکبر۔ آزاد سبحانی۔ جلیل۔ ریاض۔ حسرت موہانی۔ شوق قدوائی۔ عزیز لکھنوی۔ نظم طباطبائی اور وحشت صاحب کی غزلیات ہیں۔ رسالہ کی تقطیع درسی کتابوں کی سی اور قیمت صرف ۲ر سالانہ ہے۔

یہ امر خوشی کے قابل ہے کہ انجمن خدام ہند نے اہل ملک کو ملکی معاملات کی تعلیم دینے کے لیے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے چنانچہ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کی مؤکتاب سلف گورنمنٹ (حکومت خود اختیاری) ہمارے کرم فرما پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی کے اہتمام سے اسی مہینے میں شایع ہوگی۔ ہم نے ناظرین الناظر کے واسطے پہلے ہی سے ایک معقول تعداد کی فرمائش درج کرادی ہے تاکہ کتاب چھپتے ہی مل جائے۔ اس کی قیمت تخمیناً ۱ر یا ۸ر ہوگی۔ بہی خواہان ملک کے لیے ملکی مسائل کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرلینا ضروری ہے اس وجہ سے امید ہے کہ اس سلسلہ کی کتابوں کی بکثرت اشاعت ہوگی۔ قومی و ملکی لیڈروں کو تو تبلیغی رسائل کے طور پر انھیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مفت تقسیم کرنا چاہیے۔

نیلی چھتری
یا
شاہان دہلی کا پوشیدہ خزانہ

مسٹر ظفر عمر بی اے کا یہ ناول اس قدر دلچسپ ہے کہ کوئی خشک مزاج آدمی بھی ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد ختم تک پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ افسانہ ہے تو حقیقت میں دہلی کے ایک شاطر قزاق اور علیگڈھ کالج کے ایک طالبعلم کی ذہنی و دماغی قابلیتوں کا موازنہ، مگر پیرایہ تحریر ایسا ہے کہ کتاب کو ہاتھ میں لیتے وقت قوت تخیل اُسکی نوعیت اور ناظر کا احاطہ کرنے سے قاصر رہتی ہے دیکھیے اور مزے لوٹیے۔ قیمت ۱۲ار

پریم پچیسی

یعنی پریم چند صاحب کے دلچسپ و سبق آموز افسانوں کا مجموعہ جسے ڈاکٹر اقبال۔ مولوی عبد الحق اور ملک کے تمام انشا پردازوں نے بہترین ادبی مجموعہ تسلیم کیا ہے۔ سیرت نگاری جو افسانہ کی جان ہے پریم چند صاحب کا حصہ ہے قیمت ۲ار

ابن مسلم

یعنی الناظر کے مایۂ ناز مضمون نویس مسٹر سلطان حیدر صاحب جوش کا دلچسپ ناول۔ جس کے ہر باب میں فطری جذبات اور تاریخی واقعات کی جیتی جاگتی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں سلطان حیدر صاحب کا قلم فسانہ نگاری کے میدان میں جو کرشمہ سازیاں کرسکتا ہے وہ الناظر کے اوراق سے ظاہر ہے۔ قیمت ۱۲ار

رسول عربی

یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر اور جامع سوانحمری جس میں خاص طور پر حضور سرورِ کائنات روحی فداک کی خانگی زندگی کے وہ روشن کارنامے پیش نظر کیے گئے ہیں جو تہذیب انسانی کا سرمایۂ ناز اور مسلمانوں کے لیے ہر لحظ قابل تقلید ہیں۔ قیمت ۸ر

بنت الرسول

یعنی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالی عنہا کی مختصر سوانحمری۔ جسکا مطالعہ عورتوں کے لیے خصوصاً بہت مفید ہوگا کہ آج انکی معاشرت سب سے زیادہ اسلامی تعلیم کے لحاظ سے قابل اصلاح ہو رہی ہے۔ قیمت ۵ر

ازواج الانبیا

اُردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی کسی زبان میں حتی کہ عربی میں بھی کوئی کتاب اس موضوع پر موجود نہیں ہے انبیا علیہم الصلوۃ کے حالات تو اکثر مورخین نے مرتب کیے ہیں مگر اُنکی ازواج مطہرات کے جس قدر حالات بھی ملیں گے وہ ایسے پاشاں اور متفرق ہوں گے کہ جبتک کوئی شخص عربی کی بڑی بڑی سیکڑوں کتابیں نہ پڑھے، واقفیت تام نہیں حاصل ہوسکتی۔ اس کتاب میں جو علیا حضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال کے حکم سے تیار ہوئی ہے سوائے خاتم النبیین سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے کہ ان میں سے ہر ایک کی علٰحدہ سوانحمری لکھی جارہی ہے تمام نبیوں کی بیبیوں کی سوانح زندگی جو دستیاب ہوسکے ہیں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ قیمت صرف عہ ر

سوانح احمدی

جس میں حضرت مولوی سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات نہایت ہی اس شرح و بسط کے ساتھ درج کیے گئے ہیں کہ باریک کتابت کے باوجود ۱۶۰ صفحوں پر ختم ہوئے ہیں اور آخر میں ۶۰ کے قریب سید صاحب کے مکتوبات ہیں جنسے اُس عہد کے اکثر دلچسپ واقعات پر روشنی پڑتی ہے قیمت ۱۲؍

اسلام کا انجام

یہ اُس شہرۂ آفاق رسالہ کا ترجمہ ہے جسکو دیار مصر کے نامور بزرگ سند العارفین راس الکاملین فاضل اجل علامہ سید توفیق بکری نے المستقبل الاسلام کے نام سے تصنیف فرمایا تھا قیمت ۲؍ ناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کیجیے

پہلے درویش کے جنگی کارنامے

یعنی ان بڑی لڑائیوں کا بیان جن میں خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے ہیں عنوان بالا کے تحت میں نہایت موثر و دلکش تاریخی مضامین کا ایک قابل قدر سلسلہ حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب نے میرٹھ کے ماہوار مذہبی و ادبی رسالہ راز و نیاز کے لیے لکھنا شروع کیا ہے اس دلگیر سلسلہ کا پہلا حصہ راز و نیاز کے نوروز نمبر معروف بہ درویش جنتری ۱۹۱۷ء میں شایع ہوا ہے۔ جو صاحب اس اثر انداز تاریخی مضمون کے مطالعہ سے لطف اٹھانا چاہیں وہ صرف ۴ کے ٹکٹ بھیجکر ہم سے درویش جنتری ۱۹۱۷ء منگالیں جسمیں سال بھر کے لیے پنجگانہ نماز اور سحر و افطار کے نہایت معتبر اوقات۔ ایکہزار سے زائد بزرگان دین کے عرسوں کی تاریخیں۔ حضرت جرجیس علیہ السلام کا عبرت آموز قصہ اولیاء اللہ کی دلسوز حکایات، فقہی مسائل۔ شرعی آداب، اعمال و وظائف مجرب علاج اسلامی اخبارات و رسائل کی فہرست اور بہت سی کارآمد اور دلچسپ باتیں درج کیگئی ہیں اور جسکی ہر ایک سطر پڑھنے کے قابل ہے۔ رسالہ راز و نیاز (جسکی سالانہ قیمت ۱؍ ششماہی ۱؍ اور سہ ماہی ۱؍ ہے) کے مستقل خریداروں کو درویش جنتری مفت دیجاتی ہے۔ محض ۴ خرچ کر کے آپ درویش جنتری اور راز و نیاز کے دو پرچے خرید سکتے ہیں ضرور بھیجیے۔ درویش جنتری ۱۹۱۷ء کو کمیشن پر فروخت کرنیکے لیے ایجنٹوں کی بہت ضرورت ہے ۲۵ جلدوں کی قیمت ایجنٹوں سے بجائے للعہ کے صرف ۱؍ لیجائیگی

منیجر راز و نیاز و درویش جنتری کیمپ میرٹھ

علمی مضامین کا گنجینہ، اخلاق کا آئینہ یعنی ادب اردو کا ایک ماہوار رسالہ

نظارہ

یہی وہ نظارہ ہے جسکی تاب حضرت موسیٰ نہ لاسکے! یہی وہ نظارہ ہے جسکے پردے میں قدرت کی تجلیاں مخفی ہیں۔ دنیاے علم کے تماشائی کہاں ہیں؟ آنکھیں کھولیں اور اس جام جہاں نما کی سیر کریں۔ اخلاقی، تمدنی، ادبی معاشرتی مناظر کا نظارہ نظارہ ہی کے صفحات سے ہوتا ہے۔ جو ہر مہینے آفتاب عالمتاب کی طرح میرٹھ سے نکلتا ہے اور دنیا میں ایک نئی روشنی لاتا ہے۔ اہل نظر نظارے کو آئینے کی طرح سامنے رکھیں اور علم کی جیتی جاگتی تصویروں کا (جن کو ملک کے مشہور اہل قلم مختلف رنگوں میں نظارے کے اوراق پر کھینچتے ہیں) تماشا دیکھیں قیمت کچھ بھی نہیں صرف تین روپیے بھیجنے پر نظارہ کی سیر ایک سال تک گھر بیٹھے ہو سکتی ہے۔ نمونہ ۵ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔

منیجر رسالہ نظارہ شہر میرٹھ

سالانہ رپورٹ

انجمن ترقی اردو

بابت سنہ ۱۹۱۶ء

جناب صدر انجمن۔

اس سے قبل کہ مین آپ کی خدمت مین اس سال کی کارگزاری کی کیفیت پیش کرون، مین اسے اپنا فرض سمجھتا ہون کہ سب سے پہلے اُس منبع جود وسخا کے بذل وعطا کا ذکر جمیل بجال احسانمندی وشکرگزاری کرون جس کی خسروانہ اعانت کی بدولت اس انجمن کے قیام کو استحکام نصیب ہوا ہے۔ ہندوستان مین کم ایسی علمی انجمنین اور تعلیمی درسگاہین ہین جو اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے احسان وعطا کی زیر بار نہون۔ اعلیٰ حضرت واقدس کی فیاضیان اور اُن کی ہنرپروری اور علمی قدردانی روز روشن کی طرح آشکار ہین۔ بلامبالغہ کسی ملکی یا قومی کام شروع کرنے سے پہلے امید بھری آنکھین دکن کی طرف اُٹھتی ہین۔ تمام ہی خواہان اردو کو یہ سن کر بے انتہا مسرت ہوگی کہ اعلیٰ حضرت نے ازراہ مراحم خسروانہ انجمن کے لیے

مستقلاً پانچ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد مرحمت فرمائی ہے سچ یہ ہے کہ اعلیٰحضرت کی سرپرستی اور شاہانہ امداد نے اس سسکتی ہوئی انجمن کے حق مین آب حیات کا کام کیا ہے۔ انھین کرم فرماتے اتنی دیر نہین لگتی جتنی ہمین شکرگزاری کے لیے الفاظ تلاش کرنے مین ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مین اُس خاتون محترم فیض مجسم کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہون جس کے در سے کوئی قومی گدا کبھی محروم نہین پھرتا۔ کتنے مدرسے کتنی انجمنین کتنے یتیم خانے ایسے ہین جن کا وجود و قیام محض فرمان روا ے بھوپال کے دم سے ہے علیا حضرۃ خلد اللہ ملکہا نے جنھین انجمن کے اغراض و مقاصد سے ابتدا سے ہمدردی ہے، انجمن کے لیے پچاس روپیہ ماہانہ کی مستقل امداد عطا فرمائی ہے جس سے انجمن کو بہت بڑی تقویت ہو گئی ہے۔

ابتدا ے قیام انجمن سے یہ پہلا وقت ہے کہ انجمن کی مالی حالت اس قابل ہوئی ہے کہ ہم علمی اور عملی کام یک گونہ اطمینان کے ساتھ انجام دے سکتے ہین اور یہی نہین بلکہ پہلے سے زیادہ اہل ملک نے اس کی طرف توجہ فرمائی ہے اور مختلف مقامات مین اس کے مقاصد و اغراض کی اشاعت و توسیع اور اس کی شاخین قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ بعض ایسے ہمدرد اصحاب بھی پیدا ہو گئے ہین جو انجمن کے کامون کو خوشی اور مستعدی کے ساتھ کرنے کے لیے آمادہ ہین۔ اور عام طور پر انجمن کی کارروائیان اور کوششین بنظر استحسان دیکھی جانے لگی ہین۔

چنانچہ اس سال کلکتہ مین انجمن کی ایک شاخ جناب نواب نصیر حسین خان صاحب خیال اور قاضی عبد الغفار صاحب (اڈیٹر صداقت) کی سعی سے قائم ہوئی اور اس کے

سکرٹری مولوی واحد حسین صاحب۔ بی۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس انتخاب کیے گئے۔ آپ خاص بنگال کے باشندے ہین اور اُردو زبان اور تعلیمی معاملات سے دل چسپی رکھتے ہین اور اُردو مین متعدد کتابون کے مؤلف ہین۔ چونکہ اس کے ارکان مین بعض ہمدرد اور پرجوش حضرات شریک ہین۔ اس لیے یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ شاخ بنگال کے لیے ضرور مفید ہوگی۔ گذشتہ اکتوبر مین مسلمانان جنوبی ہند کی تعلیمی انجمن (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مدراس) کا سالانہ اجلاس عظیم لشان پیمانے پر خاص انتظام واہتمام سے زیر صدارت جناب مسٹر محمد اکبر حیدری ہوم سکریٹری دولت آصفیہ حیدرآباد دکن بمقام وانیم باڑی منعقد ہوا۔ اس مین انجمن کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ کانفرنس کے اجلاس مین ایک خاص رزولیوشن انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ جنوبی ہند مین قائم کرنے کے متعلق پیش ہوا۔ یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ جنوبی ہند کے مسلمانون کو اردو سے ایک قسم کا عشق ہے اور وہ اسے اپنی قومی زبان خیال کرتے ہین اور ہمیشہ اس کی تحصیل وتعلیم پر مُصر پائے جاتے ہین۔ انھون نے انجمن کے مقاصد اور کارگزاریون کو بڑے شوق اور دل چسپی سے سُنا اور بڑے جوش کے ساتھ متفق اللسان ہوکر اس رزولیوشن کی منظوری دی میرا خیال ہے کہ عملی کارروائیون مین ہمارے جنوبی ہند کے بھائیون کو ہم سے زیادہ سوجھ بوجھ ہے۔ خصوصاً جبکہ نواب غلام محمد صاحب کلامی اور آنربل سیٹھ یعقوب حسن جو کانفرنس کی روح وروان ہین مدراس مین ایک ایسی انجمن کی ضرورت سمجھتے ہین اور اس کے مقاصد کے دل سے حامی ہین، تو مجھے یقین ہے کہ اُن کی نگرانی وآبیاری سے انجمن کی یہ شاخ زیادہ سرسبز رہے گی۔

اسی سال جناب مولوی مصطفےٰ علی صاحب وکیل کی سعی و توجہ سے جالنہ ضلع اورنگ آباد مین انجمن کی ایک شاخ قائم ہو چکی ہے اور اس کے متعلق ایک کتب خانہ قائم کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے مشہور انجمن گر مولوی حاجی ریاض الدین احمد صاحب امسال حج کو تشریف لیے جا رہے تھے، چلتے چلتے انھون نے بمبئی مین جھٹ پٹ ایک جلسہ کرکے اس انجمن کی ایک شاخ قائم کر دی۔ حاجی صاحب موصوف کو ایسے معاملات مین کسی تحریک کی ضرورت نہین۔ اگر اُن کی قائم کردہ انجمنون اور مدرسون (یعنی مردہ اور زندہ دونون) کا شمار کیا جائے تو جتنے حضرات اس وقت یہان جمع ہین، اُن سب کی کوشش سے اس قدر انجمنین اور مدرسے قائم نہین ہوئے ہون گے جتنے حاجی صاحب نے تن تنہا اپنی ہمت سے اس ملک مین قائم کر دیے ہین۔ شاید ہی کوئی بدنصیب مقام اُن سے بچا ہو گا۔

یہ شاخین اس وقت گو کسی حالت مین ہون لیکن محض ان کا قیام اس امر کی دلیل ہے کہ لوگ عام طور پر انجمن کے مقاصد کو مفید خیال کرتے ہین اور اس سے بجا طور پر یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر یہ کام استقلال سے جاری رہا تو کامیابی مین شبہ نہین اور آیندہ رفتہ رفتہ وہ تمام مشکلات رفع ہو جائین گی جو اب تک پیش آتی رہی ہین۔ لیکن سب سے زیادہ حوصلہ افزا امر اس سال یہ پیش آیا کہ اہل لکھنؤ نے (جن مین اکثر شہر کے عمائد اور اہل علم شریک تھے) اپنی خاص عنایت و ہمدردی سے انجمن کو اپنے خوب صورت اور بارونق شہر مین دعوت دی اور یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ اُس کا ایک جلسہ لکھنؤ مین بھی کیا جائے۔ اس مین صرف

وقت یہ تھی کہ یہ جلسہ کن تاریخون مین ہو۔ اُن مین سے اکثر اصحاب کا یہ خیال تھا کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی کسی تاریخ مین ہونا چاہیے تاکہ لوگ آسانی سے اُس مین شریک ہوسکین ورنہ پھر ایسا موقع نہ ملے گا۔ دوسرے اوقات مین اس قدر اصحاب کا ایک جا جمع ہونا ممکن نہین۔ ان کا یہ خیال بالکل درست تھا، مگر مشکل یہ تھی کہ اسی زمانے مین آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا بھی اجلاس ہوتا ہے اور انجمن کا سالانہ جلسہ اس کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ لہذا اس شرط پر دعوت قبول کر لی گئی کہ لکھنؤ کے جلسے کی کوئی ایسی تاریخ مقرر کی جائے جو انجمن کے سالانہ اجلاس کانفرنس کے بعد ہو۔ اس مین فریقین کو کسی عذر کا موقع نہ تھا۔ اور چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس بارے مین بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی اور اصل حقیقت کے دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کرکے جلسے کے انعقاد اور داعیون کی نیت پر نکتہ چینی کی گئی۔ میرے خیال مین کیا کسی کے خیال مین بھی اہل لکھنؤ کی یہ خواہش ایسی غیر معمولی یا ناروا تھی کہ وہ مورد الزام یا مستوجب نکتہ چینی سمجھی جاتی۔ اصل واقعات کے معلوم نہ ہونے سے ہمیشہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور پھر غلط فہمی کی نوبت دور تک پہونچ جاتی ہے۔ حالانکہ موقع یہ تھا کہ اہل لکھنؤ کا شکریہ ادا کیا جاتا کہ انھون نے اشاعت مقاصد کے لیے انجمن کو ایسا اچھا موقع دیا۔ اُن حضرات کو یہ بھی معلوم نہین کہ اس قسم کی دعوتین اور بھی کئی مقامات سے موصول ہوئی ہین اور سب سے زیادہ اہل حیدرآباد کا تقاضا ہے کہ وہان بڑے پیمانے پر انجمن کا ایک جلسہ کیا جائے اور غالباً لکھنؤ سے قبل وہین ہوتا لیکن طاعون کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ مین اس موقع پر اس امر کا اظہار کر دینا مناسب سمجھتا ہون کہ اگر ہمین انجمن کو ملک کے حق مین مفید اور مؤثر بنانا ہے تو

ہمین اس کے جلسے مختلف مقامات اور مختلف موقعون پر کرنے پڑین گے اور بارہا کرنے پڑین گے۔ ایسی صریح اور نا قابل اعتراض باتون پر ناراضگی و رنج کا اظہار کرنا ٹھیک نہین ہے۔ لیکن مین جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب کا ممنون ہون اور ساتھ ہی اُن کی سلامت طبع کا قائل ہون کہ اگرچہ اُن کے گرد وپیش ایسے اسباب موجود تھے کہ اُنھین ان حالات سے اشتعال پیدا ہوتا لیکن انھون نے مطلق ان باتون کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے کامون کے انجام دینے کے لیے باہمی اعتماد کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

علاوہ اس کے دو سال سے یہ خیال تھا کہ ارکان انجمن کی ایک مجلس شوریٰ کر کے بعض ایسے امور پیش کیے جائین جن کا قطعی طور پر فیصلہ کرنا نہایت ضروری ہے اور جو خط وکتابت سے طے نہین پا سکتے۔ لیکن گذشتہ دو سال مین کانفرنس کے اجلاس ایسے دور و دراز مقامات پر ہوئے کہ ارکان انجمن کی کافی تعداد بہم نہ پھونچ سکی دوسرے وقت کی تنگی ایسی تھی کہ یہ خیال وقوع مین نہ آسکا۔ انجمن کا کام روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داریان بڑھتی جاتی ہین۔ اس لیے اب مجلس شوریٰ کے انعقاد کی ضرورت اور شدید ہو گئی کیونکہ اگر ان ضروری امور کا جلد تصفیہ نہ کر لیا گیا تو انجمن کے کام کو نقصان پھونچنے کا اندیشہ تھا۔ اس سال یہ موقع بہت غنیمت سمجھا گیا۔ ملک کی بڑی بڑی انجمنون اور مجلسون کے اجلاس اسی زمانے مین ہین۔ علی گڈھ اور لکھنؤ ایسے مقامات ہین جو علمی، معاشرتی اور مقامی خصوصیات کی وجہ سے خاص کشش رکھتے ہین۔ لوگون کا اجتماع خاطر خواہ ہوگا اور ارکان و بہی خواہان انجمن کی ایک کثیر تعداد آسانی سے جمع ہو جائے گی۔ چونکہ

اس سے بہتر موقع قریب زمانے مین ملنا مشکل تھا۔ اس لیے یہ راے قرار پائی کہ انھین تاریخون مین ایک دن اس کام کے لیے بھی مخصوص کر دیا جائے۔

علاوہ بعض دیگر امور کے خاص خاص معاملات فیصلہ طلب یہ ہین

۱ — موجودہ حالات کے رو سے انجمن کے قواعد و ضوابط پر نظر ثانی اور ضرورت ہو تو اُن مین مناسب ترمیم کی جائے۔

۲ — ملک کے مختلف مقامات مین انجمن کی شاخین قائم ہوتی جاتی ہین اور آیندہ غالبًا اور زیادہ توسیع کی امید ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اندیشہ ہے کہ کہین ایسا نہ ہو کہ یہ انجمنین محض نام کی ہون اور کوئی کام نہ کرین۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان کے لیے کچھ قواعد مرتب کر دیے جائین تاکہ وہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہین اور انجمن کے مقاصد کی تکمیل مین ان سے کافی مدد ملے اور مرکزی انجمن سے ایک نسبت اور سلسلہ قائم رہے۔

۳ — انجمن کے بعض مقاصد ایسے ہین جن کے متعلق ابھی تک کوئی کارروائی عمل مین نہین آئی اُن کے متعلق مناسب تدابیر غور کے لیے پیش کی جائین۔

۴ — کم سے کم آیندہ چند سال کے لیے ایک پروگرام ایسا تیار کر لیا جائے جو انجمن کے پیش نظر رہے اور اس کی تعمیل کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ اس سے انجمن کا کام ایک خاص صورت مین منضبط ہو جائے گا اور ایک مدت تک اُس کی رہنمائی کا کام دے گا۔ اگرچہ اس سے انجمن کی ذمہ داری بہت کچھ بڑھ جائے گی لیکن بغیر ذمہ داری بڑھائے کوئی مفید کام ہو بھی نہین سکتا۔

چونکہ مجھے کانفرنس کے اس اجلاس مین حاضر ہو کر اپنی رپورٹ پیش کرنا

ضرور تھا۔ اس لیے مین نے یہ مناسب خیال کیا کہ اگر ان امور کا فیصلہ اس سے قبل ہو جائے تو بہتر ہوگا تاکہ مین جناب کو اس فیصلہ کی اطلاع دے سکون چنانچہ اس خیال سے مجلس شوریٰ کا انعقاد ۲۵۔ دسمبر کو لکھنؤ مین کیا گیا جس مین ۲۰ حضرات شریک تھے۔ اور اُن کی خدمت مین یہ تمام مسائل پیش کیے گئے بعد کامل غور اور کافی بحث مباحثے کے یہ امور قابل اطمینان طور پر طے پا گئے جس کی تفصیلی کیفیت اس رپورٹ کے ساتھ الگ شائع کی جائے گی۔ کیونکہ جو وقت مجھے اس اجلاس مین دیا گیا ہے وہ اس قدر کافی نہین ہے کہ مین اُس کی رپورٹ پڑھ کر سناؤن۔ مگر مین اس موقع پر اُن تمام حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہون جنھون نے زحمت فرما کر اس مین شرکت فرمائی اور ان مسائل کی بحث مین ہمدردی اور سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

گذشتہ سال کی رپورٹ مین چند کتابون کا تذکرہ کیا گیا تھا جو زیر تالیف یا ترجمہ تھین۔ ان مین سے بعض چھپ کر شائع ہو گئین، بعض زیر طبع ہین اور بعض کا کام ابھی جاری ہے۔

ا۔ مفصلہ ذیل کتب چھپ کر شائع ہو گئی ہین۔

(۱) سید انشاء اللہ خان دہلوی مرحوم کی نادر کتاب دریائے لطافت۔

(۲) اردو قاعدہ۔ و کلید قاعدہ۔

(۳) پلوٹارکس لائوز (مشاہیر یونان و روما) کی جلد اول ترجمہ جناب سید ہاشمی صاحب

(۴) طبقات الارض مولفہ جناب مولوی مرزا مہدی خان صاحب کوکب۔

(۵) عربی ایک مشکل زبان ہے، لیکن اتنی بھی نہین جس قدر کہ یہ عام طور پر

مشکل سمجھی جاتی ہے، طریقۂ تعلیم اور مروجہ درسی کتب نے اسے اور مشکل کردیا ہے۔ مولانا حمید الدین صاحب۔ بی۔ اے۔ صدر دارالعلوم حیدرآباد دکن نے اس دقت کو محسوس کرکے طالب علموں پر بڑا احسان کیا ہے کہ انھون نے نہایت آسان اور سلیس زبان مین بالکل جدید طرز پر چند رسالے انجمن ترقی اردو کے لیے لکھے ہین۔ جن مین سے دو طبع ہوگئے ہین اور دو زیر تالیف ہین ان مین صرف وہی مسائل نہین ہین جو مبتدیون کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہین۔ بلکہ مبتدی سے منتہی تک کے لیے کافی ہین اور اُن تمام دقیق اور پیچیدہ مسائل کو جن کے سمجھنے اور سمجھانے مین بڑی دشواری پیش آتی ہے بالکل سہل کردیا ہے۔ اور وہ اہم اور نازک مسائل جو بڑی بڑی کتابون کے مطالعے کے بعد کہین مشکل سے نظر پڑتے ہین، ان رسالون مین بڑی خوبی سے آگئے ہین جو لوگ عربی زبان تحصیل کرنا چاہتے ہین اُنھین ان سے بہتر اور جامع اور سہل کتابین کسی زبان مین نہین مل سکتین۔

۲۔ وہ کتابین جو زیر طبع ہین۔

(۱) علم المعیشت مولفۂ جناب محمد الیاس صاحب برنی۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر علی گڈھ کالج۔ پروفیسر صاحب موصوف نے بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔ اس فن پر اردو زبان مین یہ پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام و وسعت نظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ قابل مؤلف نے مشکل سے مشکل مسائل کو تاحدامکان آسان زبان مین ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو حضرات اس فن کے مسائل و اصطلاحات کی مشکلات سے واقف ہین وہ سمجھ سکتے ہین کہ مؤلف کو اس کے لکھنے مین کیسی کیسی دشواریان پیش آئی ہون گی۔ وہ لوگ جنھون نے کسی غیر زبان مین کسی فن کی تحصیل و تکمیل

کی ہے بے شبہ قابل قدر ہین - لیکن وہ لوگ جنھون نے اس تکمیل کے بعد اہل ملک کے فائدے کے لیے زحمت و مشقت اُٹھا کر اپنی زبان مین اس فن پر کتابین لکھی ہین وہ بہت زیادہ قابل قدر اور لائق تحسین ہین - یہ کتاب چھپ چکی ہے اور صرف چند اجزا باقی ہین - امید ہے کہ ملک مین قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی -

(۲) پروفیسر لیکی کی مشہور کتاب ہسٹری آف دی یورپین مارلس (تاریخ اخلاق یورپ) کا ترجمہ جناب مسٹر عبد الماجد صاحب - بی - اے - نے کیا ہے ترجمہ بالکل مکمل ہو گیا ہے اور طبع کے لیے بھیجدیا گیا ہے -

۳ - جن کتابون کے آیندہ سال طبع ہونے کی توقع ہے وہ یہ ہین -

(۱) پلوٹارکس لائوز (مشاہیر یونان و روما) کی دوسری جلد جس کا ترجمہ جناب سید ہاشمی صاحب کر چکے ہین -

(۲) نامۂ دانشوران کے ۱۰۰ صفحے ترجمہ ہو چکے ہین - جناب مولوی ریاض حسن صاحب نے اور سو صفحے عنقریب ترجمہ کر کے دینے کا وعدہ فرمایا ہے - ان سو صفحات کے وصول ہونے پر یہ تمام ترجمہ ایک جلد کی صورت مین شائع کر دیا جائے گا -

(۳) مولوی سید محمد صاحب نے ایک کتاب پیرایۂ اقبال نامی انجمن مین بھیجی ہے - مولف نے اس کتاب مین تمام ہندوستانی زیورون کے نام اور اُن کی تشریح کی ہے - اور سند مین اردو کے کسی مستند اُستاد کا شعر بھی دیا ہے اسی ضمن مین بعض متعلقہ اصطلاحات وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے - یہ کتاب اردو کی مکمل لغت کے لیے جو آیندہ کبھی لکھی جائیگی، بہت کار آمد ثابت ہوگی -

(۴) علم و اعمال حفظان صحت مولفہ ڈاکٹر لطافت حسین خان صاحب آئی۔ایم۔ایس، مکمل ہو گئی ہے۔نظر ثانی بھی ہو چکی ہے اور اب مسودہ صاف ہو رہا ہے۔ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی اور امید ہے کہ یہ بہت مفید ثابت ہوگی۔

(۵) مرزا غالب کے اردو دیوان کے جدید و نفیس اڈیشن کے متعلق گذشتہ رپورٹ مین ذکر ہو چکا ہے۔یہ اڈیشن بہمہ وجوہ مکمل و مرتب ہو چکا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری۔بی۔اے ال ال ڈی۔بیرسٹر ایٹ لا مشیر تعلیم ریاست بھوپال اس کے لیے ایک عالمانہ مقدمہ لکھ رہے ہین۔جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اس اڈیشن کے لیے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔اب تک بعض وجوہ سے طبع مین تاخیر ہوتی رہی۔ایک تو بوجہ جنگ اعلےٰ درجے کا کاغذ دستیاب ہونے مین دشواری ہے دوسرے اب تک لیتھو کا کوئی مطبع ایسا نہین ملا جو اسے اعلےٰ درجے کی نفاست کے ساتھ چھاپ سکے جو انجمن کا منشا ہے۔بعض صاحبون کی یہ راے ہے کہ فوٹوگراف کے ذریعہ طبع کرایا جاے۔اس کے متعلق بھی خط و کتابت جاری ہے کوشش کی جائیگی کہ آئندہ سال یہ طبع ہو جاے۔

(۶) گزو کی تاریخ تمدن کا ترجمہ ہو چکا ہے اب اس پر نظر ثانی باقی ہے

۴ — تراجم و تالیفات جن کا کام جاری ہے۔

(۱) اس شق مین سب سے اول جناب پروفیسر برکت علی صاحب بی۔ایس۔سی کی کتاب ہیئت جدیدہ کا ذکر کرتا ہون۔یہ پروفیسر صاحب

موصوف نے جس کمال احتیاط و محنت و تحقیق سے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا ہے وہ بے حد قابل قدر ہے۔ جو حصہ اس وقت تک لکھا جا چکا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف باعتبار فن بلکہ بہ لحاظ خوبی تحریر بھی بے مثل ہوگی۔ اس وقت تک اس کتاب کے ۱۲۰۰ صفحے لکھے جا چکے ہین، یہ بہت مبسوط اور جامع کتاب ہوگی جو دو یا تین جلدون مین ختم ہوگی۔ فاضل مؤلف جس شوق اور جان فشانی سے اس کام کو انجام دے رہے ہین انجمن اس کا شکریہ کافی طور سے ادا نہین کرسکتی۔ درحقیقت یہی وہ لوگ ہین جو اپنے علم و فضل سے ملک کی سچی خدمت کرسکتے ہین اور یہی وہ لوگ ہین جن سے یہ توقع ہے کہ وہ اس کم مایہ زبان مین علمی روح پھونکین گے۔ دنیا پر اُنھین کا احسان نہین ہے جن کی آواز صرف کالج کے کمرون مین گونجتی اور جن کے دماغ کی جولانی مدرسی کی کرسی تک محدود ہے بلکہ بڑا احسان اُن علما کا ہے جن کی آواز کالج اور یونیورسٹیون کے کمرون سے نکل کر ایک عالم تک پھونچتی ہے۔

(۲) ہربرٹ اسپنسر کی کتاب علم الاخلاق کا ترجمہ جناب مولوی حافظ علی صاحب کر رہے ہین۔ افسوس ہے کہ بوجہ علالت و دیگر مکروہات کے ترجمہ زیادہ نہین ہوا۔ لیکن جس قدر حصہ اب تک ہو چکا ہے وہ بہت قابل قدر ہے۔ یہ معمولی اور آسان کام نہین ہے۔ ہندوستان مین بہت کم لوگ ایسے ہین جو اس قسم کے مشکل علمی کامون کو اس خوبی سے انجام دے سکتے ہین جس طرح کہ مولوی صاحب موصوف نے اس ترجمے کا کام انجام دیا ہے۔ مولوی صاحب

ایک فاضل اور جامع شخص ہین۔ افسوس ہے کہ اس زمانے مین بوجہ نزول الماء انکی بصارت کو بہت صدمہ پہونچا اور ڈاکٹر نے سخت ممانعت کر دی تھی کہ لکھنے پڑھنے کا کام مطلق نہ کیا جائے ورنہ اب تک اس کتاب کا بہت سا حصہ ترجمہ ہو جاتا۔

(۳) جناب سید افتخار عالم صاحب اگرچہ اس زمانے مین مختلف آلام و افکار مین مبتلا رہے ہے مگر باوجود اس کے تاج خسروی کی لَو ان کے دل مین برابر لگی رہی۔ انھون نے اس کام کو بڑے شوق سے شروع کیا۔ اس کے لیے سامان بہم پہونچانے مین بڑی محنت و کاوش کی اور اب اُسے بڑی تحقیق اور انہماک کے ساتھ لکھ رہے ہین مجھے یقین ہے کہ حضرت امیر کے حالات و کلام پر یہ کتاب بے مثل ہو گی اور قابل مولف کا یہ کارنامہ اردو زبان مین یادگار رہو گا۔

(۴) علامۂ ابوریحان بیرونی کی کتاب الہند کا ترجمہ جاری ہے۔ اور قابل مترجم باوجود دوسری مصروفیتون کے اس کام سے بھی غافل نہین رہے۔ اس وقت کتاب کا پانچوان حصہ ترجمہ ہو چکا ہے۔ مین نے ترجمے کے کچھ اجزا دیکھے ہین۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ بڑی احتیاط اور قابلیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

۵ - تعلیمی کتب

(۱) اردو کے قاعدے کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ یہ بڑی مشکل اور جھگڑے کا کام تھا اس لیے اس مین زیادہ عرصہ لگا۔ مگر اب پورا ہو چکا ہے۔

(۲) اسی سلسلے مین انجمن اردو کی پہلی کتاب لکھوا رہی ہے۔ اس سلسلے کی تالیف سے مقصد یہ ہے کہ ایسی کتابین لکھوائی جائین جو ہندوستان کے ہر حصے مین رائج ہو سکین ان کی زبان سلیس سادہ اور فصیح ہو۔ بچون مین اشیا پر غور کرنے کا

مادہ پیدا ہو اور ابتدا سے اُن کے دلون مین عمدہ اخلاق، حبّ وطن، صفائی وغیرہ کے خیالات جاگزین ہون۔

(۳) گذشتہ رپورٹ مین اس امر کا صراحت سے ذکر ہو چکا ہے کہ سرکار نظام نے اس امر کا فیصلہ کر دیا ہے کہ دار العلوم حیدر آباد مین تمام علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے سے دی جائے۔ اس فیصلے کی اہمیت اور افضلیت سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔ ایک مدت کے تجربے اور خسارے کے بعد اب ہم صحیح راستے پر آئے ہین۔ ملک مین علم کو اشاعت کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔ دنیا بھر مین شاید یہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جو علم کو غیر زبان کے ذریعے سے سیکھتا ہے۔ اس کے معنی یہی نہین ہین کہ علم نہین آتا۔ بلکہ دماغ کو خراب کرنا، بد ذوقی و بداخلاقی کو پھیلانا، فطری جدت و جودت کو کچلنا، اور دانستہ اپنی زبان کو مٹانا ہے۔ دولت آصفیہ کا یہ فیصلہ نہایت دانشمندی اور دور اندیشی پر مبنی ہے۔ اگر اس پر احتیاط، ہمدردی اور صحیح عالمانہ نظر سے عمل کیا گیا تو اس کے نتائج ملک کے حق مین نہایت عمدہ مترتب ہون گے۔ لیکن اس کی تعمیل مین صرف ایک ہی دقت ہے۔ وہ یہ کہ کتابین کہان ہین؟ اس کی ذمہ داری انجمن ترقی اردو نے اپنے سر لی ہے۔ یہ ذمہ داری معمولی نہین ہے۔ مگر آپ کو یہ سُن کر مسرت ہوگی کہ اُس نے اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہی اُسے عمل مین لانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ (۱) چنانچہ درجۂ مولوی و منشی کے لیے طبیعات پر ایک کتاب لکھی جا چکی ہے اور وہ علمائے دار العلوم کے زیر غور ہے۔ (۲) اس کے علاوہ تاریخ یونان بھی تکمیل پا چکی ہے اور عنقریب پیش کی جائیگی (۳) تیسری ایک کتاب علم النفس

(سائیکالوجی) پر زیر تالیف ہے۔
یہ کتابین اس نہج پر لکھوائی گئی ہین کہ علاوہ درسیات کے عام طور پر بھی پڑھنے کے لایق ہون اور اردو دان اصحاب اُن سے فائدہ اُٹھا سکین۔

(۴) مولانا حمید الدین صاحب کی کتب صرف ونحو عربی کا ذکر مین اس سے قبل کر چکا ہون جو اس غرض کے لیے خاص طور پر مفید ہین۔

انجمن نے حال مین ایک تجویز کی ہے جو بعض اہل الرائے وارباب علم کے پاس مشورہ کی غرض سے بھیجی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان پر ایک مبسوط اور جامع کتاب "ہمارا وطن" کے نام سے لکھوائی جائے۔ جس مین ملک کے مختلف پہلوون مثلاً تعلیمی، اقتصادی، سیاسی، مذاہب، السنہ و اقوام وغیرہ وغیرہ پر نہایت تحقیق کے ساتھ بحث کی جائے۔ تجویز یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب یا ابواب کے مختلف حصے خاص خاص ارباب علم سے لکھوائے جائین جو اس مضمون مین مستند مانے جاتے ہین یا جنھون نے اس کا گہرا مطالعہ فرمایا ہے۔ گویا اردو مین یہ پہلی کتاب ہوگی جو ملک کے اہل علم کی مشترکہ کوشش اور محنت سے تیار ہوگی۔ بعض اہل علم حضرات نے جن کی خدمت مین یہ تجویز بغرض اظہار رائے بھیجی گئی تھی اسے نہایت پسندیدہ نظرون سے دیکھا ہے اور اس مین عملی حصہ لینے کا بھی وعدہ فرمایا ہے یہ کتاب اگر انجمن کی تجویز کے مطابق لکھی گئی تو بہت بڑا کام ہوگا اور اس سے اہل ملک کے معلومات مین بڑا اضافہ اور تغیر پیدا ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانے مین ملک کے ہر قسم کے معاملات بحث مین آتے ہین اور جب ایک معاملے کا دوسرے سے ایسا تعلق ہے کہ جب تک اُن پر مجموعی حیثیت سے نظر نہ ہو تو رائے قائم کرنے اور

نتائج کے استنباط مین عموماً غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ اس لیے صحیح معلومات کا مہیا کرنا نہایت ضروری ہے اور یہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرے گی اور ہر طبقہ کے لوگون کو رہنمائی کا کام دے گی۔ لیکن اس کی تیاری مین وقت درکار ہے اور صرف کثیر بھی۔ کیونکہ لکھنے والون کو معقول معاوضہ دیا جائے گا اور کتاب بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحات سے کم نہ ہوگی۔

علاوہ اس کے نواب عماد الملک بہادر نے، جو اس انجمن کے صدر اور مربی و سرپرست ہین اور جن کی توجہ اور سرگرم ہمدردی سے انجمن کو یہ کامیابی نصیب ہوئی ہے، انجمن کو ایک نادر قلمی کتاب تنقیح المناظر عنایت فرمائی ہے۔ یہ کتاب دراصل علامۂ فارسی نے مرتب کی ہے۔ لیکن ابن ہیثم کی کتاب المناظر پوری یا اس کا ضروری اور بڑا حصہ اس مین آگیا ہے، علامۂ فارسی اصل عبارت کے ساتھ اپنی تشریح کرتے گئے ہین۔ ابن ہیثم سرتاج حکمائے اسلام اور ایک عدیم النظیر مہندس اور ماہر فن طبعیات گذرے ہین۔ فن مناظر مین اس حکیم نے بڑی بڑی تحقیقاتین کی ہین اور موسیو شاسل جن سے بہتر اس امر مین راے دینے والا کوئی شخص نہین ہے ابن ہیثم کی اس کتاب کو یورپ کی کل معلومات علم مناظر کا ماخذ خیال کرتے ہین۔ اس عالی مرتبت اور عدیم النظیر حکیم اسلام کے علو مرتبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے پانچ چھ صدی تک یورپ کے علم و حکمت پر حکومت کی ہے اس کی کتاب المناظر دنیا کی اُن چند بے بہا اور بے مثل تصانیف مین سے ہے جنھین دنیا ہمیشہ وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ ایک زمانے مین اس کا ترجمہ لاطینی اور اطالی زبانون مین ہوا تھا اور اس سے کیپلر نے اپنی کتاب مناظر مین بہت کچھ کام

لیا تھا۔ اوّل اوّل یہ خیال ہوا کہ تنقیح المناظر کا ترجمہ مع حواشی اور مبسوط مقدمے
کے جس مین اس حکیم کے حالات اور علمی تحقیقات کا مفصل ذکر ہو طبع کیا جائے
لیکن بعد مین یہ راے قرار پائی کہ پہلے اصل عربی کتاب مع اردو مقدمے کے شائع
کی جائے اور بعد مین ترجمے کا انتظام کیا جائے تاکہ اصل کتاب بھی محفوظ رہ سکے
لیکن اسی زمانے مین اصل کتاب المناظر کی بھی جستجو رہی اور خدا کا شکر ہے کہ اس کا پتہ
لگ گیا ہے اور اس امر کی کوشش جاری ہے کہ اس کی نقل ہاتھ لگ جائے۔ قوی
امید ہے کہ اس مین کامیابی ہو جائیگی۔ نقل دستیاب ہونے کے بعد اصل کتاب
مع ایک مبسوط علمی مقدمے کے شائع کی جائے گی۔ یہ ایک نہایت مشکل اور ہمت شکن
کام ہے۔ اول اصل کتاب کا مطالعہ پھر اس زمانے کے علمی حالات و کمالات پر
کامل نظر اور اس کے بعد اس کتاب سے یورپ کے علم و حکمت و تحقیقات پر جو اثر
پڑا ہے اُن سب کے لیے کس قدر محنت کس قدر وسیع مطالعہ اور جانکاہی کی ضرورت
پڑے گی۔ اور ان تمام امور کے لیے کس قدر سامان فراہم کرنا پڑے گا لیکن انجمن
نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو وہ اس کام کو انجام دے کر رہیگی۔ اور انجمن کی یہ
خوش قسمتی ہے کہ اس نہایت دشوار اور عظیم الشان کام کو ہم مین سے ایک ایسے
صاحب بصیرت اور شیدائے علم نے اپنے ذمے لیا ہے کہ مطالعہ جس کا اوڑھنا بچھونا
اور علمی تحقیقات جس کا مقصد حیات ہے۔ یہ کام اگر انجام پا گیا تو یہ انجمن کا ایک
بڑا کارنامہ اور ایک وقیع علمی خدمت ہوگی۔ اس مین بہت وقت اور روپیہ
صرف ہوگا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ دولت آصفیہ اس مین انجمن کو فیاضانہ امداد دیگی۔
مین نہایت مسرت کے ساتھ یہ اطلاع بھی جناب کی خدمت مین دینا چاہتا ہون

کہ ہماری قوم کے سچے محسن اور ہندوستان کے سرمایۂ ناز فاضل مولانا سید کرامت حسین صاحب مدظلہ العالی سابق جج عدالت عالیہ الہ آباد نے ایک بے نظیر کتاب "المرأة" تحریر فرمائی ہے جو فرقۂ اناث کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا خزانہ یا انسائی کلوپیڈیا ہوگی۔ جنس لطیف کی دماغی اور اخلاقی خصوصیات، پیدائش سے لیکر آخری عمر تک اُس کے محسوسات اور اُن کی ارتقائی کیفیت اور پھر وہ اثر جو جسمانی ساخت کا اُس کے میلان طبعی پر ہوتا ہے اور اِس سے اُسکی تعلیم و تربیت مین جو مدد مل سکتی ہے غرض ان تمام علمی مسائل کو جس تحقیق و تبحر کے ساتھ جناب ممدوح الصدر نے مفصل و واضح کر کے لکھا ہے اُس کی مثال اردو عربی ایک طرف، شاید مغربی علم ادب مین بھی بہ مشکل نظر آئے گی۔ کیونکہ درحقیقت یہ کتاب عطر ہوگی بہت سی اُن مستند جدید تصانیف مغربی کا جن مین کمال محنت سے اِس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤن پر علیحدہ علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ اور اس مین شک نہین کہ ایسی جلیل المرتبت کتاب کا معاشرت پر بہت گہرا اثر پڑے گا اور خدا نے چاہا تو وہ ہمارے اصلاح تمدن کا ایک قوی وسیلہ ہوگی۔ دنیا کی خوشیون کا بہت بڑا حصہ رجال و نساء کے باہمی تعلقات پر مبنی ہے اور یقیناً عورتون کی فطرت سمجھنے مین جس قدر آسانیان فراہم ہون گی اُسی قدر یہ تعلقات بہتر بنائے جا سکین گے اور اصلاح قوم و ملک مین مدد و معاون ہون گے۔ یہ کتاب کم سے کم آٹھ سو صفحے کی ہوگی۔ کتاب تیار ہے صرف نظر ثانی باقی ہے۔ اگر مولانا کی طبیعت علیل نہ ہوتی تو اب تک مکمل ہو جاتی۔ مولانا کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھون نے یہ بیش بہا کتاب انجمن کو عنایت فرمائی ہے۔

بھی خواہانِ اردو کو اس امر کے سُننے سے کمال مسرت ہوگی کہ بعد کامل غور اور بحث کے سرکار نظام نے یہ تہیّہ کولیا ہے کہ اردو زبان کا ٹائپ جاری کیا جائے اور اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ نے اس کے لیے ایک معتد بہ رقم کی منظوری بھی عطا فرمائی ہے۔ اور ایک ایسے ٹائپ کا انتخاب کیا گیا ہے جو خوبصورت ہونے کے علاوہ نستعلیق سے اقرب ہے۔ اس مین اردو زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے ضروری ترمیم اور صلاح بھی کی گئی ہے۔ یہ ایک صریح علامت ترقی کی ہے اور کچھ عرصے کے بعد جب لوگ اس سے مانوس ہوجائین گے تو اردو زبان کو اس سے یقیناً فائدہ پہونچے گا۔ اس بارے مین جناب مسٹر حیدری۔ بی۔ اے۔ ہوم سکریٹری دولت آصفیہ نے جو سعی فرمائی ہے وہ ہر طرح قابل شکریہ ہے۔

یہ بھی انجمن کی خوش قسمتی ہے اور مین نہایت مسرّت کے ساتھ جناب کی خدمت مین یہ اطلاع دیتا ہون کہ مسٹر راس مسعود ناظم تعلیمات مملکت آصفیہ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان کی بعض اعلیٰ درجے کی کتابین انجمن کے لیے اردو مین ترجمہ کرین گے۔ صاحب موصوف فرنچ زبان کے ادیب ہین اور اس سے یقین ہے کہ اردو زبان مین قابل قدر اضافہ ہوگا۔

انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانون سے بعض مجالس و حضرات کو شکایت رہتی ہے لیکن انجمن اس بارے مین بھی خوش نصیب ہے۔ اطراف و جوانب ملک سے ان حضرات کے اکثر خطوط وصول ہوتے رہتے ہین کہ وہ انجمن کی خدمت کرنا چاہتے ہین اور انھین کوئی کتاب ترجمے کے لیے دی جائے۔ اس خیال سے مین نے ایک فہرست انگریزی، عربی، فارسی کی ایسی کتب کی تیار کی ہے جو اردو مین ترجمہ کے قابل ہین اور جن کا ترجمہ ملک کے لیے مفید خیال کیا جاسکتا ہے۔ یہ فہرست بعض ارباب بصیرت کی خدمت مین بغرض مشورہ و ترمیم و اصلاح

بھیجی گئی ہے۔ بعد تکمیل اسے طبع کرالیا جائیگا اور بعدازاں اس کی ایک ایک نقل اُن تمام اصحاب کی خدمت مین روانہ کی جائیگی۔ جو اس کام کے انجام دینے کی فرصت اور صلاحیت رکھتے ہین اور ترجمہ کا نمونہ طلب کرکے بعد پسندیدگی معاوضہ پر ترجمہ کرایا جائے گا۔

ارکان اعانت کی تعداد اس سال ۸۳ ہے۔ ان مین سے بھی بعض نیم بعض ربع ممبر اور بعض اس سے بھی کم ہین۔ اگرچہ گذشتہ سال سے تعداد مین کچھ اضافہ ہوا ہے تاہم انجمن کی آرزو کے مقابلے مین نہایت کم بلکہ کچھ بھی نہین جناب مفتی انوارالحق صاحب ایم اے ناظم تعلیمات ریاست بھوپال نے جنھین انجمن کے مقاصد سے بیحد ہمدردی ہے گذشتہ سال مجھے ایک طویل خط اس بارے مین لکھا تھا۔ ان کی مضبوط اور مستقل رائے ہے کہ "تمام ملک مین کم سے ایک ہزار ارکان انجمن کے ایسے ہونے چاہیین جو ایک روپیہ ماہانہ ادا کرین اور اس کے معاوضے مین انھین بارہ روپیہ قیمت کی کتابین دی جائین۔ ان کا احسان صرف اتنا ہوگا کہ وہ یہ رقم پیشگی ادا کرین۔ اگر کسی زبان کے ہزار پڑھنے والے بھی نہ ملین (اور خصوصاً ہندوستان جیسے وسیع ملک مین) تو وہ کوئی زبان نہین اور اس کے لیے سعی و جدوجہد کرنا محض عبث اور فضول ہے" اس سال جناب مفتی صاحب نے بکمال عنایت ایک گوشوارہ بناکر بھیجا۔ اس گوشوارے مین انھون نے تمام بڑے بڑے شہرون کے نام درج کیے ہین اور ہر شہر کے نام کے سامنے اس کی حیثیت کے موافق ارکان کی تعداد لکھی ہے۔ جناب مفتی صاحب نے اس تقسیم مین بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ لیکن جب اس گوشوارے مین میری نظر علی گڈھ پر پڑی تو معلوم ہوا کہ جناب موصوف نے اس شہر کے ساتھ بڑی فیاضی کا برتاؤ کیا ہے کیونکہ اس کے نام کے سامنے (۵۰) ارکان لکھے ہوئے ہین اور یہ بڑی سی بڑی تعداد ہے جو جناب مفتی صاحب نے ہندوستان کے بعض خاص شہرون کے حصے مین لکھی ہے۔ چنانچہ گوشوارہ مذکور مین سوائے

علی گڈھ کے سارے ملک مین صرف تین خوش نصیب شہر ایسے خیال کیے گئے ہین جن سے اس قدر ارکان کی توقع کی گئی ہے - یعنی لکھنؤ - حیدرآباد - اور بمبئی - لیکن جب مین ایک طرف اس گوشوارہ پر نظر ڈالتا ہون اور دوسری طرف اپنی موجودہ فہرست ارکان پر تو مجھے مفتی صاحب کی سادگی اور خوش عقیدگی پر ہنسی آتی ہے - شاید مفتی صاحب نے یہ خیال کیا ہوگا کہ چونکہ علی گڈھ تمام ہندوستان کے مسلمانون کا تعلیمی مرکز اور روشن خیالی کا سرچشمہ ہے اس لیے وہان ارکان اعانت کی تعداد لکھنؤ حیدرآباد اور بمبئی کے برابر ہونی چاہیے - لیکن شاید انھین یہ معلوم نہین کہ علی گڈھ شریف مین سواے مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کے کوئی فرد واحد بھی اس انجمن کا رکن اعانت نہین ہے - غالبًا اس اطلاع کے بعد جناب مفتی صاحب کو اپنے گوشوارہ پر نظر ثانی کی ضرورت واقع ہوگی -

اسی سلسلے مین میرے عزیز دوست مولوی محمد معشوق حسین خان صاحب بی - اے نے بکمال عنایت بڑی محنت کے ساتھ ہندوستان کے تمام صوبون کی ضلعواری فہرست تیار کی اور اس مین انھون نے ان تمام اشخاص کے نام درج کیے جن کی نسبت انھین ذرا سا بھی گمان انجمن کے رکن ہونے کا ہوسکتا تھا - یہ فہرستین بڑے کام کی ہین اور ان سے بہت بڑی مدد ملیگی - لیکن سب سے مشکل اور فیصلہ طلب معاملہ یہ ہے کہ کثرت سے ارکان اعانت بنانے کے لیے کون سے ذرائع و وسائل اختیار کیے جائین - یہ مسئلہ بھی انجمن کی مجلس شورا مین پیش ہوا تھا - بعد کامل غور اور بحث کے یہ طے پایا کہ رکن اعانت کا سالانہ چندہ بجاے بارہ روپیہ کے چھ روپیہ کردیا جاے اور ان کو دوران کلیت مین انجمن کی مطبوعات نصف قیمت پردی جائین - اس تغیر کا منشا یہ ہے کہ لوگ کثرت سے اس کے ارکان ہوسکین اور انجمن کے مقاصد اور مطبوعات کی اشاعت آسانی سے ہوسکے مجھے امید ہے کہ اس سہولت کی وجہ سے

آیندہ سال انجمن کے ارکان مین معتدبہ اضافہ ہوجائے گا اور موجودہ شکایت باقی نہ رہیگی۔

آخر مین مین اُن تمام بہی خواہان و معاونین انجمن کا شکریہ ادا کرتا ہون جنھون نے اپنی رایون اور مشورون، مالی اعانت اور علمی امداد سے انجمن پر احسان فرمایا ہے۔ مین حیران ہون کہ ان تمام اصحاب کا شکریہ کیونکر ادر کن الفاظ مین ادا کرون۔ لیکن مین خصوصیت کے ساتھ اُن چند بزرگون کا ذکر کیے بغیر نہین رہ سکتا جن کی حقیقی توجہ اور دلی ہمدردی سے انجمن کو بے انتہا فائدہ پہونچا ہے۔ خاصکر انجمن جناب مسٹر محمد اکبر حیدری۔ بی۔ اے۔ ہوم سکریٹری دولت آصفیہ کی غایت درجہ ممنون ہے کہ انھون نے باوجود کثرت مشاغل اور عدم فرصت کے ہر موقع و محل پر انجمن کی تائید کی۔ جناب موصوف کو علمی و تعلیمی معاملات سے خاص دلچسپی ہے۔ حیدرآباد دکن اور جنوبی ہند کے مسلمانون کی تعلیمی ترقی مین جو بے نظیر کام آپ نے کیا ہے اس کے اعلےٰ نتائج عنقریب ظہور مین آئین گے۔ یہ آپ کی حسن توجہ اور مسلسل سعی و تحریک کا نتیجہ ہے کہ انجمن کی مالی حالت اس درجہ قابل اطمینان نظر آتی ہے۔ انجمن صاحبزادہ میجر حاجی حمید اللہ خان بہادر۔ بی۔ اے کی بھی بہت ممنون ہے کہ علاوہ اس مستقل رقمی امداد کے جو وہ انجمن کو عطا فرماتے ہین، صاحبزادہ صاحب نے انجمن کی بہبودی و ترقی کے لیے مختلف طریقون سے کوشش فرمائی اور اُس کے علمی کامون مین بھی حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے جو خاص طور پر قابل شکر گزاری ہے۔ مولانا محمد عبد الحلیم صاحب شرر کسی تعریف و توصیف کے محتاج نہین ہین۔ اُن کی تمام عمر ملک کی علمی خدمت کرتے گذری ہے۔ وہ چند سال سے بالکل گوشہ نشین ہین، کہین آتے جاتے نہین اور نہ آج کل کی انجمنون اور مجلسون مین کوئی حصہ لیتے ہین۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کے علمی مشاغل اس کثرت سے ہین کہ انھین اسکی فرصت بھی نہین لیکن باوجود اس کے وہ ہمیشہ انجمن کو اپنی مفید اور پختہ رایون سے مدد دیتے

رہتے ہین - اور یہی نہین بلکہ انھون نے حال مین خاص انجمن کی خاطر اپنے آشرم سے باہر نکل کر علمی کامون مین بھی سرگرمی سے حصہ لیا - انجمن مولانائے ممدوح کے اس ایثار و ہمدردی کی بدرجۂ کمال ممنون احسان ہے -

جس سچی ہمدردی دلی توجہ اور کمال غور و فکر کے ساتھ جناب ڈاکٹر عبد الرحمن صاحب بجنوری بی - اے - ال ال ڈی بیرسٹرایٹ لا مشیر تعلیم ریاست بھوپال نے انجمن کے مختلف مسائل پر نظر ڈالی ہے اور اسے علمی مشورے دیے ہین اس کا شکریہ ادا کرنے سے مین بالکل قاصر ہون - ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے علم و فضل اصابت راے سلامت طبع اور ذوق سلیم کے لحاظ سے مسلمانون مین بے نظیر شخص ہین - انجمن کو ان عالمانہ مشورون سے بے انتہا فائدہ پہونچا ہے اور اس سے زیادہ فوائد کی آیندہ توقع ہے - ایسے ہی لوگ ہین جو علمی کامون کی حقیقی رہنمائی کر سکتے ہین - اور اس قسم کی علمی و ادبی انجمنون کو کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہین - مگر افسوس کہ ہم مین ایسے کتنے ہین ! - مین جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر کا ممنون ہون کہ انھون نے انجمن کے حال پر خاص التفات فرمائی اور اپنی تصنیف "خلافت اندلس" کی دو سو جلدین انجمن کو مرحمت فرمائین - نواب صاحب ممدوح کا یہ عطیہ خاص طور پر قابل شکرگذاری ہے - مین جناب مفتی انوار الحق صاحب - ایم - اے ناظم تعلیمات ریاست بھوپال کا بھی شکرگذار ہون کہ انھون نے کمال ہمدردی انجمن کے عملی و علمی کامون مین بہت ہی قابل قدر اعانت فرمائی اور علاوہ اس کے اپنی تصنیف کی بہت سی جلدین بھی انجمن کو مرحمت فرمائین -

انجمن کے مہربانون اور اس کے قدر شناسون کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اگر مین نام بنام ان کا ذکر کرنے لگون تو ایک افسانہ ہو جائیگا لیکن ذیل مین چند ایسے ہمدردون کا نام گنتا ہون جنکی ہمدردی کچھ خاص سال یا کسی خاص موسم تک محدود نہین بلکہ وہ ہمیشہ انجمن کی اعانت کے لیے مستعد رہے

ہین۔انمین سے بعض ایسے ہین جن سے علمی مشورون اور کامون مین مدد ملتی ہے۔اور بعض ایسے ہین جو انجمن کے لیے ارکان مین اضافہ کرنے اور عطیے دلوانے مین ساعی رہتے ہین۔اور بعض ایسے ہین جو انجمن کی ہر قسم کی اعانت کے لیے تیار ہین ؎

۱ - جناب مولوی ظفر الملک علوی اڈیٹر الناظر لکھنؤ

۲ - جناب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔

۳ - جناب مولوی معشوق حسین خان صاحب۔بی۔اے (حیدر آباد دکن)

۴ - جناب مرزا محمد بیگ صاحب افسر تصفیۂ اراضی عثمان ساگر (حیدر آباد دکن)

۵ - جناب مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ (بھوپال)

۶ - جناب خان محمد الف خان صاحب ناغر مہتمم صدر مجلس اورنگ آباد

۷ - جناب مولوی عبد السلام صاحب (حیدر آباد دکن)

انجمن اُن اخبارات کی بھی ممنون ہے جنھون نے انجمن کے اعلانات شایع کیے یا جنھون نے ازراہ ہمدردی اسکی کارروائیون کو قابل توجہ سمجھا خصوصًا صداقت خاص طور پر قابل شکریہ ہے جس نے انجمن کی حمایت مین نہایت پرزور مضامین لکھے اور اس کے مقاصد کی اشاعت مین بہت بڑی مدد دی۔علاوہ اس کے وکیل امرتسر، مساوات الہ آباد، نیر اعظم مراد آباد، الناظر لکھنؤ، دلگداز لکھنؤ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہین کہ اُنکے اڈیٹرون اور مالکون نے اپنے رسالے اور اخبار بھی انجمن کو بھیجے۔ہمدم لکھنؤ اگرچہ جدید اخبار ہے مگر اس نے ابتدا ہی سے انجمن پر نظر التفات رکھی۔مین حیدر آباد کے رسالہ افادہ کے لایق اڈیٹر کا بھی ممنون ہون کہ انھون نے اپنے قابل قدر رسالے کے ذریعے ہمیشہ اپنی زبان کی حمایت کی اور انجمن کی اعانت فرمائی۔اسی طرح حیدر آباد کا روزانہ صحیفہ بھی قابل شکریہ ہے۔کہ اس نے اُردو زبان اور انجمن کی حمایت و تائید مین ہمیشہ سعی کی۔

انجمن جناب آنریری سکریٹری صاحب و جناب جائنٹ آنریری سکریٹری صاحب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی ممنون ہے جنھون نے اس کی ترقیون پر ہمیشہ اظہار مسرت فرمایا اور اس کے کامون کو وقعت و استحسان کی نظر سے دیکھا۔

مشہور مصنفین لکھنؤ

امیر مینائی مرحوم

صنم خانۂ عشق
مراۃ الغیب
خیابان آفرینش
خطوط

مولانا شرر

جنید بغدادی
ابوبکر شبلی
خواجہ معین الدین
عصر قدیم
حروب صلیبیہ
تاریخ بغداد
تاریخ سندھ
ملکۂ زنوبیہ
الحکم الرفاعیہ
آغا صاحب
سکینہ بنت حسین
مخدرات
زوال بغداد
غیب داں دلہن
حسن بن صباح
افسانۂ قیس
مقدس نازنین
قیس و لبنیٰ
ایام عرب
حسن انجلینا
منصور موہنا

دلکش
میوۂ تلخ
ماہ ملک
شوقین ملکہ
ملک العزیز ورجنا
رویتہ الکبریٰ
فلورا فلورنڈا
فتح اندلس
یوسف و نجمہ
آغا صادق کی شادی
بدر النساء کی مصیبت
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
خوفناک محبت
الفانسو
فلپانا
فاتح مفتوح
ہندوستان کی موسیقی
سرسید کی دینی کتابیں

مرزا رسوا

امراؤ جان ادا
لیلےٰ مجنوں

شوق قدوائی

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ
عالم خیال
سیکنڈن ولسن

سرشار

مشو
بچھڑی دلہن
کڑم دھم
بی کا ن
طوفان بے تمیزی
کامنی
جام سرشار
سیر کہسار
خدائی فوجدار
فسانۂ آزاد

جلال مرحوم

شیوۂ نادلکش
نظم نگاریں
افادۂ تاریخ
رسالہ تذکیر و تانیث
سرمایۂ زبان اردو

منشی نثار علی برق

مرزا لنی
ماہ رتین
بنگالی دلہن
پرتاب
معشوقۂ فرنگ
بیوگ
نسخۂ تسلیم
روہنی

منشی احمد علی مرحوم

تاریخ تمدن
حرمان نصیب
شباب لکھنؤ
مرقع اردو

مسٹر عبد الماجد

فلسفۂ جذبات
فلسفۂ اجتماع
غذائے انسانی
فلسفہ کی تعلیم

منشی محمد لطیف مرحوم

اکبر
اورنگ زیب

احسن گرامی

خون آرزو
معشوقۂ عرب
محبوس گذشت
پاک گریباں
زخم جگر

احمد علی کامل

سادھارانی
پاربتی
کلثوم
ادر وصال

معاشرت
واقعات انیس
یادداشت عمل
باجرہ کی کامیابی
راما من کے سین
خیالات آلیان
حاکم و محکوم

مطبوعات الناظر پریس

قواعد اردو
کلیات محسن
محاربات صلیبی
رموز فطرت
ازدواج الانبیا
تسخیر فرانس
واقعات کربلا
الاحسان
سیلاب ابن جوزی نمبر
حیات نظامی
ہندوستانی تاریخی کہانیاں
دکن کی تاریخی کہانیاں
طریق سعادت حصہ اول
حصہ دوم
جمیل منظر
سیکنڈن ولسن
اتفاقات زمانہ
شوکیہ
عطر انتخاب

مسٹر محمد علی کا خط راجہ صاحب محمود آباد کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھندواڑہ ۱۳، مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

مخدومی راجہ صاحب۔ السلام علیکم۔ میں نے ابتداءً آنجناب کی خدمت میں چند عریضے متعلق اپنے حالات پر ارسال خدمت کیے تھے مگر جواب نہ آنے سے قیاس کیا کہ غالباً یہ خاموشی کسی مصلحت پر مبنی ہے (گو خود اُس مصلحت کو سمجھنے سے میں قاصر تھا اور اب تک قاصر ہوں) اور یہی مناسب معلوم ہوا کہ آنجناب کو آئندہ تکلیف نہ دی جائے۔ مگر جس امر نے آج مجھے مجبور کیا ہے کہ میں ایک عریضہ خدمت عالی میں ارسال کروں اُس کو میری ذاتی منفعت و زیان سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ محض اُس قوم کے سود و بہبود سے متعلق ہے جسکے آپ سردار و رہنما رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ اسلیے امید ہے کہ جواب سے سرفراز فرمائیے گا۔

مجوزہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے جو تعلقِ خاطر ایک مدتِ دراز سے مجھے بھی ہے اُسکا اس موقع پر اظہار کرنا غیر ضروری ہے، اس لیے کہ آنجناب اُس سے بخوبی واقف ہیں۔ مگر جس چیز کا میں اس وقت اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ وہ ہم آہنگی و ہم عملی ہے جو آنجناب کے اور میرے درمیان اس تحریک کے متعلق قائم تھی۔ جس کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے آپ صدر تھے اُس میں جو حصہ میں نے لیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اور دراصل جس خوبی و خوش اسلوبی سے آنجناب نے اپنے فرائض بحیثیت صدر انجام دیے اُس نے سب سے اول مجھے آپ کا گرویدہ بنایا تھا۔ کمیٹی کے اجلاس اولیں منعقدہ ۱۵ و ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء سے لیکر ابتدائے ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء تک جتنے اجلاس ہوئے اور جو کچھ مزید کارروائی آنجناب اور آنجناب کے چند شرکائے کی اُس سے مجھے برابر اتفاق رہا اور اسکا اعتراف علاوہ دیگر مواقع کے میں کامریڈ میں بھی کرتا رہا۔ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء میں جب ہم سب شملہ گئے تھے اور ایک مسئلہ جو اس سے قبل طے شدہ سمجھا جاتا رہا تھا (چانسلر کے اختیارات متعلق منظوری تقرر پروفیسران) از سرِ نو معرضِ بحث میں آیا تو البتہ مجھے اختلاف کرنا پڑا

اور غالباً یہ امر کسی قدر آنجناب کو ناگوار بھی ہوا تھا کیونکہ سید وزیر حسن صاحب اور آپ کے نیجر صاحب کے اصرار سے مترشح ہوتا تھا کہ آپ اس مسئلہ کے متعلق غالباً کوئی اظہار رائے ممبر صاحب تعلیمات کے سامنے کر چکے تھے اور شاید یہ بھی بیان فرما چکے تھے کہ ممبرانِ کمیٹی کے لیے اس معاملہ میں رائے تبدیل کرنا چنداں دشوار نہ ہوگا۔ اُس وقت میرے ہمخیال صرف مرحوم نواب وقار الملک بہادر، مرحوم عزیز مرزا صاحب، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور نبی اللہ صاحب تھے اور باقیماندہ ممبران موجودہ شملہ اپنی رائے اُس وقت تبدیل کر چکے تھے۔ ۲۲ ستمبر کو کمیٹی کا ڈیپوٹیشن ممبر صاحب تعلیمات و سکرٹری تعلیمات سے ملا اور باہم گفتگو و بحث ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں ایک ورمسئلہ اہم اُن امور کے آخری فیصلہ کے متعلق خلافِ توقع نکل آیا جس میں چانسلر و کورٹ کے درمیان اختلافِ رائے واقع ہو سکے۔ ان تمام امور میں جیسا کہ آپ کو علم ہے مَیں کثرتِ رائے اور نیز آنجناب کا ہمخیال نہ تھا۔ مگر، خواہ اسکو کمزوری کہا جائے، خواہ اتباعِ سردارانِ قوم، میں نے بھی آخر میں یہ قبول کر لیا کہ مسئلۂ مؤخر الذکر تو حسب خواہش ممبر صاحب تعلیمات اُسی وقت طے ہو جائے اور منظوریِ چانسلر قبل تقرریِ پروفیسران کے معاملہ میں کم سے کم ایک بار ہماری جانب سے گورنمنٹ عالیہ کی خدمت میں اظہارِ خیال کر دیا جائے۔ گو ممبر صاحب تعلیمات نے گورنمنٹ عالیہ کی جانب سے اس امر میں بھی کوئی اُمید نہیں دلائی۔

اسکے بعد متعدد اجلاس کمیٹی کے لکھنؤ میں منعقد ہوئے اور آنجناب کو معلوم ہے کہ اُن اجلاسوں میں سے ہر ایک میں مَیں آپ کے ساتھ ہم آہنگی و ہم عملی کا برابر ثبوت دیتا رہا اور اب بھی کامریڈ کی فائلیں اسکی شاہد ہیں۔ آخر کار گورنمنٹ عالیہ کی جانب سے جولائی سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ کیونکے شائع ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو ایک سخت ہیجان میں ڈال دیا۔ کیونکہ اُن سے معلوم ہوا کہ وہ بنیادی اصول جن پر مجوزہ یونیورسٹی کا انحصار تھا اور جن کے متعلق گورنمنٹ عالیہ سے کافی سمجھوتہ ہو چکا تھا اُن سے صاحب وزیرِ ہند کو اختلاف ہے اور اختلاف بھی اس قدر شدید کہ آخری فیصلہ بلا ساعتِ مدعی سنا دیا گیا۔ حسب الطلب آنجناب کے میں بھی کلکتہ سے باوجود

سخت علالت کے ۱۰ راگست ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ حاضر ہوا - آنجناب نے سید وزیر حسن صاحب کو شام کے وقت میرے پاس ہوٹل میں جہاں میں ٹھیرا تھا بھیجا اور اُنہیں کے ہمراہ میں کلکتہ سے آتے ہی حاضرِ خدمتِ عالی ہوا - راستہ میں سید صاحب موصوف نے مجھ سے مشورہ طلب فرمایا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے - ظاہر ہے کہ جس قسم کی یونیورسٹی گورنمنٹ عالیہ سے ہم مانگتے تھے اور جو بعض اہم ترمیموں کے بعد گورنمنٹ عالیہ ہم کو دینے پر راضی ہوگئی تھی اُسکے دینے سے صاحب وزیرِ ہند کو قطعی انکار ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہند نہ اُس قسم کی یونیورسٹی لینے پر راضی ہوں گے جیسی کہ صاحب وزیرِ ہند دینا چاہتے ہیں اور نہ درا‌صل وہ لے سکتے ہیں - اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ صاحب وزیرِ ہند کا آخری فیصلہ مسلمانوں کے نزدیک ہرگز آخری فیصلہ نہیں ہو سکتا - مگر حالت یہ ہے کہ ہز ہائنس سر آغا خاں ہندوستان میں موجود نہیں ہیں اور اجلاس متعینہ ۱۱ و ۱۲ راگست ۱۹۱۲ء کی کارروائی کی تمام ذمہ داری صاحب وزیرِ ہند اور غالباً آخر میں خود سر آغا خاں بھی آنجناب کے سر ڈال دیں گے کیونکہ آنجناب آغا خاں صاحب کے دست و بازو تھے اور بالخصوص کانسٹیٹیوشن کمیٹی کے صدر تھے - سید وزیر حسن صاحب کی رائے تھی کہ اجلاس متعینہ ۱۱ و ۱۲ راگست کو ملتوی کر دیا جائے تا آنکہ آغا خاں صاحب بھی چند ماہ بعد ہندوستان واپس آئیں - میں نے اس رائے سے سخت اختلاف کیا مگر جب سید صاحب موصوف نے مجھ سے کہا کہ پھر تمہیں کوئی تدبیر بتاؤ کہ یہ سارا بوجھ آنجناب پر نہ پڑے تو میں نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد رائے دی کہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اُن تمام معاملات پر جو صاحب وزیرِ ہند از سرِ نو معرضِ بحث میں لے آئے تھے محض اپنی رائے کا اظہار کر دے اور کہدے کہ اُسکا کام صرف ایک مناسب ترین آئین و دستور العمل مرتب کرنا تھا - خاص شرائط کو قبول کرنا یا نہ کرنا، اور یونیورسٹی لینا یا نہ لینا، یا اُسکے لینے کو ایک وقت خاص تک ملتوی کرنا، یہ کام ساری قوم کا ہے نہ کہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا، اور اس کا فیصلہ صرف فاونڈیشن کمیٹی ہی کر سکتی ہے - اس طرح ہم کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی رائے

کا اظہار بھی کر سکینگے اور نیز مسلمانوں کی نیابت کے فرض کو ایک حد خاص تک ادا کر سکیں گے اور ساتھ ہی ساتھ آنجناب کو اُس اہم ذمہ داری کے بارے سے بھی سبکدوش کر سکیں گے جسکے متعلق سید وزیر حسن صاحب کو اس قدر اندیشہ تھا۔

آپ کو یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ آخر کار یہی فیصلہ کیا گیا اور ۱۱ راگست ۱۹۱۲ء کے اجلاس نے مجھے مجاز کیا کہ ممبر صاحب تعلیمات کے مراسلہ مورخہ ۹ راگست کے جواب کا مسودہ تیار کر کے ۱۲ راگست کو دوسرے اجلاس میں پیش کروں۔ چنانچہ میں نے متذکرۂ بالا مصلحتوں کو مد نظر رکھکر ایک مسودہ تیار کیا جسے اجلاس نے منظور فرمایا۔ اور جو ۱۲ راگست کو آنجناب کے دستخط سے ممبر صاحب تعلیمات کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔

جس وقت یہ کارروائی کی گئی تھی اُس وقت سوائے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے (جو پہلے روز کے اجلاس میں شریک نہ تھے اور دوسرے روز کے اجلاس میں امور فیصل شدہ پر از سر نو بحث کرنا چاہتے تھے) کسی ممبر کمیٹی کو اُن اُمور میں کمیٹی کے فیصلہ سے اختلاف نہ تھا۔ جن پر آنجناب کا دستخط کردہ مراسلہ مورخہ ۱۲ راگست بنام ممبر صاحب تعلیمات مشتمل تھا اور ہمارا یہ خیال تھا کہ آئندہ موسم سرما کی ابتدا سے قبل ہی فونڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ ہو جائیگا جسمیں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی رایوں کی کافی تائید ہو جائے گی اور اس طرح اُس فیصلہ کی ذمہ داری جو آپ نے اور ہم سب نے ۱۱ رو ۱۲ راگست ۱۹۱۲ء کو مسلمانوں کی عام رائے کی مطابقت میں اور اُنکی سود و بہبود کی غرض سے کیا تھا تمام قوم پر بٹ جائے گی۔ اور نیز وہ فیصلہ بھی مستحکم ہو جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ تعویق کا وہ سلسلہ جو اب تک جاری ہے شروع ہو گیا اور اواخرِ دسمبر میں جب ایک جلسہ کے لیے لوگوں کو مدعو کیا بھی گیا تو ایک غلط طریقہ پر یعنی بلا کسی اختیار با قاعدہ کے ہر ضلع سے چندہی لوگوں کو نائب تسلیم کرنے کا ارادہ کیا گیا اور آخر میں جب تمام ممبران فونڈیشن کمیٹی کو اذن دیا گیا تو وقت اس قدر ناکافی تھا کہ وہی لوگ اس اذن عام سے مستفید ہو سکتے تھے جو لکھنؤ میں موجود تھے۔

اس عرصہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چند مضامین سرسید کی "محبوب" یونیورسٹی کے متعلق شایع کراکے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے فیصلوں کی تکذیب کرنا شروع کی اور "متین الدین" اور "جوش محمد" کے فرضی مکالمے کے شایع کرنے سے اس تکذیب کی کوشش کی مزید تائید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن لوگوں کو جو مسلمانوں کی عام رائے کی مخالفت کرنا مناسب خیال کرتے ایک موقع ہاتھ آگیا کہ کہ سکیں کہ خود مسلمانوں میں اس بارے میں سخت اختلاف ہے اور گو کبھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے علانیہ یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ بیرونی کالجوں اور اسکولوں کا الحاق مسلم یونیورسٹی کے لیے غیر مفید و نامناسب ہوگا (جیسا کہ سر تھیوڈور مارلین اور سید راس مسعود صاحب نے علانیہ اور باصرار تمام ظاہر کیا) تاہم اُنھوں نے اس مطالبہ اور نیز دیگر مطالبوں سے دستکشی کی اتنی مصلحتیں بیان کیں کہ مخالفین کو اُنکی تحریروں اور تقریروں سے پوری تائیدو امداد حاصل ہوگئی اور اُس وقت مسلمانوں کے لیے کامیابی محال ہوگئی۔ اس خیال سے کہ یہ موقعہ مخالفین کو نہ ملے میں نے دسمبر ۱۹۱۲ء کے پہلے اجلاس کے بعد اس تک کو گوارا کیا کہ فونڈیشن کمیٹی کے ہاتھ سے یونیورسٹی لینے نہ لینے کا فیصلہ نکال لیا جائے اور ایک ایسے محدود ڈیپوٹیشن کو اس کا اختیار دے دیا جائے جس کے ممبروں سے مجھے کامل امید تھی کہ وہ جمہور مسلمانان کی نیابت اچھی طرح کر سکیں گے۔ اور وہی فیصلہ کثرت رائے سے کریں گے جو اُن حالات میں خود فونڈیشن کمیٹی کرتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جس وقت دوسرا اجلاس لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۱۲ء کو کانفرنس کے پہلے اجلاس کے بعد منعقد ہوا تو کسی بزرگ نے ہمت نہ کی کہ جمہور مسلمانان کے سامنے اس سمجھوتے کو پیش کرکے اُنکی رضامندی حاصل کرے اور آخر تک آپ سب نے مجھی کو حکم دیا کہ اس کو جلسہ میں پیش کرو اور مسلمانوں کی منظوری حاصل کرو۔ میں بوثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ میری مختصر پبلک زندگی میں گو بہت سے اہم واقعات پیش آئے مگر میری ذات کے لیے اس واقعہ سے زیادہ اہم کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ میں نے بظاہر اپنے کھلے ہوے اور دیرینہ اصولوں کے سراسر خلاف ایک جمہوری حق کو ایک محدود جماعت کے سپرد کرنے کی تجویز جمہور کے سامنے

پیش کی، اور گو اُس وقت حاضرین جلسہ نے میری استدعا کی شرم رکھ لی، مگر آخر کار مجھے مخالفت شدید کا سامنا کرنا پڑا اور چند واقعات ایسے پیش آئے کہ خود اُن حضرات کو جن کی مخالفت کو ہٹانے کی غرض سے مجھے اُنکے ساتھ متذکرۂ بالا سمجھوتہ کرنا پڑا تھا مارچ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک فونڈیشن کمیٹی کو پھر نہ مدعو کیا جائے اور کُل معاملات کو اُسکے سامنے پیش نہ کیا جائے کوئی کارروائی جائز طریقہ پر نہیں ہو سکے گی۔ میں ان واقعات کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یقیناً یہ خود آپ کو مجھ سے زیادہ اچھی طرح یاد ہونگے بہر کیف یہ تو ظاہر ہے کہ دسمبر ۱۹۱۲ء کے سمجھوتے کی وجہ سے آپ سے کچھ زیادہ ہی مجھپر بھی الزامات لگائے گئے۔ اور مجھے باوجود جمہور پسند اور حامیِ جمہور ہونے کے جمہور سے بہت کچھ سننا پڑا۔

۲۶ و ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کو فونڈیشن کمیٹی کے پہلے باقاعدہ اجلاس علیگڈھ میں منعقد ہوئے اور اس وقت ہر شخص کو موقعہ حاصل تھا کہ اپنی رائے جمہور پر اثر ڈالکر اُن سے منوا تا۔ یہ موقعہ بالخصوص مستبدین علیگڈھ کو حاصل تھا اور اُنھوں نے اس سے ہر جائز و ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ وہ حضرات بھی جو زور ڈالوا کر علیگڈھ کے ضلع سے فراہم کیے گئے تھے جلسہ میں آکر حق سے مرعوب متاثر ہو گئے اور فیصلہ وہی ہوا جس کی جمہور مسلمانان سے توقع تھی۔ کاش اس فیصلہ پر عمل بھی کیا جاتا اور اس تمام قضیۂ نامرضیہ کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا۔ مگر افسوس کہ اپریل ۱۹۱۵ء تک مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن بھی مرتب و مجتمع نہ ہو سکی اور وہی تساہل آج تک جاری ہے۔ اُس وقت سے آج تک دو سال گذر چکے ہیں مگر باوجود جون و جولائی ۱۹۱۵ء کی شورا شوری کے اگست ۱۹۱۵ء سے وہ بے نکمی ظاہر ہوتی رہی ہے کہ نہ ایسوسی ایشن کے قواعد کا مسودہ ایسوسی ایشن کے سامنے پیش ہو کر پاس ہوا نہ جو اسکیمیں سرمائہ یونیورسٹی کے بہترین مصرفوں کے متعلق چند اصحاب نے تیار کی تھیں اُنھیں کا کچھ حشر ہوا۔ ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم نے البتہ ۲۶ ہزار روپیہ منظور کردہ جلسۂ اپریل ۱۹۱۵ء کو (جو محض سکرٹری صاحب کی ضد پر بلا کسی محاسبہ کے بطور دفع الوقتی کے منظور کر دیا گیا تھا) بہ تعجیل تمام لے لیا

اور اسکے بعد سے آج تک ہر سال بلا کسی جلسہ کے انعقاد کے محض سکرٹری صاحب کی گشتی چٹھی پر جس کا دار ومدار انکا موشتی نیم رضا کا مشتبہ گر نہایت کارآمد اصول ہے - ۲۶ ہزار خزانہ ٹرسٹیان میں منتقل ہوتا رہتا ہے - اسلامی اسٹاف کی تیاری کے متعلق جو تجویز اسیوشی ایشن نے منظور کی تھی نہ خود اسیوسی ایشن کی طرف سے اُس پر عمل کیا گیا نہ ٹرسٹیوں ہی سے اُسکی تائید کرائی گئی۔

اگست ۱۹۱۵ء میں آنجناب نے چند اصحاب کو شملہ پر مدعو فرمایا اور اس امر کی کوشش کی کہ مسلمان ایک ایسی یونیورسٹی کو جو ہندو یونیورسٹی کے اصولوں پر مبنی ہو قبول کریں - اگر اس موقعہ پر بھی میں اس خیال کو چھپاؤں کہ مجھے تعجب و نیز تاسف ہوا کہ اس مشورہ میں آنجناب نے نہ مجھے شریک فرمایا نہ شوکت علی صاحب کو جن کی کوشش فراہمیِ سرمایہ میں آپ پر عوام سے بھی زیادہ روشن تھی تو ویسا ہی بیکار ہوگا جیسا کہ اصول دیانت وصفا پسندی کے خلاف ہوگا - بہرحال اُس وقت آنجناب کی کوشش باوجود اکتوبر ۱۹۱۵ء کی بیقاعدگیوں کے اُتنی با اثر ثابت نہ ہوئی جتنی کہ توقع کی جاتی تھی - ۱۰ / اپریل ۱۹۱۶ء کے لیے فونڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ پھر تجویز کیا گیا اور میں مشکور ہوں کہ کم ازکم اس موقعہ پر آنجناب نے مجھے فراموش نہیں فرمایا - گر کیا بیجا ہوگا اگر میں عرض کروں کہ اصل مدعا شورٰی نہ تھا بلکہ مجھے اپنی رائے سے متاثر کرنا مقصود تھا - میرے دیرینہ دوست سید سجاد حیدر صاحب یہاں آئے اور اُن سے یونیورسٹی کے مسئلہ پر دیر تک بحث رہی - اُن کے بعد میرے ایک دوسرے عنایت فرما احسان الرحمٰن صاحب بھی آئے اور علاوہ اُن شفقت ناموں کے جو اس سے بیشتر موصول ہو چکے تھے ایک اور پیغام میرے مرشد مولنا عبدالباری صاحب کا زبانی لائے۔ اُن سے بھی میں نے بہت کچھ گفتگو کی اور اپنی رائے کا اظہار کرکے عرض کر دیا کہ باوجود اسکے اگر میرے مرشد کا ارشاد ہوگا کہ اس کے خلاف کرو تو گو شراب کو پھر بھی حرام سمجھوں گا مگر اسپر عمل کرونگا کہ

بے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید

اس کے علاوہ ایک نہایت مفصل تحریر میں نے اُسی وقت باوجود اپنی سخت علالت کے (جس کا باعث ایک حد تک یونیورسٹی کے متعلق تفکرات و ترددات بھی تھے) تیار کرکے سنسر کی اجازت سے احسان الرحمٰن صاحب کی معرفت آنجناب کی خدمت میں ارسال کردی۔ چونکہ اُس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا بلکہ رسید تک سے میں مشرف نہیں کیا گیا اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ یہ طول امل بیکار رہا یا اس کا کچھ اثر آنجناب پر بھی ہوا۔ البتہ یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کو مسلمان اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ضرور اُن امور پر راضی ہوگئے جن کے خلاف وہ اور میں اُس وقت تک دونوں تھے۔

جو رزولیوشن شوکت علی صاحب اور میرے متعلق پاس کیا گیا وہ غیر ضروری تھا بلکہ ایک حد تک تکلیف دہ بھی ثابت ہوا اور میں نے اس کا اظہار اپنے مرشد پر غالب کا ایک شعر لکھ کر کر بھی دیا تھا کہ ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی یارب اُسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی

غالباً آپ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کے جلسہ کے فیصلوں پر میں ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔ اور گو شوکت علی صاحب نے بار بار اُن کو دفع الوقتی پر محمول کرکے مجھے بھی اس کا قائل کرنا چاہا گر میں فکر و اندیشہ کا اُسی طرح شکار رہا۔ کاش واقعات ما بعد مجھے اس بے اطمینانی پر نادم کرتے۔ مگر حالتِ موجودہ شاہد ہے کہ ہمارے مخالفین پر ہماری آزادی اصول میں جس طرح گراں تھی اُسی طرح فروع میں بھی گراں تھی اور باتباع اُنکے ارباب حل و عقد علیگڈھ نے بھی کچھ کوشش نہ کی کہ فونڈیشن کمیٹی نے جن فروعی امور میں آزادی کو برقرار رکھنا چاہا تھا اُسے محفوظ کیا جائے۔ ایک سال ضایع کرنے کے بعد باوجود اس امر کے کہ ایک عالمگیر جنگ جس نے سرکار عالیہ کی فرصت اور ہماری آزادی کو سلب کر دیا ہے ابتک جاری ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کی طرف مائل ہے اور اُس کا قرب ہندوستان میں بھی محسوس ہونے لگا ہے آج فونڈیشن کمیٹی کو پھر مدعو کیا جا رہا ہے اور عام خیال ہے

کہ اب فروعی آزادی کو بھی خیر باد کہنے کا عزم بالجزم ہے اور قوم کے دیرینہ خواب کی اس طرح تعبیر کی جائے گی کہ جس طرح کی یونیورسٹی ایک دوسری قوم نے بظاہر اپنی قومی ضروریات و خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھکر لینا قبول کی ہے اسی طرح کی یونیورسٹی ہم بھی علانیہ خلاف اپنی قومی ضروریات خصوصیات کے قبول کرلیں - کہاں ۱۱، و ۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء کے مطالبے اور دعوے تھے اور کہاں آج کی ہمتیں اور ارادے ہیں - افسوس تو اس کا ہے کہ باوجودیکہ سنا جاتا ہے کہ آپ اسپرمُصر ہیں اور ارباب حل وعقد علیگڈھ سے زیادہ اس فیصلہ کے لیے کوشاں ہیں خود آپ کو ارباب حل وعقد علیگڈھ پر جنکے ہاتھ میں وہ رہے سہے اختیارات ہوں گے جو مسلمانوں کو دینا گوارا ہیں، اعتماد و اعتبار نہیں - یہ بھی ظاہر ہے کہ اس عالمگیر جنگ کے باعث یونیورسٹی کے قیام میں ضرور دیر لگیگی - اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کونسا عظیم الشان تعلیمی فائدہ اسی سال اسکی بنیاد رکھے جانے سے حاصل ہو جائے گا - جو ایک دو سال کے توقف و تامل سے فوت ہو جائے گا اور سب پر طرہ یہ کہ جو ناگفتہ بہ حالت علیگڈھ کالج کی آج ہے وہ کبھی نہ ہوئی تھی اور ہر شخص جسکو خدا نے ذرا سی بھی عقل دی ہے جانتا ہے کہ جن لوگوں سے ایک کالج نہیں چل سکتا وہ یونیورسٹی کو کیا چلائیں گے - پھر کیا وجہ ہے کہ اس عجلت سے کام لیا جارہا ہے - اور ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کو جس کا دوران جنگ میں چھیڑنا خود سرکار عالیہ کے پیش کردہ اصول کے خلاف ہے چھیڑا جارہا ہے -

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے میں بوثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ کوئی وجہ اس عجلت کی موجود نہیں اور متعدد وجوہ (بالخصوص ٹرسٹیان علیگڈھ کی مجرمانہ غفلت و غداری کے باعث مسلمانوں کا یونیورسٹی کے اعلیٰ اسٹاف کے لیے تیار نہ ہوسکنا) اس عجلت کے خلاف موجود ہیں - رہیں سیاسی وجوہ، سو اُن کے متعلق میں بحالتِ نظربندی کوئی رائے نہیں دے سکتا - اور یہی بہتر بھی ہے - اس لیے کہ وہ وجوہ ہرگز ایسی نہیں جن پر کوئی مدعیِ حریت فخر و ناز کر سکے - ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز　　ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

میں نے اب تک جو آئندہ جلسہ میں پیش ہونے والی تجویز کے متعلق لکھا ہے وہ محض دوسروں سے

سُنی ہوئی باتوں پر مبنی ہے اگر مجھے اس کا پورا یقین ہوتا تو ہرگز اس قدر طویل عریضہ لکھ کر آنجناب کے اور نیز اپنے وقت کو ضایع نہ کرتا۔ اس عریضہ کا منشا یہی ہے کہ آنجناب براہ راست مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں۔ مجھے اس امر کی ضرور شکایت ہے کہ اگست ۱۹۱۵ء کی طرح اس بار بھی آنجناب نے مجھے مشورہ کے قابل نہ سمجھا۔ اور اس فراموشی سے اپریل ۱۹۱۶ء کی یادآوری کا اصلی سبب اور بھی واضح ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس بار آنجناب کسی فریق کا ساتھ نہ دیں گے بلکہ یونیورسٹی کے فیصلہ کو جمہور پر چھوڑ دیں گے۔ ایک عرصہ تک میں نے انتظار کیا کہ اُن حضرات کا رجحان معلوم ہو جو کم از کم ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء سے پیشتر میرے ہمخیال تھے۔ لیکن جب وقت تنگ رہ گیا اور اُدھر سے بھی صدائے برنخاست تو میں نے مجبور ہو کر ایک تحریک ۵ مارچ کے جلسہ کے لیے سکرٹری صاحب کی خدمت میں معہ ایک مفصل عریضہ کے داخل ایجنڈا کرنے کے لیے ارسال کر دی اور نیز ڈاکٹر انصاری صاحب کو بھی ایک نقل اُس تحریک کی روانہ کر دی۔ یقین ہے کہ آپ کو بھی میرے اُس عریضہ اور اُس تحریک کا پورا علم ہوگا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جلسہ ۸ اپریل کو ہوگا اور لوگوں کا خیال ہے کہ آنجناب نہایت سرگرمی سے مسلمانوں سے نہ صرف ۱۱ و ۱۲ اگست ۱۹۱۱ء و ۲۶ و ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرانا چاہتے ہیں بلکہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کے فیصلہ کے بھی خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ آپ علانیہ فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں لکھنؤ سے دس ہزار آدمی اپنی رائے کے موافق رائے دینے کے لیے لے آؤں گا۔ یہ وہ خیالات ہیں جو آپ جیسے سردار قوم کے متعلق میں اپنے دل میں ہرگز جاگزیں نہیں ہونے دینا چاہتا۔ چنانچہ اس قسم کے تمام شبہات کو دور کرنے کی غرض سے میں نے ۳۰ مارچ کو خدمت گرامی میں ایک تار اس مضمون کا ارسال کیا ہے کہ میں آنجناب کی رائے دربارۂ مسلم یونیورسٹی معلوم کرنے کا متمنی ہوں اور نیز اس مسئلہ پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ سید سجاد حیدر صاحب کو یہاں روانہ کر سکتے ہیں اور بتوسط ممبر صاحب تعلیمات ہماری حاضری کا

علیگڈھ میں انتظام فرما سکتے ہیں - اب تک اس تار کے جواب سے مشرف نہیں ہوا ہوں مگر امید ہے کہ آنجناب سید صاحب موصوف کو سال گزشتہ کی طرح اس بار بھی روانہ فرما دیں گے اور نیز اس بار ہماری حاضری کے لیے سرکار عالیہ کی منظوری حاصل فرمالیں گے تاکہ جس جلسہ میں مسلم یونیورسٹی کا آخری فیصلہ ہو اُس میں ہم بھی جن کو اس سے دیرینہ تعلق اور گہری دلچسپی ہے شریک ہو کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں - اگر آنجناب سید سجاد حیدر صاحب یا کسی دوسرے صاحب کو جو آنجناب کی رائے سے پوری طرح واقف ہوں یہاں روانہ فرمائیں تو امید ہے کہ وہ مندرجہ تحت سوالوں کا جواب آنجناب کی طرف سے دے سکیں گے :-

۱ - یونیورسٹی کے مسئلہ کو تا اختتام جنگ کیوں نہ ملتوی رکھا جائے اور اس عرصہ میں وہ تمام کارروائی کالج کی ترقی و اصلاح کے متعلق کیوں نہ کر لی جائے جو بلا توسط سرکار عالیہ ہم آج بھی کرنے کے مجاز ہیں اور جسکے متعلق کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اگست ۱۲؁ ۱۹ء میں آخری فیصلہ کر چکی تھی یعنی کالج کے انتظامات موجودہ ٹرسٹیوں کی بجائے مجوزہ یونیورسٹی کورٹ کے سپرد کیوں نہ کر دیے جائیں اور اس شرط پر سرمایۂ مُسلم یونیورسٹی کا پورا منافع اور مزید قومی چندے کیوں نہ ترقی و اصلاح کالج پر صرف کیے جاتے رہیں -

۲ - وہ کونسا تعلیمی فائدہ ہے جو یونیورسٹی کے متعلق اسوقت آخری فیصلہ کرنے میں متصور ہے مگر ایک دو سال بعد فوت ہو جائے گا -

۳ - کیا جنگ کے باعث قیام یونیورسٹی میں باوجود ہمارے فیصلہ کر دینے کے کہ جیسی بھی ملے قبول کر لی جائے رکاوٹیں پیش نہ آئیں گی -

۴ - کیا ہم عنقریب کافی اور عمدہ اسٹاف جو یونیورسٹی کے شایانِ شان ہو مہیا کر سکیں گے -

۵ - کیا علیگڈھ کالج کے اربابِ حل وعقد پر آپ کو اعتماد ہے کہ وہ یونیورسٹی کو مناسب طریقہ پر چلا سکیں گے -

۶ - اگر آپ کو ان حضرات پر اعتماد ہے تو آپ اب تک کیوں اُن سے اس قدر کشیدہ رہے اس

اور کیوں علیگڈھ کالج کے معاملات میں آپ نے اُس سرگرمی کا جس کی آپ کے ہر جاننے والے کو آپ سے توقع تھی اب تک اظہار نہیں فرمایا اور کیوں انتخاب صدر کانفرنس کے معاملہ میں آپکی جانب سے ارباب حل وعقد علیگڈھ کی اس قدر مخالفت یا اُنکی جانب سے آپ کی اور آپ کے ہمخیال اصحاب کی مخالفت ہوئی۔

۷۔ اگر واقعی آپ کو ان حضرات پر اعتماد نہیں ہے تو پھر کس جماعت سے آپ کو اس کی توقع ہے کہ باوجود ان حضرات کی مخالفت کے وہ یونیورسٹی کو حسب منشا آپکے اور جمہور کے چلالے گی۔

۸۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نبی اللہ صاحب کو علیگڈھ کالج کا سکرٹری بنانا چاہتے ہیں اور اُنکی مالی امداد کے لیے آمادہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صرف نبی اللہ صاحب اس کام کے لیے کافی ہوں گے اور یکہ وتنہا ارباب حل وعقد علیگڈھ کا مقابلہ کرسکیں گے جب کہ نہ اُنھوں نے نہ سید وزیر حسن صاحب نے سرگرمی ومحنت کا باوجود لکھنؤ میں ایک مقتدر قومی جماعت کے کارکن ہونے اور مخالفت کے ایک بڑی حد تک مفقود ہونے کے ابتک کافی ثبوت دیا۔

مخدومی۔ آپ کیا، قوم کا جاہل سے جاہل شخص بھی، اب تو سمجھ گیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ بحالت موجودہ قوم کی موت اور زیست کا مسئلہ ہے۔ ہماری نظربندی نے ہمیں مجبور کردیا ہے کہ بہت سے قومی معاملات میں کوئی حصہ نہ لیں۔ مگر چونکہ تعلیمی معاملات میں ہم ایک حد تک آزاد ہیں اور خط وکتابت کرسکتے ہیں اس لیے کم ازکم مکاتبت ومراسلت میں معذور نہیں۔ اور اس قدر بے پروبالی پر بھی اتنے بے تعلق نہیں ہوسکتے کہ یہ کہکر چھوٹ جائیں کہ ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہو جسپہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس لیے جو کچھ ہوسکا کیا اور کریں گے گو یہ جانتے ہیں کہ ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلیے

اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ ہماری آواز کہاں تک پہنچتی ہے اور کیا اثر رکھتی ہے۔ اپنا تو اسی پر عمل ہے کہ

فریاد و فغاں بلبلِ ناشاد کیے جا　　مہمانِ قفس خاطرِ صیاد کیے جا
فریاد ہویا نالہ ہو یا آہِ جگر سوز　　جو ہو سکے تجھ سے دل ناشاد کیے جا

مشکل یہ ہے کہ ہم کو آج انھیں سے شکایت پیدا ہوتی ہے جن کی تعریف میں ہماری زبانیں کل تک سوکھتی تھیں۔ اگر آنجناب اور ہمارے دیگر احباب کا پاؤں درمیان نہ ہوتا تو کچھ بھی دقت نہ تھی۔ مگر حال یہ کہ استبدادیوں کا جانشہ استبداد کہیں سے احرار کو دستیاب ہوگیا ہے، اور اُسے ہمارے سب سے بڑے حریت پسند زیب بدن کیے ہوئے ہیں۔ بھلا کہہ نہیں سکتے بُرا کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ ؎

دل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت　　بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت
در رزم گہش ناچخ و خنجر نتواں برد　　در بزم گہش بادہ و ساغر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند　　ہموارہ تراشد بُت و آذر نتواں گفت

موجودہ زمانہ ہمیشہ نہ رہے گا مگر جو فیصلہ ہم اور آپ آج کریں گے اُس کا اثر ہمارے بچوں اور آنے والی نسلوں کی تعلیم پر صدیوں تک پڑتا رہے گا۔ کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ اُن کے لیے ہم اپنی کم ہمتی بطور ورثہ کے چھوڑ جائیں۔ کاش ہمارے دیرینہ احباب پورے پورے مسلمان ہو جاتے اور اس آیۂ پاک کی تعمیل کی طرف متوجہ ہوتے کہ یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔ یہی وقت اظہارِ ایمان و قیام پر اسلام کا ہے۔ مگر ؎

کارے عجب اُفتاد بدیں شیفتہ مارا　　مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

جو کچھ لکھ سکتا تھا لکھ دیا ؎

نامہ از سوزِ دروں نم بہ قلم سوختہ شد　　قاصد از دم زند از حوصلہ بیجا ہے بہت

سید سجاد حیدر صاحب کا منتظر ہوں امید ہے کہ وہ جلد تر آسکیں گے۔ جو درخواست میں نے گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور جو تحریر ممبر صاحب تعلیمات کی خدمت میں ارسال کی ہے اُنکی نقلیں ملفوف کرتا ہوں۔ والسلام

آپ کا قدیمی نیازمند　　محمد علی

مسٹر محمد علی نے جن انگریزی تحریروں کا خط کے آخر میں حوالہ دیا ہے اُسکی نقل یہاں کرنا فضول ہے البتہ مسلمانوں کی عام واقفیت کے لیے اُن کے مفہوم کا خلاصہ درج کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مراسلہ بنام چیف سکرٹری صاحب ممالک متوسط - مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی منعقدہ ۸ و ۹ راپریل کے جلسوں کی شرکت کے لیے ہمیں علیگڈھ جانے کی اجازت دی جائے - اپنی نیک نیتی کی طرف سے مزید اطمینان دلانے کے لیے ہمیں کچھ عذر نہ ہوگا - اگر حکومت مقامی کی طرف سے ایک جماعت محافظین ہمارے ہمراہ بھیجی جائے یا امن عامہ کی حفاظت کے لیے کوئی دوسری مناسب کارروائی کی جائے۔

(۲) مراسلہ بنام آنریبل سرشنکران نائر وزیر تعلیم - آپ کو معلوم ہے کہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ ۸ راپریل کو بمقام علیگڈھ ہونے والا ہے - اور اُس گہری دلچسپی کی وجہ سے جو ہم لوگ اپنے مادر علمی کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچانے کی تحریک سے لیتے رہے ہیں اور نیز بخیال اس اہمیت کے جو اس مسئلہ کو ہماری قوم میں حاصل ہے ہم فطرۃً اسکے خواہاں ہیں کہ اس جلسہ میں شریک ہوں - اگرچہ ہماری درخواست کا تعلق براہ راست صوبہ کی گورنمنٹ سے ہے جسکو ہم درخواست بھیج چکے ہیں تاہم بخیال اسکے کہ ہمیں جہاں جانا ہے وہ چیف کمشنر صاحب بہ متوسط کے حدود قیام سے باہر ہے اور اسلیے گورنمنٹ آف انڈیا کی منظوری سے اسکا انتظام کرانے کی ضرورت ہوگی لہذا بحیثیت وزیر صیغہ تعلیم کے ہم آپ سے متمنی ہیں کہ آپ ہمیں ضروری اجازت حاصل کرنے میں مدد دیں۔

مارچ ۱۹۱۷ء کے الناظر میں مسٹر محمد علی کی ایک تحریر چھپی تھی جس میں انھوں نے اپنی شاعرانہ زندگی کے ابتدائی حالات لکھے تھے - اس میں ایک جگہ اُن کا سنہ ولادت لکھا ہوا ہے جو کاتب صاحب کی غلطی سے ۱۸۷۹ء کے بجاے ۱۸۹۶ء چھپ گیا ہے - اخبار شیر دکن (حیدرآباد دکن) کے ایک نامہ نگار نے اس غلطی کی اصلاح چاہی ہے جسکی بنا پر اڈیٹر صاحب نے ۱۴ راپریل کے پرچہ میں ایک نوٹ لکھکر ہمیں توجہ دلائی ہے - حقیقت یہ ہے کہ مسٹر محمد علی موجودہ ہندوستان کے اُن چند افراد میں ہیں جو آیندہ نسلوں کے لیے تاریخ بنا رہے ہیں - اور اس بنا پر اُنکے زمانہ ولادت کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے دینا ایک طرح سے آیندہ زمانہ کے تاریخ پڑھنے والوں کو خواہ مخواہ مغالطہ میں ڈالنے کا موجب ہوگا - بریں خیال کتابت و چھاپہ کی اُس غلطی کی اصلاح کی جاتی ہے اور تمام ناظرین الناظر سے درخواست ہے کہ الناظر (نمبر ۹۲ جلد ۱۲) بابت مارچ ۱۹۱۷ء کے اُنتیسویں صفحے کی گیارہویں سطر میں جہاں "میری پیدائش ۱۸۹۶ء کے اواخر کی ہے" لکھا ہوا ہے وہاں ۱۸۹۶ء کو قلمزد کرکے ۱۸۷۹ء لکھدیں۔

خواجہ کمال الدین صاحب

نے حقائق اسلام کی اشاعت سے قبل مفتی انوار الحق صاحب کو جو خط لکھا تھا اُسکے ملاحظہ سے اس بات کا اندازہ ملے گا کہ تبلیغ و اشاعت اسلام یا بیدینی و الحاد کے دفع کرنے کے لیے یہ کتاب کتنی مفید و کارآمد ہے:—

نقل مراسلہ مورخہ ۹ فروری سنہ ۱۲ء

نحمدہ و نصلی۔

مکرمی مفتی صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ میں نے علیگڈھ میں بھی عرض کیا تھا اور بھوپال میں بھی۔ خدارا آپ وہ کتاب جلد ہی چھاپ دیں۔ وہ تو بہت ہی مفید ہے۔ اور آپ کی خدمت میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اسکے بعض مضامین تو آپ انگریزی میں ترجمہ کر کے ضرور مجھے بھیجیں میں انکو اسلامک ریویو میں نکال لوں گا۔ آپ یہ کام بفضلہ کر سکتے ہیں ہاں کوشش شرط ہے۔ اگر آپ جیسے بزرگ میری قلمی معاونت نہ کریں گے تو اور کون کرے گا۔ بہرحال یہ کتاب جس صورت میں ہے اب بہت جلد چھپ جانی چاہیے۔

فقط والسلام

بحمد اللہ کہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ آگرہ کے مشہور مطبع مفید عام سے طبع ہو کر شائع کر دی گئی ہے۔ تعلیم یافتہ اصحاب کو اور خصوصاً ایسے لوگوں کو جو عقائد مذہبی یا شریعت دنیاوی کے لحاظ سے اسلامی تعلیم کے متعلق دل میں کچھ شکوک یا اعتراضات رکھتے ہوں چاہیے کہ اس کتاب کو ضرور بالضرور مطالعہ کریں۔ انشاء اللہ تشفی ہو جائے گی۔ قیمت عمار

المیزان

مولانا شبلی مرحوم نے موازنۂ انیس و دبیر جس زمانہ میں لکھا تھا اُسی وقت سے اکثر ارباب قلم اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ مولوی صاحب نے موازنہ میں حق بخوبی ادا نہیں کیا۔ اور میر انیس کے کمالات کا اعتراف کرنے میں جس قدر فیاضی صرف کی، اُسی قدر مرزا دبیر کے ساتھ بخل بھی کیا۔ اس ستم کے علاوہ اور بھی بہت سے نقائص اُسکے قابل تردید و اصلاح تھے۔ متعدد اصحاب نے موازنہ کے مقابلہ میں آنا چاہا مگر بعض تو مولانا کی شہرت سے مرعوب ہوگئے، بعض کے ساتھ زمانہ نے مساعدت نہ کی۔ بالآخر ضلع متھرا کے ایک ذی علم اور صاحب مذاق رئیس چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی اس میدان میں درآئے اور اُنھوں نے 'المیزان' کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھکر پیش کر دی جسمیں موازنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا دبیر کی شاعری پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اُنکی ہر قسم کی سلیس اور صاف نظموں کا نمونہ دکھایا گیا ہے اور اُنکے محاسن سخن اور فصاحت و بلاغت کلام کا مشرح تذکرہ کیا گیا ہے۔ حجم تقریباً ۰۰۰ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت ے ر

موازنۂ انیس و دبیر

بھی اب کمیاب ہے۔ صرف کچھ جلدیں مل سکتی ہیں جو صاحب چاہیں چار روپے (للعہ) فی جلد کے حساب سے منگا لیں

الناظر بک ایجنسی - چوک - لکھنؤ

لڑائی کے متعلق دلچسپ کتابیں

جرمن جاسوس

جسمیں جرمنی کے مشہور آفاق جاسوسوں کی حیرت انگیز کارگذاریاں انگلینڈ۔ روس۔ اٹلی اور فرانس میں پوشیدہ سازشیں۔ تیغگیر مادوں اور آلات حرب کے خفیہ ذخائر کا اجتماع۔ جسن عشق کے حقیقی جذبات۔ ممالک یورپ کے مختلف دلفریب مقامات کے فوٹو۔ عبرت و حیرت کے متعدد مناظر وغیرہ ایسی خوبصورتی سے جمع کیے گئے ہیں کہ ایک صفحہ دیکھنے کے بعد ممکن ہی نہیں کہ کتاب ختم کیے بغیر ہاتھ سے چھوٹے۔ حجم ۳۹۲ صفحے۔ قیمت عہ

محاصرۂ دردانیال

دردانیال کے گذشتہ محاصروں پر مختصر بحث۔ قدیم رومی تاریخ پر اجمالی تنقید موجودہ جنگ میں حملہ کے اسباب۔ جہازوں اور سپاہ کی تعداد اور کارگذاریاں۔ دردانیال کے قدرتی استحکامات۔ قلعبندی۔ افواج متحدہ کی ان تھک کوششیں۔ جہازرانوں کی بے جگری کے کارنامے۔ سچی محبت کی ایک جھلک۔ غرضکہ ناول کے پیرائے میں رزم کی داستان نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کردی گئی ہے حجم ۱۰۰ صفحے۔ قیمت ۹ر

بحری جنگ

یعنی ۱۳ مئی سنہ ۱۶ء کے ساحل جٹلینڈ کے عظیم الشان معرکہ کی تفصیلی حالات انگلستان اور جرمنی کی بحری جنگ۔ ڈرڈناٹ جہازوں کی پہلی لڑائی۔ دونوں ملکوں کی بحری تاریخ۔ حریفین کی بحری قوت کا موازنہ۔ انگریزی امیر البحر کی مراسلت قیصر جرمنی کی تقریر۔ جرمن اور غیر طرفدار اخبارات کی رائیں۔ غرضکہ جنگ کا ہو بہو نقشہ الفاظ کے ذریعہ سے کھینچکر دکھایا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں لائق مصنف مسٹر انیس احمد بی اے نے جنگی سابقہ تصنیفات پر جرح کی کاکیا ہے

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

یہ واقعہ تسلیم شدہ ہے کہ دنیائے ادب میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جس رسالہ نے اُردو کی خدمت اور اسکی ترقی میں کوشش کی ہے وہ رسالہ **مخزن** ہے۔ جو سترہ سال سے ہرماہ کی پہلی تاریخ کو افق لاہور سے طلوع ہوکر ادبی دنیا کے کونے کونے کو روشن کرتا ہے۔ سررشتہ تعلیم پنجاب مدراس کے ڈائرکٹروں نے مخزن کو سیکڑوں کی تعداد میں سرکاری اسکولوں کے لیے خرید کر اسکے مفید ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اُردو نصاب میں انتخاب مخزن داخل کیا گیا ہے۔ انڈیا کی کئی ہندو مسلمان ریاستوں میں مخزن سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے۔ دوسرے تیسرے ماہ اس میں مشاہیر کی تصاویر بھی شایع ہوتی رہتی ہے۔ کم سے کم (۷۲) صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ لسان العصر خان بہادر حضرت اکبر۔ آغا حشر کاشمیری انڈین شیکسپیر۔ مولانا طباطبائی لکھنوی۔ وقار الاعظم حضرت شرف جاورہ۔ خان بہادر مرزا سلطان احمد وغیرہم جیسے آسمان ہند کے آفتاب اپنی علمی ادبی نوریزیوں سے صفحات مخزن کو رونق دیتے ہیں۔ ان تمام دلربائیوں کے ساتھ ان کا وقت پر شایع ہونا مخزن کا امتیازی صفت ہے۔ کتابت۔ چھپائی۔ کاغذ نہایت عمدہ قیمت سالانہ قسم اول ساڑھے تین روپیہ۔ قسم دوم دو روپے آٹھ آنے۔ نمونہ کا پرچہ پانچ آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوتا ہے۔

مینیجر مخزن لاہور

جو بہت مقبول ہوئی ہے ایک دلچسپ اور قابل داد مقدمہ لکھا ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحے۔ قیمت ۸ر۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔

ہوم رول

مصنفہ مسٹر اے۔ رحمان

یورپ میں آج جو ہولناک جنگ ہو رہی ہے اسکے خاتمے کا زمانہ قریب آرہا ہے اور صلح و امن کے زمانہ کی لڑائیاں جو ان صبر آزما ایام میں ملتوی کر دی گئی تھیں اُنکے از سر نو چھڑنے کا وقت آجائے گا۔ انگلستان والے اپنے ملک میں جو تغیرات کریں گے اور نو آبادیوں کے باشندے اپنی خدمات اور قربانیوں کا جس طور پر معاوضہ مانگیں گے اس سے آپ کی واقفیت چنداں ضروری نہ ہو لیکن کم سے کم یہ تو آپ کو ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ خود آپ کے ملک کے وہ مشہور و ممتاز لوگ جو ملکی و قومی معاملات میں آپ کی رہنمائی کر رہے ہیں اور آپ کے لیے انتظام ملک میں ہر قسم کی آسانیاں اور فلاح و بہبود کی راہیں پیدا کرنے میں سالہا سال سے اپنی زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں اس ملک کے لیے کیا چاہتے ہیں؟ ہندوستان کے اکثر و بیشتر رہنمایان قوم اس بات پر متفق ہیں کہ اس ملک کی بہبود و فلاح کا تمامتر دار و مدار ہے

ہوم رول

یعنی حکومتِ خود اختیاری یا حکومت ملکی پر!

کیونکہ اسکے سوا اور جو کچھ بھی اصلاحات ہونگی وہ فروعی اور نامکمل ہونگی اس تحریک کے متعلق ایک نہایت ہی لطیف اور دلچسپ مضمون مسٹر رحمان نے لکھا اور بصورت رسالہ شایع کرایا ہے تاکہ جو لوگ تفصیلی طور پر اہل ملک کے اس مطالبہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ اسے پڑھیں اور مطلع ہوں قیمت فی نسخہ ۵ر

منیجر الناظر بک ایجنسی۔ چوک۔ لکھنؤ

سلف گورنمنٹ

یعنی

حکومت خود اختیاری

از فخر ملک جانشین مسٹر گوکھلے آنجہانی، آنریبل مسٹر سری نواس شاستری

صدر انجمن خادمان ہند

جسے پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی ورکن انجمن خادمان ہند نے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اسکا مطالعہ یوں تو ہر ہندوستانی کے لیے مفید ہے۔ مگر جو لوگ انگریزی نہیں جانتے۔ اور آنریبل شاستری کے اصل رسالہ کو نہیں مطالعہ کر سکتے اُن کو تو خصوصیت کے ساتھ ایک دفعہ پڑھنا چاہیے۔

قیمت ۱۶/

المشتہر منیجر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ

قوت مردی کیلیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ آ گئے ہوں تو آخر میں اب ایکبار ہماری سفارش قبول فرمائیں اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ آتنک نگرہ گولیوں کا استعمال فرمائیں اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں گئی ہوئی اور ہاتھوں سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتیں از سر نو عود نہ کر آئیں تو ہمارا ذمہ۔

صاحبو! اس باب میں زمانہ کے معزز اصحاب تعریف فرماتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں سرٹفکیٹ موجود ہیں مردوں اور عورتوں کو یکساں مفید ہیں اور نباتات سے مرکب قیمت بھی بہت کم صرف فی بکس ۳۲ گولیوں کا ایک روپیہ۔ آزمائش شرط ہے۔ کمیشن چار روپے کے خریدار کو ایک روپے کی دوا زیادہ ملیگی۔

وید شاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

مولوی ابو الحسن فریدہ آبادی
- معلم السیاست — ۱۲ر
- تاریخ مصر جدید — عہ

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفر نامہ بلاد اسلامیہ — ۱ہ
- الصدیق — عہ
- المرتضیٰ — ۱ر
- سیاحت ہند — ۱۲ر

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس — عہ
- اقصائے مغرب — ۱۲

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ — عہ
- حیات جامی — ۸ر
- علوم عرب — عہ
- خواتین — ۱ہ

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ۱ہ
- روزنامہ باتصویر — ۱ہ
- " بلا تصویر — ۱ہ
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر و قمر — ۸ر
- رسول کی عیدی — ۲ر
- پیاری چکڑی — ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ۱۰ر
- گوما خاتون — ۲ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۱۲ر
- شمع و شاعر — ۱۲ر
- بلال — ار
- شکوہ — ۲ر
- جواب شکوہ — ۳ر
- نالۂ یتیم — ۳ر
- فریاد امت — ۳ر

مولانا عمادی
- کتاب المعارف — ۱ہ
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر
- علم الحدیث — ۸ر
- صناعۃ العرب — ۳ر

مولوی ظفر علیخاں
- جنگل میں منگل — ۱ہ
- سیر ظلمات — ۱ہ
- معاشرت — ۶ر
- جنگ روس جاپان — ۱ہ
- فلسفہ ابن سینا — ۳ر
- اپریل فول — ۴ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المراۃ — عہ
- المدنیۃ والاسلام — ۱ہ

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر — ۱ے
- وکیل نسواں — ۸ر

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابو البشر — عہ
- حقائق اسلام — ۱۲ر
- اثبات واجب الوجود — عہ
- قوت خیال — ۴ر
- اصول خانہ داری — ۱۲ر

پروفیسر نواب علی
- تذکرۃ المصطفیٰ — ۱ہ
- معارج الدین — ۱ہ

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المعلمین — ۸ر
- معیار الاخلاق — ۲ر
- تنقید لطیف — ۵ر
- تربیت اولاد — ۴ر

شفق عماد پوری
- تحقیق شفق — ۸ر
- غنچہ نوبہار — ۴ر
- کنز المعانی — ۲ر
- حدیقۂ آخرت — ۶ر
- آئینۂ پیغمبر — ار
- ریاض شفق — ۸ر
- ثمرۂ عقیدت — ۲ر

مولوی مصباح الدین
- الہارون — ۱ہ
- محاربہ فرانس و پرشیا — عہ
- مصباح التوپ — ۸ر

حکیم محمد علیخاں
- عبرت (کامل) — ۱ے
- حسن سرو (") — ۱ے
- دیول دیوی — عہ
- گورا — ۱۲ر
- منیل کا سانپ — ۱ہ
- جعفر و عباسہ — ۱ہ
- اختر حسینہ کامل — ۱ہ
- سیہ کاسۂ عالم — ۸ر

منشی پریم چند
- پریم پچیسی — ۱۲ر
- سیر درویش — ۳ر

لالہ سری رام
- خمخانۂ جاوید جلد — عہ

منشی سعید احمد
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۴ر

مولوی معین الدین
- نپولین اعظم کامل — عہ
- اورنگ زیب — عہ
- بدمزاج شوہر — ار
- زاہدہ بیگم — ار

سید ابراہیم
- جاپان — ۸ر
- جنگ روس و جاپان — ۹ر

مہاشے پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم — ۵ر
- مہاتما بدھ — ۱ہ
- خدا اور روح — ار
- مارٹن لوتھر — ۸ر
- سیرۃ المستورات — ۱۲ر
- بچوں کی کہانیاں — ۱۲ر

حسرت موہانی
- شرح غالب — عہ
- دیوان حسرت — ۱۲
- تذکرۃ الشعرا — ۱ہ

ارشد تھانوی
- حسن تخیل — ۱۲ر
- بیاض ارشد — ۸ر

حسن الدین خاموش
- جمیلہ خاتون — ۳ر
- قومی گیت — ۵ر
- زنانہ خطوط — ۵ر
- لاڈلا بیٹا — ۳ر
- اصلاح الرسوم — ۲ر
- حوران جنت — ۴ر
- رفیق مرزا — ۴ر
- ناصح مشفق — ۳ر

سید رفیع موہانی
- تاج و نشان — ۱ہ
- دستار و کلاہ — ۸ر
- تیغ شائیگاں — ۱ہ

الناظر بک ایجنسی - چوک - لکھنؤ سے طلب فرمائیے

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۹۴ جلد ۱۶ — اپریل ۱۹۱۷ء

نوٹ۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی کا فوری جنتری ۱۹۱۶ء کی خوبصورت تیار ہوئی ہے دس شریف لکھے پڑھے اشخاص کے نام اور پورا پتہ لکھنے پر جنتری بلا قیمت و محصولڈاک بھیجی جاتی ہے۔

وقت پر صلاح

جو دوست ہوتے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں۔

ہیضہ کی مجرب دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی صلاح ہے کہ موسم گرما آگیا ہے۔ اس موسم میں کھاتے پیتے رہنے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف رہتا ہے اس سے بچنے کے لیے پہلے ہی ایک شیشی اصلی عرق کافور منگوا کر اپنے پاس گھر میں ڈال رکھیں۔ جس سے اپنے یا اپنے پڑوسیوں کی وقت پر حفاظت کر سکیں۔ یہ اصلی عرق کافور عرصہ اکتیس ۳۱ سال سے تمام ہندوستان میں جاری ہے۔ یہ عرق گرمی کے دست۔ پیٹ کے درد۔ متلی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت ایک شیشی ۴؍ محصولڈاک ایک سے ۴ شیشی تک ۵؍ ۸ شیشی تک ۶؍

گھینگے کی مجرب دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی

گھینگھا سخت اور بہت برا ہے بہت دنوں کا ہو جانے سے آرام نہیں ہوتا ہے مگر تھوڑے دن کا ورم رہتے ہی علاج برابر کرنے سے چھوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی دوا ایسے گھینگھے کو آرام کرنے کا دعویٰ رکھتی ہے دو ایک ماہ تک کرنا چاہیے۔ اسمیں صرف بہت کم ہے ایک دوا کھانے کی اور ایک لگانے کی ملتی ہے۔ جو کہ دو ہفتہ کے لیے کافی ہوتی ہے

قیمت کھانے کی دوا بارہ آنہ ۱۲؍

لگانے کی دوا چار آنہ ۴؍

محصولڈاک پانچ آنہ

ڈاکٹر ایس کے برمن کا بنایا ہوا

پین ہیلر

یہ اندرونی اور بیرونی ہر قسم کے درد کو دور کرنے کے لیے لاجواب دوا ہے۔ موچ۔ چوٹ۔ گٹھیا کے سبب جوڑوں یا گانٹھوں میں درد ہو ریاح یا سردی کی وجہ سے کمر کو اندا گردن وغیرہ میں درد ہو تو اسکی مالش سے فوراً ہی درد دور ہو جاتا ہے۔ ڈاڑھ اور مسوڑھ کے درد کو بھی فائدہ کرتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲؍ محصولڈاک ۵؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۹۴ جلد ۱۶ — یکم اپریل سنہ ۱۹۱۷ء

تاریخ الفلسفہ

(سلسلہ کے لیے الناظر نمبر ۹۰ بابت ماہ نومبر سنہ ۱۶ء ملاحظہ ہو)

علم ما بعد الطبیعی

ہرمس کے مندر کے ایک مخروطی مینار پر یہ عبارت کندہ کی ہوئی تھی :-

ہر چیز جو پہلے تھی وہ میں ہی تھا - جو کچھ اب موجود ہے وہ میں ہی ہوں - جو کچھ آیندہ ہوگا۔
وہ بھی میں ہی ہوں - کوئی فانی انسان میری ازلیت و ابدیت کا راز معلوم نہیں کرسکا -

موجودہ دَور کے سائنس داں مدعی ہیں کہ ہم نے یہ حجاب رفع کردیا ہے - لیکن، دیکھنا یہ ہے کہ ان کا دعوے کس حد تک صحیح ہے ؟

کائنات و مظاہر کائنات کے متعلق دو حیثیتوں سے رائے قائم کی گئی ہے (۱) علمی سائنس کے نقطۂ نظر سے (۲) ما بعد الطبیعی نقطۂ نظر سے

علمی سائنس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم کائنات کے متعلق اپنی رائے ان اشکال و صور کے

کے حساب سے قائم کرتے ہیں جن میں وہ ہم کو اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہے مابعد الطبیعی نقطۂ نظریہ ہے کہ ہم اس علم سے جو بذریعہ حواس حاصل ہوتا ہے قطع نظر کرکے اس امر کی تحقیق کریں کہ وہ کون سی (شے) ہے جو کائنات کا (جوہر) ہے؟

اہل سائنس اس کی تحقیق نہیں چاہتے کہ اصل وجود کیا ہے اور کیوں ہے؟ وہ صرف ایک راستہ اختیار کرتے ہیں: وہ یہ کہ کسی طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ موجودات کا ظہور کیونکر ہوا۔ بہ الفاظِ دیگر۔ ان کی تحقیقاتِ علمی صرف اُن واقعات تک محدود رہتی ہے جن کی بنا تجربے وشاہدے پر ہے۔

روحِ انسانی ہمیشہ احقاقِ حق کی متمنی رہتی ہے۔ اس کی اس قسم کی تحقیقات سے ہرگز تشفی نہیں ہوسکتی۔ آدمی کے دل میں خیال آتا ہے کہ یہ دم بدم کے تغیرات، یہ زندگی کی کیفیات کا انقلاب، خود بخود موجود نہیں ہوگئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی مستقل چیز ضرور موجود ہے جو لامحدود ہونے کے علاوہ یہ صفات بھی رکھتی ہے کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور جملہ کائنات کی خالق ہے۔ پس۔ تلاش کرنا چاہیے کہ وہ شے کیا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے علم کی ضرورت تھی جس میں مذکورۂ بالا تحقیق کا تذکرہ ہو۔ رفتہ رفتہ اس علم کی تدوین ہوئی اور اس کا نام مابعد الطبیعی رکھا گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس علم میں یہ تبلانے کی کوشش کیجاتی ہے کہ اصل اشیا کا سراغ لگانے کا طریقہ کیا ہے جو حیات وکائنات کے مظاہر طبعی کے پرے یا بعد ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ علم دراصل علم اصل وجود ہے۔

مسائل مابعد الطبیعی پر غور کرنے والے حکما کے کئی گروہ ہیں (۱) ایک گروہ کہتا ہے کہ کائنات کا وجود مادّے کی وجہ سے ہوا ہے۔ حرکت وحیات مادّے کی خصوصیات ہیں، اور جب اجزا منتشر ہوجاتے ہیں تو حرکت وحیات بھی مفقود ہوجاتے ہیں۔ اس کو مسئلۂ مادیت کہتے ہیں۔ (۲) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام کائنات کا ظہور رُوح کی وجہ سے ہُوا مادّہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کو مسئلۂ روحانیت یا الٰہیات کہتے ہیں۔ (۳) تیسرا گروہ کہتا ہے کہ روح اور مادّہ دونوں

سبب ظہور کائنات ہیں اور یہ کہ یہ دونوں متحد ہیں - یہ مسئلہ ثنویت کہلاتا ہے - (۴) چوتھا گروہ تیسرے گروہ کے برعکس رائے رکھتا ہے، وہ یہ کہ کائنات کی سبب کوئی شے ہے جو ایک ہے، جس کی نسبت علم نہیں کہ وہ کیا ہے - یہ مسئلہ توحد کہلاتا ہے -

(الف) مادّیت یا دہریّت

مادّئین کل عالم کو ایک شے واحد قرار دیتے ہیں - اس کا نشاء یہ ہے کہ تعدّدِ اشیا کا معما ایک ہی کلیہ کے قائم کرنے سے حل ہو جائے - یہ کہتے ہیں کہ ہر شے کی اصل مادّہ ہے - روح کوئی جداگانہ چیز نہیں ہے - جس چیز کو لوگ نفس کہتے ہیں وہ بھی ان اشکال میں کی ایک شکل ہے جو علی الاتصال انقلاب پذیر مادّہ اختیار کیا کرتا ہے - غرضکہ، ہر چیز یا تو خود مادہ ہے یا مادیت کا کوئی مظہر ہے - مادّہ لامحدود اور لافانی ہے، اس کے قوانین اٹل اور ابدی ہیں، نہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے نہ انسان نے اُسے بنایا ہے - یہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا - اور گو کہ اسکی شکلیں ہمیشہ سے بدلتی رہتی ہیں اور بدلتی رہیں گی مگر اس میں سے ایک ذرے کا بھی فنا یا ضایع ہونا ممکن نہیں ہے - - - - -

مادیت میں توحد کا رنگ تو ضرور ہے مگر الحاد آمیز ہے - ان کا یہ بھی قول ہے کہ فضائے کائنات تمام و کمال مادے سے پُر ہے اس میں خدا، رُوح، شیاطین، ہیولیٰ وغیرہ کا گزر ممکن نہیں ہے - فطرت اپنی ضروریات خود پوری کیا کرتی ہے - دنیا میں فوق الفطرت کوئی بات نہیں ہوتی - مادیت کا اعتقاد بہت قدیم ہے - قدیم رمل، جفر و مذہب بودھ میں بھی اس کا رنگ بالکل نمایاں ہے -

حکیم یوسیس پہلا یونانی حکیم تھا جو مادّے کے جوہر کائنات ہونے کا عقیدہ رکھتا تھا - اسکے بعد اس کے شاگرد حکیم دی مقراطیس کا نمبر تھا - یہ شخص ۴۲۰ء قبل مسیح میں موجود تھا اور مادّئین کا امام مانا جاتا ہے - اس نے اجزائے لاتیجزّی کا مسئلہ قائم کیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

مادہ نہایت چھوٹے چھوٹے ذروں سے مرکب ہے جو ہمیشہ متحد اور پھر متفرق ہوتے رہتے ہیں جنکی وجہ سے اجسام بنتے اور بگڑتے ہیں۔

حکیم ایپکورس نے جو سنہ ۳۴۱ قبل مسیح میں موجود تھا، مسئلۂ اجزائے لایتجزیٰ کو تسلیم کیا اور اپنی طرف سے اتنا اور اضافہ کیا کہ روح، عقل و خیال و ضمیر سب مادّے کے لوازم ہیں۔

لیوکریشیس نے جس کا زمانہ سنہ ۹۹ قبل مسیح تھا۔ دہریت کی تائید میں کتاب دی ریرم نیچورا تصنیف کی۔

قرون متوسطہ میں عیسائیوں میں ثنویت کا عقیدہ پھیلنے لگا۔ گینڈی و گارڈنو برونو نے اس کے خلاف آواز بلند کرنی چاہی مگر اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلا کہ سنہ ۱۶۰۰ء میں برونو شہر روما میں آگ کی نذر کر دیا گیا۔

ٹامس ہوبس نے جس کا زمانہ سنہ ۱۵۸۸ لغایت سنہ ۱۶۷۹ء تھا، انگلستان میں دوبارہ مادیت کو زندہ کیا۔ اس کی اہم رائیں یہ ہیں: کُل مظاہرِ کائنات حرکت کا نتیجہ ہیں۔ روح کوئی چیز نہیں وہ اجسام طبعی جو اس قدر لطیف ہیں کہ ہمارے ادراک سے باہر ہیں اُنھیں کو لوگ روح کے نام سے یاد کرنے لگے۔

بیرن ہولباش نے جس کا زمانہ سنہ ۱۷۲۳ لغایت سنہ ۱۷۸۹ تھا، اپنی کتاب سسٹم دی لا نیچر کا مادیت کی تائید میں تصنیف کی۔ جرمنی میں مولیشات نے کتاب دورِ حیات مادیت کی تائید میں لکھی۔ وگوٹ نے کتاب مذہب تعصب و سائنس لکھی۔ لیکن ان میں سب سے بڑا لودویک بخنر تھا جس کی کتاب قوت و مادہ مادئین کی انجیل سمجھی جاتی ہے۔

(ب) روحانیات یا الٰہیات

ابتدائے آفرینش کا ایک قصہ ہے کہ دو بھائی ہابیل و قابیل تھے کسی وجہ سے آپس میں لڑے۔ قابیل نے ہابیل پر حربہ کیا۔ ہابیل مر کر گر گیا۔ قابیل نے پہلے کسی کو مرتے نہیں دیکھا تھا

وہ اس انقلاب کی وجہ نہ سمجھ سکا اور مُردہ بھائی کو جھنجھوڑنے لگا اور یہ سوالات کرنے لگا:

میرے بھائی اُٹھ۔ تو سبزے پر بے طرح کیوں پڑا ہے؟ یہ نیند کا وقت نہیں، تیرا چہرہ اس قدر زرد کیوں ہے۔ صبح تک تو تُو خوش تھا۔ اب تو بالکل چپ کیوں ہے۔ کیا اب تو کبھی نہ بولے گا؟ وغیرہ وغیرہ

اس قصے کے بیان کرنے کی غایت یہ ہے کہ عالم کے گوناگوں انقلابات کو دیکھ کر جو حالت ہر آدمی کی ہو جاتی ہے وہ اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ انسان دیکھتا رہتا ہے اور تغیرات انقلابات نو بنو ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن ان کا سبب اس بیچارے کی سمجھ میں خاک نہیں آتا اور نہ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو یہ اَدَل بَدَل کر رہی ہے۔

اگر تم کسی شخص سے پوچھو کہ بھلا بتاؤ تو کہ کیا موجود ہے؟ تو وہ شخص فوراً بول اُٹھے گا کہ وہ کُل چیزیں موجود ہیں جن کو میں دیکھتا ہوں یا دیکھ سکتا ہوں، جن کو میں چھوتا ہوں یا جن کو میں محسوس کرتا ہوں . . . . . مگر غور سے دیکھیے تو اس کے یہ جوابات نہ کافی ہیں نہ شافی۔ کیونکہ ان تمام چیزوں میں جن کا وہ ذکر کر چکا ہے اتنے فرق ہیں اور ایسے عجیب انقلابات رُونما ہوئے ہیں جن کا علم شخص مذکور کو ہے ہی نہیں۔ مثلاً دیکھو ان چیزوں میں بعض ایسی ہیں جو حرکت کرتی ہیں یعنی چلتی، رینگتی یا اُڑتی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جو غیر متحرک ہیں۔ بعض جاندار ہیں بعض بے جان۔ پھر۔ ان میں سے جو ذی حیات ہیں اُن کا بھی یہ حال ہے کہ جب ان پر موت وارد ہوتی ہے تو وہ حرکت سے باز رہ جاتی ہیں۔ یہ اعضا، یہ خون کا جوش دسیلان۔ یہ طوفان خیز زور و قوت خاک و رسایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ابھی تھوڑے عرصے کا ذکر ہے کہ ان کی موجودہ شکل کا نام و نشان بھی نہ تھا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان کا پھر کوئی وجود نہ ہو گا۔ یہاں تک کہ یہ بھی معلوم نہ رہ جائیگا کہ یہ کب آئی کب گئی اور آیا اس کا کوئی وجود بھی تھا کہ نہ تھا

آنانکہ درآمدند و در جوش شدند　　　آشفتۂ ناز و طرب از ہوش شدند
خوردند پیالۂ و کفن پوش شدند (خیام)　　　در خواب عدم جملہ ہم آغوش شدند

پس حل طلب یہ سوال ہے کہ وہ کون سی شے ہے جو ان انقلابات کی فاعل ہے۔
حکما نے اس کے متعلق متعدد رائیں قائم کیں۔ چنانچہ ایک یہ ہے کہ یہ چیز وہ ہے جو غیر مرئی ہے۔ غیر مادی ہے لیکن باوجود غیر مادی ہونے کے پھر بھی ہر چیز میں مکین ہے اور اسکا نام روح ہے۔

تن زجان و جاں زتن مستور نیست لیک کس را دید جاں دستور نیست

یہی وہ شے ہے جو اجسام کو حیات و حرکت بخشتی ہے اور جب اپنی اصل کی جانب رجوع کرجاتی ہے تب اجسام لاشئے محض رہ جاتے ہیں۔

صورت از بے صورتی آمد بروں باز شد کانّا الیہ راجعون

حکیم افلاطون کا مسئلۂ روحانیت یہ ہے :-

روحانیت کا وجود ثابت ہے اور ان کی بعینہٖ وہی صورت ہے جو مظاہر کائنات کی ہے۔ وہ اصلِ کل جو اشکال و صور کے پردے میں کام کر رہی ہے غیر مادّی ہے اور روحانی وضع رکھتی ہے۔

فلسفۂ جدید کے زمانے میں ڈیکارٹ نے روحانیت کے مسئلے کا احیا کیا اور لائبنیز نے جس کا زمانہ ۱۶۴۶ء لغایت ۱۷۱۶ء تھا۔ اس کی توضیح کی۔ اس کا قول ہے کہ تمام اشیا کا جوہر صرف ایک ہے اور وہ روحانی ہے۔ یہ جوہرِ واحد لاتعداد نقطوں میں تقسیم ہے جنکو جواہر فردہ کہتے ہیں۔ اجسام مادیت کی نمو سے پیدا ہوتے ہیں۔ مادیت کا جوہر ایک قوت ہے جو غیر مادی غیر قابل تجزی اور غیر قابل فنا ہے۔ جواہر فردہ کی تکمیل کے مختلف درجات ہیں ان میں جو افضل ہوتا ہے حکومت کرتا ہے اور جو ادنیٰ ہوتے ہیں اطاعت کرتے ہیں۔ مُردہ اور افسردہ اشیا غیر مکمل جواہر فردہ کا تودہ ہیں جن کی درمیان سے حکمراں جوہر غائب ہے۔ لیکن۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو اشیا مردہ دکھلائی دیتی ہیں وہ بالکل بے جان ہیں۔ کیونکہ ہر جوہر فرد خواہ کیسا ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو بجائے خود روح و جسم کا مجموعہ ہے۔

جارج برکلے کا زمانہ ۱۶۸۵ء لغایت ۱۷۵۳ء تھا۔ اس کی رائے ہے: مادّہ ایک دھوکے

کی ٹئی ہے۔ صرف ایک ہی جزو کا وجود ثابت ہے جس کو روح یا نفس کہتے ہیں۔ اسی نے ہم میں وہ خیالات نقش کر دیے ہیں جن کے اصل مفہوم کے سمجھ لینے کا نام اصل اشیا کا ادراک ہے۔

اس کے بعد کے زمانے کے اکابر حکماے روحانیئین یہ ہیں: ہیرمن لوٹز، شوپن اور فیشنر۔ فیشنر کی کتاب جس کا نام کائنات کی شام وسحر ہے بہت مشہور ہے۔

(ج) توحد وثنویت

جیسا پہلے کسی جگہ بیان ہو چکا ہے، بعض حکما اس امر کے قائل ہیں کہ اصلِ اشیا صرف ایک ہی شے ہے۔ اس سے کچھ مطلب نہیں کہ وہ شے مادی ہے یا روحانی۔ یہ فلسفۂ توحّد کہلاتا ہے۔ توحد کا ماننے والا اگر مادے کو اصل اشیا سمجھتا ہے تو دہری ہو جاتا ہے اور اگر روح کو اصل اشیا سمجھتا ہے تو روحانیوں میں داخل ہے۔

ثنویت کے تسلیم کرنے والے روح و مادے کے مشترک وجود کے قائل ہیں۔ زمانۂ قدیم میں انگزاغورس ایک حد تک حکیم فلاطون، حکیم ارسطو، حکماے استوئکی ثنویت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اور زمانۂ حال میں ڈیکارٹ، ہیربارٹ، لوٹزا اور فشت مشہور حکما گزرے ہیں۔

۱۔ انگزاغورس جس کا زمانہ ۵۰۰ قبل مسیح تھا اس کی راے تھی کہ کائنات میں دو قسم کی چیزوں کا وجود ہے (۱) مادہ جو غیر متحرک اور غیر مدرک ہے (۲) جوہر مدرک جو تمام حیات و حرکت کا سبب فاعلی ہے۔

۲۔ ایک نظر سے افلاطون اور ارسطو دونوں ثنویت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً افلاطون عالم اجسام و عالم ارواح دونوں کا وجود بتلاتا ہے۔ ارسطو کا بھی یہ خیال تھا کہ مادہ ایک چیز ہے اور صور میں ایک اندرونی قوت موجود ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مادہ و صور جدا گانہ چیزیں نہیں ہیں۔ مادہ، ہیولیٰ و صور، جسم و روح ہر شے میں موجود ہیں۔

۳۔ دی کارٹ کی راے تھی کہ مادے اور نفس میں فرق ہے۔ نفس یا روح میں مادیت اور

عرض کا شائبہ نہیں ہے۔ یہ متحرک اور آزاد ہے۔ برخلاف اس کے جسم و مادّہ عرض رکھتے ہیں۔ اور بے جان ہیں۔ آدمی، جسم و روح کا مجموعہ ہے۔

اسپینوزا کا خیال تھا کہ دو مختلف الاصل چیزیں مجتمع نہیں ہوسکتیں۔ پس لاجرم ایک ہی شے اصل کُل ہوسکتی ہے۔ چاہے اُس کو خدا کہو یا اُس کا نام فطرت رکھو، بات ایک ہی ہے۔ خیال و غرض اسی شے کی دو مختلف صفات ہیں۔

۵ ۔ ہیگل اپنی کتاب تو مُد میں لکھتا ہے:۔

ثنویت ہر صاحبِ نظر کا عقیدہ ہے۔ یہ تمام مذاہب کی جان ہے۔ تمام قدیم مذاہب و نظامہائے فلسفہ ثنویت کی جانب مائل تھیں ... خدا و کائنات، رُوح و مادّہ، خالق و مخلوق مختلف چیزیں ہیں۔ یہ خاص قسم کی ثنویت اُن تمام مذاہب میں جن میں صرف ایک خالق کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے، پائی جاتی ہے۔ ان مذاہب کی بیّن مثالیں مذہبِ یہود، مذہب عیسائی اور مذہب اسلام ہیں۔

(د) علم نظام الکون

مذکورۂ بالا علوم کے بیانات میں صرف اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کا ذکر تھا کہ "کیا چیز موجود ہے"۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس کے ساتھ کے سوالات کا جواب دینے کی کہاں تک کوشش کی گئی ہے۔ وہ سوالات یہ ہیں۔ (۱) کائنات کیونکر موجود ہے (۲) کائنات کیونکر وجود میں آئی۔ دیکھیے جب انسان کو سمجھ آنے لگتی ہے تو وہ معلوم کرتا ہے کہ گو کہ مظاہر و مناظرِ فطرت بے عدد و بے شمار ہیں لیکن ان میں ایک عجیب قسم کی ہم آہنگی موجود ہے۔ بعض تبدیلیاں برابر ٹھیک اوقات پر ہوتی رہتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودات کسی ایسے سخت قاعدے کی پابند ہیں جس سے یکسر مُو تفاوت و انحراف ممکن نہیں ہے۔ یہ معلوم کرکے آدمی کے دل میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ یہ عجیب و غریب انتظام کیونکر وجود میں آیا۔

قدیم حکماء یونان کا تو یہی خیال تھا جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایک واحد اصل اصول

اس کا سبب ہے جس کو کسی حکیم نے آب قرار دیا، کسی نے فضا قرار دی اور کسی نے نفس یا باد یا آتش۔ لیکن یہ سوال جوں کا توں باقی رہا کہ تمام ہجوم مظاہرِ فطرت میں ایسے عمدہ انتظام کا وجود کیونکر ہوا؟ اب جوابی رائیں سُنیے :۔

پہلی رائے ذی مقراطیس کے خیال میں نظام عالم صرف ظاہری اور بے اصل چیز ہے اس کا واقعی کوئی وجود نہیں ہے۔ اسی دعوے کی تائید میں اس نے اجزاے لاتیجزی کا مسئلہ پیش کیا تھا جو یہ ہے :۔

> لاتعداد چھوٹے چھوٹے اجزا یا ذرّے فضا میں بغیر کسی حاجت و ضرورت کے گشت لگا رہے ہیں۔ وہ آپس میں ملتے ہیں اور جدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وصل و فصل کسی بالادست قوت کی وجہ سے نہیں پیش آتا ہے۔ کوئی ضرورت اور وہ دائی حرکت جو ان اجزا کے جوہر کا جزو ہے یہ اجتماع و افتراق پیدا کیا کرتی ہے۔ کائنات میں کسی چیز کی بھی کوئی خاص غرض و غایت نہیں ہے۔ اجزاے لاتیجزے لاانتہا تعداد میں نامتناہی فضا میں ایک غیر محدود وقت کے لیے گشت کر رہے ہیں۔ بدیں وجہ موجود ہوتی ہیں اور معدوم ہوتی ہیں اور نیز موجود ہوتی ہیں اور پھر معدوم ہوتی ہیں۔

اقرارِ وجودِ فاعلِ حقیقی

ذی مقراطیس نے مذکورۂ بالا کلیہ قائم ضرور کیا مگر اس سے طبع انسانی جس کی اُفتاد یوں ہی واقع ہوئی ہے کہ اصلِ اشیا کی بابت تفتیش کرتا رہے، کسی طرح مطمئن نہ ہُوا۔

دوسری رائے انسان کے دل و دماغ میں چند احساس ایسے موجود ہیں جو اگرچہ مبہم تو ہیں مگر نہایت طاقت ور ہیں۔ مثلاً ہر آدمی کے دل میں خود بخود یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ میں کسی ایسی حکمراں اعلیٰ قوت کے ساتھ وابستہ اور اُس کی پناہ میں ہوں جو بالکل پوشیدہ ہے۔ لاجرم اُس کا دل یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس پوشیدہ قوت کو مطلق العنانی حاصل ہے اور یہ اپنے

ارادوں کا ادراک یقینی طور سے رکھتی ہے۔ اس کے بعد وہ اُس قوت کی تصویر اپنے سامنے لانا چاہتا ہے مگر آخرکار ناکامی کی وجہ سے اتنا سمجھ لینے پر قناعت کرتا ہے کہ اس کی نام فہم مثل اگر پوری ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ یہ قوت عقل انسانی کے مشابہ ہوگی۔

بہرحال جب انسان نے یہاں تک خیال قائم کر لیا تو پھر اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگ سکتی تھی کہ یہ گوناگوں مظاہر فطرت بھی اُسی ہاتھ کے مرتب ہیں۔ لہذا وہ ان انتظامات کے قائم کر لینے پر بھی قادر ہے۔

اگرچہ مذکورۂ بالا رسلے انتظام کائنات کا معما ایک حد تک صاف تو ضرور ہو گیا۔ مگر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا مکمل طور سے حل بھی ہو گیا۔ کیونکہ اس حد تک پہنچنے پر ایک دوسرا شبہہ بھی پیدا ہوا، وہ یہ کہ ایک گروہ یہ کہنے لگا کہ مختلف اشیا و اجزائے کائنات کے مختلف فاعل ہیں۔ اس طرح یہ گروہ متعدد معبودوں کا قائل ہو گیا اور اس طرح یہ اس گروہ سے بالکل الگ ہو گئے جو ایک ہی خالق کا قائل تھا۔

اس سے طرفہ تر لطیفہ یہ تھا کہ ایک خدا کے ماننے والے گروہ میں بھی تفریق ہو گئی اور دو گروہ قائم ہو گئے:۔

اول ایک گروہ وہ جو یہ کہتا تھا کہ انسان کی ہرگز یہ قدرت نہ تھی کہ اپنے ارادے سے خداشناس بنجاتا۔ خدا نے خود اپنی کتابیں اور انبیاء بھیجکر اس کی مدد کی ہے۔ یہ لوگ ایمان بالغیب والے کہے جاتے ہیں۔

دوم دوسرا گروہ کتب سماوی و انبیاء کی رسالت کی ضرورت کا منکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کو محض اپنی عقل کی مدد سے پہچانا ہے، اور ہر شخص اسی طرح پہچان سکتا ہے۔ یہ لوگ اہل عقلیت کہلاتے ہیں۔

ان کے خاص عقائد اور بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بے دینی کو ایک بڑی حد تک دخل ہے۔ وہو ہذا:۔

(۱) خدا موجود ضرور ہے مگر نظم عالم کے قیام میں اُس کا کچھ حصّہ نہیں۔

(۲) خدا نے کائنات کو مطلق نیستی کی حالت سے ہست نہیں کیا۔

سلسلۂ حکما

حکیم لیوسیپس، دی مقراطیس، انگزا غورس، مسئلۂ اجزائے لاتیجزّے کے حامی تھے۔

حکیم افلاطون، ارسطو، لائنبز، کنٹ، وحدت الوجود کے قائل تھے۔

ڈولنیڈ، ہنڈال، شیفٹس بری، اہلِ عقلیت سے تھے۔

جرمن فلاسفر اشپینیورا بھی وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس کے اقوال یہ ہیں:-

کُل کائنات میں صرف ایک جوہر طاری و ساری ہے۔ یہی جوہر لا محدود اور حکمراں ہے۔ اسی کو خدا کہتے ہیں۔ دیگر جملہ جواہر جو محدود ہیں، اسی جوہر کے پیدا کیے ہوے ہیں، اور اسی کے جزو ہیں۔ ان جواہر کی ہستی عارضی اور چشم زدن میں گزر جانے والی ہے:

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائدار کا　　چشمک ہے برق کی کہ تبسّم شرار کا

خدا کے دو صفات ہیں۔ عرض و خیال۔ عرض نے تھوڑے تغیر سے اجسام کی شکل اختیار کی ہے اور خیال نے تھوڑے سے تغیر سے نفس کی حالت اختیار کی ہے۔

(باقی آیندہ)

قاضی خادم حسین امیٹھوی وکیل لکھنؤ

شمع سوزاں

نہ پوچھ اے پوچھنے والے فسانے ہجراں کے　　ستارے آسماں کے ہیں شرارے آہ سوزاں کے
مری حالت میں ہیں آثار سب آتش مزاجی کے　　مرے قامت میں ہیں انداز سب سروِ چراغاں کے

مجوسیت سراسر یہ مری شب زندہ داری ہے
جو اشکِ گرم ہیں آتشکدے ہیں سوزِ پنہاں کے

رُخِ خورشید سے روشن ہے محفل روزِ روشن کی
مرے دَم سے چمکتے ہیں سراپردے شبستاں کے

رواں رہتے ہیں آنسو آنکھ سے ہر وقت ہر ساعت
گلستانِ لگن میں ہیں نظارے شبنمستاں کے

کرشمے ہیں فقط یہ برق و باراں جسکو کہتے ہیں
کسی کی آہِ سوزاں کے۔ کسی کی چشمِ گریاں کے

بہت جل جل کے پروانے سحر تک خاک ہوتے ہیں
کئی صدقے اُترتے ہیں مری جلتی ہوئی جاں کے

بُرید و قطع۔ داغ و گُل۔ گداز و سوز پیہم ہیں
عوارض دل ہلا دیتے ہیں میرے جسمِ لرزاں کے

گلِ سوزاں نہیں یہ پھول ہوتے ہیں حقیقت میں
مری حسرت کے، میرے آرزو کے، میرے ارماں کے

بجز سوزِ نہاں اے ہمنفس از من چہ می پُرسی
بہارِ گلشنِ ایجاد از گلخن چہ می پُرسی

بیاضِ صاف ہی فانوس شعلہ ہی زباں میری
لکھی ہے آگ کے حرفوں سے گویا داستاں میری

میں جلتی ہوں کہ خاکستر ہو سرمہ چشمِ عبرت کا
جگا دیں سونے والوں کو یہ شب بیداریاں میری

ضیا سے نورِ قدرت ہیں۔ فروغِ داغِ الفت ہیں
یہ جاں افروزیاں میری یہ خلوت سوزیاں میری

مقدر ہے کہ رو دھو کر گزاروں عمر کی راتیں
فسانہ میرا شیون ہی فغاں ہی داستاں میری

مجھے دیکھو تو پروانوں کے سوزِ نوحہ خوانی میں
مرے پیچھے ہمیشہ گرم ہے بزمِ فغاں میری

ستارے چند ہیں جن پر فلک کو نازِ بیجا ہے
بناتی ہیں زمیں کو آسماں چنگاریاں میری

جو بے حس بیخودی نکلی، تو گونگی خامشی نکلی
نہ یہ ہے رازداں میری۔ نہ وہ ہی ترجماں میری

مجھے حیرت نے بخشی اس قدر آئینہ سامانی
لپک کر دیدۂ جوہر نے لیں حیرانیاں میری

غرض جو کچھ بھی ہوں میرا وجود اک رازِ قدرت ہی
کہ ہیں دلسوزیاں میری سبق آموزیاں میری

نگہ در خوں فشانی ہا نفس در سرگرانی ہا
چہ لطفِ زیستن باشد بدیں ناشادمانی ہا

—— ملک محی الدین احمد قمر (از جموں)

وِمانا

زمانے کی نا قدری یا یوں کہو کہ کم ازکم اُردو زبان کی بے مائگی نے آج بہت سے تاریخی جواہر ریزوں کی چمک دمک ہماری نگاہوں سے اوجھل کر رکھی ہے؛ ان ہی غیر معروف مگر قیمتی سنگریزوں میں وِمانا کا بھی شمار ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے اولوالعزم شخص کی مکمل و مفصل سوانحعمری لکھی جائے۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ ہندوستان کا بہت بڑا شخص گزرا ہے، بلکہ ناظرین کو پند و نصائح کی خوشبوؤں سے معطر و مفرح کرنے کے لیے جب ایک انسان استقلال کے ساتھ کسی کام میں مشغول ہو جاتا ہے تو اُس کے نزدیک حضیض کو اَوج کر دکھانا ایک معمولی کرشمہ ہے؛

ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان کی عام تاریخیں تو درکنار، ہم نے اس وقت تک جو ہندی تاریخیں دیکھی ہیں اُن میں بھی اس مردِ بزرگ کے حالات کہیں خال خال ہی نظر آجاتے ہیں۔

وِمانا اپنے مذہب اور زمانے کے مطابق ایک عالم باعمل تھا۔ اس لیے اُس کا نام اگر ہندوستان کے مذہبی بزرگوں میں شامل کیا جاتا تو مناسب تھا۔ لیکن عام طور پر وہ شاعر کے لقب سے مشہور ہوا۔ کیونکہ نظم لکھنے سے بھی اُس کو خاص ذوق تھا اور اُس کا کلام ہر خاص و عام میں نہایت مقبول تھا؛ وہ مدراس کے شمال میں مشرقی ساحل کے کسی مقام کا باشندہ تھا۔

جس طرح بیربل کا مرز بوم اور وطنِ اصلی کوئی تحقیق کے ساتھ نہیں بتا سکتا اُسی طرح وِمانا کی جائے پیدایش کا صحیح پتہ دینے والا آج کوئی نہیں۔ افسوس ہے کہ اُس کی زندگی کے زیادہ واقعات تاریکی میں ہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا وجود اُس زمانے میں تھا جبکہ شاہجہاں اور اورنگزیب کے عدل و انصاف کے دریا تمام ہندوستان میں لہریں مار رہے تھے۔

مدراس کے قریب دو سو میل شمال و مغرب میں کڈاپا ایک پہاڑی ضلع ہے، اس میں ایک موضع کترا پلی ہے جس کے زیادہ تر باشندے خود کو وِمانا کی اولاد بتاتے ہیں؛ آگے چل کر

معلوم ہوگا کہ یہیں وِماناؔ کے نام کا ایک مندر بھی بنا ہوا ہے اس لیے عام طور پر لوگوں کا خیال ہے اور ایک حد تک سچا خیال ہے کہ اُس کا اصل وطن یہی مقام ہے۔

وِماناؔ، دراوڑ قوم میں کاپو فرقے کا تھا جو شودروں کا نہایت آزاد خیال اور زراعت پیشہ گروہ ہے - یہ لوگ ہندو رسم و رواج کے پابند نہیں بلکہ اکثر اوقات وہ اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں - اُن کے اکثر عادات و اطوار اور طرز معاشرت میں وہی سادگی پائی جاتی ہے جو اُن کے آبا و اجداد کا حصہ تھی۔ اُن کے مذہبی خیالات بھی قریب قریب وہی ہیں جو آرین [illegible] کے سیلاب کے آنے سے پیشتر تھے۔

وِماناؔ کی زندگی کے حالات کسی معتبر ذریعہ سے بہت کم معلوم ہوئے ہیں، لیکن ہندوستان قدرۃً کچھ ایسا ملک واقع ہوا ہے جس میں اکثر فرقے لکیر کے فقیر کے مصداق ہیں؛ دو تین صدیوں کا زمانہ اُن کی معاشرت میں کوئی نمایاں تغیر پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اسکی زندہ مثال میں کاپو فرقہ کو ہی دیکھ لو: اس کی جو شکل آج سے ڈھائی سو سال پیشتر نظر آتی تھی یعنی وہی شکل آج دکھائی پڑتی ہے؛ اُس کی معاشرت، اُس کا تمدن، اُس کے اخلاق و عادات اور اُس کے اطوار اب بھی اپنی اُسی حالت پر قائم ہیں اور اس کے لیے خواہ مخواہ کسی ستم ظریف کا یہ مقولہ دُہرا دینا پڑتا ہے ؎

دیا گر تیل چرخے میں تو اس سے کیا ہوا حضرت   وہی چرخ وہی چوں چوں جو پہلے تھی سو اب بھی

غرض یہ ایسا زبردست وسیلہ ہے جس کے ذریعے سے ہمارے دل کے فوٹوگرافک کیمرے میں وِماناؔ کی معاشرت اور خانگی زندگانی کا ایک اچھا خاصہ عکس ظاہر ہو سکتا ہے۔

کترا پلی، کڈاپا کے جنوب و مشرق میں دامن کوہ میں واقع ہے۔ حدِ میسور کی سطح اسی مقام سے بلند ہونی شروع ہوئی ہے؛ اُس کے چاروں جانب اونچی اونچی چٹانوں اور میناروں اور گنبدوں کی شکل کی پتھریلی قطاریں عجب پر لطف منظر پیش کرتی ہیں۔ انھیں پہاڑوں میں سے ایک چشمہ نہایت آن بان کے ساتھ بل کھاتا ہوا اُس گاؤں کے قریب ہو کر نکلا ہے جس کے ہر دو جانب سبزہ

کا قدرتی مخملی فرش اور زیادہ دلفریب پیدا کرتا ہے، تھوڑے ہی فاصلے پر دو بہت بڑے بڑے تالاب موجود ہیں جن میں موسم باراں میں اتنا پانی جمع ہو جاتا ہے کہ وہ پورے سال کے لیے اُنکے چاول کے کھیتوں کی آب پاشی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ چشمہ اور تالاب کے درمیانی حصے میں کچھ جنگلی پھلوار کے پودے خودبخود اُگ آتے اور اپریل مئی کے مہینوں میں اپنے گلابی و زرد رنگ کے پھولوں سے دیکھنے والوں کی آنکھوں اور دلوں میں عجب لطف پیدا کر دیتے ہیں؛ گاؤں کے اندر باہر املی کے پیڑوں کی بہت افراط ہے؛ کہیں کہیں آم کے باغات بھی نظر آ جاتے ہیں؛ اس گاؤں میں اس وقت زیادہ سے زیادہ ایک سو بیس مکانات ہوں گے اور وہ بھی کچے، جن پر پھوس کے چھپر سایہ کیے ہوئے ہیں؛ غرض ہمارے اس مضمون کے ہیرو کے وطن کا یہ موجودہ زمانے کا اصلی مرقع ہے۔

ومانا کا باپ ایک معمولی کاشتکار تھا لیکن بہ قول "ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات" بچپن ہی سے اُس کی پیشانی سے سنجیدگی اور ذہانت کے آثار نمایاں تھے؛ پھر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ ایک معمولی کسان کا بچہ جو دن بھر بھینسیں چراتا ہو، شام کو غریب باپ کے ساتھ کھیتوں پر جاتا ہو اور رات کے وقت دوسرے گنوار بچّوں کے ساتھ کھیل میں مصروف رہتا ہو، ایک روز بامِ اوج پر پہنچکر اپنی ہمسایہ اقوام کی نگاہوں کو خیرہ کر دے گا اور عرصۂ دراز تک لوگوں میں اپنی یاد قائم رکھے گا۔ لیکن خدا کی شان دیکھو، وہی غریب کسان کا لڑکا کس حالت سے کس رتبے پر پہنچتا ہے؟

ومانا جب کسی قدر بڑا ہوا تو اُس کو گاؤں کے برہمن کے سپرد کیا گیا۔ چونکہ ذہین اور محنتی تھا بہت جلد اتنی قابلیت پیدا کر لی کہ خودبخود بہت کچھ لکھ پڑھ سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس کے بچپن ہی میں کسی خدا رسیدہ نے اُس کے ایک مشہور اُستاد ہونے کی خوشخبری دی تھی؛ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز کترا پلی کے کچھ لڑکے کھیلتے کھیلتے پہاڑ کے ایک غار کے قریب پہنچ گئے، جہاں انھوں نے ایک سِن رسیدہ فقیر کو یادِ الٰہی میں مصروف دیکھا، جو ان کو دیکھ کر بے ساختہ بول اُٹھا "میرے لیے تھوڑا پانی لا دو۔" لڑکے اِدھر اُدھر پانی کا برتن تلاش کرنے لگے؛ فقیر نے کہا "تم محض نادان ہو، جاؤ چھوٹے ومانا کو میرے پاس بھیجدو۔" چنانچہ وہ گئے، اور اُس کو اپنے ہمراہ لے آئے، ومانا اُس وقت بارہ سال کا تھا

لیکن نہایت اطمینان قلب کے ساتھ فقیر کی جانب متوجہ ہوکر کہا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

فقیر:- جاؤ میرے لیے تھوڑا پینے کا پانی لے آؤ۔

یہ سنکر وماناً غار کے اندر گیا اور ریت کے ایک ڈھیر میں سے فقیر کا پانی پینے کا برتن ڈھونڈ نکالا اور فوراً دوڑ کر پانی لے آیا۔ فقیر نے پانی پیا اور وماناً کے سر پر دست شفقت پھیر کر کہا "تم ان سب سے مختلف ہو، جب تم بڑے ہوگے تو اپنے زمانے کے اُستاد اور بڑے عالم ہوگے۔"

کہا جاتا ہے کہ ان الفاظ کا وماناً پر اس قدر اثر ہوا کہ اُسی وقت سے اُس مرد بزرگ کی شاگردی قبول کرلی۔ خدا کسی کی محنت رائگاں نہیں کرتا، کچھ ہی عرصہ میں مذہب و اخلاق کی تمام باتیں سیکھ گیا۔ اُس زمانے میں سائنس جیسی کچھ بھی تھی اُس سے بخوبی واقفیت حاصل کرلی۔

وماناً اگرچہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جس میں بت پرستی رائج تھی، لیکن وہ بذات خود ان سب باتوں کا نہایت مخالف تھا۔ نہ اُس کو بت پرستی سے مطلب اور نہ دوسرے مذہبوں کے دوسرے ہی احکام کا پابند تھا، بلکہ اُس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اُس کی تعلیمات بدھ کی تعلیمات سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ یہ بتانا حقیقتاً بہت مشکل ہے کہ اول اول وماناً نے پبلک کو کیونکر متاثر کیا؟

بلاشبہ آج سے کچھ عرصہ قبل تک سلسلۂ درس و تدریس ایسا عمدہ پیشہ سمجھا جاتا تھا کہ بڑے بڑے وزرا بھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے۔ وماناً بھی اپنے زمانے کا اُستاد ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے علمی سرچشمے سے اپنی قوم کو مستفیض کرنا شروع کیا، مگر اپنے مذہبی خیالات کی بنا پر اپنے ہمسایوں کی زبردست مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اُس کے دوست اور عزیز یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ اُنھیں میں سے ایک گنوار غریب کاشتکار کا لڑکا پبلک اسٹیج پر ظاہر ہوکر اُن سے زیادہ قابل اور عاقل ہونے کا دعوے کرے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے مذہبی علما اور مندروں اور دیوتاؤں کی توہین کرے۔

وماناً نہایت راستباز اور گاؤں کے تمام قصوں جھگڑوں سے علٰحدہ رہتا تھا۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اُس میں خودغرضی کا نام ونشان بھی نہ تھا، بلکہ وہ قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں

لانا چاہتا تھا۔ استقلال و خلوص ہی ایسے دو زبردست آلے ہیں جن سے دنیا کا مشکل سے مشکل کام بھی بغیر کامیابی کے ساتھ ختم ہوے نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ وِمانا کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہوئی اور کیوں نہ ہو اُس کی خانگی زندگی، اُس کا خلوص، اُس کا استقلال، اور اُس کی پارسائی، ایسی نہ تھی جس کو کوئی دیکھے اور متاثر نہ ہو ؎

کرے اخلاص جو یارو اُسی کو پارسا سمجھو

جنوبی ہندوستان کے کاشتکار گو تہذیب کے دائرے میں نہ آسکیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیں نہایت معقول، اسی لیے ومانا کی معقول تعلیمات نے اُن پر جلد اثر کیا، کیوں کہ اُن کو چاروں جانب ومانا کی تعلیمات سے زیادہ معقول تعلیم نظر نہ آتی تھی۔ بہرحال وہ اپنے زمانے کے آخر تک ہندوستان کے ایک بہت بڑے گرو کے جامے میں نظر آنے لگا۔ اُس کی زندگی ہی میں اُس کے پیرو یا چیلے بہت ہوگئے تھے۔

ومانا نے بہت کافی عمر پائی اور مرنے پر اُس کی راکھ نہایت شان و شوکت سے کترا پلی میں دفن کی گئی جہاں اُس کا متھ (مقبرہ) اب بھی اُس اُولوالعزم کی یاد دلا کر دنیا کی ناپائداری ثابت کرتا ہے۔

جگہ جی لگانے کی دُنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

اُس کے مقبرے کے سامنے ہی ایک مندر میں لکڑی کی بنی ہوئی مورت رکھی ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ومانا کی مورت ہے، اُس کے سامنے ہر وقت چراغ جلتا رہتا ہے، اور ہر سال اُس گرو کی یاد میں ایک عظیم الشان میلہ ہوتا ہے؛ اُن اطراف میں اُس کے پیرووں کا ہنوز ایک بہت بڑا فرقہ موجود ہے جو وِمانا ہی کی پرستش کرتا اور اُسی کو خدا مانتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ومانا کے اس سے زیادہ حالات لکھنے سے ہم قاصر ہیں۔ آیندہ مضمون میں ہم اُس کے اقوال و تعلیمات کا کچھ اقتباس ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ انشاءاللہ العلی العظیم۔

بشیر حسین (علیگ) مارہروی

از متھرا

قطعۂ تاریخ انتقالِ پُرملال نواب وقار الملک بہادر مرحوم

طبعزاد منشی منیرالدین احمد اسیونی

ہاتھ پیرِ چرخ کے جور و ستم سے کب تھکے
ہیں وہی اب تک جو تھے بچپن میں اُس کے ہتھکنڈے

گھومتا ہے رات دن کمبخت بس اس کے لیے
اسکو دُکھ پہنچائے کچھ اُسکو کوئی آزار دے

ہے دل آزاری میں بھی اسکو وہ کامل دستگاہ
رنج وہ دیتا ہے جو کافی ہو عالم کے لیے

قوم نے پائی نہ تھی غمہائے سابق سے نجات
لوگ ابھی سرسیدِ مرحوم کو بھولے نہ تھے

محسن الملک اور نذیر احمد کی تازہ یاد تھی
حالی و شبلی کے نقشے تھے نظر کے سامنے

تاک کر ظالم نے پھر مارا وہ تازہ غم کا تیر
ایک زد سے جسکے لاکھوں قلبِ مضطر چھِد گئے

یعنی وہ نوابِ عالی جاہ مشتاق حسین
تھے جو مشہورِ جہاں عزتِ وقار الملک سے

محسن الملک اور سرسید کے تھے وہ جانشیں
قوم کے شیدائی تھے اور دل سے حامی ملک کے

چھوڑ کر روتا ہوا کیا یار کیا اغیار کو
سوئے گلزارِ جناں دُنیا سے وہ راہی ہوئے

دَور میں اس قحطِ انساں کے غنیمت تھا وہ دم
اب کہاں ہوتے ہیں پیدا لوگ ان اوصاف کے

باخرد ذی علم، صاحب حوصلہ، عالی دماغ
دُوربیں، خوش فکر، پُردل اور پکے عزم کے

صاف باطن، نیک خو، شیریں سخن، سادہ مزاج
منکسر، خوش خلق، بے شر، خوش مزاج اور منچلے

مستطیع باسخا ذی مرتبہ عالی نژاد
باوفا بے نفس مہماں دوست پورے قول کے

مظہرِ اخلاص، تصویرِ وفا، گلزارِ خُلق
کوہِ استقلال، بحرِ حلم، دریا فیض کے

شانِ خودداری بھی تھی اُن میں مگر نخوت سے دُور
ہر کہ و مہ سے وہ پیش آئے ہمیشہ خُلق سے

مالِ دنیا بھی اُنھیں حاصل تھا نقدِ دین بھی
بہرہ ور تھے الغرض وہ دولتِ کونین سے

فکرِ دُنیا میں نہ بھولے تھے کبھی اللہ کو
دست در کار اور دل بایار کے مصداق تھے

مظہر اوصاف و اخلاقِ حسن تھے لاکلام　　جس کو کہنا چاہیے انسان وہ انسان تھے
انتہا کا درد وہ رکھتے تھے دل میں قوم کا　　خدمتیں کرتے رہے وہ قوم کی جب تک جیے
اُن کی قومی خدمتوں، ایثارِ نفسی کا اثر　　یہ پڑا تھا غیر بھی تھے اُن کو اپنا جانتے
آن میں اُن کی عیاں تھی شوکتِ ماضی کی شان　　رہ گئے تھے غیر اکثر اُن کا لوہا مان کے
گر نہ ہوتا درمیاں اُس پاک باطن کا قدم　　کھو چکی تھی قوم اِس کالج کو اپنے ہاتھ سے
اُن کی کوشش سے ہوا کالج کی خوبی کو فروغ　　دین کے چرچے بڑھے کالج میں اُنکی ذات سے
درجہ مخدومِ جہاں کا اُسکو حاصل کیوں نہ ہو　　وقف کر دے زندگی اپنی جو اوروں کے لیے
مرتے دم تک خدمتِ قومی کا اُسکو عشق تھا　　قوم کو اب کچھ تو خدمت اُس کی کرنا چاہیے
یادگار اُنکی بنے کوئی یہ ہے تجویز خوب　　متفق اس سے یقیں ہے ہونگے سب چھوٹے بڑے
خوش رہیں عالی نظر میجر حمید اللہ خاں　　جس سخی ابن سخی نے پانچ توڑے دیدیے
بیگمِ بھوپال اور شاہِ دکن والا مقام　　ہند میں ہے رونقِ اسلام جن کی ذات سے
ایک دریائے عطا ہے دوسرا ابحر کرم　　دیر ہے بس لہر کی جب آئی دامن بھر دیے
یادگار ایسی جو ہو از بس مفیدِ روزگار　　پیش اُن فیاض درباروں میں ہونا چاہیے
جنکے ایک ادنیٰ اشارے میں بنینگے لاکھ کام　　یاں ملے گا کیا جو نکلا بھی ہزاروں جیب سے
بارگاہِ کبریا میں مانگ لے دل یہ دُعا　　باغِ جنت میں رہیں مرحوم خوب آرام سے
ہیں جو اُن کے لختِ دل مشتاق احمد نیک خو　　اس غمِ جانکاہ میں اللہ اُنکو صبر دے
اور رتبہ بھی عطا ہو اُن کو اُن کے باپ کا　　وہ چلیں ہر راہ میں نقشِ قدم پر باپ کے

کلکِ محزوں نے سر جاں سے لکھا سالِ وفات
سوے جنت چل بسے افسوس شیدا قوم کے

۱۳۳۵ھ

چالیس ہزار درہم محبت کے معاوضہ میں

محمود درّاق نیشا پور کی سرزمین میں ایک خوش نصیب اور کامیاب شخص تھا، جس نے دُنیا کے حالات اور واقعات کا مطالعہ کرتے ہوئے دولت کا خزانہ سمیٹ کر رئیس اعظم کا لقب حاصل کیا تھا اُس کے مسرت بھرے خیالات زندہ ارمانوں کے ساحل سے ٹکرا کر منہ مانگی مُرادوں کا سفینہ بنے ہوئے تھے اور اُس کی نگاہ میں صفحۂ ارض ایک زریں سمندر کی طرح تھا، جس کی زبردست لہروں نے خوبصورت چراگاہیں اور غلّے کے ذخیرے پیدا کیے تھے۔ تجارتی کاروبار اور زراعتی کارناموں کی وجہ سے دولت قدم قدم پر محمود درّاق کے ساتھ چلتی تھی اور اُس کے ہم جلسوں میں یہ بات ضرب المثل ہوگئی تھی کہ وہ اپنے فرائض کو نہایت محنت اور جاں فشانی سے انجام دیتا ہے۔ مشرقی دنیا میں دولت کی زیادتی انسانوں کو عشق و محبت کے جذبے سے کسی طرح باز نہیں رکھ سکتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ شباب کے ہوتے ہوئے دل کی بھڑکنے والی آگ کو دباتا اور عشق کی قرباں گاہ میں قدم نہ رکھتا۔ وہ ہونہار انسان جس کا دماغ تمام اعلیٰ مقاصد سے لبریز تھا اور فکر برقی پُرزوں کی طرح عظیم الشان کاموں کو ختم کرنے کے لیے دَوڑ رہی تھی۔ اب اُس کو حُسن کی درگاہ میں رئیسانہ غرور کو خیرباد کہہ کر عاجزی اور منت کے سجدے ادا کرنے پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ عشق اور عقل دونوں ایک تماشا گاہ میں پارٹ نہیں کر سکتے لیکن اس میدان میں آکر اُس کی دلی خواہش یہ تھی کہ حُسنِ معاشرت کو ذرہ بھر بھی نقصان نہ پہنچے اور وہ محبت کے صلے میں حقیقی خوشی حاصل کرے۔

ریحانہ جس کا حُسن و جمال بہار کے تازہ پھول کی طرح شاداب تھا، محمود درّاق کی نظر میں تمام دُنیا کی دولت سے زیادہ پیاری تھی۔ اُس کی جوانی کے قالب میں خوبصورتی کے چمکدار درّے

کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ فطرت نے حُسن کے سرمایہ داروں کو دیگر کمالات سے محروم رکھا ہے مگر یہ نازنیں خوبیوں کا مجسم نمونہ تھی۔ شعرگوئی، فن خوشنویسی، بربط نوازی، یہ وہ اوصاف تھے جنھوں نے اُس کی شہرت و ناموری کی داستانوں کو شاہِ ایران محمدؐ طاہر کے کانوں تک پہنچایا تھا اور وہ غائبانہ طور پر ریحانہ کی محبت کا دَم بھرتے تھے۔ اس پری جمال کو بناؤ سنگار سے کبھی فرصت نہ ملتی تھی۔ جب دیکھیے کنگھی چوٹی میں اُلجھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ خدائی بھر کے خوبرویوں میں فائق رہے۔ اور حُسن کی ڈگری لیکر سارے زمانے کے دل فتح کرلے۔ ارادے کی پختگی اور ہمت کے جوش نے اُسکی عملی زندگی کو نہایت شاندار بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتی تھی کہ بناؤ چنا ؤ حُسن میں چار چاند لگادے اور جوانی یا تندرستی کا خون رخساروں سے یوں نمودار ہو جس طرح شام کے وقت نیلگوں آسمان پر شفق کی گلنار موجیں جوشزن ہوتی ہیں حُسن شناس طبایع طبقۂ اناث کی صحت کو انسانی ہستی کا سرچشمہ، اور بناؤ سنگار کو تمام بیاریوں کا علاج تصور کرتی ہیں۔ لہٰذا ریحانہ کا جو وقت اپنی صورت کو دلفریب بنانے میں صرف ہوتا تھا اُس کو قدرتی حکمت سے گہرا تعلق تھا اور دو دوپہر آئینے کا ہاتھ سے نہ چھوٹنا اس بات کی علامت تھی کہ وہ حُسن کی طاقت کو بہت زیادہ دلکش بنائے۔

شاہ ایران نے محمود وزاق کو دولت کی طمع دلائی اور کہا کہ وہ ریحانہ کو شاہی محل میں داخل کردے مگر اُس نے صاف جواب دے دیا۔ اور بڑھی ہوئی محبت کا رشتہ توڑنے میں سو عذر کیے۔ یہ دونوں عرصۂ دراز تک گلچھرّے اُڑاتے رہے مگر آخر کار رفضولخرچیوں کے دور دورے کے ختم ہونے کا وقت قریب آگیا۔ عیش و مسرت کی گھڑیاں گزر گئیں۔ افلاس و غربت نے محمود وراق کی خودداری، آزادی، غیرت پر پانی پھیر دیا اور وہ شاہی دربار میں اس غرض سے حاضر ہوا کہ اپنی محبوبہ کو بادشاہ کے ہاتھ فروخت کر دے۔ محمود وراق کی نیت کو بدلا ہوا دیکھ کر، ٹوٹتے ہوئے دل میں اُمید کی روشنی جلوہ گر ہونے لگی اور محمد طاہر شاہِ ایران کو اس مژدے کے سُننے سے اتنی خوشی حاصل ہوئی جو ایک بہادر جنرل کو کسی ملک کا بڑا حصہ فتح کرلینے سے ہو سکتی ہے۔ کامیابی کی منزل جو بہت

دُور بھی اُس کے قدموں سے آلگی۔ انسانی جذبات میں کوئی چیز ایسی پھرتیلی نہیں ہے جیسے کسی کے انتظار کا زمانہ ہوتا ہے۔ شاہِ ایران کو تو برسوں سے یہ آرزو تھی کہ وہ ریحانہ کی چاند سی صورت کا ہالہ بنے اور اُس کو اپنے شبستانِ عشرت کی زینت بنائے۔ محمودِ ورّاق کی اس درخواست کو فوراً منظور کر لیا اور محبت کا بڑھا ہوا شوق ایک جلیل القدر بادشاہ کو محمودِ ورّاق کے در تک کھینچ لایا۔ ضروری گفتگو کے بعد چالیس ہزار درم ریحانہ کی قیمت ٹھیری، جو اُسی وقت خزانۂ شاہی سے ادا کر دی گئی۔ اس رقم نے پُرانے تعلقات کو دل سے فراموش کرا دیا۔ محمودِ ورّاق کے مُنھ میں پانی بھر آیا۔ وہ خوش ہو کر اندر گیا اور زہرہ جبیں ریحانہ سے یہ کہا کہ "تیری قسمت کا ستارہ بامِ ترقی پر روشن ہونا چاہتا ہے اور تجھ کو بادشاہ چالیس ہزار درم میں خریدتے ہیں۔" یہ جملہ زہر میں بجھا ہوا تیر تھا جس نے ریحانہ کے محبت بھرے دل کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ لگاتار ہچکیوں کی آواز بادشاہ کے کانوں تک پہنچی اور اُنہوں نے ان دونوں کی باتوں کو غور سے سُنا۔

محمودِ ورّاق۔ پیاری ریحانہ، تیرے ہوش و حواس کیوں اُڑے جاتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنے نورانی چہرے کو حسرت آلودہ نہ بنا اور نیا لباس پہن کر بادشاہ کے سامنے چل۔

ریحانہ۔ اے آقا۔ مجھے یہ بتایا جائے کہ چالیس ہزار درم غریب ریحانہ کی قیمت ہیں یا آپ کی آزادی اور شرافت کا معاوضہ؟ کیا ہمارے برسوں کے پیار اور محبت کا یہ انجام ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کی یاد کو دل سے بھلا دیں؟

محمودِ ورّاق۔ تم بیع کے منشا کو قطعی نہیں سمجھیں۔ میری اہم غرض یہ ہے کہ تم کو آرام نصیب ہو اور تجھے مصیبت سے نکل کر راحت کے کھُلے ہوئے میدان میں تازہ ہوا کا لطف اُٹھاؤ۔ میرے پلّے اب ٹکا نہیں ہے۔ افلاس کی بدولت گھر میں چاندنا ہے۔ پس۔ بیع سے تمھارا ذاتی فائدہ مدِّ نظر ہے۔ تم بادشاہ کے محل میں داخل ہو کر افلاس کی بلا سے محفوظ رہو گی۔ تم کو ایسی نعمتوں سے محروم نہ رہنا چاہیے جو خدا عطا کرنا چاہتا ہے۔ اُٹھو اور اُن برکتوں پر خوش ہو جو تمھیں عنقریب ملنے والی ہیں۔"

ریحانہ (نہایت غضبناک لہجے میں) آپ کے قدموں کی قسم، میں نمایشی دولت کی طالب نہیں ہوں۔ آپ مجھے گھر سے جدا نہ کیجیے۔ چالیس ہزار درم کوئی چیز نہیں ہیں، وہ معقول وسائل سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں تمھارے پاس رہ کر ہر طرح کے مصائب جھیلنے کو تیار ہوں۔ رومال اور دریاں بُن کر جائز طریقے سے اتنا روپیہ بآسانی فراہم ہو سکتا ہے، جو ہمیں غربت اور افلاس کے خطروں سے نکال سکے۔ جس طرح تم چالیس ہزار درم لینے کو آمادہ ہو اُسی طرح کفایت شعاری کے لیے سرگرم ہو جاؤ تو فضول خرچی کی عادت ہنستے بولتے رفع ہو سکتی ہے۔ شاہی محل مجھے موت کے غار سے کم نہیں ہے میں ٹوٹے پھوٹے گھر کو دنیا کی تمام آرائشوں پر ترجیح دیتی ہوں۔"

محمود ورّاق۔ اگر یہ باتیں ایک سچے دل سے نکل رہی ہیں تو میں تجھ کو اس وقت آزاد کرتا ہوں اور ساڑھے اُنیس ہزار کے بدلے اپنی منکوحہ بناتا ہوں۔"

بادشاہ، جو باہر تھا اس دردبھری گفتگو کو سُن کر اُس کا جی بھر آیا۔ اور محمود ورّاق کو اپنے سامنے بُلا کر یہ کہا کہ چالیس ہزار درم مفت حاضر ہیں۔ تاکہ دونوں میاں بیوی فارغ البالی سے زندگی بسر کر سکیں!

محمد مبین نازش (بدیونی)

اک بڑی منزلِ پُرخوف و خطر ہے درپیش
رُوح کو عالَمِ بالا کا سفر ہے درپیش

محفلِ حُسن میں سب جمع ہیں خوبانِ جہاں
امتحانِ دلِ اربابِ نظر ہے درپیش

غم یہ تھا پہلے کہ نالوں میں نہیں کیوں تاثیر
وہ جو مضطر ہیں تو اب رنجِ اثر ہے درپیش

اب کہے کوئی کہ ہم اہلِ نظر جائیں کہاں
ہر طرف مسئلۂ عشقِ بصر ہے درپیش

منزلِ بے ہنری میں اُنھیں کرنا ہے مقام
سخت مشکل پےٴ اربابِ ہنر ہے درپیش

ہو جنھیں شوقِ شہادت اُنھیں کیا خوف بھلا
قید کا مرحلۂ نرم اگر ہے درپیش

فکرِ دُنیا کے بکھیڑے بھی غضب ہیں حسرت
ہر دم اک مسئلۂ نفع و ضرر ہے درپیش

حسرت موہانی

ناکام

(سلسلہ کے لیے الناظر ماہ اپریل ملاحظہ ہو)

دوسرا جزو

(۱)

صاحب سجادہ کے عظیم الشان اور وسیع مردانہ مکان میں خدامانِ درگاہ اور مریدانِ عقیدت کیش، ہجوم کیے ہوئے تھے کہ دفعتہً زنانہ مکان سے مردانہ مکان میں آتا ہوا ایک متبرک اور مقدس انسانی مجسمہ نمودار ہوا، جس کی وضع قطع، تراش خراش، کسی حیثیت کو تقدسِ ظاہری کے سانچے میں ڈھالنے سے نہیں چھوڑا گیا تھا۔ ہر ہر قدم پر سرہاے غلاماں سدِ راہ بن رہے تھے اور ہر شخص کی یہی تمنا تھی کہ پہلے ہم دست بوسی کا شرف حاصل کریں، مگر ایسا فخر رکھنے والے معدودے چند تھے جن کی طرف نگاہِ عنایتِ خاص ملتفت ہوتی (جو، عموماً، اگلے پچھلے گناہ معاف کرانے کے لیے کافی سے زیادہ سمجھی جاتی ہے) سو سلاموں پر ایک بار گردن کی جنبش سب کا جواب ہو جاتی۔ کیونکہ ایک گوشت پوست کا انسان جس کے دونوں ہاتھ اس خاص وقت میں وقفِ مریداں ہوں، ہر شخص کے سلام کا جواب، فرداً فرداً، جواب دے، بالکل غیر ممکن ہے۔ خیر ایسے موقعوں کے لیے کچھ عذر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن، اکثر، ایک پیرزادے کے لیے یہی کیا کم وسیع الاخلاقی سمجھی جاتی ہے کہ وہ سلام کے جواب میں سلام کرنے والے کی طرف صرف نگاہ اٹھا دے!

اس کی کیا وجہ ہے؟

ایک ذاتِ واحد کی طرف جب بے شمار ہستیوں کا نیاز ثابت ہوتا ہے تو اس کے دماغ میں رعونت سما جاتی ہے، وہ خوشامد کا عادی ہو جاتا ہے ۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ "انسان کے لیے سب سے زیادہ خطرناک مرض خوشامد کا اچھا معلوم ہوتا ہے" —— پھر ایک پیرزادہ

جو اپنی غیر کسبی خصوصیت پر نازاں ہے (اس خصوصیتِ پیرزادگی کو قانونِ جہالت ایک جائز ورثہ بتاتا ہے) اُس کو خوشامد کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ایسا انسان دنیاوی ضروریات سے عموماً مستغنی ہوتا ہے اس لیے اُس کا دماغ عرش پر ہوتا ہے۔ غلط نہ ہوگا اگر زمانۂ ماضی کے کسی شخصی سلطنت کے بے فکر بادشاہ کے دماغ کو آج کل کے بے مغز پیرزادوں کے دماغ سے تشبیہ دی جائے۔ کیونکہ ان لوگوں کے گردوپیش کے حالات بہت کچھ ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ایسی آنکھیں رکھتے ہیں جو زمانے کے سوشل نشیب و فراز کو ایک سطح مستوی دیکھتی ہیں ان کے کان "جی حضور" کی صدا کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان کا دماغ صحیح نہیں رہ سکتا۔ پھر رفتہ رفتہ اِن دماغوں میں یہ سما جاتا ہے کہ "ہم کچھ بلکہ بہت کچھ ہیں" اور اسی تصور کو اتنی ترقی ہوتی ہے کہ "پدرم سلطان بود" کا راگ وردِ زباں ہو جاتا ہے۔ اگر اس بات کو کوئی شخص نہ سمجھا ہو تو تجربہ کرلے کہ صرف کسی خصوصیت کا کسی دوسرے کی زبانی بار بار دُہرایا جانا تصور اور عقل پر اثر ڈال کے کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

قیصرِ اعظم Julius Caesar کو دیکھیے تو کیا فلسفہ داں تھا۔ اُس نے اپنی واقف کاری سے ایک لسان دشمن کے مقابلے میں کیسا کام لیا۔ اُس نے اپنے گروہ کے لوگوں کو سکھا دیا کہ جہاں کہیں میرے اِس دشمن مقرر کو کسی مضمون پر تقریر کرتے ہوئے پاؤ، اپنے جم غفیر کے ساتھ مجمع سامعین تک پہنچو اور ایک ایک کرکے اُس کو دیوانہ بنانا شروع کر دو اور اُس کی باتوں پر ہنس ہنس کے اُس کو پاگل اور مجنون کہنے لگو۔" اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک ایسا لائق مقرر پاگل ہو گیا جس کی ذات سے قیصر کو بہت بڑا نقصان پہنچنے والا تھا!

اسی طرح اگر کسی شخص کو یکزبان ہو کر چند لوگ کسی خصوصیت کا پتلا بنانا شروع کریں تو اُس کے دماغ پر کیا اثر پڑے گا؟ پھر اگر ایسی تعریف سے کوئی اعتقادی حیثیت بھی شامل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ قوم، ملک، مذہب، اور ہر قسم کے نظام تمدن کو سخت سے سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

اعتقادی حیثیت سے اگر کوئی گروہ سوسائٹی میں ممتاز حیثیت قائم کرلے تو کیا اُس کے یہ معنی

نہیں ہیں کہ وہ ہندوؤں کے نیاز کو جو فطرتاً خدا کی طرف جا رہا ہے، اپنی طرف بٹائے لیتا ہے۔

دنیا میں کوئی شخص روزی کھانے کا مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا تاوقتیکہ وہ ایمان داری اور محنت سے اپنی روزی نہ کماتا ہو۔ لیکن یہ گروہ کا گروہ مفلس قوم کے سر کھاتا ہے! مفلس اور جاہل افراد، جو بے بنیاد اعتقاد کے دام میں گرفتار ہیں، اپنا پیٹ کاٹ کر، اپنی عاقبت اور دُنیا بنانے کی موہوم اُمید پر، اپنی ضروریات کم کر کے، بلکہ قرض لے کر ان لوگوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ اور یہ غیر مستحق کھانے والے ایک غریب کی محنتِ شاقہ سے کمائی ہوئی روٹی کو بیقدری سے کھاتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کی سی بے محنت زندگی پر رشک کر کے بہت سے لوگ ان کے زمرے میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس گروہ کو اور فروغ ہوتا ہے۔ اس مُلک میں بھیک مانگنا ہی پیٹ پالنے کا ایک آسان ذریعہ نہیں ہے، بلکہ خیرات کھانے والے فقیروں سے بھی زیادہ اس مضرِ ترقی گروہ کی جماعت میں شامل ہو جانا بھی پیٹ پالنے کا ایک مجرب علاج ہے۔ بتائیے بتائیے، وہ کون سا مذہب ہے وہ کون سی شریعت ہے جس نے بے محنت روٹی کھانے کو جائز بتایا ہو؟ اور بھیک مانگنے کو یا فقیری لینے کو ایک جائز پیشہ قرار دیا ہو؟ آہ! فرمائیے آپ اہل ہنود پر کس زبان سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تمھارے مذہب کو تمھارے برہمنوں نے تمھارے عالموں نے برباد کر دیا؟ ہندوؤں کے مذہب میں یہ ضروری نہ تھا کہ اگر باپ برہمن بن کر طالب علم بنتا ہے تو اُس کے لڑکے کو مذہباً کشتریوں (اہل سیاست) کے زمرے میں شامل ہونے سے روک دیا جائے۔ یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ کسی کشتری کا لڑکا تجسس علم نہ کر سکے اور برہمن نہ بن سکے۔ لیکن جب برہمنوں نے دیکھا کہ ہم اپنی مذہبی حیثیت اور اقتدار قائم رکھ کر بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ کسی دوسری ذات کا شخص ہمارے زمرے میں نہیں بیٹھ سکتا۔ پھر اُن کی وجاہت وراثتاً اُن کی اولاد پر منتقل ہونا شروع ہوئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اُن کے علما کی اولاد جب ہر طرح مستغنی ہو گئی اور مذہباً احترام ہونے لگا تو انھوں نے اپنی اصل خصوصیت (علم و مذہب کے لیے کوشش) کو چھوڑ دیا۔ مگر اُن کی عزت اُسی طرح باقی ہے۔ افسوس! اب

نکل گیا اور ہم لکیر پیٹ رہے ہیں! ہاں، ہماری قوم میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جس نے ہماری قوم کے جہلا کو اپنا آلۂ کسب معیشت بنا رکھا ہے۔ لوگ جو بڑے بزرگ اور اللہ والے ہوئے ہیں، راہیِ عدم ہوگئے لیکن اُن کی اولاد، جس کو اُن بزرگوں سے کوئی دوسری نسبت نہیں دیجاسکتی اپنے اسلاف کی وجاہت پر اب بھی اپنی عزت کراتی ہے۔

الغرض، ہمیں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اجتماع عظیم موصوف سجادہ نشین کے اُس جدِ بزرگوار کی تاریخ وفات کی سالانہ یادگار ہے جس نے اپنی زندگی اپنے مالک کی مخلوق کو بہتر بنانے کی کوشش میں صرف کردی۔ جس نے تلقین امورِ حقہ میں اپنے ایثار کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر صفحۂ تاریخ پر کم ملتی ہے۔ جس نے اپنے ہم جنسوں کی مدد کرنے میں اپنی جان گنوا دی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے مقدس خون سے خدا کی زمین سینچی گئی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے ہاتھوں نے دُکھتے ہوئے سروں کو دبایا، جس کے بازو کی قوت، اور مشقت کی پیدا کی ہوئی روزی نے کتنے بندگانِ خدا کی بھوک کو سیر کیا۔ گو وہ اس جہان سے چلا گیا لیکن اپنی حرمت اور عزت ہمارے دلوں میں بلکہ تاریخ اخلاق کے صفحے پر چھوڑ گیا۔

کیا یہ اُسی بزرگوار کی ذریت ہے جو ایک عالم کو تسخیر کرکے بے منت و مشقت کی روٹی ایک غریب، جاہل، مُردہ قوم سے حاصل کرکے اپنا بےحیا پیٹ پالتی ہے؟ شرم! شرم!

قصہ مختصر تھوڑی دیر بعد مجمع چھنٹا۔ پیر صاحب (موصوف) نے راجہ سر اُگیر سنگھ بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی اور نواب خان بہادر، مرزا سیف الدین محمد صاحب سے نذر وصول کی۔ پھر بڑے حال و قال کے بعد محفلِ سماع سے اُٹھکر زنانے میں مستورات سے نذریں لینے کے لیے تشریف لیگئے۔

(۲)

"اماں جان، میں آپ کو بہت بڑا الزام دوں گا کہ آپ نے مجھ کو جی جان سے مانوس پاکر اُس کی تربیت ایسے ہاتھوں میں چھوڑدی جو بجز حق تلفی اور غضب کے کچھ نہیں جانتے۔ گو میں تجھ سے بے خبر رہا اور قابلِ الزام ہوں، لیکن جہاں تک آپ کا اس کی تربیت اور تعلیم سے

تعلق ہے۔ آخر، آپ کو کیوں نہ الزام دیا جائے؟ کئی مرتبہ مجھے نجمہ سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اُس کے خیالات کا پورا اندازہ کر لیا۔ وہ جاہلوں میں رہ کر جاہل ہو گئی ہے اور"ان" لوگوں سے اس قدر معتقد ہے کہ خدا و رسول کے بعد انھیں لوگوں کو سمجھتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ! آپ کو معلوم نہیں کہ میرے باپ کو ان لوگوں سے کیسی نفرت تھی؟ اور وہ ان کے اعتقادات کو کس ذلیل نگاہ سے دیکھتے تھے؟ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے شوہر نے ان لوگون کی امن دوست خو کو کہ وہ سجادہ نشیں بنیں، کس طرح رد کر دیا تھا۔ اس لڑکی کی سرشت میں جو اعتقادات راسخ ہو گئے ہیں، تا وقتیکہ وہ اس کے دل سے کلیتہً نکال نہ دیے جائیں، میرے مرحوم باپ کی مرضی پوری نہیں ہو سکتی"۔

سلیم کی ماں نے سکوت کے بعد ایک ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا:۔

"بیٹا، تم سچ کہتے ہو، میرا قصور ہے! میری کمزوری ہے۔ لیکن جو ہوا سو ہوا۔ اب تم اُسی عمدہ اور علمی اصول سے نجمہ کو تعلیم دو اور اُس کے خیالات درست کرو جس سے کام لیکر میرے بھائی اور میرے شوہر نے میری تعلیم و تربیت کی۔ آہ! تمھارے باپ نے کس بات کو سوچ کر تم کو یہاں سے دُور رکھنے کی وصیت کی تھی؟ اگر تم یہاں رہتے تو اپنے چچا کی طرح مفت کی روٹیوں، اور مال و دولت کو دیکھ کر للچا جاتے اور میرے مرحوم شوہر کی امیدوں اور کوششوں پر پانی پڑ جاتا۔ سلیم، تمھارے چچا کو تمھارے باپ نے بہت سمجھایا کہ اس بیکاری کی زندگی کو چھوڑیں، بلکہ انھوں نے ایک حدیث نبوی سنائی تھی کہ خدا اُس سے محبت نہیں کرتا جو کام کاج کے لائق ہو لیکن نہ اپنے لیے کچھ کرے نہ دوسروں کے لیے۔ لیکن شیطان بڑا موذی ہے۔ خیر، خدا تم کو نیکی کی توفیق دے اور حق پر کامیاب کرے"۔

"میں نے نجمہ سے کئی بار گفتگو کی ہے اور اُس کی اصلاح کے لیے کوشش شروع کر دی ہے نجمہ! ذرا میرے پاس آنا۔ میں آج پھر تم کو کچھ سمجھا دوں گا"۔ نجمہ قریب آئی۔

"ہاں تو کل تمھارا کیا سوال تھا، کہ اگر والدین کسی کام کا حکم دیں تو اُس کام کا کرنا

فرض ہے؟ بیشک ایسا ہے۔ لیکن اب ایک بات کا تم جواب دو۔ وہ یہ کہ تم پر خدا کا حق زیادہ ہے یا والدین کا؟"

"خدا کا۔ کیونکہ اصل پیدا کرنے والا وہی ہے"۔

"شاباش! بے شک ایسا ہی ہے۔ تم بڑی سمجھدار ہو۔ پھر۔ اگر خدا کے کسی فرض میں اور والدین کے حکم میں تضاد واقع ہو تو کیا کرنا چاہیے؟"

"خدا کے حکم پر عمل"۔

"بہت ٹھیک! کیونکہ خدا کے احکام بڑی حکمت پر مبنی ہیں۔ والدین بعض وقت خود غرضی یا محبت کے پیچھے بہت غلط حرکات کر بیٹھتے ہیں۔ اب اگر والدین کسی لڑکی کا بلا اُس کی صلاح اور مرضی کے کسی کے ساتھ عقد کر دیں تو کیسا ہے؟"

"اچھا ہے۔ کیونکہ وہ اچھائیاں اور برائیاں دیکھ کے کرتے ہیں"۔

"یہ سچ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھائی عموماً چاہتے ہیں۔ لیکن بہت سے نکاح ایسے ہوتے ہیں جنکے نتائج خدا کی مرضی کے خلاف نکلتے ہیں۔ مثلاً بہت سے لوگ روپے کے لالچ میں لڑکی دیدیتے ہیں، اور اکثر جن باتوں کو والدین اچھا سمجھتے ہیں وہ درحقیقت مذہباً عقلاً ہر طرح بُری ہیں"

"بھائی جان، روپے کے لالچ میں چاہے بُری جگہ کر دیتے ہوں لیکن ایسے تو کسی کے ماں باپ اندھے نہ ہوتے ہونگے کہ عقلاً اور مذہباً بھی نکاح سے بُرائیاں پیدا ہوں اور ماں باپ اُن برائیوں کو اچھائیاں جانیں"۔

"نہیں، ذرا غور کرو۔ نجمہ دیکھو یہاں سے کیسے مزے کی بات پیدا ہوتی ہے۔ فرض کرو، لڑکی اپنے منسوب کے متعلق جانتی ہے کہ مجھ کو بُرے اعمال کے ارتکاب پر مجبور کرے گا تو ایسی صورت میں کہ ماں باپ اُس کے اعمال کو اچھا سمجھتے ہوں (جو دراصل بُرے ہیں) اور اُس کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم دیں، اور بعد نکاح جب مجبوراً وہ لڑکی اُن بُرے اعمال کو کرے تو بے شک وہ اُن اعمال کی سزا خدا سے پانے کے مستحق ہوں گے۔ کیوں کہ اُسنے

جان بوجھ کے ایسا کام (یعنی نکاح) کیا۔ جس سے خدا کے منشا کے خلاف نتیجہ نکلا۔ علاوہ بریں والدین کو ایک ایسی آزادی سلب کرنے کا حق ہی کیا ہے جس کی وجہ سے زن و شوہر اپنے تعلقات باہمی کے ذمہ دار رہ سکتے ہیں؟ جو حق تلفی خدا خود نہیں کرتا، وہ والدین کو اسکی اجازت کب دے گا؟ تمھارے پیغمبرؐ کا قول ہے: "عورت کے حقوق مقدس ہیں، تم دیکھو کہ جو حقوق اُن کو دیے گئے ہیں آیا پورے بھی کردیے گئے؟" جب مردوں کو یہاں تک تنبیہ کردی گئی تو پھر وہ تمھارے حقوق پامال کرنے کے مجاز ہو ہی نہیں سکتے۔

ایک دلچسپ قصہ سنو، جس سے معلوم ہوگا کہ ہمارے نبیؐ حق شناس کی کتنی عزت فرماتے تھے: ایک صحابیہ سے ایک صحابی کو محبت تھی اور وہ اُن کو اپنے عقد میں لینا چاہتے تھے۔ ان صحابی نے نبیؐ کریم سے درخواست کی کہ وہ صحابیۂ موصوفہ سے سفارش کردیں، چنانچہ پیغمبرؐ خدا نے سفارش کی، مگر، تم سمجھو، کہ صحابیہ اپنے حقوق کیسے پہچانتی تھیں! اُنھوں نے جرأت کے ساتھ جواب دے دیا کہ مجھ کو جناب کی سفارش قبول کرنے اور نہ کرنے کا حق (خدا کی دی ہوئی آزادی کی بناپر) حاصل ہے۔! اُنھوں نے بہ ادب تمام اُن کی سفارش کو منظور نہ کیا، اور ہمارے پیغمبرؐ نے حق شناسی کی بناپر اُن سے کوئی بازپُرس نہ کی۔

اب نجمہ، تم ہی انصاف کرو کہ نبی اور رسول کی سفارش سے بڑھ کر ماں باپ کی سفارش نہیں ہے (سفارش بھی ایک قسم کی مرضی ہی ہے) اور والدین کے لیے حکم دینا اس بارے میں روا نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ سفارش کرسکتے ہیں۔ نجمہ، تمھیں نہیں معلوم کہ تمھارے مقدس مذہب نے جنسِ نازک کے لیے بہت سے حقوق چھوڑے ہیں، جنکی نوعیت اور لذت سے تم کلیتہً بے بہرہ رکھی گئی ہو۔ اگر تم لوگ اپنے اُن بھائیوں کی مدد نہ کروگی، جو خداترس اور عملاً حق شناس ہیں، اور تمھارے "مقدس حقوق" جاہل، غاصب اور خودغرض مردوں سے تمھیں واپس دلانے کے لیے کوشاں ہیں، تو یاد رکھو تا قیامت تم خدا کی نعمات سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتیں، اور ہمیشہ خدا کی اُن لعنتوں کی موردبنی رہوگی جو ہمیشہ

کفرانِ نعمت کے عذابِ عظیم بھگتنے والوں پر نازل ہوا کرتی ہیں۔ تم جانتی ہو کہ غلامی پسند گروہ مشکل سے آزاد ہوتا ہے! سمجھ گئیں؟"

نجمہ اس تقریر سے متأثر ہوئی اور اُس کے چہرے پر اب مخالفانہ شکست کے آثار اُنکی فطری خوش طبعی کے پردے میں ظاہر ہونے لگے اور وہ بولی:۔

"جی ہاں، اچھی طرح سمجھ گئی۔ اچھا یہ بتا یئے کہ عرس کے دن آپ نے مجھ کو شاہدہ کے ساتھ درگاہ جانے سے کیوں روکا تھا؟"

"محض اس لیے کہ یہ خدا اور رسول کے منشا کے خلاف ہے۔ مذہبؔ خصوصاً عورتوں کے لیے بہت سلامتی کا راستہ ہے۔ اس قبر پرستی اور بزرگوں سے زیادہ عقیدت رکھنے وغیرہ کے جو نقصانات ہیں وہ تو خیر تھوڑے سے غور کرنے پر سمجھ میں آسکتے ہیں۔ لیکن تمہارے اس جواب میں خاص قول پیغمبرؐ موجود ہے: حضرت ابن عباس سے حدیث مروی ہے کہ 'اللہ قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت کرتا ہے اور اُن لوگوں پر لعنت کرتا ہے جو اُن (قبروں) پر مسجد بناتے اور چراغ رکھتے ہیں' اس حدیث کے دوسرے جزو سے تم سمجھ سکتی ہو کہ ہمارے خاندان والے کس قدر مذہب اور خدا کی مرضی کے خلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح رفتہ رفتہ میں تمکو بہت سی باتیں بتاؤں گا۔"

"بھائی جان، آپ کو بُرا نہ معلوم ہو ——— مجھ کو ——— کچھ ——— اس کہنے سے اطمینان نہیں ہوتا، مَیں اس کو کیا کروں؟"

"نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ پُرانے یقین کے خلاف جو نئی بات معلوم ہوتی ہے وہ اس قدر حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ اُس پر یقین ذرا مشکل سے آتا ہے۔ اس کو تم کیا کرو؟ میں تم کو مطمئن کر دوں گا، بلکہ ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ تم اُس کا ترجمہ دیکھ سکتی ہو۔ میں اس کو عقلی دلیل سے بھی ثابت کرکے تمھارے دل میں راسخ کر دیتا لیکن افسوس ہے کہ تم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا۔ مذہباً تم کو کسی بات کا جتا دینا میرے نزدیک تمھارے لیے

اصلاح کی زیادہ کامیاب صورت ہے۔

نجمہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے سوچا کی پھر بولی" اچھا یہ بتائیے کہ آخر چچا صاحب نے نے بھی پڑھا لکھا ہے، وہ بھی مذہب سے واقف ہیں، پھر وہ خدا رسول کے نفرتیں۔۔۔ کیسے چل سکتے۔

"یہ تو تم خود سمجھ سکتی ہو، فرض کیا تم نماز کو فرض سمجھتی ہو، اُس کے ترک کو بُرا سمجھتی ہو، پھر کبھی ٹال بھی جاتی ہو! آخر جان بوجھ کے تمھارا دل مرتکب گناہ ہونے کو کیوں چاہتا ہے؟ اسی طرح اُن کا بھی دل ہی تو ہے؛ تم دیکھتی ہو کہ موجودہ حالت میں اُن کا کتنا بڑا مفت مالی فائدہ ہوتا ہے؟ اسی لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔

نجمہ پھر کچھ سوچی اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی" اب فقط ایک بات ہی جو میری سمجھ میں نہیں آتی، وہ یہ کہ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی میں درگاہ گئی، مجھپر ایک عجیب ہیبت سی چھا گئی وہاں دل نہ معلوم کیسا معلوم ہونے لگتا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ قبر والے اگر بزرگ نہ ہوں، میں جانتی ہوں، تو یہ بات نہ ہو"

"نجمہ، نجمہ، میں بزرگوں کی بزرگی اور اُن کے مقدس ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ ان بزرگ ہی لوگوں نے ہمیشہ دنیا کے کام کو سنبھالا ہے اور زندگی بھر اپنے ہم جنسوں کو فائدہ پہنچایا۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد جن لوگوں نے اُن کو پوجا وہ لوگ بگڑ گئے۔ اور ان پوجاریوں کو اُن لوگوں نے (اپنا مطلب نکالنے کے لیے) اور گمراہ کیا۔ جنھوں نے اپنے کو بزرگوں کی طرف نسبت دی۔ اور اُس نسبت سے دنیاوی فائدہ اٹھایا۔ دیکھو! ایسے لوگ خدا کے کتنے بڑے مجرم ہیں کہ اپنے وجود کو دنیا کے لیے مضر ثابت کرنے کے ساتھ بزرگوں کو آلۂ تجارت بنا کر کماتے ہیں!

ہیبت طاری ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہاں بزرگوں کی عظمت کا خیال آتا ہے۔ علاوہ اس کے عورتوں کے دل کمزور ہوتے ہیں جن پر ہر جذبے کا اثر جلد ہوتا ہے اسی لیے تم لوگ ضعیف الاعتقاد ہو اور مذہبًا قبر پر جانے سے روک دی گئی ہو، تاکہ تم لوگوں سے ایسی باتوں کے ظاہر ہونے کا خدشہ نہ رہے جن کے مٹانے کو اسلام دنیا میں آیا۔

علاوہ ان وجوہ کے ہیبت معلوم ہونے کی ایک بہت ہی اہم علت ہے، جس کو دریافت کرنا ایک بہت بڑے علم کا کام ہے، جس کو فلسفہ کہتے ہیں - تم صرف یوں سمجھو کہ چونکہ وہاں کی انوکھی آرائش تم نظر اعتقاد سے دیکھتی ہو اور تمھاری ہم عقیدہ بہت سی عورتیں وہاں موجود ہوتی ہیں اس لیے ان کی غیر معمولی تعظیم دیکھ کے تم کئی گونہ زیادہ متاثر ہو جاتی ہو - اور تمھاری طرح اُن میں سے ہر ایک پر اعتقادی قوت و کمزوری کے لحاظ سے کم و بیش اثر پڑتا ہے - بلکہ یہ اثر مجمع کی زیادتی کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے - بس یہی ہے اور کچھ نہیں"

"آپ کی اِن بتائی ہوئی سب باتوں پر غور کر کے شاہدہ کو بھی سمجھاؤں گی - اس وقت میرا جی بہت خوش ہُوا"

"نجمہ، تم اپنی تبلیغ کو اس قدر محدود کیوں رکھو - ان باتوں کو جاننے کے بعد اپنی سب بہنوں کو سمجھانا تمھارا فرض ہے - شاہدہ کی طرح تمھارے خاندان کی بہت سی لڑکیوں کا ایمان اصلاح کا مستحق ہے - تمھارا دل ابھی خوش نہیں ہوا ہے، تمھارے دل کو صرف خوش ہونے کا ذرا سا چسکا پڑ گیا ہے - نجمہ، علم کی لذت یہی ہے کہ ہر نئی بات کے معلوم ہونے پر دل باغ باغ ہو جاتا ہے"

"جی ہاں - واقعی یہ تو بہت دلچسپ چیز ہے!"

"ہاں یہ بات اور بتانے کی ہے کہ تم مَردوں میں سے کسی سے بحث نہ کرنا، بلکہ ان کی بحث سے بھاگنا - ورنہ ان کی چرب زبانی کے آگے تم دب جاؤ گی - مذہبی دلیلیں انھوں نے اپنا خیال درست ثابت کرنے کے لیے پیدا کر لی ہیں - لیکن، قسم خدا کی، ان میں سے کوئی دلیل سلیم الطبع آدمی معقول نہیں سمجھ سکتا - تمھارے لیے صرف اتنی دلیل کافی ہے کہ قبر پرستی سے عامہ مسلمین کی ترقی کو ضرر پہنچتا ہے اور صحت عامہ کے لیے ان خیالات سے جو نقائص اور مضرات پیدا ہوتے ہیں وہ لاتعداد ہیں - تفصیل اس کی یہ ہے کہ گو، ہم لوگ اپنی ذاتی عقل یا واقفیت کی وجہ سے راہ اعتقاد کی اُن منازل تک نہ پہنچیں، جہاں سے تشبّہ مشرکین کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں، مگر جاہل عوام ہماری قائم کی ہوئی مثالوں کو دیکھ کر وہ کچھ کر گزرتے ہیں جن کو ہمارا قانونِ ملت

جائز نہیں کہتا۔ علاوہ اس کے بہت سی اخلاقی بدکاریوں کو اس طرح فروغ دیا جاتا ہے کہ پردۂ اعتقاد بدمعاشوں کے کردار کی سترپوشی کرتا ہے۔ یہ بات بہت کچھ تشریح طلب ہے۔ اور تم سے واقعات چشمدید کا بیان کرنا میری غیرت گوارا نہ کرے گی۔ بہرحال تمہارے مخالفین کے خاموش کرنے کے لیے اسی قدر تقریر کافی ہے۔ گو اُن کی زبان کو کوئی بند نہیں کر سکتا۔ تم سمجھ گئیں؟"

(باقی آئندہ)

اثر، لکھنوی

دلِ بیتاب کی اُس بُت کو خبر ہے کہ نہیں — میری آہوں میں خدا جانے اثر ہے کہ نہیں
بھر دے بھر دے مرے پیمانے کو ساقی بھر دے — دل سے رندوں کے بڑا تیرا جگر ہے کہ نہیں
جسکی رگ رگ میں کھٹک ہو وہ بتائے کیونکر — دردِ دل ہے کہ نہیں دردِ جگر ہے کہ نہیں
نالے سنکر نہ کبھی غیر سے اتنا پوچھا — کہیں پہلو میں کسی اور کا گھر ہے کہ نہیں
سوزِ فرقت کو ہم ارمانوں کے چھینٹے دیں گے — دل کی موجوں سے بھرا دامنِ تر ہے کہ نہیں
نہ سہی دَیر و حرم میں مری حاجت نہ سہی — دونوں عالم میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
دیکھو دیکھو نہ مجھے گھور کے اتنا دیکھو — تم کو غیروں کے اشاروں پہ نظر ہے کہ نہیں
حال ہر ایک کا وہ بزم میں یوں پوچھتے ہیں — اِسکا دل ہے کہ نہیں اُسکا جگر ہے کہ نہیں
غیر کا شکوہ عبث، آہ کا رونا بیکار — راز کہنے کو تری ترچھی نظر ہے کہ نہیں
سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں اغیار تو کیا — دیکھنا یہ ہے کہ پتھر کا جگر ہے کہ نہیں
خوف کیا دفترِ عصیاں کا کرم سے تیرے — رونے دھونے کے لیے دیدۂ تر ہے کہ نہیں
کیوں خدا واسطے اُس بُت کو بُرا کہتے ہو — واعظو کچھ تمھیں اللہ کا ڈر ہے کہ نہیں
تم نڈر ہوکے ستم ڈھاتے ہو میرے دل پر — یہ سمجھتے نہیں اللہ کا گھر ہے کہ نہیں
غیر کے بننے بگڑنے پہ مٹا جاتا ہے — دلِ ناداں تجھے اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں
گنبدِ سبز میں آرام سے سونے والے — اپنے نیّر کی بھی کچھ تجھ کو خبر ہے کہ نہیں

نورالحسن نیّر۔ کاکوروی

نظرے خوش گزرے

اُردو کانفرنس کے اجلاس دوم میں ایک تجویز یہ بھی منظور ہوئی تھی کہ

یہ جلسہ قرار دیتا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت میں زبان اُردو کی ترقی و تقویت کا کام تمام فرقہائے آبادی کی اعانت سے سرانجام دینے کے قابل بنانے کے لیے انجمن ترقی اُردو کو جس پیمانے تک وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی تدابیر سوچنے اور عمل میں لانے کے لیے چند مقتدر اصحاب کی ایک کمیٹی مامور کی جائے اور اُس کو حسب ضرورت اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔"

ایک کمیٹی تقریباً بیس اصحاب کی اُسی وقت بنا دی گئی تھی اور ہمارے دوست پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی اس کمیٹی کے سکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ صاحب موصوف نے گشتی مراسلہ کے ذریعہ ہوا خواہانِ اُردو سے اس مسئلے کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی درخواست کی ہے۔ اس مراسلے میں جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جوائنٹ سکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (انجمن ترقی اُردو جس کا ایک شعبہ ہے) کا مندرجۂ ذیل خط بھی نقل کیا گیا ہے جو صاحبزادے صاحب نے ماہِ گذشتہ میں پنڈت صاحب موصوف کے نام لکھا تھا:-

آفتاب منزل - علی گڈھ ۲۲ فروری ۱۹۱۶ء

مکرمی - تسلیم - آپ کا عنایت نامہ پہنچا - جس میں آپ نے اس گفتگو کا ذکر فرمایا ہے جو اُردو کانفرنس کے متعلق مجھ سے اور حافظ عبدالرحیم صاحب سے ہوئی تھی۔ دو وجہ سے میں اُردو کانفرنس کے قیام کا حامی اور مؤید ہوں۔

(۱) زبان اُردو کی ترقی اور اشاعت اور مقبولیتِ عام کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ جن اصحاب کو اس سے خاص دلچسپی ہے ان کی توجہ اور کوشش کو ایک نظام کی شکل میں بدلے

پیمانے پر لانے کے لیے اُردو کانفرنس کی ضرورت ہے۔

(۲) اُردو کانفرنس کے علٰحدہ قائم ہونے کی حالت میں ہمارے ہندو بھائی اس میں شریک ہو سکتے ہیں اور اس طرح پر ایک بہت بڑے اہم مسئلے کے حل کا راستہ نکلنے کی توقع ہو سکتی ہے۔

ان وجوہ سے میری رائے یہ ہے کہ اگر اُردو کی ترقی کے کام کو اُردو کانفرنس کی شکل میں انجام دیا جائے تو ہر طرح پر مناسب اور ضروری ہے لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اُردو صیغہ ہے اسکے قائم رہنے یا نہ رہنے کے متعلق فیصلہ کانفرنس یا سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس کرسکتی ہے۔ اگر اس کے متعلق تحریک ہو، بحیثیت ایک ممبر کے میں وہی رائے دوں گا جو میں نے اوپر عرض کی ہے۔ اس کی نسبت فیصلہ کرنا ممبران کے اختیار میں ہے۔"

آفتاب احمد

جناب صاحبزادہ صاحب ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کی روح رواں ہیں اور اس بنا پر اُن کی تحریر کو اس مسئلے کے مستقل تصفیے کے لیے راہداری کا پروانہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن جو اصحاب انجمن ترقی اُردو کو کانفرنس کے تحت سے نکال کر ایک جداگانہ ہستی دینا چاہتے ہوں اُنھیں واضح رہے کہ یہ صاحبزادے صاحب کی ذاتی رائے ہے، اور کانفرنس کی مرکزیت کو اس طریق پر جو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اُس کا تحفظ کرنے والی ایک جماعت بھی موجود ہے جس کو رام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

صاحبزادۂ آفتاب احمد خاں صاحب کے متعلق ایک صاحب نے ایک وقت میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ اگر موجودہ انجمن ترقی اُردو نے کانفرنس کے ظلِ عاطفت کو چھوڑ کر ایک آزاد مجلس کی حیثیت اختیار کی تو کانفرنس اپنا شعبہ از سرِ نو قائم کرلے گی۔ معلوم نہیں صاحبزادے صاحب کی یہ رائے تھی یا جو کچھ اُنھوں نے اُس وقت فرمایا تھا وہ بحیثیت جوائنٹ سکرٹری اُن کی زبان سے نکل گیا تھا۔ خدا کرے کہ صاحبزادے صاحب کی طرف سے یہ اعلان کردیا جائے کہ اُن کی پہلی گفتگو کا مفہوم صحیح نہیں سمجھا گیا۔ بہرحال ضرورت اس کی ہے کہ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے اراکین اور دیگر ناموران قوم اس بارے میں پوری فراخدلی اور روشن خیالی سے کام لیں تاکہ خدمت گزاران اُردو متفق و متحد ہو کر

ترقی اُردو کا کام انجام دے سکیں۔

اُردو کانفرنس کے انعقاد سے قبل یہ طے پایا تھا کہ ایک مجلس شوریٰ اس غرض سے منعقد ہو گی کہ آیندہ کے لیے انجمن ترقی اُردو کا پروگرام بنایا جائے، ہم نے اُس موقع کے واسطے "انجمن ترقی اُردو کا نظام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر بعد کو ایک دوست کے مشورے سے اُسے ناتمام چھوڑ دیا۔ کیونکہ جلسۂ شوریٰ کی قلیل فرصت میں کسی مضمون کو پڑھ کر سنانے کی مہلت ملنا دشوار تھی۔ جلسۂ شوریٰ میں جب ہم نے اس بحث کو چھیڑنا چاہا تو افسوس ہے کہ جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب صدر جلسہ نے ہمیں لب کشائی کی اجازت نہیں دی اور چونکہ اصحابِ موجودہ میں سے اکثر حضرات اسی کو کافی سمجھتے تھے کہ اُس جلسے میں انجمن کے قواعد و ضوابط کی کسی قدر اصلاح ہو جائے، مجبوراً ہمیں اس اصولی بحث کو کسی دوسرے موقع کے لیے اُٹھا رکھنا پڑا۔ آیندہ نمبر میں ہم اُس ناتمام مضمون کو ہدیۂ ناظریں کر دیں گے تاکہ اس بارے میں ہمارے خیالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائیں۔

مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ علی گڈھ میں پہلے ۲۵ رمارچ کو طلب کیا گیا۔ بعد ازاں اُسکی تاریخ بدل کر ۱۰ را پریل معیّن ہوئی ہے۔ ۱۰ را پریل ۱۹۱۶ء کے جلسے میں اس بات کی پوری کوشش ہو چکی ہے کہ جن شرائط پر ہندو یونیورسٹی قبول کی گئی ہے اُنھیں کے مطابق مُسلم یونیورسٹی بھی لے لی جائے۔ اور اس میں اس حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی کہ فاونڈیشن کمیٹی نے چار ناچار ہندو یونیورسٹی کے اصول کو منظور کر لیا۔ مگر ناخدایانِ علی گڈھ اس پر بھی راضی نہیں ہو سکتے لہٰذا اس جلسے میں اُن استثنائی قیود کو بھی اُٹھا دینے کی فکر ہو گی جو لکھنؤ کے جلسے نے عائد کیے تھے۔ مسلم یونیورسٹی جب تک عالمِ خیال میں رہی نہایت دل خوش کن معلوم ہوتی تھی، اگرچہ جس وقت سے کہ اُسے عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد شروع ہوئی قدم قدم پر ایسی مشکلات حائل ہوتی رہی ہیں کہ اب یہ باور کرنے کے پورے وجوہ موجود ہیں کہ اگر مسلم یونیورسٹی عجلت میں لے لی گئی تو وہ قوم کے لیے ایک بے سود سی شے ہو گی۔

ایسی صورت میں تآل اندیشی اور انجام بینی تو اس کی مقتضی تھی کہ اس مسئلہ کو موجودہ پیچیدگیوں کے زمانے میں علی حالہٖ رہنے دیا جائے اور بعد اختتام جنگ جب ہمیں پوری آزادی اور قوت کے ساتھ آئینی جدوجہد کا موقع حاصل ہو جائے تب اس بارے میں قوم کے مطالبات کو از سر نو پیش کر کے حصول مدعا کی کوشش شروع کی جائے۔ اسی خیال کی بنا پر مسٹر محمد علی نے اپنے گوشۂ مجبوری سے یہ تجویز آنریری سکرٹری صاحب کی خدمت میں بھیجی ہے کہ تا اختتام جنگ مسلم یونیورسٹی کا تصفیہ ملتوی رکھا جائے۔ یہ تجویز نہایت مناسب اور بالکل باموقع ہے اور خداوند کریم سے دعا ہے کہ بزرگان ملت کو اس کی طرف جیسی چاہیے توجہ ہو، تاکہ اطمینان و سکون کی حالت میں قوم کو انتہائی جدوجہد کا موقع ملے۔ لیکن ایسی صورت میں کہ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے جلسۂ یونیورسٹی ایسوسی ایشن میں اسی قسم کی ایک تجویز رد کر دی گئی اور گذشتہ سال فاونڈیشن کمیٹی کے جلسے میں بھی جب یہ خیال ظاہر کیا گیا تو اسے حسن قبول حاصل نہ ہو سکا۔ بہت کم اسکی توقع ہو سکتی ہے کہ علی گڈھ میں بیٹھ کر اس مشورے پر عملدرآمد ہو۔ بہرحال ہمارا تو عقیدہ ہے کہ جب تک کوئی امر واقع نہ ہو جائے جدوجہد سے غافل نہ رہنا چاہیے۔ لہذا بزرگان علی گڈھ سے ایک دفعہ پھر کہنا چاہیے اور پوری قوت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی تعجیل سے قوم کی چہل سالہ کوششوں پر پانی نہ پھیریں اور یا تو اس بات پر پورے اعتماد و استقلال کے ساتھ جم جائیں کہ ہم وہی چیز لینگے جسکی ہمیں ضرورت ہے اور جو ہمارے درماں کی دوا بن سکتی ہے۔ اور صاف کہدیں کہ ہم وہ نہیں لینا چاہتے جو حقیقتاً ہمارے پیش نظر نہیں اور جس سے ہمارا مقصد اعظم فوت ہو جائے گا۔ یا شرست خاموشی اختیار کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

ہمارے دوست مسٹر "ناظر" کا ایک ڈراما "زود پشیماں" کے نام سے سال گذشتہ شایع ہو چکا ہے اور اگرچہ جیسی خواہش تھی ارباب ذوق نے اُس کے متعلق توجہ کے ساتھ اظہار خیال نہیں فرمایا تاہم توقع کے مطابق اکثر حضرات نے اسے پسند کیا۔ اور بعض احباب کی یہ خواہش بھی ہوئی کہ اسے کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ چنانچہ امید ہے کہ جلد اس خواہش کی تعمیل ہو سکے گی۔

"بد سرشت" کے نام سے دوسرا ڈراما مسٹر موصوف نے لکھا ہے جو اس پرچے کے ساتھ بصورت

کتاب شایع کیا جا رہا ہے تاکہ آیندہ چل کر علحدہ کتاب چھاپنے کی زحمت نہ رہے۔ ڈراما کے مکمل ہو جانے پر سرِ رق اُن اصحاب کی خدمت میں بھیجدیا جائے گا جو اس کی خواہش فرمائیں گے۔

برادرِ محترم کی خبرِ وفات پر تعزیتی تحریروں کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ دلی خواہش کے باوجود ہم وقت پر ہر تحریر کی رسید نہیں لکھ سکتے اور نہ اپنے کرم فرماؤں کا فوراً شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔ اسی لیے الناظر کی وساطت سے پھر اپنے ہمدرد و دل سوز احباب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جواب نہ بھیجے جانے کو ناحبت شناسی یا بے التفاتی پر محمول نہ فرمائیں گے۔ چند مزید قطعات تاریخ بھی وصول ہوئے ہیں جو دلی احسان مندی کے ساتھ درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(۱) از منشی عبد الرحیم خوشنویس لکھنؤ

نخبۂ آلِ ساقیِ کوثر — سیدِ اذکیا سخاوت علی
گفتہ لبیک داعیِ حق را — ہمہ طوع و رضا سخاوت علی
فجاۃً رہ نوردِ عقبیٰ شد* — از جہانِ فنا سخاوت علی
از تکالیف و کربِ نزعِ رواں — رستگار آمدہ سخاوت علی
ہمہ تن نیکذات و خوشخو بود — صافدل بے ریا سخاوت علی
در صفات و کمالِ انسانی — بے مثال آمدہ سخاوت علی
کانِ حلم و حیا و مہر و وفا — دُرِ بحرِ صفا سخاوت علی
با نعیمٍ مُقیم در جنت — یافت فضلِ خدا سخاوت علی
شد و مدعو بہ نہرِ کوثرِ خاص — بحرِ جود و سخا سخاوت علی
بہرِ تاریخِ آں رئیسِ جناں — زبدۂ اسخیا سخاوت علی
درِ بابِ بہشت گیر و بگوے — بجناں آمدہ سخاوت علی

۲ — ۱۰۶ — ۵۰ — ۷۷ — ۱۱

۱۳۳۵ھ

---

* مرگ مفاجات نہ تھی بلکہ مرحوم پہلے سے کسی قدر علیل تھے۔ اور انتقال سے چند گھنٹے قبل خطرناک تغیر نمودار ہو گیا تھا۔ ایڈیٹر۔

(۲) از منشی سید محمد عسکری وسیم مہتمم گلچین

وہ گلِ با فیض جو مرجھا گیا — کیسی ہوا باغِ جہاں میں چلی
داغ بدل آج ہے ہر ایک پھول — باغ میں دل بستہ ہو جو ہے کلی
چاک جگر غم سے ہے اب لکھنؤ — خاک نشاں لکھنؤ کی ہر گلی
جائے گی افسردگیِ غم کہاں — ہے یہ مرے خانۂ دل کی پلی
حشر جو آئے گا تو جانوں گا میں — دوپہر اس روز سیہ کی ڈھلی
جودِ علی مہرِ علی اُن میں تھی — سید علوی تھے وہ حق کے ولی
آنکھیں جنھیں ڈھونڈھتی ہیں اے وسیم — آہ کہاں ہیں وہ سخاوت علی
تھے لبِ دریا جو سکونت گزیں — خلد مکاں ہیں وہ سخاوت علی ۱۳۴۵ھ
آنکھیں جنھیں ڈھونڈھتی ہیں اے وسیم — آہ کہاں ہیں وہ سخاوت علی ۱۳۴۵ھ

(۳) از منشی ارتضیٰ علی شرر کاکوروی

چھڑایا ہم سے سخاوت کو نوجوانی میں — ذرا بھی رحم نہ آیا قضا نے عجلت کی
ہائے دیتی ہے دل آہ بیوۂ ناشاد — یتیم کرتے ہیں فریاد کس قیامت کی
غضب ہے سوگ میں بھائی کے مضطر اسحاق — عجیب حالتِ غمناک ہے شفاعت کی
سقر سے بڑھ کے یہ دنیا ہے غمزدوں کیلیے — اگرچہ لی ہے سخاوت نے راہ جنت کی
شرر کو فکر تھی تاریخ کی ندا آئی — کہ - آہ آہ سخاوت علی نے رحلت کی ۱۹۲۶ع
زیرِ خاک است سخاوت در خواب — بر سرش سایۂ رحمت باشد
بہر تاریخ شرر می گوید — جنتی نیک سخاوت باشد
وطن میں سخاوت علی کا ہے سوگ — ملنسار رہا نوجواں نیک بخت ۱۹۲۶ع
شرر فکرِ تاریخِ رحلت ہے آج — لکھو - ماتمِ نوجواں مرگِ سخت ۱۹۲۶ع

؎ مراد از ایڈیٹر الناظر۔

بدسرشت

اشخاصِ ڈراما

چودھری محسن حسین - کریم نگر کے رئیس
چودھرائن - ان کی بیوی
بیگم انصاری - آنریبل قاسم علی انصاری بیرسٹر کی بیوی
محمد اکرم - محسن حسین کے سابق بہنوئی
محمود - اکرم کا لڑکا، بیرسٹر
عزیز - چودھرائن کا بھتیجا، کالج میں پروفیسر
اُلفت آرا - چودھری محسن حسین کی لڑکی
زینت آرا - اس کی چچازاد بہن -
سعید، اعجاز، مہدی حسن، اسمٰعیل، میر صاحب، فخرالدین، مرزا صاحب، پنڈت جی، نفیسن وغیرہ

ایکٹ اوّل

سین (۱)

(چودھری محسن حسین کی محلسرا - اُلفت آرا کے کمرے میں بیگم انصاری بیٹھی ہیں)

بیگم انصاری - اوہو، تم نے ماشاءاللہ انگریزی میں تو اچھی خاصی لیاقت پیدا کرلی - خدا نظرِ بد سے بچائے - یہاں کی مسلمان عورتوں میں سوا تمھارے اور تعلیم یافتہ ہئی کون ہے -

اُلفت آرا - تو بیگم صاحب اس میں میری کیا تعریف، اوروں کو کوئی اچھا پڑھانے والا نہیں ملتا -

مجھے تو جو کچھ آیا سب مس جانسن کی بدولت آیا۔

بیگم - میں کیا کہوں، مجھے ان مشنری لیڈیوں سے ایک طرح کی نفرت ہوگئی ہے، یہ کیا اس لائق ہوتی ہیں کہ ہمارے گھرانوں میں آنے پائیں۔ لیکن یہ مس جانسن تمھیں واقعی ایک فرشتہ مل گئی ہیں۔ بالکل مشنری معلوم ہی نہیں ہوتیں -

الفت - جی ہاں، میرے واسطے تو میاں جان نے بہت سی میمیں رکھیں، لیکن ان کی ایسی کوئی نہ ملی کہنے کو تو یہاں کالج میں ایک سے ایک لائق میمیں ہیں، لیکن میں سب کو دیکھ چکی ہوں -

بیگم - خیر، انگریزی، حساب، جغرافیہ یہ چیزیں تو تمھیں آہی گئی ہوں گی۔ لیکن کہیں اُردو تو تم نہیں بھول گئیں؟ میں نے بہت سی لڑکیوں کو دیکھا ہے کہ انگریزی میں پڑکر اپنی اُردو چوپٹ کر دیتی ہیں۔

الفت (مسکرا کر) جی نہیں، کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔ اُردو پر تو میاں جان کی اور زیادہ تاکید رہتی ہے۔

بیگم - بیٹی، بہت دنوں سے تمھارا ہارمونیم نہیں سُنا، تم تو ماشاء اللہ پیانو، ستار، بیلا، سب ہی کچھ بجا لیتی ہو، لیکن مجھے اپنا وہی پُرانا ہارمونیم پسند ہے۔ اس وقت کچھ سُناتیں تو اچھا تھا۔

الفت - جی، اچھا۔ ایک تازہ غزل یاد کی ہے، وہ سناتی ہوں۔

بیگم - یہ تمھاری والدہ اُٹھ کر کہاں چلی گئیں۔ اُنھیں آ لینے دو نہ؟

الفت - وہ آ جائیں گی، جب تک آپ ہی کو سُناتی ہوں - [گاتی ہے]

نہ پوچھو کہ کیا چشمِ تر ڈھونڈھتی ہے ۔۔۔ بس اک جذبِ دل کا اثر ڈھونڈھتی ہے

نہ گُل سے غرض کچھ نہ بُلبل سے اُسکو ۔۔۔ خدا جانے کیا یہ نظر ڈھونڈھتی ہے

وہ مدت ہوئی مل چکے ہیں عدو سے ۔۔۔ مری آہ اب تک اثر ڈھونڈھتی ہے

یہ کیا جانے، ہے زندگی بھی جبھی تک ۔۔۔ شبِ غم، نشانِ سحر ڈھونڈھتی ہے

تمنا کہ ہے یاس و حسرت پہ غالب ۔۔۔ ابھی تک دُعا میں اثر ڈھونڈھتی ہے

نگاہِ کرم اُس ستمگر کی، ناظر ۔۔۔ فقط آپ کی چشمِ تر ڈھونڈھتی ہے

بیگم - ماشاء اللہ، خوب سُنایا۔ غزل بھی خوب تھی، اور تم نے ادا بھی خوب کی۔ [والدۂ الفت آتی ہیں]

آئیے ، چودھرائن صاحب ، یہ آپ اُٹھ کر کہاں چلی گئی تھیں۔ یہاں ایک بڑی مزے دار غزل ہو رہی تھی
چودھرائن - بھینا، میرے دن اب غزل وزل سننے کے نہیں - یہ دن ان لڑکیوں کے ہیں ، اور ہاں ماشاء اللہ آپ لوگ سُنیں۔ میں کمبخت کہاں سے سنوں، دن رات جی جلا کرتا ہے۔
بیگم - کیوں خیر تو ہے ؟ یہ آج آپ اتنی اُداس کیوں ہیں ؟
چودھرائن - اللہ محمود کے باپ کو سلامت رکھے ، روز ہی میری قسمت میں جلنا ہے۔
بیگم - محمود کے باپ کون ؟ اچھا میں سمجھی ، آپ کے نندوئی ، اکرم صاحب - وہ تو اللہ رکھے ہماری الفت آرا کے سسرے ہونے والے ہیں۔ [الفت اُٹھ کر چلی جاتی ہے]
چودھرائن - جی ہاں، اُنھیں پر اللہ کی سنوار ایسی ہے ، کہ روز ایک نیا اُشغلہ چھوڑتے ہیں۔ دیکھا چاہیے میری اُلفت کا نباہ اُن کے یہاں کیسے ہوتا ہے۔
بیگم - اچھا ، تو اُنھوں نے کیا کیا ؟
چودھرائن - ارے بہن ، میں اپنی زبان سے کیا کہوں ، وہی مثل ہے کہ اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے - دیکھا چاہیے اس خاندان کی تقدیر میں کیا لکھا ہے (آبدیدہ ہو کر) ایک ناک کٹنا باقی تھی وہ بھی دن آ گیا ، اب دشمنوں کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی -
بیگم - ہاں چودھرائن صاحب کہتی تو آپ سچ ہیں - آپ کے نندوئی کی وجہ سے آپ کا گھر سارے شہر میں بدنام ہو رہا ہے - میں تو جانتی ہوں کوئی گھر ایسا نہیں ، جہاں تحصیلدار صاحب کے قصے مشہور نہ ہوں - مگر یہ تو کہیے ، نئی بات کیا ہوئی ؟
چودھرائن - وہ وہی جو آج تک کبھی نہیں ہوئی تھی - بڑی بھاوج کا سن آپکے نزدیک کیا ہو گا ؟
بیگم - پچاس سے کیا کم ہو گا ؟ اور یوں دیکھنے میں تو وہ ساٹھ کی معلوم ہوتی ہیں -
چودھرائن - بھلا اب یہ سن اُن کی دوسری شادی کرنے کا ہے -
بیگم - تو کیا کسی پاگل نے اُنھیں دوسرے نکاح کی صلاح دی ہے -
چودھرائن - صلاح مشورہ کیسا ؟ ڈنکے کی چوٹ ، اصل خیر سے پورا پیغام آیا ہے - چولھے میں جائے

ایسی کمبخت شوقینی اور آگ لگے ایسی طمع کو۔

بیگم۔ میں کہتی ہوں، تحصیلدار صاحب کا دماغ تو نہیں ٹل گیا ہے۔ خود کا یہ سن کہ کئی برس ہوئے پنشن لے چکے۔ ابھی خاصی بیوی موجود، اولادیں ایک نہیں چار چار، اور اس پر آپ کی بھابھی جان کو یہ پیغام! مجھے تو یقین نہیں آتا۔

چودھرائن۔ لیجیے یہ خط خود پڑھ لیجیے۔

بیگم۔ (خط پڑھ کر) یہ تو واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔

چودھرائن۔ پاگل کیسے، یہ کہو طمع کا پاگل پن ہے۔ بڑی بھاوج کو بیوہ ہوئے چودہ برس ہو گئے۔ تب نہ کسی نے پھوٹے منھ سے پیغام دیا۔ اب اتنے دنوں بعد جب بھاوج سے مقدمہ لڑ کے اُنھیں جائداد ملی ہے، تو لوگوں کو نکاح کی سوجھنے لگی۔ یہ اچھی خاصی خود غرضی ہے۔ اسے پاگل پن نہیں کہتے۔

بیگم۔ توبہ۔ ایسا بھی کیا لالچ، کہ آدمی بالکل اندھا ہو جائے۔ ہائے! مجھے آپ کی بھابھی جان پر کیسا ترس آتا ہے، وہ بیچاری کیسی نیک بیوی ہیں۔ انھوں نے یہ سُن کر کچھ کہا؟

چودھرائن۔ کہتیں کیا، برابر آنسوؤں کا تار جاری ہے۔ صبح سے کھانا پینا سب موقوف۔ میں ابھی اُٹھ کر اُنھیں کے پاس تو گئی تھی۔

بیگم۔ بے شک اُن کے صدمے کی بات ہے۔ [ایک خواص آکر کہتی ہے "بیگم صاحبہ آپ کا موٹر آگیا ہے، آپ کے صاحب بھی اس پر ہیں"]
[اُٹھتی ہیں] اچھا بہن، تو اب پھر ملاقات ہو گی۔

چودھرائن۔ خدا حافظ، بچوں کو میری طرف سے پیار۔ [بیگم جاتی ہیں، الفت آرا اور زینت آرا داخل ہوتی ہیں]

الفت۔ باجی، کیا بیگم انصاری چلی گئیں؟

چودھرائن۔ ہاں، ابھی تو چلی جا رہی ہیں۔ [جاتی ہیں]

زینت۔ میں کہتی ہوں پھوپھا کو یہ کچھ خبط ہو گیا ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک حرکت کر گزرے۔

الفت۔ اُنھیں خبط کچھ آج سے ہے، میں تو ہمیشہ سے اُن کی یہی حرکتیں دیکھتی آئی ہوں۔

زینت۔ لیکن آپا، یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔ آپ کو اُنھیں کے یہاں گزر کرنا ہے، کیسے نباہ ہوگا۔

الفت - آخر وہ بھی تو انسان ہی ہوں گے، جنھیں خدا دوزخ میں ڈالے گا۔ مَیں یہ سمجھی بیٹھی ہوں کہ دنیا ہی میں مجھے دوزخ کا مزا حاصل ہو جائے گا۔

زینت - اے نوج آپا یہ کیا باتیں ہیں۔ دوزخ میں جائیں تمھارے دشمن مدعی۔ وہ تو کہیے محمود بھائی کا مزاج بہت اچھا ہے۔ آپ کو اُنھیں کی خوشی سے کام۔ کسی کے سُسرے ہمیشہ بیٹھے تھوڑے رہتے ہیں۔ اصل سابقہ میاں بیوی کا ہوتا ہے۔

الفت - تم تعریف کرو، مجھے تو کوئی فرق نہیں نظر آتا۔

زینت - نہیں آپا، یہ تو نہ کہو۔ کہاں محمود بھائی اور کہاں پھوپھا۔ دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پھوپھا کے لڑکے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ سب لوگ تعریف کرتے ہیں۔

الفت - تمھیں نہ معلوم ہوتے ہوں گے، لیکن جس کا سابقہ پڑنے والا ہے اُسے تو پوری طرح معلوم ہے۔ بس فرق صرف اس بات کا ہے کہ باپ کی اتنی کَٹ کَٹ مزاج میں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے بدمزاجی ابھی مشہور نہیں ہوئی ہے۔

زینت - ہاں تو آپ کو اُن کا حال زیادہ معلوم ہے، شاید ایسا ہی ہو۔ اور آپ تو آدمی کو قافیہ سے ـــــ اے توبہ میرے مُنھ سے ہمیشہ غلط نکلتا ہے ـــــ قیافے سے پہچان لیتی ہیں۔ لیکن ماشاءاللہ آج کل کما خوب رہے ہیں۔ بیرسٹری خوب چل رہی ہے۔

الفت - ہوگی کوئی پانچ چھ سَو کی آمدنی؟

زینت - پھوپھا تو اپنی زبان سے ہزار ڈیڑھ ہزار اُڑا رہے تھے، لیکن اُس روز خود محمود بھائی اپنی ڈائری دکھا رہے تھے، اُس میں ۶ - ۷ سو ماہوار کا اوسط لکھا ہوا تھا۔

الفت - خدا کسی کو اتنا احمق نہ بنائے۔ آدمی جھوٹ بھی بولے تو ذرا عقل کے ساتھ۔ کسی بچے کی عقل میں بھی یہ بات آئے گی کہ جو شخص آزادی کے ساتھ اتنا کما رہا ہو وہ سَو سَوا سَو کی نوکری کے لیے دفتر والوں کو رشوت دیتا پھرے گا۔

زینت - ہاں یہ تو میں نے بھی سُنا ہے، کہ محمود بھائی کو کہیں کی منصفی مل رہی ہے۔

الفت ۔ "مل رہی ہے" کی خوب کہی ۔ یہ نہیں کہتیں کہ مدت سے اس کے لیے جان دی جا رہی ہے ۔ درخواست پر میاں جان سے سفارش لکھوائی ۔ دفتر میں جا جا کر رشوتیں دیں ۔ یہ سب حال تو میں سُن چکی ہوں ، اور پھر مجھی سے یہ پردہ ۔

زینت ۔ کیا منصفی کی تنخواہ سَوا سَو سے شروع ہوتی ہے ؟

الفت ۔ اور نہیں کیا تم ہزار دو ہزار سمجھ رہی تھیں ؟

زینت ۔ بھئی حد کر دی پھوپھانے ۔ میں کہتی ہوں کہ ہر وقت تو یہ تسبیح ہاتھ میں لیے رہتے ہیں ، یہ ان سے اتنا جھوٹ بولا کیسے جاتا ہے ؟

الفت ۔ سارا الزام اکیلے پھوپھا پر ! اور جسکی ڈائری میں تم جھوٹی تحریر دیکھ چکی ہو اُس کا ذکر ہی نہیں ۔

زینت ۔ بھئی ہوگا ۔ ہاں پرسوں کا تماشہ تو تم نے دیکھا ہی نہیں ۔ عزیز بھائی اور محمود بھائی میں باتیں ہو رہی تھیں ۔

الفت ۔ کیا ؟

زینت ۔ میری سمجھ میں پوری طرح تو آیا نہیں ، آپ ہوتیں تو پوری طرح سمجھتیں ۔ محمود بھائی اندر بیٹھے کسی انگریز کا نام لے رہے تھے ، گرویس یا کیا ۔ ۔ ۔ ۔

الفت ۔ پروفیسر مارگویس کہا ہوگا ۔

زینت ۔ ہاں ہاں یہی نام لیا تھا ۔ تو وہ اسی کو کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کا بڑا دشمن ہے ۔ اتنے میں عزیز بھائی نے پوچھا کہ کس کتاب میں اور کیا اُس نے مسلمانوں کے خلاف لکھا ہے ۔ محمود بھائی سے اس کا کچھ جواب نہ بن پڑا ۔ تب عزیز بھائی نے پوچھا کہ یہ ہے کون شخص ، اور اس نے کون کون کتابیں لکھی ہیں ۔ محمود بھائی اتنا بھی نہ بتا پائے ۔ اس پر ہم سب ہنسنے لگے ، بیچارے جھینپ کے رہ گئے ۔

الفت ۔ بھلا عزیز بھائی کے سامنے کوئی علمی بات کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ ولایت کی سیر کر آنے اور انگریزی ٹوپی پہن لینے سے کسی کو قابلیت تو آ نہیں جاتی ۔

زینت ۔ عزیز بھائی کی لیاقت کی تو سب لوگ تعریف کرتے ہیں ۔

الفت - وہ انگریز تو اُن کا بڑا دوست ہے - لندن کی رائل اسٹاریکل سوسائٹی کا پریسیڈنٹ ہے۔ اُسی نے تو عزیز بھائی کو اُس سوسائٹی کا ممبر بنایا ہے -

زینت - دوستی تو صرف کتابوں کے ذریعے سے ہوگی، عزیز بھائی ولایت تو کبھی گئے نہیں۔ (دیکھ کر گھڑی دیکھ کر) آج کہیں چلنا ہے؟ کچھ یاد ہے؟

الفت - خوب یاد دلایا - بیچاری نے کس محبت سے بُلایا تھا - نرگس، جلدی گاڑی تیار کرنے کے لیے کہو - [دونوں جاتی ہیں] پردہ گرتا ہے -

---

سین (۲)

[محمد اکرم اپنے کمرے میں]

اکرم (تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے اور ٹہل ٹہل کر) نالائق، بیہودہ، کمبخت، گردن زدنی، میرے ہر کام میں رخنہ اندازی - کوئی اس ملعون سے پوچھے کہ اگر میں نے مہدی حسن کی بیوہ کو پیغامِ عقد دیا تو تیرا اس میں کیا بگڑتا تھا - تو آخر اُس کو کون بھڑکانے والا تھا - بدنامی نیکنامی جو کچھ ہوتی میری ہوتی، تجھ کو کیا مطلب تھا - کچھ آخر میں تیرے باپ کی جائداد تو چھین نہیں رہا تھا - اچھا خاصہ شکار میرے ہاتھ سے آکر نکل گیا - لیکن دیکھ تو محسن حسین، میں بھی تجھ کو کیسا ٹھیک بناتا ہوں - تو نے مجھے سمجھا کیا ہے - تو نے جیسا مجھے نقصان پہنچایا ہے، نہ اُس کا دس گنا نقصان تجھے پہنچا دیا ہو تو محمد اکرم میرا نام نہیں - میں نے تیس برس تک تحصیلداری کی ہے، یا گھانس کھودی ہے - تُو اپنی دولت و اثر پر پھولا ہوا ہے، مگر اب دیکھنا کیسا تجھے پریشان و ذلیل کرتا ہوں - میں کبھی کسی کمشنر و صدر بورڈ سے تو دب کر رہا نہیں، تو تیری کیا ہستی ہے - ڈارا صاحب اس کروفر کے صدر بورڈ تھے کہ کمشنر تک اُس کے نام سے لرزتے تھے - لیکن یہ محمد اکرم ہی کا جگر تھا کہ ایک روز اُسکے سامنے "دارا مارا" کہہ ڈالا اور وہ منھ دیکھ کر رہ گیا - اور خدا شیرِ انگلستان محمود میاں کی عمر میں برکت دے، میں کسی کا

قانونی دباؤ بھی ماننے والا نہیں۔ نارٹن، السٹن، لنکن تک تو میرے محمود میاں کی گرد کو پہنچتے نہیں ....

[محمود آتا ہے]

محمود - ابا، آپ ڈپٹی فخرالدین سے کبھی ملے ہیں؟

اکرم - کون فخرالدین؟

محمود - رُدولی والے۔

اکرم - نہیں تو، میں اُن کے نام سے بھی نہیں واقف۔

محمود - اچھا، تو اب اُن سے واقف ہو جائیے تو بہتر ہے۔ اُن کے چار لڑکیاں ہیں، اور ہر لڑکی کے نام انھوں نے دس دس ہزار کی جائداد لکھ دی ہے، جو شادی کے وقت اُنکے شوہروں کو ملیگی۔

اکرم - واہ بیٹا، تم نے خوب بتایا۔ میں تو ایسے شخص کی تلاش ہی میں تھا۔ تو اب اُن سے ملنے کہاں چلیں؟ کیا وہ یہاں کہیں آئے ہوئے ہیں؟

محمود - جی ہاں، اس مکان کے پچھواڑے اُن کے کوئی عزیز رہتے ہیں، اُن سے ملنے اسوقت آئے ہیں، ابھی اسی طرف سے تو گزریں گے۔

اکرم - واہ واہ، بیٹا آج تو تم نے انعام کے لائق کام کیا ہے۔ اچھا، پان حقہ جلدی منگاؤ۔

[راستہ سے کوئی شخص عمدہ لباس پہنے گزرتا ہے۔ اکرم "السلام علیکم جناب ڈپٹی صاحب" کہکر اُسکی طرف لپکتے ہیں۔ اجنبی حیرت سے ان کا منھ دیکھنے لگتا ہے]

محمود - نہیں ابا، یہ وہ نہیں، آپ کیا غضب کرتے ہیں۔

اکرم - معاف کیجیے گا جناب مجھے دہوکا ہوا (محمود سے) اچھا بیٹا تم یہاں کھڑے رہو۔ مجھے بتا دینا

محمود - دیکھیے اب آ رہے ہیں۔

اکرم - السلام علیکم جناب ڈپٹی صاحب۔

فخرالدین - وعلیکم السلام۔ معاف فرمائیے گا۔ میں نے جناب کو پہچانا نہیں۔

اکرم - ہاں جناب کیونکر پہچان سکتے۔ پورے ۲۵ برس کے بعد آج دیکھا ہے۔ بھلا اُس زمانے

ں صورت کسی کو یاد رہ سکتی ہے۔ لڑکپن میں میں آپ کے ساتھ کھیل چکا ہوں۔ میرا نام
مداکرم ہے۔ ۳۰ برس کی تحصیلداری کے بعد پنشن لی۔ آپ کی تعریف سن سُن کر جی خوش ہُوا کرتا
ھا، تمام حکام والا مقام کو آپ کا مدّاح پایا۔ کیا صدر بورڈ اور کیا صاحب ڈپٹی کمشنر ہر شخص
پ کی تعریف ہی کرتا ہے۔ مدت سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ رات کو خواب کیا دیکھتا ہوں کہ
پ اس شہر میں تشریف لائے ہیں، اور پڑوسی میں اپنے کسی عزیز سے ملنے آئے۔ میں نے صبح
ُٹھتے ہی محمود میاں سے یہ خواب بیان کیا، یہ میرا لڑکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ابا، آپ کے خواب
بھی غلط نہیں ہوتے، آپ نے دیکھا ہے تو ڈپٹی صاحب ضرور آج آتے ہوں گے۔ چنانچہ اس
ھروسے پر صبح سے ہم دونوں آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھو محمود میاں، میں نے صبح جو تم سے
ُلیہ لباس وغیرہ بیان کر دیا تھا، بعینہٖ وہی ہے یا نہیں؟ اچھا ڈپٹی صاحب تو اب اندر تشریف
لیے نہ؟ کچھ چائے وائے سے شوق فرمائیے۔

فخرالدین - بہتر ہے۔ [تینوں جاتے ہیں]

سین (۳)

[چودھری محسن حسین اور ان کی بیوی]

چودھرائن - مَیں کہتی ہوں محمود کے باپ کی عقل پر یہ کیسے پتھر پڑ گئے ہیں۔

محسن - مجھے تو اب تک اس خبر کا یقین نہیں تم جانتی ہو میں رائے بہت دیر میں قائم کرتا ہوں لیکن جب قائم
کر لیتا ہوں، تو پھر ہٹنا بھی مشکل سے ہوں۔ تحصیلدار صاحب کے مزاج سے تو میں اول روز سے
واقف ہوں، اور اسی لیے جب ان کی نسبت بہن مرحومہ کے ساتھ ٹھہر رہی تھی، تو میں کسی طرح
راضی نہیں ہوتا تھا، لیکن والد کو انھوں نے خوشامد سے موم کر لیا تھا، آخر ان کے ساتھ ہو گئی
مجھے تو اس مرحومہ کی بات کا خیال ہے۔ اپنے آخری وقت بیچاری کا میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہنا کہ
بھائی، محمود کو آپ کو سونپا، اسے آپ اپنا لڑکا بنائیے گا۔" بھلا میں اس وصیت کو بھول سکتا ہوں

ورنہ اب تو جو نالائقی کی حرکتیں یہ دونوں باپ بیٹے کر رہے ہیں انھیں کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔

چودھرائن۔ سُنتی ہوں کہ آپ جہاں نسبت ٹھہرا رہے ہیں، اُس لڑکی کی والدہ میں لونڈی کا میل ہے۔

محسن۔ تم لونڈی کا میل کہہ رہی ہو۔ اگر وہ چماری یا مہترانی بھی ہو، تو ہمارے تحصیلدار صاحب کو کبھی عذر نہ ہو بشرطیکہ روپیہ کافی مل رہا ہو۔ مگر میں ابھی بدگمانی کیوں کروں، خدا کرے یہ خبر غلط ہی ہو۔

چودھرائن۔ اچھا اگر یہ خبر سچ نکلی تو میری الفت کو پھر کہاں کروگے؟

محسن۔ کہاں بتاؤں، خاندان میں اور کوئی لڑکا تو نظر ہی نہیں آتا۔ جو ہیں بھی وہ یا تو بہت چھوٹے ہیں، اور یا شادی شدہ ہیں۔

چودھرائن۔ ہاں اسی سوچ میں تو میں بھی ہوں۔ اگر خدانہ خواستہ (شیطان کے کان بہرے) یہ خبر سچ نکلی تو میری الفتیا تو کہیں کی نہ رہے گی۔ سب لوگ یہی کہیں گے کہ لڑکی میں کوئی ایسی ہی بُرائی تھی تب ہی تو سگی پھوپھو کے پوت بھائی کے ساتھ لگی لگائی بات چھوٹ گئی۔ برادری بھر میں کیسی بدنامی ہوگی (آبدیدہ ہوکر) یا پاک پروردگار، میرے گھرانے کی آبرو تیرے ہی ہاتھ ہے۔

محسن۔ خیر، اس وہم کو اپنے دل سے نکال دو۔ اب تحصیلدار صاحب ایسے سڑی تو کیا ہو جائیں گے کہ مرحومہ کی وصیت کو بالکل بھول جائیں گے۔ اور سچ یہ ہے کہ میں خود اُن کے گھر میں کب الفت کو کرنا پسند کرتا ہوں، لیکن کیا کروں اپنے اس وعدے سے مجبور ہوں۔

چودھرائن۔ تمھارے نزدیک عزیز کیسا ہے۔

محسن۔ عزیز کی لیاقت میں تو شبہہ نہیں .... (ایک لونڈی خط لیے ہوئے آتی ہے) یہ خط تو تحصیلدار ہی صاحب کا ہے، خدا خیر کرے۔ (خط پڑھ کر) نالائق، دغاباز، محمد اکرم، کیا میرے احسانات کا یہی معاوضہ تھا! میں نے اسی دن کے لیے تجھے نوکر رکھا یا تھا؟ جب تجھ پر رشوت کا مقدمہ قائم ہوا ہے، اور تو معطل ہو گیا ہے۔ تو میں نے کیا اسی دن کے لیے تیری طرف سے پیروی کرنے میں ۱۲ ہزار خرچ کیے تھے؟ ابھی کل کی بات ہے محمود کو منصفی کس نے...

چودھرائن ۔ کیوں کیوں ۔ کیا وہ خبر صحیح نکلی؟ (خط اُٹھا کر دیکھتی ہے) ہا، میری بیٹی...
[غش آجاتا ہے]

محسن ۔ او ہو، یہ غش آگیا کیا؟ [منھ پر چھینٹے ڈالتا، اور ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے، پردہ گرتا ہے]

سین (۴)

(مشاعرہ)

میر صاحب ۔ کہیے مرزا صاحب وہ آپ کے حماقت بیگ ابھی تک تشریف نہیں لائے ۔

مرزا صاحب ۔ جی ہاں، اب آتے ہی ہوں گے ۔

عزیز ۔ کون صاحب؟

مرزا صاحب ۔ آپ اُن سے نہیں واقف؟ محمد اکرم صاحب پنشنر تحصیلدار ۔

عزیز ۔ بدقسمتی سے وہ میرے عزیز ہوتے ہیں ۔

مرزا صاحب (ندامت کے ساتھ) معاف فرمائیے گا ۔ مجھے یہ کیا خبر تھی ۔ ہم لوگ تو انھیں اپنی تفریح کا ایک نسخہ سمجھے ہوئے تھے، اور اسی لیے انھیں آج یہاں مدعو بھی کر دیا تھا کہ سنجیدہ شاعری کے بعد تھوڑی دیر اُن سے دلچسپی رہے گی ۔ اچھا ہوا کہ آپ سے ابھی ذکر آگیا ۔ آپکی اُن کی قرابت کی ہم لوگوں کو کیا خبر تھی ۔

عزیز ۔ نہیں، میں آپ لوگوں کی لطف اندوزی میں مخل نہیں ہونا چاہتا، البتہ یہ کروں گا کہ جب اُن کی باری آئے گی، تو میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا ۔

میر صاحب و مولوی صاحب ۔ نہیں یہ تو نامناسب ہوگا ۔

عزیز ۔ جی نہیں، نامناسب بالکل نہیں ۔

دیگر حاضرین اچھا تو یہی سہی ۔ (تحصیلدار صاحب آتے ہیں) تسلیمات، آداب، تشریف لائیے ۔

میرزا صاحب ۔ ہاں میر صاحب تو آپ کی وہ غزل رہ گئی "جفا دیکھ" "وفا دیکھ" والی ۔

آپ نے تو صرف مطلع ہی سنایا تھا۔ تحصیلدار صاحب، چونکہ آپ اس محفل میں نئے ہیں، اس لیے آپ سے گزارش کر دینا ضروری ہے کہ براہِ مہربانی غزل سنتے وقت خاموش رہیے گا عام مشاعروں کی طرح ہر شعر پر داد دینے کا دستور اس مجلس میں نہیں ہے۔

تحصیلدار۔ بہتر ہے، تو میں پہلے اپنا ہی کلام نہ سناؤں۔

میر صاحب۔ جی نہیں، آپ کا نمبر آخر میں آئے گا۔

پنڈت جی۔ ہاں میر صاحب اب ارشاد ہو۔ اس زمین میں شفیقہ نے کیا خوب فرمایا ہے

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت   دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

میر صاحب۔ ملاحظہ ہو:۔

ہر شئے سے ٹپکتا ہے مرا جذبِ تمنا   نالہ کا اثر دیکھ کہ تاثیرِ دعا دیکھ
آخر تو ہیں ہم مدعیِ صبر و تحمل   رہ جائے نہ دل میں ترے ارمانِ جفا دیکھ
حد سے نہ گزر شغلۂ جور میں اے یار   نازک ہے بہت رشتۂ پیمانِ وفا دیکھ
آشفتہ سری پر مری کیوں طنز ہے اتنا   تو خود تو ذرا برہمیِ زلفِ دوتا دیکھ
لازم ہے کبھی دلدہی اُن کی بھی ستمگر   ٹوٹے نہ کہیں خاطرِ اربابِ وفا دیکھ
خودداری و تقویٰ پہ یہ کیوں ناز ہے زاہد   ناظر کو در بت پہ کبھی ناصیہ سا دیکھ

حاضرین۔ سبحان اللہ۔ مرحبا۔ مقطع شفیقہ کے مقطع سے بڑھ گیا۔

مرزا صاحب۔ اچھا اب مولوی صاحب آپ کی باری ہے۔

مولوی صاحب۔ میں حاضر ہوں۔ غالب کی اس غزل کا خیال کر لیجیے۔

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں   اک چھیڑ ہے وگرنہ مرا امتحاں نہیں ؎

پنڈت جی۔ کیا آپ نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے؟

مولوی صاحب۔ جی ہاں، مگر بہ تبدیلِ ردیف۔ یعنی "نہیں" کے بجائے میں نے "کہیں" کر دیا ہے "گماں کہیں" "زباں کہیں"۔

مرزا صاحب۔ یہ تو آپ نے سخت دشوار زمین اختیار کی۔
مولوی صاحب۔ جی، اسی لیے تو مطلع نہ ہو سکا۔
حاضرین۔ اچھا شعر تو فرمائیے۔
مولوی صاحب۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اظہارِ شوقِ دل میں نظر کام دے تو دے — ہوتی ہے ترجمانِ محبت زباں کہیں
ہر چند معتقد ہوں کہ ہستی ہے اک فریب — جاتی ہے دل سے خواہشِ نام و نشاں کہیں
گو لاکھ باوفا ہوں پہ انسان ہی تو ہوں — لائیں نہ رنگ وزکی بے مہریاں کہیں
تاثیرِ شعر کے لیے لازم ہے سوزِ دل — ہیں محض لفظ باعثِ حسنِ بیاں کہیں
دعوائے حفظِ وضع ہے اک خیالِ خام — قائم رہی ہیں عشق میں خودداریاں کہیں
ناظرؔ، جفائے دہر کا شکوہ ہے کس لیے — اہلِ ہنر کا دوست ہوا آسماں کہیں

میر صاحب و مرزا صاحب۔ کیا خوب کلام ہوتا ہے۔ اچھا جناب عزیز صاحب اب آپ محظوظ فرمائیے
عزیز۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں بہت کم کہتا ہوں۔
مولوی صاحب۔ مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ جب کبھی آپ کہتے ہیں، تو بے مثل کہتے ہیں۔
پنڈت جی۔ اس وقت تو آپ کو سنانا ہی ہوگا۔
عزیز۔ بہتر ہے۔ تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

کیا پوچھتے ہو کس نے غزل خواں بنا دیا — سچ یہ ہے دردِ دل نے سخنداں بنا دیا
اُس بزم تک رسائی کے سامان ہو گئے — دشواریوں کو شوق نے آساں بنا دیا
مانا، نگاہِ شوق ہے مسحورِ حسنِ یار — کیا اس نے آئینے کو بھی حیراں بنا دیا
تھی زندگی بجائے خود اک حلقۂ الم — عاشق کے دل کو کس نے پریشاں بنا دیا
آخر مری وفا کا ہوا آپ پر اثر — اور اس طرح کہ آپ کو حیراں بنا دیا
ناظرؔ، وہ جن کو مس بھی نہ شعر و سخن سے تھا — الفت نے اُنکو صاحبِ دیواں بنا دیا

مرزا صاحب و پنڈت جی۔ اس کلام کا کیا کہنا۔ جناب تحصیلدار صاحب اب آپ کے کلام کا اشتیاق ہے۔

[عزیز آہستہ سے اُٹھ جاتا ہے]

تحصیلدار صاحب۔ سُنئیے۔ مگر میرا کلام دقیق بہت ہوتا ہے۔ اس لیے جب تک میں اپنے ہر شعر کی خود تشریح نہ کرتا جاؤں آپ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا۔

مولوی صاحب۔ بہتر ہے، آپ شرح کرتے جائیے گا۔ اور ہاں جناب تخلص کیا فرماتے ہیں؟

تحصیلدار صاحب۔ چپیق۔

حاضرین۔ چپیق؟ یہ چپیق کس زبان کا لفظ ہے؟ اور اس کے معنی کیا ہیں؟

تحصیلدار صاحب۔ اسی سے تو میں کہتا تھا، کہ میرا دقیق کلام آپ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی کسی لغت کی کتاب میں تلاش کیجیے، میں شاعر ہوں، کوئی لغت کی کتاب تو ہوں نہیں۔

میر صاحب۔ اچھا جناب برہم نہ ہوں، اپنا کلام سنائیں۔ تخلص پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔

تحصیلدار صاحب۔ کوئی سمجھدار ہوتا تو تخلص کی داد دیتا، کہ اس میں ندرت کس قدر ملحوظ رکھی ہے بھلا آج تک دنیا میں کسی اور کا تخلص بھی چپیق گزرا ہے؟ آپ لوگ نیا مضمون کہاں سے لائیں گے تخلص تک تو نیا آپ لوگوں کو ملتا نہیں۔

پنڈت جی۔ جناب وہ تخلص کی بحث تو ختم ہو گئی۔ اب آپ ہم لوگوں کی نافہمی کو معاف فرما کر اپنا کلام سُنائیے۔

تحصیلدار۔ سُنئیے۔ مطلع عرض کیا ہے۔

کانوں میں آ رہی جو صدا ہے نعیق کی　　شاید مشاعرے میں غزل ہے چپیق کی

نعیق کہتے ہیں بانگِ زاغ کو، کوا صبحِ صادق کے وقت بولتا ہے، اور مشاعرے کی بہترین غزل بھی سب سے آخر میں، یعنی صبحِ صادق ہی کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کانوں میں کوے کی بولی جو سُنائی دے رہی ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ اس وقت مشاعرے میں چپیق بلاغت آفریں کی غزل ہو رہی ہے۔ تعلّی کا مضمون ہے، مگر ملاحظہ کیجیے، کہ کس انداز سے باندھا ہے۔

حاضرین۔ واقعی یہ مضمون تو روز ازل سے آج تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔
تحصیلدار۔ کہتا ہوں۔

کون اُنکی چاہِ چشم میں غوطہ لگا سکا	کس کو ملی ہے تھاہ اس بحرِ عمیق کی

اس شعر کے الفاظ صاف ہیں، مگر مضمون ذرا پیچیدہ ہے۔ لیکن یہ کتنی غلط تشبیہ ہے، بھلا دِقن میں عمق کہاں ہوتا ہے۔ آنکھ میں البتہ عمق ہوتا ہے، اس لیے میں نے چاہِ چشم باندھا، اور پھر "چاہ" اور "چشم" میں تجنیس بھی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کون اُن کی آنکھوں میں اب تک سما سکا ہے؟ یعنی کس کے ساتھ اُنھوں نے محبت کی ہے؟ دیکھیے، واللہ کتنا نیا مضمون ہے! اور چاہ، اور چشمہ، اور غوطہ اور بحر اور تھاہ کی رعایتیں تو ذرا دیکھیے۔ سب سے بڑھ کر "چاہ" اور "تھاہ" کا قافیہ ملاحظہ ہو۔
حاضرین۔ کیا خوب، کیا خوب۔ کتنے اچھوتے مضامین اور کیا کیا نادر صنایع جناب کے کلام میں ہوتے ہیں۔
تحصیلدار۔ ملاحظہ ہو:-

میں کشت زارِ عشق کا نرگاؤ بن گیا	درکار ہے مرے لیے بندش سمیق کی

نرگاؤ بمعنی بیل، اور سمیق کہتے ہیں جُوے کو، جو بیل کی گردن پر رکھا جاتا ہے۔ اب شعر کا مفہوم صاف ہے۔ مگر داد دیجیے گا کہ مضمون کتنا نادر ہے۔
حاضرین۔ سبحان اللہ جناب کا کلام کیا ہے، ایک زعفران زار ہے۔ اور جناب خود ایک نسخۂ تفریح ہیں۔
تحصیلدار۔ آپ لوگ کچھ گھانس تو نہیں کھا گئے ہیں؟
حاضرین۔ جناب کی نثر بھی نظم سے کچھ کم نہیں ہوتی ہے۔ دیکھیے وہ کشت زار، نرگاؤ کی رعایت اب تک چلی آتی ہے۔ یہ حصہ ہے جناب کا۔
تحصیلدار۔ عرض کرتا ہوں۔

دیدوں سے اپنی دیبا و کمخواب گر گئے	پوشاک اُنکی بن گئی جب سے سلیق کی

سلیق کہتے ہیں درخت کی اُن پتیوں اور چھوٹی شاخوں کو جو خود بخود گرا کرتی ہیں مطلب یہ ہے

کہ جب سے معشوق ان بے حقیقت چیزوں کا لباس پہننے لگا ہے، میری نظروں میں بڑے بڑے بیش قیمت کپڑے بھی حقیر ہو گئے ہیں۔ اور درختوں کی چھال کو بے حقیقت کون کہہ سکتا ہے۔ دیکھیے بلاغت کا نکتہ یہ ہے کہ میں بجائے "نظر" کے "دیدہ" کا لفظ لایا۔ "دیدہ" اور "دیبا" میں کیا خوب مناسبت ہے۔ اور پھر "دیدہ" و "خواب" میں۔ پھر "گر گئے" کی بلاغت کو دیکھیے، کہ سلیق بھی چونکہ گری ہوئی چیز کو کہتے ہیں، اس لیے پہلے مصرعہ میں قصداً "گر گئے" لایا۔

حاضرین۔ سبحان اللہ، آنت کا نام روشن رکھنے والے اب جناب ہی تو رہ گئے ہیں۔

تحصیلدار۔ آپ لوگ مجھے بنا رہے ہیں، میں بھی اب مقطع پڑھ کر آپ لوگوں سے قطعِ کلام کرتا ہوں۔

مرزا صاحب۔ کوئی فقرہ بلاغت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس "مقطع" اور "قطع کلام" کی رعایت نے تو قیامت کر دی۔

تحصیلدار۔ گر آپ بھی تو اسی ضلع میں اقامت کیے ہوئے ہیں، جبھی تو رعایت و قیامت کا جوڑ ملا رہے ہیں۔ اچھا، اب مقطع سنیے،

چُپ چاپ ساری چپقلشِ غیر رہ گئی   آخر کو چل گئی نہ چپیقِ لئیق کی

[حاضرین ہنسی سے بے قیار ہو جاتے ہیں]

اس شعر کی بلاغت آپ جیسے بدمذاقوں پر بھی ظاہر ہوگی۔ چپ چاپ چپقلش، چل، چپیق، ان سب کی تجنیس ملاحظہ کیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ اغیار کا سارا مجمع کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ اور آخر کار فتح چپیقِ لئیق ہی کو ہوئی۔

پنڈت جی۔ جناب تحصیلدار صاحب اب تو آپ "چپت" کے ضلع میں آ گئے، اب جلدی سے "چنپت" ہو جیے، ورنہ اگر کسی صاحب کے ہاتھ میں "کھل" ہونے لگی تو تحصیلدار صاحب آپ "ضلع بازی" کو چھوڑ کر اپنی قسمت کو رونے لگا۔

[تمام حاضرین ہنستے ہیں]

تحصیلدار۔ (کھڑے ہو جاتے ہیں) آپ لوگ سخت بیہودہ و بد تہذیب ہیں۔ جانتے نہیں کہ میں کون ہوں۔ آج وہ دن تھا کہ آپ لوگ فخر کرتے کہ ایک فسٹ تھرڈ کلاس مجسٹریٹ نے آپ کی بزم کو معزز کیا تھا۔ بجائے اس کے آپ میری توہین کرتے ہیں۔ میں ابھی تو جا کر کلکٹر صاحب سے کہتا ہوں کہ یہ لوگ یہاں جمع ہو کر

خواجہ حسن نظامی کی پھڑکتی ہوئی کتابیں

روزنامہ سفر حجاز و شام و مصر

اُردو زبان میں بہت سے سفرنامے ہیں مگر یہ سفرنامہ سب سے نرالا، سب سے انوکھا، اور بالکل عجیب چیز ہے۔ اسکے پہلے صفحہ پر لکھا ہے "سب سے پہلا اور سب سے آخری سفرنامہ" یہ فقرہ یقیناً درست ہے کیونکہ اُردو میں اس سفرنامہ سے پہلے اس طرز کا کوئی سفرنامہ نہ تھا، اس واسطے یہ سب سے پہلا ہے اور نہ امید ہے کہ اس وضع کا اور اس شان کی چلبلی عبارت کا اور کوئی سفرنامہ ہو سکے گا، لہذا سب سے آخری بھی یہی ہے۔

اس میں مصر کے حالات عجائبات۔ سیاسی تمدنی مذہبی کیفیتیں ایسے انداز سے تحریر ہوئی ہیں کہ تمام مصر سامنے آجاتا ہے۔ فرعون کی لاش کا فوٹو۔ حضرت یوسف پیغمبر کا اصلی مرقع نہایت کوشش اور صرف کثیر سے حاصل کرکے اس میں شامل ہوا ہے۔

اسی طرح بیت المقدس، ملک شام اور مدینہ منورہ کے دلچسپ حالات ہیں اور عکسی تصویریں بھی ترتیب کی دی ہیں۔ ۳۰ کے قریب تو اس میں فوٹو ہیں، الفاظ کی تصویریں الگ رہیں۔

یہی وہ سفرنامہ ہے جو گھر بیٹھے اسلامی دنیا کی سیر کرا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی عمدگی سے لکھا گیا ہو کہ ہر بات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے جا نظر آتا ہے قیمت باتصویر ۲/ بلاتصویر ۱۲/ ۔ علاوہ محصول۔

سی پارۂ دل

اس کتاب میں خواجہ صاحب کے وہ تمام مضامین ہیں جو آج تک ہندوستان کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں چھپے۔ بعض مضامین تو وہ ہیں جو ناپید ہوگئے تھے اور ایک ایک اشرفی قیمت دینے پر بھی دستیاب نہ ہوتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک مجموعۂ مضامین چھپا تھا مگر وہ ناتمام تھا۔ اُسمیں یہ نئے مضامین نہ تھے، جو اس تازہ مجموعہ میں ہیں۔

خواجہ صاحب نے اُردو زبان میں ایک نئی وضع انشاپردازی کی ایجاد کی ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی دلپسند اور چھوٹے بڑے ادنیٰ اعلیٰ کی سمجھ میں آنے والی اور اثر کرنے والی عبارت کوئی نہیں لکھ سکتا۔ لہذا اگر کسی شخص کو اس کا ثبوت آنکھ سے دیکھنا ہو تو یہ مجموعہ مضامین منگا کر دیکھے۔ عبارت آرائی، تصوف، اور سوز و گداز کا ایک باغ لگا ہوا نظر آئے گا۔ قیمت ۱۲/ علاوہ محصول

انتخاب توحید

اخبار توحید میرٹھ کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے جو صرف پانچ مہینے جاری رہا۔ مگر مقبولیت کی کیفیت تھی کہ ہندوستان کا کوئی گاؤں ایسے ناظرین سے خالی نہ تھا۔ یہی وہ اخبار تھا جسکے ایک مضمون کھو تکبیر کو ہندو مسلمانوں نے بطور خود چھپوا چھپوا کر تقسیم کیا اور

منیجر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ

اس طرح ایک کروڑ کے قریب اسکی اشاعت ہوئی ہی وہ مضمون تھا جسکے ترجمے تمام ترکی و عربی اخباروں نے شائع کیے اور باوجود ضبط ہوجانے کے ابتک ہزاروں آدمیوں کو حفظ یاد ہے۔

اخبار توحید کے چیف ایڈیٹر حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب تھے اور اسکے اکثر مضامین آپ ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ انتخاب اسی اخبار توحید شہید کے مضامین کا ہے جس میں خواجہ صاحب کے تمام مشہور مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصول

تسخیر مہر و قہر اعمال حزب البحر

عملیات کی ہزاروں کتابیں ہیں۔ اور حزب البحر شریف کے بیسیوں طریقے بازاروں میں بکتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب نے جس مدلل اور موثر طریقہ سے یہ کتاب لکھی ہے اسکی مثال کہیں نہ ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ چند روز میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا دوبارہ چھپی اور وہ بھی قریب الاختتام ہے ہندوستان کے شہرۂ آفاق بزرگ حضرت مولانا سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس کتاب کی نسبت فرماتے ہیں کہ میں خواجہ صاحب کی تمام تصانیف میں اسکو اول درجہ کا سمجھتا ہوں۔ قیمت ۸؍

اتالیق خطوط نویسی

خط و کتابت آج کل ہر آدمی کی زندگی کا ضروری حصہ ہے۔ عورتوں اور مردوں کو یکساں ضرورت ہے کہ مختصر الفاظ میں زیادہ اور طویل مطلب ادا کر سکیں خواجہ صاحب نے اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔ اسکے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں خود خواجہ صاحب کے خطوط ہیں اور خط لکھنے کا ڈھنگ زینہ بزینہ بتایا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں ہندوستان کے نامور مسلمانوں کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ مثلاً نواب محسن الملک۔ مولانا شبلی۔ مولانا ابوالکلام۔ ڈاکٹر اقبال۔ حضرت اکبر۔ مولانا ذکاءاللہ۔ میرزا قادیانی وغیرہ حضرات غرض دونوں حصے حقیقتاً خط و کتابت کا طریقہ جاننے کے لیے اسم بامسمیٰ اتالیق ہیں قیمت ہر دو حصہ ۱۰؍

روزنامچہ خواجہ حسن نظامی

سنہ ۱۹۱۶ء کا روزنامچہ ہے جسمیں خواجہ صاحب نے بمبئی گجرات کاٹھیاواڑ وغیرہ کے دلچسپ حالات سفر لکھے ہیں۔ مشہور زیارتوں اور مقامات تاریخی کا بیان ہے اور سومنات کے مندر کی کیفیت تو ایسی ہے کہ اسی ایک کی خاطر ہزاروں آدمی اس روزنامچہ کو خریدتے ہیں۔ قیمت ۸؍

رسول کی عیدی

یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب ہے جس میں مزیدار نظم و نثر بچوں کے خوش ہونے اور دینی محبت پیدا کرنے کی درج ہوئی ہیں۔ کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ عیدین اور عید میلاد کے موقع پر سیکڑوں کی تعداد میں لوگ خرید کر بچوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ قیمت ۲؍

اسلام کا انجام

یہ اس شہرۂ آفاق رسالہ کا ترجمہ ہے جس کو دیار مصر کے نامور بزرگ سندالعارفین راس الکاملین فاضل اجل علامہ سید توفیق بکری نے المستقبل الاسلام کے نام سے تصنیف فرمایا تھا۔ قیمت ۴؍

اعظم الکلام (فی) ارتقاء الاسلام

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم فنانشل ورینیو سکرٹری دولت آصفیہ اُن چند عالی دماغ لوگوں میں بھی غالباً دقتِ نظر و فلسفیانہ استدلال کے لحاظ سے ممتاز ہیں جو غدر کے بعد مسلمانان ہند کی علمی دنیا کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ایک یورپین عالم دین ریورنڈ ملکم میکال نے بڑے شد و مد کے ساتھ دعویٰ کیا تھا کہ "مذہب اسلام مانع ترقی ہے" مولوی چراغ علی نے اُسکے اعتراضات کی تردید میں قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور فقہ و تاریخ کی رو سے نہایت عالمانہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام روحانی، اخلاقی اور دماغی ترقی کا حامی۔ تغیرات زمانہ کے ساتھ تمدن و سیاست کا ساتھ دینے والا اور زندہ ضروریات کے مطابق ہر قسم کے قوانین کی بنیاد بننے کی صلاحیت رکھنے والا مذہب ہے۔ اور اسکی فطرت جمود و خمود کے منافی ہے اسی ضمن میں دوسرے بہت سے یورپین مصنفین کی غلط بیانیوں کی اصلاح مشرقی اور مغربی حوالوں سے کی گئی ہے اور صدہا اسلامی مسائل متعلق بہ معاشرت و سیاست پر عالمانہ و مجتہدانہ بحث کی گئی ہے مسلمانوں کے لیے اعظم الکلام کا مطالعہ دینی اور دنیاوی ترقیوں کے لحاظ سے بہت ضروری ہے، کہ اسکے بغور دیکھنے سے اُنکے خیالات اور جذبات میں جوش اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ سلاست کے لیے مولوی عبدالحق صاحب کا نام نامی کافی ہے۔ جنھوں نے اس کتاب کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے اور اس پر ایک عالمانہ مقدمہ اضافہ کیا ہے۔ قیمت ہر دو حصہ ۳؎

الاسلام و النصرانیۃ

مولفہ مفتیِ اعظم شیخ محمد عبدہ المصری۔ اس رسالہ میں اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرکے تاریخی واقعات سے ثابت کیا گیا ہے کہ علم و سائنس اور تمدن و تہذیب سے اسلام کو کس قدر قربت اور گہرا تعلق ہے مگر باانیہمہ عیسائیت نے اسلام سے اظہار مخالفت کیا۔ قیمت ۸ر

اسلام اور سوشل رفارم

میں (جسکے مصنف نامور مصری عالم محمد رفیق بک اعظم ہیں) تمدنی زندگی کی اُن اغراض کا ذکر ہے جو اسلام نے تعلیم کی ہیں اور اُن کا مقابلہ علمائے یورپ کے عقائد و خیالات سے کیا ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ کہ اسلام سے بڑھ کر معتدل اور ضرورتِ تمدن کی کفیل اور مفید تعلیم کسی دوسرے مذہب نے اسوقت تک نہیں دی اور نہ آیندہ امید ہے۔ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید و کارآمد ہوگا۔ قیمت ۸ر

صناعۃ العرب

اس کتاب کے مولف مولوی عبداللہ العمادی ہیں اس میں قدیم اہل عرب کی دستکاریوں اور کلوں اور ایجادوں کا مفصل تذکرہ ہے اور واقعات سے ثابت کیا ہے کہ عربی تمدن نے کیسے موجد اور مخترع پیدا کیے تھے۔ مسلمانوں کیلیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ہی مفید اور کارآمد ہے اسکے بغور مطالعہ کے بعد مسلمانوں میں صنعت و حرفت کی رغبت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے جسکی اس زمانے میں خاص ضرورت ہے۔ قیمت ۳ر

منیجر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ

پریم پچیسی

یعنی پریم چند صاحب کے دلچسپ اور سبق آموز فسانوں کا مجموعہ۔ جسے ڈاکٹر اقبال، مولوی عبدالحق اور ملک کے تمام انشا پردازوں نے بہترین ادبی مجموعہ تسلیم کیا ہے سیرت نگاری جو افسانہ کی جان ہے پریم چند صاحب کا حصہ ہے۔ قیمت ۱۲/

ابن مسلم

یعنی الناظر کے مائیناز مضمون نویس مسٹر سلطان حیدر صاحب جوش کا دلچسپ ناول۔ جسکے ہر باب میں فطری جذبات اور تاریخی واقعات کی جیتی جاگتی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ سلطان حیدر صاحب کا قلم فسانہ نگاری کے میدان میں جو کرشمہ سازیاں کرسکتا ہے وہ الناظر کے اوراق سے ظاہر ہے۔ قیمت ۱۲/

رسول عربی

یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر اور جامع سوانحعمری جس میں خاص طور پر حضور سرور کائنات روحی فداہ کی خانگی زندگی کے وہ روشن کارنامے پیش نظر کیے گئے ہیں جو تہذیب انسانی کے سرمایہ ناز اور مسلمانوں کے لیے ہر لحظہ قابل تقلید ہیں۔ قیمت ۸/

بنت الرسول

یعنی سیدۃ النسا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مختصر سوانحعمری۔ جس کا مطالعہ عورتوں کے لیے خصوصاً بہت مفید ہوگا کہ آج انکی معاشرت سب سے زیادہ اسلامی تعلیم کے لحاظ سے قابل اصلاح ہو رہی ہے۔ قیمت ۵/

سوانح احمدی.

جس میں حضرت مولوی سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ کے حالات زندگی اس شرح و بسط کے ساتھ درج کیے گئے ہیں کہ باریک کتابت کے باوجود ۱۹۸ صفحوں پر ختم ہوئے ہیں اور آخر میں ۹۰ کے قریب سید صاحب کے مکتوبات ہیں جن سے اس عہد کے اکثر واقعات و معتقدات پر روشنی پڑتی ہے۔ قیمت ۱۲/

فرائض الدین

یہ اپنی طرز کا اردو میں پہلا رسالہ ہے جسمیں والدین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کے نہایت بیش بہا اور حکیمانہ اصول بتائے گئے ہیں۔ ہر صاحب اولاد کے لیے اس مفید رسالہ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت صرف ۴/

گلشن ہند

میرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا تھا جو ۱۹۰۶ء میں شمس العلما مولوی شبلی نعمانی مرحوم کی تصحیح و تحشی کے بعد شایع ہوا۔ شروع میں مولوی عبدالحق بی اے (موجودہ سکرٹری انجمن ترقی اردو) کا ایک عالمانہ مقدمہ ہے جس نے اس تذکرہ کی قدر و قیمت دوبالا کردی ہے۔ قیمت ۱۲/

وکرم اروسی

کالیداس کا مشہور ڈراما جسے مشہور ادیب مولوی عزیز مرزا مرحوم بی اے، سابق ہوم سکرٹری دولت آصفیہ و آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے اردو لباس سے آراستہ کیا۔ ابتدا میں ڈراما کی حقیقت پر ایک بسیط مقدمہ مترجم نے بڑی قابلیت کے ساتھ لکھا ہے قیمت ۸/

مولانا عمادی	مولوی نواب علی	
کتاب المعارف	تذکرۃ المصطفیٰ	جعفر و عباسہ
تاریخ عرب قدیم	معارج الدین	اختر و حسینہ کامل
علم الحدیث	خواجہ غلام الحسنین	سیمائے عالم
صناعۃ العرب	دستور المعلمین	منشی پریم چند
مولوی ظفر علیخاں	معیار الاخلاق	پریم پچیسی
جنگل میں منگل	تنقید لطیف	سیر درویش
سیر ظلمات	تربیت اولاد	لالہ سری رام
معاشرت	شفق عمادپوری	خمخانۂ جاوید
جنگ روس و جاپان	تحقیق سخن	منشی سجاد احمد
فلسفۂ ابن سینا	غنچۂ نوبہار	حیات خسرو
[illegible]	کنز المعانی	حیات [illegible]
مولوی رشید احمد انصاری	حدیقۂ آخرت	مولوی کمال الدین
[illegible]	آئینۂ [illegible]	[illegible]
[illegible]	تذکرۂ عقیدت	[illegible]
	مولوی صباح الدین	

شرح غالب

دیوان حسرت

حسرت موہانی

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۹۵ جلد ۱۶ — یکم مئی ۱۹۱۷ء

مہر محمد علی کا خط راجہ محمود آباد کے نام (ضمیمہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۹۵ جلد ۱۶ — یکم مئی سنہ ۱۹۱۷ء

انجمن ترقی اُردو کا نظام

اب تک انجمن ترقی اُردو سے مراد ہیں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکریٹری، یا اگر اُس علمی امداد پر نظر کیجیے جو اُن کے بعض خاص دوستوں نے محض ذاتی تعلقات کی بنا پر اُنھیں اس کام میں دی ہے تو زیادہ سے زیادہ نصف درجن اصحاب اس مہتم بالشان تحریک کے تمام تر ذمہ دار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن کیا اُس کام کی وسعت و اہمیت کے لحاظ سے جو انجمن ترقی اُردو کے پیش نظر ہے، یہ حالت قابلِ رشک یا لائق اطمینان کہی جا سکتی ہے؟ فرض کیجیے کہ آج ہمارے شفیق دوست کو جو تھوڑی سی فرصت و فراغت حاصل ہے کل کو ریاست کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جانے کی وجہ سے یا اور کسی غیر معمولی و غیر متوقع سبب پیش آ جانے کے باعث اُسیر اُن کا دسترس نہ ہونے پائے تو کیا ہم اس نہایت ہی ضروری تحریک کو پھر اُسی حالت جمود و سکون میں چھوڑ دیں گے جو آپ سے چند سال قبل اُس کی قسمت سے وابستہ تھی۔ اور اگر ہم اس کو زندہ اور میدانِ عمل میں جولاں رکھنا چاہتے ہیں، جیسا کہ یقیناً تمام ہی خواہان اُردو کا دلی منشا ہوگا تو ہمیں چاہیے کہ اس مجلس کا ایک ایسا نظام بنائیں اور اُس کی ذمہ داریاں

ایک ایسی جماعت (نہ کہ شخص) پڑ ڈالیں کہ مسلسل اور متحد کوشش نہ صرف اسے سرسبز و بار ور کرنے کا ذریعہ بنے بلکہ محض ایک یا دو اشخاص کی توجہ و مستعدی پر اسکی علمی زندگی کا انحصار نہ ہے برائے نام ہستی سے تو اب سے چار سال قبل بھی وہ مبرّا نہ تھی۔

حقیقت میں زبان اردو کو اس ملک کی اتنی کثیر آبادی سے تعلق ہے اور اپنے ساتھ ہماری اتنی امیدیں اور ضروریاتِ ملکی و قومی وابستہ ہیں کہ اگر وسیع پیمانے پر اردو کی خدمت کرنا مقصود ہو، اور بے شبہہ یہ ہم میں سے بہت سے اصحاب کے پیش نظر بھی ہے، تو حصولِ مدعا کا کوئی دوسرا ذریعہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے علمی کاموں میں کوشش کر کے ملک کے ہر طبقے اور حصے کے وہ تمام اصحاب شریک کیے جائیں جنھیں اپنی زبان کا درد اور اس قسم کے کاموں سے دلچسپی اور جن میں کچھ کام کرنے کی صلاحیت ہے مگر اس قسم کی صلائے عام دینے سے پیشتر ضروری ہے کہ موجودہ نظام انجمن میں ایسی مناسب ترمیمات اور تبدیلیاں کر دی جائیں جو اہلِ ملک کے لیے قابل قبول ہونے کے علاوہ ممکن العمل بھی ہوں۔ اس بارے میں انجمن کے موجودہ قواعد و ضوابط قطعاً ناکافی ہیں۔ اور اگرچہ اس مختصر مضمون میں اس کا موقع نہیں کہ ان قواعد کی تمام جزئی تفصیلات پر غور و بحث ہو سکے تاہم چند اصولی باتوں کے متعلق یہاں اظہار رائے کر دینا ضروری ہوگا۔

ایک جداگانہ ہستی کی ضرورت

سب سے مقدم یہ امر ہے کہ انجمن ترقی اردو کو جو محض ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ متصور ہوتی ہے، ایک علٰحدہ اور مرکزی مجلس بنایا جائے۔ اس بحث کی ابتدا ہی میں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس قسم کی علٰحدگی کی تحریک اُن عام شکایات کی بنا پر نہیں کر رہے ہیں جو انجمن کے ساتھ کانفرنس کے نا فیاضانہ سلوک کو دیکھ کر اکثر ہوا خواہانِ اردو کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ بے شبہہ کانفرنس نے اپنے دیگر شعبہ جات کے ساتھ اور بالخصوص انجمن ترقی اردو کے ساتھ جس قسم کی بے اعتنائی برتی ہے وہ صد درجہ قابل [illegible] ہے

لیکن جن خیالات کی بنا پر ہم اس تحریک کو پیش کرتے ہیں اُنکی بنا دو دوسرے اسباب پر ہے۔ اور اگر ہمیں اس بات کا یقین بھی ہو جائے کہ کانفرنس اپنے سابقہ رویہ کو بدل کر آئندہ پوری فیاضی کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کو مدد دے گی تب بھی ہم یہی عرض کریں گے کہ اُردو کے لیے ایک علیحدہ مجلس بنانے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے مندرجۂ ذیل وجوہ کو ہم اپنے اس دعوے کی تائید میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اُردو زبان ملک کے مختلف طبقات میں رائج ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سب فرقے یکساں طور پر اُردو بولتے، اُردو میں لکھتے پڑھتے اور اُردو کو اپنی مادری زبان تصوّر کرتے ہیں۔ اکثر متعصب ہندوؤں کو اسپر اصرار ہے کہ وہ زبان جسے دوسرے اُردو کہتے ہیں، درا صل ہندی ہے۔ اور ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اُردو کو عملاً ہندی بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن باوجودیکہ ایک طرف تو اس قسم کی کوشش کرنے والے اصحاب میں ایک خاص قسم کا جوش ہے اور وہ ہیں بھی دَتنہ ہوشمند اور پُرحوصلہ کہ اپنے جوش کو ایک منضبط کوشش کی صورت میں اور پورے استقلال کے ساتھ رونما کرتے رہیں اور دوسری طرف ہوا خواہان و دلدادگان اُردو کی جماعت کثیر بے حسی، آرام طلبی اور پست ہمتی کی بدولت اُن گرانمایہ جواہر کو رائگاں کرنے پر تُلی بیٹھی ہے جو فطرت نے ان میں ودیعت کیے ہیں اور انضباط و استقلال کے ساتھ کسی قسم کی اجتماعی کوشش سے بظاہر عاری نظر آتی ہے، یہ اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ برابر ملک کے اندر اور باہر پھیلتی جاتی ہے اور اسکے سرمایۂ ادبی میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے اُن لوگوں پر جو اُردو کے متعلق کسی اجتماعی تحریک کے حامی ہوں لازم ہے کہ وہ اُن متعصب ارباب وطن کی کوششوں سے قطع نظر کرکے ہندوؤں کے اُس وسیع الخیال طبقہ کی ہمدردیوں کو ضائع نہ ہونے دیں جو مسلمانوں کی طرح اُردو کی ترقی کے دل سے خواہاں ہیں اور جو تعداد میں خواہ کم ہی کیوں نہ ہوں، مگر اپنی قابلیت و اثر کے لحاظ سے کسی طرح نا قابل التفات نہیں ہیں۔ لیکن ہندوؤں کے لیے اس

تحریک میں شرکت اُسوقت تک دشوار رہے جب تک کہ مسلمان اسے صرف اپنی ملک سمجھتے ہیں اور اپنی کسی قومی مجلس سے خواہ وہ تعلیمی ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا اقتصادی اسے وابستہ رکھیں گے۔

بے شبہہ اس کی امید نہیں ہوسکتی کہ آج ہم ایک علیحدہ مجلس بنا دیں تو کل ہی ایسے تمام ہندو اصحاب ہمارے شریک کار ہو جائیں گے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ بہت سے ہندو اصحاب اس تحریک میں عملی حصہ لینے لگیں گے۔ اور بفرض محال اگر وہ اسپر بھی ہماری شرکت گوارا نہ کریں تو کم سے کم ہیں وہ یہ الزام تو نہیں دے سکتے کہ ہم نے اُنکے لیے دروازے پر "اندر مت آؤ" کا تختہ لٹکا رکھا ہے۔ جیسا کہ اس وقت بعض اصحاب بجا طور پر کہتے ہیں۔

پھر ہندوؤں کے علاوہ عیسائیوں کی بھی ایک جماعت ایسی ہے جسکی مادری زبان اُردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں بن سکتی۔ اور اُن کو بھی ہم اُسی حالت میں پوری آزادی کے ساتھ دعوتِ شرکت دے سکتے ہیں جبکہ اُردو کی کوئی ایسی مجلس قائم ہو جو کسی خاص طبقے یا فرقے سے تعلق نہ رکھتی ہو۔

(۲) اُردو زبان کے متعلق کام کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ اگر کسی بڑی سی بڑی مجلس کی وابستہ دامانی پر ہم نے قناعت کر لی تو اُس صورت میں لازماً اُس کا دائرۂ عمل محدود رہے گا۔ اور سوائے اُن لوگوں کے جو اُس اصلی مرکزی مجلس کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوں ناممکن ہوگا کہ ہم تمام طبقاتِ اسلامی کو بھی اپنا شریک وسہیم بنا سکیں۔ بے شبہہ مُلک میں کوئی دوسری اسلامی مجلس اتنی بڑی موجود نہیں ہے جو ایجوکیشنل کانفرنس کی ہمپایہ کہی جاسکے یا جسکے ساتھ انجمن ترقی اُردو کو وابستہ کیا جاسکے۔ مگر ملک کے کتنے اصحاب ہیں جو اس بزم قومی کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے یا کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں اسکی کیا توقع ہوسکتی ہے کہ جب وہ سرے سے اس اصلی و مرکزی مجلس کے ساتھ ہی نہیں رہنا

پسند کرتے تو اُسکے کسی شعبے پر ذرا بھی التفات کریں گے۔ حالانکہ ہماری تحریک کا منشا یہ ہے کہ ہم اُن کو بھی اپنا شریک کار بنائیں جو اس بزم تعلیمی کے ہمدرد و شریک ہیں۔ اور اُن کے سوا اُن لوگوں کو بھی اپنے حیطۂ اثر میں لائیں جنھیں کسی سبب سے اس سے کچھ سروکار نہیں ہے۔

(۳) اس وقت تک اگرچہ اُردو زبان کے حامیوں اور اُسکو ایک علمی زبان بنانے والوں نے اپنے پیش نظر ایسا کوئی نصب العین نہیں رکھا ہے جسے ہم اپنی کوششوں کا آخری مدعا قرار دے سکیں لیکن غالباً وہ دن دور نہیں جب ہم ایک اُردو یونیورسٹی کا خواب دیکھنے لگیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کانفرنس جو انگریزی کی ترویج و اشاعت اور انگریزی زبان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مُسلم یونیورسٹی بنانے کی جد و جہد میں مشغول ہے کسی نہج سے اس کو عملی صورت میں لانے کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ اپنے دائرے کو وسیع کرکے اس تحریک کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنا چاہے گی تو یہ یقینی ہے کہ یہ یونیورسٹی بھی صرف ہم مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوگی۔ حالانکہ اُردو یونیورسٹی اگر کبھی عرصۂ شہود میں آسکی تو اُسے ہندوؤں اور عیسائیوں کی یکساں طور پر ملک بننا چاہیے۔

اس بارے میں ابھی کوئی تفصیلی بحث کرنا بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بظاہر یہ خواب ہی سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ اگر آج سے ہم اس خواب کے سا خیال کو بطور اپنے نصب العین کے پیش نظر رکھیں تو ایک دن اُردو یونیورسٹی بنا لینا بھی ممکن ہو۔

(۴) کسی زبان کی پوری نشو و نما کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسکے سرمایۂ ادبی میں وہ تمام علوم و فنون داخل ہو جائیں جو اُس زبان کے بولنے والوں کی تمام ضروریات پر حاوی ہوں۔ یا یوں سمجھیے کہ اُس زبان کے ذریعہ سے ہر قسم کے وہ علوم پھیل سکیں جن سے اہل ملک کی ادبی، علمی، معاشرتی، اقتصادی و سیاسی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ یہ بہت ممکن ہے بلکہ شاید ضروری ہوگا کہ آگے چل کر خود اس مرکزی انجمن کو مختلف شعبوں پر تقسیم کر دیا جائے اور ہر شعبہ کے متعلق الگ الگ علوم و فنون کی تدوین کر دی جائے۔ لیکن جب تک کام کا پیمانہ نسبتاً

محدود رہے لازم ہوگا کہ ایک ہی مجلس ان سب صیغوں کا کام انجام دے۔ لیکن دوسرے شعبوں سے بحث کیے بغیر اگر صرف سیاسیات کی تدوین کا ذکر کیا جائے تو یقیناً یہ اس انجمن کے اصل کے قطعاً منافی ہوگا جو ایک خالص تعلیمی مجلس کے ماتحت ہو۔ علی الخصوص جبکہ ارباب علی گڈھ سیاسیات کو اس قدر متوحشانہ نظروں سے دیکھتے اور سیاسی آب وہوا کی سمیت سے اس درجہ بھاگتے ہیں کہ کانگریس اور لیگ کے جلسے اگر لکھنؤ یں ہوں تو وہ اُنکی دعوت پر التفات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔

انجمن کے لیے ایک مستقل مرکز کی ضرورت

ابتدا سے اب تک انجمن ترقی اُردو کا کوئی مستقل مرکز نہیں رہا۔ بلکہ اُسکا مرکز وہیں ہوتا ہے جہاں اُس کا سکرٹری رہے۔ مولانا شبلی کے عہد میں حیدرآباد اُس کا مرکز تھا، تو مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کے زمانے میں بھیکن پور یا علی گڈھ۔ پھر مولوی عزیز مرزا مرحوم کے عہد میں لکھنؤ اُس کا مرکز بنا اور اب مولوی عبدالحق صاحب اُسے اورنگ آباد لے گئے ہیں۔ اور آگے نہیں معلوم کہاں کہاں کی خاک چھاننا اس کی قسمت میں ہو۔ کیونکہ اگر آج ہمارے محترم دوست جو اس انجمن کی موجودہ سرسبزی کے واحد ذمہ دار ہیں کسی اتفاق سے ریاست حیدرآباد کے کسی غیر معروف قریہ کو اپنا مستقر قرار دے لیں یا ریاست سے نکل کر کشمیر، برہما، سندھ، ڈھاکہ، یا کراچی کو جا بسائیں تو ہمیں ان دور دراز مقامات میں سے کسی جگہ کو اپنا مرکز بنانا پڑے گا۔ اور یا اس سچے مخدوم کی بیش بہا خدمات سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نہ وہ ہمارے لیے موزوں ہے اور نہ یہ پسندیدہ ہو سکتا ہے۔

اب تک انجمن کا دائرۂ عمل محدود رہا ہے اس وجہ سے مرکز کی یہ تبدیلیاں چنداں دشوار اور تکلیف دہ نہیں ثابت ہوئیں۔ لیکن اگر وسیع پیمانے پر اس کام کو کرنا ہے تو اس بڑے نقص کو رفع کر دینا چاہیے۔

یہ بحث اس وقت بالکل قبل از وقت ہوگی کہ یہ مرکز کہاں قائم ہو۔ اور باوجودیکہ ہم لکھنؤ کے

اُن حقوق کا نہایت قوی احساس رکھتے ہیں جو زبان اُردو پر اُسے حاصل ہیں اور اُس بہت سی خوبیوں اور آسانیوں کو پوری قوت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں جو بحیثیت مرکز کے لکھنؤ آج اپنی بے بضاعتی کے عالم میں بھی پیش کر سکتا ہے لیکن اگر لکھنؤ کے بجاے دہلی، آگرہ، لاہور، حیدرآباد، علی گڈھ، الہ آباد، پٹنہ، بدایوں وغیرہ کوئی مقام اس کا مرکز قرار دیا جائے تو موجودہ حالات کے لحاظ سے ہر طرح پر قابل اطمینان ہونا چاہیے۔ باقی یہ جو موجودہ حالت ہے کہ انجمن ترقی اُردو کا دفتر ایک گرد اور یا پھیری لگانے والے بساطی کی طرح مارا مارا پھرتا ہے کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔ بے شبہ کام کرنے والوں کی آج جو کمی محسوس ہو رہی ہے، اُس پر نظر کر کے آسان یہی معلوم ہوتا ہے کہ مجالس کے دفاتر سکرٹریوں کے ساتھ گشت کرتے رہیں مگر جب کام بڑھے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ کس قدر دشوار اور ناممکن العمل ہے۔

کام کرنے والی جماعت

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے، سکرٹری کی ذات واحد اب تک انجمن کی مرادف سمجھی جاتی رہی ہے۔ اور اگر یہ مولوی عبدالحق صاحب جس مستعدی، انہاک اور سچے ذوق کے ساتھ انجمن کا کام کر رہے ہیں، یہ محض اُسی کا نتیجہ ہے کہ تین سال کی مدت میں انجمن ترقی اُردو کی بنیادیں اس قدر مستحکم ہو گئی ہیں اور اتنا علمی کام ہو گیا ہے کہ اس سے قبل کے دس برس سے اگر مقابلہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے اور اُن کی خدمات کا دل سے اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ تنہا نہ ہوتے اور کم سے کم دس بارہ آدمی ایسے اور مل جاتے جو اسی قدر نہیں تو اس کے دسویں حصوں کے برابر بھی کام اگر کرتے تو آج اس انجمن کی حالت کتنی بہتر ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی طرح علمی خدمت کرنے والے زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن خود مولوی صاحب کے ان کمالات اور اس مستعدی اور اہلیت کا اب سے تین چار سال قبل کون اعتراف کرنے کے لیے تیار رہتا۔ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس طرح مولوی صاحب ممدوح نے اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیا ہے، چند اور افراد مُلک میں نکل آئیں جو کم سے کم اُن کا ہاتھ ہی بٹائیں حقیقت

یہ ہے کہ اس کا بہتر جواب تو تجربہ ہی دے گا لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر سارے ہندوستان میں صرف ایک ہی شخص کے ذمہ اُردو کی خدمت کرنا واجب ہے تو بس، پھر یہ کام ہو چکا۔ مگر نہیں، مایوسی کی ابھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پہلے ہمیں کوشش کرکے دیکھنا چاہیے اور تلاش کرکے کام کے آدمیوں کو میدانِ عمل میں لانا چاہیے۔ اور یقین واثق ہے کہ ملک میں بہت سے ایسے اصحاب موجود ہیں جو ہمارے کار آمد ہوسکتے ہیں۔ نظر بریں حالات ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے قواعد وضوابط میں مناسب ترمیم واصلاح کی جائے۔ ہمارے ذہن میں اصلاحات کا جو خاکہ ہے وہ یہاں درج کیے دیتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ہوا خواہان انجمن بھی اگر اپنے اپنے خیالات وتجاویز پیش کریں تو ان سب پر یکجائی غور وبحث کرنے کے بعد ضرور کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔

یہاں تک تو قلمبند کیا ہوا موجود تھا۔ اب اسکے بعد وہ خاکہ رہ جاتا ہے جو انجمن کے نظام اساسی کے متعلق ہمارے ذہن میں تھا۔ اُس وقت جیسا کہ ماہِ گذشتہ میں عرض کیا گیا تھا، چونکہ ارادہ بدل گیا تھا، اس بنا پر اسکی تکمیل کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اس دفعہ اتنا موقع نہ تھا کہ ان اجزا کے ساتھ وہ خاکہ بھی درج کیا جائے آیندہ نمبر میں انشاءاللہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

اسی اثنا میں ہمارے عزیز اور محترم دوست مولوی عبدالحق صاحب نے، جن کی مساعیِ جمیلہ سے انجمن ترقی اُردو آج اس منزل پر پہنچی ہے کہ لوگوں کو اُسے ایک آزاد اور مستقل مرکزی کانفرنس کی شکل میں تبدیل کرنے کی اُمنگ پیدا ہوئی ہے، پنڈت کشن پرشاد صاحب کے گشتی مراسلے کے جواب میں ایک خط اخبار ہندوستانی میں شایع کرایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود سکرٹری صاحب انجمن ترقی اُردو اسے پسندیدہ نہیں سمجھتے کہ انجمن ترقی اُردو کو ایجوکیشنل کانفرنس کی ماتحتی سے آزاد کرنے کی کوئی کوشش بھی کی جائے۔ آیندہ نمبر میں حسب گنجایش ہم اس خط پر بھی ایک نظر ڈالیں گے۔

تصانیف مولانا سید احمد لکھنوی الملقب بہ علامۂ ہندی

حمایت الاسلام

اس کتاب میں عقلی دلائل سے مذہب کی ضرورت پرایک پُرزور آرٹکل لکھا گیا ہے اور حقی الوسع مذہب کی فلاسفی اور عبادات کی عقلی خوبیاں ثابت کرنے میں فوق العادۃ کوشش کی گئی ہے۔ غسل۔ وضو۔ نماز۔ وغیرہ کے نکات میں جس فلسفی طریق پر آج کل کے جدید طرز سے بحث کی گئی ہے اُسکی جدت آفرینی ثابت کررہی ہے کہ باخبر مصنف کو ضروریات زمانہ کے ساتھ فلسفۂ جدیدہ میں بھی غیر معمولی دستگاہ حاصل ہے۔ مسلمانوں کے عام ادبار اور علماء کی خاص غفلت پر نظر کرتے ہوئے بہت کم امید تھی کہ مسائل مذہبی پر بسیط ریویو کرکے ہر مسئلہ کے حسن و قبح عقلی پر منصفانہ ریمارک کیے جائیں گے لیکن خدا کا شکر ہے کہ جناب مولوی سید احمد صاحب قبلہ مجتہد شیعہ کی قابل تعریف توجہ نے علما کو اس بار الزام سے سبکدوش کرنے میں ایک حد تک ابتدائی کامیابی حاصل کی ہے۔ کتاب میں قابل لحاظ یہ بات ہے کہ ہر چند ایک شیعی المذہب مجتہد العصر کی تصنیف ہے مگر تعصب کی آلائش سے بالکل پاک و صاف، کسی غیر مذہب سے تعرض نہیں۔ اُردو کی سلیس اور شستہ زبان میں جس تہذیب سے گفتگو کی گئی ہے اسکا ٹھیک اندازہ اُسوقت مل سکتا ہے جب پہلے بنا الاسلام پر نظر پڑ چکی ہو

(ریویو رسالہ البیان لکھنؤ) قیمت ہر دو جلد ١٢ آنہ

فلسفۃ الاسلام

کے سلسلے میں "فن ہیئۃ" اور "فن کیمسٹری" (کیمیا) پر بھی دو رسالے علامۂ موصوف نے لکھی ہیں جن میں قدیم و جدید فن کو نہایت خوبی کے ساتھ باہم پیوست کر دیا ہے ان کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدیم علوم کہاں تک تکمیل کو پہنچ گئے تھے اور علماے جدید نے جو تحقیقات اور اضافے کیے ہیں وہ کیا ہیں اور کتنے قیمتی ہیں۔ رسالہ فن ہیئۃ کی قیمت ۸ آنہ اور رسالہ فن کیمسٹری کی قیمت ۶ آنہ ہے۔

ایڈیٹر کا حشر۔ مولوی ظفر علیخاں صاحب بی اے کا لکھا ہوا ایک نہایت عبرتناک افسانہ۔ اخبار نویسوں کی مالی مشکلات کی سچی تصویر قیمت صرف ١٠ر

چابک نامہ حکیم چابک کی اس کتاب میں ہزار برس پہلے قیامت کے حالات لکھ گیا ہو جو سب ٹھیک نکل رہے ہیں قیمت ٣ر

خواجہ خضر کے حالات کون مسلمان ہے جو خواجہ خضر کے نام سے واقف نہ ہو اُنکے مبارک اور مقدس اور پرسوز حالات اس رسالہ میں ہیں۔ قیمت ١ر

علم الحدیث۔ حدیث پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا نام ہے اور اسلیے ہر مسلمان کیلیے انکی پیروی ضروری ہے لیکن احادیث کی نوعیت پر کامل غور و خوض اور امتیاز کی حاجت ہے جس حدیث کے راوی ثقہ نہ ہوں وہ قابل حجت نہیں ہو سکتی۔ مولانا عبد العلی ہروی نے اس رسالہ میں احادیث کے اقسام و نوعیت اور انکے مدارج اور معتبر و غیر معتبر راویوں کو بہت واضح اور مدلل طور پر بیان کیا ہے جو تمام مسلمانوں کے ملاحظہ کے لائق ہے۔ قیمت ۸ آنہ

مینیجر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ

عربوں کا فنِ تعمیر

اس کتاب میں شمس العلماء ڈاکٹر سید علی صاحب بلگرامی بیرسٹر ایٹ لا نے مورخانہ حیثیت سے فن تعمیر پر نظر ڈالی ہے اور اسکی مختصر کیفیت بیان کرکے دنیا کو آگاہ کرنا چاہا ہے کہ عربوں نے فن تعمیر میں کہاں تک کمال اور دستگاہ حاصل کی تھی۔ عرب اور دیگر مشہور دیار و امصار میں انکی عمارتوں کے مختلف نمونے پائے جاتے ہیں انکو بتفصیل بیان کیا ہے اس کتاب کے دیکھنے سے عربوں کی صناعی اور دستکاری کا بخوبی پتہ چلتا ہے ناظرین کے لیے یہ کتاب نہایت دلچسپ اور تاریخی معلومات کا اضافہ کرنے والی ہے۔ قیمت عہر

حیاتِ خسرو

حیات خسرو میں منشی محمد سعید احمد صاحب مارہروی نے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے سوانحی حالات اور تصنیف و تالیف کی کیفیت بیان کی ہے۔ حضرت امیر خسرو کی شاعری اور انکی مقدسانہ زندگی اور متصوفانہ جذبات کا مطالعہ منظور ہے تو حیات خسرو کو مطالعہ کرنا چاہیے تمام حالات نہایت دلکش انداز سے بیان کیے گئے ہیں قیمت ۱۱ر

تذکرۃ المصطفٰے

اس کتاب کے نام سے اسکی حالت ظاہر ہے مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ کوئی بات دلآویز نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے مقدس پیغمبر علیہ السلام صلعم کے مبارک اور نصیحت بخش حالات سے واقف ہوں مولوی سید نواب علی صاحب نیوتنوی ایم اے ایس سی پروفیسر بڑودہ کالج صوبہ گجرات نے نہایت تحقیق و تدقیق سے اس کتاب کو تالیف کیا ہے اسلوب بیان بہت ہی صاف اور دلکش ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ کتاب کارنامۂ رشد و ہدایت ہے قیمت عہر

الاسلام

مصنفہ مولوی فتح محمد خاں جالندھری اسمیں تمام مسلمانوں اور بچوں اور عورتوں کو اسلام کے ضروری عقائد سکھانے کیلیے مسائل مفید تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر

کلامِ اقبال

اگر آپ اپنے قومی شاعر کی لاجواب نظموں کا مجموعہ ملاحظہ فرمانا چاہتے ہوں تو فی سٹ ایک روپے میں ملے گا جس میں مندرجہ ذیل نظمیں نہایت خوشنما اور برابر کی تقطیع پر چھپی ہوئی ہیں: شکوہ۔ جواب شکوہ۔ بلال۔ فریاد امت۔ نالۂ یتیم۔ شمع و شاعر۔ قومی درد سے آشنا دل کے لیے یہ لاجواب تحفہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب فرمائیے

منیجر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ

مسلمانوں کے تنزل کے وجوہات

(پروفیسر فیروزالدین مراد ایم۔ ایس سی، بی۔ اے کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ)

مسلمانوں کے تنزل کے سے اہم واقعہ کے متعلق بہت کم اختلاف ہے۔ اس تنزل کے اسباب دریافت کرنے کی غرض سے ہم اس مضمون میں آج کل کی دُنیاے اسلام پر ایک محققانہ نظر بغیر کسی قسم کے تعصب کے ڈالنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم کو ایک ایسی اصطلاح کے متعلق فیصلہ کر لینا چاہیے جس کو ہم اکثر مرتبہ اس مضمون میں استعمال کریں گے۔ جب ہم خصوصیات شخصی و قومی میں تفریق کرتے ہیں تو ان خصوصیاتِ قومی سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟ کیا ہم ایک فرد یا چند نمایاں افراد کی خصوصیات کو خواہ وہ اچھی ہوں یا بُری، قوم کی خصوصیات قرار دے سکتے ہیں؟ اس بحث کا آخری فیصلہ ہم فلسفیوں پر چھوڑتے ہیں۔ اپنے مطلب کے لیے ہم کو یہ بیان کر دینا کافی ہو گا کہ خصوصیاتِ قومی سے ہماری مراد افراد کی ایک معتدبہ جماعت کی خصوصیات سے ہے۔

ہم مسلمانوں کی گزشتہ و موجودہ تاریخ سے چند مثالیں بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں جب مسلمانوں کو اول اول فلسفۂ یونانی سے سابقہ پڑا تو ان میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جس کے عقائد تذبذب کی حالت میں تھے۔ اور جس نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس فرقہ نے بوجہ اسلام کے اصول سے ناواقف ہونے کے یہ خیال کیا کہ تعلیمات اسلامی اور اصول فلسفۂ یونانی میں بُعد المشرقین ہے۔ ایک اور فرقہ تھا جو کسی قدر عقائد میں سخت تھا مگر کوتاہ نظر تھا۔ اس فرقہ نے بزعم خود اس لامذہبیت کے خیالات کو باطل کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے اُس نے فلسفۂ یونانی اور سائنس کے پڑھنے کو ناجائز قرار دیا۔ لیکن ان میں دُوراندیش بھی تھے جن کی بفضلہ تعداد زیادہ تھی۔ جن کو صاف طور سے یہ معلوم ہو گیا کہ دونوں مذکورۂ بالا فرقے

غلطی پر ہیں - نیز سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ تمام علوم و فنون کا نہایت غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے اور جہاں کہیں اسلام اور سائنس کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ ہاں ان دونوں کی موافقت دکھلانی چاہیے - اُن کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ درحقیقت اسلام اور سائنس میں کوئی تنازع نہیں بلکہ جو بظاہر ان میں اختلاف نظر آتا ہے وہ درحقیقت اتحاد ہے ۔

درحقیقت اُس زمانہ کے مسلمان آج کل کے مسلمانوں سے بدرجہا بہتر تھے وہ نہ صرف اپنی مذہبی تعلیمات ہی میں سرگرم تھے ، بلکہ اپنے زمانے کی رفتار سے اچھی طرح واقف تھے ۔

بالآخر یونانی فلسفہ اور سائنس کو اسلامی فلسفہ میں جگہ دی گئی اور علم کی ایک نئی شاخ اور فلسفیوں کی ایک نئی جماعت نے اس جگہ کو اور دوبالا کر دیا ۔ وہ شاخ علم کی علم کلام ہے اور فلسفیوں کی جماعت سے مراد متکلمین کی جماعت ہے ۔ جن کا کام یہ تھا کہ اسلام کو تمام بیرونی حملوں سے محفوظ رکھیں اور جو اعتراضات اسلام پر کیے جاتے ہیں اُن کا معقولات میں جواب دیں - آج کل بھی اسی قسم کا منظر نظر آتا ہے ۔ انسان اب قدرت سے اس قدر واقف ہے جس قدر کہ وہ پہلے کبھی نہ تھا ۔ قدرت کے تمام وہ اسرار جو لاینحل سمجھے جاتے تھے اب بہت کامیابی کے ساتھ حل ہو گئے ہیں ۔ اور اُن کی بجائے نئے اور اہم حل طلب مسائل پیدا ہو گئے ہیں - ایک دوسرے مضمون سائنس اور اسلام میں ہم نے دکھلایا ہے کہ کس طرح یورپ نے علم کی روشنی مسلمانوں سے حاصل کی اور کس طرح اب مسلمان اپنی گم کردہ پونجی سے بے پرواہ ہیں ۔

مسلم کیمپ میں پھر تفرقہ پھیل گیا ہے ۔ لیکن اس مرتبہ بدقسمتی سے مذبذبین کی تعداد زیادہ ہے - انکو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ اسلام کی فتح ہوتی ہے یا سائنس کی ۔ انھیں تو اپنا اُلو سیدھا کرنا ہے ۔ جس چیز کی درحقیقت زمانہ کو سخت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ فلسفۂ قدیم کی توسیع اور ترمیم ایک نئے علم کلام کی صورت میں کی جائے ۔ جس سے پھر از سرِ نو سائنس جدید اور اسلام کے درمیان رشتہ اتحاد قائم ہو ۔ اور جو کچھ کاوش دونوں کے درمیان ہے وہ دُور ہو جائے ۔

کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدائی ہدایت سے اسلام ہی ایک سچا مذہب ہے۔ اور وہ مسلمان جن کے دماغ میں سائنس کی طرف سے تعصب نہیں ہے وہ جانتے ہیں کہ سائنس کا منشا، صرف یہ ہے کہ اُن اصولوں کو دریافت کرے جن پر خدائی کارخانۂ قدرت چل رہا ہے۔ سائنس اور اسلام ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ جہاں کہیں سائنس اور اسلام کی سرحدیں ملتی ہیں وہاں پر کلام الٰہی اور فعل الٰہی (قدرت) میں کوئی تخالف نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مسئلہ جس کی نسبت ہم یہاں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ موجودہ مسلمانوں کا اپنے آپ کو مذہب سے علیحدہ رکھنا ہے اور اپنے شعائر جلی سے بے خبر رہنا۔ ان کے آبا و اجداد اپنی خصوصیاتِ قومی کے برقرار رکھنے میں بہت سرگرم تھے۔ اور یہ سرگرمی کچھ صرف مسلمانوں ہی سے وابستہ نہ تھی بلکہ وہ تمام قومیں جو زندہ رہنا چاہتی ہیں، وہ تمام باقیماندہ دنیا سے اپنے آپ کو ممتاز رکھنے میں کوشاں رہتی ہیں۔ اس قومی تفریق سے مراد نہیں کہ خواہ نخواہ دوسروں کی حقوق تلفی کی جائے۔ بلکہ یہ صرف اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور بغیر اس کے قومی زندگی محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف مذاہب میں ایک خاص قسم کی عبادت اور اسی طرح کی اور چیزوں کو ملاکِ قومی تصور کیا گیا۔

تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ جائے پیدائش یا تربیت یا قبل از اسلام اُن کے حالات کا ان پر بحیثیت مسلمان ہونے کے کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جب مسلمان فوجوں نے ایران کو فتح کیا اور ایک دوسرے تمدن سے سابقہ پڑا تو اُن کو بہت سختی کے ساتھ حکم دیا گیا کہ وہ سرمو بھی اپنی خصوصیات قومی میں فرق نہ آنے دیں۔ یہاں تک کہ اُن کو یہ حکم تھا کہ تھین کُرتا نہ پہنیں اور سوائے عربی النسل گھوڑوں کے دوسروں پر نہ سوار ہوں۔ آج کل کے مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف دیکھیں اور معلوم کریں کہ اس بنیادی اصول پر عیسائی اور ہندو کس قدر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ ہم صحت کے ساتھ نہیں

کہہ سکتے ہیں کہ آیا ہندوؤں میں چھوت کی اجازت مذہب کی طرف سے بھی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ چاہے چھوت کے خلاف کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو ان کے مذہب کی طرف سے یہ حکم امتناعی ملا ہوگا کہ تمام قسم کی گندگی اور غلاظت سے اپنے آپ کو پاک رکھیں لیکن طریقۂ چھوت جیسا کہ ان میں رائج ہے بہت ہی سخت ہے اگر کوئی مسلمان یا کوئی عیسائی غرضکہ کوئی غیر ہندو کسی ہندو کے کھانے کو چھولے (یا اس برتن ہی کو جس میں کھانا ہوتا ہے) تو اس کھانے کو ناپاک سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ گویا کہ صرف چھونے ہی سے وہ کھانا کھانے کے قابل نہ رہا اور ناپاک ہوگیا۔ قطع نظر اس کے کہ غیر ہندوؤں پر اس کا کیا اثر پڑا ہندوؤں کو خود اس رسم سے بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ تمام ہندو ہندو دوکانداروں ہی سے خرید و فروخت کرتے ہیں۔

یورپ کی عیسائی قوموں نے بغیر چھوت کے اس عجیب لا اصول مسئلہ پر اعتقاد رکھتے ہوئے دنیا کو اپنی دیرینہ روش سے یہ دکھلا دیا ہے کہ وہ غیر یورپین یا غیر عیسائی قوموں کی ہرگز اتباع نہ کریں گے۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتے ہیں وہ بلا لحاظ آب و ہوا کے اور بلا لحاظ اپنے سفارت کے اپنی پوشش اور اپنی عادات و اطوار برقرار رکھتے ہیں۔ اور یہ اُن کی طرف سے جارحانہ کارروائی نہیں ہے۔ اس مسلکِ خودداری پر چلنا انکی عقلمندی کی دلیل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اور نیز دیگر اسلامی ممالک کے مسلمان اپنی دیرینہ اور مذہباً جائز عادات کو چھوڑ رہے ہیں اور انکے بجائے غیر قوموں کے عادات و اطوار اختیار کرتے جاتے ہیں۔ ان کو یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ انھیں صرف آج ہی کی فکر کرنی ہے، بلکہ اُن کو عقل کی ہدایت پر کام کرنا چاہیے اور کل کا بھی خیال کرنا چاہیے۔ چند موہوم فائدوں کی بنا پر اُنھوں نے یورپ کو اپنے لیے نمونہ بنا رکھا ہے۔ اور جو درحقیقت سب سے بڑا عیب ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے نمونے کی تمام برائیوں کو بلا سوچے سمجھے اختیار کرتے جاتے ہیں، لیکن اسکے محاسن کی

تقلید میں مطلقاً کوشاں نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم و ترقی یافتہ جماعت کو دو الزام ٹھیرتی ہے۔ کیونکہ بجاے اس کے کہ وہ یورپ کی اتباع مختلف علوم و فنون کے فروغ دینے میں کریں یا قومی تنزل کے اسباب علل کے دریافت کرنے کی فکر کریں۔ درانحالیکہ ان میں سے ہر ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں وہ اپنی موجودہ تعلیم و تہذیب کا بہترین استعمال کر سکتے تھے۔ وہ اپنی تمام قوتیں فیشن کی پیروی میں فضول ضائع کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے آبائی طرز و طریق کو بالکل بھلا دیا ہے۔ گویا ان کا ماضی ان کے حال سے بدتر تھا جس میں وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک وضع ایسی اختیار کی ہے جو اُن کے مذہبی فرائض کی ادائگی میں حارج ہے۔ علاوہ بریں بالکل بیکار ہے۔ اُنھوں نے اپنے طرز معاشرت کو بالکل بدل دیا ہے۔ اُنھوں نے کھانے تک میں یورپ کی تقلید کی ہے، گویا کہ تیرہ سَو برس سے وہ بلا شکم کے تھے۔ وہ برابر سرعت کے ساتھ قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں۔

یہ واقعی عجیب بات ہے کہ بجاے اس کے کہ یورپ دوسروں سے سبق حاصل کرے وہ تمام دنیا کا اُستاد بنا ہوا ہے۔ جب ہم انگلینڈ جاتے ہیں، تو ہم سے قدرتی طور پر یہ امید کیجاتی ہے کہ ہم اُس ملک کے رسم و رواج سے واقف ہوں گے۔ لیکن یہ ہمارے دماغوں کی عجیب تخریب ہے کہ گھر بیٹھے ہوے ہم صرف شاگرد ہی بننے پر قانع ہیں۔ کیا یہ خلاف فطرت نہیں ہے۔ انگریز لوگ ہندوستان میں رہ کر کیوں ہمارے رسم و رواج کو نہیں اختیار کرتے۔

ہم کو نہایت وسیع الخیال ہونا چاہیے اور یورپ سے صرف اسی قدر سیکھنا چاہیے جتنا کہ ہمارے لیے مفید ہے۔ ہم کو یہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ہمدرد انگریز اس غلامانہ حیثیت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ہم اپنے انگریز حکمرانوں اور دیگر ابناے حکومت سے دوستانہ تعلقات پیدا کر سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ ہم اپنی صورت اور سیرت کو بلا سوچے سمجھے اُنکے قالب پر ڈھالیں۔ ہم کو امید ہے کہ اس مقام پر ہماری طرف سے غلط فہمی نہ پیدا ہوگی اور ہمارے الفاظ کے فرضی معنی نہ پہنائے جائیں گے۔

ہم ابھی تک مسلمانانِ ہندوستان کی مذہبی بے توجہی اور قومی نکبت کا تذکرہ کرتے آئے ہیں، لیکن ہم کو یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ اب ایک امید افزا دَور شروع ہو گیا ہے۔ اب قرآنِ مجید ہماری الماریوں کی صرف زینت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے معانی اب زیادہ اچھے طریقے پر سمجھے جاتے ہیں۔ اور ہم کو ہر طرح سے امید ہے کہ اس قسم کی تازگی بخش کوششوں کا شروع ہی میں خاتمہ نہ ہو جائے گا۔ بعض مقتدر مسلمان علما نے ایک انجمن علم کلام کے انعقاد کی رائے دی ہے۔ اور ایک بڑی جماعت تعلیم یافتہ اور نیز غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اپنی ذمہ داریوں اور اپنے فرایض کو سمجھنے لگی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے مسلمانانِ ہندستان اب بھی بہت پیچھے ہیں۔ اوائلِ ایامِ اسلام میں مسلمانوں کے لیے اپنے مذہب کی اشاعت میں اپنی جانوں کی قربانیاں کرنا بہت آسان تھا۔ وہ مذبذبین میں سے نہ ہوتے تھے، بلکہ اُن کے لیے یہ نہایت خوشی کی بات ہوتی تھی کہ وہ اپنے خدا و عقبیٰ پر ایمان کا اس قدر زبردست ثبوت پیش کریں۔ بہت سے تاریخی واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان عین وقتِ موت پر چلّا اُٹھے کہ ہم نے اپنے زندگی کے مقصد کو پا لیا۔ آج کل کے مسلمانانِ ہندستان کو اپنی جانوں کے قربان کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خدا کو کمتر قربانیوں سے خوش کر سکتے ہیں۔

ان تمام گذشتہ صدیوں میں مسلمان جس تنزل کا نشانہ رہے ہیں اُس کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے ہم اپنے قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک طرف تو امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ، امیر معاویہؓ کی پہلی صدی ہجری کے تصفیہ پر غور کریں۔ اور دوسری طرف چودھویں صدی ہجری میں مراکو کے مولائی حافظ اور عبد العزیز کی لڑائیوں پر فکر کریں۔ ہم کو یہاں اس سے غرض نہیں کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے تصفیہ کی کیا نوعیت تھی اور نہ ہمارے لیے یہ زیبا ہے کہ اس قدر صدیاں گزر جانے کے بعد ہم اپنے آبا و اجداد کے افعال پر رائے زنی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم یہاں پر کوئی مذہبی قصہ نہیں چھیڑنا چاہتے۔ بلکہ ہمارے لیے

یہی کافی ہے کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے اس قول کے ساتھ ہم نوا ہوں کہ ہم اُن چیزوں سے ڈرتے ہیں جن کی بابت خدائے تعالیٰ ہم سے بروزِ قیامت بازپرس کرے گا - اور جس میں حضرت علی اور امیر معاویہ کا قصہ نہیں ہے"۔ جس بات سے ہم کو غرض ہے وہ امیر معاویہ کا برتاؤ رومیوں کے اُس بیہودہ خط کے ساتھ ہے جسکی تفصیل حسب ذیل ہے -

مسلمانوں کی فوجوں نے شام میں عیسائی قوت کی اچھی طرح سرکوبی کردی تھی۔ اسی وجہ سے رُومی اس بات کے خواہاں تھے کہ حضرت علی اور امیر معاویہ کے جھگڑے کو اپنا بدلہ نکالنے کے لیے ایک آڑ بنائیں اور وہ دوستی کے پیرائے میں۔ لہذا جب انھوں نے اس خانہ جنگی کا حال سُنا تو بہت جلد ایک قاصد امیر معاویہ کے پاس ایک خط دے کر بھیجا۔ جس میں امیر معاویہ کو ایک شہنشاہ گردانا گیا تھا اور ان کے دعاوی کو صحیح مانا گیا تھا۔ اور گویا دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے حضرت علی کے خلاف مدد دینے کی اجازت طلب کی گئی تھی۔ اس میں یہ تحریر تھا کہ ایک رومی لشکر فوراً حضرت علی کے خلاف امیر معاویہ کی مدد کے لیے روانہ کیا جائیگا۔

چودھویں صدی کے مسلمان شاید اس خط کو امیر معاویہ سے بالکل مختلف پہلو سے دیکھتے، وہ بے شک اس کو ایک شگونِ نیک سمجھتے۔ لیکن پہلی صدی کے مسلمانوں کے دلوں میں حیات کی وہ چنگاری تھی جو آج کل کے مسلمانوں سے قطعاً مفقود ہے - وہ دوست دشمن میں تمیز کر سکتے تھے اور بہت دُور اندیش واقع ہوے تھے - امیر معاویہ کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے جبکہ وہ خط کے عجیب مضمون پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں - ان کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور اس زہریلے مضمون والے خط کو پھینک کر وہ قاصد سے ایک سخت لہجے میں اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ "اپنے آقا سے کہدو کہ مسلمان اپنے جھگڑوں کو خود فیصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی رومی فوج مسلمانوں کی سرزمین میں حضرت علی سے لڑنے کے لیے داخل ہوگی تو سب سے پہلے جو شخص اُس سے لڑنے اور اُسکے پرخچے اُڑانے کے لیے تیار ہوگا وہ میں ہوں گا! علی میرے بھائی ہیں اور ہم کو اپنے برادرانہ جھگڑوں کے فیصل کرنے کے لیے کسی غیر کی مدد کی ضرورت نہیں ہے"۔

یہ تصویر کا روشن پہلو تھا۔ اب اس کے تاریک پہلو پر نظر ڈالنا چاہیے۔ مسلمانوں کو ہٹتے ہوئے تیرہ سو برس ہو گئے۔ اور مراکو کے سلطان کو وہی مہم درپیش ہے جو امیر معاویہ کو پیش تھی، جبکہ رومیوں نے اپنی مطلب برآری کے لیے اُن کو آڑنا چاہا تھا۔ مولائی عبدالعزیز مراکو کا بزدل سلطان سفید حُسن کی دل لُبھانے والی اداؤں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ اپنے آپ کو عیش و عشرت کے حوالے۔ اس کی مسلمان رعایا اسکی زیادتیوں سے تنگ آکر اسکو معزول کرتی ہے اور اسکے بھائی مولائی حافظ کو تخت نشین کرتی ہے۔

ہمارے سامنے دو بھائیوں کا قصہ موجود ہے، جو ایک سلطنت کے لیے ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ فرانس اور اسپین عبدالعزیز اور اسکے بھائی کے خلاف مدد کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور بُزدل اور بے سمجھ سلطان ان کی اس دوستانہ مداخلت پر شکریہ ادا کرتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ باقی قصہ کیا ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی خلافت صدیوں تک قائم رہی اور ان کی جگہ مسلمان ترکوں نے لے لی۔ لیکن مراکو کی سلطنت ایک افسانہ اور ایک قصہ ہے۔ جو کچھ اُس نے آج تک انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ یورپ میں جوع الارض کے مرض کو تقویت حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع بہم پہنچا دیا۔

ان دونوں واقعات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ آیا دول یورپ غیر یورپی طاقتوں کے اس طرح کی دوستانہ مداخلت کو گوارا کریں گی یا چین کے جنگی جہازوں کی آمد کو جھگڑوں کے فیصل کرنے کے لیے پسند کریں گی۔

آج کل کے مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت اسلام اور اُسکے ماضی کے لیے باعث ننگ و عار ہے۔ ہمارے کانوں میں چاروں طرف سے انسان کے باہمی حقوق کے متعلق آوازیں آتی ہیں۔ کیا وہ مسلمان جو اپنی کمینہ شال سے دوسرے مسلمانوں کے اقتدار کو گرا رہے ہیں۔ بنی نوع انسان کے حقوق ادا کر رہے ہیں۔ کیا وہ بھول گئے ہیں کہ زندگی تمام فانی نمود و وجود کے سمندر میں صرف ایک بُلبُلا ہے۔ ہمارے اُن بھائیوں کو جنھیں ہماری باتیں بری معلوم

ہوں اُن کو چاہیے کہ اپنی عادات کی اصلاح کریں اور اپنی زندگی کو بہتر طریقہ پر بسر کریں پھر ہماری باتوں کی تلخی بالکل جاتی رہے گی۔

حیلہ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام کا ایک سچا نمونہ پیش کریں۔ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی شاندار زندگی ان کے لیے نمونہ ہونا چاہیے۔ ان کی زندگی کے اصولوں کا ماخذ رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہونا چاہیے۔ اور اختلافاتِ زمانہ کی تغیر پذیر ضروریات کو اپنے نئے خیالات کے ذریعہ سے پورا کرنا چاہیے جو اسلام کے اصول کے مطابق اور مسلمانوں کی ماضی کے موافق ہوں۔ یورپ کو تہذیب جنگہائے صلیبی کے زمانے میں مسلمانوں کے میل جول سے حاصل ہوئی۔ اسکی ترقی اور اسکے علوم کا احیاء ان سب کا ماخذ اور مخرج اسلام کا سرچشمہ ہے۔ پادریوں کی یہ سب سے بڑی حکمت عملی ہے کہ وہ ہمیشہ اسلام کے متعلق زہر اُگلا کرتے ہیں اور اس طرح پر جمہور یورپ کو زندگی بخش اصول سے بے بہرہ رکھتے ہیں۔ لیکن باوجود اسکے فرقۂ پروٹسٹنٹ کا وجود یورپ کے حجت پسند دماغ پر اسلام کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اگر آج کل کے مسلمان اپنی اصلاح کرلیں اور ظاہراً و باطناً اسلام کے سچے پیرو بنجائیں، تو ہر طرح سے امید ہے کہ وہ یورپ پر روحانی فتح حاصل کرسکیں گے۔ فرقۂ پروٹسٹنٹ نے راستہ صاف کردیا ہے۔ صرف راہرو درکار ہیں۔

لیکن پیشتر اسکے کہ ہم ان بعید از وقوع باتوں کی امید رکھیں، ہمارے گھر میں خود ہمارے لیے ایک اہم کام موجود ہے۔ یہ مذہبی تاریخ کا ایک مسلم الثبوت مسئلہ ہے کہ نام نہاد علمائے مذہب نے ہمیشہ اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ انسان فطرتاً اپنی روحانی ہدایت اور مدد کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ یہ احتیاج مذہب میں بہت زیادہ ہے۔ اور فی الواقع کسی چیز کا ایسے بُرے طریقے سے استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ مذہبی معاملوں میں جاہلوں کی اس احتیاج کا۔ یہودیوں کے مربی اس کی کافی شہادت ہیں۔ عیسائی پاپا زمین پر خدا کے خلیفہ ہوگئے، جو خدا کو سفارشی خطوط لکھا کرتے تھے اور ہر طرح سے زمین و آسمان کا اپنے آپ کو حکمران جتاتے تھے۔ سائنس

کی بڑھتی ہوئی رَو کو انھوں نے ہی روکا۔ اور بڑی ہی مشکل سے زمین کی گولائی ان پر ثابت کیجا سکی وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر زمین گول ہے تو حضرت عیسیٰ مسیح کو صرف آدھی دُنیا دیکھے گی۔ اور چونکہ تمام دنیا کا ان کو دکھنا ضروری ہے لہذا مثل طشت کے زمین چپٹی ہے۔ اسی طرح کا خطرہ اسلام کے لیے بھی ان نام نہاد پیروں اور مرشدوں کی صورت میں ہے جو کہ اپنی خودغرضی کی وجہ سے لوگوں کو جہالت میں رکھتے ہیں۔ وہ جاہل مسلمانوں کی سادگی سے ایک باقاعدہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور یہ انسانیت اور اسلام کے ہی خواہان کا فرض ہے کہ ایسے نام نہاد ہادیوں کی چالبازیوں کو طشت ازبام کریں۔ اسلام کے سچے علماء (جن کا شمار اس گئے گزرے زمانے میں بھی کافی ہے) خاموشی اور بغیر کسی نام و نمود کے اپنی بہترین کوشش اپنے ہم مذہبوں کی بہبودی کے لیے صرف کر رہے ہیں۔ لیکن جب تک معاملات کی موجودہ صورت قائم رہے گی ترقی کی بہت کم امید ہے۔ ان تمام برائیوں کو جن کو ہم نے دکھلایا ہے اور ان تمام رایوں کا جو ہم نے پیش کی ہیں خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی زندگی کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق بنانے کی کوشش کریں اور تمام نئی باتوں کو اختیار کرتے ہوئے انھیں عربی کی مشہور مثل "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل کرنا چاہیے۔

المترجم ظہور احمد

زمانِ فصلِ گُل آیا نسیمِ مشکبار آئی
دلوں کو مژدہ ہو پھر جوشِ مستی کی بہار آئی

پھلا پھولا رہے گلزارِ یارب حُسنِ خوباں کا
مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی

سرِ پُرشور بھی اک بار تھا، جسکو مری گردن
ترے کوچے میں آج اے فتنۂ دوراں اُتار آئی

تری محفل میں ہم آئے۔ مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

جو اُنکے حسن سے بھی بڑھ گئی ہے بیقراری میں
تڑپ ایسی کہاں سے عشق میں پروردگار آئی

یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے
ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی

بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرت
جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ اشکبار آئی

حسرت موہانی

الہامِ فطری

دردِ دل یا دردِ الفت ہے جہاں میں ایک چیز جانور تک جس سے ہو جاتا ہے انساں کو عزیز
لاکھ انسانی شرف ہے جو ہر عقل و تمیز قوتِ جذبات سے لیکن نہیں ممکن گریز
نقد و زر کی ہے ضرورت وارِ مکروہات میں
کچھ عجب تاثیر ہوتی ہے مگر جذبات میں

ناز ہے اہلِ عرب کو اپنے چند اوصاف پر یعنی آزادی، تواضع، رحم، اور انصاف پر
فخر ہے ان کو ہمیشہ شیوۂ اسلاف پر بلکہ تازی و عراقی کے بھی کل اصناف پر
یوں تو دنیا میں ہر اک انکی روش مشہور ہے
خاص کر گھوڑوں کی اپنے پرورش مشہور ہے

کاروانوں میں بسر کرتے ہیں اکثر روز و شب اور اُٹھاتے ہیں سفر میں شوق سے رنج و تعب
مل گیا چشمہ کہیں تو کر لیے خیمے نصب ورنہ گھوڑے اور خود، مالِ عرب پیشِ عرب
بود و باش اُنکی وہ صحرائی وہ ارزاں زندگی
فکرِ زر سے بے نیاز ایسی کچھ آساں زندگی

اک مسافر نے لکھا ہے واقعہ یہ چشم دید چاہتا تھا وہ کہ لے اک اسپِ تازی کو خرید
دیر تک ہوتی رہی مالک سے گو گفت و شنید لیکن اسکے ہاتھ آنے کی نہ پائی کچھ اُمید
اک رقم وافر کے بدلے میں جو وہ سائل ہوا
احتیاجِ زر سے بدوی بیع پر مائل ہوا

گو وہ شیدائی رہا دیکھی جو اُسکی چال ڈھال شکل میں طاؤسِ رقصاں، دست و بازو میں غزال

نازبردار جیسے اعرابی کا پیارا نونہال
طے ہوا مشکل سے لیکن اسکی قیمت کا سوال

ہو چکی جب بات چیت اور نقد ٹھیرے اسکے دام
مشتری کے ہاتھ میں دینے کو تھا بدوی لگام

ہاتھ سے اسکے مگر چھوٹی نہیں جاتی تھی راس
اک ہجوم رنج و فرقت تھا بپاے درد و یاس
وقتِ رخصت دیکھ کر بدوی کا چہرہ یوں اداس
اسکے مرکب کو ہوا احساسِ رنج بیقیاس

فکرِ سیم و زر میں گو نوعِ بشر ہے مستمند
اور ہی شے ہے مگر سینے میں قلبِ دردمند

چاہتا کب تھا غرض گھوڑا کہ ہو جائے جدا
جس نے آقا کے قدم پر اپنی گردن دی جدا
جانور میں دیکھ کر یہ پاسِ آئینِ وفا
مل کے خود گھوڑے کی گردن سے عرب رونے لگا

دھل گیا اشکِ ندامت سے مگر دل کا غبار
نفسِ سرکش سے نہ ہونے پایا دامن داغدار

الوداعی لفظ تک منہ سے نہ نکلے اسکے جب
اپنے مرکب پر جو آیا پیار حالت تھی عجب
چوم کر آنکھیں ایال و سُم کھلائے کچھ رطب
دیکھ کر یہ رنگِ الفت رہ گئے حیرت میں سب

نقد قیمت پھیر کر اپنا وہ بے پروا ہوا
بے تحاشا پھیر کر منہ اک طرف چلتا ہوا

جانب صحرا جو اعرابی چلا ہو کر سوار
تیزی رفتار میں مثلِ ہوا تھا راہوار
کہتا جاتا تھا وہ گھوڑے سے بچشم اشکبار
میں نہ بھولوں گا وفا کو تیری تا روزِ شمار

حال دل رہوار کا بتلائے کیا کوئی سفیر
سچ کہا ہے بس زبانِ بے زباناں یادگیر"

سفیر (کاکوڑی)

ناکام

سلسلہ کے لیے گذشتہ نمبر ملاحظہ ہو

تیسرا جزو

(۱)

"نالائق ناخلف لڑکا! میں تو پہلے ہی سے ایسی تعلیم کا مخالف تھا۔ کیا یہاں مناسب تعلیم نہیں ہوسکتی تھی؟ ایسی تعلیم کی ہم لوگوں کو ضرورت ہی کیا ہے؟ ہمارے لیے صرف اس قدر تعلیم کافی ہے جس سے خدا اور رسول پہچانا جاسکے۔ لیکن اس کی ماں نے اس کو یہاں نہ رہنے دیا اور اپنے بھائی کے پاس نیچری بننے کے لیے بھیجدیا۔ ارے تھوڑی سی عربی پڑھ لی تھی، بس، یہی کافی تھا۔ یہی ہمارے بزرگوں میں ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن اب جو ہمارے اسلاف کے طریقوں کے خلاف کیا گیا تو اسکا نتیجہ اور اسکی نحوست یہ ہے کہ لڑکا بالکل دہریہ ہوگیا۔ میں جانتا ہوں کہ جب کبھی کوئی نئی بات ہوئی ہم لوگوں کو کبھی نہیں پھلی۔ آہ! آج وہ ہورہا ہے جو کبھی نہ ہوا تھا!" یہ الفاظ تھے جن کو حفیظ میاں کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے ادا کیا۔

"لیکن، صاحب، اب چاہے جو کچھ ہو جائے میں اپنی لڑکی کی قسمت اس کے ساتھ خراب نہ کردں گا۔ اس ملعون مردود کو اپنے خاندان کی بدنامی کا بھی خیال نہیں! آہ ہمارے ایسے عالی خاندان میں اس موذی نے شیطان کا جنم لیا۔ خدا ہی اس سے سمجھے گا اور بزرگوں کی مار پڑے گی مردود پر!"

اس وقت مولوی عبداللہ رحمانی صاحب ہی صرف اس گروہِ غلاماں سے مستثنیٰ تھے جو پیرصاحب موصوف کے ہر ہر جملے کو گوشِ عقیدت وتائید سے سُن رہے تھے۔ رحمانی صاحب کا دماغ سلیم پیرصاحب

کی وارفتگی، اور دیدہ دہنی سے ذرا بھی متأثر نہ ہوتا تھا۔ رحمانی صاحب متانت کے ساتھ اُن کے ہر جملے کو سنکر اُنکے الفاظ میں حقیقت اور اصلیت ڈھونڈھتے تھے اور وہ چونکہ اس خاندان کے احوال اور طرز معاشرت و نیز چند واقعات سے واقف تھے اور سلیم مرحوم باپ (سعید) کے دلی مخلص تھے خفیف غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچگئے کہ اُن کے مرحوم دوست اور حفیظ میاں کے مابین کاوش تھی۔ اُس نے حفیظ میاں اور سلیم کے دماغوں میں جنم لیا ہے۔

چونکہ سعید کی زندگی میں حفیظ میاں کے خلاف، رحمانی صاحب کسی عملی کارروائی میں حصہ نہ لے سکتے تھے اس لیے حفیظ میاں کو اُن کی طرف سے کوئی بدگمانی نہ تھی۔ اور وہ رحمانی صاحب کو اپنے خاندان سے گہرے تعلقات رکھنے والا اور شاید کسی حد تک اپنا ہم خیال بھی سمجھتے تھے۔ لیکن حفیظ میاں کی یہ غلط فہمی سلیم کے لیے موافق معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ رحمانی صاحب اُن کی اس غلط فہمی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اپنی پالیسی کی گفتگو (جو رحمانی صاحب کی ایک بڑی خصوصیت تھی) سے سلیم کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد حفیظ میاں نے غصہ تھوک کر متانت سے کہا: جناب، آپ کو میں نے اسی لیے آگرہ سے یہاں آنے کی تکلیف دی ہے کہ لڑکی کا معاملہ ہے، جیسے یہ میری اولاد ہے اسی طرح آپ بھی اسکو اپنی لڑکی سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی انصاف کریں گے آپ پر واضح رہے کہ سلیم ہمارے بزرگوں کا دشمن ہے اور اُن کے طریقوں سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مزار اقدس پر کوئی نہ جائے اُن کا عرس نہ ہو۔ اُن کے سجادہ نشیں کی کوئی عزت نہ کرے۔ کوئی ہم لوگوں سے خبر نہ ہو...... اور ہم لوگ نوکری چاکری کریں، تجارت کریں اور اپنے بزرگوں کی گدی چھوڑ دیں۔ فرمایئے کہ اگر میں اپنی لڑکی کسی غیر کے ساتھ بیاہ دوں تو مجھ پر الزام نہیں ہے؟ آہ یا اور جتنے جس آج انھوں نے بدنام کیا ہے وہ آپ کو نہیں معلوم۔ مجھ کو مکار، فاسق، فاجر، اور خدا جانے کیا کیا مشہور کیا۔ کہتے ہیں اگر حفیظ کی کوئی عزت کرے وہ قوم کو تباہ کرنے والا ہے.... ہائے! آج وہ ہورہا ہے جو کبھی نہ ہوا تھا۔ اُفوہ!

اس نے مجھے بڑھاپے میں بدنام کیا ـــــــ "

رحمانی صاحب (جن کے دل میں سلیم کی طرف سے ہمدردی بھری ہوئی تھی) نے اپنی پالیسی سے کام لینا شروع کیا۔ گویا پیر صاحب کے الفاظ سے متاثر ہو کر اپنا حق تعلقات جتاتے ہوئے غصہ کی آواز بنا کر زور سے چلا اُٹھے :۔ "سلیم؟ کہاں ہے سلیم؟ اُس کو ذرا بلوائیے تو!"

ان الفاظ کا رحمانی صاحب کی زبان سے ادا ہونا تھا کہ گروہ غلاماں میں ایک انتشار پیدا ہوا اور رحمانی صاحب کے چہرے پر متعدد خشمگیں اور پُرحیرت نگاہیں پڑنا شروع ہوئیں کہ "اگرچہ سلیم مرتد ہو گیا ہے، تاہم اُسکی پیرزادگی (جس کو اعمال و افعال سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا۔) ایک بالکل بے اختیاری شے ہونے کے باعث ضروری الاحترام ضرور ہے۔ باوجود اس کے، غلامانِ سرفروش کے موجود ہونے پر بھی سلیم کا نام، بلا کسی لفظ تعظیمی کے اضافے کے کسی فانی انسان کے منھ سے کیسے ادا ہو سکتا ہے !!!"

سلیم خندہ پیشانی کے ساتھ آیا، اور بلا تصنع ادائے آداب کر کے بیٹھ گیا۔ اور پیر صاحب کے حکم سے حُضّار اس وقت ٹال دیے گئے۔ اور پیر صاحب نے اپنی سادہ لوحی ظاہر کرتے ہوئے بڑبڑانے کے انداز سے اپنی تقریر شروع کی :

"میں نے سلیم سے کون سی بات ایسی کہی ہے جو اُس کو مجھ سے عداوت ہو گئی؟ ہاں توکل علی اللہ کی تلقین میں نے بے شک کی ۔ اور ایک جلسہ یہ کہا کہ اُپنے بزرگوں کا کام اختیار کرو، ورگاہ شریف پر توکل کیے بیٹھے رہو۔ اس دنیا میں چار دن کی مہمانی ہے۔ اس زندگی کو کسی طرح کاٹنا ہے ...."

پوری داستان ختم نہ ہوئی تھی کہ رحمانی صاحب نے سلیم کو مخاطب کیا: "کیوں جی! مجھے معلوم ہوا کہ تم نیچریوں کی سی باتیں کرتے ہو؟"

"جی میرے خیالات تو ایسے نہیں ہیں۔ ہاں چچا صاحب کو شاید میری کوئی بات ایسی معلوم ہوئی ہو۔"

"لو صاحب! یہ جھوٹ ہے؟ مجھے جھوٹا بناتے ہو؟ تم نے اسلاف کا ہتک نہیں کیا؟ ارے

میں تم کو خوب جانتا ہوں۔ تمہیں ہو، جس نے مجھے ذلیل کیا، مجھ کو حرام خوار، مکّار کہا! مجھے بھیک مانگنے والے فقیر سے بدتر کہا۔ آہ! میں نے کس کے آگے ہاتھ پھیلایا ..... جواب دو۔"

"چچا صاحب۔ یہ آپ کے خیالات ہیں۔ اور میں — آپ کے —— سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں۔"

"تو پھر میں اپنی لڑکی بھی آپ کے عقد میں دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"میں کچھ آپ سے آپ کی لڑکی مانگنے نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھے یہ دھمکی کیوں دیتے ہیں؟ اور میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ آپ کی کسی قسم کی دھمکی میرے خیالات اور میرے ارادے کو ذرہ برابر بھی صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ میرا ایمان محض خدا کی رضا جوئی ہے۔ اپنے موقر اعتقاد اور ارادوں کے آگے ایک ناچیز کمزور جنس ذرا بھی وقعت نہیں رکھتی ہے۔ آپ سمجھتے کیا ہیں؟ میں ایک پسندیدہ عورت کے لیے اپنا ایمان اور قصد نہیں چھوڑ سکتا۔ اُفوہ۔ مجھ کو پہلے سے معلوم تھا کہ آپ مجھ کو یہ دھمکی ...."

"خیر میرے متعلق جو افواہیں آپ نے مشہور کی ہیں اس پر میں صبر کرتا ہوں، خدا سمجھے گا۔"

"گستاخی معاف! جناب، یہ افواہیں نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ جن کا بغیر اظہار کیے ہوئے آپ کے طریقِ زندگی پر تنقید نہیں ہو سکتی۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کا کوئی راز یا کوئی غلط واقعہ نہیں بیان کیا۔ بیان وہی کیا گیا جو دنیا پر اظہر من الشمس ہے۔ اور چونکہ دُنیا کو ایک غلط راستے سے ہٹا کر راہِ راست پر لانا میرا مقصد ہے اس لیے میرے اعلائے حق میں آپ کو جس قدر مضرت پہنچ جائے اُس کو البتہ میں اپنے لیے پیش خیمۂ کامیابی سمجھوں گا۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ مجھے کسی شخص خاص سے بغض نہیں ہے اور نہ میں کسی بندۂ خدا کو زک دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تحقیق حق میں جاں فشانی کی تھی، جو کچھ مجھ کو صحیح معلوم ہوا اُس کو دُنیا کے سامنے پیش کرنا میں اپنا شریفانہ فرض سمجھتا ہوں۔ اب دنیا کی تمام متحدہ قوتیں مجھ کو میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ البتہ نصرت میری پابند نہیں ہے۔ کوشش کرتا ہوں۔ اگر ناکام ہوا

تو اُس کوشش کی نوعیت کے احترام میں، اپنی ناکامی کو ہزار کامیابیوں پر افضل سمجھوں گا۔ اور میرا مدعا ایک طرح سے ناکام رہنا بھی ہے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی کام کرنے والا آج تک کامیاب نہیں مرا۔ آپ سمجھ لیجیے، جب میں کسی کام کے لیے کھڑا ہوا ہوں تو اپنی اچھی سے اچھی چیز اور عزیز ترین شے کو اس متبرک راہ پر قربان کرنے کو تیار رہوں۔ بہتر ہے کہ آپ کے ذریعے سے میری عزیز ترین خواہش کی قربانی لے لی جائے۔ آپ کا یہ خیال سچا ہے کہ میں شاہدہ کو بیحد عزیز رکھتا ہوں اور اُس سے نکاح کرنے کا متمنی ہوں۔ علاوہ اس کے، مجھے موثوق ذرائع سے معلوم بھی ہوگیا ہے کہ مجھ سے ابھی تک پہلا سا اُنس باقی ہے۔ لیکن اگر خدا کو مجھ سے ایک سچی قربانی لینا ہے تو پہلے پہل میری تمنا کا خون ہونا چاہیے۔ آپ کو اپنے فعل کا اختیار ہے۔ مگر اس کا خیال رکھیے کہ خدا نے ہر شخص کو اور ہر ذات کو آزاد پیدا کیا ہے۔"

"لیجیے صاحب یہ تو میری آبرو کے بھی خواہاں نظر آتے ہیں! ہائے میری لڑکی کے متعلق خدا جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں! شاہدہ اور اس نامعقول سے اُنس! آہ! مرجانے کی بات ہے۔ شریف کے لیے! یہ وہ ہے جو کبھی نہ ہوا تھا! ذرا اس جھوٹ کو ملاحظہ کیجیے، جو کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے وہ آپ فرما رہے ہیں! آہ وہ ان کی حرکتوں سے ان کا نام سُنکر بیزار ہوتی ہے...... آہ میں کیا کروں؟

پیر صاحب نے زار و قطار رونا شروع کردیا اور ڈاڑھیں مار مار کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ رحمانی صاحب، جو بڑی حد تک سلیم کے ہم خیال تھے، سلیم کے مانے ہوئے زبردست مخالف کے آگے کچھ تو مروتاً اور کچھ مصلحتاً، اس موقع پر سلیم کے خیالات پر نعرۂ آفریں نہ بلند کرسکے مگر وہ دل ہی دل میں سلیم کے ارادوں پر 'مبارک باد' کہہ رہے تھے۔

(۲)

تجربہ کار رحمانی نے زیادہ خاموشی مناسب نہ جان کر سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اثنائے گفتگو میں اُنکی بڑی کوشش یہ رہی کہ پیر صاحب اُن کو اپنا ہمخیال سمجھتے رہیں۔

"بے شک سلیم کا رویہ آپ کے بالکل خلاف ہے۔ اور بقول آپ کے یہ وہ کر رہے ہیں جو کبھی نہ ہوا تھا، صاحب، زمانے کا رنگ ہی یہی ہے کہ نئی نئی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان لڑکوں نے تو وہ اُدھم مچا رکھا ہے جس کا وہم وگمان بھی ہمارے اسلاف کو نہ تھا۔ اور سچ پوچھیے تو ایسے لوگ ہر زمانے میں رہے" ان متضاد خیالات کو پیر صاحب بالکل اپنے موافق سمجھ کر فرمانے لگے:

"رحمانی صاحب آپ بجا فرما رہے ہیں۔ ہم لوگوں کی عقلیں ان کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم جو کچھ سوچ سمجھ کے کرتے ہیں اُس کو یہ لوگ کیا جان سکتے ہیں؟"

"اصل یہ ہے کہ یہ لوگ شورش پسند، انقلاب پسند ہیں، ہماری باتیں انکو بُری لگتی ہیں۔ لیکن ہیں یہ ابھی کمسن، ہمارے آگے کے لڑکے، ہم کو انکی ایسی باتوں سے تکلیف ہوتی ہے"۔

رحمانی صاحب یہ خوب سمجھتے تھے کہ دنیا میں آج تک جو کچھ انقلابات ہوے اُنکی اصل شورش تھی، جس کی تہ میں بڑے بڑے دماغوں کی پالیسی اور تجربہ پنہاں تھی اور دنیا میں جو کچھ ہو سکتا ہے وہ نوجوان کی ہمت اور جوش کی قوت پر ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پہلے ہی سے طریق عمل پر کافی غور ہو چکا ہو۔ ونیز یہ کہ دماغوں میں جو اعتقادات اور خیالات مدتے سے راسخ ہو کر مضبوط ہو چکے ہیں اُن کو بجز اسکے کہ ایک ہنگامہ خیز اسلوب سے نکالنے کی کوشش نہ کیجائے وہ اپنی پشت پناہ نہیں چھوڑ سکتے۔ اور ایک ایسے بے حسے اور دُھن کے پکّے کی عقل بغیر اس طریقے کو کام میں لائے ہوے مسخر نہیں ہو سکتی کہ پالیسی سے کام لیا جائے۔ حفیظ میاں اس پالیسی کو سمجھنے کے لیے کافی عقل نہ رکھتے تھے۔ آخر کار اُنکی زبان سے یہ جملہ بلا قصد نکل گیا:

"آپ بڑی عقلمندی سے انصاف فرما رہے ہیں۔ کاش ان نوجوانوں کی بھی آپ ہی کی ایسی عقل ہوتی۔ ہمارے جد بزرگوار ان لوگوں کے دماغوں کو اپنے تصرف سے درست کریں"۔

"آمین! انقلاب پسندی؟ یہ تو شباب کا خاصہ ہے۔ اور غیر مستقل مزاجی؟ اسکو ہم آپ سمجھ سکتے ہیں جن پر گزر چکی ہے۔ بس، یہ اُن کا بچپن ہے اور کیا ......"

"بخدا اے لم یزل! آپ نے میرے منھ کی بات چھین لی"

"یہ لوگ ہزار اپنی عقل کو بڑھائیں لیکن ہمارے تجربے کو تھوڑے ہی پہنچیں گے۔ بس۔ صاف تو یہ ہے کہ بچے ہیں۔ جب ہمارے آپ کے سنوں آئیں گے تب جا کے ان کے خیالات پختہ ہوں گے"

"سبحان اللہ! رحمانی صاحب، آپ نے کیا عقل پائی ہے۔ یہ ہمارے زمانے کی عقل ہے واہ کیا کہنا!"

"اور ان کے یہ خیالات غیر پختہ ہیں۔ چند دنوں میں سب جاتے رہیں گے، جیسے آپ کے میرے، سب کے خیالات بدل گئے۔ اب غور کیجیے۔ بھلا بچپن اور نوجوانی کے خیالات کو آج کے خیالات سے ملائیے"

آہ! رحمانی نے یہ کس اخلاقی تاریکی کے زمانے کی یاد دلادی۔ جس میں اس پیر کے لیے بجز نفس پرستی اور اخلاق کشی کے کچھ نہ تھا۔ حفیظ میاں کی آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ پھر گیا جس میں اُنکی اخلاقی عریانیت کو موروثی لباس تقدس چھپائے رہتا تھا۔ اور جس میں اُس کی غیر کسبی شرمناک بزرگی اُسکے اعمال قبیحہ میں منہمک بنانے میں ممد ثابت ہوتی تھی۔ پیر صاحب نے پُرانے قصہ کو ٹالنے کے لیے انکساراً کہا:۔

"جی ہر شخص کے خیالات جوانی میں اور ہوتے ہیں۔ مجھ گنہگار کا کیا ذکر ہے۔ پختہ سنی میں سب کے خیالات اچھے ہو جاتے ہیں"

"بس اسی طرح سلیم کے خیالات بھی بدل جائیں گے۔ آپ کو سلیم کی جانب سے امید نہ ہونا چاہیے۔ آپ اسکے باپ کی جگہ پر ہیں۔ یہ آپ کے بھائی کی نشانی ہے۔ ابھی نوجوانی ہے۔ شباب میں قوائے جسمانی کمال پر ہوتے ہیں۔ طبیعت کے جوش اور قوت سے عقل دبی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ آدمی اس زمانے میں شورش پسند اور سرکش ہوتا ہے۔ جب جوانی ڈھلتی ہے تو خاندانی شرافت اور موروثی اطوار عود کرتے۔ شباب کے زودزوال اثر کے ساتھ بے استقلالی

بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ گو اس لیے کہ لازمی طور سے آپ کو سلیم کی طرف سے ناراضگی ہو لیکن دائمی نفرت تو نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے خیالات درست ہو جائیں گے یہ آپ کا خون وجگر ہے، آپ کا بھتیجا ہے، اس سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ آپ ہاتھ کی لکیروں کو نہیں مٹا سکتے۔ شاہدہ پر اُس کا حق ہے۔ جب حق دینے کا وقت آیا ہے تو اسکو نہ بھولیے۔ شاہدہ کا دوسری جگہ نکاح کرنا دونوں پر ظلم ہے۔ سلیم گو ضدی ہے لیکن آپکی اولاد کے برابر ہے۔ بچہ ہے۔ اسکی ضد معاف کر دینا چاہیے۔"

سلیم کے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی (محبت، حسرت، نفرت) لیکن اُسکے چہرے پر کسی قسم کے آثار نمایاں نہیں ہوے۔ وہ نگاہ زمین میں گاڑ کر اس تقریر کو سنتا رہا پیر صاحب نے تیور بدل کر فرمایا:

"آپ کا قول صحیح ہے۔ مگر جناب لڑکی کو ایسے شخص کے حوالہ کر دوں جس سے اُسکو نفرت ہو؟ یہ چار دن میں اُسکو جلا جلا کے مارڈالے گا۔ اور اگر اسکی بیوی گی اسی طرح رہی تو وہ اپنا گلا گھونٹ لے گی۔ مجکو خدا کے گھر جانا ہے۔ اپنے سر ایک خون لے لوں؟"

"حفیظ میاں، یہ سچ ہے، مگر اس کا تصفیہ میں کر دوں؟ مجھ سے آپ سے کوئی مغائرت نہیں۔ شاہدہ سے خاموشی کے ساتھ اُس کا ارادہ دریافت کر لیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"نعوذ باللہ من ذٰلک! توبہ توبہ!! بڑا تعجب ہے کہ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! یہ رسم دستور صاحب، ہمارے نہیں!"

"حفیظ میاں، رسم و رواج دکھانے کی چیزیں ہیں، اپنے معاملے کو چپکے سے کر لیجیے۔"

"نا صاحب، نا، یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا مجھکو اور لڑکی کو اُس دن کے لیے نہ رکھے کہ وہ اپنی زبان سے اس بارے میں بولے، ہمارے اسلاف نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اور پیر نفس اسکو کیسے گوارا کرے گا؟ میں تو جانتا ہوں کہ وہ سلیم سے نفرت کرتی ہے، نام سے بیزار ہے۔"

"اچھا، اگر کوئی معقول عورت شاہدہ کو سمجھائے کہ سلیم کے خیالات ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"جناب یہ نہیں ممکن ہے۔ ہم اپنی لڑکی کا نکاح کرتے ہیں۔ آپ اس میں نہ بولیے۔ میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ کیا میں وہ کروں جو کبھی نہ ہوا تھا؟ اور میں صاف کہے دیتا ہوں کہ میں لڑکی کا عقد بہت جلد کرنے والا ہوں۔ میرے ایک عزیز کا لڑکا بڑا نیک چلن، خوبصورت، نیک سیرت ہے۔ رحمانی صاحب، اُسکے ایسے اچھے اعتقاد ہیں کہ میں کیا کہوں۔ اگر اُس پر بزرگوں کی عنایت رہی تو وہ بڑا اچھا شخص ہوگا۔ اُس کا پیغام آچکا ہے اور میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ میں زبان ہار چکا"۔ سلیم اور رحمانی اُٹھ کر چلے گئے۔

(۳)

"سلیم، تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھارے چچا کی باتوں سے ذرا بھی متاثر ہوا ہوں۔ میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ خدا نے تم کو تمھارے باپ کے خیالات اور جذبات عطا کیے ہیں۔ بلکہ قوتِ عمل اور اخلاقی جرأت تم میں اُن سے زیادہ ودیعت کی ہے۔ اگر تمھارے ایسے چند نوجوان اور پیدا ہو جائیں تو ہندوستان ان نجس خیالات والوں سے پاک ہو جائے۔ یہ لوگ اگرچہ کچھ نہیں کرسکتے تاہم ترقی چاہنے والوں کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ جس وقت تک یہ اپنی بزرگی کا گیت گایا کریں گے اور سلف پرست بنے رہیں گے مسلمانوں کو اس طرح کی پستی سے نہیں نکالا جا سکتا۔ مرحبا! تم وہ کام کر رہے ہو جو ہر شخص نہیں کرسکتا سوسائٹی اور رسم و رواج کی جکڑبندیاں ایسی ہیں جن سے اپنا پیچھا چھڑانا جہادِ عظیم سے کم نہیں۔ میں اُن دقتوں سے واقف ہوں جو تمھارے راستے میں حائل ہوں گی۔ لیکن تم گھبرانا نہیں ڈرنا نہیں۔ مصیبت کا وقت بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ تمھارے والد مرحوم نے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائیں لیکن اپنے ارادے سے نہیں ہٹے۔ سمجھ لو، جو آج تم کو بُرا کہتے ہیں کل ہی تمھارے اشاروں کے غلام ہوں گے۔ ہر شخص تمھارا گرویدہ ہو جائے گا۔ ہاں ہاں، سلیم۔ ان بتوں کو توڑ دینا چاہیے جو گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ یہ میدانِ جنگ تمھارے لیے صحنِ اعزاز ہے"۔

"الحمد للہ۔ میں آپ کا بالکل ہمخیال ہوں"۔

"سلیم۔ میں نے اثنائے گفتگو میں تمہارے چچا سے یہ ضرور کہا کہ سلیم کے خیالات رسن رسیدگی میں بدل جائیں گے۔ کیا تم اس نکتے کو سمجھے؟"

"میں آپ کی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں"۔

"میری مصلحت کے ساتھ تم کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ تمہارے خیالات بدل جانے کی بابت جو امید میں نے ظاہر کی تھی اُسکی وجہ تمہارے چچا کو تمہاری جوانی کی بے استقلالی بتائی تھی لیکن تمہارے خیالات کی نوعیت بہت اعلیٰ ہے اور تمہارے خیالات تمہارے علمی استعداد کا نتیجہ ہیں جو تمہاری نوعمری کی بے استقلالی کے ساتھ فنا ہونے والے نہیں۔ موجودہ حالت میں میں بھی تمہارے ایسے متین آدمی سے استقلالی کی اُمید نہیں ..... گو کبرسنی میں موروثی خیالات دماغ، نفس، عقل وغیرہ کو کمزور پا کر اپنا تسلط کرنا چاہتے ہیں، اور مُسن آدمی کے کمزور قلب میں ضعیف الاعتقادی بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ مگر تم اپنی زندگی کے کسی زمانے میں ان فضول خیالات کے حامی نہیں ہوسکتے۔ وراثتاً جن خیالات کے تم حامل ہوگے اُن میں اکثر خیالات تمہارے باپ کے ہوں گے۔ ضعیف الاعتقادی وغیرہ جسکو تمہارے چچا کے سامنے 'شرافت' سے تعبیر کیا ہے وہ تمہارا بہت دُور کا ورثہ ہے۔ میں نے مصلحتاً یہ لفظ کہا تھا۔ اور تم خود سمجھ سکتے ہو کہ بندگان خدا کی بہبودی کے لیے ایثار نفس کرنا اس سے زیادہ شریفانہ فعل کوئی شخص کیا کر سکتا ہے؟۔ ہاں، تو تم اپنے چچا کے خیالات اور اعتقادات ورثہ میں نہیں پا سکتے۔ اور استقلال، ہمت، اور خیالات کی پختگی وغیرہ یہ چیزیں تم میں کمال کے ساتھ پائی جائیں گی۔ کیونکہ یہ تمہارے باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ ہے۔ اس لیے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی ثابت قدمی تمہارے لیے کوئی غیر معمولی اہمیت کی شے نہیں۔ تم کو فطرۃً مستقل مزاج ہونا چاہیے۔ اب اگر احوال گرد و پیش اور حوادث دنیادی تمہارے قدموں کو اس سنگلاخ زمین پر جمے رہنے کے لیے بال بھر بھی جگہ چھوڑیں اور اُسکو تم غنیمت سمجھو تو یہ تمہاری کمزوری ہوگی ...... اسی کے ساتھ تم کو 'مصلحت' کے معنی بھی سمجھ لینا چاہیے۔ تم کو

معلوم ہے کہ موقع پر کمزوری دکھانا بھی ایک قوت ہے ۔ دل تلوار سے تسخیر نہیں کیے جا سکتے ۔ ہر جگہ جوش و تعصب کو دخل نہ دینا ۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ کامیابی ہمیشہ قوت کے ساتھ نہیں دیتی ۔ اور غلبہ ہمیشہ درشتی کا نتیجہ نہیں ہوتا ۔ ہاں ، سلیم ، میں تم کو وقتاً فوقتاً مشورہ دوں گا ۔"

(باقی آیندہ)

آثر (لکھنوی)

بہار آئی ہے آرایشِ چمن کے لیے
مزے ہیں لالہ و نسرین و نسترن کے لیے

خیال بھی نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن
تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لیے!

پڑا تھا کام گریباں کو دستِ وحشت سے
نہ ایک تار سلامت رہا کفن کے لیے

چمن کے دام سے جائیں گے ہم کہاں صیاد
قفس فضول ہے پروردۂ چمن کے لیے

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لیے

میں قیدِ رشک سے آزاد ہوں محبت میں
کہ تجھ کو شمع بنایا ہے انجمن کے لیے

برنگِ غنچہ کہ آمادۂ شگفتن ہو
ہے آفریدہ تبسم ترے دہن کے لیے

سوادِ دیدۂ دیدار جو کو حل کرکے
بنا ہے سرمہ تری چشمِ سحرفن کے لیے

زبانِ اہلِ بصیرت پہ عرضِ حیرت ہے
سکوت داد ہے گویا مرے سخن کے لیے

دلِ گرفتۂ عاشق کو اپنے ہاتھ میں لا
کہ طرہ ہو ترے گیسوئے پرشکن کے لیے

قسم ہے ذوقِ نظر کی کہ ہو گئی مخصوص
ادائے کجکلہی تیرے بانکپن کے لیے

فروغِ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

رضا علی وحشت

اندھے کانوں سے دیکھنے لگے

ہم آئے دن اخبارات میں ایسی ایسی ایجادات کے تذکرے دیکھتے ہیں جن کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کی برکت سے ان معجزاتِ علمیہ (ایجادات) کا سلسلہ بند ہونے والا نہیں۔ چنانچہ آج کل ایک عجیب و غریب آلہ ایجاد ہوا ہے جسکی مدد سے اندھے آنکھوں کا کام کانوں سے لے سکتے ہیں۔ ہماری اس تقریر سے یقیناً آپ کے دل میں خلجان پیدا ہوا ہوگا کہ اس متناقض کلام کا آخر مطلب کیا ہے؟ لیکن جب آپ اس مضمون کو پڑھیں گے تب معلوم ہوگا کہ جس آلہ کا ہم ذکر کرنے والے ہیں اُسکی حقیقت کیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں پروفیسر برزیلیوس نے ایک دھات دریافت کی ہے جسکو سلینیوم کہتے ہیں۔ یہ دھات نادرالوجود و کمیاب ہے۔ تحلیل کیمیاوی سے ثابت ہوا ہے کہ یہ دھات اپنی مختلف خصوصیات کے لحاظ سے گندھک سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اُس کا تجزیہ اور تحلیل کرنے سے کچھ اجزا تو نہایت صاف سنگریزوں کی صورت میں باقی رہتے ہیں اور کچھ اجزا کثافت لیے ہوئے سیاہ و گندم گوں نکلتے ہیں اور اُنکا بُرادہ برادۂ آہن سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے انتہائی کوشش اور متواتر تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اُسکے تحلیل کرنے کے بعد کچھ اجزاء نہایت صاف شکل بلور کے برآمد کیے ہیں اور یہی اجزائے بلوریہ اس آلہ میں مستعمل اور اُسکا جزو اعلیٰ ہیں۔ یہ دھات سلینیوم بہ نسبت دیگر معدنیات کے انعکاس نور سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے اور اشعۂ نور کو جذب کر کے اُن کے اندر مقناطیسی قوت یا بجلی پیدا کر دیتی ہے اور اس بجلی کی رَو بذریعہ تار یا پونگلی (نلکی) کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی قوت مقناطیسی یا بجلی اس آلہ کی ایجاد کا سبب و محرک ہے۔ جب اس آلہ پر روشنی پڑتی ہے تو وہ اپنی قوتِ جاذبہ سے اُسکو جذب کرتا ہے اور اُسکے اندر برق پیدا کرتا ہے

جس کے اثر سے وہ نور آواز کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور نور کی کمی بیشی، قوت و ضعف کی بنا پر ان اصوات میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

اس آلہ کو کتاب پر رکھتے ہیں اور وہ نلکی یا چونگی جو اس آلہ میں لگی ہوتی ہے، اندھے آدمی کے کان میں لگا دیتے ہیں جس کے ذریعہ سے حروف کی مختلف آوازیں اُس کے کان میں آتی ہیں۔ اختلافِ صوت کی وجہ یہ ہے کہ ہر حرف کا نور اُس آلہ میں مرتسم ہوتا ہے۔ اور اختلافِ حروف سے اُسکے اندر تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جب نور میں تبدیلی ہوئی تو آواز میں بھی جو بعینہٖ اُس نور کا فوٹو ہے ضرور تبدیلی واقع ہوگی۔ چند روز کی مشق کے بعد یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اندھا آدمی بسہولت پڑھنے لگتا ہے۔

یہ ایجاد ایکدم مرتبۂ وجود میں نہیں آئی بلکہ ایک عرصہ کی دماغ سوزی اور تبدیلی و تغیر کے بعد تدریجی ترقی حاصل کر کے اب اعلیٰ ترین ایجادات میں شامل ہوئی ہے۔

موجد اصلی اس آلہ کا پروفیسر فورنیہ ڈالب Fournier d' dalbe ہے

اول اسی نے یہ آلہ بنایا جو اشعۂ نور کو اپنے برقی قوت کے کرشمے سے جذب کر کے آواز کے سانچہ میں ڈھال دیتا ہے۔ اور وہ آواز باعتبار اختلافِ حروف بدلتی رہتی ہے۔ لیکن ابتداءً جب یہ آلہ بنایا گیا ہے تو پورے طور سے حروف کے درمیان تمیز نہیں کرتا تھا بلکہ وقت استعمال نابینا کو صرف اس قدر رہنمائی کر دیتا تھا کہ اس وقت اندھیرا ہے یا اُجالا۔ آفتاب نکل آیا، یا غروب ہوگیا۔ رات ہے یا دن۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہی وجہ تھی کہ باوجود اس ایجاد کے کارآمد و مہتم بالشان ہونے کے پرواج پذیر نہ ہوئی اب قریب سال ڈیڑھ سال سے پروفیسر فورنیہ ڈالب نے اس آلہ کو ترقی دی اور یہاں تک اسکی قوت میں اضافہ کیا کہ اندھا آدمی اُسکی امداد سے اتنے بڑے حروف کو پہچاننے لگا کہ جن کا حجم پانچ سنٹی میٹر سے کم نہو۔ جب اُس نے اس قدر کامیابی حاصل کر لی پھر اور آگے بڑھا کر قدم رکھا اور آلہ میں اتنی قوت اور پیدا کی کہ انگریزی حروف (جن کا طول ایک یا ڈیڑھ ملیمیٹر سے

زیادہ نہ ہو) بتلانے لگا۔

لیکن اس آلہ کو دیکھکر ڈاکٹر براون Dr. C. F. Brown نے ایک اور آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ سے اندھا آدمی انگریزی حروف کی لکھی ہوئی عبارت پڑھنے پر قادر ہو گیا ڈاکٹر براون ولایات متحدۂ امریکہ میں ولایت ایوا کے کسی شہر کا رہنے والا ہے۔ اس نے سلینیم دھات کو پہلے صاف کیا اور اس کی تحلیل ایسے اجزا کی طرف کی جو صفائی میں بلور کے مشابہ ہیں۔ اس سے پیشتر یہ دھات معمولی پتھر کی صورت میں تھی۔ بہ نسبت دیگر پتھروں کے بلور میں قوت تاثر سو درجہ زائد ہے۔ اس موقع پر بعض تجربوں کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو کہ پروفیسر موصوف نے امریکہ میں کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس نئی ایجاد پر کس قدر نتائج علیہ مرتب ہو سکتے ہیں۔

گزشتہ ماہ تموز کی پہلی دو تاریخوں میں موجد نے اس آلہ کو امریکہ کی ایک کمیٹی میں پیش کیا اور درخواست کی کہ سان فرانسسکو میں چند نابینا بلائے جائیں۔ قریب قریب تیس اندھوں پر اس آلہ کا تجربہ کیا گیا۔ سب نے دو تین مرتبہ کی پریکٹس کے بعد حروف ذیل کو پڑھ لیا A. ta. L. o. J اور ایک شخص جس کا نام ویدر ہے تھوڑی مدت کی مشق کے بعد چھوٹے چھوٹے کلمات مثلاً The, Mine, Rt, Rt پڑھنے پر قادر ہو گیا۔ پھر اس نے حاضرین کے روبرو ان آوازوں کی کیفیت بیان کی جو کہ ہر حرف کے مقابلے میں آلہ کے اندر سے اسکے کانوں میں آتی تھیں۔ حرف W کی آواز موسیقی تال کی طرح me, do, me, do, me بیان کی۔ اور حرف A کی آواز do, me, do, me بتلائی۔ اندازاً دو ماہ کی پریکٹس میں ایک نابینا صفحے کے صفحے پڑھ سکتا ہے۔

اس آلہ کا نام عین المیکانیکیہ ہے۔ اس عجیب و غریب آلہ کی مفصل کیفیت بیان کرنا اور اسکے دقائق کو ضبط تحریر میں لانا طوالت سے خالی نہیں۔ اس لیے اجمالاً تھوڑا بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

آلہ کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ آلہ تین جزو سے ترکیب دیا گیا ہے۔

پہلا جزو I بائیں طرف ہے۔ اسکے اندر سلینیوم کے اجزائے بلوری ہیں۔ اس کا نام آلۂ حساسہ ہے۔ یہ آلہ نور سے متاثر ہوتا ہے اور اُس کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

دوسرا جزو II وسط میں ہے اُسکے اندر برقی رَو نور کو آواز کی صورت میں بدل کر سامعہ یعنی چونگلی کی طرف لے جاتی ہے۔

تیسرا جزو III دائیں جانب ہے اُسکے ذریعہ سے حروف کی آواز کانوں تک پہنچتی ہے۔ اسکو آلۂ سامعہ کہتے ہیں۔

پہلے جزو میں ایک چھوٹا برقی لیمپ ہے۔ یہ لیمپ حروف پر یکے بعد دیگرے روشنی ڈالتا ہے۔ جب ایک حرف پر روشنی پڑتی ہے تو اُسکی شعاع ایک محدب شکل بلور پر گزرتی ہے اور قبل اسکے کہ شعاع نور بلوری قطعات پر پڑے، یہ محدب قطعۂ بلور شعاعِ نور کو اپنے اندر جذب کرتا اور جمع کر لیتا ہے اور اُسکے اندر قوت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اندر قطعات بلور تین یا چار ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک آلہ کے اندر تین قطعات بلور ہیں تو ہر ایک قطعہ آلہ کی گردش کے ساتھ ایک خاص کیفیت سے متاثر ہوگا۔ ایک قطعہ حروف عُلیا سے اثر پذیر ہوتا ہے اور دوسرا حروفِ متوسطہ سے۔ تیسرا حروفِ ادنیٰ کا اثر قبول کرتا ہے۔ مثلاً حرف A کے آلہ کے مقابل آیا تو تیسرا قطعۂ بلور متاثر ہوگا پھر دوسرا، پھر پہلا۔ اور اسی نسبت کے ساتھ ترتیب بدلتی جائے گی۔ یعنی پہلے کے بعد دوسرا متاثر ہوگا پھر تیسرا۔ علیٰ ہذا۔ حروف کی جیسی شکلیں مختلف ہیں ایسی ہی انکی تاثیر مختلف ہوگی، جو کہ بلور پر پڑے گی۔ ہر قطعۂ بلور کے اندر مشابہ حروف کے ایک قسم کی برق پیدا ہوتی ہے، وہ حرف کی صورت کو آواز کی صورت میں ڈھال کر بذریعہ چونگلی کان میں پہنچا دیتی ہے۔ ایک خوبی اس آلہ میں یہ ہے کہ حرف کی آواز خواہ ایک مرتبہ سن لو خواہ دو مرتبہ۔ مکمل آلہ کا وزن ۳۵ لیبرہ ہے لیکن آلہ کا وہ جز جو صفحات کتاب پر گردش کرتا ہے اُسکا وزن ۲ لیبرہ سے زائد نہیں یعنی ایک کیلوگرام سے بھی کم ہے۔ تاہم آئندہ بہت کچھ امید ہے کہ وزن میں اور بھی کمی کی جائیگی۔ (ترجمہ از "الہلال" مصری)

المترجم فضل حق

حمد

اللہ اللہ جلوا تیرا — بقعۂ نور سراپا تیرا
آنکھیں میری جلوا تیرا — سر ہے میرا سودا تیرا
گُل میں بو بلبل میں اُلفت — شان تری ہے جلوا تیرا
کعبہ ، دیر ، کلیسا ، گرجا — ہر جا دیکھا جلوا تیرا
دل میں رہنا آنکھ سے چھُپنا — ایسا گہرا پردا تیرا
سب سے چھوٹ گیا وہ جس کو — قرب میسر آیا تیرا
کہتا تھا منصور انا الحق — یہ تھا ایک اشارا تیرا
مجنوں بنکر لیلےٰ بنکر — دیکھا خوب تماشا تیرا
کس کا کس کا نام بتاؤں — سب کو تو ہے سودا تیرا
جس کو دیکھا مفتوں تیرا — جس کو پایا شیدا تیرا
چشمِ بصیرت دیکھ رہی ہے — ہر شئے میں ہے جلوا تیرا
گُل ہے تیرا گلشن تیرا — باغ کا پتّا پتّا تیرا
ماہِ منور مہرِ درخشاں — سب ہے ذرّا ذرّا تیرا
ماہ سے ماہی تک جو کچھ ہے — سب میں نور ہویدا تیرا
اے دنیا تو زور سراپا — مکر و دغا ہے شیوا تیرا
نادانو کچھ ہوش میں آؤ — کیا میرا کیسا تیرا
جنت دے یا دوزخ دے تو — میں تو ہوں اک بندا تیرا
توبہ توبہ یہ ممکن ہے؟ — لب تک آئے شکوا تیرا
حشر کے دن آفاق کو یارب — ہے بس ایک بھروسا تیرا
خوب سمجھ رکھ آفاق اِسکو — نادانی ہے سہرا تیرا

آفاق (بنارسی)

مہاراجہ چندولال شاداں

مہاراجہ چندولال شاداں کی ولادت ۱۱۷۵ھ میں ہوئی۔ راجہ صاحب کا خاندان دولت مغلیہ کے ظل عاطفت میں نہایت ممتاز اور وقیع تھا۔ راجہ ٹوڈرمل آپ کے مورثِ اعلیٰ اور شاہنشاہ اکبر کے وزیر اعظم تھے۔ شاہنشاہ اکبر کے انتقال کے بعد راجہ ٹوڈرمل کے ممبرانِ خاندان شہنشاہ دہلی کی خدمت میں ممتاز رہے اور محمد شاہ کے عہد تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

راجہ چندولال قوم کے کھتری اور فاضلانہ قابلیت کے محقق۔ مذاقاً بہت مہذب متین اور شاعری سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔ اُنکی صحبت میں ارباب علم و فضل اور شعرائے باکمال کا مجمع رہتا تھا۔

محمد شاہ کے وقت میں راجہ صاحب کے جد امجد رائے مولچند دربار میں بہت رسوخ رکھتے تھے۔ جب نظام الملک فتح جنگ بہادر آصف جاہ بہادر دکن کی طرف روانہ ہوئے تو بمشورۂ ارکان دولت راجہ مولچند بھی ہمرکاب ہوئے اور دکن میں پہنچ کر کمشنر کروڑگیری کے معزز عہدے پر مامور ہوئے اور اسکے بعد انکی اولاد کو یہ عہدہ ملتا رہا۔ راجہ چندولال نے رائے سالک رام (من اخفاد رائے مولچند) کے زیر عاطفت پرورش و تربیت پائی۔ کیونکہ راجہ چندولال دس ہی برس کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔

راجہ چندولال جب سن رُشد کو پہنچے تو نواب شمشیر جنگ نے ان پر توجہ فرمائی اور اپنا پیشکار مقرر کیا۔ پھر اور مختلف ملازمتیں کیں اور بتدریج حضرتہ بخشی بیگم صاحبہ کے بڑے محل نے راجہ صاحب کو بیلی کی خدمت سپرد کی۔ پھر شمشیر جنگ بہادر نے حضور پُرنور سے سفارش کر کے تعلقہ موروثی کی کارپردازی پر مقرر کرادیا۔ ۱۲۱۲ھ میں مشیر الملک بہادر کی تحریک سے راجہ صاحب کو راجہ بہادر کا خطاب بارگاہِ خسروی سے ملا۔ اور مہماتِ ملکی کو جو اُنکے سپرد تھیں

نہایت خوبی سے انجام دیا۔ راجہ لکھپت رام کے انتقال کے بعد راجہ صاحب کشتری کروڑگیری پر مقرر ہوگئے۔ پھر نواب سکندرجاہ بہادر نے انکی قابلیت اور حسن خدمات کے صلہ میں افواج قاہرۂ آصفیہ کا پیشکار مقرر کیا۔ ۱۲۳۵ھ میں مہاراجہ کا خطاب حاصل کیا اور ایک کروڑ روپیہ نقد انعام میں پایا۔ ۱۲۳۷ھ میں ہفت ہزاری کے منصب جلیلہ پر فائز ہوے۔

منیرالملک بہادر کی وفات کے بعد (۱۲۴۸ھ) راجہ صاحب وزارت عظمیٰ پر ممتاز ہوے ۱۲۵۹ھ میں ملازمت سے مستعفی ہوے اور ۱۲۶۱ھ چھیاسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مہاراجہ صاحب اپنی فیاضی اور داد و دہش کے لیے بہت مشہور تھے اور انکی اس فیاضی اور قدردانی کے سبب نامور اہل علم اور شعرا انکی صحبت سے خوش تھے۔

حکیم شفائی خاں۔ حکیم میر سلامت علی خاں۔ ملّا محمد فائز کاشانی۔ میر مفتوں۔ شاہ نصیر وغیرہ وغیرہ نامی اصحاب ہمدم و جلیس تھے۔ مہاراجہ صاحب ارباب علم کی خدمت و سلوک کو اپنا فرض منصبی جانتے تھے۔

مہاراجہ صاحب کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ صوفیانہ مذاق کے دلدادہ تھے اس لیے کہ انکی کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس کے دو ایک شعر متصوفانہ رنگ کے نہ ہوں۔ شاعری کا رنگ قدیمانہ ہے۔ بعض غزلوں میں تیرادر شاہ نصیر کا رنگ موجود ہے۔ کلام میں سادگی ہے اور اغراق و غلو کثیر بازاری مذاق سے پاک ہے۔ اور یہ بات حق بجانب بھی ہے۔ اس لیے کہ جب علما، حکما، مہذب شعرا صحبت میں رہتے تھے، تو کلام تہذیب و متانت سے کیونکر گر سکتا تھا۔ کلام کی صفائی، حسن بندش اور خیالات کی نزاکت ایسی ہے جیسی ایک کامل شاعر کے کلام میں ہونا چاہیے۔

ہر چند صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب کو کس سے تلمذ تھا، لیکن غالباً شاہ نصیر کو کلام دکھاتے ہوں۔

مہاراجہ صاحب کے دو دیوان چھپے ہیں۔ دیوان میں حمد و نعت کا انداز ویسا ہی ہے جیسے کسی مسلمان شاعر کے کلام میں۔ ناظرین کی دلچسپی اور تفنن طبع کے لیے مہاراجہ صاحب کے

کلام کا کچھ انتخاب کیا جاتا ہے۔
ذیل کے مطلع میں موسم بہار کی ترقی و رونق اور بلبل وگل کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ خیال اور معنی آفرینی بھی اور دلکش ہے۔ یعنی

جب غنچہ نے سر اپنا گریباں سے نکالا   بلبل نے قدم پھر نہ گلستاں سے نکالا

(تخلیق عالم)

کب زمین و آسماں تھا ہُو کا اک میدان تھا   کُن کے فرمانے سے خالق کے عجب گھر بنگیا

ذیل کا متصوفانہ مطلع ملاحظہ ہو۔ خیال بہت اچھا ہے گرچہ قدیم مذاق کے موافق اس میں ایطا ہے۔ میر و درد وغیرہ نے بھی ایسا کہا ہے

جلوہ گر تھا ہر جگہ کعبہ تھا یا بتخانہ تھا   گھر ہزاروں تھے مگر وہ ایک صاحبخانہ تھا

اسی زمین میں رندانہ رنگ کا ایک شعر خوب کہا ہے میکشی کرتے کرتے کس طرح سو گئے ہیں؟

رات کو کیا خوب گزری پیتے پیتے تا ہمیں   اس طرف میں اس طرف و بیچ میں پیمانہ تھا

(سادگی و لطف زبان)

سب ہوے محو اُسے دیکھ جدھر سے نکلا   تھے تعجب میں کہ یہ چاند کدھر سے نکلا

دہن زخم جو خنداں نہ ہوا تھا سو ہوا   (ولہ) اب تلک عشق نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا

سو سو طرح سے بات بناؤ تو کچھ نہ ہو   (ولہ) سب بات بن پڑتی ہے جب اُسکا کرم ہوا

ذیل کے شعر میں شاہ نصیر یا نظیر کا رنگ ملاحظہ ہو:

لے لو میاں سلام تم اس عشق باز کا   جو منتظر کھڑا ہے تمہارے سلام کا

مکھڑا تو ذرا مجھے دکھا جا   مشتاق ترا ہوں بر میں آ جا

آیا جو وہ گلشن میں پژمردہ ہوئے سب گل   بلبل بھی پھڑکتے تھے یہ رنگ چمن کا تھا

(توحید)

قطرہ کہیں دریا سے ہوتا ہے جدا یارو   وہ تم سے جدا کب ہے [illegible] جدا جانا

لپٹ صنم کے گلے سے عجب ہیں درش رہا : مجھ میں حال رہا اور نہ مجھ میں ہوش رہا

(میر کا رنگ)

دوست اپنا جو ہم کو جانا تھا ہم سے ملنے میں کیا بہانا تھا

اشعار ذیل میں معانی آفرینی کے ساتھ مضمون کی صداقت ملاحظہ ہو۔ شاہدہ کی بنیاد پر یہ مضامین بالکل بے مبالغہ ہیں۔ نازک خیالی میں فارسی اشعار سے کم نہیں۔ معلوم ہوتا ہے حزیں کے بعض اشعار کا ترجمہ ہیں۔

موج کب صبا میں چھلکتی ہے بنبن حباب پنپتے چھرتے کر لیا کرتی ہے پابوس حباب

گو اُسے پابند کیجیے موج کی زنجیر سے یہ ہوا سے ٹوٹ ہی جاتا ہے فانوس حباب

دیکھ لے غافل نہیں بحر جہاں جائے قیام کان رکھ کر سن یہ دیتا ہے صدا کوس حباب

جوں زمین و آسماں پیوند ہو سکتے نہیں کب بھلا پیوند ہو دریا کا ملبوس حباب

جبکہ ہے اشتیاق شاداں اور ہے گا منتظر

لاغ۔۔س بحر خوبی کی تو جا بوس حباب

کیا عجب ہے لوٹ جائے دل کو قاتل دیکھ کر رکھدیا یہ آئینہ اُسکے مقابل دیکھ کر

پہچانتے ہیں تجھکو کسی رنگ میں آئے سو رنگ سے آتا ہے اگر رنگ بدل کر

شاداں کے اس شعر کا رنگ ذیل کے مشہور شعر سے ملتا ہوا ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را می شناسم

دل یہی چاہے ہے ہر دم کہ اٹھا دوں اُسکو خواب راحت سے ہوا وہ نہیں بیدار ہنوز

ساقیا جام پلا دیجو شراب اور اُسے جو شتا آتا ہے وہ نشہ میں سرشار ہنوز

یہ دونوں شعر بھی اُردو زبان کا عمدہ نمونہ ہیں۔ پہلے شعر میں معشوق خوابیدہ کی پاسداری کے ساتھ اپنے اشتیاق کا اظہار کرتے ہیں دوسرے شعر میں ساقی کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ معشوق

تیرے پہلے ہی جام سے اب تک مست و سرشار ہے۔ اب اگر اور جام دیا تو معلوم نہیں مستی کیا رنگ لائے۔

چھانتا ہوں خاک عالم کی تلاشِ یار میں　　جیسے ہو غواص کو دریا میں گوہر کی تلاش
زیب دیتا ہے سبھی سنم کو پہنے جس طرح　　کب گلے میں خوشنما معلوم ہوں مفلس کے پھول

(رندانہ)

ہو رہی ہے کس طرح کی آج میخانے میں دھوم　　دختر رز نے مچا رکھی ہے پیمانے میں دھوم
جو تم نے اشارہ کیا وہ جان گئے ہم　　نشا تھا کہ قربان ہو قربان گئے ہم

اشعار ذیل کی ترکیب ملاحظہ ہو۔ مگر جس وقت میں یہ کہے گئے ہیں اُسکو نظرانداز نہ کیجیے

تم عدو کے آگے ہرگز مت کرو آدھین پن　　اس میں ہوگا دوستوں کے سامنے توہین پن

(عاجزی)

ہم وہ عاشق ہیں کہ تیرے عشق میں اے دلربا　　نوجوانی، طفلی و پیری یہ کھوئے تینوں پن
مرا دل توڑ کر باتیں بنانے سے ہو کیا حاصل　　کہ شیشے ٹوٹ کر ہرگز نہیں پیوند ہوتے ہیں

ذیل کے اشعار میں بھی میر کا سا طرز بیان ہے۔

آٹھوں پہر ہمارے دل میں جو بستیاں ہیں　　مل بیٹھ کر خوشی سے آپس میں ہنستیاں ہیں
مکھڑا تو تم دکھاتے ہو آں ہر گھڑی ہو　　لیکن ہماری آنکھیں تو بھی ترستیاں ہیں
ہشیار رہو پیارے اب وقت صبح آیا　　غفلت میں مست مت ہو یہ کیسی مستیاں ہیں
مست کرتا ہے اک نگاہ میں تو　　کب تجھے دیکھ ہم سنبھلتے ہیں
شاید نہیں ہے جنسِ محبت کی قدر اُسے　　دل بیچتا ہوں میں وہ خریدار کیوں نہیں

(ناصحانہ)

شحنہ کہتا ہے یہ شب کو کہ خبردار رہو　　سو کے غفلت سے نہ کھو وقت کو ہشیار رہو

(اوا بندی و شوق)

چھوتا چھوتا سرشار صنم آتا ہے ہاتھ کو چوم کے کہتا ہوں کہ اس بار رہو

(توحید)

نظر آتا تھا کچھ بھی لیکن جو اُسکو دیکھا تو سب کو دیکھا اندھیری شب میں بھٹک رہے تھے ہوا وہ جلوہ چراغ ہم کو

اک پل میں آنکھ کھول کے ملتے ہیں بحر میں رکھتے ہیں رنگ اور ہی پیالے حباب کے

حدیثِ عشق نے عاشق کے کان کھول دیے پڑے تھے پردۂ غفلت سو آن کھول دیے

سنا جو آہ بے گل و مرا گلستاں میں صبا نے غنچۂ گلشن کے کان کھول دیے

ذیل کا شعر کتنا پاکیزہ اور بے تکلف ہے

غزال بھول گئے ہوں گے چوکڑی اپنی شمیم زلف جو سوئے چمن گئی ہوگی

(اخلاق)

عیب گر دیکھے سی کا اُسپہ دامن ڈھانپ دے جو برہنہ ہووے اُسکا لطف سے تن ڈھانپ دے

(محویتِ جمال)

وہ جھگڑا جس گھڑی اپنا ہمیں دکھلاے ہے پھر جھپکتی ہی نہیں یہ آنکھ جب لگ جاے ہے

جانتے ہیں اُسکی ہم یہ باتیں سو رنگ کی آپ وہ کرتا ہے سب کچھ غیر کو بتلاے ہے

جیسے لہرا تا ہے سبزہ غلتِ سرسبز سے موج اُسکی یاد سے دریا میں یوں لہراے ہے

عقل اور تدبیر تو اس کی نہ دامنگیر تھی الفتِ لیلی ہی مجنوں کی مگر زنجیر تھی

جس طرف میں دیکھتا تھا اُسکے جلوے تھے نمود مردمک آنکھوں میں میری یار کی تصویر تھی

ناظرین نے حضرتِ شاداں کے ان متفرق اشعار سے اندازہ کرلیا ہوگا کہ انکا کلام قدیم رنگ کی شاعری میں اُستادانہ درجہ رکھتا ہے۔ میر۔ نصیر۔ سوز وغیرہ کے رنگ کے صدہا اشعار ہیں۔ جناب شاداں کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب ہے اور اس سے انکے اخلاق و عادات کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ رباعیاں وغیرہ بھی زیادہ تر توحید و تصوف میں ہیں مگر غزل سرائی میں بھی انکا درجہ کسی اُستاد سے کم نہیں۔ مہاراجہ بہادر شاد نے ان دیوانوں کو چھپوا کر ایشیائی شاعری میں ایک نہایت ہی پسندیدہ و دلکش اضافہ فرمایا ہے۔

ا۔ ز۔ (لکھنوی)

لطافتِ طبعی

ایک جوہر مستتر ہر پیکرِ انساں میں ہے   جس سے یہ ہستی ممیّزِ عالمِ امکاں میں ہے
ظاہری احساس سے اعلیٰ ہے وہ برتر ہے وہ   روح میں پنہاں ہے لیکن اُس سے بھی بڑھکر ہے وہ
غیر فانیت کے عالم تک رسائی اُس کی ہے   جلوۂ نورِ بقا - جلوۂ [illegible] اُس کی ہے
ہے یہی وہ شے جو دیتی ہے کمال انسان کو   پستیوں میں کرتی ہے عالی خیال انسان کو
توڑ سکتی ہے جکڑبندوں کو دُنیا کے یہی   کرکے طے رکھ دیتی ہے بندوں کو دنیا کے یہی

دیکھتی ہے رُوح جب کیفیتِ رفعت پذیر   حالتِ موجودہ کی رہتی نہیں منت پذیر
لذت آمیز اِک خلش محسوس ہوتی ہے اُسے   کوئی پاکیزہ کشش محسوس ہوتی ہے اُسے
اِس طرف سے ترکِ نسبت کا سبب بنتی ہے وہ   مرکزِ جذباتِ آرام و طرب بنتی ہے وہ
جاذبیّت اس طرح کرتی ہے ممنونِ نشاط   اور رکھتی ہے ابد تک پھر وہ مرہونِ نشاط
ہاں مگر اسکے لیے صدق و صفا درکار ہے   اور پابندیٔ تسلیم و رضا درکار ہے

ارشد تھانوی

دل کیا سمجھ کے میرا جلایا - جواب دو   تم کو ذرا بھی رحم نہ آیا جواب دو
میں نے تمہیں حسین کہا کیا بُرا کیا   کیا ہو نہیں حسین کچھ اسکا جواب دو
دل لیکے میری جان کے خواہاں ہو یہ غضب   یہ ظلم تم کو کس نے سکھایا جواب دو
کوئی کرے سلام تو دیتے نہیں جواب   تم کو یہ کیوں غرور ہے اتنا جواب دو
مجنوں ہوا ہوں فرطِ محبت سے میں مگر   لیلےٰ یہ کس نے تم کو بنایا جواب دو
فریادؔ وہ جو سخت ہیں بیجا و سختِ دل   جیسا اُدھر سوال ہو ویسا جواب دو

مصطفٰے حسن علوی فریادؔ کاکوروی

نقاد کی ادبیت

سنبھل کے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں ۔۔۔ کہ اس جگہ کوئی سودا، برہنہ پا بھی ہے

نقاد پر نقد

ممتحن" اپنی مقررہ بلند سطح سے نیچے آنے پر مجبور ہو، اور یہ یقین دلادیا جائے کہ نصیب غیر آج تو آپ کا بھی امتحان لیا جائیگا، تو بلا شک اُنکے چہرے اور قلب پر سیاہ اضطراب و تذبذب اپنی وہ ہوائیاں چھوڑنی شروع کر دیتے ہیں جو ہر امتحان میں آجانے والے کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، جنکے بعد پھر بدحواسیوں کی کمی نہیں رہتی - اور وہ اندیشۂ کامیابی و ناکامی جو ہر امتحان دینے والے کے چہرے کا غازہ ہوا کرتا ہے، ایک رنگ جماتا اور ایک اُڑاتا ہے۔ مختلف ادعا اپنی پذیرائی و عدم پذیرائی کے لیے قلب میں پہلو بدلا کرتے ہیں۔

لیکن، یہ سب فطری واردات ہیں جن سے بچ جانا بہت بڑا کام ہے، ہم کو نہ معلوم کیوں یہ یقین سا آگیا تھا کہ ان فطری واردات سے، چشم بد دور نقاد، جدید حیات یافتہ نقاد، قمر زمانی اور دگیر کا مشترک لخت جگر نقاد، متاثر نہ ہوگا - مگر آہ، خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم،

حسرت پہ اُس غریب مسافر کی روئیے ۔۔۔ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

پہلی ہی نظر میں معلوم ہوگیا، کہ شریانِ جنوں نشتر کے انتظار میں، حسنِ ذوق سے کچھ کہہ رہا ہے،

(۲)

خیر مقدم

ملک کی بے مذاقی کا بسمل، بے التفاقی کا شہید" ہر زماں از غیب جانے دیگر است" سمجھتا ہوا بخیال خود خدا دیدہ ہاتھوں سے نشاۃ الثانیہ کا قمر طلعت جام پی کر دو سال کے بعد، اب یہ نہیں معلوم کہ اوروں کو مٹانے یا پھر خود ہی پروانہ وار مٹ جانے کے لیے آیا،

دلگرفتہ و دلگیر، کے لحاظ سے نہیں، کسبِ نور کی خواہش سے متاثر ہو کر نہیں، بلکہ اس لیے کہ کہ ایک گم شدہ دوست مدت کے بعد آیا، اور طرفہ ماجرا آیا، یعنی اپنے ساتھ ایک لطیفہ لگا لایا، ہم بھی کہتے ہیں : بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم ۔ دیکھو دلگیر تم نہ چڑھ جانا

(۳)

داد

یوں تو میخانے میں ہر روز دُردکش ، زلف فام گھٹاؤں کی دعائیں مانگا ہی کرتے ہیں لیکن بھلا تو بہ شکن گھٹائیں انکے وقت پر کب آتی ہیں ، اور کتنی نگاہیں ہیں جو انکا خیر مقدم کرتی ہیں ۔ لیکن اگر کہیں قمر طلعت ساقی زلفیں کھیرا کر، اپنی ہی زلفوں سے دُرد کشانِ میخانہ کے لیے، گھنگھور گھٹائیں دام طلب کرنے کے لیے محفل میں آجائے تو شاید اودی گھٹائیں دوش ہوا پر خود لپک کتی ہوئی حاضر ہو جائیں اور ہر نگاہ ہمہ تن آغوش ہو کر پذیرائی کے لیے اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہو، پس یارانِ نقاد ، جنکی تشنہ کامیاں بہت طویل ہو چکی تھیں کیوں نہ اب سیر کام ہوں ،

زاہد نہیں وہ شیخ نہیں کچھ ولی نہیں"

اگر نظروں کو صرف اُسی قدر نظر آیا جس قدر کہ اُنکو دکھلایا جانا مقصود ہے ، تو پھر نہ پوچھیے" ذوق کے لیے جامِ تہیج ہے ، سکون قلب کے لیے حرکت ہے ، تخیل کے لیے معراج ہے ، خلوت کے لیے حسن تصور ہے ، اور کیا کہوں کس کے لیے کیا کیا ہے" اگر کہیں تاڑنے والی آنکھوں نے خندۂ زیرلبی کے معنی سمجھ لیے تو پھر یہ ایک ایسی بات ہوگی جسکے بعد چند فرمائشی قہقہوں کے سوا اور کچھ نہیں ۔

ہم ہنوز نادیدہ آشنا ہیں، ابھی پورے طور پر یہ معلوم ہو جاتا کہ دلگرفتہ و دلگیر کا " فی الحال سرمایۂ ادب کس حد تک پُرشعریت ہے ، اور کس حد تک خالی " ذرا مشکل ہے ۔

اگرچہ ، افتتاحِ افتتاحیہ" میں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے ، کہ چاندنی راتیں ابھی شروع ہوئی ہیں" یہ جو کچھ نظر آیا جلوۂ ہلالی" ہے ، شاید ایسا ہی ہو" مگر اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں قرار ابھی

کیونکہ، قضا کچھ اور کہتی ہے اور کچھ اور کہتی ہے۔ افتتاحیہ میں کہا گیا ہے :-

لیکن اب جبکہ میں نسبتاً آزاد ہوں، ان بندشوں کو قطع کرتی ہوں" اور آپ کے سامنے

اس حیثیت سے آنا چاہتی ہوں جس حیثیت سے مجھ کو اس سے قبل آجانا چاہیے تھا

(صفحہ ج سطر (۷) نقاد - جلد ۴ - نمبر ۱)

معلوم ہوتا ہے، "ناز اٹھاتی ہے ہوئی زلف گرہگیر سفید"

دلگرفتہ دلگیر کو یہ حق تو تھا کہ اپنی چاندنی رات کی جس قدر چاہتے تعریف کرتے، مگر ان کو یہ حق نہ تھا کہ کر چاندنی کو، دوسروں کے لیے صبح تمنا ہونے کا یقین دلانے کی کوشش اور وہ بھی غیر مشکور کرتے، قمرزمانی" جن کا ہاتھ بقول انکے اور بقول دلگرفتہ دلگیر کے دماغ بھی نقاد کی آرایش میں غالب شریک ہے، بجائے خود ایک لطیفہ بشرطیکہ ہنوز صبح نہ ہوئی ہو، تسلیم کیجا سکتی ہیں۔ یہ کہ ان کا حسن مذاق ہی قابل پذیرائی ہو، اس میں کم از کم مجکو ایک گونہ ہنوز کلام ہے۔ کیونکہ اپنے افتتاحیہ میں" جس کو حور پریں نے، وفور دلگیری سے چربہ لے کر چھاپا ہے، نقاد کی تازہ آمد ناپذیرائی کے ساتھ ارقام ہوتا ہے "۔

اُن عاشقوں سے پوچھو، کہ اگر اُنکے محبوب کسی طرح پھر زندہ ہو کر دنیا میں آجائیں تو وہ کیا کچھ نہ کریں؟" (صفحہ الف سطر ۸ نمبر ۱ - جلد ۴)

ما سبق اور مابعد کے فقرات کا مطلب مفہوم یہ ہے کہ مجکو نقاد کے اجرا سے اسقدر مسرت ہوئی ہے جیسے کسی عاشق کو اپنے فوت شدہ اور قبر رسیدہ معشوق کے دوبارہ زندہ پالینے سے ہوتی ہے۔

کیا ذوق سلیم اور شعریت مذاق کے لیے اس فقرہ میں ملتجی نہیں ہے، آپ نے خیال فرمایا۔ یہ عشق کا نیا فلسفہ ہے، عاشق زندہ اور معشوق قبر رسیدہ " سبحان اللہ

ہم بھی ایسے عشاق کو دیکھنا چاہتے ہیں جو معشوق کی موت کے بعد زندہ بھی رہ سکتے ہوں بندہ نواز میرے لیے تو یہ تخیل بھی اس قدر تکلیف دہ ہے، کہ میں اس پر گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتا کیا نقاد کا یہی معیار ہوگا؟ شاید ایسے عجیب العشق عشاق کا، ما طلانِ نقاد کو پتہ ہوگا۔

پھر، ایک جان دار پتی نظر آتی ہے، قریب پہنچکر دیکھتے ہیں تو اُنکو وہ تیری نظر آتی ہے،
حالانکہ وہ ہماری "دمن" کی سرد نعش تھی، جو خاک چمن سے گورو کفن مانگنے آئی تھی۔

میری یہ پیشیدستی، اگر ناگوار ہو، تو زیادہ سے زیادہ کوس لیا جائے، لیکن ان اعتراضوں
کے بعد بھی ہم اپنے دل میں ایک جگہ پاتے، لیکن اس قدر ضرور گزارش ہے، کہ بے نقاب
نہ ہو جائیے گا۔ آپ خدارا مرد بننے کی خواہش کیوں کرتی ہیں، فاتح کو مفتوح بننے میں بھلا کیا لطف
حلقۂ علم و ادب میں عورت ہونا جرم تو نہیں ہے، اور اگر ہو بھی تو پھر آپ کے لیے تو واللہ کوئی
جرم نہیں، (تو مشق ناز کر، دلگیر کی گردن پہ خوں ساری خدائی کا)

آپ کو اختیار ہے، سوالات کو تشنہ رکھیے، لیکن نقاد کے منانے والوں کو شاید اپنی
جوانی کا، بشرطیکہ ابھی باقی ہو، صدقہ، تشنہ نہ رکھیے گا، غریب دو سال کے پیاسے ہیں۔

"ہمارا نام بھی لے کر پکار ہم بھی ہیں"

سچ اور دل کی بات تو یہ ہے کہ نقاد میں چاہے کچھ ہو یا نہ ہو، مگر جب تم ہو تو اب ادبیت کو
کسی اور چیز کی ضرورت ہی کیا ہے "

(۴)

رقاصہ والے مضمون میں نیاز صاحب فتح پوری نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں
ہر آرٹ کی تکمیل عریانی پر ختم ہوتی ہے اور عریانی خود ایک آرٹ ہے (صفحہ ۴۹ جلد ۲ نمبر ا سطر ۲)
یہ دونوں باتیں نئی ہیں، اول تو لفظ آرٹ نہایت ثقیل ہے۔ کیا صنعت کا لفظ بیان اولے مفہوم
سے قاصر پایا گیا؟ دوسرے، صنعت (آرٹ) کو جب عریاں کر دیا جائے تو پھر صنعت (آرٹ) کہاں۔
صنعت اُسی وقت تک صنعت رہ سکتی ہے جب تک وہ راز میں ہے۔

مجکو تسلیم ہے عورت خود ایک صنعت ہے، لیکن اگر یہ راز سے باہر لے آئی جائے تو فرمائیے
اس میں کیا صنعت باقی رہ جاتی ہے۔ صنعت دراصل پردہ ہی کا نام ہے۔ اس فقرہ پر غور فرمائیے؟

(۵)

عکاس صاحب

کاش مغربی لٹریچر کو مشرقی انداز میں اپنی زبان کے لیے ڈھالیں تو زیادہ داد کے مستحق ہیں۔ اس وقت تو خشک اور باسی خالی از شیرینی کیک خدا جانے کس کباڑی کے یہاں سے لے آئے۔

(۶)

پپیہا

بلاشک مانی جائسی کا پپیہا خوب ہے خوب ہے، بہت خوب ہے۔ نیاز صاحب کے پپیہے سے بہت بہتر ہے۔

راقم، نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

(تمنا)

ناگفتنی ہے حالتِ عہدِ شباب بھی
دیوانہ میں بھی تھا دلِ خانہ خراب بھی

وہ کیا خلاف ہیں کہ زمانہ ہے برخلاف
پھولا ہوا ہے مجھ سے چمن میں گلاب بھی

تا بڑھ نہ جائے سلسلۂ نامۂ و پیام
اب میرے خط کا وہ نہیں دیتے جواب بھی

کرتا ہوں جان بوجھ کے میں اُن سے چھیڑ چھاڑ
مقصد یہ ہے کہ دیکھ لوں شانِ عتاب بھی

ٹوٹا ہے جیسے مجمعِ یارانِ بادہ نوش
غارت ہو یوں ہی محکمۂ احتساب بھی

بجھتی نہیں ہے پیاس کسی تشنہ کام کی
موجِ سراب ہے ترے خنجر کی آب بھی

رُخسار اپنے مجکو دکھا کر وہ کہتے ہیں
قبضے میں آفتاب بھی ہے ماہتاب بھی

جو رہ سکا نہ غیب کے پردے میں مستتر
اُس حُسن کو چھپا نہیں سکتی نقاب بھی

پانی میں بھی لگائی ترے عکسِ رُخ نے آگ
ہیں میرے آبلوں سے مشابہ حباب بھی

وعدہ جو اُس نے خواب میں آنے کا کر لیا
فرطِ خوشی سے اُڑ گیا آنکھوں سے خواب بھی

ہستی کے شور و غل نے نہ سُننے دیا رقم
کچھ کہہ گئی صدائے شکستِ حباب بھی

---

۲ امیر علی رقم لکھنوی

نظرے خوش گزرے

۸؍اپریل ۱۹۱۷ء کو علیگڈھ میں مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کا اجلاس نواب زادہ حمید اللہ خاں صاحب خلف اصغر علیا حضرۃ بیگم صاحبۂ بھوپال کی صدارت میں منعقد ہوا - اور جیسا کہ گذشتہ نمبر میں اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا بزرگان علیگڈھ کی دلی خواہش کے مطابق ہندو یونیورسٹی کی لائن پر "بہترین" یونیورسٹی حاصل کر لینے کی تجویز منظور ہو گئی - انا للہ وانا الیہ راجعون -

یونیورسٹی کا مسئلہ اگر محض ایک خالص تعلیمی بحث ہوتی تو جمہور مسلمانان تو درکنار سوائے چند اعلیٰ درجے کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے کسی کو اس بارے میں رائے زنی کا حق نہ ہوتا - لیکن بسبب اس کے کہ ہندوستان پر ایک ایسی قوم حکمراں ہے جو مذہب میں، نسل میں، رنگ روپ میں اور معاشرت میں ہم لوگوں سے کلیۃً مختلف ہے - اور اس وجہ سے ہمارے مقاصد ہماری خواہشات اور ہماری ضروریات سے وہ ہمیشہ متفق نہیں ہو سکتی - ہماری قومی زندگی کی کوئی منزل ایسی نہیں جہاں سیاسیات کی خاردار جھاڑیوں سے ہمارا دامن نہ الجھتا ہو - چنانچہ مسلم یونیورسٹی کی تجویز کے مختلف مدارج پر غور کرنے سے صاف طور پر نمایاں ہوتا ہے کہ ابتدائی تخیل سے لیکر ۸؍اپریل تک اسکے حصول میں کیا کیا مزاحمتیں پیش آتی رہیں - پہلے جب تک یونیورسٹی کی تجویز عملی صورت اختیار کرنے کے قابل نہ تھی بزرگانِ ملت اور رہنمایانِ قوم یہ خواب دیکھتے رہے کہ ہم علیگڈھ کو ایک دن بغداد و قرطبہ کا ہمپایہ بنا دیں گے - لیکن تجویز کی ملک میں عام اشاعت اُس کو رُو براہ کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اور بعد ازاں اصول و قواعد کی ترتیب کی منزلوں میں جیسے جیسے ہم حصولِ مدعا کے قریب ہوتے گئے ویسے ہی ویسے اس بات کا احساس بڑھتا گیا کہ جو ہم کرنا چاہتے تھے وہ نہیں ہونے پائے گا - ایسی صورت میں کہ ہمارا مقصود اصلی فوت ہو رہا تھا قوم کے بعض سربرآوردہ افراد نے اس اصول پر کہ کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، اور

گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت ست ، ایک ایسی یونیورسٹی کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی جو یہی نہیں کہ ہمارے اعلیٰ تخیل اور مدعاے دلی سے بہت ہی کم درجے کی چیز ہے بلکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں سے جن کا دُکھڑا علی الاعلان رویا جاتا ہے کچھ بھی بہتر نہیں۔

بے شبہہ ہمارے رہنماؤں میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ اگر آج ہم اس کھلونے پر قناعت نہ کرتے تو کل ہمیں یہ بھی میسر نہ آتا۔ لیکن ایک دوسرا گروہ یہ کہنے کو بھی تیار رہے کہ اگر ہمارے رہنماؤں کی طرف سے پوری جد وجہد کی جاتی اور پورے استقلال و جوش کے ساتھ گورنمنٹ پر اپنی قومی ضروریات ظاہر کی جاتیں (جسکے لیے یقیناً موجودہ زمانۂ جنگ موزوں نہ تھا) تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنے مدعا کے موافق یونیورسٹی حاصل نہ کرسکتے۔ کیونکہ ہمارے سامنے دو نظیریں اس قسم کی جد وجہد کی موجود ہیں ایک تقسیم بنگالہ کی تنسیخ اور دوسری اجارہ دار مزدوری کا انسداد۔

تقسیم بنگالہ کے متعلق ہم سے کتنی بار نہیں کہا گیا کہ یہ ایک فیصل شدہ امر ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن بنگال کے باہمت رہنماؤں کو شاباش ہے کہ وہ اس قسم کی تمام باتوں کو با در ہوا سمجھتے رہے اور جو دُھن اُنھیں لگی تھی اُس سے کسی آن غافل نہ ہوے اور یہاں سے لیکر انگلستان تک برابر اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کرتے رہے ، بالآخر اُنکے استقلال ، پامردی اور مخلصانہ کوششوں کو کامرانی کا سہرا نصیب ہوا اور ملک معظم کے دربار سے تقسیم کا حکم ایسے طریقے پر ترمیم کر دیا گیا کہ بنگالیوں کا دلی مقصد پورا ہو گیا۔

اجارہ دار مزدوری کے متعلق جو مردانہ جد وجہد فدائے مُلک مسٹر گاندھی نے جنوبی افریقہ میں شروع کی تھی وہ بھی اس حد تک بارور ہو چکی ہے کہ گورنمنٹ نے سردست اس قبیح دستور پر عملدرآمد ملتوی کر دیا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب اُسکے کلّی انسداد کے متعلق ضروری قانون رائج کر دیا جائے گا۔

لیکن اس قسم کی آئینی جد وجہد کے دَوران میں جن شدائد و مصائب کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے ،

جو جو سختیاں جھیلنا پڑتی اور جیسی جیسی قربانیاں کرنا ہوتی ہیں افسوس ہے کہ وہ قوم جس نے ہز ہائینس آغا خاں۔ راجہ صاحب محمود آباد اور پرنس حمیداللہ کو اپنا رہبر و رہنما بنایا ہے کبھی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اُسے زندگی کے ہر مرحلے میں اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ان کی حُب جاہ اور عیش پسندی کی بدولت قوم کی آرزوئیں اور تمنائیں ہمیشہ نا امیدی اور مایوسی سے ہمکنار ہوتی رہیں گی۔ اور جب تک دولت کی پرستش سے ہم باز نہ آئیں گے اس قابل نہیں بن سکتے کہ ترقی کی دوڑ میں اُن خوددار اور عالی ظرف قوموں سے سابقت کر سکیں جن کے رہنما روپیہ اور وجاہت کے ذریعے سے نہیں بلکہ سچے خلوص اور حقیقی ایثار کی بنا پر قوم کے سرتاج بننے کے مستحق ہیں۔

مگر ان رؤسائے قوم کی شکایت بے سود ہے کہ یہ اپنی پیدائشی خصوصیات، اپنے گرد و پیش کے اثرات، اپنی تعلیم و تربیت، اپنے مشیروں اور ہمصحبتوں، اپنی عشرت پسندی و راحت طلبی اور اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے قطعاً مجبور ہیں کہ یا تو سرے سے قوم کی آرزوؤں اور تمناؤں کی پرواہی نہ کریں یا اپنے دلی رجحان اور ذاتی خواہشات کی بنا پر کبھی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ بھی ہوں تو اُسی حد تک کہ اُن کے رجحانات اور خواہشات کے منافی نہ ہو۔ بہرحال خواہ ہم انھیں اپنی مجلس سیاسی کا پریسیڈنٹ بنائیں یا تعلیمی و مذہبی انجمن کا صدر۔ اور خواہ وہ ہمیں اپنے اُس روپے میں سے جس کا بیشتر حصہ میڈیم پائل اور ایکو تیھ انیڈ لارڈز اور وہاں ٹوے لیڈی لا، یا خوشامدی مصاحبین یا تھیٹروں اور سامان عشرت کے لیے وقف رہتا ہو، تھوڑا بہت ہمارے کاسۂ گدائی میں بھی ڈالتے رہتے ہوں یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نرم و نازک گدوں پر سونے والے اور خوشامد کی ہواؤں میں پلنے والے ہمارے مرض کی دوا نہیں۔ نہیں نہیں بلکہ اُن کی صحبت ہمارے نظام قومی کو بھی موم کی ناک بنا کر چھوڑے گی۔ داغ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں

قومی زندگی کی منازل راہ محبت سے کم نہیں، اور اس میں بھی مسلم یونیورسٹی اور مسجد کانپور جیسے سخت مقام ضرور آئیں گے۔ اور اگر ہمیں منظور ہے کہ ان کا وہ المناک و یاس انگیز حشر نہ ہو جو ہوا تو چاہیے کہ ہم ان معبودان زریں بال کو دُور ہی سے سلام کریں اور ان کے دستِ طلائی کو بوسہ دینے سے احتراز کریں۔

اپریل ۱۹۱۳ء میں جب فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تو اگرچہ گروہِ احرار میں سے مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر انصاری نے عین وقت پر راجہ صاحب کی ہم آہنگی اختیار کرلی تھی لیکن بھوپال سے جو جماعت منشی محمد امین صاحب اڈیٹر ظل السلطان کے زیر سیادت احرار کی مدد کرنے آئی تھی اُس کی امداد اور مولانا حسرت موہانی کی رہ نمائی نے قیصر باغ پارٹی کو پورا قابو نہ پانے دیا۔ اب کی بھوپال بھی شریک سازش تھا اور مولانا حسرت بھی تشریف نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا من مانی تجاویز منظور کرالی گئیں۔ یہ واقعات عالم آشکارا ہیں مگر یہاں ان کا اعادہ صرف اس بات کو دکھانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اگر جماعتِ احرار متفق و متحد رہتی تو راجہ صاحب و بزرگان علیگڈھ کی ساری کوششیں بیکار جاتیں۔ مگر جب بقول ہمارے دوست مسٹر محمد علی کے "استبدادیوں کا جامۂ استبداد کہیں سے احرار کو دستیاب ہوگیا ہے" تو سوائے اس کے کہ قوم کی بدنصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو رویا جائے اور بارگاہِ الٰہ العالمین میں دعا کی جائے کہ خداوند کریم اُس قوم پر رحم فرمائیں جس کے رہنما اتنے کم مایہ اور پست ہمت ہیں، چارۂ کار ہی کیا رہتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر انصاری نے مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ وہی برتاؤ کیا ہے جو ناظم پاشا اور اُن کے ساتھیوں نے حکومتِ عثمانیہ کے ساتھ گزشتہ جنگ بلقان میں کیا تھا۔ بلقان میں جو شکست حکومتِ عثمانیہ کو ہوئی اُس کی اشک شوئی تو انور بے کے اڈریانوپل فتح کرلینے سے کسی قدر ہو بھی گئی تھی مگر ہمارے یہاں اول تو انور بے پیدا نہیں ہوتے۔ اور اگر ہم مسٹر محمد علی کو جدید ہندوستان کا انور بے قرار دیں بھی تو وہ غریب آج ہم سے زیادہ مجبور ہیں۔

مسٹر محمد علی نے اپنے محبوس خانہ سے التوا کا جو رزولیوشن بھیجا تھا وہ بکثرت آرا مسترد[۱۵] ہو گیا ہمارے دوست کو یہ معلوم کر کے بہت نا امیدی ہوئی ہوگی، خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ لوگ جنکی موجودہ عظمت اور احرار میں ہر دلعزیزی کے اصلی سبب مسٹر محمد علی ہوئے ہیں وہی اُن کے اصلی مخالف تھے۔ احرار کے موجودہ رہنماؤں میں مسٹر مظہر الحق کو چھوڑ کر کون ہے جو آج اس طرح منبرِ رہبری کی زینت افزائی کر سکتا اگر بدنصیبی سے مسٹر محمد علی نے ان لوگوں کو بڑھانے میں نہ حصہ لیا ہوتا۔ ہم کو اپنے دوست کے خلوص و جوش پر ہمیشہ بھروسا رہا اور نواب وقار الملک مرحوم کے بعد ہم بجزاِن کے کسی کو اس کا مستحق نہ سمجھتے کہ مسلمانوں کے سردار بنیں۔ لیکن مسٹر محمد علی اس قدر نامردم شناس واقع ہوئے ہیں کہ ہمیں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ سید وزیر حسن اور راجہ صاحب محمود آباد کی اُن تمام بے مہریوں کے باوجود جو اس دو برس کے عرصے میں ان لوگوں نے ان کے ساتھ علی الاعلان اور درپردہ برتی ہیں وہ پھر انھیں کے ہم آہنگ ہو جائیں گے اور جس طرح دسمبر ۱۹۱۲ء میں وہ ان لوگوں کی بدولت ایک بڑی فاش لغزش کے مرتکب ہو چکے ہیں آیندہ بھی ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ کر قوم کے مفاد کو نظر انداز کر جائیں گے۔ البتہ ایک چیز ہے جس سے کچھ فلاح کی امید بندھتی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ممدوح نے چند واڑہ کی محصوری کے زمانے میں کلام پاک کو برابر زیر مطالعہ رکھا ہے۔ عجب نہیں جو اُسکی برکت سے اُنکے قلب میں اتنی صفائی اور قوت پیدا ہو جائے کہ آزاد ہونے کے بعد جب وہ پھر عملی دنیا میں قدم رکھیں تو لوگوں کے دلوں کا کھوٹ اور فرضی اور جھوٹا ادعاے حریت اُنھیں دھوکے میں نہ ڈالے اور پوری قوت کے ساتھ قوم کی سچی خدمات انجام دے سکیں۔

مسئلہ یونیورسٹی کے متعلق ابھی کچھ مرحلے اور باقی ہیں۔ خدا کرے کہ ان مراحل کے طے ہونے سے پیشتر ہی جنگ ختم ہو جائے اور مسٹر محمد علی آزاد ہو جائیں۔ کیونکہ اس بارے میں گروہ احرار اُن کی رہنمائی کا سخت محتاج ہے۔ اور صرف وہی اس مصیبت عظمیٰ کو ہمارے سروں سے دُور کر سکتے اور اس ذلتِ کبریٰ سے ہم کو نجات دلا سکتے ہیں۔

---

۱۵ سید جالب صاحب ایڈیٹر ہمدم جو اُس جلسے میں موجود تھے بیان کرتے ہیں کہ مسٹر محمد علی کی تجویز اور تحریر سرے سے پیش ہی نہیں ہوئی بلکہ یہ خود سید صاحب کی تحریک تھی جو مسترد ہوئی۔ البتہ محمد علی صاحب کی تجویز کے ایک حصہ کا مفہوم بھی یہی تھا۔

الہ العالمین! اپنے حبیب کے طفیل میں محمد علی، اصلاح شدہ محمد علی، جلا یافتہ محمد علی اور قرآن خوان محمد علی کو ہمارے درمیان بھیجے کہ وہ حضور سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کے نام پاک کی برکت سے ہمارے سروں سے ان جھوٹے معبودوں کی بلا دور کریں اور اپنی ذریات کو گمراہی و ضلالت سے بچالیں۔ آمین۔

مسٹر محمد علی کی ذریات (گروہ احرار) نے اگرچہ عملاً اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ استبدادیوں میں اور اُن میں کوئی فرق عظیم باقی نہیں رہا۔ کیونکہ جس طرح اُس جماعت کے افراد عہدوں اور خطابوں کے معاوضے میں مفاد قومی و ملکی کو فروخت کر دینے میں تامل نہیں کرتے تھے، یہ بھی عرضِ بازار بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ فرق ہے تو قیمت اور سکے یا نوعیت معاملہ کا۔ وہاں اگر ڈپٹی کلکٹری اور آنریری مجسٹریٹیاں یا ججیاں اور نوابیاں حد نظر تھیں تو ان کا مطمحِ نظر چندے کی جمع کردہ رقوم، مرکزی ڈرز، قومی، ملکی مجلسوں کی معتمدیاں اور صدارتیں، اخبار کے لیے مالی امداد اور خود ساختہ تجاویز میں تائید کا وعدہ ہے۔ غرضکہ بیع و شریٰ کا بازار ہر حال میں اور ہر طبقے میں یکساں گرم رہتا ہے۔ بعض سرگرم احرار، جن کے ہاشیہ ستبدین کو اسی قبیل کے الزام دیتے رہے ہیں، جب اُن کی ملک فروشیوں پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ بہت جز بز ہوتے ہیں اور معترضین کی اس بداخلاقی پہ اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہتے کہ وہ ایماندارانہ اختلاف رائے اور تبدیلی حالات کے ساتھ خیالات کے تغیر کو بھی جائز نہیں قرار دیتے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور ہم مجبور ہیں کہ لوگوں کے عقائد و اصول کو اُن کے عمل اور واقعات پیش آمدہ کی کسوٹی پہ پرکھیں۔ تم کہتے ہو، ادعا کرتے ہو، یا کم از کم آرزو ظاہر کرتے ہو کہ لوگ تمہیں حریت پسند، ترقی پذیر اور قوم کا حقیقی دردمند جانیں، ملکی و قومی مجالس کا انصرام قابضین و متصرفین سابقہ کے دستِ استبداد سے نکال کر تمہارے حوالے کر دیں، میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں تمہیں اپنا نمائندہ بنائیں اور قومی و ملکی معاملات کا تصفیہ تمہاری عقل و رائے پر چھوڑ دیں۔ یہ خواہش بالکل حق بجانب ہوتی، یہ دعوٰی بالکل صحیح کہا جاتا، اور یہ

تمنا قطعاً قابل پذیرائی تھی اگر تم بربنائے اہلیت وقابلیت یا حق وآزادی کے نام پر ان چہرو ں کے طلبگار نہ ہوتے اور محض وراثتاً جانشینی کے خواستگار ہوتے کہ رہبرانِ سابقہ کہن سالی کے سبب ناکارہ ہوگئے ہیں اور اس کشاکش سے اُن کو نجات پاکر سکون وآرام حاصل کرنا چاہیے۔ مدعیانِ حریت، اپنے دلوں پر ہاتھ رکھو، اپنے رَوَیّہ کی جانچ کرو، اور خدارا بتاؤ کہ پرنس حمیداللہ اور نوابِ رامپور، راجہ محمود آباد اور میاں محمد شفیع، سید وزیر حسن، اور مولوی رفیع الدین مسٹر مظہر الحق اور شیخ عبداللہ، ڈاکٹر انصاری اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان، ڈاکٹر عبدالرحمن اور ڈاکٹر ضیاءالدین میں اب کوئی فرق نظر آتا ہے؟ اگر نواب رامپور، میاں محمد شفیع، مولوی رفیع الدین، شیخ عبداللہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاءالدین کو آپ اس کا مجاز نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ایماندارانہ اختلافات اور خلوص آمیز ارادوں کی بنا پر قوم کی رہبری اور نمائندگی کی خدمات انجام دیں تو کوئی سبب نہیں نظر آتا کہ پرنس حمیداللہ، راجہ محمود آباد، سید وزیر حسن، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمن کے موجودہ رَوَیّہ کو بھی ہم نہایت درجہ مذموم اور قابلِ ملامت نہ قرار دیں اور اس خدمت کے لیے نااہل نہ سمجھیں۔

تم کہوگے کہ یہ لوگ شملہ اور دہلی میں آتے جاتے، گورنمنٹ کے ذمہ دار عہدہ داروں سے ملتے جلتے، اور اُن باتوں سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں جو عام پبلک کے وہم وگمان سے بالاتر ہیں لہٰذا ان کے مشوروں اور صلاحوں کو بدنیتی اور غداری پر محمول نہ کرو اور یہ کہکر سرِ تسلیم خم کردو کہ

بے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید ۔۔۔ کہ سالک بیخبر نبود زراہ ورسمِ منزلہا

مگر افسوس کہ یہ بعینہٖ وہی بات ہوگی جو مستبدین کے سرغناؤں اور رجعت پسندوں کے رہنماؤں سے ہم سنتے چلے آئے ہیں، اور اس وجہ سے، باوجودیکہ گراموفون کا ریکارڈ تبدیل ہوگیا ہے اور گانے والوں کے نام اور حُلیے بھی بدلے نظر آتے ہیں، ہم مجبور ہیں کہ ان عذرات کو اب بھی لنگ سمجھیں اور

باطل است آنچہ مدعی گوید

کا فیصلہ صادر کریں۔

مسٹر مظہر الحق کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے کہ کونسل میں جب مسلم یونیورسٹی بل پیش ہو گا تو اُس وقت وہ اپنی پھبتی کے جوہر دکھائیں گے اور ایک ایک ترمیم پہ پونے ٹیک دیں گے

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس سے قبل مسجد کانپور کے تصفیے کے وقت بھی تو کسی نے اسی قسم کے وعدے کیے تھے اور باور کرایا تھا کہ مقامات متبرکہ اور مذہبی معابد کی حرمت کو قائم رکھنے کے واسطے ایک خاص مسودۂ قانون کونسل میں پاس کرا دیا جائے گا۔

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

مسٹر محمد علی نے فاونڈیشن کمیٹی کے ۸ را پریل والے جلسے سے پیشتر ایک خط راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں بھیجا تھا، جو بعض اتفاقات کی وجہ سے اُن کو بر وقت نہ مل سکا۔ یہ تحریر اس غرض سے نہیں لکھی گئی تھی کہ شایع ہو اور نہ لکھتے وقت خود محمد علی صاحب کو اس کا گمان ہو سکتا تھا کہ اُن کا خط راجہ صاحب سے پہلے ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔ بہرحال مفادِ قومی کے لحاظ سے اس کی اشاعت کر دینا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔۔۔ اور مسٹر محمد علی کی ذریات، اور راجہ صاحب کے پرستار، دونوں کی لومة لائم سے بے خوف ہو کر اس خط کو جو اچھا خاصہ طولانی ہے بطور ضمیمہ درج کرتے ہیں۔

اس خط پر سر دست کسی اضافہ کی گنجایش وضرورت نہیں۔ ناظرین خود اُس کے مطالب کو پڑھیں اور غور کریں۔ ہمیں جو کچھ لکھنا ہو گا وہ آیندہ نمبر میں لکھیں گے۔

واللہ المستعان

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۹۶ جلد ۱۶ یکم جون ۱۹۱۶ء

کلوروڈائن

یہ انگریزوں کی ایک خانگی دوا ہے - ریاحی درد - مروڑ - خواہ کسی صورت سے ہو اس کی ایک ہی دو خوراک سے جاتی ہے - آؤں ، دست ، اور ہیضہ کے لیے یہ نہایت مفید ہے - ڈاکٹر برمن نے انگلینڈ کے ایک نامی دواخانے سے بنوایا ہے اور دیگر کلوروڈائن سے بہتر ہے - اسلیے بازاری کلوروڈائن کو نہ خرید کرکے اس کلوروڈائن کو خریدیں - قیمت ۲ ر اور ایک درجن کے چار روپے - محصولڈاک ۵ ر

دانت کے درد کی دوا

لگاتے ہی درد کو مٹاتی ہے روتے کو ہنساتی ہے - ایک باریک و مضبوط تنکے یا سینک کے سرے پر روئی لپیٹ کر اُسے دوا میں ڈبو کر ٹھیک درد کے مقام پر لگائے اور اگر دانت کی جڑ میں درد ہو تو ذرا سی روئی ڈبو کے اُس میں بھر دیں فوراً بند ہو جاتا ہے - قیمت ۴ر - محصولڈاک ۱ شیشی تک ۶ر

جلدی بیماری کی دوا

یہ تیل کئی ایک مفید دیسی اور ولایتی اسپتال کی تجربہ کی ہوئی دوائیوں سے بنایا گیا ہے - اس سے ہر قسم کی جلدی بیماری یعنی چمڑے کا مرض مثلاً خارش کھجلی - چھاجن - ایگزیما وغیرہ رفع ہوتے ہیں - پارہ سے خراب ہوئے چمڑے میں یہ اچھا فائدہ دکھاتا ہے - اس حالت میں تیل لگانے کے ساتھ ہی خون صاف کرنے والی دوا ایڈورڈ اینبر سالسہ بھی حسب ہدایت استعمال کرنا چاہیے - قیمت فی شیشی ۸ر محصولڈاک ایک سے چار تک ۵ ر سالسہ قیمت ۱۲ر محصول ۶ر

ڈاکٹر ایس کے برمن کا جوہر پیپرمنٹ

یہ تو غالباً سبھی لوگ جانتے ہیں کہ معمولی درد شکم میں جوہر پیپرمنٹ کو استعمال کیا کرتے ہیں مگر بازار کے جوہر پیپرمنٹ میں دوسری چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں اسلیے وہ پورا نفع نہیں کرتا ہے - یہ جوہر جاپان کے ایک مشہور کارخانہ سے تیار کرا کے منگوایا ہے - اسلیے آدھے چاول کے برابر پان میں رکھکر کھانے سے منھ کا بو - پیٹ کا درد ریاحی وغیرہ کو دور کر دیگا - تیل میں ملا کر کنپٹی میں لگانے سے درد سر کے لیے بھی مفید ہے - قیمت فی شیشی ۸ر محصول ڈاک وغیرہ ۵ ر

(نوٹ) یہ دوائیں ہر جگہ دوکانداروں دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں - ورنہ کارخانہ سے طلب کیجیے

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ - کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۹۶ جلد ۱۶ —— یکم جون ۱۹۱۷ء

ہمارے پڑوسی

تمہید

پڑوسی نہیں بلکہ ساتھی ! جنکا ہمارا ساتھ روزِ ولادت سے لیکر مدت العمر تک رہتا ہے۔ وہ ہمارے گھروں میں، باغچوں میں، اور ہماری بستیوں کے باہر جنگلوں میں بھی ہر جگہ اس طرح رہتے سہتے ہیں کہ گویا یہ زمین انھیں کی ملکیت ہے۔ اور اس دُنیا کے دشت و دَر میں ہمارا اور ان کا دونوں کا ساجھا ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو ملکیت میں غالب حق اُنھیں کا ہے۔ کیونکہ اکثر ہمیں اُن کے مساکن میں آدھمکتے اور وہاں اپنا قبضہ جماتے پھرتے ہیں جس سے اُن غریبوں کو اپنی جان لیکر کسی دوسری جگہ بھاگتے ہی بن پڑتا ہے۔ ہمیں ہیں کہ اپنے علم و ہنر کے گھمنڈ میں ان کے جنگلوں کو اپنی بستیاں آباد بناتے پھرتے ہیں۔ اور اُن "بے زبان" پڑوسیوں پر ایسے ایسے ظلم روا رکھتے ہیں کہ کیا عجب ہے وہ اپنے دلوں میں ہمیں اُن مظالم کی وجہ سے ہزاروں صلواتیں سناتے اور کوستے رہتے ہوں۔ تمام چرند و پرند اور کیڑے مکوڑے ہمارے دَم کے ساتھی ہیں۔ ہم اُن کو پالتے ہیں۔ اُن سے خوش

ہوتے ہیں۔ اُن سے ڈرتے ہیں۔ اُن کو اپنے کام میں لاتے ہیں۔ اُن کے ننھے ننھے دلکش سے
حظ اُٹھاتے ہیں۔ اور انکی طرح طرح کی حرکتوں اور آوازوں کو ہر روز دیکھتے اور سُنتے رہتے
ہیں۔ لیکن وائے برحال ما۔ جہالت و لاعلمی کا بُرا ہو۔ جو انکی ایک بات بھی ہماری سمجھ میں آتی ہو۔
یا انکے ایک فعل سے بھی ہم کوئی مطلب نکالتے ہوں۔ بلکہ ہم تو صرف یہ کہکر ٹال دینے کے عادی
ہیں کہ اس ادنیٰ مخلوق میں سمجھ اور عقل کہاں۔ صرف ایک Instinct (حس حیوانی) ہے
. . . . جو کٹھ پتلی کی طرح ان سے تمام افعال صادر کراتی ہے اور اُن کا
مرنا جینا دونوں یکساں ہے۔ یہ خیال اپنے دل کے لیے تو ضرور تسلی بخش ہے لیکن افسوس ہے
کہ اس سے حقیقت حال کچھ بھی نہیں کھلتی۔ اوپر سے طرّہ یہ ہے کہ موجودہ تحقیقاتوں نے اور بھی
غلجان میں ڈال دیا ہے۔ چیونٹی۔ مکڑی۔ بندر۔ کُتے وغیرہ کی زندگی پر جن صاحبان ذہن و ذکا نے
مدتوں مشاہدے کیے ہیں اُن کا قول اس امر کی پوری طور سے تصدیق کرتا ہے کہ ہمارا گمان
اگر بالکل باطل نہیں تو مبالغہ آمیز اور بہت ہی مبالغہ آمیز تو ضرور ہے۔ جانوروں کی زندگی کا مطالعہ
نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ حد درجہ سبق آموز اور اس بات کو جتانے والا کہ وہ بھی عقل و فہم سے
بے بہرہ نہیں ہیں۔ انکے حالات اس قدر عجیب و غریب دریافت ہوے ہیں کہ فسانہ اور کہانی معلوم
ہوتے ہیں۔ اور ابھی ہوا ہی کیا ہے۔ دیکھیے آگے آگے کیا کھلتا ہے۔ جب انکی بولی سمجھ میں آنے
لگے گی اُس وقت بڑا ہی لطف آئے گا۔ خیر یہ تو ایک اُمید موہوم ہے۔ کیونکہ شاید ہی کسی انسان
کو حضرت سلیمانؑ کا مرتبہ حاصل ہو۔ پھر بھی جو کچھ ذخیرہ موجود ہے بہت کچھ ہماری آنکھیں کھولنے کے
لیے کافی ہے۔ زمانۂ حال میں علم حیوانات پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور ہمارا مقصد ناظرین
کرام کو اُنکے مطالعہ کا شوق دلانا ہے۔ اس لیے اُن کتابوں سے چند مختصر چٹکلے چُن کر ناظرین کے
حضور میں پیش کرتے ہیں :-

(۱) اُلّو

بھئی واہ اچھے سے شروع کی۔ جو لوگوں میں ایسا نکو بدنام ہے کہ شاید ہی کوئی اور پرند ہو

ایسا منحوس کہ جہاں بیٹھا اُس جگہ کو ملیا میٹ کرکے اُٹھا - رات کا چور - قزاق - چڑیوں کو تنگ کرنے والا - اُجڑی ہوئی محلسراؤں پر بیٹھنے والا - بچّوں کو اپنی گھگوگو سے ڈرانے والا - اُسے شیطان کا چیلا کوئی نہ کہے تو کیا کہے - شاعروں نے الگ اسکی ہجو اور مذمت کے گیت گائے ہیں - زبان درازوں نے اس کا نام لیکر الگ سر پھوڑوائے ہیں - غرضکہ کوئی ہے جو اسکو نفرت سے نہ دیکھتا ہو؟ لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ انصاف کی بات نہیں - بقول شخصے - ع "چغد بے بُوم مفت میں بدنام ہے" - بھلا بیچارے بُوم کو انسان سے کیا دشمنی! اُسپر آفت و بلا لانے کی کیا قدرت! آپ جانیے کہ چیل و باز کی طرح ایک شکاری پرندہ ہے - کسی وجہ سے رات کو جاگنے کی اس نے دل میں ٹھان رکھی ہے - اُسی وقت اپنا پیٹ پالنے کے لیے باہر نکلتا ہے - سوتی ہوئی چڑیوں کے گھونسلوں پر جھپٹا مارتا ہے تو اُن کے لیے ضرور آفت و بلا بنجاتا ہے - اس لحاظ سے، اسمیں شک نہیں کہ ہم بھی چڑیوں کے طرفدار و ہمدرد ہوکر یہ ضرور مانتے ہیں کہ یہ حضرت صورت شکل کے بھولے بھالے لیکن ہیں بڑے گنوں سے بھرے ہوئے - یہ بھی کوئی بات ہے کہ جب سارے پرندے اپنے گھونسلوں میں مزے سے خرّاٹے لیکر سو رہے ہوں یہ باہر قدم رنجہ فرماتے ہیں - اور چُپکے چُپکے دوسروں کے گھروں میں پہنچکر اُنکے بچوں کو پکڑ کے ہڑپ کرجاتے ہیں - اس حرکتِ ناشایستہ کے لیے قدرت نے اعضا بھی ان کے ایسے ہی بنائے ہیں، نگاہ بڑی دُوربیں - کان بلا کے تیز - پرواز خاموش - کیونکہ رات سُنسان ہے - شکار دُور ہے - ذرا سی آہٹ پر پہنچتا ہے - اور ایسی ہوشیاری کے ساتھ کہ کسی کو پتہ نہ لگے - اگر کوّے کے سے پر ہوتے اور اُڑنے میں پھڑ پھڑ کرتے تو بھلا کاہے کو کوئی لقمہ نصیب ہوتا - اُلو کی آنکھوں کو کس نے نہیں دیکھا - معلوم ہوتا ہے کہ دو بڑے بڑے چمکدار دیدے ہیں جو گھور رہے ہیں - ان کی شکل گول ہے - پُتلیوں کی سیاہی سفیدی سے کہیں زیادہ ہے تاکہ رات کے وقت چاند یا تاروں کی روشنی بخوبی اندر داخل ہو سکے - مگر جب دن ہوتا ہے تو یہی امر اُسکی تکلیف کا باعث ہوتا ہے - اور سورج کی تیز روشنی کے سامنے اس قدر چکا چوندھ پیدا ہو جاتی ہے کہ اُسکو کچھ سوجھائی نہیں دیتا - اسی لیے وہ رات کو دن پر ترجیح دیتا ہے

اندھیرے مقامات کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اور کبھی بھولا بھٹکا صبح کو نکلا بھی تو کہیں سایہ میں منھ چھپا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس میں ایک اور بھی خصوصیت ہے۔ درانحالیکہ اکثر پرندوں کی آنکھیں سر کے دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ اسکی آدمی کی طرح سامنے کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ تاکہ مقابل کی شے کو بخوبی دیکھ سکے گر پیچھے سے آنے والا مطلق نظر نہیں آسکتا۔ جن جانوروں کی آنکھیں ایسی نہیں بلکہ چڑیوں کی طرح ہوتی ہیں اُنکے منظر کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ سامنے کی چیز کو گو اچھی طرح نہ دیکھ سکیں لیکن اردگرد و پس پشت کا نظارہ بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ اگر اُن اطراف سے کوئی حملہ آور ہو تو فی الفور خبر ہو جائے اور اپنے بچاؤ کی تدبیر کر سکیں۔ قسام ازل نے بھی خوب ہر ایک جانور کو اسی کی ضرورت کے مطابق دیکھنے کا آلہ بخشا ہے۔ مثلاً جو کمزور وضعیف ہیں، دوسروں کا شکار ہو جاتے ہیں اُن کی آنکھیں بھی آڑی ترچھی دو طرفہ بنا دیں۔ یا گردن لمبی کر دی۔ مثلاً چڑیاں۔ ہرن۔ بیل و نیل گاؤ وغیرہ کہ اپنے دشمنوں سے آگاہ ہو جائیں۔ لیکن جو شکاری پرند و چرند ہیں۔ مثلاً اُلو، عقاب، شیر وغیرہ وہ اپنے صید پر سامنے سے جھپٹا مارنے کے عادی ہیں۔ اس لیے ویسی ہی آنکھیں بھی اُنکو عطا فرمائیں۔

اب اُلو کے کانوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ ان کا سوراخ بخلاف دوسرے پرندوں کے بہت کشادہ ہے اور باہر چمڑے کا ایک پردہ سا لگا ہوا ہے جسے حرکت دینے سے آوازیں زیادہ صفائی کے ساتھ مرکز سامعہ تک پہنچ سکتی ہیں۔ ان کی بعض ایسی بھی قسمیں ہیں جن کے کان درازی و ساخت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں جس سے شاید مزید سرعت احساس مقصود ہو۔

اس کے بازوؤں کی حرکت سے اس لیے آواز نہیں آتی ہے کہ پر نہایت ملائم اور روئیں دار ہیں ان میں ہوا کی سرسراہٹ سے مطلق شور نہیں ہونے پاتا۔ اور اُس چور کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ربڑ کے جوتے پہن کر کسی مکان میں آ گھسے۔ اسی طرح غریب چڑیوں کو بھی جب تک یہ سر پر نہیں پہنچتا خبر تک نہیں ہوتی۔ پھر فضول چلاتی ہیں پھڑپھڑاتی ہیں۔ اور یہ اپنا شکار دبوچ کر جلدی سے جیسے آیا تھا ویسا ہی چمپت ہو جاتا ہے۔ کبھی اگر شامت اعمال سے لالچ نے بہت ستایا اور ان کو یہ سوجھی کہ چلو دن کو بھی کہیں حلوان کا ڈول جمانا چاہیے، تب تو چڑیوں کی منھ مانگی مراد بر آتی ہے اور اُلو کی

بے طرح گت بنائی جاتی ہے۔ تمام چڑیاں جمع ہوکر جن میں سب سے آگے کوے ہوتے ہیں اُس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور اپنی چونچوں سے مار مار کر اس طرح نوچنا کھسوٹنا شروع کرتے ہیں کہ پر تو کیا اپنی جان بھی سلامت لیجائے تب بھی غنیمت جانے۔ آنکھ سے چکا چوند کے مارے کچھ سوجھائی تو دیتا نہیں، اور پیچھے سے حملہ کرنے والوں کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے پریشان حیران اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ اسی خوف سے اس نے شب بیداری کی زندگی کو غنیمت جان کر اختیار کیا ہو۔ بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چڑیوں کی یہ مخاصمت اُس نفرت پر مبنی ہے جو قدرتی طور سے ہر ذی روح کو اپنے دشمن کے ساتھ ہوتی ہے لیکن جو اس بات کے قائل نہیں اور انکو جذبات و فہم سے غیر متصف گردانتے ہیں، کہتے ہیں کہ پرندوں کا یہ عجیب برتاؤ ہر اجنبی پرندے کے ساتھ اسی طرح کا ہے۔ مثلاً اگر لہبر طوطے کو پنجرے سے کھول کر باہر نکال دیا جائے تو چونکہ دوسری چڑیاں اسکو اپنی سوسائٹی میں روز دیکھنے کی عادی نہیں ہیں اس لیے اُس کے ساتھ بھی ایسی ہی بدسلوکی کے ساتھ پیش آئیں گی - یہ چڑیاں کیا ہوئیں گانوٗں کے لونڈے ہوے کہ جہاں کسی بہروپیے یا غیر ملک کے آدمی کو دیکھا۔ تالیاں بجا بجا کر، ڈھیلے مار مار کر اُس کا ناک میں دم کر دیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر اتنی بھی انھیں عقل ہے اور اپنی جنس کے تحفظ کا خیال ہے تو بھی بڑی داد و ستایش کی مستحق ہیں۔

اُلّو کو (سوائے بند و قچی کے) کسی دوسرے جانور سے کھٹکا نہیں۔ کوئی اور اس کا شکار کرنے والا نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ نسبتاً اسکی تعداد بہت کم ہے۔ کیا غذا کی قلت ہے؟ نہیں وہ بھی بافراط موجود ہے۔ تو شاید وہ بڑی مشکل سے ملتی ہوگی اور اپنی زندگی کے قیام کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو پرند ہوشیار و چالاک نہیں اور کمزور و ضعیف پر واز ہیں بہت جلد معدوم ہو جائیں گے اور باقیماندہ جن کو افضل الجنس سمجھنا چاہیے لامحالہ قلیل التعداد رہ جائیں گے۔ بظاہر تو یہی قانون تمام کارگاہِ قدرت میں مروج معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے درندوں و جانوروں میں بھی اسی کا عمل موجود ہے۔ مثلاً شیر ہی کو دیکھو کہ دُنیا میں کس قدر رکمیاب ہو رہ گیا ہے۔ فی الجملہ اگر یہی کیفیت ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ شکاری اپنے شکار سے بدتر حالوں میں ہیں۔ اُس غریب کو اپنا رزق تو

آسانی سے اور با فراط مل جاتا ہے۔ سسک سسک کر بھوکوں کے مارے جان تو نہیں دیتا اور جب موت آتی ہے تو ایسی دفعتاً واچانک کہ خبر تک نہیں ہوتی۔

اُلّو کی آواز بڑی بھیانک ہے۔ اس سے شاید شکار کو مرعوب کرنا مقصود ہو۔ بعض درندے جانوروں کا بھی یہی حال ہے۔ شیر کی آنکھوں کا اثر چھوٹے جانوروں پر اس قدر ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے اور بے حس و حرکت وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

(۲) گلہری

بی گلہری کے بھی بہت سے چاہنے والے موجود ہیں۔ جو اُسکی خوبصورت دھاریوں، نازک جسم اور ملائم بالوں پر جان دیتے ہیں۔ لیکن ہم تو اس حُسن ظاہری کے قائل نہیں۔ ہماری سمجھ میں تو وہ بڑی ہی شوخ بدتمیز اور بےحیا سی ہے۔ بدقسمتی سے مجھے اس کے ساتھ اکثر سابقہ بھی رہا کیا ہے۔ لکھنؤ میں ایک مکان میں رہتا تھا جس کی چھت لکڑی اور پھونس کی بنی تھی۔ اور اُسکے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ جس میں برگد اور نیم کے دو تین بڑے درخت بھی تھے۔ بس کیا پوچھتے ہو۔ اس کمبخت کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ تمام گھر اور باغ گویا اُسی کی ملکیت ہو گئی۔ کرایہ تو ہم دیں اور یہ مفت میں رہیں سہیں۔ اور اُسپر طرہ یہ کہ میں ہی کھانا بھی دوں اور ان کے گھونسلے کی تعمیر کے لیے اشیاء بھی مہیا کروں۔ مثلاً کڑیوں اور چھت کے درمیان جو خالی جگہ تھی وہ اسکو بھا گئی اور جائے قیام قرار دی گئی۔ اُسی کے قریب کی کڑی سے رسّی کا ایک سرا بندھا ہوا تھا جس سے پنکھا لٹکا رہتا تھا اور جس کے نیچے پلنگ بچھا کر میں کبھی دن کے وقت لوٹ پوٹ کر لیا کرتا تھا۔ اب یہ رسّی کیا تھی گویا گلہری بیگم کے خلوت کدے میں آنے جانے کا زینہ تھا۔ زمین سے اُچک کر پلنگ کے پائے پر چڑھیں۔ وہاں سے جو جست ماری تو جھالر پر پہنچیں اور لکڑی کے ڈنڈے پر ایک دوڑ لگا، رسی کو پکڑتی ہوئی اوپر پہنچیں۔ وہاں سے جو ایک چھلانگ ماری تو اپنے گھر کے اندر داخل۔ اس تیزی، پھرتی اور نڈرپن کے ساتھ کہ اگر کوئی نٹ اور کرتبی بھی یہ تماشا دیکھے تو اپنے کان پکڑے اور لوہا مان جائے۔

جب گلہری کو کوئی ایسی موزوں جگہ نہیں ملتی تو درختوں کی شاخوں میں اپنے لیے ایک بڑا سا

گھونسلا بناتی ہے جس میں باہر سے تو گھاس پھونس اور تنکے لگاتی ہے لیکن اندر سے خوب ملائم اور گُدگُدا بناتی ہے۔ اسکے لیے جہاں سے کوئی چیز مل سکتی ہے چوری یا سرزوری سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر لاتی ہے۔ میرے گھر میں ایک بی ملاقی تھیں۔ وہ ایک دن پلنگ پر بیٹھی ہوئی، آنکھوں پر عینک لگائے، اُنگلی میں انگشتانہ پہنے، سوئی سے تاگہ نکل گیا تھا تو اُسکو اُٹھا کر پھر پرونا چاہتی ہی تھیں کہ اتنے میں پیچھے سے کسی نے جھٹکا دیا، تاگا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کیا دیکھتی ہیں کہ گلہری منھ میں تاگے کا گولا دبائے ہوئے بھاگی چلی جا رہی ہے۔ غصے میں جوتی کھینچ کر ماری، لیکن بھلا اُسکو لگتی۔ ہے!!! یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گئی۔

میرے پاس ایک رضائی تھی جسے میں جاڑے کے زمانے میں روز اوڑھ کر صبح کے وقت مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اُس میں ایک چھید ہو گیا جو روز بروز بڑا ہوتا گیا۔ میں حیران تھا، سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے اور کس شیطان کی کارستانی ہے۔ کہ اتنے میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ پیچھے مڑ کر جو نگاہ کرتا ہوں تو گلہری اپنے مُنھ میں روئی کا بڑا سا ٹکڑا دبائے ہوئے (جو یقیناً میری ہی رضائی سے نوچ کر نکالا ہوگا) اپنے گھونسلے کی طرف رُخ کیے خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ روئی اور تاگے سے بڑھ کر بھلا اور کون سا نرم بچھونا ہو سکتا ہے۔ جس کو ہمیں سے چھین جھپٹ کے نہ لے تو کس سے لے۔

کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ گلہری کی خاص خوراک میوے۔ پھل۔ بیج اور بعض ملائم ڈنٹھل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایک آدھ کیڑا مکوڑا بھی مُنھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے چکھ لیتی ہے۔ لیکن میرا اپنا تجربہ و مشاہدہ گواہی دیتا ہے کہ بہت سی اور چیزوں کے کھانے سے بھی اُسے دریغ نہیں۔ مثلاً ایک دن میں بیٹھا ہوا چاء پی رہا تھا۔ بسکٹ کا آدھا ٹکڑا توڑ کر طشتری میں رکھ دیا تھا۔ ذرا سی آنکھ اوجھل ہوئی ہوگی پھر جو دیکھتا ہوں تو نہ ٹکڑے کا پتہ ہے نہ مکھن کی گولی کا۔ سخت حیران کہ الٰہی یہ کون آ کر لے گیا؟ نوکر کو آواز دیکر تھوڑا اور منگایا۔ اور بہانہ بنا کر ایک کاغذ سے مُنھ چھپا کر کن انکھیوں سے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک تو بالکل سکوت رہا۔ اتنے میں ایک گلہری کمرے میں داخل ہوئی۔

سب سے پہلے اس نے اپنا سر چاروں طرف گھما کر اچھی طرح دیکھ لیا کہ میدان خالی ہے اور کوئی ڈر تو نہیں ہے۔ پھر بڑی بیباکی کے ساتھ آگے بڑھی۔ سینک پائے پر سے ہوتی ہوئی اوپر چڑھی اور روٹی کا ٹکڑا منھ میں دبا کر روانہ ہونے ہی والی تھی کہ میں نے ہُش کر دیا۔ اس نے گھبرا کر دو تین قلابازیاں کھائیں اور حواس باختہ بھاگی۔ ٹکڑا وہیں زمین پر گر گیا۔ لحظہ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ پھر دروازے کے پاس موجود۔ وہی تاکا جھانکی۔ وہی دبے پاؤں آنا۔ لیکن ابکی بار اُٹھا ہی لے گئی۔ اور خوش خوش باہر جا رہی تھی کہ اتفاقاً ایک کوا ابھی اسی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ چور کا بھائی گرہ کٹ۔ ایک ہی جھپٹے میں مُنھ سے نوالا چھین کر اُڑتا بنا۔ اسوقت بیچاری گلہری کی حالت قابل دید تھی۔ اسکے بدن کی بوٹی بوٹی تھرتھر کانپ رہی تھی۔ گویا غصے میں بھری ہوئی حرامزادے کوّے کو ہزاروں صلواتیں سُنا رہی تھی۔

گلہری کو روٹی دودھ کا بہت شوق ہے اس کے ملنے کے لیے سیکڑوں ہی تو ترکیبیں کرتی ہے۔ میرے یہاں ایک مَینا پلی ہوئی تھی۔ جسے لکڑی کے تیلیوں دار پنجرے میں بند کر کے رکھتا تھا۔ اور اُسکے کونے میں ایک چھوٹی سی پیالی دودھ اور روٹی سے بھری ہوئی کبھی کبھی رکھ دیتا تھا۔ کسی طرح گلہری کو اسکی خبر لگ گئی۔ پھر کیا تھا۔ فوراً ہی تو کھمبے پر چڑھکر جہاں دَر میں پنجرا لٹکا ہوا تھا پہنچی اور اپنا ننھا سا پنجہ تیلیوں کی دراڑ میں سے اندر ڈال کر تمام ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے چٹ کر گئی۔ میں نے دوسرا پیالہ ذرا کھسکا کر پنجڑے کے بیچوں بیچ رکھدیا کہ اب تو اس کا ہاتھ نہ پہنچے گا۔ اس کا جواب مجھے یوں ملا کہ تیلیوں کو اس نے اپنے دانتوں سے کتر کر توڑ ڈالا۔ اور خوب دھڑلّے سے اندر گھُس کر بیباکانہ اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ ذرا سی میری آہٹ پائی اور کود کر باہر ہو گئی اور جب دیکھا کہ میں چپکا بیٹھا ہوں تو پھر اندر پہنچ گئی۔ میں بھی اپنے داؤں کا منتظر تھا۔ موقعہ پاکر اور بڑی صفائی اور پھُرتی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے سوراخ کو بند کر دیا۔ اب بچا تا ؤ کہاں بھاگ کر جاتی ہو! گلہری نے جو یہ دیکھا تو اندر پاگلوں کی طرح اس زور زور سے چکر مارنے اور سر پھوڑنے لگی کہ میری مینا ڈر گئی چیخنے اور پھڑپھڑانے لگی۔ مجھے بھی گھبرا کر ناچار ہاتھ اُٹھا دینا پڑا۔ اور سمجھا کہ یہ کافی سزا مل گئی۔

اب کبھی نہ آئے گی۔ لیکن اسکی بلا ان باتوں کا خیال کرے۔ دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ پھر وہیں موجود۔ بل بے گلہری تیرے دیدے کی ڈھٹائی!!

آپ اپنا خاصہ بھی عجب انداز سے تناول فرماتی ہیں۔ پچھلے پیروں کے بل زمین پر بیٹھکر اور اگلے دونوں پنجوں میں کوئی چیز اُٹھا کر کتر کتر کر کھاتی ہیں اور ایسی جلدی جلدی کہ معلوم ہو کئی دن کا شاید فاقہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دُم بھی پیچھے سے ہلتی جاتی ہے جو سامنے سے نظر نہیں آتی۔ اسکو اس کا بڑا خیال رہتا ہے کہ درخت یا اپنے مسکن سے بھٹک کر دور نہ چلی جاؤں کیونکہ ذرا سا بھی خطرہ ہوا اور سرسے اوپر چڑھ گئی۔ اور وہاں بیٹھ کر کتنا ہی مُنھ چڑھاؤ اور غصہ دکھاؤ، پھر کسی کا قابو نہیں چل سکتا۔ گلہری حد درجے کی بےصبری واقع ہوئی ہے۔ یہ کہاں انتظار کہ پھل اور بیج پک پکا کر زمین پر گر پڑیں تب اُنھیں کھاؤں۔ وہ پہلے ہی سے ٹہنیوں پر چڑھ کر اور اُنکو کتر کتر کر سوراخدار بنا دیتی ہے۔ ہلکی پھلکی ہونیکے سبب اس میں کچھ تکلیف بھی نہیں۔ چھوٹی سی چھوٹی پھننگ پر ایک لمحے میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈالیوں پر اُچکتی جست مارتی پھرتی ہے۔ اور اتنا غل مچاتی ہے کہ چڑیاں کہتی ہیں کہ یہ بھونچال کہاں سے آگیا۔

گلہریاں آپس میں بڑی ملنسار ہوتی ہیں۔ بچے بالوں کے پالنے کا زمانہ تو مجبوری ہے ورنہ ہمیشہ سب ایک ساتھ مل کر کسی پُرانے درخت کے تنے میں ایک سوراخ دیکھ کر اُسی میں گھونسلا بنا کر رہتی ہیں۔ سویرا ہوا۔ سورج نکلا اور سب نے باہر آکر ذرا دھوپ کھائی۔ پھر اپنی اپنی روزی کی فکر میں مختلف اطراف کا گشت لگانے نکلیں۔ شام ہوتے ہی سب واپس آتی ہیں بعض جو طبیعت کی شوخ اور کھلنڈری واقع ہوتی ہیں سونے سے پہلے آپس میں کہتی ہیں "آؤ گوئیاں ذرا آنکھ مچولا کھیل لیں" اس سے بڑی دیر تک وہ دھاچوکڑی مچی رہتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ایک بھاگتی ہے دوسری اُس کا پیچھا کرتی ہے۔ دُم پکڑتی ہے۔ کبھی درخت کے اندر کبھی باہر۔ کبھی شاخ پر، کبھی نیچے۔ غرضکہ جب تک تھک نہیں جاتیں اپنے کھیل کود سے باز نہیں آتیں۔

گلہری کے بچے سخت بدشکل پیدا ہوتے ہیں۔ ننگے بُچّے۔ گوشت کے لوتھڑے کی طرح اور

آنکھوں سے اندھے۔ اُنکی پیٹھ پر تین لمبی لمبی دھاریاں ہوتی ہیں جنھیں ہمارے ہندو بھائی ہنومان جی کی اُنگلیوں کے نشان بتاتے ہیں۔ کچھ دنوں میں آنکھیں بھی کھُل جاتی ہیں اور بال بھی اُگ آتے ہیں اور اچھی خاصی گلہری کی صورت نکل آتی ہے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر پالا جاوے تو بڑی دلگی اور تماشا کرتے ہیں۔ ابھی ہاتھ پر بیٹھے ہوے مزے سے روٹی کھا رہے ہیں ابھی ذرا سی بات پر ڈر گئے اور اُچھل کر نظروں سے غائب ہو گئے۔ پھر اُنکو ڈھونڈھتے پھریے اور پریشان رہیے کہ کہیں بلّی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے۔ بہزار خرابی ڈھونڈھ کر نکالا۔ تو دری، قالین یا تکیے کے پیچھے، یا باہر کسی درخت کے پاس دبکے بیٹھے پایا۔ اسکو بھی عجب عجب جگہیں چھپنے کی سوجھتی ہیں مجھے خوب یاد ہے کہ جب چھوٹا سا تھا تو مکتب میں ایک شریر لڑکے نے مولوی صاحب کے قریب ہی ایک گلہری کا بچہ چھوڑ دیا۔ اُسکو گھبراہٹ میں کچھ نہ سوجھی تو مولانا کے ڈھیلے پاجامے کے پائنچے میں گھُس گیا۔ اُس وقت اُنکی پریشانی قابل دید تھی جو مجھے کبھی نہ بھولے گی۔

گلہری کی دُم کیا ہے اچھی خاصی جھاڑو ہے۔ جس کے تنکے جہاں جھڑ گئے اور لگا لیے۔ بال خود بخود اُگ آتے ہیں۔ میں ایک دفعہ ایک بچے کے پکڑنے کی فکر میں تھا کہ وہ پلنگ پر سے کود کر بھاگا۔ جلدی میں میرا ہاتھ دُم پر پڑا۔ وہ تو نکل گیا لیکن اپنی نشانی ہاتھ میں چھوڑ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد دیکھا تو پھر جیسی کی تیسی پونچھ ہلا رہا تھا۔

"مانی"

کون یہ دست بشمشیر نظر آتا ہے — مجھ کو اک عالم تصویر نظر آتا ہے
جلوۂ حسن سے رنگیں دل پُرداغ مرا — شوق کے ہند میں کشمیر نظر آتا ہے
کم نگاہی میں بھی اُس محوِ حیا کی دل کو — اثرِ سُرمۂ تسخیر نظر آتا ہے
ولولے دل کے ترے غم کا ادب کیوں نہ کریں — اک جوانوں میں یہی پیر نظر آتا ہے
غیر سے ہنس کے وہ بولے مجھے پاکر بیتاب — آج یہ طالبِ تعزیر نظر آتا ہے
اُن سے ملنے کی نکلتی نہیں تدبیر کوئی — کام وابستۂ تقدیر نظر آتا ہے
پا سکا بار نہ اُس بزم طرب میں شاید — حسرت اس درجہ جو دلگیر نظر آتا ہے

حسرت موہانی

ہندوستانی مفلسی کے اسباب اور اُسکے دفعیہ کی تدابیر

ہندوستان کا افلاس اب واقعات کی منزل طے کرکے ضرب المثل کے حدود میں آگیا ہے اور ارباب بصیرت کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ دُنیا میں بہت کم ایسے ممالک ہیں جن کی ابتدائی دولت و ثروت اُس مرتبۂ کمال پر پہنچی ہو جس کا ہندوستان ایک غیر محدود زمانے تک مسلسل مالک رہ چکا ہے۔ اور پھر اب اُس قعر ذلت میں گر گئے ہوں جس سے نکلنے کے لیے نہ اُسکے پاؤں میں دم ہے، نہ قوت اجازت دیتی ہے، اور نہ واقعات و حوادث مدد کرتے ہیں۔

ہندوستان کی قدیم روایات اور پھر عہد وسطیٰ کے افسانے ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ کیونکر دوسرے ممالک کے حملہ آوروں نے ہندوستان کو تاراج کیا اور کس طرح وہ سنبھالے لیکر اپنے تنزل کی انتہائی درجے کی طرف جھکتا گیا، حتیٰ کہ آج ایک بیدست و پا جسم ہے، اور قطعاً غیر متحرک وجود! لیکن ہم کو بھولنا نہیں چاہیے کہ باوجود اس تاخت و تاراج کے ہندوستان کے تمدن و اقبال، دولت و حشمت کا چراغ اُسی طرح روشن رہا اور اُسکے بیرونی دشمنوں نے کبھی بھی اُسکے دامنِ دوستی کو نہیں چھوڑا۔ مگر زمانۂ حال کے انقلابات اور عہد وسطیٰ کے قرونِ تابناک کے بعد ہندوستان جس درجہ مصائب و فلاکت کا آماجگاہ رہا ہے اُسکی نظیر ملنا نہایت دشوار ہے۔

آج جبکہ ہم کو اُسکے افلاس کا احساس ہے، اُسکی سیاسی اہمیت کے فقدان، تہذیب و تمدن کے زوال، اور تعلیم و معاشرت کی تباہی کا ہم رونا روتے ہیں تو ہم کو بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ان خرابیوں میں بیشتر وہ ہیں جو افلاس کے ہاتھوں پیدا ہوئی ہیں اور اُسکی وجہ سے بڑھتی جاتی ہیں۔ فی الحقیقت کسی قوم کی ترقی اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اول اپنے سب سے زبردست دشمن افلاس کو زیر نہ کریں۔

ہمارے تعلیمی پروگرام میں جو رُکاوٹیں ہیں وہ روپیہ ہی کی کمی کی بدولت ہیں، ہمارے سیاسی مساعی جو ناکام ہیں اُن کا اصل سبب روپے کی ہی کمی ہے، اور اسی طرح ہمارے دوسرے کاموں میں ہر جگہ روپے کا سوال اس صورت میں پیش ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی منصوبہ آگے بڑھنے نہیں پاتا۔ گرمیں عرض کروں گا کہ روپے کی کمی اور دولتمند نہ ہونے کا یہاں سوال نہیں ہے بلکہ مفلسی کا ذکر ہے۔ مقابلتہً یہ لفظ مفلسی معنی رکھتا ہے۔ ہندوستان میں آپ اُس کو مفلس کہتے ہیں جس کی آمدنی دس روپے ماہوار سے کم ہو، اور انگلستان میں وہ شخص مفلس ہے جو سو روپے ماہوار نہ پیدا کر سکے۔

اس طرح یہ ہی نہیں کہ ہماری تعلیمی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی حالت کے بہتر و عمدہ ہونے کے لیے دولت کی کمی سدِ راہ ہے بلکہ کیسر ہم اپنی بھلائی اور بہبود کے لیے کسی قسم کا نظام یا کوئی تدبیر کرنے ہی سے قاصر ہیں۔ اس لیے کہ جب افلاس کی یہ حالت ہو اور آتش شکم مشتعل ہو تو نہ ماہرین سیاست اور نہ مجوزین تعلیم اپنے دماغوں سے کام لے سکتے ہیں اور ہم کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

اسی لیے سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو ہندوستان کے ہر فرزند کے غور و فکر کا مستحق ہے وہ "ہندوستان کا افلاس" ہے۔ ہندوستان کی تنگدستی نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ ہماری اعلیٰ ترقیات و دماغی و ذہنی استعدادات کو پامال کیا ہو بلکہ انفرادی حیثیت سے اور نیز مجموعی حیثیت سے وہ اس قسم کی تباہی کا باعث ہوئی ہے کہ جس کی نظیر دنیا میں بمشکل مل سکتی ہے۔ صحت ہماری دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے، امراض کا روز بروز اضافہ ہوتا ہے، اور مختلف النوع نئے امراض بہت سے پیدا ہوگئے ہیں اور بعض اُس قسم کے امراض جو پہلے شاذ و نادر عارض ہوتے تھے آج عام ہیں اور موت کی رفتار کو دن بدن تیز کرتے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کے باشندوں کی کمزوری سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ خدا نخواستہ وہ بھی اپنی بعض ہمسایہ قوموں کا ساتھ دے کر کہیں دنیا سے فنا نہ ہوجائیں۔ یہ ہی حالت ہماری اخلاقی پستی کی ہے؛ متعدد تمدنی خرابیاں اور اخلاقی امراض پیدا ہوگئے ہیں، اور اُنکا کوئی علاج نہیں جب تک کہ اصل مرض افلاس سے نجات نہ حاصل ہو۔

افلاس اور قحط کا ہندوستان میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، زرعی ملک ہونے کے سبب سے

قحط کے اثرات ہمیشہ شدید ترین محسوس کیے گئے ہیں مگر یہ خیال جو بالعموم ظاہر کیا جاتا ہے کہ انگریزی حکومت سے قبل ہندوستان قحط سے ناآشنا رہا ہے، موجودہ علم الاقتصاد تسلیم نہیں کرتا، بلکہ وہ قحط کو ہندوستان کا قدیمی دشمن قرار دیتا ہے اور اُسکے وجود کا ہر زمانے میں قائل ہے۔ جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے قحط و فاقہ کشی کا سب سے زیادہ اثر غریبوں پر پڑتا تھا اور انھیں لوگوں کو آج پبلک کہا جاتا ہے۔ وہ زمانہ اس قسم کا تھا کہ اس غریب و مفلس مخلوقِ خدا پر کسی نے نظر نہ کی اور اپنی داستاں سرائی کو امرا و اکابرینِ سلطنت اور زیادہ تر بادشاہوں کی ذات تک محدود رکھا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ قحط کے حالات اور اُسکی تباہی کا بیان گذشتہ تحریری شہادتوں میں بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے افلاس کا اولیں سبب اس مُلک کی زرعی حیثیت ہے۔ اصفدا کی شان ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ ہندوستانیوں کو روٹی دیتی ہے وہ ہی سب سے زیادہ اُسکی فاقہ کشی کا بھی باعث ہوئی ہے۔

ہندوستان جیسے وسیع برِّ اعظم کا تین چوتھائی حصہ اپنی شکم پُری کے لیے زمین کی پیداوار کا رہینِ منت ہے اور رزاقِ حقیقی کی رحمتِ عام یعنی بارش پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ اور زیادہ ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کے استعمال کے بجاے ہمارے کاشتکار خدا کی رحمت اور اپنی قسمت ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور پانی کی آس پر اپنی خوشحالی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ جو بیج وہ استعمال کرتے ہیں وہ بھی بہترین نہیں ہوتا۔ اور کھاد کے جمع کرنے کا طریقہ بھی زیادہ منفعت بخش نہیں ہے۔ عمدہ سے عمدہ کھاد اکثر وہی ہوتا ہے جو ہم اُپلا کر خاکستر کر دیتے ہیں اور بجاے اپنی پیداوار کے اضافے کے اُسکی ہستی ہی کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس طرح جو کھاد استعمال کیا جاتا ہے وہ بالعموم بُرا اور کم حیثیت ہوتا ہے اور اسکے علاوہ سب سے بڑا سبب ناواقفیت ہے جو ہماری زراعت کو بڑھنے نہیں دیتا۔

بالعموم جو طریقہ ہمارے کاشتکار استعمال کرتے ہیں وہ وہی ہے جو اُنکے باپ دادا استعمال

کرتے آئے ہیں اور اگر ذرا سی بھی غیر متوقع رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اُسکے دور کرنے کے قطعاً ناقابل ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پانی کی قلت یا زمین کی فطری خرابی ہمارے کاشتکار کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور اُس کا نتیجہ خسرانِ عظیم اور نقصان مستقل۔

خود زمین کے کھیتوں کی تقسیم بھی اس قسم کی ہوتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں جداگانہ کاشت ہونے کے سبب محنت و خرچ زیادہ اور نفع کم ہوتا ہے۔ دیہات میں بہت سے حصے زمین کے بغیر کاشت کے اور بغیر کسی سودمند کام کے پڑے ہوتے ہیں اور اس طرح زرعی فلاح اور کاشتکاروں کی دولتمندی کے صریح منافی ہیں۔

جب ہم ان سب واقعات کا نتیجہ بحیثیت مجموعی نکالنا چاہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی دولت کا سب سے بڑا ذریعہ یعنی زراعت اول تو نہایت بُری حالت میں ہے اور دوسرے یہ کہ غیر متیقن ہے اور جب کبھی قحط یا کمی پیداوار کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے تو اُسکی تلافی نہایت ہی دشوار اور سخت دقت طلب ہوتی ہے۔ بعض حالتوں میں ایسا ہُوا ہے کہ برسوں اس قسم کے نقصانات کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے بعد دوسری سب سے اہم وجہ ہندوستان کے افلاس کی اس بدقسمت مُلک کی وہ سخت کمی ہے جو ہم ہر گوشۂ ملک میں اُسکی صنعت و حرفت کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ دُنیا کے دوسرے ممالک کا اگر جائزہ لیا جائے اور پھر ہندوستان کی موجودہ حالت پر نظر کی جائے تو ہمارے استعجاب و حیرت کی کچھ حد نہیں رہتی، اور کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر ایک ایسا مُلک جس کے ہر حصے میں ہر قسم کے بہترین سامان موجود ہیں (جو بے انتہا فائدے کے ساتھ صنعت و حرفت کے کام میں لگائے جاسکتے ہیں) اور اگر کافی قابلیت اور عمدہ انتظام کے ساتھ ہر قسم کی پیداوار کے لیے صنعتی پیداوار کا انتظام کیا جائے تو دُنیا کا کوئی مُلک ہندوستان کے کسی ایک صنعت کا بھی مقابلہ نہ کر سکے، آج اپنی صنائع کی پستی میں دُنیا بھر سے بڑھا ہوا ہے!

اول تو ہندوستان کو موجودہ زمانے میں کسی طرح اصلی معنوں میں ایک صنعتی مُلک ہی نہیں

کہا جا سکتا اور جو موجودہ صنائع یہاں پائے جاتے ہیں اُنکا بیشتر حصہ خاص خاص دولتمند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور عوام کا اُن کے فوائد و دولت میں نہ کوئی حصہ ہے اور نہ اُس سے وہ عام طور سے واقف، یا اُس کی مدد کے قابل ہیں۔ اس طرح ہندوستان کے افلاس پر اُسکا اثر بہت ہی کم ہے اور کافتہ الناس کی بربادی و فاقہ کشی بدستور قائم و موجود ہے۔

یورپ کے دندانِ آز نے ہندوستان کے قدیم اور زبردست صنائع کو اس طرح کاٹ چھانٹ کر تباہ کر دیا کہ آج اُن میں سے ایک کا پتہ نہیں، نہ ڈھاکے کی ململ اب نظر پڑتی ہے، نہ ریشمی کپڑے اور کمخواب کو کوئی پوچھتا ہے۔ اور باوجودیکہ کشمیر کا کام اب بھی نہایت عمدہ ہوتا ہے مگر ہمارے جسم وہاں کے پشمینے و شال و پارچہ جات سے کچھ ایسے ناآشنا ہیں کہ بہت کم کسی سوسائٹی میں ان چیزوں کے عمدہ نمونے نظر پڑتے ہیں۔

یہ ہی حالت دوسری تمام صنعتوں کی ہے اور جیسا کہ فطرت کا اصول ہے صنعتوں کے ساتھ خود صناعوں کا وجود بھی معرضِ زوال میں آگیا ہے اور اکثر اُن میں سے ناپید ہو گئے ہیں جُلاہے جو اس مُلک میں ایک کرور کے قریب تھے اب مٹتے جاتے ہیں اور اسی طرح دوسرے پیشے والوں کا نام بھی سننے میں نہیں آتا۔

پُرانی صناعیاں تو ختم ہو ہی گئیں اور آج اُن کا نشان بھی نہیں ملتا بلکہ "نقش سجدہ" بھی مٹتا جاتا ہے، لیکن سب سے بڑی مصیبت اور اس ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ نئی صنعتیں اور نئے پیشے پیدا ابھی نہیں ہوتے۔ حالانکہ دوسرے ممالک نے اپنی صنعت و حرفت سے نہ صرف اپنے مُلک کو دولتمند و مرفہ الحال بنا لیا ہے بلکہ دوسرے ممالک کو بھی بغیر توپ و تفنگ و تیغ و سنان کے اپنے زیرنگیں کر لیا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ ذرائع میں گو کسی قسم کی ایسی کمی نہیں ہے جو اُسکی ترقی میں بالخصوص سدّراہ ہو مگر کوئلہ کا بہ افسوسناک نہ ہونا اور نسبتاً لوہے کی کمی جو اکثر حصۂ ملک میں ہے ہندوستان کی صنعت و حرفت کے لیے خاص دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ اور جہاں کہیں کوئلہ موجود ہے

وہاں وہ کافی تعداد میں اور بکثرت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح لوہا بھی موجود ہے۔ مثلاً ممالک متوسط اور بالخصوص صوبۂ بہار میں یہ دونوں چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں مگر چونکہ تمام ہندوستان میں وہ کیساں نہیں ملتیں اس لیے ہمارے ملک کے صنائع برابر نقصان اُٹھا رہے ہیں۔

اسکے بعد سب سے اہم اور قابل ذکر سبب ہندوستان کی مفلسی کا اسکی تجارتی کمی ہو جو صنائع کے فقدان کا بڑی حد تک ایک لازمی نتیجہ ہے۔

کسی مفلس ملک کو تجارت کرنا اور اُس میں وہ مرتبہ حاصل کرنا جو آج ممالک یورپ و ریاستہائے امریکہ کو حاصل ہے یوں ہی کیا کم دشوار ہے لیکن ہندوستان میں دوسری مصیبتیں بھی ہیں جنکی وہ کسی طرح تاب نہیں لا سکتا۔ مثلاً نئے اور مروجہ طریقۂ تجارت سے قطعاً بیگانگی، جو تمام افراد ملک کا ایک لازمی شیوہ ہوگیا ہے، اور اُس تعلیم و تربیت کا فقدان جو ہر مہذب ملک میں اُسکی تجارت کے فروغ کے لیے خاص اور نہایت ضروری چیز ہے۔ جو تجارتیں ہندوستان میں اس وقت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہیں یا جو عمدہ اور بڑے خوشحال کارخانے جاری ہیں وہ سب کے سب غیر ملکی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں اور اس طرح اُن کے فائدے سے ہمارا ملک قدرتاً محروم ہے۔ جو مدارس اس وقت صنعت و حرفت اور اصول تجارت کی تعلیم دیتے ہیں وہ اس درجہ کم اور ادنیٰ حیثیت کے ہیں کہ کسی عظیم الشان ملک کی ضروریات کے لیے کسی طرح مکتفی نہیں اور نہ اُن کی وجہ سے وہ دلچسپی اور عام مذاق پیدا ہو سکا جو اشاعت علوم کے بعد عام طور سے اور ہر حالت میں ہو جایا کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ اور معزز طبقے کے افراد تجارت سے پرہیز کرتے اور دُور بھاگتے ہیں اور ابتک وہ اثر جو صدیوں سے تجارت کو حقیر اور ذلیل نظروں سے دیکھنے کا چلا آتا ہے بالکل رفع نہیں ہُوا ہے۔ جو مال باہر سے آتا ہے اور جو مدد اُن غیر ممالک کو اُنکی اپنی حکومتوں سے تجارت کی برتری اور فروغ کے لیے ملتی ہے وہ ہندوستان میں ناپید ہے اور اس لیے وہ اُس سیلاب عظیم کو جو مقابلے کی شکل میں دن بدن بڑھتا چلا آتا ہے کسی طرح کامیابی کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتا

ہندوستان کی بیرونی تجارت زیادہ تر اُن غیر ملکی اور اکثر متعصب اور غیر ہمدرد جہازرانوں کی نظرِ کرم پر موقوف ہے جو نہ ہندوستان کے باشندوں سے خاص ہمدردی رکھتے ہیں اور نہ کسی طرح اُن کے مانند افلاس و تنگدستی کا شکار بنائے جا سکتے ہیں۔ خود ہندوستان میں نہ کوئی جہازراں کمپنی ہے اور نہ جہازیاں بنتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ہندوستان کے بہبود کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ وہ ان جہازوں سے اُس قسم کی مدد لے سکتے ہیں جسکے بغیر کوئی تجارت فروغ نہیں پا سکتی۔

اسکے علاوہ ہندوستان جیسے مُلک کے لیے آزادیِ تجارت کا موجودہ اصول اور بندرگاہِ بمبئی کے محصولات، جس کا انسداد صرف ہماری گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے، ہندوستان کی کمزور اور انحطاط پذیر تجارت کے لیے ایک اور ضرب شدید ہے جس کے اثرات سے محفوظ رہنا اس بے مایہ ملک کے اختیار میں نہیں۔

ان سب دشواریوں کے باوجود بھی ہندوستان کی تجارت اس سخت حوصلہ شکن اور پست حالت میں نہیں ہو سکتی تھی جیسی کہ آج نظر آتی ہے مگر خود ہندوستانیوں کی غفلت اور بے حمیتی نے اسکی حالت اور بھی شرمناک کر رکھی ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اُس سے رہائی پانے کے لیے وہ طرح طرح کی تدابیر کرتا اور کسی نہ کسی طرح اُس بلا سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر ہماری غفلت نے ہم میں کسی قسم کے حس کی عادت ہی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اگر ہندوستانی سرمایۂ تجارت فراہم کرنے میں وہ کوششیں کرتے جن کا اس سقیم اور ناگفتہ بہ حالت میں کرنا لازمی تھا تو اُنکی تجارت کے لیے کوئی امید ہو سکتی تھی مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اوّل تو بالعموم سرمایہ دار لوگ ہی نہیں، اور جو ہیں وہ بوجہ اپنی ناواقفیت کے اُسکو تجارتی کاموں میں لگانا اور اُس سے فائدہ اُٹھانا بالکل نہیں جانتے، رائج الوقت بنکوں پر اعتبار نہیں کرتے اور جس کسی کے پاس تھوڑا بہت روپیہ ہوتا ہے اُس کو وہ بجائے نفع بخش کاموں میں لگانے کے غیر سود مند اور بعض اوقات مضر کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔ زیوروں کی کثرت اور اُن کا رواج، روپے کو زمین میں دفن کرنے کا دستور آج تک موجود ہیں۔ جو شخص اپنے نزدیک

بڑی دور کی سوچتا ہے تو ہزار خرابی و دشواری کسی قطعہ اراضی یا بڑے حصہ زمین کا مالک بننے کا شوق اُس کے مفید سرمایہ کو تجارت کے سود و بہبود سے روک لیتا ہے اور انجام کار وہ معمولی زمیندار ہو کر مقدمہ بازی و حکام ضلع کی نظروں میں رسوخ و مرتبہ حاصل کرنے کی اُمید میں ہمہ وقت غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور اس طرح اُس شریف و بلند مرتبہ پیشہ یعنی تجارت کو اُسی طرح خراب و خستہ حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

عوام کے اخلاق و عادات کا اثر جو کسی ملک کے فلاح و بہبود پر پڑتا ہے اُس سے اہل نظر غافل نہیں ہیں۔ زمانۂ گزشتہ کے وہ جلیل القدر افراد جنکے ایک گوشۂ چشم نے دنیا کے بڑے بڑے حصوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، ہزاروں مفلسوں اور بے خانماں غریبوں کو مالا مال کر دیا آج اس کرۂ ارض پر نہ باقی ہیں اور نہ زمانہ کی رفتار دیکھتے ہوئے یقین ہوتا ہے کہ اس قسم کی شخصیتیں آیندہ بھی پیدا ہو سکیں گی۔ برخلاف اسکے جمہوریت و عوام کی قوت دن دونی اور رات چوگنی بڑھ رہی ہے اور ہر شخص اپنی جگہ پر یہ تسلیم کرتا ہے کہ کسی ملک کی خوشحالی یا اُسکے افلاس کا ذریعہ یا دفعیہ سب سے بڑھ کر خود اُسی کے افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اگر اُن کے دست و بازو میں قوت اور دماغ میں فہم و فراست ہے تو پھر اُس ملک کی کایا پلٹ محض ایک وقت کا سوال رہ جاتا ہے اور کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملک والے (گویا ہم خود) اپنے عزیز وطن کی اس فلاکت و مصیبت کے کہاں تک ذمہ دار ہیں۔

ہم میں سے ہر شخص جب متذکرۂ بالا وجوہ پر غور کرے گا تو یہ ماننا پڑے گا کہ سب سے بڑی ذمہ داری ہماری ہی ذات پر عائد ہوتی ہے، اسکے بعد مگر اس سے کسی طرح کم نہیں، گورنمنٹ یعنی ہماری حکومت پر ہے جس کے استغنا و بے نیازی کی جبروتی شان نے ہمیشہ ہمارے نالۂ ہائے زار کو 'صدا بصحرا' سمجھا ہے۔

مگر ہمیں سب سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا چاہیے۔ کون نہیں جانتا کہ ہم میں سے ہر شخص (خدا جانے کن اثرات کے ماتحت) اس قسم کی ایک شان استغنا و مناواجب تمانت

کو لیے ہوئے ہے کہ دُنیا کے دوسرے ممالک کی طرح حوصلہ مندی اور وقتی ضروریات کا احساس ہم سے تقریباً مفقود ہو گیا ہے اور اگر کمپنی بنا کر اور مشترکہ امداد سے ہم کوئی کام نہیں کر سکتے تو انفرادی اور شخصی ساعی کو بھی ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے اور ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اپنے ملک کی فلاح و بہبود کا لحاظ رکھ کر اُس قسم کے پیشوں اور اُن مشاغل کی طرف توجہ کرتے ہیں جو ذاتی مفاد کے ساتھ ہی کسی قدر مُلک و وطن کی خوشحالی اور آسایش میں بھی مدد دیں۔ پھر ہمارے مُلک کی سب سے زبردست قوم جو باعتبارِ آبادی سب سے بڑی ہے یعنی غیر مُسلم اقوام (جو عرفِ عام میں ہندو کہلاتی ہے) وہ اس درجہ ذات پات کے جھگڑوں اور فرقہ بندی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے کہ کسی فرقے سے دوسرے فرقے کا کام لینا یا اُسکی توقع کرنا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ خود مسلمان بھی اپنی بدبختی اور غفلت سے اگر ذات اور نسل کے قیود کا بہت لحاظ نہیں کرتے ہیں تو کم ازکم فرقہ بندی میں اس درجہ مبتلا ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے پیشے کا کام کرنا اپنے لیے ننگ و عار سمجھتا ہے۔ اس طرح مشترکہ اغراض اور مُلکی فلاح کو پامال کیا جاتا ہے۔ اور ہندوستان کی ترقی کی اُمیدیں اور اُسکی خوشحالی کی توقعات پاؤں کے نیچے روندی جا رہی ہیں اور مادرِ وطن کے جائے اطمینان سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے۔ (غالبؔ)

تعلیم کی کمی نے اس حالت کو اور بھی بدتر بنا دیا ہے اور مَرے پر سو دُرّے کا صحیح نقشہ ہو گیا ہے۔ اپنی ناواقفیت اور جہالت سے عوام اپنی تکالیف کے اسباب سمجھنے سے قاصر ہیں اور اسکا علاج تو گویا قطعاً اُن کے ذہن ہی میں نہیں۔ صدیوں سے موجودہ حکومت کی مستحکم اور زبردست قیود کے ماتحت اور نیز گزشتہ زمانے میں اپنی عزیز حکومت کے آغوش امن و مسرت میں رہتے رہتے وہ انفرادی اور شخصی کوششوں کا سبق ہی بھول گئے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کس طرح اپنی حالت کی اصلاح ممکن ہے۔

کتنے ہم میں سے ایسے ہیں جو اپنے دل و دماغ سے تجارت و صنعت و حرفت میں

عظیم الشان ترقیاں کرسکتے ہیں مگر بدقسمتی کہ اس طرف توجہ نہیں کرتے اور جس کام کے اہل نہیں ہیں اُس کو اختیار کر لیتے ہیں۔

یہاں تک کسی قدر وضاحت سے اُن اسباب کے شمار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے باعث ہندوستان انتہائی غربت و افلاس میں مبتلا ہے۔ اب اس مصیبت کے رفع کرنے کی جو تدابیر ہو سکتی ہیں اُن کا مختصراً ذکر کیا جائے گا اور یہ کوشش کی جائے گی کہ حتی الوسع وہی ترتیب قائم رہے جسکے مطابق ابتدائی حصہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔

زراعت کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے پہلے اور سب سے مقدم جو چیز ہے وہ بندوبست کا دوامی ہونا ہے۔ موجودہ اصول بندوبست (جو ہمارے صوبے میں رائج ہے) اپنے نقصانات میں سب سے زیادہ مہلک اور تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ صوبۂ مدراس کا طریق بندوبست بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہے، البتہ بنگال کا وہ بابرکت اصولِ بندوبست جس کی بدولت بنگال کی موجودہ ترقی اور سیاسی اہمیت بہت کچھ مبنی ہے ایک ایسا مفید طریقہ ہے جس کے بغیر کسی زمیندار یا کاشتکار کی فلاح و دولتمندی تقریباً ناممکن ہے۔ جہاں بندوبست دوامی ہو وہاں کاشتکاروں کے حقوقِ وراثت بھی نظرثانی کے مستحق ہیں۔ نیز تقاوی کے جو اصول اس وقت تسلیم کیے گئے ہیں اور جس سے بعض حالتوں میں کاشتکار بجائے نفع حاصل کرنے کے بعض حالتوں میں اور بھی مفلس ہو جاتا ہے، ان کو تبدیل کیا جائے۔ اور اس قسم کے قواعد مقرر کیے جائیں کہ تقاوی حقیقی معنوں میں کاشتکار کی مدد اور فائدے کے لیے ہو۔ بارش کا پانی چونکہ غیر یقینی ہے اور اب تو برساتوں کا کوئی ٹھیک وقت ہی نہیں رہا ہے، اس لیے نہروں کا اضافہ کیا جائے۔ اور جا بجا پانی کے حصول میں سہولتیں کی جائیں اور اُس پانی کے محصول میں معقول کمی کر دی جائے تاکہ لوگ خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکیں۔ بیج بھی جو کاشتکار استعمال کرتے ہیں چونکہ اعلیٰ قسم کا نہیں ہوتا اس لیے حکومت خود عمدہ قسم کا بیج مہیا کرنے کی ذمہ داری لے اور اُسکو عام طور پر سستے داموں فروخت کرے۔ "کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیز" یا

مشترکہ سرمائے سے لین دین کرنے والی دوکانیں زیادہ کثرت سے اور زیادہ قابل قبول بنائی جائیں اور اس طرح پر زمینداری کے پیشہ اور زراعت کے فن کو زیادہ تقویت اور ترقی دی جائے۔

صنعت و حرفت و تجارت کو جو مرتبہ کسی ملک یا قوم کے تمول کو عروج دینے میں حاصل ہے اُسکے متعلق ایک لفظ بھی لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک اور موجودہ زمانے کے اصول صلح و امن اور اغراض جنگ و جدال غرض ہر سیاسی و معاشرتی حیثیت شاہد ہے کہ کوئی ملک ترقی کی صورت سے آشنا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو ایک بڑا تجارتی ملک اور کثیر التعداد صنائع کا مالک نہ ثابت کرے۔ اس لیے ہندوستان کی صنعت و حرفت یا تجارت کی ترقی سب سے ضروری چیز ہے۔ ورنہ کوئی شبہہ نہیں کہ اُس کا موجودہ افلاس خدا جانے کب تک اسی طرح ہمارے جسم زار کو اور بھی لاغر و نحیف کرتا رہے گا۔ قحط کے زمانے میں ہندوستان کے مفلس باشندوں پر جو مصیبتیں پڑتی ہیں اُنکے دفع کرنے کی اگر سب سے زیادہ مفید اور با اثر کوئی تدبیر ہے تو وہ ہندوستان کی تجارت و صنعت و حرفت کو ترقی یافتہ اور مستحکم بنانا ہے اس لیے کہ دوسرے حصص ملک کے غلہ یا اپنی پیداوار کی برآمد بند کرنے سے تو سارے ملک کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ ہاں، اگر وہ روپیہ جو تجارت اور صنعت و حرفت سے حاصل ہو ان مصائب کے کم کرنے میں صرف کیا جائے تو البتہ توقع ہے کہ قحط کی مصیبت سے بہت کچھ اور یقینی نجات ہو جائے اور کچھ دشوار نہیں کہ ہندوستان کا وہ دورِ ماضی پھر عود کر آئے جو کسی وقت جبکہ ہمارا ملک جنت نشان تھا اُسکا خاص تمغاے امتیاز رہا ہے۔ بیرونی مال جو ہماری صنعت و تجارت کو ہضم کیے لیتا ہے جلد سے جلد کسی سخت ٹیکس کے ذریعہ سے روکنا چاہیے تاکہ اندرونِ ملک کے صنائع کو اُبھرنے کے لیے موقع ملے۔ سب سے زیادہ بیرونی کپڑوں پر ٹیکس کی ضرورت ہے جو سب سے زیادہ اس ملک کی دولت کھینچتے ہیں۔ تیل بنانے اور شیشے کی چیزوں کے تیار کرنے کا ہندوستان میں بکثرت سامان موجود ہے اور بعض جگہ مثلاً انبالہ میں یہ کام ہو بھی رہا ہے مگر جب تک بیرونی حملوں کے روکنے کا انتظام نہ ہو گھر کی فوجیں امن و عافیت سے اپنے پاؤں پر نہیں کھڑی ہو سکتیں۔

آخر کہاں تک خندقیں بنائی جائیں اور اُنکی پناہ میں اوقات گزاری جائے ؟ ایک موہوم سی امید ہے کہ موجودہ انڈسٹریل کمیشن (ارباب حکومت کے متعینہ محققین حالات صنائع وحرفہ) ملک کی ضروریات پر کچھ لحاظ کرے اور گورنمنٹ سے اُس قسم کی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے جنکی سخت ضرورت ہے۔ اب تک حکومتِ ہند کو جس قدر قرضہ لینے کی ضرورت پڑی ہے اُس نے بیرونِ ملک سے حاصل کیا ہے اگر وہ ہندوستان ہی سے ہندوستان کے لیے قرضہ لیا کرے خواہ شرح سُود کسی قدر زیادہ دینا پڑے تو غالبًا یہاں کے باشندے سرمایہ جمع کرنے کی طرف زیادہ توجہ کریں۔

ان سب خرابیوں میں جہاں تک اہل ملک کا تعلق ہے وہ کچھ کم افسوسناک نہیں ہے اور اسکی سب سے بڑی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ اس لیے سب سے بڑی ضرورت اشاعت تعلیم کی ہے۔ اس سے میرا مقصد وہ تعلیم نہیں ہے جو اعلیٰ جماعتوں یا بڑی درسگاہوں میں نہایت گراں اور ناقابلِ برداشت قیمتوں پر فروخت ہوتی ہے بلکہ فی الحقیقت ملک کو آج سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ابتدائی تعلیم ہے جس سے کوئی شخص ناواقف نہ رہے اور جو کسی شخص کے قابو سے باہر نہ ہو یعنی عام ہو اور جبری ہو۔ بلا استثناء ہر شخص تعلیم حاصل کرے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ جب تعلیم مفت ہو اور ساتھ ہی لازمی بھی ہو۔ جب تک یہ نہ ہوگا نہ کاشتکار اپنی حالت کو سمجھ سکیں گے اور نہ دوکاندار تجارت کے معنی سیکھیں گے۔ لوہار اور بڑھئی اُن ذرائع کے سمجھنے سے قاصر رہیں گے جو اُنکو اپنے پیشے کے لیے لازمی طور پر جاننا چاہییں۔ اور اسی طرح ہر قسم کی ترقی ایک ناقابل انسداد رُکاوٹ کا شکار رہے گی۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ صنعت وحرفت کے مدارس مختلف پیمانے پر اور بکثرت جاری کرے اور تجارت کی اعلیٰ تعلیم کا بھی خاص انتظام کرے۔ ہر سال یونیورسٹی سے ایک معقول تعداد گریجوٹیس کی تجارت میں وظیفہ دیکر بھیجی جائے۔ بڑے بڑے تاجروں سے معاملہ کرنا چاہیے کہ وہ ایسے طلبا کو اپنے کارخانوں میں اپنی مدد سے کام سکھائیں۔

اسکے علاوہ سب سے زیادہ ضرورت ہندوستانیوں کو خود اپنی اصلاح کی ہے۔ مثلاً وہ کفایت شعاری اور بیجا اخراجات کے کم کرنے کی عادت ڈالیں اور اپنی مالی حالت کو انفرادی طور پر درست کرنا سیکھیں۔ جس قسم کے فضول اور لغو اخراجات وہ مختلف رسوم اور تقریبات کے موقعوں پر کرتے ہیں اُن سے پرہیز کریں۔

ہمارے ملک میں سیکڑوں ہزاروں وقف ہیں اور اُنکی آمدنیاں نہایت ہی معقول، مگر جس بیدردی اور بیہودگی سے اُن کا صرف ہوتا ہے اور جس قسم کی بے عنوانیاں متولیانِ اوقاف سے ظہور پذیر ہوا کرتی ہیں اُن سب کا نتیجہ یہ ہے کہ بجاے مفید اور قابل قدر کام کے عموماً اہلِ ملک کے مذاق اور اخلاق پر اور بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ اگر ان بڑی بڑی جائدادوں کی آمدنیاں ہندوستان کی صنعت و حرفت کی ترقی میں صرف کی جائیں اور اس کے منافع سے یتیم خانے کھولے جائیں، محتاجوں کو کھانا ملے۔ تعلیمی مدارس مفت قائم کیے جائیں، اور نادار طلبہ کے وظائف کا انتظام ہو، ساجد اور مندروں میں علم و فقر کی افزائش و برتری کے وسائل مہیا کیے جائیں تو یقیناً وقف کا صحیح اور عمدہ مصرف ہوں گے ؎

اے دل بکوے عشق گزارے نمی کنی   اسباب جمع داری و کارے نمی کنی (حافظ)

ہندوستان کے افلاس کے اسباب پر غور کرتے ہوئے بعض نہایت ہی حقیر اور جزوی باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور سب سے زیادہ اہم اور نمایاں اُمور سے بحث کی گئی ہے جن کے ہوتے ہوئے یقیناً ہندوستان کے موجودہ افلاس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔

آخر میں خداے تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے محتاج بندوں پر رحم فرمائے اور اپنی قدرتِ کاملہ سے ہندوستان کی سب سے سخت مصیبت کو دُور فرمائے۔ ؎

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نور الرحمٰن

حکیم عمر خیّام کے خیالات

جلوہ افروز ہوا رات کو گردوں پہ قمر — اوڑھ لی مادرِ گیتی نے روپہلی چادر
سطحِ غبرا پہ ہوئی ایسی صباحت غالب — ذرّے ذرّے نے چمک کر یہ کہا "ہوں اختر"
پست و بالا کی ہوئی ایک سی حالت پیدا — ایک نیچے تھا فلک ایک فلک تھا اوپر
چاندنی صحنِ چمن میں تھی عجب نور فزا — شک یہ ہوتا تھا کہ نزدیک ہے اب وقت سحر
بول اُٹھتے تھے وہیں طائرِ شیریں گفتار — ہلتے تھے تیز ہوا سے جو کبھی برگِ شجر
بھینی بھینی تھی وہ پھولوں کی مہک صلِّ علیٰ — سامنے اُس کے نہیں رہتی تھی قدرِ عنبر
دیکھکر عالمِ سفلی کی یہ پیاری تصویر — مردمِ دیدہ تھی حیرت میں نہایت ششدر
جوشِ حیرت کا ذرا دیر جو کم ہوتا تھا — دل میں سنجیدہ خیالات کا ہوتا تھا گذر
اتنے میں ایک نظر آئے کہن سال بزرگ — ان کے آنے سے بڑھی اور ضیاے منظر
صاف ہوتا تھا عیاں چہرۂ نورانی سے — "ملکے از چرخ فرود آمدہ در شکلِ بشر"
ان کی آہستہ روی سے تھی متانت پیدا — دیکھتے آتے تھے گلشن کا سماں تھم تھم کر
زیرکی اور ذہانت تھی جبیں سے ظاہر — بود دستار بسر سبز عبائے دربر
بہرِ تعظیم اُٹھا اور کیا میں نے سلام — وہ ہوے مجھ سے مخاطب متبسم ہو کر
میں نے پوچھا یہ ادب سے کہ جنابِ عالی — نام ہے آپ کا کیا اور ہے کس شہر میں گھر
ہنسکے فرمایا کہ ہے نام مرا "دانشمند" — میرے احباب مجھے کہتے ہیں "دانش" اکثر
خرد آباد ہے جو عام میں مشہور دماغ — ہے وہ مالوف وطن اور وہاں میرا گھر
نام نامی سے جو تھی واقفیت پہلے سے — جانتا تھا کہ خردمند ہیں یہ نام آور
پاکے موقع یہ کیا عرض کہ ہیں چند سوال — جنکے حل کرنے کی رہتی ہے مجھے دھن اکثر

ہنس کے فرمایا کرو شوق سے تم مجھ سے سوال	حل کروں گا وہ سمجھ میں مری آئیں گے اگر
میں نے پوچھا کہ ہے کیا شے یہ حیاتِ انساں	بولے اک خواب ہے یہ اور خیالی پیکر
"حاصلِ زیست ہے کیا؟" پھر یہ کیا میں نے سوال	داد پاسخ کہ "وبالیست و در دیست بسر"
نفسِ سرکش ہو مرا رام، جو پوچھی تدبیر	"گوشمالی سے کرو بس میں" یہ بولے ہنسکر
میں نے پوچھا کہ ہیں کیا اہلِ ستم بانیِ جور!	گفت "گرگ اندو شغال اندو سگِ دم دار"
پوچھا دنیا کے یہ ہیں بحث و مباحث کیسے	بولے "بیہودہ ہیں۔ بےسود۔ ہے اِنسے عذر"
میں نے پوچھا کہ ہیں کس فکر میں دُنیا والے	بولے "یہ فکر ہے بس جمع کریں سیم و گہر"
کد خدائی ہے یہ کیا چیز؟ کیا میں نے سوال	بولے "اِک عیش ہے دوروزہ سے نہیں ہے بڑھ کر"
اُس میں کلفت ہے بہت اور ہے عشرت تھوڑی	غور کرتا نہیں انجام پہ ناداں ہے بشر"
میں نے پوچھا کہ ہے کیا دولتِ دُنیا کہیے؟	بولے "ہے زال۔ جواں یہ تمھیں آتی ہے نظر"
میں نے پوچھا ہیں مضامین شرر کے کیسے	"عالیہ ہوتے ہیں اشعار" کہا خوش ہو کر

محمد ارتضا علی شرر (کاکوری)

مُسلم یونیورسٹی کا فیصلہ

گو بظاہر شیر ہوں باطن میں بودے دل کے ہیں	مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں
فوج کو اپنی ہی دینا ہل کے دشمن سے شکست	یہ نتیجے آپ ہی کی فکرِ لاطائل کے ہیں
ناز تھا شوقِ شہادت پر ابھی کل تک جنھیں	دست و بازو آج گویا خود ہی قاتل کے ہیں
ہل چکی سرکارِ استبداد میں جائے امام	حوصلے بیکار اس تجویزِ بے حاصل کے ہیں
پائیں گے البتہ آغا خانِ ثانی کا خطاب	گرچہ انداز اُنکے فہمِ ناقابل کے ہیں
مظہر و انصارِ مظہر نے یہ ثابت کر دیا	ہم میں اب بھی کچھ نمونے ظالم و کاہل کے ہیں

کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا
راہزن ہوں جب کہ ہی جو راہبر منزل کے ہیں

حسرت (موہانی)

ناکام

(گزشتہ سے پیوستہ)

چوتھا جزو

(۱)

"آہ! میرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے؟ میں تو کچھ بھولا بھولا سا ہوں! میرا قلب میرے خیالات، میرا دماغ سب کمزوری دکھا رہے ہیں۔ میرے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں! افسوس! کیا میں یقین کر لوں کہ میں دنیا کے کسی کام کا نہیں رہا! میں نے بہت سی مصیبتیں اٹھائیں لیکن شوریدہ سری کے آگے مجھے ذرا سی بھی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ میری ہمت نہیں ٹوٹی۔ میرا دل مضبوط رہا۔ مگر ــــ مگر، یہ کیوں؟ آخر کیا ہے جو مخلوقات ارضی میں میری جگہ ایک نہ ہل سکنے والے پتھر اور ایک بے اختیار ہستی کے ہم پلہ ہے؟ ــــ آہ! خدا نہ کرے کسی کی کوئی امید منقطع ہو جائے! میں سمجھ گیا! مجھے جب تک شاہدہ کو حاصل کر لینے کی دھندلی سی بھی امید رہی، میں ایسا مخمور رہا کہ دنیا کی تکلیفیں ہیچ ہو گئیں۔ لیکن اب؟ آہ! میں نہیں جانتا تھا کہ محبت انسان کے لیے ایک عظیم الشان کمزوری ہے! ...... شاہدہ کے بغیر میں عملی دنیا ــ بلکہ دنیا کے کسی کام کا نہیں۔ کاش میرے لیے شاہدہ کے حاصل کرنے کی ایک موہوم امید پھر پیدا ہو جاتی، خواہ وہ مجھ کو ملتی یا نہ ملتی۔ جب کبھی شاہدہ کے پیارے پیارے ہاتھ کو میں اپنے تصور میں چوم لیتا تھا میری تمام تکلیفیں، حیرانی، پریشانی، لذت اور راحت سے بدل جاتی تھی۔ لیکن اب جب میں پریشان ہو کر اپنا دل بہلانا چاہوں گا تو کس خیال کو بلا کے دل خوش کروں گا؟ کیا اس خیال کو کہ شاہدہ اب میری نہیں ہو سکتی؟ میں کچھ کھویا سا ہوں؟ کچھ بھول گیا ہوں!؟ اگر میں شاعر ہوتا تو کہتا کہ پہلو سے دل کھو گیا۔ شاید دنیا والے امید ہی کو دل کہتے ہیں۔

"اُف وہ! میری آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر مجھے اور گھبرا رہے ہیں۔ اب میں تعلیم رونا موقوف کیے دیتا ہوں۔ مجھے ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ میں ذرا سوچ لوں کہ شاہدہ کے لیے اس کا موقع باقی ہے کہ ابھی وہ میری ہو سکے! بیشک وہ میری ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ مجھے تو معلوم ہے کہ اُسکو مجھ سے ــــ مَم ــــ محبت ہے! مگر آہ شاہدہ! بیکس شاہدہ۔ آ، اور میری مدد کر تاکہ میں تجھ کو حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ مظلوم لڑکی! کیا تو مجبوری کی حالت میں بھی میری مدد پر آمادہ ہے؟ میری شاہدہ، کیا میں اب بھی تجھ کو 'اپنی' کہہ سکتا ہوں؟ مجھے اس کا موقع ہے؟ ٹھیرو، مَم ــــ میں شاہدہ کا امتحان کرتا ہوں ...."

پیکرِ خیالی سے گفتگو کرنے والے مدہوش کے سامنے دفعتہً نجمہ آتی ہوئی معلوم ہوئی اور مسرت کے تبسم کو چھپاتی ہوئی قریب آئی اور بیباکی سے اپنے بھائی کو چونکا کر ہانپتے ہوئے بولی:

"بھائی جان، اگر شاہدہ آپ ہی کو پسند کرتی ہوں تو کیا کریں؟"

"کیا ــــ کیا؟ نجمہ، شَ ــــ شاہدہ کو واقعی میرے ساتھ نکاح کرنا پسند ہے؟"

"مجھے یہ تو کچھ معلوم نہیں۔ میں نے تو یہ پوچھا کہ 'اگر ایسا ہو تو کیا ہونا چاہیے'؟"

"تو، تو اُسکو مجھی سے شادی کرنا چاہیے ــــ نجمہ یہ بتاؤ کہ اُس نے تم سے کیا کہا تھا؟ سب شروع سے بیان کرو۔"

"مجھ سے وہ کیا کہتیں؟ بھائی جان، میں یہ پوچھتی ہوں کہ اگر وہ آپ سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو کیا کریں، وہ تو بالکل بے بس ہیں۔"

"وہ اپنے بس کی نہ ہوں تو کیا ہوا اُنکی زبان تو اُن کے قابو میں ہے؟ اُن کا دل تو مجبور نہیں؟"

"بس، انھیں چیزوں پر اُن کا قابو ہے۔"

"اور اس کے سوا نکاح میں شاہدہ کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟ بقیہ انتظام میرے سپرد کرو۔ اگر انھیں چیزوں کو وہ صحیح طریقے سے کام میں لائیں تو اُن کے ...

قابو حاصل کرنا یہ میرا کام ہوگا"۔

"بھائی جان، میں اس وقت اتنا گھبرائی ہوئی اور اس قدر خوش ہوں ...."

"نجمہ، میری بہن، کیا اُس نے کچھ ایسا ظاہر کیا تھا؟ اُسی کی خوشی ہے نا؟"

"نجمہ نے مسکرا کر جواب دیا" جی ہاں — نہیں — ہاں یہ بھی بات ہے۔ اور بڑی بات یہ کہ چچی جان کو میں نے توڑ لیا۔ وہ بھی راضی ہیں مگر ..."

"الحمد للہ! ہاں۔ مگر؟"

"مگر وہ یہ کہتی ہیں کہ اسکی صورت کیا ہو سکتی ہے کہ خفیہ طریقہ سے نکاح ہو جائے؟ وہ بھی تو مجبور ہیں۔ ظاہر میں چچا صاحب کی موافق ہیں مگر مجھ سے اُنھوں نے صاف کہہ دیا"۔

"میری نجمہ، دیر نہ کرو اُنھیں بُلا لاؤ"۔

"اس میں راز فاش ہو جائے گا۔ اگر چچا صاحب کو معلوم ہوگیا تو ...."

"کیا یہ ممکن ہے کہ کسی وقت رات کو چچی جان اور شاہدہ اس (قریب والے) کمرے میں چھپا کے چلی آویں؟ میں باقی انتظام کروں گا"۔ نجمہ جلدی سے اپنی چچی سے پوچھنے چلی گئی اور فوراً واپس آگئی۔

"اُنھوں نے کہا ہے کہ آج رات کو ۲ بجے کے بعد انشاء اللہ ضرور ضرور۔ یہ بہت اچھا ہے لیکن آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیے۔ جب یہ راز فاش ہوگا تو اتنی بڑی بدنامی ......"

"بس۔ الحمد للہ! بہت ٹھیک! تم جا کر اُن کو اطمینان دلا دینا۔ دنیا میں آخر انسان بدنامی کو کہاں تک ڈر سکتا ہے؟ خیر۔ ہاں۔ ذرا سب شروع سے تفصیل سے بیان کرو شاہدہ نے تم سے کیا کہا تھا؟"

(۲)

تاریک رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ مستقل اور پائدار خاموشی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ہوا کی قوت خفیف تھی اور ایک عالم بیہوشی گھر والوں پر چھایا ہوا تھا۔ ۲۔ اور ۳ بجے کے

درمیان شاہدہ کی ماں شاہدہ کو آہستہ آہستہ قطعہ مکان کے اُس حصہ میں لے گئیں جہاں نجمہ کی ماں رہا کرتی تھیں۔ ماں بیٹیاں جاگ ہی تھیں اور مسلسل مگر آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔

اتنے میں نجمہ بولی "لیجیے وہ آ گئیں" یہاں سے چاروں عورتیں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اُس کمرے میں پہنچیں جس سے متصل مردانہ کمرہ تھا (جہاں سلیم مع اپنے چند اونگھتے ہوئے دوستوں کے بیٹھا ہوا مسرت اور گھبراہٹ کی درمیانی کیفیت میں بے چین ہو رہا تھا) جاگنے والے ہوشیار ہو گئے۔ سلیم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اُس دروازے میں کھڑے ہو کر جو ان (مردانہ اور زنانہ) کمروں کو ملاتا تھا، گھبراہٹ اور بھرائی ہوئی آواز میں آہستہ سے پوچھنے لگا "سب ٹھیک ہے؟" نجمہ نے آہستہ سے جواب دیا "جی ہاں، اور شاہدہ یہ کھڑی ہیں۔"

شاہدہ کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ وحشت سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جسم تھرا رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی اور بیتاب ہو کر سسکیاں لینے لگی۔ روشنی قریب لائی گئی اور سلیم کے دوست دیوار کی آڑ میں ہمہ تن گوش کھڑے ہوئے تھے۔ سلیم نے کہنا شروع کیا۔

"شاہدہ! اپنے خالق کے منشا کے مطابق اور اُسکے رسولؐ کے ایما کے مطابق تمہارا نکاح میں اپنے ساتھ، بوعدۂ ادائی مہر...... روپیہ نقد، اپنے ساتھ کرتا ہوں۔ تم اسکو اپنے سچے دل سے قبول کرتی ہو؟"

"جی ہاں، میں نے قبول کیا"۔ اب شاہدہ کا دل کشمکش وحشت و مسرت میں گرفتار تھا۔ اسکی حالت دنیا کا کوئی مقرر یا محرر بیان نہیں کر سکتا۔ وہ اس شدت سے رو رہی تھی کہ بمشکل بقیہ دوبار (رسم ایجاب قبول کے مطابق) اپنی زبان سے اقرار کر سکی۔ گواہ موجود تھے۔ نکاح مذہبًا درست ہوا۔ اس دلچسپ چھوٹی سی رسم کو اس موقع پر گو بہت سادگی سے ادا کیا گیا تھا لیکن اسکی شان و شوکت اُسکے دل سے کوئی پوچھے جو اپنا دوستانہ پُر جذبات دل لیے ہوئے وہاں موجود تھا۔ سلیم خوشی کے مارے اچھل پڑا اور انتہائے مسرت اُسکی آنکھوں میں نمودار ہوئے۔ اسکے بعد حاضرین اپنی اپنی جگہ اطمینان سے پہنچ گئے۔

(۳)

نجمہ بیگم جس لڑکے سے شاہدہ کا عقد کرنا چاہتی ہیں اُس کا نام فضل ہے۔ اسکے متعلق پیر صاحب خود اپنی زبان سے تعریفی کلمات ادا کر چکے ہیں لیکن چند خاص باتیں بیان کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں: فضل، گروہِ خدام میں سب سے زیادہ عزیز اور قابلِ عزت سمجھا جاتا ہے۔ اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ پیر صاحب کی نظرِ عنایت کے ساتھ ہزاروں مریدین اُسکی طرف (موجودہ زمانہ کی رسم کے مطابق) صوفیوں کی طرح میلان ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس طرح کے ربط ضبط سے جو کچھ اثر کسی کے .... پر پڑ سکتا ہے، اُسکو غالباً ہر شخص آسانی سے سمجھ لیگا۔

"تصوف" اور "حضرات صوفیہ کرام کی تقلید" کے جو معنی، فی زماننا، ہندوستان میں سمجھ لیے گئے ہیں اُن کے لحاظ سے تصوف کے اعلیٰ منازل طے کرنے کے لیے جس زینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، اُس (زینہ) کے ظاہری خصوصیات اس لڑکے میں پوری طرح پائے جاتے ہیں۔ خوش اعتقاد آنکھوں کو پیر صاحب کا یہ التفات لڑکے کی بہبودی کا باعث نظر آتا ہے مگر سلیم نے ایک مرتبہ اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا: "اگر اسی طرح پیر صاحب کی نگاہِ لطف اس لڑکے پر رہی اور یہ لڑکا پیر صاحب کے منازلِ تصوف طے کرانے کا آلہ بنا رہا تو پیر صاحب تو تصوف کی سب سے بڑی ڈگری حاصل کر ہی لیں گے لیکن فضل فنا فی الشیطان ہی ہو جائے گا"۔ جس صحبت کا فضل کی خصوصیات والا شخص بیٹھنے والا ہو اُس صحبت کی اخلاقی حالت کے متعلق ہم کچھ نہ کہیں گے اور ایسے لڑکوں کے اندھے والدین کو کیا کہا جائے جن کی آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور ہر اچھائی برائی اُنکو صرف اچھائی ہی نظر آتی ہے۔

نجمہ نے اپنی بچی کو موافق بنا لیا۔ لیکن اس موافق بنانے میں ہم نجمہ کی کوئی کامیابی نہیں سمجھتے کیونکہ فضل سے شاہدہ کی ماں کو نفرت تھی اور اس قدر نفرت تھی کہ انھوں نے اتنا بڑا خطرہ برداشت کر لینا اپنے شوہر کی خواہش پوری کرنے سے افضل جانا۔

صحبت کیسی ہے؟ [illegible] دے سکتا ہے جو مردوں اس صحبت کو دیکھ چکا ہو۔ ہم کسی

مسلمان کو اس کا مشورہ نہ دیں۔ کہ کوئی اس گروہ سے ملوث ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پختہ خیال سے پختہ خیال جو اس صحبت میں بیٹھے ہیں اُنکو بھی اپنے خیالات پر قائم رہنا دشوار ہو گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کسی دوسرے مضمون میں دیا جائے گا۔

سلیم، آج، فضل کے مقررہ عقد کے دن فضل کے مکان پر پہنچا۔ فضل خلافِ معمول اپنے مکان پر موجود تھا۔ سلیم کے پہنچنے پر بلا وعلیکم السّلام کے اُٹھ کھڑا ہوا اور غصہ سے مجنون ہو کر چلّانے لگا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تم کو کس نے یہاں آنے دیا؟ خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ میں تمھارے ایسے کافروں اور ملعون کتّوں سے بات کرنا نہیں چاہتا۔"

"بھائی صاحب، میں ایک ضروری امر سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ ....."

"میں کہہ چکا۔ یہاں سے نکل جاؤ۔ مردود، نکل جا یہاں سے ...."

"اگر آپ سننا نہیں چاہتے تو اپنے کان بند کر لیجیے۔ مجھے جو کہنا ہے وہ ضرور کہوں گا۔ آپ کو معلوم ہو کہ شاہدہ کا عقد ہو گیا۔"

"کب؟ کس کے ساتھ؟ کیسے؟ تو جھوٹا ہے، مکار ہے، شیطان ہے مجھے دھوکا دینا چاہتا ہے، کمبخت .... جاتا ہے یہاں سے یا کچھ لیگا؟ کوئی ہے؟ نکال دو اسکو۔ جھوٹا دغاباز!"

سلیم، جو پہلے ہی سے ایسے لوگوں کی دماغ کی خرابی کا قائل تھا اس نازیبا سب و لہجے کو سن کر چلا آیا۔

....

رات کو قاضی صاحب کے ساتھ سیٹھ میاں بھی موجود تھے۔ جب قاضی صاحب نکاح قبول کرانے کے لیے زنانے مکان میں گئے۔ گوشہ عروسی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ پردے کے دوسری جانب سے قاضی صاحب نے فرمایا: میں نے کر دیا نکاح تمھارا ساتھ فضل ابن مولانا اکرم اللہ کے، بعوض ایک لاکھ روپے کے۔ کیا تم نے قبول کیا؟ شاہدہ کا جسم ہشت ایہ

بے بسی کی حالت میں کانپ رہا تھا۔ نجمہ جو عنقریب فاش ہونے والے راز اور نتیجے کو جانتی تھی خوف سے کانپ رہی تھی اور "یا اللہ مدد کر" کا وظیفہ کر رہی تھی، شاہدہ کو دبائے ہوئے بیٹھی تھی۔ شاہدہ نے ایک مستحکم سکوت قائم کیا تھا اور اُسکی قلبی کیفیت نے اُسکو اسوقت بالکل بجیس بنا رکھا تھا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو قاضی صاحب بہت برہم ہوے۔ پیر صاحب نے ہزار ہزار کوشش کی، عورتوں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ شاہدہ اپنی خاموشی توڑے۔ لیکن ہر شخص اس کوشش میں ناکام رہا۔ اس مختصر اور محدود جگہ میں، جہاں سیکڑوں سانس لینے والا ایک پر ایک گر رہی تھیں، گرمی اور حبس سے شاہدہ کے حواس جاتے رہے تھے۔ کچھ نزاکت جنسی کے باعث اور کچھ اس کشمکش سے متاثر ہو کر شاہدہ اپنی دہشت کی تکلیف کو ناقابل برداشت پاکر بیہوش ہوگئی۔ لیکن مجمع میں بجز زیادتی کے اور کوئی تغیر نہ ہوا۔ اب ہر ایک کی حالت انتشار اپنی پوری حد تک پہنچ گئی تھی اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہیئے

تھوڑی دیر کے بعد شاہدہ کو ہوش آیا۔ اور اُس پر پھر جبر ہونے لگا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق جواب دے۔ لیکن اُسکی نہ ٹوٹ سکنے والی خاموشی نے سارے گھر پر ایک عجیب عالم طاری کر دیا۔ پیر صاحب نے انتہائے طیش میں زور سے کہا کہ "تمہارا نکاح نفضل ابن کرم اللہ کے ساتھ بمہر ایک لاکھ روپئے کے کیا جاتا ہے تم کو منظور ہے؟" لیکن اسکا جواب پھر نہ تھا۔ اب شاہدہ میں تاب ضبط نہ تھی اور قریب تھا کہ وہ رو دے (جو عموماً علامت قبول لڑکیوں کے لیے قرار دی جاتی ہے) کہ دفعتاً گھر بھر میں ایک ہنگامہ مچگیا۔ اور دیکھا گیا کہ سلیم دفعتاً مکان میں ایک ایسی فاتحانہ آن کے ساتھ گھس آیا ہے کہ باوجود اُسکے کثیر التعداد مخالفین کے جمع ہونے کے کسی شخص کو اتنی ہمت نہ تھی کہ اُس سے کسی قسم کا سوال یا مطالبہ کرے۔ وہ بڑھا ہوا بے خوف و خطر اور لاپروائی کے ساتھ گوشۂ عروسی کی طرف جا رہا ہے۔ عورتیں مختلف راستوں سے کوٹھوں پر بھاگ رہی ہیں اور مردوں پر حیرت اور پریشانی طاری ہے۔ دفعتاً وہ پیر صاحب سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے:-

"چچا صاحب، میں آپ کو معذور سمجھ کر اطلاع دیتا ہوں کہ چونکہ ہر مسلمان مرد و عورت کو یکساں اسلام نے اپنے ہر فعل کا ذمہ دار بنانے کے ساتھ اپنی مرضی پر چلنے کی آزادی دی ہے اس بنا پر شاہدہ مجھ سے عقد کر چکی ہے۔ میں اس وقت اُسکو قانوناً اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ معاف کیجیے گا۔"

پیر صاحب کے غصے کے ساتھ ہی مجمع میں اشتعال پھیل گیا۔ رہی سہی عورتیں بھی فرار ہوگئیں اور مردوں نے ہر طرف سے مانے ہوے کافر پر جہاد کی نیت سے بڑھنا چاہا۔ سلیم جو اس خطرے سے آگاہ تھا بہت عرصہ پہلے اپنے بچاو کی فکر کر چکا تھا۔ عین موقع پر سلیم نے ایک سیٹی بجائی۔ اور فوراً سارا مکان پولیس کے جوانوں سے بھر گیا (جو سلیم کے ایک دوست پولیس انسپکٹر کے ہمراہ دیر سے آواز کے سننے کے منتظر باہر کھڑے ہوے تھے) یہ ممکن تھا کہ پیر صاحب کا سارا گروہ اپنے پیر کی مدد کو ایک آن میں جمع ہو جاتا۔ لیکن پیر صاحب کا غصہ دہشت اور خوف سے بدل گیا۔ اور چونکہ پولیس کا نام پیر صاحب کے حواس منتشر کر دینے کے لیے کافی تھا اس لیے کچھ نہ ہو سکا اور سلیم خیریت سے اپنی ماں، بہن، اور محبوبہ کو ساتھ لیکر ایک دوسرے مکان میں لے گیا۔

. . . .

شاہدہ کی قلبی کیفیت ناگفتہ بہ ہے اور اُس کو برابر غشی کے دورے ہوتے ہیں۔

(۴)

صبح کو لکھنؤ سے ایک ڈاکٹر بُلا آئے۔ عرصے تک علاج ہونے کے بعد جب شاہدہ کو فائدہ محسوس ہوا اور حالت قابل اطمینان معلوم ہوئی تو سلیم اپنے چند ہوا خواہ عزیزوں پر گھر چھوڑ کر کسی دوسرے طبیب کو بُلانے کی ضرورت سے دہلی گیا۔ سلیم کی غیر حاضری میں خدا جانے کیونکر شاہدہ کی ماں اپنی لڑکی کو دیکھنے آئیں اور ایک دن سلیم کی والدہ سے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں: "بہن اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میرا ایک کہنا مان لو۔ مجھ پہ بڑا احسان ہوگا۔"

سلیم کی ماں اس قدر محسن کش اور سخت دل نہ تھیں کہ شاہدہ کی ماں کی بات رد کر دیتیں۔

انھوں نے شرمندگی کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کہو، بہن، جو تم کہوگی وہ ہوگا"۔

شاہدہ کی ماں نے بیان کیا کہ "یہاں ایک شاہ صاحب آئے ہوے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ شاہدہ کو آسیب نے ستایا ہی۔ میرا دل چاہتا ہی کہ شاہ صاحب شاہدہ کو دیکھ لیں۔ شاید وہ کوئی تعویذ دیدیں اور اُس سے فائدہ ہو جائے"۔

سلیم کی والدہ کو یہ کوئی معقول بات نہ معلوم ہوئی اور گو اُنھوں نے اسکو ایک لایعنی فعل کہا تاہم اس میں کوئی مضرت نہ تھی اس لیے منظور کر لیا کہ ماں کی تسکین ہو جائے۔ شاہ صاحب آئے اور بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور اپنی کامیابیوں کے قصے بیان کرتے رہے شاہدہ کی ماں نے کچھ روپیہ اُنکی نذر کرنا چاہا لیکن اُنھوں نے یہ کہکر انکار کردیا کہ "مائی، فقیر کو پیر نے روپیہ پیسہ ایسے کام کے لیے لینے کا حکم نہیں دیا ہے، میں یہ نہیں لوں گا۔ جب یہ لڑکی اچھی ہو جائے تو شاہ کلن فقیر کی نیاز کر دینا"۔ شاہدہ کی ماں کا اعتقاد شاہ صاحب سے کئی ڈگری بڑھ گیا اور جب دیکھا کہ شاہ صاحب بالکل بے غرض شخص ہیں تو اُنکی اور زیادہ خاطر تواضع ہونے لگی۔ شاہ صاحب نے اپنے تھیلے سے ایک کٹورہ نکالا جس میں بہت سے نقش و تعویذ لکھے ہوے تھے پھر تھوڑا سا پانی اُس میں ڈال کر دیر تک ہلایا کیے۔ اور یہ پانی شیشی میں بھر دیا کہ جب غشی کا دورہ ہو اُس وقت پلا دیا جائے۔ پانی دینے کے بعد شاہ صاحب فوراً رخصت ہو گئے۔ اور دو گھنٹے کے اندر وہ کھنوال کے اسٹیشن پہنچ گئے کہ سب سے قریب ریل کے وقت سے کہیں چلتے ہو جائیں۔

سلیم اُسی دن مکان واپس آرہا تھا۔ ایک حکیم صاحب بھی ساتھ تھے۔ اسٹیشن پر سواری موجود تھی دونوں بہت جلد مکان پہنچ گئے۔ اس وقت شاہدہ کو غشی کا دورہ ہو رہا تھا۔ اعضا میں تشنج اور جبڑا بند تھا۔ حکیم صاحب نے فوراً نبض دیکھنا چاہی، لیکن تشنج کی وجہ سے ہاتھ ساکن نہ رہ سکا (شاہ صاحب کا دیا ہوا پانی پلایا جا چکا تھا)

تھوڑی دیر بعد یہ کیفیت زائل ہو گئی۔ حسب معمول چاہیے تھا کہ طبیعت دورے کے بعد کسی قدر چاق ہو جاتی لیکن اضمحلال بڑھتا گیا اور چہرہ زرد پڑنے لگا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ہی

ٹھنڈی سانس بھر کے ہمدردی سے کہا: "خدا شفا دے۔ حضرت، مریضہ کے جسم میں مجکو سمیت کا اثر معلوم ہوتا ہے، ذرا ان کے چہرے کی کیفیت دیکھ کر مجھے حال بتائیے۔"

حکیم صاحب کی تشخیص بہت جلد صحیح معلوم ہوئی۔ آہ! زہر کا اثر تمام جسم پر نمایاں تھا۔ اور نبضیں ڈوب رہی تھیں۔ لیکن ہر ایک متحیر تھا کہ آخر زہر جسم میں کیونکر پہنچ گیا؟ نجمہ نے بہت جلد سارا راز فاش کر دیا۔ اور سلیم کو معلوم ہو گیا کہ یہ شاہ صاحب کا پانی تھا جس نے شاہدہ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

سلیم نے ایک چیخ ماری اور عورتوں کی طرح بیقرار ہو کر اور اپنی شاہدہ کے نیم مردہ جسم سے چمٹ کر اس کے زرد گالوں کو محبت سے چوما اور رونے لگا: "آہ شاہدہ! میری شاہدہ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

شاہدہ نے ایک مرتبہ اپنی آنکھ کھولی۔ افسوس وہ کچھ کہنا چاہتی تھی! مگر نہ کہہ سکی۔ باپ کو اس حالت کی خبر تھی اور وہ تمام رنجشوں کو بھول کر اپنی جلد مرجانے والی لڑکی کے سرہانے بھی کھڑے تھے۔ لیکن کشتۂ ضعیف الاعتقادی، شاہدہ کی بے بسی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ حسرت بھری نگاہیں ادھر ادھر ڈال کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار اس نے اپنی ماں کی طرف نگاہ ڈال کر وہ جادو کر دیا کہ ماں مضطرب ہو گئی۔ سلیم رونا بھول گیا تھا اور اس نے نوجوانی میں مرنے والی شاہدہ کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ شاہدہ نے آخری بار اپنی آنکھ کھول کر بد نصیب سلیم کو دیکھا۔ ایک منٹ تک دونوں کی نگاہِ شوق لڑتی رہی۔ سلیم اپنے غم میں اور شاہدہ سکراتِ موت کے عالم میں ایک دوسرے کو ٹک ٹک کر خدا جانے کن جذبات کے ساتھ اپنی تمام زندگی کی حسرتیں نکال رہے تھے۔ پھر شاہدہ نے نئے مکان کے در و دیوار پر ایک پُر حسرت نظر ڈالی اور اپنے اعزہ کو دیکھا۔ آہ! اس نگاہ کو دیکھنے والوں کے آگے غور طلب کہا جائے یا کچھ دن اور سیرِ دنیا دیکھنے کا تمنی؟ یہ سین ختم ہوا اور شاہدہ ہمیشہ کے لیے سلیم کے آغوش سے چھین لی گئی! شرمندہ والدین کے دلوں پر بجلی گر پڑی۔ کیونکہ شاہدہ ایک آہستہ آواز اللہ اکبر کے ساتھ مر چکی تھی!

آہ! آج باغِ ہستی کا وہ پھول، جو وقت تمنائے حبیب ہونے کے لیے پھولا تھا، اُس ظالم دیوتا کی بھینٹ چڑھ گیا جو ضعیف الاعتقاد لوگوں کے کمزور دلوں پر حکومت کرتا ہے!

....

شاہ صاحب بہت جلد گرفتار ہو گئے۔ اُنکی تلاشی لی گئی تو اُنکے پاس بعض قسم کے زہر، کچھ روپیہ اور نوٹ اور ایک خط نکلا۔ جس سے پتہ چلا کہ فضل نے شاہ صاحب کو اس بزدلانہ جرم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اور سلیم کو بھی قتل کرڈالنے کی ترغیب دی تھی۔ خط پر فضل کے دستخط موجود تھے۔ اس لیے وہ بھی شاہ صاحب کے ساتھ عدالت سے سزا پانے کا مستحق ہو گیا۔

سلیم جو دیوانہ ہو گیا تھا، اور جس کو اپنی آنکھوں کا اعتبار نہ تھا، مکان کے ہر گوشے میں شاہدہ کو ڈھونڈھتا پھرتا تھا اور بازاروں گلیوں میں ایک بے ضرر پاگل کی طرح چلاتا تھا۔ "آہ! شاہدہ! مظلوم شاہدہ! تجھپر سب ظلم کرتے ہیں! آہ تو اپنے بالوں کو اپنے خوبصورت چہرے پر پریشان نہ کر۔ آہ! بیدردی سے میرے دل کو نہ دُکھا۔ چلی آ۔ شاہدہ چلی آ۔ افسوس! تو اتنی بیوفا تو کبھی نہ تھی!"

بیچارہ سلیم، خدا جانے زندہ ہے یا مرگیا۔ خوش اعتقاد سمجھتے ہیں کہ اُسکو اُسکے کردار کی سزا مل گئی جیسا اُس نے کیا تھا، اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ بزرگوں نے اُسکو سزا دے دی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے بزرگ بعد موت کے خدا کی زندہ مخلوق پر ظلم کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہوں، اور خدا کے ارادوں اور مصلحتوں پر اُنکی بزرگانہ قوت غالب آجاتی ہو۔ لیکن کسی صحیح الدماغ شخص کا تو یہ عقیدہ ہو نہیں سکتا۔

ناکام سلیم جو دنیا بھر کے دلوں سے ضعیف الاعتقادی نہیں دُور کر سکتا تھا، ایک شوریدہ سر دیوانہ ہوگا اگر مرگیا ہوگا تو عالمِ ارواح میں جاتے ہی اُسکی عظمت وعزت نے اُس محفل میں ایک ہنگامہ برپا کردیا ہوگا۔ اُسکی محبوبہ اُسکے ساتھ ہوگی اور دونوں کی فریادیں عرش کو ہلائے دیتی ہونگی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مظلوم کی فریاد اُن لوگوں پر ضرور قہر ڈھائےگی جنھوں نے اُس پر ہمیشہ لعنت کی۔ دیکھ لیا آپ نے اس شعبدے کو؟ اب اگر آپ اپنے آنسوؤں کو مقدس بنانا چاہیں تو اپنی مدد آپ کریں!

اثر۔ لکھنوی

انجمن ترقی اُردو کا نظام

(۲)

گذشتہ مضمون میں وعدہ کیا گیا تھا کہ مجوزہ اصلاحات کا خاکہ آئندہ مہینے میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ چنانچہ آج ہم اُس کا ایفا کرتے ہیں۔

۱۔ کانفرنس سے علحدگی یہ تو ہم لکھ ہی چکے ہیں کہ انجمن کے لیے ایک جداگانہ ہستی کی ضرورت ہے یہاں اسکے متعلق مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ اُردو کانفرنس میں جو کمیٹی انجمن کی توسیع کے لیے بنائی گئی تھی اور جسکے سکرٹری ہمارے دوست پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی مقرر ہوے تھے اگر اس کمیٹی کی طرف سے اور نیز انجمن ترقی اُردو کے ارکان شوریٰ کی جانب سے یکدلی وہم آہنگی کے ساتھ کانفرنس سے علحدگی کی تحریک کی جائے تو حصول مدعا میں دشواری نہ ہوگی۔ اور اس پر جلد سے جلد عملدرآمد کرنے کا انتظام کرنا چاہیے۔ خصوصاً جبکہ کانفرنس کے روح رواں جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کو ہماری اس تجویز سے اتفاق ہے۔

۲۔ مرکز کا تعین یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ انجمن کے لیے کسی مستقل مرکز کی ضرورت ہے جس سے کوئی سمجھدار آدمی اختلاف نہیں کر سکتا، تعین مرکز کی منزل سامنے آجاتی ہے جو نسبتاً دشوار ہے۔ کیونکہ مختلف شہروں کے حقوق و دعاوی مرکزیت سے عہدہ برا ہونا کوئی آسان بات نہیں۔

ہم اس بحث کو ابھی چھیڑنا قبل از وقت سمجھتے ہیں۔ تاہم اس موقع پر اُن خصوصیات کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو انجمن ترقی اُردو کے مرکز کے واسطے ہمارے خیال میں لازمی ہیں۔

(۱) ایسا مقام ہو جہاں انجمن کے ہمدردوں اور معاونوں کی معقول تعداد موجود ہو۔ خصوصاً ایسے اصحاب کافی تعداد میں ہوں جو انجمن کی انتظامی جماعت کے رُکن بنائے جا سکیں۔

(۲) ایسی جگہ ہو جہاں ایسے ارباب علم کی ایک جماعت بہ آسانی مہیا ہو سکتی ہو جو انجمن کے ارکان شوریٰ بنائے جا سکیں۔

(۳) ایسی بستی ہو جہاں طباعت اور اشاعت کتب کی تمام آسانیاں حاصل ہوں۔

(۴) ایسا شہر ہو جہاں انجمن کے اہل قلم معاونین کے لیے قدیم و جدید کتابوں کا معقول ذخیرہ مہیا ہو سکے یعنی متعدد عمدہ کتب خانے موجود ہوں۔

(۵) ایسے موقع پر ہو جہاں انجمن کے کتب خانے۔ مطبع۔ دارالاشاعت اور منتظمین کی اقامت کے واسطے بہ آسانی و ارزانی زمین و عمارت کا انتظام ہو سکے۔

منجملہ اُن مقامات کے جنکا ذکر گذشتہ پرچے میں کیا گیا ہے، علی گڈھ اور لکھنؤ غالباً اِن اغراض کو بہ احسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں، خصوصاً لکھنؤ، کہ یہاں متعدد اعلیٰ درجے کے کتب خانے، بڑے بڑے مطابع اور تھوک فروش تاجرانِ کتب، وسیع اور کشادہ زمینیں اور مکانات سب موجود ہیں اور انجمن کی ہر قسم کی کارکن جماعتوں کے واسطے معقول تعداد میں اراکین مل سکتے ہیں۔

۳- اغراض و مقاصد

مقاصدِ انجمن کی وسعت بھی اس معنی کرکے قابلِ اعتراض ہے کہ جو کام ہم انجام نہیں دے سکتے اُس کو اپنے ذمے لینے کی ضرورت ہے نہ استحقاق۔ بلکہ حقیقتاً اس طریقے پر ہم فائدہ پہنچانے کے بجائے اُس مقصد کو نقصان پہنچا دیں گے۔ کیونکہ ہم تو معذور الخدمت ٹھیرے اور دوسرے بسا اوقات اس وجہ سے کوئی کام کرنے کی جرأت نہ کریں گے کہ ایک دوسری انجمن اسی مقصد کے لیے قائم ہے۔ انجمن ترقی اُردو صرف کتابوں کے تیار اور شایع کرانے کا اہتمام کر سکتی ہے اس سے زائد کی نہ اُس سے توقع ہے اور نہ اُس میں قابلیت۔ لہٰذا ہندوستان کے مختلف حصص میں زبان اُردو کے رواج دینے اور زبان اُردو کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری دوسروں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ترویج زبان کا مسئلہ ہر چند کہ بہت اہم اور جملہ بہی خواہان اُردو کی توجہ کے قابل ہے۔ مگر اس کا تعلق علمی کوششوں سے کمتر اور سیاسی جد و جہد سے زیادہ تر ہے۔ اور انجمن ترقی اُردو اس وقت تو بسبب ایک خالص تعلیمی مجلس کی ماتحتی کے سیاسی جد و جہد کی قابلیت

نہیں رکھتی اور آیندہ چل کر جب ہندوستان کی مختلف قوموں کے نمایندے خصوصاً ہمارے ہندو بھائی اس مجلس میں شریک ہو جائیں گے تو اُس وقت اس قسم کی کسی تحریک کو انجمن ترقی اُردو کے زیر اثر قائم رکھنا اور بھی دشوار ہوگا۔ اس کام کو سرِدست کسی دوسری مجلس کے واسطے چھوڑ دینا چاہیے جسے ضرورتِ زمانہ خود پیدا کر لے گی۔

اصلاح زبان کا کام بھی نہایت کٹھن ہے۔ اور جب تک پُرانی وضع کے شاعروں اور ٹھیٹ اُردو والے لوگوں کی امداد نہ حاصل ہو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ رفتار زمانہ بتا رہی ہے کہ جدید و قدیم گروہ کا کسی مقصد میں متحد ہونا یا کسی ایک مدعا کے واسطے باہم مل کر کام کرنا فی الحال اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لہٰذا اس کام کے اہل زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اصلاحِ سخن کی مجالس کے زینت بخش ہیں اور ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ اُن کے حدودِ مملکت میں دخیل ہوں۔

۴۔ صلائے عام۔ ان اصلاحات کے بعد مقدم امر یہ ہونا چاہیے کہ انجمن کی طرف سے اُن تمام ہی خواہان ملک کو بلا لحاظِ قومیت و مذہب سکونت صلائے عام دی جائے جو اُردو کی ترقی میں کسی قسم کی اعانت کر سکتے ہوں۔ یہی نہیں کہ ملک کے اخبارات و رسائل کے ذریعے سے اس خبر کو اچھی طرح شایع کیا جائے کہ انجمن ترقی اُردو، اب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دامنِ دولت سے آزاد ہو گئی ہے بلکہ متعدد پمفلٹوں اور مسلسل لکچروں کے ذریعے سے اس بات کے ذہن نشین کرنے کی خاص کوشش کرنا چاہیے کہ اُردو زبان کی ترقی ہندوستان کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے از حد ضروری ہے۔ اور انجمن ترقی اُردو سے بہتر اس خدمت کو کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا عام طور پر تمام اہل ملک کو اسکی امداد کرنا چاہیے۔ افسوس یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اپنی مصروفیتوں کے باعث اور نیز اس سبب سے کہ اُنکا ہاتھ بٹانے والے بہت کم ہیں اب تک ایسی کوئی عام کوشش نہیں کر سکے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں کسی تحریک کی عام اشاعت کے لیے اس سے بہتر تدبیر نہیں ہو سکتی کہ چھوٹے چھوٹے رسائل تعداد کثیر چھاپ کر تقسیم کیے جائیں اور لکچروں کے ذریعے سے عام دعوت دی جائے۔ ملک کی دیگر کامیاب تحریکوں کی تاریخ پر نظر کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی کامیابی کا راز

بہت کچھ اسی میں مضمر ہے۔ اس کام کے لیے سرمایہ اور کام کرنے والوں کی ضرور ضرورت ہے لیکن اگر طریقے سے کام کیا جائے تو تجربہ بتائے گا کہ سرمایہ اور کام کرنے والوں کی فراہمی کا بھی بہترین ذریعہ یہی عمل ہوتا ہے۔

ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ انجمن کی طرف سے اصحاب ذیل کی خدمت میں فوراً تحریک کی جائے کہ وہ ایک ایک رسالہ عام فہم اور موثر پیرایہ میں اس موضوع پر تحریر فرمائیں کہ اُردو زبان کی ترقی کیوں ضروری ہے، اور یہ کہ اُس کی ترقی کن کن طریقوں پر ملکی فلاح و بہبود میں معاون ہو سکتی ہے:—

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ مولوی عبدالحلیم شرر۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔
مولوی عبداللہ عمادی۔ سید محفوظ علی۔

ان رسائل کو یکے بعد دیگرے تمام ملک میں شایع کرکے امداد و اعانت کی عام درخواست کی جائے۔ اور اسی دَوران میں کم سے کم دو تین صاحب اس خدمت کو انجام دینے کے لیے منتخب ہوں کہ وہ مختلف مرکزوں میں جاکر ترقیِ اُردو کی تحریک کے متعلق لکچروں کے ذریعہ سے اہل ملک کو دعوت دیں۔ اس کام کے لیے حسب ذیل اصحاب نہایت موزوں نظر آتے ہیں:—

مولوی عبدالحق صاحب۔ قاضی تلمذ حسین صاحب۔ مولوی سید سلیمان ندوی۔

اصحابِ بالا میں سے قاضی تلمذ حسین صاحب غالباً اس وقت سب سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور اگر وہ بلا معاوضہ اس کام کو انجام دینے کے لیے نہ تیار ہوں تو مناسب ہوگا کہ اُن کی خدمت انجمن اپنے ذمے لے۔

مذکورۂ بالا حضرات کے سوا اور بھی بکثرت اصحاب ایسے ملیں گے جن سے ان کاموں میں کافی مدد مل سکتی ہے اور جو اُردو کی خدمت کے لیے اپنا قیمتی وقت دینے میں یقیناً دریغ نہ کریں گے۔
اس طور پر اگر ایک مرتبہ بھی عمل شروع کر دیا گیا تو ہمیں یقین ہے کہ نتائج نہایت خوش آیند اور مفید نکلیں گے اور جو کام موجودہ طریقے پر سالہا سال میں نہیں ہو سکتا وہ تھوڑے ہی دنوں

میں پورا ہو جائے گا۔ اس کام کے لیے چار پانچ ہزار روپیہ درکار ہوگا جسکی فراہمی کے لیے اگر مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولوی عبدالحق صاحب مل کر کوشش کریں تو ایک مہینے کے اندر انتظام ہو جائیگا۔ مولوی حبیب الرحمن صاحب ایک نہایت ذی ہمت اور فیاض رئیس ہیں۔ اتنی رقم وہ چاہیں تو خود اپنی جیب سے دے دیں۔ ورنہ صرف اپنے ضلع علیگڈھ سے دلا سکتے ہیں

۵۔ جماعت انتظامی

یہ پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ باستثناء چند اصحاب کے معاملات انجمن سے دلچسپی لینے والے بہت کم ہیں۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ انجمن محض بیکار اور غیر ضروری چیز ہے۔ یا پھر جنھیں توجہ کرنا چاہیے اور اس سے دلچسپی رکھنا چاہیے اُن کی غفلت ہے۔ امر اول کو تسلیم کرنا خصوصاً اس زمانے میں جبکہ مرض انجمن سازی اپنی انتہائی حد پر پہنچا ہوا ہے، غالباً ناممکن ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ اس خیال کے ظاہر کرنے والے کو آپ مخبوط الحواس اور دیوانہ کہنے میں دریغ نہ کریں گے۔ لہذا مجبوراً نتیجہ یہی نکالنا پڑتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ اصحاب جن کو اس ضروری مجلس کے کاموں سے پوری دلچسپی لینا چاہیے تھی غفلت برت رہے ہیں۔ اور یہ مرض غفلت اس قدر ہمہ گیر اور عام ہے خصوصاً مسلمانوں میں کہ باوجود شدید ترین اور حد درجہ توہین آمیز الزام ہونے کے آپ چند افراد کو چھوڑ کر تمام تعلیم یافتہ طبقے کو اس کا مورد بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم علی الاعلان اس بات پر اظہار افسوس کرنے پر مجبور ہیں کہ معدودے چند ارکین شوریٰ کے سوا انجمن ترقی اُردو کے اکثر و بیشتر ارکان شوریٰ محض برائے بیت ہیں۔

لیکن انجمن ترقی اُردو کو اگر اپنے ارکان شوریٰ کی بے اتفاقی اور غفلت کا رونا ہو تو یہ کچھ تعجب کا مقام نہیں، کہ مسلمانوں کی بڑی مرکزی مجلسیں اسی وباے عام کا شکار ہیں۔ علیگڈھ کالج کو اپنے ٹرسٹیوں سے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کو سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے اراکین سے۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنے ممبران کونسل سے بعینہ یہی شکایت ہے۔ بر ایں ہمہ تجربہ گاہ عالم میں اگر گذشتہ واقعات سے سبق حاصل نہ کیا جائے تو یقین ہے کہ ہماری رفتار ترقی بالکل ہی سست رہے گی۔

کالج کے ٹرسٹی اس لیے ٹرسٹی نہیں بنائے جاتے کہ اُنھیں مسلمانوں کا درد اور تعلیم کا ذوق ہے۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جو روپے والوں کو یا ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے جنکی وساطت سے روپے والے قابو میں آتے ہیں۔ اب منصبدار کو چونکہ اس بات کی طرف سے کامل اطمینان ہے کہ خواہ وہ ہاتھ پانوں ہلائے یا پڑا سوتا رہے اُسکے منصب میں فرق نہ آئے گا۔ اس وجہ سے اُسکو قطعاً کام کرنے اور معاملاتِ کالج میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس قسم کے منصبدار ٹرسٹیوں کی بے التفاتی اور عدم توجہی روز روشن کی طرح عیاں ہے اور اسکی ضرورت نہیں کہ ان سوتی ہوئی ہستیوں کو نام بنام پکارا جائے۔

سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے اراکین کا انتخاب بھی قریب قریب اسی اصول پر کیا جاتا ہے بلکہ وہاں روپیہ کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کو کسی حیثیت سے ممتاز ہونا چاہیے۔ یہ اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ آپ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر بنا لیے جائیں گے۔ اس سے کسی کو بحث نہ ہوگی کہ آپ کو کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے کس حد تک ہمدردی ہے اور آپ اپنا کتنا وقت اس قسم کی دلچسپیوں کے لیے دینے کو تیار ہیں۔ آپ کا وقت برباد کرانا وہاں مدنظر بھی نہیں ہوتا۔ ہاں جب کبھی کسی معاملے میں منتظمین کانفرنس کو مخالفت کا اندیشہ ہو تب اُس وقت البتہ آپ کو اُنکی خاطر رائے لکھنے میں کچھ وقت ضائع کرنا پڑے گا۔ اور اُس وقت بھی اگر آپ محض سادے کاغذ پر دستخط کر کے رائے لکھنے یا خانہ پُری کرنے کا اختیار دفتر کانفرنس کے سپرد کر دیں تو مزید تشکر گزاری کے مستحق ہوں گے۔

رہی آل انڈیا مسلم لیگ، سو وہ ابھی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ اُسکی جماعتِ انتظامی میں شرکت کسی کے لیے بھی باعث اعزاز ہو۔ اور چونکہ کارکنانِ لیگ رزولیوشن سازی کے سوا کوئی عملی کام کرنا نہیں چاہتے، اس وجہ سے اُنکو جماعتِ انتظامی کی حقیقتاً ضرورت بھی نہیں۔ خصوصاً جبکہ دولتمند پریسیڈنٹوں کی بدولت دفتر کے اور نیز دوسری قسموں کے اسراف کے لیے بیدریغ روپیہ میسر آجاتا ہے۔

لیکن اگر کالج مقامی ٹرسٹیوں کی ملک بنا ہُوا ہے؛ کانفرنس پر عہدہ داران اعزازی تصرف کیے ہوے ہیں، اور لیگ کا قبالہ قیصر باغ پارٹی کے نام لکھا جاچکا ہے۔ تو کیا یہ واقعات اپنے اندر کوئی عبرت ہمارے واسطے نہیں رکھتے؟ اور کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اپنی جدید مجالس کو اِن خرابیوں میں مبتلا ہونے سے بچائیں۔

کالج، کانفرنس اور لیگ کی بنیادمیں جو کجی ہے اُسکی اصلاح ممکن نہ ہو، مگر انجمن ترقی اُردو کی حالت ان سے جدا گانہ ہے۔ اُسکی یہ ابتدائی منزل ہے اور اسی وقت سے اگر اس بات کی کوشش کی جاے گی کہ اسکی بنیاد میں کوئی خرابی نہ پیدا ہونے پائے تو یقین واثق ہے کہ آیندہ چل کر وہ اُن سب خرابیوں سے پاک رہے گی جو ہماری دوسری مجلسوں کے لیے آج طغرلے امتیاز ہیں۔

انجمن کی اصلی خرابی یہ ہے کہ انجمن کے نظام میں سرے سے کوئی انتظامی جماعت رکھی ہی نہیں گئی ہے۔ بے شبہہ ارکان شوریٰ سے سکرٹری صاحب اکثر امور میں مشورہ لیتے رہتے ہیں۔ لیکن نہ تو ارکانِ کے انتخاب میں کوئی اصول مدنظر رہتا ہے نہ اُنکی تعداد معیّن ہے نہ اُنکی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ ضابطہ میں کوئی دفعہ اس قسم کی ہے کہ جو ارکان غفلت برتیں اُن کو اس اعزازی خدمت سے سبکدوش کردیا جائے۔ دوامی پٹہ اگرچہ صریحاً نہیں لکھا گیا ہے تاہم قانون اس بارے میں بھی کوئی صراحت نہیں کرتا کہ انکی میعادِ رکنیت کیا ہوگی۔ لہذا ان خرابیوں کا انسداد اس طور پر کردیا جاہیے کہ

(۱)　ارکان شوریٰ کی تعداد معیّن ہو

(۲)　انکی نامزدگی یا انتخاب کے لیے قواعد بنا چاہیے

(۳)　انکی میعادِ رکنیت مقرر کی جائے۔

(۴)　انجمن کے تمام معاملات مجلس شوریٰ کی رائے سے طے پائیں۔

(۵)　ارکان شوریٰ کی ایک مختصر جماعت مجلس انتظامی کے نام سے موسوم ہو اور انجمن کے تمام صیغوں کی ذمہ داری اس مجلس پر رکھی جائے۔

(۶)　ارکان شوریٰ کے لیے عام طور پر چندہ لازمی کیا جائے۔

(۷) چونکہ بعض اربابِ علم شاید ایسے بھی ہوں جو چندہ نہ دے سکیں اس لیے یا تو ایک تعداد اعزازی اراکین کے واسطے مخصوص کردی جائے یا خاص صورتوں میں ایسے لوگوں کو مستثنیٰ کردیا جائے۔

(۸) جملہ عہدہ داران مجلس انتظامی و دیگر ماتحت مجالس ارکان شوریٰ ہی میں سے بذریعہ انتخاب مقرر ہوں اور اُنکی میعادِ عہدہ یا رکنیت معین ہو۔

۶۔ سرمایہ

ان کاموں سے فراغت حاصل کرکے سب سے ضروری یہ ہے کہ انجمن کے لیے ایک مستقل اور کثیر المقدار سرمایہ فراہم کیا جائے۔ یہ کام چنداں آسان نہیں ہے تاہم اگر مستعدی اور ہمت کے ساتھ کام کیا جائے تو ناممکن بھی نہیں۔ لیکن اگر محض سکرٹری کے متعلق منجملہ دوسرے فرائض کے یہ کام بھی رہا جیسے کہ کالج۔ کانفرنس اور لیگ میں ہے تو یا تو ضرورت کے مطابق سرمایہ فراہم نہ ہوگا یا سکرٹری صاحب مجبور ہوں گے کہ اربابِ زر کی پرستش کریں اور اُنکے زیرِ اقتدار رہیں۔ رفتہ رفتہ انجمن ترقی اُردو بھی کالج اور لیگ کی طرح اہل دولت و ثروت کی ملک بن جائے گی۔ اور اگرچہ آج ہمیں خوش قسمتی سے ایک بے لوث اور مخلص سکرٹری سے سابقہ ہے لیکن اگر ہم نے کافی احتیاط نہ برتی اور منتظمین انجمن کی عقل و علم کو روپے کے معاوضہ میں فروخت ہونے دیا تو ایک دن آئے گا کہ انجمن ترقی اُردو کے منتظمین کو ہماری آئندہ نسلوں سے وہی کچھ سننا پڑے گا جو آج ہم کالج اور مسلم لیگ کے عہدہ داروں کو کہنے پر مجبور ہیں۔

بے شبہ ہندوستان کے فراخ حوصلہ والیانِ ریاست اور دیگر دولتمند اصحاب کی وجہ سے اس وقت تک قوم و ملک کی بہت سی تحریکات زندہ اور قائم ہیں اور اُنکی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے ناممکن ہے کہ ان صاحبانِ ثروت کی فیاضی کا اعتراف نہ کیا جائے۔ لیکن جہاں انکی مالی امداد سے قوم کو نفع حاصل ہوتا ہے وہیں دو عظیم الشان اور قریب قریب لاعلاج مرض بھی جسم قومی کو لاحق ہوگئے ہیں؛ اور اس سے انکار کرنا بدیہیات کے خلاف جانا ہے کہ ان بیماریوں کے جراثیم کا سرچشمہ اہل دول کی یہی مالی امداد ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کی اچھی سے اچھی اور بڑی سے بڑی قومی مجالس کے اندرونی حالات دریافت کیجیے

تو معلوم ہوگا کہ آج اس عہد بیداری میں بھی جبکہ زمانہ کے زبردست پہلوان کی بدولت کوئی چھوٹا سا چھوٹا طبقہ بھی غفلت اور بیہوشی کی نیند نہیں سوتا۔ ہم سے زیادہ پردۂ دنیا پر کوئی غافل و پست قوم نہیں ہے۔ اول تو عموماً مجالس نے اپنا وطیرہ یہی کرلیا ہے کہ عامۃ الناس اور قوم کے متوسط طبقے کو جو حیات قومی کا اصلی مرکز ہو سکتا ہے، بالائے طاق رکھ کر محض امرا کی اعانت و امداد کی راہ دیکھتی رہتی ہیں۔ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ عامۃ الناس اور متوسطین قوم کو جیسی چاہیے ان تحریکات سے دلچسپی نہیں پیدا ہوتی اور چونکہ اُنکو دلچسپی نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ کوئی کافی امداد بھی نہیں کر سکتے۔ پھر اُمرا و رؤسا عموماً جو مدد ان تحریکات کو دیتے ہیں وہ حقیقت میں اُس درد کا نتیجہ نہیں ہوتی جو قوم یا ملک کی محبت و ہمدردی کسی دل میں پیدا کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طبقہ سرے سے اس جنس کی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ مگر جب وہ روپیہ دیتے ہیں کسی مشیر یا مصاحب کی سفارش پر، یا خاص صورتوں میں کسی بڑے آدمی یا ممتاز جماعت کو ممنون کرم بنانے کے لیے تو ظاہر ہے کہ انکی فیاضی کا شجر انکے تخم نیت ہی کی مناسبت سے بار لائے گا۔

ہندوستان کے وہ والیانِ ریاست اور دولتمند افراد بسا غنیمت ہیں جو روپیہ دیکر بھول جاتے ہیں اور کبھی اسکے خواہاں نہیں ہوتے کہ اُس روپے کا معاوضہ لیں۔ لیکن تمدن مغربی کا روز افزوں اثر ہمارے رئیسوں اور امیروں کو اُس منزلت و عظمت کا گرویدہ بنا تا جاتا ہے جو مجامع اور قوموں کی رہبری اور سیادت کی وجہ سے کسی بڑی سے بڑی انسانی ہستی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس عالی مرتبت مدبرین، بالغ نظر حکما، باکمال شاعروں اور بلند حوصلہ سپہ سالاروں کے سے دل و دماغ تو ہیں نہیں لیکن وہ اس کمی کو چاہتے ہیں کہ روپے کے اثر سے دور کر دیں اور غرضمند اُنھیں باور کرا دیتے ہیں کہ اُن کے پاس وہ پارس ہے کہ اُسکی ایک رگڑ سے اُنکی مٹی بھی سونا ہو سکتی ہے۔ زمانۂ گذشتہ تو شاید اس قابل نہ ہو کہ اُسکی یاد دلائی جائے، مگر عہد جدید میں جبکہ مغربی تمدن اور برطانوی حکومت کی برکات سے سارا ہندوستان جگمگا رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اسی روپے کی بدولت زندگی کے ہر شعبے میں ایسے لوگ ہماری رہبری کر رہے ہیں جو اگر دولتمند نہ ہوتے

تو شاید کوئی اُن کا نام بھی نہ لیتا۔

ان اسباب کی بنا پر ہماری دلی آرزو اور تمنا یہ ہے کہ جدید اجتماعی تحریکات کے منتظمین اس بات میں ہمہ تن ساعی ہوں کہ چند دولتمندوں کی نگاہِ التفات پر نہیں بلکہ کثیر التعداد متوسطین کی امداد پر ان تحریکوں کا انحصار رہے۔ موجودہ زمانے میں اور خصوصاً کسی کام کی ابتدا میں یہ کچھ آسان نہیں۔ لیکن صبر، استقلال، پامردی اور حوصلہ مندی کے ساتھ کام کیا جائے تو تھوڑے ہی دنوں میں خود نتائج اس بات کا ثبوت دیں گے کہ سب سے بہتر اور قابلِ اعتماد طریقِ کار یہی ہے۔ وما علینا الا البلاغ

ایڈیٹر

کھلا ہے جب سے آنکھوں میں چمن گلہائے وحدت کا
نظر آتا ہے پژمردہ ہر اک گُل باغِ کثرت کا

نکلتا میری آنکھوں سے اِدھر اشکِ ندامت کا
برس پڑتا اُدھر محشر میں مجھ پر ابرِ رحمت کا

کسی کو زعم تقویٰ کا کسی کو غرّہ طاعت کا
خداوندا ہمیں تو آسرا ہے تیری رحمت کا

جو ہو ہر موئے تن میرا زباں اے صانعِ عالَم
نہ ہو جب بھی بیانِ وصف اک ذرہ تیری صنعت کا

کسی نے بھی نہ پایا بھید تیرا دونوں عالم میں
تماشا دیکھتے ہی رہ گئے سب تیری قدرت کا

جسے کچھ اُسکی صنّاعی میں شک ہو دیکھ لے آکر
نمونہ ہے دو عالم ایک ادنیٰ اُسکی صنعت کا

دکھائی دیتی ہیں بزمِ جہاں میں صورتیں کیا کیا
کرشمہ ہے یہ صورت آفریں کے دستِ قدرت کا

ہزاروں گُل کھلائے بوستانِ دہر میں لیکن
جدا ہے رنگ و بو سب کا تماشا ہے یہ قدرت کا

بھلا مجھ سے ملا سکتا ہے کوئی بادہ خوار آنکھیں
سُرور آنکھوں میں ہے میری شرابِ جامِ وحدت کا

نگاہِ چشمِ حق بیں سے ذرا دیکھ انکو اے زاہد
بتوں میں بھی نظر آتا ہے جلوہ اُسکی قدرت کا

قیامت ہو گی گرمی آفتابِ روزِ محشر کی
بھروسا ہے خدایا سایۂ دامانِ رحمت کا

مرے اشک آکے پونچھے دامنِ رحمت نے محشر میں
بہت ممنون ہوں آفاق میں اپنی ندامت کا

بھلا روزِ قیامت کا مجھے آفاق ڈر کیا ہو
کہ رحمت کا اُدھر دریا اِدھر بیڑا شفاعت کا

عاصی آفاق (بنارسی)

"چشمِ مجنوں سے دیکھ لیلیٰ کو"

شب وہ دردِ نہاں کا بڑھ جانا — دل کو اس طرح میرا سمجھانا
اے دل اے مستِ بادۂ الفت — اے ستم دیدۂ شبِ فرقت
اے مرے غمگسار و محرمِ راز — اے شہیدِ ادا و کشتۂ ناز
زخمیِ تیغ نرگسِ مخمور — مئے شوقِ وصالِ یار سے چور
سر بکف در رہِ رضائے حبیب — تختۂ مشقِ ہر جفائے حبیب
مستِ خوشبوئے گیسوئے مشکیں — بیخودِ یادِ عارضِ رنگیں
آج کیوں ایسی بیقراری ہے؟ — کیا ہوا کیوں یہ اشکباری ہے؟
کیوں ہے یہ پیچ و تاب! خیر تو ہے؟ — اس قدر اضطراب! خیر تو ہے
حسرتوں کو نہ یوں مچلنے دے — ارے ظالم مجھے سنبھلنے دے
رات آنکھوں میں کاٹ دی تو نے — میری مٹی خراب کی تو نے
تجھ کو آخر یہ بیخودی کیوں ہے؟ — خیر ہے عزمِ خودکشی کیوں ہے؟
ارے ظالم کچھ اپنا حال تو کہہ — ہم سے کچھ باعثِ ملال تو کہہ
ہم نے مانا غمِ جدائی ہے — جان پر تیری کیوں بن آئی ہے؟
غیر ممکن ہے جب وصالِ صنم — پھر عبث ہے تجھے خیالِ صنم
جس کے پیچھے تو جان کھوتا ہے — بیوفا چین سے وہ سوتا ہے
ضبط کچھ صدمۂ و ملال تو کر — میری رسوائی کا خیال تو کر
کیا طریقہ یہی وفا کا ہے — کیا یہی عاشقی کا شیوا ہے
گر اسی طرح گزرے لیل و نہار — زیست ہو جائے گی مجھے دشوار

(۲) لاکھوں صدمے یوں ہی گذرتے ہیں   کہیں جانباز اُف بھی کرتے ہیں
دامنِ صبر و ضبط ہاتھ رہے   غم رہے اور دَم کے ساتھ رہے
گزرے ہیں پہلے سیکڑوں جانباز   بستۂ زلف و کشتۂ انداز
محوِ شیریں تھا کوہکن کہ نہیں   نل تھا غم دیدۂ دمن کہ نہیں
قیس آخر اسیرِ لیلےٰ تھا   وامق آخر ہلاکِ عذرا تھا
موجدِ رسمہائے اُلفت تھے   رہروِ جادۂ محبت تھے
مرگئے پر نہ اُف زبان پہ لائے   کہتے تھے جان جائے آن نہ جائے
اُن کے حالات دیکھ غیرت سیکھ   ارے کمبخت کچھ تو عبرت سیکھ
نام کیوں عشق کا ڈبوتا ہے   جان کیوں یوں تڑپ کے کھوتا ہے
ہے مناسب کہ رنج ہو رخصت   چھوڑ دے تھوڑی دیر کو وحشت
یہ دعا کر کہ اے خدا اے کریم   مالک و صانع و قدیم و حکیم
مہرباں مجھ پہ وہ صنم ہو جائے   دور یہ سب غم و الم ہو جائے

سُن کے کہنے لگا دلِ رنجور   مجھ کو سمجھاتے ہیں اگرچہ حضور
کیا یہ بے وجہ بے قراری ہے   دردِ الفت کچھ اختیاری ہے
یاد میں جس کی ہوں میں یوں بیتاب   کوئی دیکھے تو اُسکا عہدِ شباب
میری بیتابیاں تماشا ہیں   شوخیاں اُس کی جان لیوا ہیں
پہلے اُس کے شباب کو دیکھو   پھر مرے اضطراب کو دیکھو
محشرِ عشق ہے جمال اُس کا   ایک عالم ہے پائمال اُس کا
چھوڑ بے درد طعنِ بیجا کو
"چشمِ مجنوں سے دیکھ لیلےٰ کو"

رئیس احمد عباسی-عاجز
(کاکوروی)

مسٹر محمد علی کا خط

۱

بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے اور شاید حکام تک بھی پہنچا یا گیا ہو کہ ہمنے مسٹر محمد علی کے خط کو اُن کی رضا مندی اور واقفیت سے شایع کیا ہے۔ اس سے نفس مسئلہ پر تو کچھ اثر ہو نہیں سکتا۔ البتہ جو لوگ مسٹر محمد علی کے ہوا خواہ نہیں ہیں اور اُنکی قوت سے ڈرتے ہیں وہ اس قسم کے بیانات کو شہرت دیکر شاید اُن کے قیام چھندواڑہ کو جدید بندشوں سے مزید تکلیف دہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن مولانا حسرت کے ہمنواؤں کی اس سے تسلی ہو جاتی ہے کہ

مصائب کی برداشت رہِ جفا میں اسی کو تو کہتے ہیں ایثارِ صالح

بہرحال ہم نے تو پہلے بھی صاف صاف لکھ دیا تھا اور اب بھی عام اطلاع کے واسطے لکھتے ہیں کہ اس خط کی اشاعت کی تمام ذمہ داری اڈیٹر الناظر کے سر ہے۔ مسٹر محمد علی کو اگر اسکی خبر ہوتی کہ خط شایع ہو جائے گا تو وہ یقیناً اُس میں سے وہ حصہ خارج کر دیتے جہاں اُنھوں نے دسمبر سنہ ۱۲ء کے اُس واقعے کا ذکر کیا ہے جو ہمیشہ محمد علی صاحب کے دامن پر بمنزلہ ایک داغ کے نمایاں رہے گا۔

۲

اس خط کی اشاعت کے بعد سے مختلف بہی خواہانِ ملک و قوم نے جو خطوط ہمیں بھیجے ہیں اُن میں اختلاف طبائع و رُجحان کے لحاظ سے مختلف خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ امر نہایت درجہ طمانیت بخش ہے کہ سب نے باستثناء ایک صاحب کے خط کی اشاعت کو مفید ظاہر کیا ہے۔ یہ صاحب ایک مشہور اہل قلم، سرگرم محب وطن اور مسٹر محمد علی کے نہایت گہرے دوست ہیں اور اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ راجہ صاحب۔ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر مظہر الحق کے ساتھ ہم نے بہت زیادتی کی ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا اُس سے اختلاف رکھنے کے باوجود ہمارے دوست کو اصرار ہے کہ یہ تینوں صاحب ایمان دار اور محبِ وطن ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے دوست کی رائے سے

اتفاق نہیں رکھتے اور نہ واقعات اسکی تائید کرتے ہیں۔

مسٹر مظہر الحق۔ ڈاکٹر انصاری اور راجہ صاحب محمود آباد ۱۹۱۳ء تک مسئلہ یونیورسٹی میں جمہور مسلمانان ہند کے ہم آہنگ تھے اور بزرگان علی گڈھ بعض جزوی اختلافات کو چھوڑ کر اصولاً اس بات میں باہم متفق تھے کہ جیسی یونیورسٹی بھی ملے لے لی جائے۔

اگست ۱۹۱۵ء میں شملے پر راجہ صاحب نے رائے بدلی۔ اور بزرگانِ علی گڈھ کے ہمخیال اور اُنھیں کی روش کے پابند ہو گئے۔ یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں مُسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کا جو جلسہ علی گڈھ میں ہوا تھا اس میں ووٹوں کے شمار اور فیصلۂ صدارت کے اظہار میں ایسی بدمزگی پیدا ہوئی کہ نصف سے زائد شرکاے جلسہ اُٹھ کر چلے آئے۔

ڈاکٹر انصاری۔ اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اُس وقت تک راجہ صاحب کے ہمخیال نہ تھے بلکہ اُن روٹھ جانے والوں کے ساتھ تھے۔

پھر سال گزشتہ جب فاونڈیشن کمیٹی کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد کیا گیا ہے تو اس جلسے سے کچھ دنوں قبل بانکی پور میں مسٹر مظہر الحق نے ایک مجلس شوریٰ منعقد کر کے بعض تجویزیں پاس کی تھیں جو علیگڈھی تحریک کی مؤیدنہ تھیں۔ ۹ر اپریل ۱۹۱۶ء کو جب مولوی محمد نسیم صاحب وکیل لکھنؤ کے دولت خانے پر گروہِ احرار کا جلسۂ شوریٰ منعقد ہوا ہے تو مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر انصاری اور نیز سید وزیر حسن صاحب یونیورسٹی ایسوسی ایشن کی تجویز کے مخالف تھے اور یہ فیصلہ کر کے اُٹھے تھے کہ اُس جلسے میں جو رزولیوشن مرتب کیا گیا ہے اُسی کو منظور کرانے میں سب صاحب پورا زور صرف کرینگے۔ آٹھ بجے شب کو یہ وعدے ہوے مگر گیارہ بجے دن کو جب مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کی کارروائی شروع ہوئی تو رات کی قرارداد معاہدۂ برلن کی طرح حرفِ غلط نکلی۔ اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر انصاری بھی وہی راگ الاپنے لگے۔ جو قیصر باغ کے گراموفون میں چند روز ہوے بھرا گیا تھا۔

مسٹر مظہر الحق کے قومی کارنامے افسوس ہے کہ ایسے نہیں ہیں جن پر اس درجہ اعتماد کیا جاسکے کہ وہ ہمیشہ حق و صداقت ہی کا ساتھ دیتے ہیں۔ کامریڈ کے فائل موجود ہیں۔ دیکھیے اور عبرت حاصل

دیکھیے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے مسٹر محمد علی کے فرستادہ طبی مشن کی سرکردگی کو جس خوش اسلوبی اور خلوص و جوش کے ساتھ انجام دیا ہے اُسکی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں، کہ مسلم یونیورسٹی کے تصفیے میں جو روش اُنکی رہی وہ بھی سزاوارِ تحسین یا جائز قرار پائے۔ اُنھیں شکایت ہے کہ لوگ اُنکی تبدیلیِ رسالے کو بدنیتی پر محمول کرتے ہیں۔ یقیناً اُنکی شکایت بالکل صحیح ہوتی اگر وہ قوم کو یا کم سے کم اُن لوگوں کو جن سے اُنھوں نے ۹ر اپریل کو عہد کیا تھا، اس تبدیلی رسالے کی اطلاع دیدیتے۔ لیکن اگر ہمارے رہنماؤں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ ہر پانچ منٹ کے بعد اپنی رسالے بدل دیں اور بغتۃً اُسکا اظہار بھی کردیں تو یقیناً قوم کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ جن لوگوں کو وہ پیشتر رہنما اور رہبر سمجھتی ہو اُنھیں وہ رنگ بدلتے ہی رہزن اور گمراہ کرنے والوں میں شمار کرنے لگے۔

رہے راجہ صاحب تو اُن کی حبِ وطن اور نیک نیتی میں تو شک کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں اس لیے کہ اُن کے روپے سے قومی تحریکات کی آبیاری ہو رہی ہے۔ حالانکہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ہر سمجھدار آدمی جان سکتا ہے کہ راجہ صاحب جیسے اشخاص کو کسی جمہوریہ یا جماعتِ احرار میں جگہ نہیں ملنا چاہیے۔ راجہ صاحب یہی نہیں کہ اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو حریت و صداقت کا دشمن ہے اور آزادی و ایثار سے جسکی پشتینی لڑائی چلی آرہی ہے بلکہ خدا کے فضل و کرم سے اپنے طبقے کے ممتاز اور سربرآوردہ افراد میں ہیں اور اسی کو اپنے لیے مایۂ افتخار جانتے ہیں۔ اور یہ جو کبھی کبھی وہ اپنے منصبِ بلند سے نیچے اُتر آتے۔ اور شاعر، انشاپرداز، کونسلر اور رہنماے قوم کی متنوع، دلچسپ اور نظر فریب شخصیتوں میں نمودار ہوتے ہیں، تو فی الحقیقت یہ کسی فطری رجحان یا جذبۂ دلی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس قسم کی مصنوعی زندگی زمانۂ حال کے بہترین مشاغلِ تفریح میں شمار ہوتی ہے۔

مسلمانانِ ہندوستان کی یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ وہ ہر دفعہ چمکدار اور پُرآب و تاب شخصیتوں کی طرف لپکتے اور اُنھیں کو اپنی حیاتِ قومی کے لیے بمنزلۂ چشمۂ حیواں جانتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ ان ریت کے تودوں میں پانی کہاں؟

مسٹر محمد علی کا خط حقیقت میں "مشتے بعد از جنگ" سے زیادہ نہیں لیکن اسکی اشاعت کی غایت اصلی اسی قدر ہے کہ نوجوانان قوم کو عموماً اور جماعت احرار کو خصوصاً اس بات کا احساس کرنا چاہیے کہ

ہر چمکتی چیز تو سونا نہیں

گذشتہ دسمبر میں جب اجلاس لیگ کے موقعہ پر پریسیڈنٹ (راجہ صاحب) اور سکرٹری (وزیر حسن صاحب) کے متعلق اظہار اعتماد کی تحریک پیش ہونے والی تھی تو ایڈیٹر الناظر اس تجویز کی علی الاعلان مخالفت کے لیے آمادہ تھا۔ اور یقیناً اس بات کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ ان لوگوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ لیکن جماعت احرار کے بعض مقتدر اصحاب نے جنکی نیازمندی کا اعزاز ہمیں حاصل ہے ہمیں اس سے باز رکھا اور باور کرایا کہ مقاصد قومی کے لحاظ سے خصوصاً میاں محمد شفیع اور پنجاب لیگ کے قابل اعتراض رویّہ کی بنا پر اس وقت خاموشی ہی مناسب ہے۔ ہمیں دلی رنج ہے کہ ہم نے ان احباب کی رائے پر بھروسہ کر کے اظہار حقیقت سے کیوں احتراز کیا۔ ورنہ آج ان حضرات کو پبلک کی آنکھوں میں خاک جھونکنے اور قومی مفاد و مقاصد کو پامال کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ بہرحال فطرت کے قانون اٹل ہیں۔ ہر مجرم کو سزا ملنا ضروری ہے۔ انشاءاللہ یہ لوگ بھی جلد اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے اور اس دن یاد کریں گے کہ فطرت کا انتقام کیا سخت ہوتا ہے۔ کذب و باطل کے مقابلے میں حق و صداقت عارضی طور پر دب جائیں تو دب جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ بالآخر فتح سچائی کو نہ ہو۔

۳

راجہ صاحب کی باموقع زرپاشی اور ظاہر فریبوں نے ساری جماعت احرار کو دار وے بیہوشی سنگھا رکھی ہے، جس کا تازہ ترین ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ مسٹر محمد علی کے خط پر حریت پسند اخبارات تک نے اظہار رائے سے دریغ کیا۔* مقامی معاصر "ہمدم" نے جسکی ادارت خصوصی ہمارے وہ دوست کر رہے ہیں جو "آف ہمدرد" (ہمدرد کے) کہے اور سمجھے جانے پر فخر کرتے ہیں اور جو ایک زمانے تک مسٹر محمد علی کے دست و بازو بنے ہوئے تھے اس خط پر اتنی توجہ بھی نہیں کی جتنی موج دریا خس کے

*: بارے "صداقت" کا احساس جاگا اور "وقار" اور "دردمشتی" نے ۱۰ جون کے پرچوں میں قرار واقعی گرفت کی ——— ایڈیٹر ۱۰ جون ۱۹۱۶ء

ساتھ کرتی ہے۔ اللہ رے شانِ بے نیازی۔

ہمدم جب جاری ہونے والا تھا تو لوگوں نے طرح طرح کے خیالات اور اندیشے ظاہر کیے تھے۔ شیخ شاہد حسین صاحب کے تلون اور عدم استقلال کی وجہ سے ہم کو خود بھی اطمینان نہ تھا لیکن خیال تھا کہ شیخ صاحب کو کونسل کی ممبری سے جن لوگوں نے اُکھاڑا ہے وہ اُنھیں کبھی معاف نہ کر سکیں گے اور مسٹر محمد نسیم کی شرکت سے اس بات کی مزید توقع قائم ہوئی تھی کہ ہمدم اُس پارٹی کا آرگن نبیگا جس کی جوع اقتدار علی گڈھ والوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہے۔ لیکن وہ لوگ جو غور کرنے والا دماغ اور قوت فیصلہ نہیں رکھتے اور کسی رائے یا جذبۂ خاص کے پابند نہیں بلکہ ہوا کے ہر جھونکے سے اُن کا رنگِ رُخ متغیر ہوتا اور اُنکی پالیسی بنتی بگڑتی ہے، اُن سے نفع کی امید رکھنا عبث ہے۔ ہمدم نقد روپے کے معاوضہ میں فروخت ہو چکا ہے اور سنا ہے کہ "آئی ڈی ٹی" کے اصطبل میں اسکے لیے بھی تھان تیار کیا جا رہا ہے۔ شیخ شاہد حسین صاحب سے نہیں، البتہ مسٹر محمد نسیم کی خدمت میں ضرور یہ عرض ہے کہ اگر آپ حقیقت میں پہلو میں دل اور اُس دل میں قوم کا درد رکھتے ہیں تو آپ کو تو "ہمدم" کی اس زندگی پر اُس کی موت کو ترجیح دینا چاہیے تھی۔

۴

مسلم یونیورسٹی کا آخری فیصلہ ہر چند کہ قوم کی عام رائے کے بالکل برخلاف ہے اور اکثر سمجھدار اور دردمند اصحاب اس فیصلے سے بدل ناراض ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ موت کی سی غفلت ہم پر طاری ہے اور ہم نے اس تصفیے کو آخری اور قطعی سمجھکر ہاتھ پاؤں ڈال دیے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقۃ اُن ہی خواہانِ قوم کے لیے جو سرفروشی اور جاں نثاری کی ہمت رکھتے ہوں یہی وقت عمل ہے۔ قومی لیڈروں میں سے مستبدین و احرار دونوں کا رنگ روغن ظاہر ہو چکا ہے، البتہ وہ نوجوانانِ قوم جن کے دل اسلامی جوش سے لبریز ہیں اور جنھوں نے ایثار اور قربانی کے سبق اپنے پیشرودں و رہنماؤں سے نہیں بلکہ کتاب کے اوراق اور تاریخ کے کارناموں سے سیکھے ہیں اب چاہیے کہ اُٹھیں اور قوم فروشی کی اس آخری کوشش کو رائیگاں ثابت کردیں۔

ہمیں یہ دریافت کر کے کچھ تعجب نہیں ہوا کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے گذشتہ جلسے میں ایک سے زیادہ بے قاعدگیاں ہوئیں۔ اور اس بنا پر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اس فیصلے کو تسلیم کریں جو دیانت و آئین کی خلاف ورزیوں کے بعد صادر ہوا ہے۔

خواجہ عبدالمجید صاحب جو ماشاءاللہ اظہار حق و صداقت میں باوجود تمام مخالف کوششوں کے آخر تک ثابت قدم رہے۔ اُنکی طرف سے اگر اس جلسے کی مفصل اور مشرح روداد شایع ہو تو قوم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے رئیس لیڈر جب قوم فروشی پر اُتر آتے ہیں تو اُن سے کیسی کیسی حرکتیں سرزد ہونے لگتی ہیں ——— اس ضمن میں جو اطلاعات ہمیں وصول ہوئی ہیں وہ اس لحاظ سے بہت ہی مایوس کُن ہیں کہ نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب جن کی جواں ہمتی ہی پر ملک کی نجات و فلاح کا انحصار ہے، باوجودیکہ اُنکے بس میں تھا کہ استقلال و پامردی سے اظہار رائے کے حق پر لڑیں اور جلسے کو اُس نتیجے پر نہ پہنچنے دیں جو قیصر باغ اور بھوپال کی پارٹیوں نے ساز کر کے باہم طے کیا تھا۔ خود اِن اربابِ تدبر کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیے۔

سالِ گذشتہ لکھنؤ کے جلسے کے واسطے بعض لوگوں نے بطور خود، سید علی امام صاحب کو صدارت کی دعوت دی تھی مگر جلسے کا رنگ دیکھکر خود سید صاحب نے بارہ دری میں قدم تک رکھنا گوارا نہیں کیا۔ ابکے پھر وہی چال چلی گئی اور بیگم صاحبہ بھوپال کے نوعمر صاحبزادے کو اس غرض کے لیے انتخاب کیا گیا۔ اگر علی گڈھ میں جلسہ نہ ہوا ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ ابکے بھی مجوزہ صدر نشیں صاحب کا وہی حشر ہوتا جو گذشتہ سال لکھنؤ میں ہوا تھا۔

(۵)

مسٹر محمد علی نے اپنے خط میں التوا کے لیے جو اسباب درج کیے ہیں وہ بجائے خود کافی وزن رکھتے ہیں، لیکن ایک بات جو ساری قوم کے دل میں ہے محتاجِ صراحت نظر آتی ہے۔

قوم کے عامۃ الناس کو چھوڑ کر خواص کے طبقے میں بھی ایسے بہت ہی کم لوگ نکلیں گے جنھوں نے بامعانِ نظر مسئلہ یونیورسٹی پر غور کیا ہو۔ لیکن جنھوں نے غور کیا ہے وہ بھی اور جنھوں نے

غور نہیں کیا وہ بھی ایک بات ضرور چاہتے ہیں اور اسی کو سب نے اپنا مطمحِ نظر قرار دیا تھا

کہ این سررشتۂ تعلیم ما درست ما باشد

امریکہ میں قومیں اور فرقے نہیں بلکہ افراد و اشخاص یونیورسٹیاں بنا سکتے ہیں لیکن اس ملک میں چالیس سال کی متواتر کوششوں کے بعد جب سات کرور نفوس کی ایک قوم اپنی تعلیمی ضروریات کے لحاظ سے ایک یونیورسٹی بنانا چاہتی ہے تو گورنمنٹ ہندوستان نہیں بلکہ ملک معظم کے سکرٹری ہندوستان ایسی ایسی رکاوٹیں پیدا کرتے اور پخیں نکالتے ہیں کہ اُس قوم کا مدعا پورا نہیں ہوتا۔

قوم کا عام رجحان اس طرف ہے کہ اس مسئلے پر پوری قوت اور پامردی کے ساتھ آئینی جنگ کی جائے اور یہاں سے لیکر انگلستان تک اپنے مطالباتِ جائز کی فریاد پہنچائی جائے۔ اور مردانہ وار جد وجہد کے بعد ایسی یونیورسٹی حاصل کی جائے جو قوم کے غور کرنے والے لوگوں کی تجویز کے مطابق قومی ضروریات کے لحاظ سے مناسب ہے۔ لیکن بدنصیبی سے وہ فرقہ جو قوم کی تعلیمی تحریک کا منتظم ہے، ابتدائی منزل کی ناکامیوں اور بعض بدخواہوں کے غلط مشوروں کی بنا پر خود اپنے پاؤں پر کلھاڑی مارنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

جنگ کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت بہت نازک ہو گئی ہے۔ لہذا جمہور کی خواہش یہ ہے کہ اس نازک موقعہ کو سکون و خاموشی کے ساتھ گزرنے دیا جائے۔ اور جب لڑائی کے بعد حکومتِ برطانیہ اور نیز حکومتِ ہندوستان کو فرغت سے اندرونی معاملات پر متوجہ ہونے کا موقع ملے، اُس وقت اس تحریک کو پھر اُٹھانا چاہیے اور خوشامدانہ چاپلوسی کے ذریعہ نہیں، بلکہ استحقاقاً مطالبہ کرنا چاہیے کہ جیسی یونیورسٹی ہم بنانا چاہتے ہیں اور جسکی ہمیں ضرورت ہے ویسی ہی یونیورسٹی کا چارٹر ہمیں دیا جائے۔

تعلیم کا مسئلہ حقیقتاً ایسا اہم ہے کہ اُسکے لیے قوم کو بڑی سے بڑی قربانیوں کے واسطے تیار رہنا چاہیے اور جس قوم نے اپنی بے مائیگی اور عام عسرت کے باوجود لاکھوں روپے آج تک تعلیم کے نام پر دیے ہیں اُس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنے تعلیمی نصب العین تک پہنچنے کے لیے ہر قسم کی مشکلات اور مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے اور کسی طریقے پر قربانی کرنے میں دریغ نہ کرے

مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے لیڈر بُزدل، خود غرض، کوتاہ اندیش اور متلون ہیں کہ اس زریں موقعہ کو ہاتھ سے دے رہے ہیں۔ اور جو پتھر کسوٹی کا کام دے سکتا تھا یا جس آگ میں تپا کر قومی سیرۃ کے لوہے کو جوہر دار بنایا جا سکتا تھا اُسی سے الگ رکھتے اور دُور ہٹا رہے ہیں ـــــ

دُنیا کا عام قاعدہ ہے کہ معمولی سے معمولی خدمت کے لیے انسانوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔ مگر یہ کیا کم ظلم ہے کہ جو قوم آپ اپنے شوق و ذوق کی بنا پر اسی امتحان میں پڑنا چاہتی ہے جسمیں کامیابی کے بعد ہی وہ خوددار اور معزز قوموں کے مجمع میں جگہ پا سکتی ہے اُسے خود اُسکی ہوا خواہی اور ہمدردی کے مدعی، داخل امتحان ہونے سے روکتے ہیں۔ اور بھلا ہو بُزدلی اور بے غیرتی کا کہ آج اس بیسویں صدی میں جبکہ جاپان، چین، ٹرکی اور روس کے حالات بچے بچے کے زبان زد اور ہر ہر قدم پر ہماری سبق آموزی کے لیے موجود ہیں، ہم اُس معمولی تدبیر سے بھی مُنھ موڑتے ہیں جو قانونِ فطرت نے دنیا کی تمام گری ہوئی اور پست قوموں کی ترقی و اصلاح کے لیے لازمی قرار دی ہے۔

مسٹر محمد علی نے جو کچھ لکھا ہے اُسکی تائید ہر وہ شخص کرے گا جو بلا رو رعایت اور محض مفاد قومی کو پیش نظر رکھ کر کوئی رائے قائم کرتا اور کوئی بات کہتا ہے۔ مگر اس بڑی اور اصلی بات کو جسے مسٹر محمد علی نے قوم کی موت و زیست سے اجمالاً تعبیر کیا ہے پوری تفصیل سے نہیں لکھا۔ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ جو قوم کارزارِ ہستی میں مصائب و تکلیفات کا سامنا کرنے سے دَم چُراتی ہے وہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہتی ہے۔ برباد کی جاتی ہے اور بالآخر ناپید ہو جاتی ہے۔ فتدبر۔

اس سلسلے میں ابھی ہمیں بہت کچھ لکھنا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت نفس خط کے متعلق تو ابھی کچھ لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ بہرحال رفتہ رفتہ وہ سب خیالات بھی اسی سلسلے میں حوالہ قلم کر دیے جائیں گے جو مسلمانان ہندستان کی اجتماعی فلاح و بہبود کے متعلق ہمارے ذہن میں راسخ ہیں۔ اور اگرچہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اسکی توقع نہیں کہ ان خیالات سے کوئی مفید نتیجہ مرتب ہوگا یا ہمارے برادران دینی اُنپر توجہ کرینگے۔ تاہم یہ کیا کم ہوگا کہ اس طریقے پر ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

نظرے خوش گزرے

مئی کے پرچے میں مسٹر محمد علی کے خط کی وجہ سے متعدد لکھے ہوئے اجزا ردکنا پڑے۔ اس دفعہ بھی اس خط کے تبصرے نے کافی جگہ روکی ہے تاہم مختصراً اُن خیالات کا اعادہ کیا جاتا ہے جو پہلے کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے تھے۔

سب سے پہلے تو ہم اُن دو بزرگوں کی وفات پر اظہارِ افسوس و ہمدردی کرتے ہیں جو اپریل کے مہینے میں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ مولوی سید کرامت حسین مرحوم سابق جج ہائیکورٹ الہ آباد اپنے علم و فضل اور غیر معمولی ایثار کی وجہ سے ہندوستان کے مایۂ ناز فرزندوں میں سے تھے۔ اور اس زمانہ میں جو چیز عام طور پر مفقود ہوتی جاتی ہے وہ اُن میں پورے طور پر نمایاں تھی یعنی پاکیزہ سیرتی اور یک رنگی۔ فلسفے سے انھیں خاص ذوق تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُن کی زندگی حکیمانہ سادگی اور نظامِ اوقات کی ترتیب کا قابلِ تقلید نمونہ بنی ہوئی تھی۔ اُن کی تصانیف بھی فلسفیانہ خشکی اور عسیر الفہمی کا نمونہ تھیں جسکی وجہ سے اس زمانے میں اُنکی زیادہ قدر نہیں ہوئی۔ تعلیم نسواں کی توسیع و ترقی سے اُن کو بہت انہماک رہا۔ چنانچہ اپنے تمام سرمایہ کو جو ساری عمر نہایت جُزرسی اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرکے اُنھوں نے جمع کیا تھا اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا۔ لکھنؤ کا اسلامی زنانہ مدرسہ انھیں کے ایثار سے قائم ہوا ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اُسے اُن کی یادگار رکھکر پوری کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلاتے رہیں۔

مسلمانانِ ہندوستان نہایت بدنصیب ہیں کہ اُن میں جو اچھے تھے وہ ایک ایک کرکے اُٹھ گئے اور اُٹھتے جاتے ہیں اور اُن کے جانشین ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس زبانی نظموں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

غنیمت ہے کہ مُسلم گرل اسکول کی نظامت ایک ایسے بزرگ کے سپرد ہوئی ہے جو مرحوم کی

بعض خصوصیات بھی رکھتے ہیں اور ہماری قوم کے بہترین افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب سابق ڈپٹی کمشنر برار و رکن عدالت العالیہ حیدرآباد کی سادہ زندگی۔ گھڑی سے زیادہ پابندیٔ وقت سچائی اور نیک نفسی مشہور خاص و عام ہے۔ اور اگرچہ بعض باتوں میں جادۂ اعتدال سے گزر جانے کے کے باعث اُنکی قوت نفع رسانی کم ہوگئی ہے، تاہم بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ دُنیادار مسلمانوں میں بہترین شخص ہیں۔ اور جو خوبیاں اُن میں پائی جاتی ہیں دوسرے تو اُن سے بھی بے بہرہ ہیں۔

مولوی کرامت حسین صاحب کی خشک تحریریں مقبول نہیں ہوئیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو زبان کی توسیع و ترقی میں اُنھوں نے کافی حصہ لیا۔ چنانچہ اکثر علمی اصطلاحات جو اُنکی وضع کردہ ہیں رائج ہوگئی ہیں اور آیندہ رائج ہوتی جائیں گی۔

انجمن ترقی اُردو کی سال گذشتہ کی رپورٹ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "سید صاحب نے ایک بے نظیر کتاب "المرأۃ" تحریر فرمائی ہے جو فرقۂ اناث کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا خزانہ یا انسائیکلوپیڈیا ہوگی" اور "اُنھوں نے یہ بیش بہا کتاب انجمن کو عنایت فرمائی ہے"۔ معلوم نہیں اُنکے ورثا اب اسکو جائز رکھیں گے یا نہیں، کہ انجمن ترقی اُردو اس لاجواب کتاب کو شائع کرے۔

مرزا محمد جعفر اوجؔ لکھنوی، جو مرزا دبیرؔ مرحوم کے خلف و نشانی تھے اُنھوں نے بھی اسی اپریل میں انتقال کیا۔ ابھی عارفؔ صاحب کی وفات کا داغ تازہ تھا کہ شاعرانِ لکھنؤ کو یہ دوسرا دھکا پہنچا۔ مرزا اوجؔ مرثیہ گوئی میں اس وقت اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اور اس ورثۂ آبائی کے مالک واحد ہونے کے علاوہ خوش خلقی۔ انکسار۔ مروت۔ سیر چشمی اور عالی ظرفی میں وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

گذشتہ چند سالوں سے محسنینِ اُردو کی مفارقت کا تار بندھ گیا ہے۔ اور اب صرف چند نفوس اُس دَور کے اور باقی رہ گئے ہیں جو غدر کے بعد سے اس وقت تک زبانِ اُردو کے مسلم اُستاد سمجھے جاتے تھے۔

ہمارے دوست ملا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" دہلی نے ازراہِ لطف ایک جلد

"شام زندگی" کی ہمیں بغرض ریویو بھیجی ہے۔ یہ کتاب مولانا راشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے اور گویا "صبح زندگی" کا تتمہ۔ مولانا راشد الخیری کا انشا پردازانہ کمال کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں۔ جو لوگ اُن کے رنگ کو نہیں بھی پسند کرتے وہ بھی اُن کے کمال کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ اور یہ کتاب غالباً اُن کی سب کتابوں سے بلحاظ انشا پردازی کے افضل ہے۔

'شام زندگی' لکھی تو گئی ہے مخصوص عورتوں کے لیے، لیکن اپنی دلکشی اور سبق آموزی کے سبب سے عورتوں اور مردوں دونوں کے مطالعہ کے قابل ہے۔ اور بعض مقامات تو ایسے موثر پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ بہت سے سخت دل مرد بھی غالباً متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کتاب کی قیمت عمہ ہے۔ اور دفتر نظام المشائخ دہلی یا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کرنے پر ملے گی۔

مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین نے اپنی تازہ تصنیف "ارض القرآن" کا ایک نسخہ ہمیں ارسال فرمایا ہے۔ اس کتاب پر مفصل ریویو آیندہ نمبر میں لکھا جائے گا، سردست ناظرین الناظر کی اطلاع کے واسطے یہ سطور لکھ دی گئی ہیں۔ کتاب کی قیمت عہ، مجلد عہر ہے اور دارالمصنفین اعظم گڈھ یا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کرنے پر ملے گی۔

منشی مہادیو پرشاد ورما تاجر کتب امین آباد لکھنؤ نے جو ناولوں کی اشاعت کے لیے مخصوص و مشہور ہیں، مندرجہ ذیل کتابیں ہمیں عنایت کی ہیں:—

جرمن جاسوس۔ قیمت عہ؍ بحری جنگ۔ قیمت ۸؍ محاصرۂ درۂ دانیال قیمت ۸؍

یہ کتابیں الناظر بک ایجنسی سے بھی ملتی ہیں۔

رسالہ "تمدن" جو پہلے دہلی سے نکلتا تھا اور اب لکھنؤ ہی سے شایع ہوتا ہے۔ اسکے جون نمبر میں شمس العلما مولانا ذکاء اللہ مرحوم کے دو مضامین "اقلیدس کی فاتحہ" اور "آفتاب" چھپے ہیں جن کے متعلق ایڈیٹر تمدن

نے حسب ذیل نوٹ بھی شایع کیا ہے :-

"یہ مضامین جناب مولوی محمد حسین صاحب محوی نے شمس العلما مولانا ذکاء اللہ مرحوم دہلوی کے قلمی غیر مطبوعہ مسودہ سے جو تبرکاً آپ کے پاس محفوظ ہے ہم کو مرحمت فرمائے ہیں جس کے لیے ہم جناب محوی کا شکریہ ادا کرتے ہیں"

اڈیٹر صاحب تمدن ہمارے کرم فرما ہیں اور منشی محمد حسین محوی دو سال سے زائد دفتر الناظر میں کام کرتے رہے ہیں، اس وجہ سے دونوں میں سے کسی کو ناراض یا نادم کرنا مقصود نہیں۔ لیکن اس حقیقت کو ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین مولانا ذکاء اللہ مرحوم نے اپنے انتقال سے کچھ ہی دنوں قبل ہمیں بھیجے تھے ـــ مگر بسبب اس کے کہ چٹھی کے کرسے گریا ٹٹ پیپر پر لکھے ہوے تھے خطوط میں مخلوط ہوگئے اور بہت دنوں بعد ہاتھ لگے۔ چنانچہ الناظر بابت مارچ و اپریل ۱۹۱۲ء میں یکے بعد دیگرے ہر دو مضمون شایع ہو چکے ہیں ـــ یہی مسودہ ہے جس سے اڈیٹر تمدن کو نقل پہنچی ہے، مگر وہ غیر مطبوعہ نہیں ہے۔

حضرت تاجور اڈیٹر مخزن نے الناظر کی اس غلطی پر توجہ دلائی ہے کہ نواب وقارالملک مرحوم کے انتقال کی خبر لکھتے ہوے

قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون

سرخی قرار دی گئی۔ اگرچہ ممکن ہے کہ قالوا کے جواز کے لیے کوئی تاویل پیش کردی جائے۔ مگر ہم اعتراف تقصیر کو تاویل سے بہتر جانتے ہیں اور اپنے کرم فرما کے شکر گزار ہیں۔

"بدسرشت" کی اشاعت بطور ضمیمۂ الناظر سردست بوجوہ ملتوی کردی گئی ہے اور شاید آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری نہ کیا جا سکے گا۔ تاہم کتابی صورت میں جس وقت شایع ہوگا ناظرین کو اطلاع دی جائے گی ـــ زود پشیماں تیار ہے اور جلد شایع ہوسکے گا۔ قیمت ۸؍

مولوی ابوالحسن فریدآبادی
- علم السیاست
- تاریخ مصر جدید

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس
- اقصائے مغرب

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ
- حیات جامی ۸ر
- علوم عرب
- خواتین

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ با تصویر
- بلا تصویر
- روزنامچہ ۸ر
- تسخیر مہر و قمر ۸ر
- رسول کی بیٹی ۲ر
- پیاری ہتکڑی ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۱۰ر
- گاما خاتون ۲ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا
- شمع و شاعر
- بلال ۱ر
- شکوہ ۲ر
- جواب شکوہ
- نالۂ یتیم
- فریاد امت

مولانا عمادی
- کتاب المعارف
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث ۸ر
- صناعۃ العرب ۳ر

مولوی ظفر علیخاں
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- معاشرت ۲ر
- جنگ روس و جاپان
- فلسفہ ابن سینا
- اپریل فول

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ
- المدنیۃ والاسلام

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر
- وکیل نسواں

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابوالبشر
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- قوت خیال
- اصول خانہ داری ۱۲ر

پروفیسر نواب علی
- تذکرۃ المصطفیٰ
- معارج الدین

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المسلمین ۸ر
- سیاحۃ الاخلاق ۶ر
- تنقید لطیف ۵ر
- تربیت اولاد

شفق عمادپوری
- تحقیق سخن ۸ر
- غنچۂ نوبہار ۶ر
- آئنۂ المعانی
- حدیقۂ آخرت
- آئینۂ پیغمبر ۱ر
- ریاض شفق
- ثمرۂ عقیدت ۲ر

مولوی مصباح الدین
- الہارون
- محاربۂ فرانس و پرشیا
- مصباح الطالب ۸ر

حکیم محمد علیخاں
- عبرت (کامل)
- حسن سرو (ر)
- دیول دیوی
- گورا
- منزل کا ساتھ
- جعفر و عباسہ
- اختر و حسینہ کامل
- سماے عالم ۸ر

منشی پریم چند
- پریم پچیسی ۱۲ر
- سیر درویش ۳ر

لالہ سری رام
- خمخانۂ جاوید ۲ جلد

منشی سعید احمد
- حیات خسرو ۱۲ر
- حیات صالح

مولوی معین الدین
- نپولین اعظم کامل
- اورنگ زیب
- بدمزاج شوہر ۱ر
- زلفا بیگم ۱ر

سید ابراہیم
- جاپان ۸ر
- جنگ روس و جاپان ۸ر

مہاشے پرکاشدیو
- حضرت محمد صلعم ۵ر
- مہاتما بدھ
- خدا اور روح
- نازنین لوفقر ۸ر
- سیرۃ المستورات
- بچوں کی کہانیاں ۱۲ر

حسرت موہانی
- شرح غالب
- دیوان حسرت ۱۲ر
- تذکرۃ الشعرا

ارشد تھانوی
- حسن تخیل ۱۲ر
- بیاض ارشد ۸ر

حسن الدین خاموش
- جمیلہ خاتون ۳ر
- قومی گیت
- زنانہ خطوط
- لاڈلا بیٹا ۳ر
- اصلاح الرسوم ۲ر
- حوران جنت ۴ر
- رفیق مرزا ۴ر
- ناصح مشفق ۳ر

سید رفیع موہانی
- تاج و نشان
- دستار و کلاہ ۸ر
- تاج ثانیات

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۹ جلد ۷ — یکم جولائی سنہ ۱۹۱۷ء

سینی لائن

خونی بواسیر اور خون بند کرنے کی دوا

یہ خوشبودار بے ذائقہ دوا چند بوٹیوں سے بنی ہے اور خون بند کرنے میں بے مثل ہے۔ ناک سے خون جاتا ہو تو تھوڑا سا یہ عرق سونگھ لینے سے اُسیوقت بند ہو جاتا ہے۔ مسوڑوں سے اگر خون جاری ہو تو ساوی مقدار سے گرم پانی میں عرق ملاکر روز کلی کرنے سے مسوڑے سخت ہو جاتے ہیں اور خون بند ہو جاتا ہے۔ منہ کے راستے یا بلغم کے ساتھ خون جاتا ہو تو اس دوا کے پینے سے بند ہو جاتا ہے عورتوں کے پردر کی بیماری میں یا حمل کی حالت میں خون جاتا ہو تو اس دوا کے استعمال کرنے سے فوراً ہی آرام ہو جاتا ہے۔

خونی بواسیر

اس دوا کے کھانے اور پچکاری لینے سے رگیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور مرض جڑ سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے۔ پچکاری کا پانچ ۱۲؍ محصولڈاک چھ آنہ اور آٹھ آنہ۔

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی جلدی بیماری کی دوا

یہ تیل کئی ایک دیسی مفید اور ولایتی استعمال کی تجربہ کی ہوئی دوائیوں سے بنایا گیا ہے اس سے ہر اقسام کی جلدی بیماری یعنی چمڑے کا مرض مثلاً خارش۔ کھجلی۔ چھاجن اپرس وغیرہ رفع ہوتے ہیں۔ برص سے خراب ہوئے چمڑے میں یہ اچھا فائدہ دکھاتا ہے۔ چمڑے کی بیماری سے اکثر خون میں بھی نقص آجاتا ہے۔ اس حالت میں یہ تیل لگانے سے پورا نفع نہیں ہوتا ہے اسوجہ سے تیل لگانے کے ساتھ ہی خون صاف کرنے والی دوا ایڈورڈ انیرڈ سالسا بھی حسب ہدایت استعمال کرنا چاہیے۔ قیمت فی شیشی ۱۰؍ محصولڈاک ایک سے چار تک ۵؍ سالسہ قیمت ۱؍ محصول ۶؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۷ جلد ۹ یکم جولائی سنہ ۱۹۱۰ء

فلسفۂ سعدی

سعدی علیہ الرحمہ کی شہرت نہ صرف ایشیائی ممالک میں ہی ہے بلکہ یورپ کے ملکوں ور اقوام میں بھی ہے۔ فرنچ، انگلش، اور دیگر یورپین زبانوں میں بھی گلستاں کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اسے اہلِ یورپ نے پوری عزت کی نگاہوں سے دیکھا ہے، یا یوں کہو کہ گلستاں یورپ میں بھی بہت کچھ خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔

سعدی نرا شاعر ہی نہیں تھا بلکہ ایک شہرت یافتہ ادیب و نثار بھی تھا۔ اگرچہ اکثر مصنفین نے زور مارے مگر گلستاں بوستاں کا جواب نہ ہو سکا یا اگر کوئی کسی حد تک کامیاب بھی ہوا تو سعدی سے سبقت نہ لے جا سکا۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سعدی علیہ الرحمہ کی ادبی خوبیوں اور ادبی کمالات تک کوئی اور پہنچ نہیں سکتا، ہاں یہ ضرور کہیں گے کہ حضرت سعدی علیہ الرحمہ کی ادبی خدمات کا پلہ بہت بھاری اور وزنی ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ نظم اور نثر دونوں میں فلسفی مزاج رکھتے ہیں۔ حضرت موصوف کی تصنیفات

نظم اور نثر کے دیکھنے سے پتہ لگ سکتا ہے کہ اُنکی طبیعت کہاں تک فلسفی تھی اور ساتھ ہی یہ کہ سعدی علیہ الرحمہ کی ہر رائے اور ہر خیال ماسوائے ادبی خوبیوں اور ادبی کمالات رکھنے کے عملی فلسفہ کا ایک روشن نمونہ ہوتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ باتونی ناظم یا باتونی ناثر نہیں تھے بلکہ اُس بات کے واعظ اور منادی تھے جو عملی اور پریکٹیکل تھی۔ گلستان اگر ذرا غور سے پڑھی جائے تو ہر نازک نگاہ رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُسکے فقرے فقرے میں فلاسفی بھری ہوئی ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ صرف ایک ہی رنگ کی فلسفی نہیں بلکہ گوناگوں اور متنوع۔ اور پھر اس سلاست اور صفائی کے ساتھ کہ کوئی اُلجھن باقی ہی نہیں رہتی اور اس قسم کی عاقلانہ رنگ رکھنے والی کہ اُسکے آگے بعض فلسفیاں کوئی قیمت ہی نہیں رکھتیں۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ صحیح معنوں میں شاعر تھے۔ کیونکہ اصل شاعر وہی ہے جسکے کلام میں فلسفے کی جھلک ہو۔ اگرچہ شاعری بجائے خود بھی ایک فلسفی ہی ہے۔ یا یہ کہ شاعر ہی فلاسفر بھی ہوتا ہے۔ مگر حضرت سعدی علیہ الرحمہ کی شاعری میں باعتبار فلسفیانہ رنگ کے کچھ اور ہی لطف و جامعیت ہے۔

حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے فلسفے پر جو اُنکے کلام نظم اور نثر میں پایا جاتا ہے فرداً فرداً لکھنے والے بہت کچھ لکھ سکتے ہیں اور اگر فلسفۂ سعدی کی تنقید کی جائے تو یہ ثابت ہو کر رہے گا کہ اُنکا فلسفہ عملی پہلو سے دنیا کے اُن فلسفوں میں سے ہے کہ جو صحیح فلسفہ کہا جا سکتا ہے اور اُس میں ایک یہ بھی خصوصیت اور لطف ہے کہ سعدی کا فلسفہ حدودِ فطرت سے باہر نہیں رہتا اور نہ کوئی صحیح فطرت اُسکی تردید اور اُسکا مقابلہ کرتی ہے۔ اگرچہ بعض فلسفیوں سے سعدی پر کبھی کبھی اعتراض بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً

اگر شہ روز را گوید شب است ایں　　　بباید گفت اینک ماہ و پروین

یا۔ "دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز"۔ وغیرہ وغیرہ اقوال۔

یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت سعدی کا کلام کوئی الہامی کلام ہے جو اسقام سے معرّا اور مبرّا ہے۔ آخر حضرت سعدی بھی ایک انسان ہی تھے وہ بھی ایک اجتہادی رکھتے تھے۔ مگر جب اس قسم کے اقوال کو بھی بنظرِ غور پڑھا اور سُنا جاتا ہے تو اُن میں بھی کوئی نہ کوئی نیک درجہ فلسفی ہی نکلتی ہے

مثلاً اسی ایک بیت کو لیجیے۔

اگر شہ روز را گوید شب ست ایں   باید گفت اینک ماہ و پروین

بظاہر تو اس میں یہ نقص نظر آتا ہے کہ اس طریقِ عمل سے صداقت اور آزادی رائے کا خون ہوتا ہے اور انسان کی اپنی رائے کوئی نہیں رہتی، جو فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن اس اعتراض اور نکتہ چینی کے ساتھ یہ بھی آپ نے سوچ لیا ہے کہ اس سے درحقیقت حضرت ممدوح کا منشا کیا ہے اور دنیا میں اس وقت عمل کیا ہے؟ اگر ہم غور کر کے یا اعتراض کرتے تو شاید اعتراض کا یہ وزن نہ رہتا۔

سچ سچ اس شعر سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ کوئی مقتدر آدمی کہے اُسکی خواہ مخواہ تائید ہی کیے جاؤ، بلکہ یہ کہ یہ اعتبار اداب سیاسیات یا قیود سیاسیات کے لازم ہے کہ جو کچھ سلاطین کی بارگاہ میں عرض کیا جائے مؤدبانہ ہو اور اس ڈھنگ سے کہ جو اُنکے شایانِ شان ہو۔ ہر مقامے و ہر نکتہ۔ ایسا نہ ہو کہ آداب متعلقہ چھوڑ کر گفتگو شروع کی جاوے۔ تائید اور تردید اس نہج پر ہو جو مؤدبانہ مؤقفانہ پہلو رکھتی ہو۔ بعض وقت فوری صداقت بے ادبی میں شمار ہو کر معاملات کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے اور بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

شاعر ایک مؤدبانہ طریق کو اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے ورنہ اُسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ سچ مچ ہی صداقت کا خون کر دیا جائے۔

اور واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اگر کسی وقت کوئی بادشاہ یا کوئی اور مقتدر نازک مزاج شخص کوئی بات دُور از صداقت کہے تو موقعہ تاڑ کر جواب دیا جائے۔ اگر اُس وقت خاموشی مناسب ہو تو کسی اور وقت کے انتظار میں جواب نہ دیا جائے۔ اور اگر کسی مناسب تاویل سے کام چل سکے تو وہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

ذرا اس زمانے کی مجلسوں اور درباروں میں بھی جا کر دیکھو کہ کیسی کیفیت اور کیسی روش ہے آپ اخیر یہ کہہ اُٹھیں گے کہ اسکی ضرورت تو بہت دفعہ پڑتی ہے۔ اس زمانے میں بھی بعض اوقات شخصِ مقتدر کے نائبین کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے مقتدر نائبین جو بعض اوقات حضور حضور،

سر بسر، جناب نواب اور قبلۂ قبلہ کہتے کہتے دوہرے ہوئے جاتے ہیں اور اُدھر ایک تھوڑی سی بیزاری اور کدورت پر لبوں پر پپڑیاں بندھ جاتی ہیں۔ اسکی وجہ؟ یہی کہ بادشاہوں، وزیروں اور دیگر درجہ بدرجہ مقتدروں کی راؤں اور خیالات کا فوری جواب خوش آیند نہیں ہوتا اور یہ خوف رہتا ہے کہ بمصداق "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند" کوئی اور اُلجھن نہ پڑے۔ جب کسی صحیح جواب پر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ

"ہمارا ایسا ہی حکم ہے۔
"ہم ایسا ہی مناسب جانتے ہیں۔
"حکم میں کوئی دخل نہیں دیا جا سکتا۔
"جو کہا جاتا ہے وہی مانو۔
"بے ادب نہ بنو۔

تو اُس کا مطلب سوائے اسکے اور کیا ہوتا ہے؟

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

لوگ روز ایسا دیکھتے ہیں اور نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ خود بھی ایسی باتوں کو کم و بیش تختۂ مشق رکھتے ہیں۔ اور پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ سعدی کا فلسفہ صحیح نہیں۔

حکم ماننا اُس صورت میں کہ وہ اپنے منشا کے خلاف ہو اس فلسفۂ سعدی پر عمل کرنا ہے ایک مقتدر طاقت حکم دیتی ہے کہ ایسا کرو یا ایسا بجا لاؤ۔ اور دوسرا شخص اُسکی غلطی پر آگاہ ہے یا اُسے غلط جانتا ہے اور پھر یہی کہے جاتا ہے کہ ہاں حضور درست فرماتے ہیں یا حضور کا حکم درست ہے اس میں کوئی نقص نہیں۔ حالانکہ دل میں اعتراض کرتا ہے۔ فرمائیے یہ کیا ہوا؟ جو اعتراض شیخ سعدی علیہ الرحمہ پر ہوتا ہے وہی ہمارے رویے اور عمل پر بھی صادق آتا اور وارد ہوتا ہے۔ ہم رات دن وہی کر رہے ہیں جو شیخ سعدی نے کہا ہے اور خصوص اس آزادی کے زمانے میں جو دنیا کی تاریخ میں ایک خصوصیت رکھتا ہے۔

بے شک بہت سے لوگ اس کمزوری سے بری بھی ہوں گے، مگر کثرت اُنھیں لوگوں کی ہے جو اس بیت میں مزعوم ہیں۔ جب ایک شخص خوشامد کی راہ سے ہاں ہاں کہے جاتا ہے یا غمازی سے مقتدر لوگوں کو خوش کرتا ہے وہ اور کیا کرتا ہے اسی شعر سعدی پر تو عمل کرتا ہے اور اُسی پر تو یہ صادق آتا ہے۔ اس شعر میں ایک یہ بھی لطف ہے کہ ایسے لوگوں کی تصدیق اور تائید کرکے خود اُس تصدیق اور تائید ہی سے اُن کی تردید کی جائے۔ مثلاً جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ دھوپ کیسی خوش آیند اور سرد ہے۔ تو ایک دوسرا شخص تعطفاً جواب میں یہ کہتا ہے ہاں حضور یہی بات ہے۔ اگر گوینده کچھ فراست اور عقل رکھتا ہے تو اس جواب سے سمجھ جاوے گا کہ یہ کہ میری تضحیک کی گئی ہے اور تجاہلِ عارفانہ سے مجھے جھٹلایا گیا ہے۔

حضرت سعدی فرماتے ہیں کہ مودبانہ پہلو سے تم تصدیق اور تائید تو کردو لیکن اس تمہاری تصدیق سے گوینده خود ہی سمجھ جاوے گا کہ فی الواقع بات تو یہ نہیں محض میری تضحیک ہے مثلاً اگر ایک سیاہ فام شخص کو کوئی دوسرا مذمت سے یا کسی اور وجہ سے یہ کہے کہ آپ تو بڑے ہی گورے ہیں اور آپ ایسے اور ایسے۔ تو اس صورت میں سیاہ فام خود ہی شرمندہ ہوگا۔ ہم بعض اوقات صرف چند دقتوں اور صعوبتوں کی وجہ سے ایک مقتدر یا جابر کے اقوال کی تائید اور تصدیق کرتے ہیں۔ اور ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے۔ بایں حالات ہمارا فعل یا قول مجبورانہ ہوتا ہے اور ایسا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک تصدیق ہی ہوتی ہے۔ اور یہی بات اس شعر سعدی میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس فلسفۂ سعدی کے متعلق ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کے عمل اور روش کو دیکھیں اگر وہ کسی نہ کسی رنگ میں اسکی تائید اور تصدیق کرتا ہے تو یہ ایک صحیح رسلے ہے اور اگر تصدیق و تائید نہیں کرتا تو پھر دوسری بات ہے۔ سعدی یہ نہیں کہتے کہ ضرور تم اپنی آزادیِ رلے کا خون کرو بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ موقعہ دیکھ کر گفتگو کرو اور عرض ادب ملحوظ رکھو۔

ایک اور موقعہ پر سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

ہر کرا جامہ پارسا بینی پارسا داں و نیک مرد انگار

در نداند کہ در نہانش چیست   محتسب را درونِ خانہ چہ کار

یہ وہ اخلاقی فلسفہ ہے جس پر دُنیا اور انسانی جماعتوں کی بہبود و امن کا مدار ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو بہت کچھ خوبیاں اور حکمت رکھتا ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کی دفعات بہت کچھ جامع اور ضروری ہیں۔

اس فلسفے سے اُن حاسدانہ بدظنیوں کا سدِّباب ہوتا ہے جن سے زندگیاں وبال میں پڑ جاتی ہیں۔ انسان دو قسم کی کیفیات رکھتا ہے

(۱) ظاہری

(۲) باطنی

انسان کی پہلی نظر پہلی نمود پر ہی پڑتی ہیں۔ اور ظواہر ہی سے انسان کی رائے قائم ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص ظاہر میں ستھرا شین ہو تو اُس کے باطن پر خیال نہیں کیا جاتا۔ اُسی پر حکم لگایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ باطن میں کیسا ہی ہو۔ حضرت سعدی علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے ہیں جسے بظاہر نیک دیکھو اُسے نیک ہی سمجھو۔ اگرچہ تم اُسکے باطن سے ناواقف ہو۔

جس طرح ایک کوتوال یا پولیس ظواہر ہی سے بازپُرس کرتی ہے اسی طرح ہمارا بھی فرض ہے کہ ظواہر ہی سے استدلال کریں۔ ہمارا یہ کام نہیں کہ باطن کی تلاش میں ظواہر کو جواب دیں اور خواہ مخواہ ایک جھگڑے میں پڑیں۔

جُرم اور گناہ اُس صورت میں قوانین سیاسیہ کی بازپُرس کے قابل ہوتا ہے جب وہ ظاہر اور ثابت ہو جائے۔ باطنی گناہوں اور کمزوریوں کی بازپرس خدا کے متعلق ہے۔ ہم ظواہر ہی کے نگراں ہو سکتے ہیں اور ظواہر پر ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

محتسب را درونِ خانہ چہ کار

بے شک، باطن خراب فی نفسہ ایک سخت نحوست اور خرابی ہے مگر جب ہمیں اُس کا علم ہی نہیں تو ہم اُسکی نسبت کیا کچھ کہہ سکتے ہیں اور کس طرح اُس پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں؟ اگر

ہم ایسا کریں تو یہ ایک ایسا فعل ہوگا کہ جس میں بہت کچھ غلطیاں نکلیں گی اور ایسی بدظنیاں ہمیں تمدنی پہلو سے بہت کچھ تکلیف میں ڈالیں گی اور ہم آرام سے زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔

مناسب طریقہ یہی ہے کہ ہم ظواہر کے مطابق رائے قائم کریں۔ قانون اور شرعیت ظاہر ہے باطن کا خدا حافظ۔

خواہ مخواہ کریدتے پھرنا اور مین میکھ نکالنا ہماری زندگیوں کو ایک بال میں ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ ہم خود بھی تکلیف میں پڑتے ہیں اور دوسروں کو بھی ایک ضغطے میں ڈالتے ہیں۔ حسن ظنی وہ حقیقتاً وہ جادو ہے جو دنیا میں بہت کچھ امن قائم رکھنے کی کفالت لیتا ہے جہاں حسن ظن ہے اور اس کا زور ہے وہاں شر و فساد کی بہت کم نوبت آتی ہے اور زندگیاں ایک آرام سے گزرتی ہیں۔ جہاں حسن ظنی نہیں وہاں باوجود ایک قسم کی فارغ البالی کے بھی ضغطہ ہی رہتا ہے۔

ظن المومنین خیرا کی فلسفی پر حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے یہ کہا ہے کہ ظواہر پر ہی عموماً فیصلہ کرو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فریب دہ ظواہر پر بھی یقین اور اعتماد کیا جاوے مطلب یہ ہے کہ احتیاطی پہلو مدنظر رکھ کر ظواہر پر فیصلہ کیا جائے۔

اگر عملی رنگ میں ظواہر کی کیفیت فریب دہ ثابت ہو تو مزید غور سے دیکھا جاوے کہ اصلیت کیا ہے۔ فطرت اگرچہ بعض وقت سخت پردوں میں ہوتی ہے مگر معاملات کے معیار سے اس کا پتہ بھی لگ جاتا ہے۔

معاملہ ہی فطرت کی کسوٹی ہے اور اس سے بہت کچھ پتہ لگتا ہے۔ معاملہ ظاہر ہے اور عمل عیاں۔ باطن پر بھی یہی روشن شہادت ہے۔ بشرہ اندرونی خیالات کا بہت کچھ مخبر ہے۔ اور عمل اس سے بھی بڑھ کر۔

جو لوگ درونِ خانہ جاتے اور پردہ فاش کرتے ہیں وہ بیجا دست اندازی کرتے ہیں اور نامناسب طریق سے کام لیتے ہیں۔ قدرت نے جو باطن کا سلسلہ اس واسطے رکھا ہے

کہ لوگ اندرونی بھیدوں سے بمشکل واقف ہوسکیں۔

قدرت بیجا نکتہ چینی کے رنگ میں تفحص اور تجسس کو روکتی ہے اور اخلاق بھی اس کا مانع ہے۔ بمصداق اِجتنبوا کثیراً من الظن۔

سُلطان احمدؔ (جہلم)

اعزازِ نفس

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

سُرخی میں نہیں دستِ حنا بستہ بھی کچھ کم
پر شوخیِ خونِ شہدا میرے لیے ہے

راحل ہوں سلمان [illegible] نعرۂ تکبیر
یہ قافلہ یہ بانگِ درا میرے لیے ہے

کیوں جان نہ دوں غم سے ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لیے ہے

[illegible] بہشتی کی طرف سے ہے بلاوا
لبیک کہ مقتل کا صلا میرے لیے ہے

ہوں کیوں نہ فدا ایسے نبیؐ پر کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب اہلِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہے ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت
پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے

ہیں یوں تو فدا ابرِ سیہ پہ سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

"مجاہد"

قرض و مقراض

ضرورت کے وقت ایک حاجتمند کو نقد یا جنس جو کچھ بوعدہ واپسی کچھ مدت کے لیے دیا جائے قرض کہا جاتا ہے! قرض کی دو قسمیں ہیں: داد و ستد کے نقطۂ نظر سے، اور کاروباری اصول پر، جو کچھ دیا جائے قرض ہے۔ لیکن امداد کے خیال سے، اور محبت کے اصول پر جو کچھ دیا جائے مقراض ہے!

اگر آپ کسی دوست کو قرض دیتے ہیں تو دوہرا خطرہ پیدا کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ روپیہ کھودینے کا خطرہ، اور دوست کھودینے کا خطرہ! ننانوے فی صدی دونوں ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں: "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم * نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے"!

اگر آپ دوست پر تقاضہ نہ کریں جب بھی وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے شرمائے گا: اور اگر کریں تو گویا ہمیشہ کے لیے اُسے کھودیا، تقاضے کا نام آتے ہی وہ چراغ پا ہوجائے گا!

ایک دوست کی امداد آپ شوق سے کریں مگر اسی قدر رقم کے ساتھ اُسے ممنون بنائیں جسکے ضائع ہوجانے کا آپ کو کبھی احساس نہ ہو: آپ دوست کی مدد کرسکتے ہیں مگر لِلّٰہ قرض نہ دیجئے! آپکی زبان پر اُس رقم کا نام آیا کہ اُس کو صدمہ ہوا۔ قرض لینے والے اکثر رقیق القلب ہوا کرتے ہیں۔ آپ گویا قرض دے کر اُسے عجیب کشمکش میں مبتلا کردیتے ہیں، اُسے اپنی نگاہ میں ذلیل کردیتے ہیں؛ اور وہ فطرتًا اس کو محسوس کرتا ہے! اگر آپ تقاضاے شدید کو کام میں لائیں گے تو یقین رکھیے آپ اُس کی ہتک عزت کریں گے!!

ایک دوست قرض لیکر آپ کا ممنونِ منت ہوسکتا ہے مگر محض اس شرط پر کہ آپ اُس کی واپسی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں! اگر آپ وہ رقم کسی طرح واپس پالیتے ہیں تو اُسکو یہ خیال نہیں ہوتا کہ آپ نے کوئی احسان کیا تھا۔ وہ اُسکو احسان سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے! جو کوئی دوست کو قرض دیکر

ادائیگی کی امید رکھتا ہے ایک ایسی حماقت کرتا ہے جس کو کوئی منطق فعل مناسب ثابت نہیں کر سکتی!

واقعہ یہ ہے کہ ایک قرضدار دوست اگر کبھی شاذونادر، دوست کی رقم جو اُس نے عین احتیاج میں قرض دی تھی واپس کرتا ہے تو اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ قرض دینے والا دوست اس ادائیگی پر خاص طور سے اُس کا ممنون ہو! فی الحقیقت دوست کو قرض دینا قرض نہیں ہے مقراض ہے!

قرض صرف وہی ہے جو بازاری اصول پر دیا جائے! داد وستد کی تجارت اُسی وقت بارآور ہوتی ہے جب قرض ۵، سے ۱۰۰ فی صدی سود تک کی شرح پر دیا جائے اور ضمانت میں رقم قرض سے پندرہ گنی مالیت آڑ میں رکھ لی جائے! اس اصول پر کاربند ہونے والے زندہ رہتے ہیں تو ہر قسم کی عزت اور خطابات پاتے ہیں اور مرتے ہیں تو اپنے بچوں کے مُنھ میں سونے کا چمچہ دے جاتے ہیں! اس اصول کے خلاف عامل ہونے والے زندگی بھر فاقے کرتے ہیں اور مرتے وقت اُنکے گور و کفن کے لیے چندے کی ضرورت ہوتی ہے!

عام طور پر قرض لینے والے دو طرح کے ہوتے ہیں:- ایک وہ جو قرض لیکر ادا کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے، اور ایک وہ جو کیسے ہی اچھے ارادے رکھتے ہوں ادا نہیں کر سکتے مختصر یہ کہ ایک ادا نہیں کرتے، اور ایک ادا نہیں کر سکتے! غضب یہ ہے کہ تمام قرض لینے والے رقیق القلب اور زود رنج ہوتے ہیں۔ کسی کے دل دُکھنے سے قہرِ الٰہی کا احتمال علٰحدہ رہا!

تیسری قسم قرض لینے والوں کی ایک اور بھی بتائی جاتی ہے۔ یہ حضرات قرض لینے کو ایک نہایت معزز و آرام دِہ پیشہ سمجھتے ہیں: معزز تو اس وجہ سے کہ بڑے بڑے مہاجن قرض دینے کے وقت "نواب صاحب" سے خطاب کرتے ہیں اور آرام دِہ اس لحاظ سے کہ نفسلہٖ نہ کسی کی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ کسی خدمت کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے: ولّال اگر زندہ ہیں تو ہر طرح کا آرام گھر بیٹھے نصیب ہے! کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ روزرات کو "خدا ئے کھانے کو تو ّیا جاے کمانے کو" ورد کے طور پر پڑھا کرتے ہیں!

قرض لینے کی ضرورت اُس وقت محسوس ہوتی ہے جب انسان اپنی حاجتوں کو اپنے مال یا ہاتھ پاؤں سے پورا نہیں کر سکتا! ظاہر ہے کہ کسی کا حاجتمند ہونا قدرت کی وجہ سے ہے! جس کو خدا حاجتمند بنانا - یا - رکھنا چاہتا ہے اُسکی امداد کرنا، یعنی اُس کو حاجتمند نہ رہنے دینے کی کوشش کرنا - ایک فعل عبث ہے اور ایک حد تک مشیتِ ایزدی سے لڑنا ہے! گویا حاجتمند کو ہمدردی کے نقطۂ نگاہ سے یا امداد کے طور پر قرض دینا سوشیل گناہ ہے تو مذہبی گناہ بھی ہے! البتہ کاروباری اصول پر المضاعف ہو جانے والے سود کے ساتھ قرض دینا منشاے قدرت کے موافق ہے کیونکہ اس طرح جس تباہی میں قدرت اُسے رکھنا چاہتی ہے وہ جلد سے جلد آ جائیگی! اب آپ منشا سے عالمِ اسباب کے موافق کاربند ہونا چاہتے ہیں یا خلاف؟ غالباً حماقت کو آپ حماقت ہی سمجھتے ہوں گے!

ایک مہاجن کے قرض دینے کا رنگ مجھے عرصہ ہوا کہ نہایت پسند آیا تھا - وہ رؤسا اور متموّل حضرات کو ۵۰ فی صدی سود پر قرض دیتا تھا اور ہر مرتبہ قرض دینے کے وقت اپنے پہلے قرضے کا حساب بیباق کر لیتا تھا: مثلاً اُس نے ایک نواب صاحب کو دس ہزار قرض دیے تھے، دوبارہ اُن ہی نواب صاحب کو قرض دیتے وقت اپنا گزشتہ قرضہ مع سود - یعنی ۱۵ ہزار روپیہ وصول لیکر پانچ ہزار نقد اور دیے اور بیس ہزار کا تمسک اُسی شرح پر لکھوا لیا! دو تین دفعہ کے تبادلہ میں بیس پچیس ہزار کی رقم نہایت خوش معاملگی کے ساتھ سوچتے سوچتے ایک لاکھ بنجاتی ہے! قرض دینے کا یہ طریقہ بہترین طریقہ ہے اور تاریخ بھی ایسے قرضے کا وجود ثابت کرتی ہے! ٹرکی کو مدّت دراز سے یورپ اسی اصول پر قرضہ دیتا چلا آیا ہے: نتیجہ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو کسی مصری حسنا فہم سے دریافت کر لیجیے! ہمیں بھی بتانے میں کوئی حجت نہیں بشرطیکہ سنسر صاحب مدّ فیوضہ اجازت دیں!

مختصر یہ کہ قرض اگر تقاضاے فطرت کا لحاظ رکھ کر دیا جائے - اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب قرض کاروبار کے اصول پر دیا جائے - تو اُس کو قرض کہا جائے گا ورنہ اور کچھ! اَور کچھ میں مقراض محبت بھی شامل ہے اور حماقتِ محض بھی!

اس میں شک نہیں کہ کسی دوست سے اگر نہایت تہذیب کے ساتھ سلسلۂ ارتباط قطع کرنا ہو

تو بہترین ترکیب یہ ہے کہ اُسکو کچھ رقم قرض دے دی جائے! "القرض مقراض المحبت" میں نہ اگلے زمانے والوں کو شبہہ تھا اور نہ موجودہ زمانے والوں کو ہے!

مالدار کو قرض دینا - اور پچیس فی صدی سود کی شرح پر - ذکاوت و ذہانت ہے: مفلس کو قرض دینا ابلہی و حماقت ہے: اور دوست کو قرض دینا مقراضِ محبت ہے!!

سُلطان حیدر (جوش)

تغیر زمانہ

(ترجمہ از نظم سروجنی نائڈو صاحبہ)

ہم نے یہ مانا کہ دُنیا ہے پُر از رنج و ملال
ایک دن فصلِ بہاری سب کو کر دے گی بحال

صبحِ صادق آئے گی اور آکے پھیلائے گی نور
فصلِ گُل سے ہوں گے سب وارفتۂ عیش و سُرور

پھول گلشن کے بھُلا دیں گے غم و رنج و محن
آج جو کرتے ہیں ماتم کل وہ ہونگے خندہ زن

رنج کیوں کرتے ہیں دنیا میں یہی معمول ہیں
خار کے انبار جو ہیں آج وہ کل پھول ہیں

ہوں مصائب لاکھ دُنیا میں مگر پھر کیا کریں
اس سے کیا حاصل کہ دن بھر رات بھر رویا کریں

ایک ذلت ہی نہیں دنیا میں عزت بھی تو ہے
اک مصیبت ہی نہیں دنیا میں راحت بھی تو ہے

صبر لے دل صبر اس رونے سے کچھ حاصل نہیں
اس طرح پر وقت کو کھونے سے کچھ حاصل نہیں

کیا نتیجہ اس قدر رونے سے ہے زار و قطار
ہے مصیبت آج، کل راحت ملے گی بیشمار

باغِ دل میں حسرتیں جو جمع ہیں بُو کی طرح
کل بھریں گی چوکڑی صحرا کے آہو کی طرح

کل یہ ہوگی جانِ شاداں آج ہے جانِ حزیں
ایک حالت پر کبھی دنیا وفاؔ رہتی نہیں

وفاؔ شاگردِ جلیل

جنگی چالیں (یا) وار اسٹریٹجی

War Strategy

پہلا شخص جس نے جنگ کو سائنس کا رتبہ عطا کیا وہ جنرل جومینی تھا۔ ابتدا میں وہ نیپولین اعظم کے لشکر میں ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور تھا۔ نیپولین کے قید ہونے کے بعد اس نے سرکار روس میں ملازمت اختیار کر لی۔ جنرل موصوف نے اسٹریٹجی کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی ہے

"اسٹریٹجی ایک ہنر ہے جس سے میدانِ جنگ میں اقدام اور مراجعت دونوں حالتوں میں مناسب طریقے سے فوجوں کی کمان کی جاتی ہے"

ایک دوسرے ماہرِ جنگ کلازی ورٹز نے اسکی تعریف دوسرے پیرایئے میں یوں کی ہے

"اسٹریٹجی ایک نظریہ ہے جس سے متخاصمین جنگ کرتے ہیں"

فن سپہ گری کا آخری تاجدار، لشکرکشی کا متأخر پیشوا، اور علم القتال کا عالم متبحر، وان مالٹیک مانا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"اسٹریٹجی اُسکو کہتے ہیں کہ سپہ سالار افواج عام یا قائد سمجھ اور عقل کو کام میں لاکر بطریقِ مستحسن فوجوں کو لڑائے"

زبان انگریزی میں دو لفظ تذکراتِ جنگ میں اکثر استعمال ہوتے ہیں اور ان کے محل استعمال اور سمجھنے میں خفیف سا غلط مبحث ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کے معنی واضح نہیں ہونے پاتے۔ ایک لفظ اسٹریٹجی ہے اور دوسرا ٹیکٹکس Tactics ہے۔ انگریز محققین فن جنگ ہیلے و ہنڈرسن نے انکے معنی کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"فن اسٹریٹجی کا کام دشمن کو جنگ کرنے پر آمادہ کرنا ہے درحالیکہ ٹیکٹکس کا اطلاق اُن طریقوں اور داؤں پیچ پر ہوتا ہے جن سے ایک کمانڈر اپنے حریف پر جنگ شروع ہو جانے کی حالت میں غلبہ پاتا ہے
پس معلوم ہوا کہ اسٹریٹجی کی غایت زیادہ تر ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کی ہوتی ہے اور اس کا تعلق پورے

محاذ جنگ سے رہتا ہے۔"

موجودہ عالمگیر جنگ یورپ نے اس وار اسٹریٹجی کے نظریوں پر نہایت تابناک روشنی ڈالی ہے جن باتوں کو پیشتر شکست کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا اب ارضی تفوق کے باوجود اخلاقی تفوق کی نمائش کی داد دی جاتی ہے اور بغیر کسی معقول نقصان کے اپنے خطۂ فاع دشمن کے حوالے کر دینے کی قابلیت کی ثنا خوانی کی جاتی ہے اور اس کو ذرا بھی معیوب نہیں سمجھتے۔ ہزیمت خوردہ فوجیں دل ہار بیٹھتی ہیں بلکہ ایک یوم الفصل کا انتظار کرتی ہیں جس پر آخری فتح و شکست اور نصرت و خسران کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس وقت حقیقی اسٹریٹجی یہ ہوتی ہے کہ حریف کے مقابل جس قدر تعداد میں نبرد آزما مل سکیں کل محاذِ جنگ کو برقرار رکھتے ہوئے اُن کو ایک نقطے پر مجتمع کر کے اس خاص خط ہجوم سے ایسی ضرب کاری لگائی جاتی ہے کہ دشمن کا خط مدافعت منتشر ہو کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ضرور نہیں ہے کہ یہ اجتماع غنیم کے مُلک ہی میں کیا جائے بلکہ انسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنے ہی مُلک کے اندر دشمن کو ترغیب و تحریص دے کر داخل کر لینے کے بعد یہ کارروائی شروع کی جاتی ہے، کیونکہ اپنے ملک کے حالات طبعی پر واقفیت کلّی ہونے کی وجہ سے ملکی فوجوں کے لیے بڑی آسانیاں موجود رہتی ہیں گویا ایک جال تیار کیا جاتا ہے جس میں پھنسا کر نقصان جانی و مالی اپنے حریف کو پہنچاتے ہیں اور بعد لذ شکست غنیم کو محض اُس مقام سے خارج ہی نہیں کر دیتے بلکہ بحالتِ انہزام دشمن کے مُلک کا بہت سا حصہ اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔ اور یہ ترقی اُس وقت تک بند نہیں ہوتی جب تک کہ فریق مخالف کے دوسرے خطوط مدافعت سے مڈبھیڑ نہیں ہوتی۔ موجودہ جنگ میں جرمنی کے مشہور جنرل وان ہنڈنبرگ نے روسیوں کے مقابل تھیلی سورین جھیلوں میں اسی نظریہ پر عمل کیا تھا۔ کبھی جنگی مصلحت و عسکری راز اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ حملہ آورانہ اقدامات و فتحمندانہ پورشات کے ساتھ ہی کمال حزم و احتیاط کے ساتھ جنگی ولولۂ غضب و انتقام پر ضبط و قابو حاصل کر کے خط سفر سے معاودت کی جائے۔ جیسا کہ وان کلک نے پیرس کے سامنے پہنچ کر پیچھے کی طرف انہزام کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب جرمنوں کو علم واثق ہو گیا کہ فرانسیسی عمدہ ترتیب اور پریشان باقاعدگی کے ساتھ

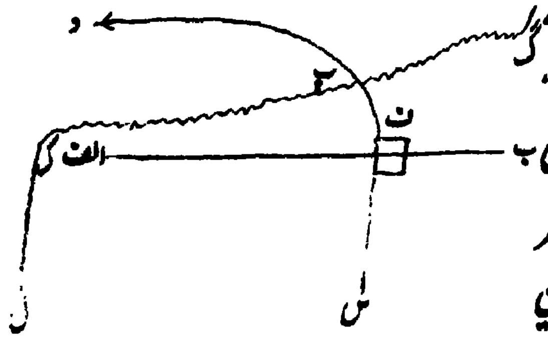
اپنی تمام فوجیں، سامانِ جنگ و دولت، دارالسلطنت سے بچا کر نکل گئے ہیں تو عاقبت بینی و مصلحت فہمی اُن کو اسی میں نظر آئی کہ پیرس کے استحکامات پر فضول سر ٹکرانے کے بجائے عقب کے تیار کردہ مورچہ بند خط پر واپس چلے جائیں اور وہاں اچھے طور سے قدم جمائیں۔ فرانسیسیوں کو اپنے دیس کی مثل "دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے" خوب یاد تھی۔ نیز ان کے جنرل سیمو کے پیش نظر میدانِ منتشر کی پریشاں کن تصویریں بھی (جو گذشتہ جنگ فرانس و جرمنی میں کھینچی تھی) موجود تھی۔ سیڈان کی شرمناک شکست اور جنرل میکموہن کی سپر اندازی کا خاکہ بھی آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود رہتا تھا، دوبارہ اُن اندوہناک واقعات کو پیش آ جانے کا موقع دینے کے بجائے اُسکو یہی مناسب معلوم ہوا کہ دارالسلطنت کو جنگی مصلحت کی بنا پر خالی کرا کر عقب میں خط مدافعت بنائے۔ پایہ تخت چھوڑ دینے پر بیرونی ممالک کے باشندے یہی نہ کہ استہزا کریں گے، اُن کو کرنے دو۔ اس سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ریڑھ کی ہڈی پر قرنگاری کھا کر و پا بریدہ ہو کر شرمناک صلح کی درخواست کی جائے۔ گذشتہ صدی کی حروب میں سب سے ابتری خیز و ہولناک "جنگ ماسکو" کہی جا سکتی ہے جو ۱۸۱۲ء میں واقع ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ روسی جنرل کٹوساف نے ولنا سے پسپا ہو کر سمولنسک کو، اور وہاں سے بھی ہٹ کر بوراڈ نو پر جب اپنا خط مدافعت بنایا تو اعلیٰ طبقے والے ذی اقتدار روسیوں نیز مقتدر افسران کو صورتِ حالات سے غایت درجہ تشویش دامنگیر ہوئی اور اُنھوں نے جنرل کٹوساف کی ان متواتر پسپائیوں پر بلا ناخوشی و ناپسندیدگی کا اظہار شروع کیا۔ ان کے الفاظ کٹوساف کے دل پر مثل تیر کے جا لگے۔ چنانچہ اسنے بوراڈ نو پر نپولین کی بڑھتی ہوئی فوجوں کا مقابلہ کرنے کا عزم بالجزم کر کے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور جنگ کا دو ٹوک فیصلہ چاہا۔ جس وقت بُرا وقت آتا ہے یا اقبال کی پری مُنھ پھیر لیتی ہے، انسانی تدبیریں کُل بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ روسیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ توبہ بھلی۔ میدان بوراڈ نو روسیوں کے خون سے سرخ پوش ہو گیا۔ خون کی ندیاں بہ نکلیں، کُشتوں کے پُشتے لگ گئے، اللہ دے بندہ لے، کا عالم تھا، مورخین کا اندازہ ہے کہ محض اس معرکے میں ایک تہائی سے زائد روسی اجل کے گھاٹ اُتر گئے۔ وہ تو کہو خیر ہو گئی کہ نپولین کو خود ہی آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس معرکہ کے بعد

وہ دست بردار ہوگیا ورنہ معلوم کیا کچھ روس پر بیت جاتی۔

جنگی اسٹریٹجی کو واضح کرنے کی خاطر اب ہم اس کی پانچوں شکلوں کا نقشہ دے کر سمجھانا چاہتے ہیں تاکہ قارئین کرام کے فہم میں اس کے نکات آجاویں چنانچہ وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) پہلی حالت وہ ہوتی ہے جب قائد (جنرلیسیو) بجائے فوج غنیم پر حملہ آور ہونے کے صرف اُس کے خطِ سفر یا سلسلہ ہائے آمدرفت ورسل ورسائل (لائن آف کمیونیکیشن) پر حملہ کرتا ہے۔ لائن آف کمیونیکیشن کے تحت میں وہ تمام سڑکیں، شاہراہیں، ریلوے لائنیں، دریا، نہریں، یا اور دیگر ذرائع آمدرفت آجاتے ہیں جن سے میدانی فوج اور اس کے مرکز۔ Base - میں اتصال قائم رہتا ہے۔ نیز اصلی فوج اور اس کے حملہ ٹکڑوں، منتشر شدہ جماعتوں، مثل ہراولی دستوں، طلیعہ، ردعہ، ساقہ ورائد کے درمیان سلسلۂ آمدرفت جاری رکھا جاتا ہے۔ مرکز کہتے ہیں اُس مقام کو جہاں سے معرکہ آرا فوج کو سامانِ حرب، خوراک، فوجی کمک، بحالتِ جنگ روانہ ہوتی رہتی ہے۔ گویا جملہ ضروریات فوجی کا وہ ملجا یا گودام ہوتا ہے اور ہمیشہ کم از کم چالیس پچاس میل سے کم فاصلے پر نہیں رکھا جاتا۔ ذرائع آمدرفت کی سہولیت پر اسکی مسافت کا انحصار رہتا ہے۔ حسب موقع ومحل اپنا خط حربی میدانی فوجیں بناتی رہتی ہیں کبھی پیچھے اور کبھی آگے۔ مرکز میں تبدیلی کسی اہم شکست کے بعد کیجاتی ہے۔ پہلا نقشہ جنگ مارنگو سے لیا گیا ہے جو درمیان فرانس وآسٹریا ۱۸۰۰ء میں واقع ہوئی تھی۔

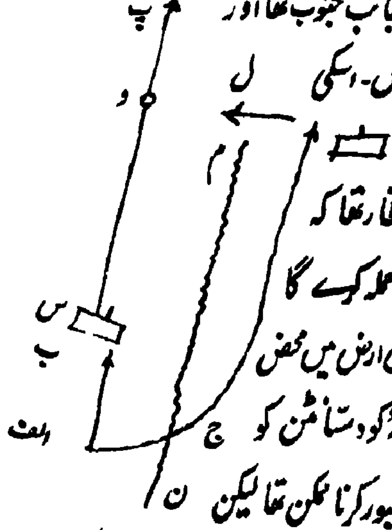
نقطۂ الف پر فوج آسٹریا ہے اور الف سے ب تک کا خط آسٹریا کی لائن آف کمیونیکیشن۔ ف فوج فرانس جو نقطہ س تک پہنچ گئی اور جسکی لائن آف کمیونیکیشن د، پ، س، ہے۔ اور زنجیرہ دار لکیر سلسلۂ کوہ آلپس ہے جس کے اظہار کے لیے حروف ل، ک، گ، درج ہیں۔ آسٹریا کے جنرل میلاس



کو یقین کامل تھا کہ نپولین اسپر نقطۂ ک سے حملہ آور ہوگا۔ نپولین

نے بھی اپنی فطری ذکاوت اور خلقی ذہانت سے میلاس کے اس گمان کو تقویت دینے کی خاطر پانچ ہزار فوج جنرل تھورو کی زیرکمان نقطۂ ک پر مقرر کردی تھی تاکہ وہ میلاس کو دھوکے میں رکھ کر اپنی طرف مخاطب رکھے اور خود اس نے آسٹریا کی لائن آف کیونی کیشن کو نقطۂ س پر کاٹ دیا۔ میلاس اس نقطے کو دوبارہ فتح نہ کرپایا اور اس کے ہاتھ سے میدان جاتا رہا۔

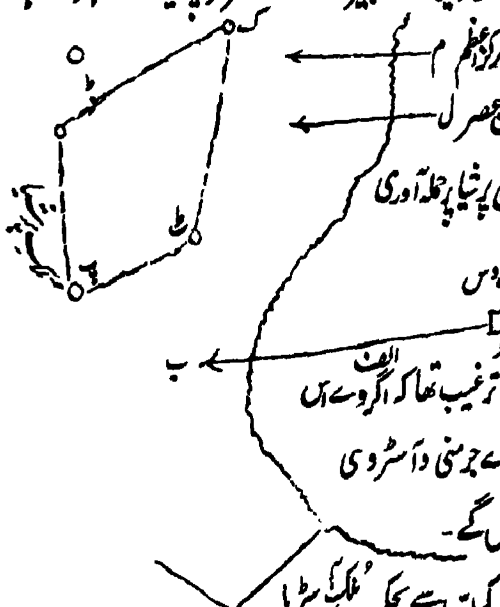
مثال دیگر جنگ ونچسٹر سے لی گئی ہے جو ۱۸۶۲ء میں واقع ہوئی تھی۔ بنکس فیڈرل جنرل مقام اسٹرابرگ میں تھا۔ نقطہ س پر اسکا رُخ جانب جنوب تھا اور وہاں اس نے مضبوطی سے خندقیں کھود رکھی تھیں۔ اسکی لائن آف کمیونی کیشن شہر ونچسٹر نقطہ و سے لیکر دریائے پوٹوماک نقطہ پ تک تھی۔ اسکو انتظار تھا کہ جیکسن افواج کانفی ڈریٹ کا جنرل جنوب سے حملہ کرے گا اور وہ بھی محض سڑک الف ب سے۔ کیونکہ اُس ارض میں محض یہی ایک سڑک تھی۔ زنجیرے دار خط م ن سلسلۂ کوہستان کو ظاہر کرتا ہے جسکو محض ایک راستہ الف ج سے عبور کرنا ممکن تھا لیکن



وہاں جیکسن مضبوط فوجیں ڈالے پڑا تھا۔ مختصر گر پھر تیلا دستہ اپنے رسالہ میں سے بنکس کے مقابل چھوڑ کر تاکہ وہ اُسکو اپنی طرف متوجہ رکھے جنرل جیکسن نے پہاڑوں پر سے اپنی اصلی فوج براہ الف ج، اُتار کر مقام فرنٹ رائل نقطۂ د کی فیڈریل فوج کا صفایا کردیا۔ بعد ازاں بسمت و بڑھ کر نقطۂ ل تک پہنچ گیا۔ جنرل بنکس نے یہ دیکھ کر سراسیمگی کی حالت میں اور بسرعت تمام اپنی فوج کو خط س و پ سے واپسی کا حکم دیا لیکن اُسوقت پانی گلے گلے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تو کہو جیکسن کا فوجی اسٹاف نالائق تھا اور کانفی ڈریٹ والی فوج رسالہ میں ڈسپلن (فوجی تنظیم) کی کمی ایسی تھی کہ اس کے باعث پہلے معرکے میں جنرل جیکسن کو سرخروئی نہ حاصل ہو سکی تاہم دوسرے روز اس نے جنرل بنکس کی بے ترتیب و غیر منتظم فوج کو شکست فاش دے کر اُس کا قلع قمع کر دیا۔ اور کیونکہ اُسکو کامیابی نہ ہوتی

جنیکس کی لائن آف کیمونی کیشن پر ضرب کاری لگنے کا نتیجہ ہی یہ ہونا چاہیے تھا۔

موجودہ جنگ کے واقعات میں سے مشرقی محاذ کا ایک نقشہ دلچسپی سے خالی نہیں جس کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:- حروف ک ڈ پ ٹ، سے مراد جرمنی کے چار مشہور قلعبند مقامات کونگزبرگ، ڈینزگ، پوسین، اور تھارن ہیں اور زنجیرے دار خط سرحد پولینڈ کو ظاہر کرتا ہے

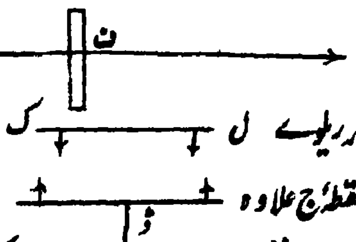


و مخفف ہے شہر وارسا کا جو روسی جنگی مرکز اعظم م تھا۔ جرمنی کے علمائے فن جنگ اور مجتہدان عصر ل کو وثوق کامل تھا کہ اگر روسیوں کو کبھی پرشیا پر حملہ آوری کی ہمت بندھی بھی تو وہ وارسا سے اپنی فوجوں کو خط الف پر حرکت دیں گے ملک روس روسیوں کے لیے یک گونہ یہ بھی باعث ترغیب تھا کہ اگر وہ اس خط سے جرمنی پر حملہ آور ہوں گے تو وہ جرمنی و آسٹروی فوجوں کو ایک دوسرے سے جدا کرسکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال ایسا حرص دہ تھا کہ اس سے بچکر ملک آسٹریا

نکلنا بظاہر بہت دشوار نظر آتا تھا اور اس چال کی تہ میں جو رمز پنہاں تھا، جرمنوں کو یقین کامل تھا کہ روسی جنرل اُس تک ہرگز نہ پہنچ سکے گا۔ اگر کہیں روسی قائد نے اس لالچ میں آکر خط الف ب سے غنیم پر حملہ کردیا ہوتا تو جرمن فوجیں اپنے قلعہ بند شہروں سے نکل کر روسی خط ترسیل یا سفر (لائن آف کیمونی کیشن) پر یلغار کردیتیں اور روسیوں کو بے ترتیبی کے ساتھ منہزم ہونا پڑتا۔ لیکن زیرک و ہوشیار روسی جنرل سامانف نے اپنی فوجوں کو نقطہ ہائے م اور ل سے حرکت دی۔ جس کا اثر جرمنی پر یہ پڑا کہ اُسکو بعجلت تمام مغربی محاذ سے فوجیں واپس بلانا پڑیں۔

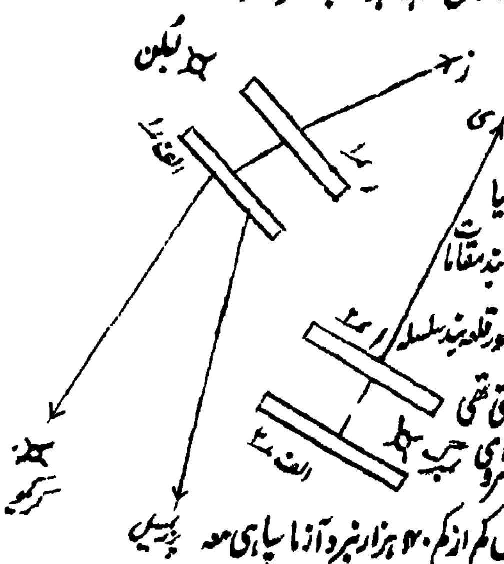
اسکے بعد ہم اب وار اسٹریٹجی کا دوسرا اصول بتاتے ہیں۔ جس کو کہتے ہیں "غنیم کو ایسے "پوزیشن" بنانے پر مجبور کرنا کہ وہ ایک بازو پر آجاوے"۔ نقشہ مندرجۂ ذیل سے یہ اصول بہ آسانی

سمجھ میں آجاتا ہے۔



فرض کرو ایک لال وردی والی فوج اپنے مرکز الف سے بسمت ب بڑھ کر ریلوے اسٹیشن ج پر قابض ہونا چاہتی ہے۔ نقطۂ ج علاوہ ریلوے اسٹیشن ہونے کے نیلی وردی والی فوجِ غنیم کا اسلحہ خانہ بھی ہے۔ اپنے مرکز سے حرکت کرنے کے بعد جب لال فوج نقطۂ ف تک پہنچی تو اسکو علم ہوا کہ نیلی فوج نقطۂ ج سے چل کر اسکے بائیں بازو پر نقطۂ ڈ تک پہنچ گئی۔ اس حالت میں اگر نادانی سے لال فوج نقطۂ ج تک بڑھتی ہی چلی جاوے گی تو نیلی فوج نقطۂ ڈ سے بڑھ کر اسکے سلسلۂ ترسیل یا رسل و رسائل پر حملہ کر کے اسکو اپنے مرکز سے منقطع کر دے گی۔ پس لال فوج کو ایسی حالت میں چاہیے کہ وہ اقدام کو روک کر پیچھے ہٹ آوے اور ایک خط مدافعت ل ک بنا دے تا کہ نیلی فوج جو نقطۂ ڈ سے بڑھ رہی ہے اسکی روک تھام ہو جاوے۔

ایک مثال موجودہ جنگ یورپ سے لیکر ہم اس طریقے کو اور بھی واضح کرنا چاہتے ہیں جس کا خیال اخبار بین حضرات کے ذہن سے اب تک بمشکل محو ہوا ہوگا بلکہ اکثر حضرات کو اسکے واقعات بھی یاد ہوں گے۔

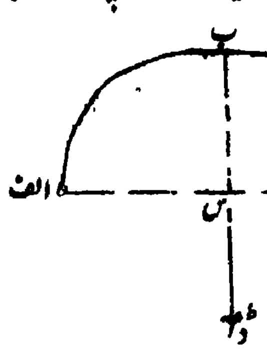


آسٹریا کا خط مدافعت مغرب میں نقطۂ کرکو سے شروع ہو کر مشرق کی جانب نہایت مستحکم مقام لمبرگ تک چلا گیا تھا۔ درمیان میں ٹارنو اور پرسلو بھی مورچہ بند مقامات تھے اور اس خط کی پشت پر پریزمسل کا مشہور قلعہ بند سلسلہ چلا گیا تھا جہاں سے آسٹریوں کو ہر وقت کمک پہنچ سکتی تھی ان مقامات کو جنگی مرکز قرار دے کر دو آسٹری فوجیں جو ۶ آرمی کور (ایک کور میں کم از کم ۴۰ ہزار نبرد آزما سپاہی مع سوار و توپخانہ و متفرق بارڈیوں کے ہوتے ہیں) اور پانچ ڈویژن رسالہ پر مشتمل تھیں، روس کی جانب

بڑھنا شروع ہوئیں۔ ان کا رُخ جانبِ شمال و مشرق تھا۔ ان دونوں فوجوں کو ہم الف ۱ اور الف ۲ سے یاد کریں گے۔ اول الذکر میں ۴ آرمی کور تھیں اور وہ کرکیو اور پرزمیسل سے بڑھ کر لُبلُن کو جانا چاہتی تھی۔ گویا ۱ فوج کا نقطۂ مقصد لُبلُن تھا جو ایک بڑا اہم مقام تھا بسبب شہرت و دریلوے لائنوں کے ایک بڑے جنکشن ہونے کے۔ چونکہ روس کے چاروں سمتوں سے آکر ریلوے لائنیں اس مقام پر مل جاتی ہیں اگر آسٹرین فوجیں اس کو مسخر کر پاتیں تو وہ روس کے دوسرے اہم جنگی مقام و قلعبند شہر آون گراڈو پر حملہ کر کے وارسا کے ایسے زبردست مرکز کو تہ و بالا کر ڈالتیں جنوب مشرق سے ان کی ضرب لگتی اور شمال و شمالی مغربی کونے سے جرمن چڑھ دوڑتے۔ چکی کے دو پاٹوں میں دبکر روس کی تابِ مقاومت جواب دے جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی گہری چال تھی اور برلن کے اعلیٰ جنگی دماغوں سے نکلی تھی۔ دوسری آسٹروی فوج الف ۲ جو داہنے بازو پر بڑھ رہی تھی وہ بہ نسبت اول کے تقریبًا نصف تعداد میں تھی اور وہ لمبرگ سے بڑھنے والی تھی گویا وہ فوج نمبر الف ۱ کے داہنے بازو کی محافظ تھی۔ لُبلُن کی اہمیت نے آسٹرویوں کو یقین کامل دلا دیا تھا کہ روسی ان کا مقابلہ جی توڑ کر اس مقام پر کریں گے اور ایڑی سے چوٹی تک کا زور وہ اسکے بچانے میں لگا دیں گے۔ لیکن یہ عجب لطف ہوا کہ روسیوں نے اپنی فوج کی زیادہ تعداد نقطۂ ی پر لاکر لمبرگ کی طرف بڑھانا شروع کیا جسکو ہم ر ۲ سے نامزد کرتے ہیں اور باقیماندہ فوج کو نقطہ ز پر قائم کر کے سست رفتاری کے ساتھ لُبلُن تک بڑھالائے جسکو ر ۱ کہنا چاہیے۔ چالیں روسیوں اور آسٹرویوں کی ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھیں، سوال محض تیز رفتاری کا تھا یعنی اگر آسٹروی لُبلُن تک اس سے قبل پہنچ جاتے جتنی مدت میں روسی فوج نمبر ر ۲ لمبرگ تک پہنچ گئی تو حالت دگرگوں ہو جاتی۔ لیکن روسی کمانڈر سبقت لے گیا اور شدید سعی کر کے اس نے لمبرگ کا محاصرہ کر لیا۔ اب کیا تھا۔ وائنا میں کھلبلی پڑ گئی اور آسٹروی قائد کو سوا اسکے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنی فتحمند فوج نمبر الف ۱ کو کمزور کر کے اس کا بڑا حصہ لمبرگ کے بچانے کے لیے روانہ کرے۔ لیکن اس سراسیمگی میں دو باتوں میں سے ایک بھی حاصل نہ ہو سکی۔ یعنی نہ تو وہ لمبرگ ہی کو بچا سکا اور نہ

ٹبلن پر قابض ہوسکا۔ ہم کو اس واقعے سے آسٹروی جنرل کی فن جنگ کے اصولوں سے نابلدی کا پتہ چلتا ہے۔ صورتِ حالات یہ پیدا ہوگئی تھی کہ ایک طرف تو آسٹروی فوجیں فتحمندانہ ٹبلن کے سامنے خیمہ زن ہوچکی تھیں اور دوسری جانب روسی فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے لمبرگ کے پھاٹک تک پہنچکر رُک گئے تھے۔ ایک نوع سے دونوں فوجوں کی لائن آف کمیونی کیشن خطرے میں تھی۔ کاش کہ آسٹروی جنرل اصول جنگ سے واقف ہوتا تو وہ سب سے پیشتر اپنے خط رسل و رسائل و آمد و رفت کے بچانے کی فکر کرتا اور احمقانہ طریق پر روس کے خط آمد و رفت پر حملہ آور نہ ہوجاتا۔ روسی فوج نمبر۲ اپنے ہی ملک میں کام کر رہی تھی اُسکو ملک کی جغرافیائی و طبیعی حالت سے کما حقہٗ واقفیت تھی۔ آسٹروی کمانڈر کے لیے وہ سرزمین بالکل اجنبی تھی وہاں آسٹروی فوجوں کی نقل و حرکت میں بڑی دشواریاں پیش آئیں اگر آسٹروی کمانڈر زیرک و سمجھدار ہوتا تو وہ اپنی فوج الف نمبر۱ کے خط کو مختصر کرکے ایک نیا پیش قائم کرتا اور اپنے خط ترسیل یا سفر کو خطرے میں نہ ڈالتا چہ جائیکہ روسیوں کے خط سفر (لائن آف کمیونی کیشن) پر حملہ کرنے کا سودائے خام وہ پکاتا۔ روسی خط سفر پر حملہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ روسی جنرل نے اپنی افواج کے ایک حصے سے اپنا "پیش بازو" پر قائم کردیا۔ اور پوری طاقت سے لمبرگ پر یورش کردی۔ لمبرگ مسخر ہوگیا۔ اسکے تسلیم کے بعد وہ دوسری آسٹروی فوج پر بھی حملہ آور ہوا۔ اسکی معاندت پر "پیش بازو" والی افواج تو تھیں ہی، آن کی آن میں آسٹروی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

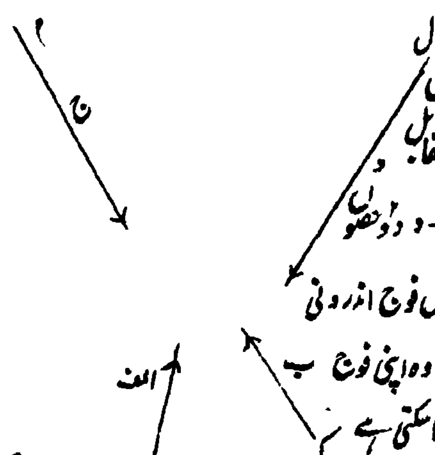
(۳) تیسرا طریقہ وار اسٹریٹجی کا وہ ہے جس میں "اندرونی" و "بیرونی" اصول پر نقل و حرکت فوجوں کی ہوتی ہے۔ "خطوطِ اندرونی" پر کام کرنے کے یہ معنی ہیں کہ دائرے کے مرکز سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہوئے فوجیں یا ایک خاص فوج کے مختلف ٹکڑے بیرونی اطراف میں غنیم سے جنگ کریں اور بوقت ضرورت جس وقت چاہیں یہ سب ٹکڑے اُس خاص مرکز پر بلا دقت و مزاحمت مراجعت کرآدیں



برعکس اسکے "بیرونی خطوط" پر کام کرنے کا اطلاق اُس وقت ہوتا ہے جب ایک فوج یا اسکے مختلف

اجزا بجانب مرکز براہِ نصف قطر دائرہ محیط سے حرکت کرتے ہیں اس طرز پر کہ اگر کوئی ٹکڑا شکست کھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور بھی ہو تو وہ دوسرے حصے کی طرف بحالت پسپائی تقہقر نہ کرے بلکہ علٰحدہ ہی رہ کر پیچھے ہٹ جائے۔ اول الذکر طریق میں فراغ و انتشار کرنا پڑتا ہے اور موخر الذکر میں مائل بمرکز ہونا پڑتا ہے۔ اسکو یوں سمجھنا چاہیے۔ فرض کرو ایک لال رنگ والی فوج ہے جسکو حرف س سے ہم نامزد کرتے ہیں اس نے اپنا مرکز دائرہ کے مرکز وسطی کو بنا لیا ہے اس فوج کی مجموعی قوت ساٹھ ہزار نفوس کی ہے۔ اسکے مقابل ایک نیلی فام فوج صف آرا ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ اسکے ہر ایک حصہ میں پچاس ہزار جوان ہیں اور وہ تین نقطوں ا۔ب۔ج پر صف بستہ ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ۶۰ ہزار لال فوج ڈیڑھ لاکھ نیلی فوج کے مقابل ہے۔ علاوہ کمی تعداد کے یہ بھی فرق ہے کہ لال فوج نے دائرہ کے مرکز کو اپنا مستقر بنا لیا ہے اور نیلی فوجیں قوسی شکل میں پورے نصف دائرے پر تین مستقروں پر مجتمع ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دائرے کے مرکزی نقطے سے نیلی فوجوں کے تینوں مستقر فاصلہ مساوی پر ہیں۔ ایسی حالت میں اگر لال فوج والا کمانڈر اپنی نادانی اور ناواقفیت سے غنیم کی فوج جو نقطہ ب پر موجود ہے اُسپر حملہ آور ہو تو نیلی فوج والے اپنے دونوں مستقروں ج۔ا سے کوچ کر کے لال فوج کے عقب میں نقطۂ س پر مجتمع ہو کر ایسی ضرب کاری لگا دیں گے کہ اس کا سلسلۂ سفر پارہ پارہ ہو جائیگا قبل ازیں کہ وہ نقطۂ ب والی نیلی فوج کو ہزیمت پہنچا سکے۔ لیکن اگر برعکس اسکے س والی لال فوج نقطۂ ج والی نیلی فوج پر دھاوا بولدے تو نقطۂ الف والی فوج تو کسی حالت میں بھی نقطۂ ج والی فوج کی کمک کو نہیں پہونچ سکتی البتہ بہ نسبت ا۔ج کے فاصلے کے ب۔ج کا فاصلہ ضرور کم ہوگا تاہم س۔ج کے بعد سے تب بھی تاکجا تفاوت رہے گا۔ اس نقشے میں یہ ایک صورت نکل سکتی ہے کہ نیلی فوج دونوں مستقروں الف و ب سے بڑھ کر دائرے کے مرکز س پر حملہ آور ہو لیکن اول تو بینا بسوے مستقر ب والی فوج کا کمانڈر نقطۂ ج پر حملہ ہونے کی خبر پاتے ہی اپنی فوجیں اسکی مدد کے لیے بسرعت و تعجیل تمام روانہ کرے گا۔ اور یہ عین مقتضائے فطرت بشری ہے ایسی حالت میں نقطۂ الف والی فوج کو ہرگز جرأت تنِ تنہا حملہ کرنے کی نہ پڑے گی۔ علاوہ ازیں ان

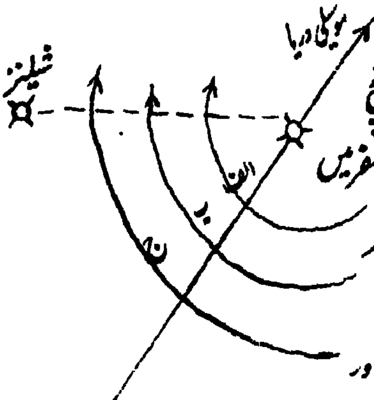
حملوں کے دفعیہ کے لیے لال فوج کا کمانڈر اگر ذی عقل ہے تو وہ ساٹھ ہزار فوج میں سے کم از کم دس ہزار جو ان دونوں فوجوں کو مشغولِ پیکار رکھنے کو چھوڑ کر باقیماندہ پچاس ہزار سے نقطۂ س پر حملہ آور ہو جاوے گا۔ نقشۂ زیر بحث میں فوج جو نقطۂ س پر قائم ہے اس کا خط سفر "د" - اور - و" ہے پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ لال فوج نے "خط اندرونی" پر کام کیا اور نیلی فوجوں نے "خط بیرونی" پر۔ ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت فوجیں "خط بیرونی" پر کام کرتی ہیں تو اُن کے خط سفر کے رُخ بھی مختلف ہوتے ہیں اور بحالت فرار وہ ایک دوسرے سے اور بھی دور ہو جاتے ہیں۔ اس "بیرونی" و "اندرونی" خطوط کی ایک شکل دیگر بھی ہے۔ جب دو متحاربہ افواج میں سے ہر ایک دو یا اس سے زائد حصوں میں منقسم رہتی ہے اور جن میں ہر ایک حصہ والی فوج اپنا جداگانہ مرکز بنا کر مشغول پیکار ہوتی ہے۔ فرض کرو ایک لال فوج ہے



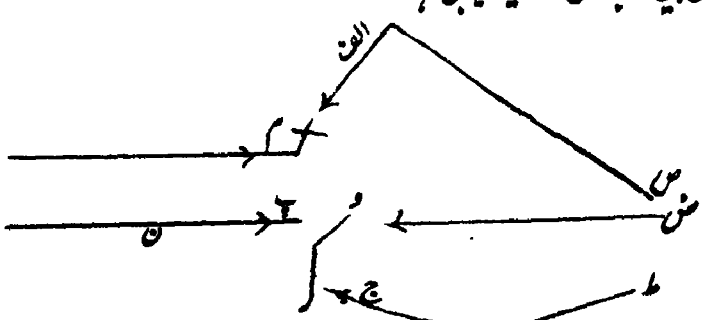
جس کے دو حصے 'الف ب' اپنے دو مستقروں (ک) سے بڑھنا شروع کرتے ہیں۔ اس کے مقابل نیلی فوج بھی دو مستقر ل۔م قائم کر کے 'ج - د' دو حصوں میں ہو کر مقابلے کو طیار رہے بمقابلہ نیلی کے لال فوج اندرونی خطوط پر کہی جا سکتی ہے کیونکہ بہ نسبت نیلی کے وہ اپنی فوج کے منتشر شدہ اجزا زیادہ تیزی سے ایک مرکز پر لا سکتی ہے اور متفق ہو کر وہ نیلی فوج کے کسی خط سفر پر اُس سے کہیں پیشتر حملہ آور ہو سکتی ہے جتنے عرصے میں کہ نیلی فوج اپنے ٹکڑوں کو یکجا کر کے ایک زبردست 'پیش' قائم کر سکے گی۔ اس صورت میں کہیں گے کہ لال فوج، دُہرے اندرونی خط" پر حرکت کرتی ہے اور گذشتہ سال محاذ روس پر مقام لاٹزین ہی نقشہ جا تھا۔

(۴) چوتھا اصول وہ ہے جس کو کہتے ہیں اسٹرٹیجک پنیٹریشن جس کے معنی ہیں غنیم کی اسٹرٹیجک پیش کے جدا جدا حصوں میں گھُس آنے کے۔ موجودہ عالمگیر جنگ یورپ میں اس نظریہ یا اصول پر متواتر عمل کیا جا چکا ہے اس اصول کے ابتدا کی تاریخ حسب ذیل ہے:-

گذشتہ جنگ جرمنی و فرانس میں ایک مقام پر فرانسیسی افواج دو بڑے حصوں میں منقسم تھیں ایک زیر کمان جنرل بیزینی قلعہ بند شہر میٹز میں اور دوسری جنرل میکوہن کے تحت میں شہر شیلنز میں۔ ان دونوں فوجوں کا خط سفر براہ راست بشکل خط مستقیم



قائم تھا۔ جرمن افواج نے دریائے موسیل کو عبور کرکے فرنچ افواج کے جو زیر کمان جنرل میکوہن و بیزینی تھیں خط سفر میں گھس کر پہلے بیزینی کو شکست فاش دے کر اسکو میٹز میں محصور کرلیا۔ بعد ازاں جنرل میکوہن کو سیڈان کا روز بد دیکھنا نصیب ہوا جس کے دل شکن واقعات اور شرمناک ہزیمت کے اذکار سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔ جرمنوں کا داخلہ تین خطوط سے ہوا تھا جسکو ہم نے حروف "الف ب ج" سے دکھایا ہے اسی کو "داخلہ اسٹریٹجک" کہتے ہیں۔ اس عمل جنگ کی اور بھی کئی شکلیں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے:۔



فرض کرو ایک نیلی فوج نے "ص ض ط" سڑکوں پر تفوق حاصل کرنے کی غرض سے تین حصوں میں منقسم ہو کر مغرب کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ برخلاف لال فوج کے جس کے مستقر نقطہ ہ م ن ہیں۔ لال فوج کے کمانڈر نے بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر نیلی فوج کے مقابلہ کی ٹھان لی۔ وہ ایک زیرک و ہوشیار جنرل ہے۔ اس نے اپنی فوج کے حصہ م سے کچھ آدمی لیکر نیلی فوج جو نقطہ الف سے بڑھ رہی تھی اسکو لطائف الحیل میں اُس وقت تک رکھنے کا حکم دیا جب تک کہ وہ نقطہ م کی

باقیماندہ فوج کو لیکر معہ فوج نقطۂ ن کے نیلی فوج نقطۂ ب والی پر تیر کی طرح جا گرا اسکا شیرازہ نہ بکھیرے وہ نقطۂ ب پر اس سرعت سے بڑھا کہ نیلی فوج جو نقطۂ ج پر تھی وہ اسکی کمک سے قاصر رہی۔ اسکو بھی کہیں گے کہ لال فوج کے کمانڈر نے نہایت قابلیت سے اصول "اسٹرٹجکٹ داخلی" پر عمل کیا۔

سب سے آخری طریقہ وہ ہے جسکو "براہ راست مقصود دلی یا "نقطۂ نظر" پر حملہ کرنا" کہتے ہیں یہ نہایت عام فہم اور سادہ طریقہ ہے اور کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

عزیز (آسیونی)

غزل منشی محمد حسین محوی

کل جو بِسک رہا تھا سرِ رہ پڑا ہُوا — یارب وہ آج محوی دیوانہ کیا ہُوا
جس گوشے میں کبھی دلِ مرحوم تھا مکیں — چھوٹا سا اک مزار وہاں ہے بنا ہُوا
جی چاہتا ہے کل سرِ حشر اُن سے پوچھیے — مجھکو ملا کے خاک میں کیا فائدہ ہُوا
آنکھوں کے باہر آ گئی ہر ایک موجِ خوں — کیا جانیں دل پہ کیا ستمِ ناروا ہُوا
اچھی نہیں یہ گرمی بازارِ حُسن و عشق — تیرے ہی در پہ کیوں رہے میلا لگا ہُوا
دل دیکے پہلے ہم ہوئے رسوا جہان میں — شہرہ ترے جمال کا پھر جا بجا ہُوا
پہلو میں کس کو ڈھونڈھتی ہے اب نگاہِ یار — دل تھا کبھی، وہ پہلے ہی صرفِ ادا ہُوا
طرزِ جفا پرستیِ محبوب کیا کہوں — ہر اک وفا پرست شہیدِ جفا ہُوا
کیوں طول دیجیے زندگیِ مستعار کو — دل ہی ہجوم یاس میں جب ہو گھرا ہُوا
جب تک جیا میں وہ نہ ہوا مہرباں کبھی — پھر میری بیوفائی کا اُس کو گلا ہُوا

محوی غمِ فراق میں مرنے کا رنج کیا
سمجھو کہ ایک فرضِ محبت ادا ہُوا

انسکلوپیڈیا اُردو

اُردو انسائیکلوپیڈیا کے مباحث اکثر اخبارات میں شایع ہو چکے ہیں اور جس وسیع پیمانے پر اس کام کی انجام دہی کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے وہ تاریخ اُردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتی لیکن مجوزین نے شاید اسکے ہر پہلو پر کافی غور نہیں کیا ہے ورنہ ایک ایسی تجویز جس کے لیے پانچ چھ لاکھ روپے کا صَرف بتایا جاتا ہے اور جس میں صدہا لکھنے والے شریک ہوں گے وہ اس طرح یکایک قطعی صورت میں مُلک کے سامنے نہ پیش کر دی جاتی۔ اس لیے کہ

(۱) یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس میں صلاح و مشورے سے وقتاً فوقتاً تدریجی ترقی ہو سکے۔ بلکہ جو کچھ ہوگا وہ ایک انقطاعی صورت میں ہوگا۔ اس لیے اور بھی زیادہ ضرورت تھی کہ قطعی تجویز شایع ہونے کے قبل اس کا خاکہ مسودۃً شایع کیا جاتا اور مُلک کی رائے معلوم کرنے کے بعد آخری فیصلہ کیا جاتا۔

(۲) جب کوئی تجویز قطعی طور پر قرار پا جاتی تو پھر اُس پر اظہار رائے اور تنقید کا وہ فائدہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ تنقیداً جو کچھ کہا جاتا ہے خواہ کیسی ہی نیک نیتی سے کہا جائے، مجوزین علی العموم اُسے اپنی مخالفت تصور کرتے ہیں اور اختلاف رائے و مخالفت میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے اور بحث ذاتیات پر آ جاتی ہے۔ اور ہر ایسی رائے سے بدیں عذر لاپروائی برتی جاتی ہے کہ بڑے کاموں کی ہمیشہ مخالفت ہی ہُوا کی ہے۔ مخالف دلائل کیسے ہی قوی ہوں بات کا نباہنا لازم آ جاتا ہے۔

پس دانستہ یا نادانستہ اس معاملے میں اول فروگذاشت یہ ہوئی کہ ایک بڑی تحریک ایسے عاجلانہ طریق پر پیش کر دی گئی کہ کسی کو رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اس سے بڑی غلطی یہ ہوگی کہ چونکہ تحریک پیش ہو چکی ہے اس لیے اب اُسکے حُسن و قبح پر غور نہ کیا جائے۔ جن اصحاب کی مالی و علمی شرکت کا اس وقت تک اظہار ہو چکا ہے اُنکی نسبت میرا یقین ہے کہ اس تجویز پر تنقیداً جو کچھ کہا جائے گا وہ اُسکے عیب و صواب پر غور کریں گے اور بشرط ضرورت اپنی رائے میں ترمیم کو

جائز رکھیں گے۔ اسی اعتماد کے بھروسے پر انسکلوپیڈیا کی تدوین کے متعلق میں سرِدست چند اجمالی خیالات عرض کرتا ہوں اور اگر مجوزین نے اسپر توجہ فرمائی تو تفصیلی خیالات کا بھی اظہار کروں گا۔

انسکلوپیڈیا کی ضرورت

مثل تمام دیگر اشیاء کے اس ضرورت پر بھی دو طریق سے نظر پڑتی ہے۔ تجریدی و تعلیقی۔ تمام تعلقات و مؤثرات کو علٰحدہ کرکے مجرداً خیال کیا جائے تو کسی معمولی کتاب کا بھی کسی زبان میں اضافہ ہو جانا مفید ہی تصور ہو سکتا ہے مضر نہیں خیال کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ انسکلوپیڈیا جیسی جامع تصنیف اُردو جیسی بے مایہ زبان میں آجائے۔ لیکن جب دوسرے تعلقات کو ملحوظ رکھ کر غور کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ اُردو میں ابھی مدت تک ایسی وسیع انسکلوپیڈیا کی تصنیف کی مطلقاً ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اسکے لیے اول یہ دیکھنا ہے کہ انسکلوپیڈیا کا موضوع و غایت کیا ہے؟ اور بحالاتِ موجودہ ہم اس غایت سے مستفید ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

انسکلوپیڈیا کا موضوع

اُردو انسائیکلوپیڈیا کی تصنیف کے لیے انگریزی کی جن تین انسکلوپیڈیاؤں پر انحصار کیا گیا ہے۔ ان میں سے انسکلوپیڈیا برٹینکا نے اس لفظ کی تعریف علٰحدہ نہیں کی ہے، صرف ضمناً یہ لکھا ہے کہ ایک کتاب ہے جو تمام اصنافِ علوم سے بحث کرے۔ پاپولر انسکلوپیڈیا نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ابتداءً اس کا مفہوم وہ تمام شعبہائے علوم تھے جن کا جاننا قدماء کے نزدیک لبرل ایجوکیشن (تشحیذ ذہن) کے لیے ضروری تھا۔ زمانۂ مابعد میں اس کا استعمال ہر منضبط ترتیب علوم پر ہونے لگا۔ خواہ وہ جملہ معلوماتِ انسانی پر حاوی ہوں یا اُسکے خاص حصّوں پر محدود ہوں۔ اس عام تدوین کی ضرورت کا احساس بہت جلد ہونے لگا تھا۔ اور جس جس قدر معلومات میں ترقی ہوتی گئی یہ ضرورت بھی زیادہ محسوس ہوتی گئی۔ کچھ اس وجہ سے کہ مختلف علوم منضبط ترتیب میں اپنے فطری تعلقات کے لحاظ سے ہوں اور کچھ اس وجہ سے کہ خاص مطالب کا جلد ترپتہ چل جائے اور انھیں دو وجہوں سے اس قسم کی تصانیف کی ترتیب کبھی فلسفیانہ طریق سے ہوتی ہے اور کبھی حروفِ تہجّی کے اعتبار سے۔

چیمبرس انسکلوپیڈیا نے سب سے زیادہ واضح طریق پر بحث کی ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ فی زمانا انسکلوپیڈیا سے وہ تصنیف مراد ہے جس کے معلومات یا تمام علوم انسانی پر حاوی ہوں یا اس کے کسی خاص علمی یا امتیازی تقسیم کے جزئیات پر محیط ہوں۔ لازماً علوم کی وسعت وقدر کے متعلق ہمارے تغیر خیال اور خود علوم کے فیما بین تعلقات کے تبدلات سے اس قسم کی تصانیف کی نوعیت بھی تغیر پذیر ہوتی رہی ہے اسلئے کوئی انسکلوپیڈیا اپنے زمانے کے مذاقِ علمی سے متجاوز نہیں ہوسکتی۔ زمانۂ وسطیٰ کی انسکلوپیڈیا اپنے تقسیم مضامین و حدِ نظر میں ویسی ہی متوسط ہوگی جیسی انتخاب و اظہار واقعات میں۔"

ان بیانات سے واضح ہوگیا کہ

(۱)۔ انسکلوپیڈیا یا جملہ علوم کی جامع ہوتی ہے یا کسی خاص علم کے جملہ جزئیات پر حاوی ہوتی ہے۔

(۲)۔ انسکلوپیڈیا اپنے زمانے کے عام مذاق علمی کی سطح سے بلند نہیں ہوسکتی۔

(۳)۔ انسکلوپیڈیا جدید انکشافات کا ذریعہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ وہ انہیں مباحث کی ایک مرتب صورت ہوتی ہے جو فی الوقت موجود و مروج ہوتے ہیں۔

جو بیانات انسکلوپیڈیا اُردو کی نسبت اب تک شایع ہوئے ہیں اُن سے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ اس انسکلوپیڈیا کی تقسیم علوم کے اعتبار سے نہیں ہوگی اور میں اسے بہت بڑی دانشمندی سمجھتا ہوں کہ مجوزین نے اس پُرخار روش کو نہیں اختیار کیا۔ کیونکہ خود یورپ میں یہ طریقہ متواتر ناکامیاب ہوچکا ہے۔ چنانچہ پنکوک کی کوشش اس ترتیب میں ایک سو چھیاسٹھ جلدوں تک جاکر بھی ناتمام رہی۔ (عربی میں اس طرز کو ضرور غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن اول تو عربی کے تصانیف جو اس مقصد کے ساتھ ہوسکتے ہیں وہ انسکلوپیڈیا کا مفہوم پورا نہیں کرتے بلکہ فی حد ذاتہا علحدہ علحدہ علم ہیں اور دوسرے یہ کہ عربی و انگریزی کی بنا سے تقسیم علوم میں بہت ہی نازک فرق ہے جو تفصیلی مباحث پر بڑا اثر رکھتا ہے) بہر حال مجوزہ انسکلوپیڈیا کی تقسیم علم کے اعتبار سے نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ جملہ علوم کی جامع بترتیب حروف تہجی ہوگی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ انسکلوپیڈیا اپنے زمانے (یعنی اُردو) کے عام مذاق علمی کی سطح پر ہوگی یا اس سے بلند ہوگی۔ سنیئے

(۱) - یہ علوم خود اُردو کے موجودہ لٹریچر سے اخذ کیے جائیں گے - یا

(۲) - انگریزی علوم ترجمہ ہو کر انسکلوپیڈیا میں شامل کیے جائیں گے -

بصورتِ اوّل: اس قدر کثیر سرمائے کی ضرورت ہے اور نہ کارکُن جماعت میں صد ہا اشخاص کے شمول کی حاجت - چند اشخاص تھوڑے صرف سے اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں - لیکن مجوزین کی یہ غرض نہیں ہے - وہ اس انسکلوپیڈیا کو نہ صرف یورپ کے انتہائی مدارجِ ترقی کی حد پر لانا چاہتے ہیں، بلکہ مشرقیات کے متعلق تحقیقات یورپ پر کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں - بہ الفاظ دیگر وہ اس انسکلوپیڈیا کو اپنے زمانے کے مذاقِ علمی سے نہ صرف بلند بلکہ بے انتہا بلند کر دینا چاہتے ہیں اور یہ موضوعِ انسکلوپیڈیا کے منافی ہے -

یہیں سے یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ اتنے صرف سے اس طرز کی کوشش اُردو کے لیے سُود مند بھی ہے یا نہیں؟ اس کا صحیح فیصلہ اس امر کے یقین پر منحصر ہے کہ انسکلوپیڈیا کی غرض و غایت ہر زبان و زمان میں کیا رہی ہے؟

(۱) آیا انسکلوپیڈیا مثل لغت و فرہنگ کے حوالجات کی ایک کتاب ہے - یا

(۲) اس سے مقصود جدید علوم کی اشاعت و تعلیم ہے -

میں نے جہاں تک غور کیا ہے کوئی ایسی نظیر مجھے نہ ملی کہ کسی انسکلوپیڈیا کی غرض اشاعتِ علوم و تعلیم رہی ہو - بلکہ پلینی کی انسکلوپیڈیا سے لے کر اس وقت تک جتنی انسکلوپیڈیاؤں کے حالات معلوم ہو سکے وہ ایک ہی واحد غرض سے لکھی گئی ہیں - یعنی جب علوم و فنون کی اتنی کثرت ہوئی کہ ان سب پر نظر کرنا دشوار ہو گیا، تو ان کے ایجاز و احصا کی ضرورت پیش آئی - جیسا کہ خود چیمبرس انسکلوپیڈیا نے لکھا ہے کہ "علوم میں جس قدر ترقی ہوتی گئی اُسی قدر یہ زیادہ ضروری ہوتا گیا کہ ہر شے کے متعلق قدرِ قلیل (اور وہ قدرِ قلیل اُس کا اہم ترین جزو) لکھنے کے لیے کسی ایک شے پر تمام و کمال بحث کرنے سے گریز کیا جائے" - چنانچہ ہر جدید دَور کے بعد جو اہم ترین انسکلوپیڈیائیں لکھی گئی ہیں وہ خود اسکی شاہد ہیں - میں بہت ہی مختصر لفظوں میں ان کا ذکر کرتا ہوں :-

(۱) سب سے قدیمی انسکلوپیڈیا پلنی کی انسکلوپیڈیا ہے جو ہسٹری نیچرلس کے نام سے اول صدی عیسوی میں روم کے زمانۂ عروج میں تیار ہوئی تھی۔

(۲) علوم اسلامی جب مدارج کمال کو پہنچ گئے تو دسویں صدی عیسوی میں فارابی نے احصاء العلوم[۱] کے نام سے علوم اسلامی کی انسکلوپیڈیا تیار کی جو اس وقت اسکیوال (اسپین) میں موجود ہے۔

(۳) یورپ کے زمانۂ وسطیٰ کی تیرہویں صدی میں ونسنٹ نے اپنی ان تھک کوششوں سے ایک انسکلوپیڈیا (تاریخ۔ طبعیات و دینیات کی) تین حصوں میں مرتب کی اور اُسکے بعد مختلف وقتوں میں یورپ میں اور تصانیف بھی اسی انداز پر ہوتی رہیں۔

(۴) ۱۶۲۰ء میں اول بار موجودہ مفہوم میں السٹڈ کی انسکلوپیڈیا شایع ہوئی اور یہی طرز جدید کی انسکلوپیڈیاؤں کی بنیاد ہے۔

(۵) انگریزی زبان میں (الف) سب سے اول انسکلوپیڈیا انگلیکن ٹکنیکم (فرہنگ علوم و فنون) کے نام سے ۱۷۰۴ء میں ایک جلد میں شایع ہوئی۔ ۱۷۱۰ء میں ایک اور جلد کا اضافہ ہوا۔ بعد ازاں (ب) ۱۷۲۸ء میں چیمبرس کی انسکلوپیڈیا دو جلدوں میں مکمل ہوئی اور (ج) ۱۷۶۸ء و ۱۷۷۱ء کے درمیان انسکلوپیڈیا برٹینکا تین جلدوں میں شایع ہوئی اور ۱۹۰۲ء میں آکر اُس کا دسواں اڈیشن چونتیس جلدوں میں پورا ہوا اور پھر ٹائمس نے اُسے از سرِ نو مرتب کرکے اٹھائیس جلدوں میں شایع کیا۔

ان بیانات سے سرسری نظر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اول صدی عیسوی میں انسکلوپیڈیا لکھی جائے اور مقبول ہو، دسویں صدی عیسوی میں اسلامی انسکلوپیڈیا تیار ہو، یورپ کے زمانۂ تاریک میں متعدد انسکلوپیڈیائیں شائع ہوں تو علوم و فنون کے اس روشن زمانے میں اُردو انسکلوپیڈیا کیوں نہ لکھی جائے اور کیوں نہ مقبول ہو۔ لیکن یہ مغالطہ اُن کتابوں کی ماہیت و نوعیت پر غور نہ کرنے سے واقع ہوتا ہے غائر نظر سے انکی ماہیت و نوعیت پر غور کیا جائے تو نتیجہ بالکل ہی بدل جاتا ہے۔ میں طویل استدلال میں

---

[۱] میرے خیال میں دائرۃ المعارف سے انسائیکلوپیڈیا کا صحیح مفہوم ہرگز نہیں ظاہر ہوتا۔ محیط العلوم اس سے بہتر ہے مگر احصاء العلوم ایسا جامع و مانع لفظ ہے کہ اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا۔

پڑھانا نہیں چاہتا۔ مختصراً وہ کیفیت پیش کرتا ہوں جن سے ان کتابوں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُردو میں اس قسم کی انسکلوپیڈیا جس کا اعلان کیا گیا ہے، انسکلوپیڈیا کی غایت کو حاصل نہیں کرسکتی۔

(۱)۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یونان میں لفظ "انسکلوپیڈیا" کا یہ مفہوم نہیں تھا جو آج ہم سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہاں اس سے مراد وہ نصاب تعلیم تھا جو ایک جامع شخص کے لیے ضروری سمجھا گیا تھا۔

(۲)۔ پلنی کی انسکلوپیڈیا علماے اسکندریہ کی گراں بہا تصانیف سٹوبیس سڈاس اور کیسلاکر مساعی جلیلہ اس دور کے انتہائی علمی عروج کی یادگاریں ہیں۔ پلنی کی انسکلوپیڈیا میں سو مصنفین کی کوشش اور چار سو چھپن مصنفین کے حوالجات اور دو ہزار کتابوں کے اقتباسات شامل ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج اُردو میں اس سے زیادہ کتب و مصنفین کے حوالے دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اول تو اُردو کی تصانیف اس پایہ کی نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ روم کی ترقی اس زمانے کی انتہا سے بلند علمی تھی۔ اُردو ابھی اس سے بمراتب دور ہے۔ علاوہ ازیں سامانِ کتابت کی گرانی یا کمیابی، نقلِ کتب کی جاں کاہی، وسائلِ آمدورفت کی دشواری ایسے موانع ہیں جو ہمارے موجودہ دور کے مقابلے میں اس زمانے کی کتابوں کی قدر و قیمت ہزارہا گونہ بڑھا دیتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یونان و روم و اسکندریہ میں جو کچھ ہوا وہ اپنے ہی علوم کی حد کے اندر ہوا، انسکلوپیڈیا کے ذریعے سے جدید علوم دیگر ممالک کے نہیں پیش کیے گئے۔ باایں ہمہ بہ الفاظ "پاپولر انسکلوپیڈیا" یہ کوشش صرف آئندہ کے لیے داغ بیل ڈالنے والی نہیں۔

(۳)۔ اسلامی زمانے میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مشرق میں بنی عباس۔ مغرب میں بنو اُمیہ و فاطمیین نے علوم کو جس حد پر پہنچایا تھا اس کا طبعی اقتضا یہ تھا کہ جب قلمی کتابوں کی تعداد کتب خانوں میں ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پہنچ جائے تو الفہرست کشف الظنون، اخبار العیون، معجم البلدان، فتوح البلدان کے مثل کتابیں تیار کی جائیں، اور فارابی نے دسویں صدی میں جو کچھ کیا وہ اور قبل ہونا چاہیے تھا۔ یہی سب جگہ ہوا اور یہی اُردو میں

بھی ہونا چاہیے کہ اول علوم شایع کیے جائیں اور پھر اُن کی فرہنگ مرتب ہو۔

(۴)۔ یہ کتابیں جس قدر بھی لکھی گئیں وہ اس معنی میں انسکلو پیڈیا کے مقصد کو پورا نہیں کرتیں جو آج ہم سمجھ رہے ہیں۔ بغرضِ مشترک کے اعتبار سے وہ انسکلو پیڈیا کے تحت میں داخل کر لی گئی ہیں مگر بیشتر یہ کتابیں ڈکشنری و لکسیکن (لغت و فرہنگ) کے نام سے لکھی گئی ہیں اور مختلف علوم کے لیے علٰحدہ علٰحدہ جلدیں مخصوص کی گئی ہیں۔ لیکن اُردو میں نہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ مجوزین کا یہ مقصود ہے۔

(۵)۔ یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ کی علمی حالت اور اس زمانے میں متعدد انسکلو پیڈیاؤں کا لکھا جانا موجودہ تحریک کے حق میں ایک قوی تائید ہو سکتی ہے۔ مگر خیال رکھنا چاہیے کہ یہ تمام تصانیف بیشتر لاطینی زبان میں ہوئی ہیں۔ جو اُس زمانے میں یوروپ کی مشترکہ زبان تھی اور تمام یوروپ میں جو علمی سرمایہ موجود تھا یہ انسکلو پیڈیائیں انکا خلاصہ تھیں۔ بلکہ بعض تو محض مستقل کتابوں کا مجموعہ تھیں۔ السٹڈ کی انسکلو پیڈیا جو ۱۶۲۰ء میں شایع ہوئی اور جس نے موجودہ طرز کی بنا قائم کی وہ بھی لاطینی میں تھی۔ انگریزی زبان میں اول انسکلو پیڈیا اٹھارویں صدی کی ابتدا میں شایع ہوئی جب انگریزی علوم کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا تھا اور انگریزی نہ صرف ملکی بلکہ تعلیمی زبان کے اعتبار سے مستحکم ہو چکی تھی (فرانسیسی کا شمار اس معاملے میں انگریزی کے بھی بعد ہے)۔

(۶)۔ جس قدر بھی انسکلو پیڈیائیں قدیم زمانے سے اس وقت تک شایع ہوئیں۔ وہ اپنی زبان کے علوم کے پہلو بہ پہلو رہیں۔ انکی تعداد ایک سے سات جلدوں تک رہی۔ انگریزی کی پہلی انسکلو پیڈیا ایک ہی جلد میں شایع ہوئی تھی۔ انسکلو پیڈیا برٹنیکا تقریباً ڈیڑھ صدی میں تین جلدوں سے اٹھائیس جلدوں تک پہنچی۔ برخلاف اسکے کہ اُردو میں یہ چاہا جاتا ہے کہ ایک دم سے ایک بارِ گراں اسپر رکھدیا جائے اسکی کوئی مثال کسی زمانے اور کسی مُلک میں نہیں ملتی۔

(۷) یورپ میں اور ممالکِ اسلامیہ میں جو انسکلو پیڈیائیں لکھی گئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے لکھی گئیں جن کے دسترس سے تفصیلی علوم (جن کے خلاصے انسکلو پیڈیا میں دیے جاتے ہیں) باہر نہیں تھے۔ مگر ہماری مجوزہ انسکلو پیڈیا اس اصول پر لکھی جانے والی ہے کہ اسکے ناظرین کے پاس اس

انسکلوپیڈیا کے سوا دوسرا ذریعہ علوم تک دسترس کا نہیں ہے۔ اور نہ ایک مدت تک ہونے کی امید ہے۔ یہ ایسی کمزوری ہے جو مجوزہ انسکلوپیڈیا کی غرض و غایت کو کلیتہً معطل کر دیتی ہے۔

ان حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسکلوپیڈیا کی جو غایت ہر زبان و زمان میں سمجھی گئی ہے وہ ہماری مجوزہ انسکلوپیڈیا سے حاصل نہیں ہو سکے گی۔ بلکہ ایک بالکل نئی غرض اس انسکلوپیڈیا سے متصوّر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ

مجوزہ انسکلوپیڈیا علومِ موجودہ کی ضابط نہیں بلکہ بجائے خود اُردو میں اشاعتِ علوم کا ذریعہ ہو گی۔ گو انسکلوپیڈیا کا یہ بالکل نیا مقصد ہے، لیکن محض اس وجہ سے کہ ایک شے سے ایک نیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے اسکی تنقیص نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اگر وہ اس نئے مقصد کو پورا کر سکے تو اسکی ہمت افزائی و قدردانی ہونا چاہیے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس مقصد کی فی نفسہ تنقیح کر کے دیکھا جائے کہ انسکلوپیڈیا سے یہ غرض حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا مثبت یا منفی جواب امور ذیل کے صحیح نتائج پر منحصر ہے۔

(۱) ۔ انسکلوپیڈیا کے پڑھنے والے کون لوگ ہوں گے اور اُنکی علمی استعداد کیا ہو گی ؟

(۲) ۔ اتنی گراں قیمت کتاب اُردو میں کس طرح شایع ہو سکے گی ؟

(۳) ۔ وہ اپنے زمانے کے علوم سے کس طرح ہمقدم رہے گی ؟

(۴) ۔ اگر نہیں رہے گی تو اسکی تلافی کس طرح ہو گی ؟

(۵) انسکلوپیڈیا کی طرز کی کتابوں سے تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

ان کی نسبت بلا رد و قدح جو حالات پیش نظر ہیں وہ حسب ذیل ہیں ۔

(۱)۔ بظاہر انسکلوپیڈیا کے پڑھنے والے اُردو خواں اصحاب ہوں گے۔ اردو میں اسوقت تک اگرچہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہو گئی ہیں۔ لیکن وہ کتابیں ایسی منتشر و متفرق و مختلف المدارج ہیں کہ اُن سے اُردو خواں طبقے میں کسی علم کو علم کی حیثیت سے بہت ہی کم ترقی ہوئی ہے چنانچہ موجودہ انسکلوپیڈیا کے مجوز اول (مولوی سید سلیمان صاحب) نے اپنے دارالمصنفین کے خوابِ تمنا میں تحریر فرمایا ہے کہ "آج بڑا رونا یہ ہے کہ مذہب، زبان، فلسفہ، صناعت، اخلاق ہماری ترقی

کے لیے جن قوائے نامیہ کی بھی ضرورت ہے ان کے تغذیے و نشو و نما کے لیے ہمارے ہاں کوئی سامان نہیں"۔ ایسی حالت میں انسکلوپیڈیا کے مباحث پر عبور حاصل کرنا اُردو خواں طبقے کے لیے قریب بہ محال ہے۔ یہ انسکلوپیڈیا انسکلوپیڈیا برٹنیکا سے بھی کچھ تجاوز ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مگر انگریزی خواں طبقہ اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ انسکلوپیڈیا برٹنیکا سے مستفید ہونے کے لیے کس قابلیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایم۔اے کے نصاب میں اسکے بعض مضامین داخل ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسکا پایہ کیا ہے۔ خود عربی میں دائرۃ المعارف موجود ہے۔ مگر اس سے مستفید ہونے کے لیے کم از کم ندوے کی مولویت تک کی تعلیم تو ہونا چاہیے۔ اُردو خواں طبقے میں اس قابلیت کے کتنے اصحاب ہیں؟ اگر مقصود یہ ہے کہ انگریزی خواں طبقہ انگریزی کتابوں کو ترک کر کے اسی کا ہو رہے گا۔ تو یہ نہ مفید رہے گا اور نہ قابلِ عمل۔ اگر کسی گروہ کو اس سے مستفید ہونے کی توقع ہو سکتی ہے تو صرف اس عربی خواں طبقے کی، جو تراجم کے ذریعے سے علوم جدیدہ سے کچھ واقفیت حاصل کر کے اپنے معلومات کو نئے طرز پر ڈھالنا چاہتا ہے۔ مگر یہ جماعت خود اس قدر قلیل ہے کہ محض اسکے لیے یہ تمام زحمت گوارا کرنا بڑا سخت بار ہے بس جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس انسکلوپیڈیا کے پڑھنے والے اور اس سے فائدہ اُٹھانے والے بہت ہی کم ہیں۔

(۲)۔ پڑھنے والوں کی اس محدود تعداد پر جب گرانیِ قیمت کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے تو حالت اور بھی یاس افزا ہو جاتی ہے۔ اُردو میں جب معمولی کتابوں کا رونا رویا جاتا ہے اور دو دو تین تین روپے کی علمی کتابوں کے اتنے بھی قدرداں نہیں ملتے کہ لکھائی چھپائی کا خرچ نکل آئے تو اتنی گراں قیمت کتاب کی فروخت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اگر اُمراء و رُوساء نے کچھ جلدیں خرید بھی لیں تو عام اشخاص کو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ گرانی قیمت اسکے نفع کو بالکل مسدود کر دے گی۔ لیکن مجوزین نے اگر کوئی خاص تدبیر اسکے لیے سوچی ہو تو اسکی ہمیں خبر نہیں ہے۔

(۳)۔ ایک بہت ہی اہم سوال یہ ہے کہ جس طرز پر انسکلوپیڈیا لکھی جانے والی ہے وہ ضرور کئی برس کا کام ہوگا اور اکتشافاتِ علمی کی کیفیت یہ ہے کہ برٹنیکا کی انسکلوپیڈیا میں ہر سال ایک نئی

جلد کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور دوسری انسکلوپیڈیائیں بھی زمانہ کے ہمقدم رہنے کے لیے جلد جلد اپنے اڈیشن بدلتی رہتی ہیں۔ یورپ و امریکہ میں علاوہ عوام کے ہزاروں کتبخانے ایسے ہیں جو بالالتزام اسی قسم کی تصانیف کو خرید کر لیتے ہیں اس لیے وہاں اس التزام کے قائم رکھنے اور صرف کثیر برداشت کرنے میں کسی طرح کی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن ہماری حالت اسکے برعکس ہے۔ یہاں نہ کتبخانے ہیں اور نہ عوام کا یہ مذاق ہے۔ بس اول تو دوران ترتیب ہی میں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ کل مضامین ایک حد پر قائم رہ سکیں۔ اور یہ دشواری اگر اس کا انتظام کیا بھی گیا تو دو ہی چار برسوں میں ان میں کمی محسوس ہونے لگے گی۔ اور انسکلوپیڈیا استناد کے درجے سے ساقط ہو جائے گی۔

(۴)۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کمی کی تلافی کی کیا صورت اختیار کی جائے گی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہمارے حالات کے اعتبار سے انسکلوپیڈیا کے اڈیشن کا بدلتے رہنا قریب بہ محال ہے۔ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وقتاً فوقتاً اس میں جدید جلدوں کا اضافہ کیا جائے۔ یہ جلدیں اگر چند صفحوں کی ہونگی تو اسکے لیے وہ تمامی اسٹاف (بہ استثنائے عام مترجمین و محررین کے) برقرار رکھنا ہوگا جو اسکی ابتدائی تدوین میں شریک رہا ہو، ایک اتنے بڑے اسٹاف کا جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے بالاستقلال اس کام پر آمادہ رہنا کہ وہ انسکلوپیڈیا کی تصحیح کی غرض سے اپنے اپنے صیغے کے جزئیات پر نظر رکھیں بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے اور اسکے لیے جس مستقل خرچ کی ضرورت ہے۔ شاید اس کا تحمل بھی قوم سے نہ ہو سکے۔

(۵)۔ یہ دشواریاں اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے شاید ان سے سابقہ پڑنے کے قبل اس کا وزن کم سمجھا جائے۔ لیکن خود انسکلوپیڈیا کی ترکیب میں فی نفسہ ایک ایسی پیچیدگی ہے جو کسی طرح بھی انسکلوپیڈیا کو ایک تعلیمی کتاب نہ بننے دے گی اور اگر اسے تعلیمی کتاب بنایا جائے گا تو وہ انسکلوپیڈیا نہ رہے گی۔ کسی انسکلوپیڈیا کی ترتیب بلا باہمی حوالجات کے نہیں ہو سکتی۔ یعنی ہر علم متعدد اجزاء میں تقسیم ہو کر منتشر ہو جائے گا اور ہر جزو کے تحت میں دوسرے اجزاء کے حوالجات پر کفایت کرنا ہوگا۔ لیکن یہ طریقہ جو انسکلوپیڈیا کی جان ہے وہ تعلیمی کتاب کے لیے سخت ناموزوں بلکہ اسکے

مقصد کا برباد کن ہے۔ اور اگر اسکے بخلاف کیا گیا یعنی علم کو متعدد اجزا میں تقسیم کر دیا گیا تو وہ انسائیکلوپیڈیا نہ ہوگی۔ بلکہ ایک سلسلے میں علوم و فنون کی متفرق کتابوں کا جمع کرنا ہوگا۔

غرضکہ ان وجوہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس انسائیکلوپیڈیا کا موضوع وہی ہو جو دوسری اسی قسم کی کتابوں کا ہو سکتا ہے تو غایت اصلی یعنی اہل علم کے لیے علوم موجودہ کا خلاصہ فرہنگ وار جمع کر دیا جائے کہ عند الضرورت حوالجات میں آسانی ہو وہ غایت کسی طرح موجودہ انسائیکلوپیڈیا سے حاصل نہ ہو سکے گی کیونکہ خود موضوع لائے موجود نہیں ہے اور اگر اس کا موضوع بدل دیا جائے یعنی اسے علوم مروجہ یورپ وعلوم قدیمہ اسلامیہ کے شیوع کا ذریعہ قرار دیا جائے تو یہ غرض اور بھی زیادہ عسیر الحصول ہو جاتی ہے۔ اسلیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ جس انداز پر یہ انسائیکلوپیڈیا اُٹھائی گئی ہے وہ ابھی

بہت قبل از وقت ہے

کسی شے کے قبل از وقت ہونے اور اُسکے فی نفسہ مفید یا مضر ہونے میں فرق ہے اور اکثر اس مغالطے سے بحث کو طول ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں قبل از وقت ہونے سے میری غرض یہ ہے کہ کوئی قوم یا ملک کسی مفید کام کے لیے تیار نہ ہو بلکہ ضرورت ہو اُسے تیار کرنے کی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی کام جو قبل از وقت ہو نہ کیا جائے بلکہ ہر قسم کی ترقیاں "قبل از وقت" ہی کاموں سے ہوتی ہیں۔ سرسیّد نے جس وقت قوم کو انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دلائی، وہ تیار نہ تھی" گر مادہ موجود تھا" آج سلف گورنمنٹ کے خواستگار بھی اسی اصول پر کام کر رہے ہیں۔ کسی کام کے "قبل از وقت" ہونے یا نہ ہونے کا صحیح معیار یہ ہے کہ اُسکے اِجراء و قیام کے لیے خارجی امداد کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ضرورت ہے تو وہ قبل از وقت ہے اور اگر ضرورت نہیں ہے تو وقت کے مطابق ہے۔ لکھنؤ میں مکرمی سید یوسف علی صاحب کا اسکول بلا کسی کی اعانت کے چل رہا ہے۔ بنگال میں بہت سے اسکول اپنے بانیوں کے لیے مالی منفعت کا سبب ہیں۔ بس یہ قبل از وقت نہیں ہیں۔ یعنی قوم و ملک ان کے لیے تیار ہے۔ لیکن لندن کا مشرقی زبانوں کا مدرسہ جو لارڈ کرامر متوفی و لارڈ کرزن جیسے با اثر شخصوں کی کوشش اور خود ملک معظم کی سرپرستی سے قائم ہوا ہے وہ ابھی انگلستان

کے لیے قبل از وقت ہے، یعنی وہ خود اپنے کو سنبھال نہیں سکتا بلکہ اُسے خارجی امداد کی ضرورت ہو پس اس معیار کی بنا پر ہم کہ سکتے ہیں کہ انسکلوپیڈیا کی تدوین ابھی قبل از وقت ہے۔ کیونکہ اسکے لیے ابتدا سے انتہا تک خارجی امداد پر بھروسا کیا گیا ہے اور ملک اسکے لیے تیار نہیں ہے۔ میرے نزدیک فی نفسہٖ اس طریقے کے اختیار کرنے میں قباحت نہیں ہے بلکہ غور طلب یہ ہے کہ قبل از وقت کے مدارج کیا ہیں اور کس حد پر آ کر ہمیں رُک جانا چاہیے۔ اسکی نسبت صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ جو کام مقصود ہے اُسکے قبول کرنے کے لیے ملک تیار ہے یا ابھی اسے قابل قبول بنانے کے لیے بھی تیاری کی ضرورت ہے، بصورت اول کام کا اجراء کر دینا چاہیے اور صورت دوم مشکوک ہے، سرسید کی زندگی کے اول بیس برس اسی میں صرف ہوئے کہ اُنھوں نے ایک مختصر گروہ ایسا پیدا کیا جو اُن کا ہمخیال ہو سکا۔ مسٹر دادا بھائی نوروزجی، لال موہن گھوش وغیرہم کی سالہا سال کی کوششوں کے بعد مُلک اس قابل ہو سکا کہ کانگرس کی بنا پڑی۔

انسکلوپیڈیا کے معاملے میں ہم درمیانی زینوں کے طے کیے بغیر اوپر پہونچ جانا چاہتے ہیں۔ اور یہ مشکل ہے۔

یورپ و امریکہ میں پانچ چھ لاکھ روپیہ کسی کتاب پر صرف ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ انسکلوپیڈیا برٹینکا کے گیارہویں اڈیشن کی صرف ترتیب پر ۳۴-۳۵ لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں۔ لیکن اب اپنی حالت پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارا مذاق علمی کس درجے پر ہے۔ حضرت سید مرحوم کی شخصیت اور تیس برس کی بلکھاری، محسن الملک کا تدبر اور دس برس کی جانفشانی بھی سلمانوں کے واحد مرکز علمیت کے لیے پانچ لاکھ روپئے کا مستقل سرمایہ نہ فراہم کر سکی۔ اگر غیر معمولی شخصیتیں غیر معمولی اثرات سے تحریک یونیورسٹی میں اس طرح شریک نہ ہو گئی ہوتیں جس طرح وہ شریک ہوئیں تو یہ تیس لاکھ جو جمع ہو گئے وہ ابھی مدتوں کی باتیں تھیں۔ انسکلوپیڈیا کی ترتیب میں اگرچہ ہندوؤں کا بھی نام لیا جاتا ہے مگر عملاً مالی و علمی کام جو کچھ بھی ہوگا مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوگا۔ پس ان فیاض ہمدردان قوم سے زیادہ (جن کی جیبیں ہر اُس کام کے لیے جو قوم کے لیے مفید ظاہر کیا جائے کشادہ رہتی ہیں) خود مجوزین

کا یہ فرض ہے کہ وہ اچھی طرح اندازہ کریں کہ جس کام کے لیے وہ اس کثیر سرمائے کے خواستگار ہیں اُسکا صرف قوم کے مالی و علمی حالات کے لحاظ سے مفید بھی ہے یا نہیں؟۔ اگر مزید غور سے وہ اسے مفید نہ سمجھیں تو اُنکے خلوص قومی سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ اپنی رائے کی تبدیلی میں اپنی کسرِ شان نہ سمجھیں گے۔ بلکہ اس روپئے اور محنت کو اس سے زیادہ مفید کاموں میں صرف کریں گے۔

علاوہ ازیں کہ بعد تیاری انسکلوپیڈیا مفید ہوگی یا نہیں۔ ہمیں خود کام کی علمی دشواریوں پر بھی نظر کرنا چاہیے۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تراجم کے ذریعے سے کام چل جائے گا۔ مگر تراجم کی کیفیت یہ ہے کہ جس زمانے میں علامہ شبلی مرحوم انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری تھے اُنھوں نے چاہا تھا کہ مصطلحاتِ علوم کا ترجمۂ اردو میں ہو جائے، اس غرض کے لیے اوّل علمِ کیمیا منتخب کیا گیا اور اسکے انگریزی مصطلحات ایک کتاب کی شکل میں چھاپ کر بہت سے ذی علم اصحاب کے پاس بھیجے گئے مگر نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ علم کیمیا خود عربی سے انگریزی میں آیا، عربی و فارسی زبانیں اس سے غیر مانوس نہیں ہیں، جب اُنکا یہ حال ہے تو انسکلوپیڈیا میں تو بیسیوں ایسے علوم داخل ہوگئے جنکا زمانۂ قدیم میں کہیں ذکر بھی نہیں تھا۔ انکے ترجموں میں جو دشواری پیش آئے گی وہ ظاہر ہے، اور محض ترجمہ مقصود نہیں ہے بلکہ محققانہ مضامین کی ضرورت ہے۔ اور اسکے لیے ایسے لکھنے والے درکار ہوں گے جو انگریزی اُردو دونوں پر پوری طرح حاوی ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے اصحاب کا شمار ہم میں بہت کم ہے جو مختلف شعبہائے علوم پر ایسی قدرت رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب نے اپنے حال کے پمفلٹ (متعلق بہ یونیورسٹی) میں لکھا ہے کہ قانونِ مسعودی کا ترجمہ یورپ میں اس وقت تک صرف اسی وجہ سے نہ ہو سکا کہ قدیم و جدید دونوں ہیئت کا جاننے والا کوئی موجود نہ تھا۔ یہ خیال کرنا بہت آسان ہے کہ مضامین انگریزی میں لکھائے جائیں گے اور پھر معمولی مترجمیں اسکا ترجمہ کردینگے اور انکی اصلاح ہو جائے گی۔ مگر محض زباندانی کے سہارے پر جو ترجمہ ہوگا اور جو اصلاح ہوگی وہ کبھی مستند نہ ہو سکے گی۔ انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ تعزیراتِ ہند کے نام سے مولانا نذیر احمد مرحوم نے بھی کیا ہے اور اب بھی قانونی ترجمے ہوتے رہتے ہیں، دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ علوم کے ترجمے کے

لیے صرف زباں دانی کافی نہیں ہے بلکہ خود اُسی علم میں کامل ہونا لازمی ہے۔ ورنہ ترجمے میں کامیابی ہونا غیر ممکن اور قطعی غیر ممکن ہے اگر اسکے خلاف ہوا (جیسا کہ اس تجویز سے ظاہر ہوتا ہے جو شایع ہو چکی ہے) تو یہ انسکلو پیڈیا نہ صرف غیر مستند ہو جاے گی بلکہ آیندہ لکھنے والوں کی گمراہی کا باعث ہوگی۔

مشرقیات کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ انسکلو پیڈیا خود یورپ کو سبق آموز ہوگی۔ جو لوگ یورپ کی تحقیقات سے کچھ بھی واقف ہیں وہ مشکل سے اس کا یقین کریں گے کہ ہندوستانی بحالاتِ موجودہ اُن سے گوے سبقت لے جا سکیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی انسکلو پیڈیاؤں میں اسلامی معاملات کو کم جگہ دی گئی ہے اور ہم بلا اعانتِ یورپ اُسے جس حد تک چاہیں پھیلا سکتے ہیں۔ اور غالباً یہی ہوگا، لیکن پیچیدگی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر مشرقی (اور علی الخصوص اسلامی) معاملات کو وسعت نہیں دیتے تو انسکلو پیڈیا بہت ہی نامقبول ہو جائے گی۔ اور اگر علومِ مغربی کو کم کرتے ہیں تو یہ بھی مضر ہے اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کتاب غیر معمولی طور پر ضخیم ہو جائے گی یا اُسکی ترتیب میں تناسب و توازن قائم نہ رہ سکے گا۔

ایک مشکل یہ بھی پیش آئے گی کہ چونکہ اس انسکلو پیڈیا سے مقصود قوم میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے اس لیے ضروری ہوگا کہ ہر مضمون مبتدیانہ طریق سے شروع ہو کر منتہیانہ حد پر پہونچایا جائے۔ اگر اسکے خلاف کیا گیا تو عوام کیا خواص کے لیے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس میں جو طوالت و دشواری ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بالفرض اگر عام پسند مضامین مبتدیانہ لکھے جائیں اور خاص مضامین منتہیانہ۔ تو اس تشتر گربہ سے کتاب بالکل غارت ہو جاے گی۔

غرضکہ اس قسم کی بہت سی علمی دشواریاں خود ترتیبِ کتاب میں پیش آئینگی۔ مگر چونکہ مجوزین نے تفصیل شایع نہیں کی ہے اس لیے میں نے بھی چند اصولی امور پر اکتفا کی ہے۔ لیکن جزئیات پر جس قدر غور کیا اُسی قدر نئی نئی دشواریاں نظر آتی ہیں۔ اگر اس تمام دردسر کا ماحصل یہ رکھا گیا ہو کہ آیندہ نسلوں کے لیے یہ انسکلو پیڈیا کارآمد ہوگی تو یہ بجاے خود بنا، غلط بر غلط ہے۔ کیونکہ

(۱) بوجہ شمول تراجم انگریزی یہ انسکلو پیڈیا ہمارے موجودہ علوم کی کوئی جامع یادگار نہیں ہوگی

(جیسی پلنی، انسٹ، وغیرہ کی انسکلوپیڈیا اپنے وقت کے مدارجِ علوم کا پتہ دیتی ہے) جس سے آئندہ زمانہ میں یہ اندازہ ہو کہ اشاعت انسکلوپیڈیا کے وقت اُردو میں اس قدر ذخیرہ جمع ہوچکا تھا اور علمی زبانوں میں اُردو کا یہ پایہ تھا۔

(۲) جس رفتار سے علوم میں ترقی ہو رہی ہے اُسکے لحاظ سے چند ہی برسوں میں اسکے مضامین فرسودہ ہو جائیں گے اور وہ آئندہ نسلوں کے لیے کچھ بھی مفید نہ ہوں گے۔

(۳) تمام زبانوں کے دستور کے خلاف یہ انسکلوپیڈیا یہ چاہتی ہے کہ اپنے لیے مصطلحاتِ علوم خود وضع کرے۔ (کیونکہ اُردو میں دو چار عام علوم کے ابتدائی مصطلحات کے سوا اس وقت تک کچھ بھی موجود نہیں ہیں) لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہی مصطلحات متفق علیہ ہو جائیں اور آئندہ تمام مصنفین و مؤلفین انہیں پر کاربند ہیں۔ اسلیے مصطلحات میں اختلافات کا ہونا قطعی ہے اور اس خلاف معمول سبقت سے انسکلوپیڈیا کے مضامین میں بڑے مغالطے پیدا ہو جائیں گے۔

پس شخصی یا قومی فیاضیوں سے اس قسم کے کام کا انجام پا جانا ایک بات ہے اور اُسکا سودمند ہونا دوسری بات ہے۔ چنانچہ شہنشاہ چین (کینگ ہی) کے حکم سے ۱۷۲۶ء میں چینی انسکلوپیڈیا پانچ ہزار بیس جلدوں میں طبع ہوئی مگر اسکا کیا حشر ہوا؟ وہ صرف سو نسخوں تک محدود رہی اور اب وہ عجائب خانوں کی زینت ہے اور بس۔ چونکہ چینی قوم میں اس سے مستفید ہونے کی اہلیت نہیں تھی۔ اتنی بڑی انسکلوپیڈیا بھی اشاعتِ علوم کا باعث نہ ہو سکی۔ بادشاہوں کی موجِ طبیعت سے ایسے بہت سے کام انجام پائے اور پھر نقش برآب کی طرح مٹ گئے۔

آب کم جو تشنگی آور بدست   تا بجوشد آبت از بالا و پست

یہ ایسے اسباب ہیں جن سے ہماری مجوزہ انسکلوپیڈیا کی کامیابی بہت ہی مشکوک ہو جاتی ہے اور میں مجوزین سے نہایت خلوص دل سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی تجویز پر کاربند ہونے کے قبل ایک بار اسپر اور غور کرلیں اور پھر بھی انکی ہمتِ بلند اگر پست نہ ہو تو اُنھیں اختیار ہے۔ مگر

کسے را کہ ہمت بلند اوفتد   مرادش بکم اندر کمند اوفتد

(قاضی) تلمذ حسین بی اے (علیگ)

مسٹر محمد علی کا خط

سلسلۂ گذشتہ

۶

گذشتہ نمبر میں حریت پسند اخبارات خصوصاً ہمدم کی بے التفاتی کا جو شکوہ کیا گیا تھا اسکے متعلق ہمدم نے ۱۶ ارجون کی اشاعت میں ایک دو کالم کا افتتاحیہ لکھ کر ہمیں ایک نئے بحث کی طرف پھیر دیا ہے جو منجملہ دیگر عوارض قومی کے ایک نہایت ہی مہلک بیماری ہے۔ اڈیٹر صاحب ہمدم فرماتے ہیں :۔

"ہمارے دوست اگرچہ ان دنوں معاملاتِ قومی کی بحث میں" پبلک" اور" پرائیوٹ" امور کو خلط ملط کر دینے کا غیر معمولی رجحان ظاہر کر رہے ہیں"۔

راقم الحروف سالہا سال سے اس مسئلے پر غور کر رہا ہے اور اپنے احباب اور متعدد بہی خواہان قوم و ملک سے اس مسئلے میں گفتگوئیں بھی آتی رہی ہیں کہ "پبلک" اور "پرائیوٹ" زندگی میں اگرچہ ایک طرح کا امتیاز پایا جاتا ہے، لیکن جن معنوں میں اہلِ مغرب "پبلک" اور "پرائیوٹ" زندگی کی تقسیم کرتے ہیں وہ اسلامی تعلیم کے قطعاً منافی اور اس بنا پر یقیناً خلافِ آئینِ فطرت ہے۔

اہل مغرب کے نزدیک، زنا، جائز۔ شراب، مباح۔ جُوا، مہذب تفریح۔ اور سود خواری بناءِ معیشت ہے۔ اور اس وجہ سے کچھ حیرت کا مقام نہیں اگر وہ "پبلک" اور "پرائیوٹ" دو قسم کی زندگیاں بسر کرتے ہیں اور ایک کو دوسرے سے اسی قدر جدا اور بے تعلق مانتے ہیں جس قدر گوروں کو کالوں سے یا انسان کو دوسرے حیوانوں سے۔

فرنگستان میں کسی نوجوان عورت کو اغوا کر کے بھگا لے جانا اور اُسکے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرنا، پبلک جُرم ہے لیکن حکومت بلدیہ کی طرف سے جن حرام خانوں کو اس نہایت ہی قبیح تجارت

کے لیے لائسنس (اجازت نامے) دیے جاتے ہیں وہاں جا کر منھ کالا کرنا ایک پرائیوٹ فعل ہے! ممالکِ مغربی میں شراب کا استعمال شاہ و گدا سب کے لیے مباح ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نشے سے مست و سرشار ہو کر کہیں ہنگامہ کرے تو وہ پبلک اور قانون کا یکساں مجرم قرار پائے گا۔ جرائم میں اعتدال قائم رکھنا ایسا ہنر ہے جس سے اہل مغرب کے نزدیک اُنکی نوعیت تک بدل جاتی ہے!

ممالک متمدنہ مغرب میں تم پوری آزادی کے ساتھ لاکھوں روپے کا جُوا کھیل سکتے ہو بشرطیکہ پرتکلف کلبوں اور گھوڑ دوڑ کے خوشنما احاطوں میں داخل ہونے اور شرکت کرنے کے تمام ذرائع تمہارے پاس موجود ہوں۔ مگر سرراہ یا کسی کے جھونپڑے میں بیٹھ کر چند۔ وہیں کا جوا کھیلنا بھی تم کو قانونی شکنجے میں کسوا دے گا!

ایک طرف شائی لاک کے ہم قوم (یہودی) محض بڑی بڑی شرحوں پر سود وصول کرنے کی وجہ سے تمام ممالک مغربیہ میں شقاوت قلبی اور سنگدلی کے واسطے بدنام ہیں، اور دوسری طرف قریہ قریہ اور چپہ چپہ پر سرکاری اور غیر سرکاری یعنی سرمایۂ مشترکہ کے بنکوں کا جال بچھا ہوا ہے جو فی الحال تجارت صنعت وحرفت وغیرہ کے فروغ کا اصلی ذریعہ بنے ہوئے ہیں!

لیکن اسلام نے ہر صورت میں زانی اور زانیہ دونوں کے لیے تعزیر رکھی ہے، شراب ہر حال میں اور ہر شخص کے لیے یکساں حرام ہے اور دوا اُسکے استعمال کا جواز ہے تو اس میں بھی شاہ و گدا کا کچھ امتیاز نہیں۔ جُوا، ہر قسم کا اور ہر موقع پر تمام نوع انسان کے لیے ناجائز ہے اور سود کسی قلیل سے قلیل مقدار میں لیجیے تو بھی معصیت ضرور ہے۔

تہذیب جدیدہ اور اسلامی اخلاق کے درمیان اس مسئلے میں جو عظیم الشان فرق ہے وہ ذیل کے واقعے سے بخوبی ظاہر ہوگا جو خود راقم الحروف کو تقریباً دس سال ہوئے پیش آیا تھا۔

اوائل ۱۹۰۶ء میں بمقام جزیرۂ ہانگ کانگ ایڈیٹر الناظر جزائر فلپائن کے ایک خاندان کے[۱]

---

[۱] جو لوگ مغربی ممالک میں رہ چکے ہیں انکو انگریزی family یا خاندان میں رہنے کے حالات و شرائط معلوم ہیں۔ مگر اسکا مفہوم عام ناظرین کے ذہن نشین کرنے کے لیے یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ کسی خاندان میں رہنا تقریباً ایسا ہے (دیکھیے صفحہ ۱۲)

ساتھ مقیم تھا۔ اس مکان میں جہاں یہ خاندان سکونت پذیر تھا تین کمرے ہم ایسے خانہ بدوشوں کے واسطے تھے۔ اور باقی حصۂ مکان، جس میں ایک بڑا کمرہ، باورچی خانہ، غسل خانہ اور چند چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ مالکہ مکان یا سرگروہ خانداں کے تصرف میں رہتا تھا۔ جہاں خود بیوہ مالکہ (عمرہ ۴۰ سال) معہ اپنے متعدد بچوں کے (جن کی عمریں تقریباً پانچ اور دس سال کے درمیان ہونگی) رہتی تھی۔

خاکسار کا تعارف جن دوست نے اس خاندان سے کرایا تھا وہ ایک جزیرۂ فلپائن کے رہنے والے نوجوان تھے جو اپنے ذہنی کمالات اور علمی مذاق کی وجہ سے خاکسار کو بہت عزیز ہوگئے تھے اور جو چیز اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کی خاص محرک تھی وہ ان دوست کی شبانہ روز کی معیت کی خواہش تھی۔ کیونکہ علاوہ ہم مذاق ہونے کے دونوں کے ملکی حالات اور سیاسی خیالات میں ایک قسم کا اشتراک و اتحاد بھی تھا جس نے ہمارے تعلقات میں ایک خاص لطف دلچسپی پیدا کردی تھی۔

فروری یا مارچ کا مہینہ تھا جب میں نے اس خاندان کے سایۂ عاطفت میں رہنا شروع کیا ہے۔ اُس وقت اس مکان میں میرے سوا چار اور اصحاب بھی رہتے تھے۔ جن میں سے ایک تو میرے ہی دوست لیونارڈ تھے جو ہانگ کانگ کے صدر ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ دوسرے پروفیسر گونسلز جو فن موسیقی کے بڑے ماہر تھے اور گورنر کے یہاں اور بڑی بڑی تقریبات میں "بنجو" یا بلیہ بجانے کے علاوہ بعض لوگوں کے گھر پر جا کر اس باجے کی مشق بھی کرایا کرتے تھے۔ تیسرے ایک جہاز کے ڈاکٹر تھے۔ ان کا جہاز منیلہ (جزائر فلپائن کا دارالخلافہ) جایا کرتا تھا۔ لہذا اُن کا قیام ہانگ کانگ میں

بجیسے کسی بورڈنگ ہاؤس یا ہوٹل یا سرائے میں ٹھہرنا۔ سرائے کے بھٹیارے، ہوٹل کے منتظم اور خاندان کے سرگروہ میں نفس الامر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ تاہم اتنا تفاوت ضرور ہوتا ہے جتنا جمہوری یا آئینی حکومت میں اور شخصی سلطنت میں۔ آخرالذکر کی مثال ایک شخصی سلطنت کی سی ہے۔ چنانچہ جو لوگ خاندانوں میں رہ چکے ہیں وہ اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہیں کہ شخصی سلطنت میں جس قدر عیوب و محاسن ہوتے ہیں قریب قریب وہی سب عیوب و محاسن اس خاندانی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی جس طرح شخصی حکومتوں کی سعادتمندی و مضرت کا انحصار اشخاص متعلقہ کی سیرۃ ذاتیہ پر ہے یعنہ خاندانوں کی خوش نظمی اور انکے ساتھ رہنے والوں کے راحت آرام، اخلاق و رویہ کا تمامتر دارومدار ہو خاندان کے سرگروہوں اور متعلقین کی شخصیت پر۔

ہفتے کے اُنھیں دنوں میں ہوتا تھا جتنے دنوں اُن کا جہاز ہمارے بندرگاہ میں لنگر انداز رہتا تھا۔ چوتھے صاحب جن کے بال بھورے، رنگت صاف، اور ناک لمبی تھی کوئی بیس سال کے نوجوان تھے جو کوئنس کالج میں تعلیم پا رہے تھے، اُن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں رہا اس لیے میں "نوجوان" لکھنے پر اکتفا کروں گا۔

یہ چاروں اصحاب مالکۂ مکان کے ہم وطن یعنی جزائر فلپائن کے باشندے تھے۔ ہسپانی زبان بولتے تھے اور میرے وہاں پہنچنے سے پیشتر سے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اور نیز اس بنا پر کہ مجھے کبھی اس قسم کی زندگی کا تجربہ نہیں ہوا تھا، مالکۂ مکان کے ساتھ ان کے بے تکلفانہ تعلقات دیکھکر مجھے بارہا یہ خیال ہوتا کہ یہ سب مالکۂ مکان کے عزیز قریب ہیں۔

ڈاکٹر اور موسیقی کے پروفیسر صاحب ایک کمرے میں رہتے تھے، میں اور میرے دوست لیونارڈ دوسرے میں۔ تیسرا کمرہ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے مشترک اغراض کے لیے تھا۔۔۔۔۔

پانچویں صاحب یعنی ہمارے نوجوان دوست بھی رہتے اُسی مکان میں تھے، مگر کہاں رہتے تھے؟ یہ عرصے تک میرے لیے معمّا رہا۔ ابتدائً بربنائے اجنبیت میرا خیال تھا کہ ان کمروں کے علاوہ کوئی اور کمرہ اس مکان میں ہے جس کا راستہ مالکۂ مکان کے کمرے کے اندر سے یا اُسی کے قریب سے ہے اور اُسی میں یہ نوجوان رہتا ہے۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد گھر کی خادمہ (ایک شانزدہ سالہ لڑکی) کے رقیبانہ جذبات نے اس واقعہ کا انکشاف کر دیا کہ وہ نوجوان کوئی علٰحدہ بستر اور کمرہ نہیں رکھتا بلکہ مالکۂ مکان کے ساتھ دونوں میں برابر کا سہیم و شریک ہے۔

شروع میں تو مجھے اسکے باور کرنے میں تامل ہوا اور ناولوں میں خادماؤں کے شوق مفسدہ پردازی کے جو واقعات پڑھے تھے اسے بھی اُسی رجحان کا نتیجہ سمجھتا رہا۔ تاآنکہ ایک دن اپنے دوست مسٹر لیونارڈ سے بھی اثنائے گفتگو میں اسکی تصدیق ہوئی۔ تصدیق ہوجانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ میں نے، لیونارڈ اور خادمہ کے مواجہہ میں نوجوان اور بیوۂ مکان کے تعلقات کے خلاف ایک پُرجوش تقریر کرکے اُنکو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب مل کر اس نوجوان کو فہمائش کریں۔ اور خود پہلے ہی

اتوار کو جب نوجوان سے نائی کی دوکان پر ملاقات ہوئی اور تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے ایک طویل لکچر کے ذریعے سے نوجوان کو اُسکی غلطی کا احساس دلانا چاہا۔ نوجوان سے بے تکلفی تو ہو ہی چلی تھی۔ کچھ تو اس بے تکلفی کے باعث اور کچھ اس سبب سے کہ میرا مشورہ تمامتر اُسی کے فلاح وبہود پر مبنی تھا۔ غرضکہ ان باتوں کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ نوجوان نے پہلے تو تمام واقعات من وعن بیان کردیے بعد ازاں اس بات کا پختہ وعدہ کیا کہ وہ جلد اپنی حالت کو بدل دے گا۔ لیکن مالکۂ مکان کا قبضہ و تصرف ایسا مگر درنہ تھا کہ میرے ایک لکچر سے اُٹھ جائے۔ لہذا میں نے یہ معمول کر لیا کہ جب موقعہ ملتا اس نوجوان کو صلاح نیک دیکر اس حالت کو فوراً بدل دینے کی تحریک کرتا۔ مگر کئی ہفتے کی کوشش نے بالآخر یقین دلایا کہ میری کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ اب غالباً مالکۂ مکان کے مشورے سے۔ نوجوان نے مجھ سے مُنھ چُرانا شروع کیا۔ اور دن میں کئی گھنٹے کی یکجائی اور پانچ سات دفعہ ملاقات ہونے کے بجاے صرف کھانے کی میز کی ملاقات رہ گئی تھی، اور کبھی کبھی وہ کھانا بھی تنہا اور علٰحدہ کھا لیا کرتے تھے۔ لہذا ایک دن میں نے اپنے دوست لیونارڈ سے کہا کہ اس ناپاک واقعہ کے علم ہونے کے بعد ہی چاہیے تھا کہ ہم تم یہاں سے چلے جاتے۔ مگر اُسوقت تک یہ اُمید لگی ہوئی تھی کہ ہماری کوششوں سے یہ نوجوان اس مصیبت سے بچ جائے گا اس لیے میں نے اس خیال کو ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اب کہ اس کا موقع معدوم ہے ہم لوگوں کو فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیے اور کہیں دوسری جگہ قیام کرنا چاہیے۔ میرے دوست لیونارڈ، جو نیم مغربی وضع و تمدن کے پابند تھے اور اپنے ضمیر و اخلاق کو اقوام متمدنہ کے ضمیر و اخلاق کا مقلد بنائے ہوے تھے اس تجویز کو سننے کے بعد پہلے تو اس واقعے پر نہایت درجہ متاسف ہوے پھر میرے جذبات کے ساتھ بہت دیر تک اظہار ہمدردی کرتے رہے بعد ازاں یوروپین فلسفۂ اخلاق کا ایک طویل لکچر سنا کے انھوں نے میری تحریک سے سخت اختلاف کیا۔ اُنکے نزدیک مالکۂ مکان اور نوجوان کے تعلقات بہت بُرے سہی مگر خود ہمارے لیے وجہ انقطاع نہیں بن سکتے تھے۔ مگر میرے لیے فی الحقیقت یہ حالت ناقابلِ برداشت تھی، لہذا میں نے مجبوراً تنہا اُس مکان کو چھوڑ دیا۔ لیونارڈ سے اس بحث پر

اُس وقت اور نیز بعد کو عرصے تک مراسلت ہوتی رہی۔ وہ میرے اس جذبے کی قدر کرنے کو تیار تھا مگر اُسکا ضمیر اس طرز عمل کو واجب نہیں قرار دیتا تھا، جو میں نے کیا۔ اور میری اس شدت پر نہایت فلسفیانہ طریق سے اُسکی ہر تحریر میں استہزا کیا گیا تھا جس سے مجھکو خود لیونارڈ سے ۔رت پیدا ہوگئی۔

اس طولانی بیان کا مقصود صرف اسی قدر تھا کہ مغرب مشرق میں جس قدر فاصلے کے لحاظ سے بُعد ہے اُسی قدر حیاتِ مذہب و ضوابطِ اخلاق کے رو سے دوری ہے۔ ہندوستان چولا بدل رہا ہے۔ تہذیب مشرق نابود ہوتی جاتی اور تمدن مغربی اسکا قائم مقام بنتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے احباب علی الاعلان "پرائیوٹ" اور "پبلک" کا امتیاز کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اسلام کے نزدیک ہر گناہ اور بدی، خواہ وہ گھر سے گھر سے تہ خانے اور بالکل تنہائی میں کیوں نہ سرزد ہو، گناہ وہ رہیگا گناہ اور بدی ہی۔ تم سمجھتے ہو کہ جو شخص صبح سے شام تک جھوٹ بولتا ہے، عیش و عشرت اور تکلف و تمتع کی زندگی بسر کرتا ہے، خواہشات و اغراض ذاتی کا بندہ بنا ہوا ہے، اور قانونِ شریعت اور دینِ فطرت کے ہر ضابطے کو توڑنے پر آمادہ رہتا ہے وہی منافع عامہ کے لحاظ سے بہترین لیڈر اور قابل احترام رہنما بن سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ راقم الحروف اسکو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تم کہوگے کہ سیاسیات۔ تعلیمات۔ اقتصادیات۔ غرضکہ مذہبیات کو چھوڑکر دوسرے تمام شعبہ جات کے لیڈروں سے اسکی توقع نہ رکھنا چاہیے کہ وہ علماے دین کی طرح متقی و پرہیزگار ہوں گے۔ میں کہتا ہوں اور یہی عقیدہ رکھتا ہوں کہ اتقا و پرہیزگاری کچھ علما کا ورثہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان متقی و پرہیزگار بن سکتا ہے۔ اور وہی ہمارا لیڈر اور رہنما ہوگا جو متقی اور پرہیزگار ہو۔ اور اگرچہ ماہرین فن کی عظمت کرنے کو ہم تیار ہیں۔ مگر ہم اسکو تسلیم نہیں کرسکتے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ سیاسی ہو یا تعلیمی۔ اقتصادی ہو یا معاشرتی اُنکے وظیفۂ مذہب سے خارج ہے۔ مسلمانوں کا مذہب چونکہ فطرت الٰہی کا آخری قانون ہے اس وجہ سے بحمداللہ اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اسکے تحت سے نہیں نکل سکتا۔

مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زبوں حالی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک یہ بھی

بدبختی ہے کہ وہ دوسروں کی کورانہ تقلید میں اپنی اچھی سے اچھی خصلتوں کو رائیگاں کر رہے ہیں۔ ظاہر و باطن کی یک رنگی مسلمانوں کی نہایت واجب الاحترام خصوصیت تھی۔ مگر آج سب سے زیادہ اسی کا فقدان نظر آرہا ہے۔

یہی ایڈیٹر صاحب ہمدم جو آج ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ

> ہمارے کرم یقیناً اپنے اس طرز عمل میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں سمجھتے کہ کسی پرائیوٹ خط کو تعلقات ذاتی کی مدد سے پڑھنے یا نقل کرنے کے لیے حاصل کرکے بعد میں اُسکو شایع کر دیا جائے۔

جب اُن کو الناظر کی اشاعت سے ایک دن قبل یہ بتایا گیا تھا کہ مسٹر محمد علی کا خط (جسے وہ ایڈیٹر الناظر ہی کی وساطت سے اشاعت سے کچھ روز قبل من وعن پڑھ چکے تھے) زیر طبع ہے تو اُنکی یہ خواہش دیکھکر کہ مطبوعہ اوراق کو وہ جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہمیں یہ وعدہ کرنا پڑا تھا کہ پرچہ تیار ہوتے ہی سب سے پہلے اُنکو ایک نسخہ بھیجدیا جائیگا۔ اور ایسا ہی کیا گیا۔ چنانچہ یہ پرچہ جن دوست کے مواجہہ اور معیت میں ایڈیٹر صاحب ہمدم کے حوالہ کیا گیا ہے وہ بعد کو ہم سے زیادہ ہمدم کی سردمہری پر متحیر تھے۔ سید صاحب نے ابتداءً توقع ظاہر کی تھی کہ ایک ہفتے تک اُنھیں بحث کرنے کے لیے اچھا مواد مل گیا۔ مگر خدا جانے خداوند ہمدم کی چشم و ابرو نے کیا کہدیا کہ ہم نے اسکے بعد کی ہر ملاقات میں سید صاحب کی برودت مزاجی کو مائل بہ ترقی پایا تا آنکہ ایک دن اُنھوں نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ

> "مسٹر محمد علی پر اس بات کا اعتماد نہیں کہ وہ جلد ان واقعات کو نسیاً منسیاً کرکے قیصر باغ پارٹی کے ہم نوالہ و ہم پیالہ نہ بن جائیں گے۔ اسلیے میں کیوں اُن سے (راجہ صاحب) بگاڑوںص"

سید صاحب! لوگوں کی پوزیشن ناقابل رشک ہو جائے تو ہو جائے، مگر میں اسے سب سے بڑی غداری اور ضمیر فروشی سمجھتا ہوں کہ کوئی اخبار نویس اپنی دماغ سوزی کے معمولی معاوضہ و تنخواہ کی خصوصی کی عزت کے خاطر حق و صداقت کا خون کرے اور

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

ص یہ الفاظ میرے ہیں۔ سید صاحب کی گفتگو کا مفہوم و مدعا یہی تھا۔

کی آڑ میں پناہ لے ! ہمدم کے متعلق اُن کا دعوٰے ہے کہ

"ہندوستان بھر کے اُردو پریس میں اسوقت صرف ہمدم ہی ایک ایسا پرچہ ہے جو فقط آزادی اعتدال کے ساتھ ملک و قوم کی حقیقی خدمت ادا کرنے کے مقصد سے جاری کیا گیا ہے۔ جس سے کوئی تجارتی منافع مطلق مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اور جسکے ایڈیٹوریل قلم پر کسی شخص یا اشخاص کا ذرا سا بھی دباؤ نہیں ہے"۔

ممکن ہے کہ صداقت، نئی روشنی، الصباح، العصر اور وکیل وغیرہ کے مالکان اس ادعاے حریفانہ کا جواب کچھ اور دیں مگر ہم صرف ایک بات دریافت کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ملک و قوم کے اس حقیقی خادم کو کیا یہ نہیں معلوم ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ جس کا صدر دفتر لکھنؤ ہی میں واقع ہے۔ کس ابتری کی حالت میں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تمام قومی اخبارات کے کیسر اور یک رنگ مطالبۂ اصلاح کے باوجود "ہمدم" نے آج تک اس بحث میں کوئی حصہ کیوں نہیں لیا ؟ کیا محض اعتدال پسندی کا نتیجہ ہے؟ یا راجہ صاحب اور سید وزیر حسن صاحب کا دباؤ اور اثر "ہمدم" کو لب کشائی کی اجازت نہیں دیتا؟

یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ "ہمدم" کی نگرانی جس کمیٹی کے سپرد ہے اُسکے ایک رُکن سید وزیر حسن صاحب بھی ہیں۔

اہل ہند کے لیے عموماً اور ہم مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ زمانہ نہایت سخت آزمایش کا زمانہ ہے چاروں طرف سنہری روپہلی مصلحتوں کا جال پھیلا ہوا ہے جو ہر ہر قدم پر ہماری فطری خواہشات اور اصلی و حقیقی جذبات کی عناں گیری کرتا ہے۔

جب ہم حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمارے ہی خواہ عَلَم بردارانِ حکومت ایک طرف اور ملک کے خطاب یافتہ اور "قدرتی رہبر" دوسری طرف ہمیں

آہستہ خرام بلکہ مخرام

کا مشورہ دیتے ہیں۔

جب ہم تعلیمی آزادی کی خواہش کرتے ہیں تو ہم سے یہی اصحاب فرماتے ہیں کہ

روم ایک دن میں نہیں بنا تھا۔

تم بھی گھبراؤ نہیں۔ رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ تم کو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

خیر یہ جواب تو ہمیں وہاں سے ملتا ہے جنھیں ہمارے سوا اور بھی کسی کی فکر ہے۔ اس لیے ہم بھی یہ کہکر اپنا غم غلط کر لیتے ہیں کہ ع پہلو میں کسی کے کبھی دو دل نہیں ہوتے۔

مگر رنج وغم اور غصہ وناگواری کی کوئی حد نہیں رہتی جب "یگانوں" کی طرف سے "بیگانگی" اور اپنے ہم مشربوں اور ہم آہنگوں کی طرف سے سرد مہری کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب "ہمدم" تیس برس سے زائد کا اخباری تجربہ اور متعلقہ اصحاب سے کم وبیش واقفیت رکھنے کے باوجود ہمیں اس "امید موہوم" میں شرکت کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر انصاری، جناب حاذق الملک اور ڈاکٹر سعید الرحمٰن بجنوری وغیرہ (راجہ صاحب محمود آباد کا نام لیتے ہوے آپ کیوں جھجکتے ہیں؟) ہندو یونیورسٹی سے بہترین یونیورسٹی دلانے میں کامیاب ہوں گے؟

ہم اپنے تجربہ کا روحت سے بجز اسکے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ

آزمودہ را آزمودن جہل است

سنہ ۱۹۱۱ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۷ء تک چھ سال کی مدت میں ایک ایک کر کے سب اصحاب کی آزمایش ہو گئی ہے اور معدودے چند کے سوا سب کا کھوٹا پن ظاہر ہو چکا ہے۔

یونیورسٹی کے متعلق ایڈیٹر صاحب ہمدم اپنی خدماتِ حسنہ کا اعتراف چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں کچھ عذر نہیں، مگر جو فروگذاشتیں اُن سے ہوئی ہیں اُن کا اظہار بھی غالبًا بیفائدہ نہ ہوگا۔

ایڈیٹر صاحب ہمدم جلسۂ فاونڈیشن کمیٹی میں موجود تھے اور اُنکو پوری طرح اُن تمام حالات کی خبر ہوتی رہی جو نواب صاحب بہاسو کی کوٹھی پر ایک پرائیوٹ جلسے میں پیش آئے۔ خود جلسے میں جو ہینا لیگی ہوئی اور تقسیم آرا کے وقت جو پیچیدگیاں "ڈالی گئیں" اُن سے بھی وہ پوری طرح باخبر تھے۔ مسئلۂ یونیورسٹی پر ابتدا سے لیکر آج تک جو کچھ ایڈیٹر ہمدم نے لکھا ہے اُس میں جگہ جگہ اشارات

اور اظہار معالات کی دھکی تو پائی جاتی ہے مگر

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

کے Safety Valves (دریچۂ حفاظتی) نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قدم پر اُنکے "خزینۂ معلومات" کو burst ہونے (پھٹ جانے) سے روک لیا۔

ہمدم کے سابق مالکان کی بابت میں سید صاحب جو کچھ کہیں مگر وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمدم میں تنہا کسی ایک شخص کا اس قدر روپیہ نہیں لگا ہے (حتیٰ کہ مالکانِ سابق کا مجموعی سرمایہ بھی اتنا نہیں) جتنا کہ "والی محمود آباد" کا ۔

ہمدم جب نکلا ہے تو مالکان ہمدم (شیخ شاہد حسین و مسٹر محمد نسیم) اور راجہ صاحب کے درمیان عقائد سیاسی و قومی کا ایک ایسا خلیج حائل تھا جسکو ہر شخص "پر خطر" اور "ناقابل عبور" سمجھ رہا تھا۔ مگر ہم اُن اسباب سے بھی بےخبر نہیں ہیں جنھوں نے اُنکے درمیان مصالحت کرا کے "ہمدم" کی آزادی کو فنا کر دیا ہے۔ لیکن یہاں اُنکے اعادے کو غیر ضروری جانتے ہیں۔

۷

اڈیٹر ہمدم نے راہ میں ٹوک کر ہمیں نفس مبحث سے بہت دُور پہونچا دیا۔ اس لیے اب ہم کو پھر مسٹر محمد علی کے خط کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس خط کے لکھنے کا اصلی مدعا تو یہ تھا کہ راجہ صاحب، جو گروہ احرار کے سرلشکر ہیں، مگر یونیورسٹی کے معاملے میں گروہِ مستبدین سے ساز کر چکے اور قوم کی آرزوؤں کو خاک میں ملانے کی کوشش میں مصروف تھے، اُنکو اس معاملت سے باز رکھا جائے۔ اسی ضمن میں یونیورسٹی کے متعلق ۱۹۱۱ء سے اس وقت جس قدر کارروائی ہوئی ہے اُس کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں ایسے ایسے واقعات کا اظہار و اعتراف بھی کیا گیا ہے جو ہرگز اس بیباکی سے نہ لکھے جاتے اگر یہ خط شائع کرنے کی نیت سے لکھا جاتا۔ مثلاً

(۱) ۱۷ ستمبر ۱۹۱۱ء میں بمقام شملہ چانسلر کے اختیارات متعلق منظوری تقریر پروفیسر ...

بارے میں مسٹر محمدؐ علی نے اختلاف کیا تو یہ امر راجہ صاحب[1] کو ناگوار ہوا

"کیونکہ سید وزیر حسن صاحب اور آپ کے منیجر صاحب کے اصرار سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آپ اس مسئلے کے متعلق غالباً کوئی اظہار رائے ممبر صاحب تعلیمات کے سامنے کر چکے تھے اور شاید یہی بیان فرما چکے تھے کہ ممبران کمیٹی کے لیے اس معاملے میں رائے تبدیل کرنا چنداں دشوار نہ ہوگا۔"

جی ہاں! آپ پہلے قول ہار جائیں اُسکے بعد تو ممبران کمیٹی آپ کے خاطر سبھی کچھ ماننے کو تیار ہو جائینگے

(۲) اگست سنہ ۱۱ء کے جلسے میں شرکت کی غرض سے مسٹر محمدؐ علی کلکتے سے لکھنؤ آتے ہیں تو سید وزیر حسن صاحب پھر نمودار ہوتے ہیں اور چونکہ

"ہز ہائینس سر آغا خاں ہندوستان میں موجود نہیں ہیں اور اجلاس متعینہ ۱۱ و ۱۲ اگست سنہ ۱۹۱۱ء کی کارروائی کی تمام ذمہ داری صاحب وزیر ہند اور غالباً آخر میں خود سر آغا خاں بھی آنجنابکے سر ڈال دینگے"

لہذا "سید وزیر حسن صاحب کی رائے تھی کہ اجلاس متعینہ ۱۱ و ۱۲ اگست کو ملتوی کر دیا جائے"

آل انڈیا مُسلم لیگ کے پریسیڈنٹ اور سکرٹری کی یہ دلیری اور قومی جاں نثاری قابل داد ہے۔

(۳) مسٹر محمدؐ علی نے بالآخر یہ حیلۂ شرعی (مسجد کانپور کے تصفیہ کے وقت مولانا قیام الدین عبد الباری صاحب نے اسی اصطلاح کی آڑ میں پناہ لی تھی) تجویز کیا کہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی محض اپنی رائے کا اظہار کر دے اور کہدے کہ اُس کا کام

"صرف ایک مناسب ترین آئین و دستور العمل مرتب کرنا تھا۔ خاص شرائط کو قبول کرنا یا انکار کرنا، اور یونیورسٹی لینا یا نہ لینا یا اُسکے لینے کو ایک وقت خاص تک ملتوی کرنا، یہ کام ساری قوم کا ہے نہ کہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا۔ اور اس کا فیصلہ صرف فاونڈیشن کمیٹی ہی کر سکتی ہے۔"

اس طرح مسٹر محمدؐ علی نے "بیک کرشمہ دو کار" کی طرح ڈالی۔ یعنی مسئلہ یونیورسٹی معرض التوا میں بھی نہ پڑا اور راجہ صاحب کو "اُس اہم ذمہ داری سے بھی سبکدوش" کر سکے۔ "جسکے متعلق سید وزیر حسن صاحب کو اس قدر اندیشہ تھا"

یہ اسی احسان مندی کا بدل ہے جو تغافل اور بے اتفاقی کی صورت میں رئیس و وزیر دونوں

[1] مراد از راجہ صاحب محمود آباد۔

مسٹر محمد علی کو دے رہے ہیں — شیخ سعدی نے سیکڑوں برس پیشتر کیا خوب کہا تھا کہ

نکوئی با بداں کردن چنان ست — کہ بد کردن بجاے نیک مرداں

(۴) دسمبر ۱۹۱۲ء کے دوسرے اجلاس میں مسٹر محمد علی نے قوم سے جو blank cheque (سادہ چک) حاصل کیا تھا اُسکے متعلق لکھتے ہیں کہ

کسی بزرگ نے ہمت نہ کی کہ جمہور مسلمانان کے سامنے اس سمجھوتے کو پیش کرکے اُنکی رضامندی حاصل کرے اور آخرش آپ سب نے مجھی کو حکم دیا کہ اِسکو جلسے میں پیش کرو اور مسلمانوں کی منظوری حاصل کرو۔

اُن لوگوں نے جو مسٹر محمد علی کے خلوص و جوش کے سچے دل سے معترف تھے، اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خود مسٹر محمد علی نہیں کر رہے ہیں بلکہ کسی کی مروت کرا رہی ہے۔ اور اسی بنا پر مولانا ابو الکلام آزاد نے اُسی جلسے میں علم مخالفت بلند کیا تھا اور کیا خوب کہا تھا کہ

با شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

آج مسٹر محمد علی کو اپنی غلطی کا خود اعتراف ہے کہ انھوں نے

"اپنے کھُلے ہوے اور دیرینہ اصولوں کے سراسر خلاف ایک جمہوری حق کو ایک محدود جماعت کے سپرد کرنے کی تجویز جمہور کے سامنے پیش کی"

سمجھوتہ - فروع میں تو خیر مضائقہ نہیں رکھتا مگر اصول میں قطعاً جائز نہیں۔ لیکن اس زمانے میں "سمجھوتے" کی استثنائی صورت متغیر ہوگئی۔ اور اُس نے ایک مسلمہ پالیسی کی جگہ حاصل کرلی ہے۔ کہ میدان عمل کی ہر منزل میں اسی پر انحصار ہوتا ہے - (باقی دارد)

غزل حسرت موہانی

گھر کے آخر آج برسی ہے گھٹا برسات کی — میکدوں میں کب سے ہوتی تھی دعا برسات کی
موجبِ سور و سُرور و باعثِ عیش و نشاط — تازگی بخشِ دل و جاں ہے ہوا برسات کی
شام سرما دلربا تھی۔ صبحِ گرما خوشنما — دلربا تر۔ خوشنما تر ہے فضا برسات کی
گرمی و سردی کے مٹ جاتے ہیں سب جس سے مرض — لال لال ایک ایسی نکلی ہے دوا برسات کی
سرخ پوشش پہ ہے زرد و سبز بوٹوں کی بہار — کیوں نہ ہوں رنگینیاں تحسین فزا برسات کی
دیکھنے والے ہوے جاتے ہیں پامال ہوس — دیکھ کر حسبِ تری اے رنگیں ادا برسات کی
لازم و ملزوم ہیں ابرِ تر و دامانِ تر — درخورِ رحمت ہے حسرت یہ خطا برسات کی

نظرے خوش گزرے

حضرت "مجاہد" کو ناظرین الناظر اور دیگر اہل ملک نام سے نہیں بلکہ اُن کے کام سے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُنکی بدل قدر کرتے ہیں۔ "اعزاز نفس" کے عنوان سے اُنکی جو نظم درج الناظر کی جاتی ہے یہ ہندوستان کے ایک مشہور شہر اور مسلمانوں کے ایک بڑے مرکز میں ایک مشاعرہ کے موقع پر پڑھی گئی تھی اور حاضرین نے پورے خلوص اور سچے جوش کے ساتھ اور خوب مزے لے لیکر سنا تھا۔ مگر باوجود اسکے کہیں چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک کرم فرمانے ہمیں عنایت فرمائی ہے اور ہم الناظر کی وساطت سے اس صدائے جرس کو کاروان گم گشتہ تک پہونچانے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔ پڑھیے اور غور کیجیے اور فائدہ اُٹھائیے۔

"اُردو انسائیکلوپیڈیا" کی تجویز ملک کے سامنے تقریباً آٹھ دس مہینے سے ہے۔ تجویز ہر چند کہ مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین اور مسٹر عبد الماجد کی طرف سے شایع ہوئی تھی مگر اس کا منبع اور سرچشمہ دراصل کہیں اور تھا۔ بہرحال منتظمین دار المصنفین نے چونکہ بربنائے مصالح اس تجویز پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، اس وجہ سے ہر دو اصحاب نے حصول مدعا کی غرض سے تجویز کو بڑی آب و تاب سے شایع کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اُردو کانفرنس کی مصروفیتوں میں اس تجویز پر لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن کانفرنس کی رو داد کی ذیل میں جو کچھ ہمنے لکھا تھا اُس سے ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمارا رجحان اس کے متعلق کیا تھا۔ بعض اصحاب یہ سمجھتے ہیں کہ راقم الحروف کو مولانا شبلی نعمانی مرحوم سے اُنکی زندگی ہی میں جو بے اعتقادی اور اختلاف تھا اُسکے باعث دار المصنفین سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ بخلاف اسکے میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ اگر مولانا شبلی ندوہ میں دخل نہ دیتے اور اپنی تمام قوت انجمن ترقی اُردو کے کام پر صرف کرتے کہ وہی اسکے پہلے سکرٹری تھے تو وہ ملک کی بہت بڑی خدمت کرتے اور خود اپنے لیے ایسی عظمت حاصل کر لیتے کہ مرحوم سر سید احمد خاں پر اگر اُنھیں تفوق نہ حاصل ہوتا تو اُنکا مرتبہ اُنکے قریب ہی قریب ہو جاتا۔ دار المصنفین کی تجویز اُسی تحریک کا ایک شعبہ ہے اور اس وجہ سے ہم بدل اُسکی کامیابی کی آرزو رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ یقین سالہا سال سے بطور ایک عقیدہ کے راسخ ہے کہ جبتک ہماری زبان کے ذریعہ سے تعلیم نہ دیجائیگی

ہماری فلاح و نجات ممکن نہیں۔ لہذا انجمن ترقی اُردو، دار المصنفین اور اس قسم کی دو کُل تحریکیں جو زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ کام بھی کر سکتی ہوں۔ ہماری دلی ہمدردی کی مستحق ہیں، اور تا امکان اُنکی خدمت کے لیے ہم تیار ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا کے متعلق بہت سے موافق و مخالف مضامین شایع ہوے ہیں مگر ہمارے دوست قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے کا مضمون جو الناظر میں نقل کیا گیا ہے مخالف تحریروں میں غالباً سب بہتر اور مدلل ہے۔ یہ مضمون "گلچیں" میں چھپا تھا، جو حضرت ریاض و جناب وسیم خیرآبادی کے زیر اہتمام سیتاپور سے شایع ہوتا ہے۔ گلچیں اگرچہ بحیثیت ایک گلدستہ کے اپنے تمام معاصرین پر فضیلت رکھتا ہو لیکن نثری ملک میں ابھی اُسکو کوئی ممتاز جگہ حاصل نہیں ہے اسی بنا پر عادت کے بالکل خلاف ہمنے اس مضمون کو یہاں نقل کر لیا ہے تاکہ علم دوست طبقے میں اسکی کافی اشاعت ہو سکے۔

النفح المدینہ۔ ایڈیٹر صاحب انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ سے اطلاع دیتے ہیں کہ اس نام کی ایک کتاب حضرت شیخ محمد عبد الباقی انصاری لکھنوی نزیل مدینۂ طیبہ کی لکھی ہوئی اور خاص مطبع علمیہ مدینۂ منورہ کی چھپی ہوئی جناب نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب کی طرف سے بلاقیمت شایع کی جا رہی ہے۔ اور بقول اُنکے اس کتاب میں نہایت قوی دلائل اور بزرگان دین کے اقوال شریفہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ ہر وہ باطن جو ظاہر شریعت کے خلاف ہو باطل ہے اور خلاف ورزی حکم رسول (صلعم) کرنے والے کے لیے تمام راستے مسدود ہیں۔ آج کل جو صدہا آدمی جُبے پہنے اور بال بڑھائے لوگوں کو مُرید کرتے پھرتے ہیں اُنکے اعمال کے محاسبہ کے لیے یہ ایک نہایت مختصر اور سہل العمل آلہ ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ حضرات صوفیہ، عربی مدارس کے اساتذہ اور منتہی طلبا اور دیگر باذاق اصحاب جو اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہیں ایک آنہ کا ٹکٹ محصول ڈاک کے لیے بھیجکر دفتر انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ سے طلب کریں۔

اس کتاب کا اُردو ترجمہ "مختارات الصوفیہ" کے نام سے انسٹی ٹیوٹ پریس نے شایع کیا ہے اور بارہ آنے قیمت رکھی ہے۔ ہمیں یہ طریقہ کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں معلوم ہوا کہ عربی کا نسخہ جس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بھی محدود ہے اور جو اس سے استفادہ کر سکتے ہیں وہ عموماً گمراہ نہیں ہوتے، تو بلاقیمت شایع ہو اور اُردو ایڈیشن ۱۲ کو فروخت کیا جائے۔ اگر نواب صاحب اُردو ایڈیشن کے مزید مصارف نہیں برداشت کر سکتے تھے تو اسکے لیے جو قلیل رقم درکار تھی وہ اُنکو بآسانی اپنے دولتمند اور معزز احباب سے مل سکتی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک فروگذاشت ہے جسکی تلافی اس طور پر ہو سکتی ہے کہ کتاب کا کُل ذخیرہ انسٹی ٹیوٹ پریس خرید کر اب تقسیم کر دیا جائے[۲]

[۲] کیونکہ فی الاصل محتاج اصلاح و تعلیم تو وہی لوگ ہیں جو عربی سے ناواقف اور قرآن و حدیث سے بےخبر ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

خوانِ ادب

ارض القرآن قرآن کریم میں بہت سی قوموں کا ذکر ہے اُنکے اعمال و نتائج کا عبرت انگیز تذکرہ ہے - اور وہ قومیں اتنی قدیم ہیں کہ مستند تاریخی زمانہ کی کتابیں اُنکے حالات پر کافی روشنی نہیں ڈال سکتیں - کلام مجید نے اُن اقوام کا تذکرہ محض عبرت حاصل کرنے کے لیے کیا ہے، اسلیے اُن کے اعمال و افعال کے وخیم نتائج بیان کر کے رہ گیا ہے - انکی مفصل تاریخی کیفیت بیان نہیں کی اور نہ اسکی کوئی ضرورت تھی -

مسلمان مفسرین جنھوں نے کلام ربانی کی تفسیر کی ہے ان اقوام کے متعلق جو تاریخی تفصیل لکھ سکے اسکا ماخذ یہود کی اثری کتابیں یا عربوں کی زبانی روایتیں ہیں - مگر ان کتابوں اور روایتوں میں مرورِ زمانہ کی وجہ سے فضول اور اوپری باتیں اتنی زیادہ مِل جُل گئی ہیں کہ انکے سبب سے وہ اعتبار و استناد کے درجے سے گر جاتی ہیں -

محققین یورپ کی یہ کنج کاویاں قابلِ داد ہیں کہ اُنھوں نے اقوام مذکورۂ قرآن کی تاریخ پر روشنی ڈالی - لیکن تعصب بیجا کی کارفرمائی نے ہنر کو عیب اور عیب کو ہنر بنوا دیا اور بجاے اسکے کہ ایک نامعلوم شے کو معلوم کرایا جاتا اس علم یا شے کا یہ مقصد قرار پایا کہ قرآن کریم کی تنقیص ہو اور ہادی برحق صلے اللہ علیہ وسلم پر حرف گیری کا ایک نیا وسیلہ پیدا کیا جائے -

اسلیے ضرورت تھی کہ کوئی خدا کا حامی دین، بندہ تحقیق کا دادہ ہو اور یورپ کے مورخین اور عالمان اثریات کی ہزیان سرائیوں کو واضح کر کے اقوام مذکورۂ قرآن کی صحیح تاریخ درایت کے اصول کے مطابق لکھتا - اور یوں علم تاریخ اور دین اسلام دونوں کی ایک ساتھ قیمتی خدمت کرتا

دار العلوم ندوۃ العلما کے ثمر شیریں اور قوم کے مربیِ سعید جناب مولانا السید سلیمان صاحب ندوی ناظم دار المصنفین نے یہ کمی پوری کرنے کا عزم کیا اور خدا کی توفیق اُن کی معین و یاور ہوئی - آخرکار کئی سال کی کد و کاوش اور چھان بین کے بعد جناب ممدوح نے اس کتاب کو تالیف فرما کر شایع کیا اور عیب بین و نکتہ چیں اصحاب کے لیے جواب باصواب اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے واسطے مزید پختگیِ عقیدہ کا سامان مہیا فرما دیا - فجزاہ اللہ احسن الجزاء -

ارض القرآن کیا ہے؟ قرآن کریم کی صحیح تاریخی تفسیر ہے - اور سرزمین نزولِ قرآن یعنی جزیرۂ نماے عرب کا بہترین جغرافیہ ہے - پھر بڑا وصف یہ ہے کہ اسکی تالیف و تصنیف میں فن درایت و انتقادِ تاریخی سے حیرت انگیز کام لیا ہے - ہم اس کتاب کو مسلمانوں کے لیے حرزِ جاں بنانے کے قابل اور شائقین علم تاریخ و جغرافیہ کے واسطے واجب المطالعہ سمجھتے ہیں -

ارض القرآن :- اس کتاب کا پہلا حصہ ہے جسمیں سرزمین قرآن (عرب) کا جغرافیہ - اقوام عرب کے

کے سیاسی، نسبی، اور قومی و تاریخی حالات سے تعلق قرآن بحث کی گئی ہے۔ اور اس سے عرب قبل از اسلام کے کارناموں پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ دوسرے حصہ کے لیے مصنف نے قریب ترین زمانہ کا منتظر بنا ہے خدا اُنکے عزم و ہمت اور صحت و اطمینان میں برکت دے کہ وہ جیتنی کتاب بھی ہمیں جلد دستیاب ہو سکے۔

کتاب میں کئی نقشے بھی دیے گئے ہیں۔ اور سب بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ نہ صرف اُردو میں بلکہ تمام دنیا کے اسلامی ادبیات میں اس فن پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ اور کاغذ و کتابت اور چھپائی سب باتیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ ضخامت ۴۲۵ صفحہ۔ اور قیمت علاوہ محصول ۵ر۔ یہ کتاب دار المصنفین۔ اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔ اور الناظر بک ایجنسی۔ چوک۔ لکھنؤ سے بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

قانون قدرت (یا) حکم پیغمبری

مولوی فاضل مولوی سید نوازش حسین صاحب

سہارنپوری ہیڈ مولوی گورنمنٹ ہائی اسکول شہر باندہ یو۔ پی۔ نے اس مختصر رسالہ میں معاشرت و تہذیب اخلاق کے متعلق فرمانات ایزدی یعنی آیات قرآنیہ کا اقتباس کر کے درج کیا ہے ترتیب معقول اور ترجمہ و تفسیر آیات سلیس و صاف ہے۔ اور جس قدر مسائل لکھے ہیں وہ جمہور اہل اسلام کے متفق علیہ ہیں۔ فاضل مؤلف سبب تالیف کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں کا ایک سلسلہ مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے وہ لکھ رہے ہیں۔ بیشک اگر انکی سب کتابیں اسی ترتیب اور اصل کے مطابق و موافق ہیں تو یقیناً قدر کتابیں ہیں۔ اور بچوں کی ابتدائی تعلیم میں نہایت مفید ہونگی رسالہ قانون قدرت کی ضخامت ۱۲ جزو ہے اور اسکی قیمت ۱۲ر علاوہ محصولڈاک وغیرہ۔ ملنے کا پتہ:- سید نوازش حسین صاحب۔ ہیڈ مولوی گورنمنٹ اسکول باندہ۔ یو۔ پی۔

تذکرۃ الشعرا

ارمغان آصفی اور حوار العرب کے مولف مولانا محمد عبد الغنی خانصاحب

مرحوم کو اپنی دوسری تالیفات کے دوران میں شعرائے فارسی کا تذکرہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس کی تکمیل اس طرح کی گئی کہ ایک فہرست مندرجہ ذیل تفصیل کے ساتھ جن جن شعرا کے نام وغیرہ معلوم ہو سکے مرتب ہوگئی تخلص۔ نام۔ سنہ وفات۔ وطن۔ ملک۔ عہد۔ اس جدول کے تیار ہو جانے کے بعد ہر شاعر کے نام پر چند سہ ڈال کر بہت مختصر سا حاشیہ دیدیا گیا ہے جو حشو و زوائد سے پاک ہونے کے ساتھ ہی "ہر چہ گیرید مختصر گیرید" کے اصول کی پابندی کا عملی ثبوت ہے

افسوس کہ جس وقت متن کتاب چھپ کر تیار ہوا تو فاضل مؤلف مرض الموت میں مبتلا ہوگئے اسی وجہ سے جناب محمد مقتدا خان صاحب نے مرتب کی طرف سے اپنی عبارت میں نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب کے نام نامی پر اس کتاب کا ڈیڈیکیشن تحریر کیا اور جناب مؤلف کے رحلت فرما جانے کے بعد اُنکے خلف مولوی عبدالحمید صاحب کے عرض حال کے ساتھ یہ تذکرہ علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے چھپکر شائع ہوا ضخامت ۱۴۶ صفحے۔ قیمت ۸ر۔ پریس مذکور سے دستیاب ہوتا ہے۔

قوت مردمی کیلیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہوکر علاج سے تنگ آگئے ہوں تو آخر میں اب ایکبار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ آتنگ نگرہ گولیوں کا استعمال فرمائیں اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں۔ گئی ہوئی اور ہاتھوں سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتیں از سر نو عود نہ کر آئیں تو ہمارا ذمہ۔ صاحبو! اسکے باب میں زمانہ کے معززین تعریف فرما رہے ہیں، لاکھوں کی تعداد میں سرٹفکیٹ موجود ہیں۔ مردوں اور عورتوں کو یکساں مفید اور نباتات سے مرکب ہیں قیمت بھی بہت کم صرف فی بکس ۳۲ گولیوں کا ایکروپیہ۔ آزمایش شرط ہے۔ یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپیہ کی دوا زیادہ ملے گی۔ پتہ:۔

وید شاستری جام نگر کاٹھیاوار

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — صہ
- تمدن عرب
- سیڈیکل جیورس پروڈنس — ے
- عربوں کا فن تعمیر — ۸ہ

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ — عہ
- حیات جامی — ۸ر
- علوم عرب — عہ
- خواتین — ۸ہ

حافظ عبد الرحمن امرتسری
- سفرنامۂ بلاد اسلامیہ — ۸ہ
- الصدیق — صہ
- المرتضیٰ — عمہ
- سیاحت ہند — ۸ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ — عہ
- المدنیۃ والاسلام — ۸ہ

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر — ے
- وکیل نسواں — ۸ر

سید رفیع موہانی
- تاج و نشان — ۶
- دستار و کلاہ — ۸ر
- گنج شائگاں — ۶ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۶ر
- شمع و شاعر — ۲ر
- بلال — ار
- شکوہ — ۲ر
- جواب شکوہ — ۳ر
- نالۂ یتیم — ۳ر
- فریاد امت — ۳ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز — عہ
- وکرم اروسی — عہ

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور مع البم — ے
- نشاط عمر — عہ
- عصائے پیری — ۱۲ر
- اقبال و وطن — ۸ہ
- حسن معاشرت — عہ

مولانا عبد اللہ العمادی
- کتاب المعارف — ۸ہ
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر
- علم الحدیث — ۸ر
- صناعۃ العرب — ۳ر

مولوی مصباح الدین
- الماردن — ۸ہ
- محاربۂ فرانس و پرشیا — عہ
- مصباح الادب — مہ

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ۸ہ
- روزنامہ باتصویر — ے
- " بلا تصویر — ۸ہ
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر و قمر — مہ
- رسول کی عیدی — ۲ر
- پیاری ٹکڑی — ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ۱۰ر
- گانا خاتون — ۲ر
- اسلام کا انجام — ۱۲ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — ۱۲ر
- میلاد نامہ — مہ
- کرشن بیتی — ۶
- اُردو دعائیں — ۶ر
- فلسفۂ شہادت — ۳ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۶ر
- جگ بیتی — ۶ر
- بچوں کی کہانیاں — ۶
- اسرار — ۳ر
- کم ٹو موت — عہ

منشی انوار الحق
- تاریخ ابو البشر — ۸ہ
- حقائق اسلام — ۶ر
- اثبات واجب الوجود — مہ
- قوت خیال — ۳ر
- اصول خانہ داری — ۳ر

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) — ہے
- حسن سرور (") — ہے
- دیول دیوی — ۸ہ
- گورا — ۸ہ
- نیل کا سانپ — ۸ہ
- جعفر و عباسہ — ۸ہ
- اختر و حسینہ کامل — ۶ہ

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس — ۸ہ
- اقصائے مغرب — ۸ہ

پروفیسر نواب علی
- تذکرۃ المصطفیٰ — ۸ہ
- معارج الدین — ۸ہ

منشی سعید احمد
- آثار اکبری — ۶ر
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۳ر

منشی محسن الدین خاں خوش
- جمیلہ خاتون — ۳ر
- قومی گیت — ۵ر
- زنانہ خطوط — ۵ر
- لاڈلا بیٹا — ۳ر
- اصلاح الرسوم — ار
- حوران جنت — ۳ر
- رفیق مرضا — ۳ر
- صبح شفق — ۳ر

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المعلمین — ۶ر
- معیار الاخلاق — ۲ر
- تنقید لطیف — ۵ر
- تربیت اولاد — ۴ر

مولوی معین الدین
- اورنگ زیب — صہ
- بدمزاج شوہر — ار
- رادھا بیگم — ار

مہاشے پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم — ۵ر
- مہاتما بدھ — ۱۰ر
- خدا اور روح — ۱۲ر
- مارٹن لوتھر — ۳ر
- سیرۃ المستورات — ۱۲ر
- بچوں کی کہانیاں — ۱۳ر

منشی پریم چند
- پریم پچیسی — ۱۲ر
- سیر درویش — ۳ر

ارشد تھانوی
- حسن تخیل — ۱۲ر
- بیاض ارشد — ۸ر

سید ابراہیم
- جاپان — ۸ہ
- جنگ روس و جاپان — ۸ر

مشہور مصنفین لکھنؤ

منشی امیر مینائی مرحوم

صنم خانۂ عشق	مہ
مراۃ الغیب	۱۲ر
خیابان آفرینش	مہ
خطوط منشی امیر احمد	مہ

مولانا عبد الحلیم شرر

جنید بغدادی	ضر
ابو بکر شبلی	مر
خواجہ معین الدین	۴ر
مقدس	مہ
حروب صلیبیہ	عہ
تاریخ بغداد	۶ر
تاریخ سندھ	عہ
ملکۂ زنوبیہ	۲ر
الحکم الرفاعیہ	۳ر
آغا ئی صاحب	مہ
سکینہ بنت حسین	۸ر
محذرات	مہ
زوال بغداد	مہ
غیب دان دولہن	مہ
حسن بن صباح	۲ر
افسانۂ قیس	۳ر
مقدس نازنین	جہ
قیس و لبنیٰ	مہ
ایام عرب	مہ
حسن انجلینا	مہ
منصور موہنا	مہ
دلکش	۹ر
سیف و تیغ	۴ر
ماہ ملک	عہ
شوقین ملکہ	عہ
ملک العزیز ورجنا	مہ
رویتہ الکبریٰ	مہ
فلورا فلورنڈا	عہ
فتح اندلس	عہ
یوسف و نجمہ	مہ
آغا صادق کی شادی	۱۰ر
ہندو انساں کی مصیبت	۳ر
حسن کا ڈاکو	مہ
دربار حرام پور	۱۰ر
خوفناک محبت	مہ
لعبت?	۱۲ر
فلپانا	مہ
فاتح مفتوح	مہ
ہندوستان کی موسیقی	۴ر
سرسید کی وفی ترتین	۲ر

منشی جوالا پرشاد برق

مرتالنی	۱۰ر
ماہ اتیں	۱۰ر
بنگالی دولہن	۶ر
پرتاب	۴ر
معشوقۂ فرنگ	۶ر
بروگ	۵ر
...	۴ر
رو رہتی	مہ

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین	۶ر
حاجی بغلول	۸ر
پیاری دنیا	۸ر
نادار لونڈی	۸ر
میٹھی چھری	۴ر
کایا پلٹ	۱ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

ہشو	۲ر
بچھڑی دولہن	۸ر
کرم دھم	۶ر
پی کہاں	۶ر
کامنی	مہ
جام سرشار	مہ
سیر کہسار	سہ
خدائی فوجدار	عہ
فسانۂ آزاد	عہ

منشی احمد علی شوق قدوائی

ترانۂ شوق	مہ
قاسم و زہرہ	۱۲ر
عالم خیال	مہ
سیکفرن ولوسی	۲ر

منشی محمد لطیف مرحوم

اکسیر	عہ
ادہنگ زیب	عہ

مرزا رسوا

امراؤ جان ادا	۱۱ر
لیلیٰ مجنوں	مہ
نوبہار	۲ر
مثنوی سیدیم	۳ر

جلال مرحوم

مضموں ہائے دلکش	عہ
نظم نگاہی	مہ
افادۂ تاریخ	۸ر
رسالہ تذکیر و تانیث	۲ر

علامہ سید احمد

حمایت الاسلام حصہ اول	صہ
" حصہ دوم	۱۲ر
فن ہیئت	۸ر
فن کیمسٹری	۶ر

منشی حیدر علی مرحوم

تاریخ تمدن	مہ
شباب لکھنؤ	مہ
مرقع اردو	۲ر

مسٹر عبد الماجد

فلسفۂ جذبات	صہ
فلسفۂ اجتماع	عہ
غذائے انسانی	۳ر
فلسفہ کی تعلیم	۲ر

مسٹر انیس احمد

ہاجرہ کی کامیابی	۲ر
بحری جنگ	مہ

خواجہ عشرت لکھنوی

زبان دانی	۳ر
اصلاح زبان اردو	مہ

مطبوعات الناظر پریس

قواعد اردو	عہ
کلیات محسن	عہ
محاربات صلیبی	عہ
رموز فطرت	عہ
ازواج الانبیا	عہ
تسخیر فرانس	مہ
واقعات کربلا	مہ
الاحسان	۸ر
میلاد ابن جوزی مترجم	۱۳ر
حیات نظامی	۱۳ر
جمیل و بثینہ	۳ر
سیکفرن ولوسی	۲ر
اتفاقات زمانہ	۱ر
شوکیہ	۱ر
نادان خدا پرست	۱ر
مصنوعی شوہر	۳ر
زندہ شیطان	مہ
نوبہار	۲ر
خوان دعوت	۱۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

النّاظر

نمبر ۹۹ جلد ۱۷ — یکم ستمبر سنہ ۱۹۱۷ء

اگر

آپ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو تندرست رکھنا چاہتے ہوں تو

لال شربت

پلاویں کلیجے کی کمزوری وکھانسی ولاغری کو دور کرنا چاہتے ہو تو

لال شربت

پلاؤ۔ پیدایش کے وقت سے ہوشیار ہونے تک یہ دوا یکساں فائدہ کرتی ہے پینے میں شیریں اور رنگ سرخ ہونے کی وجہ سے لڑکے خواہش سے پیتے ہیں۔ آپ بھی اپنے بچے کو استعمال کراکے آزمایش کیجیے قیمت ۱۲ فی شیشی محصولڈاک ۶

قوت کی گولیاں

۳۰ برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہورہی ہیں طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس، اشکلینا، ڈامینا ملاکر یہ گولیاں بنی ہیں اسلیے۔ مغز۔ ریڑھ۔ رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعویٰ رکھتی ہیں۔ زیادہ محنت۔ جوانی کی خرابی بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز فائدہ ظہور میں آتا ہے۔ بدن میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرے پر رونق اور جوانی میں ضعیفی کی سی حالت ٹوٹے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے۔ قیمت ۳۰ گولیوں کی شیشی دو ہفتے کی خوراک کا ایک روپیہ محصولڈاک ۱ سے ۳ شیشی تک ۵۔ دیکھیے اڈیٹر صاحب تہذیب دکن کیا فرماتے ہیں ہمنے ڈاکٹر صاحب کی تدبیت پر خیال کرکے ۳۲ گولیاں منگائیں اسکے تیر بہدف اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہیں تو ان گولیوں کی قیمت بجائے ایک روپے کے ۵ روپے رکھنی چاہیے تھی

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

آپ جانتے ہیں انسان کی زندگی خون سے ہے اسلیے خون صاف رکھنا ضرور ہے۔ اسکی ترکیب آسان ہے۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کا آئی اوڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں کسی چیز کا پرہیز نہیں ہے۔ یہ سالسہ صاف کرکے اس میں پوٹاس ائی روڈائڈ وغیرہ کئی ایک آزمودہ ادویات ملا کر بنتا ہے اسلیے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے۔ گرمی۔ آتشک۔ گٹھیا وغیرہ۔ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ سے خون بگڑ گیا ہو تو اسکو استعمال کیجیے۔ خون بگڑنے کی دو وجہ ہیں۔ آتشک و گٹھیا ایسے عارضے ہیں۔ پارہ ملی ہوئی ادویات استعمال کرنے سے خون بگڑ جاتا ہے۔ پوری حالت فہرست منگا کر دیکھیے۔

قیمت دو روپے (عہ) محصولڈاک ۶ر

ڈاکٹر ایس کے۔ برمن نمبرہ تارا چند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۹۹ جلد ۱۷ — یکم ستمبر سنہ ۱۹۱۷ء

بجلی

ہر انسان نے زمانۂ بارش میں بجلی چمکتے دیکھی ہے اور بادلوں کی کڑک سنی ہے۔ سب سے پیشتر پروۂ دنیا پر برقی طاقت کے جو تجربات کیے گئے تو برقی شعلے کو بجلی سے منسوب کیا اور اُسکی آواز کو بجلی کی کڑک سے۔ یہ نام جو رکھے گئے اُنکی وجہ یہ تھی کہ کوئی مناسبت عالم کو معلوم ہوئی تھی بلکہ یہ صرف لفظی مناسبت سے جیسا عام طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں اصل مناسبت بنجامن فرانکلن نے سنہ ۱۷۴۹ء میں تجربے سے ثابت کی۔ اور دنیا کو یہ تبلا دیا کہ جو برقی شعلہ ہم کو پردۂ دنیا پر ملتا ہے اور جو اُسکی آواز ہے وہ بالکل وہی ہے جو شعلۂ کرۂ باد میں بجلی کے نام سے موسوم ہے اور کڑک رعد سے۔ بعد کے تجربات نے یہ بتلایا کہ بادلوں کی موجودگی برقی حالت کے کرۂ باد میں وجود کے واسطے لازمی نہیں۔ بلکہ برقی طاقت ہر موسم میں کرۂ باد میں موجود رہتی ہے۔ مگر عموماً مثبت ہوتی اور شاذ و نادر منفی۔ جب مطلع بالکل صاف ہوتا ہے تو ہمیشہ مثبت برقی ہوا میں ہوتی ہے اور بلندی کے ساتھ اسکی مقدار بھی بڑھتی جاتی ہے۔ تنہا اونچے مقام پر تو بڑی مقدار میں ہوتی ہے لیکن مکانات، سڑکوں اور درختوں کے نیچے مثبت برقی کبھی پائی نہیں گئی۔ ۔ کھلے میدانوں

بندرگاہ اور پل پر البتہ پائی گئی ہے۔ لارڈ کلون (Lord Kelvin) نے ایک مرتبہ صرف ۹ فیٹ کی بلندی پر جزیرہ آرن میں مثبت برقی کو پایا تھا۔

صبح ۵ بجے سے ½۷ بجے تک مثبت برقی قلیل مقدار میں ہوا میں ہوتی ہے۔ پھر موسم کے لحاظ سے ½۹ بجے بڑھتی ہے۔ بعد ازاں ½۲ بجے سے لیکر ½۴ بجے شام تک کم ہوتی جاتی لیکن بعد کو ½۶ بجے شام سے ½۹ بجے رات تک۔ اور بعد ازاں باقی رات برقی طاقت کم ہوتی رہتی طلوع آفتاب تک اس کا گھٹاؤ اور بڑھاؤ اور بیرومیٹر آلہ کا گھٹاؤ بڑھاؤ ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ یہ حالت سال بھر رہتی ہے۔ لیکن جب مطلع صاف ہو اور موسم دلپسند تو محسوس ہوتی ہے بہ نسبت گندہ موسم کے۔ اور بہ نسبت گرمی کے جاڑے کے خوشگوار میں زیادہ ہوتی ہے یا دوسرے معنوں میں گرمی اور نمی کے خلاف اسکا دور ہوتا ہے۔ جب آسمان پر بادل ہوتے ہیں تو کبھی مثبت بجلی ہوتی ہے اور کبھی منفی۔

پالمیری (Palmieri) کا خیال ہے کہ جب منفی بجلی پائی جائے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ ۴۰ میل کے اندر یا تو بارش ہو رہی ہے یا برف باری یا ژالہ باری۔ اکثر ہے کہ ایک ہی دن میں کئی مرتبہ ان دونوں طریقے کی بجلیوں میں رد و بدل ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کی حالت میں جب بارش ہو رہی ہو یا برف باری۔ تو اگر ایک دن مثبت بجلی ہوا میں موجود تو دوسرے روز منفی۔ لیکن تعداد مثبت اور منفی ہونے کی ایک موسم یا ایک حالت میں ہمیشہ دوسرے کے برابر ہوگی۔

پلٹیر (Peltier) کے تجربات نے یہ ثابت کیا کہ زمین کی بجلی ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ یہ ایک اہم اور عجیب تجربات ہے۔

ہوا میں بجلی کے ہونے کے اسباب پر اگرچہ بہت کچھ رائے زنی کی گئی مگر ہنوز روز اول ہے۔ کیونکہ سائنس کسی ایک بات پر اب تک نہیں جمی۔ وولٹا (Volta) نے سب سے اول یہ بتایا کہ پانی جب بخار بنتا ہے تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن پولیٹ (Pouillet).

مقطر پانی کو جب بھاپ کی حالت میں تبدیل کریں تو کسی قسم کی بھی بجلی پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر اس میں تھوڑا نمک مل کر دیا جائے تو کیسی ہی قلیل مقدار میں بھی ہو پھر بھی انجرات میں مثبت بجلی ہوگی اور شربت میں منفی - یہ حالت معکوس ہو جائے گی اگر پانی میں کوئی تیزاب ملا دیا جائے۔ محض ان تجربات کی بنا پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ چونکہ زمین کے پانی میں شوریت ہے، لہٰذا انجرات جو نکلیں اُنھیں مثبت بجلی ہونا چاہیے اور باقی ماندہ پانی میں منفی۔

پولیٹ (Pouillet) کا خیال ہے کہ وجود بجلی کا باعث پانی کے قطرات کا حل شدہ چیز سے علیحدہ ہونا ہے۔ لیکن ریس (Riess) اور ریچ (Reich) کا خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے اس رگڑ کا جو قطرات میں بخارات بنتے اور برتن سے علیحدہ ہوتے وقت ہوئی - یہی خیال آرم اسٹرانگ (Armstrong) اور گینگین (Gaugain) کا ہے

سوہنک (Sohncke) نے اپنے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ اگر پانی کے چھوٹے قطرے برف سے رگڑ کھائیں تو کثیر مقدار میں بجلی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اُسکے خیال میں کرۂ بادکی بجلی اسی وجہ سے ہے۔ کیونکہ طبقۂ اعلیٰ میں پانی اور برف دونوں کا وجود ممکن ہے۔ برف کے ریزے مثبت بجلی سے مملو ہوتے ہیں اور پانی منفی سے - جب یہ قطرے بطور بارش گرتے ہیں تو اپنے حصہ کی بجلی ہمراہ لیتے آتے ہیں۔ یہی خیال زوینی ([illegible]) کا ہے۔

سید محمد نسیم تقوی (ملیگ)

فصلِ بہار باغ میں مہماں ہے چند روز　　　اے بلبلو یہ رنگِ گلستاں ہے چند روز

حسنِ شباب ماہ وشو بے ثبات ہے　　　دیکھو تجلیِ مہِ تاباں ہے چند روز

کس کو یہاں ثبات ہے کس کو ہمیشگی　　　آیا ہے جو جہاں میں وہ مہماں ہے چند روز

اغیار جب شریک ہوئے پھر کہاں یہ لطف　　　حسن و بہارِ محفلِ جاناں ہے چند روز

کیسے مسیح ہو کہ خبر بھی نہ لی کبھی　　　بیمارِ عشق اور بھی مہماں ہے چند روز

آفاق اک ہے ذات فقط اُسکی لا یموت　　　ورنہ جہاں میں جو ہے نمایاں ہے چند روز

فن پرواز اور اسلامی نظارہ

(خاص النّاظر کے واسطے)

از خامۂ جناب آقائے اکرم مولٰنا السید احمد صاحب علامہ ہندی

فرانس میں ۱۷۸۳ء میں سب سے پہلے ایسا غبارا ایجاد ہوا کہ جو گھانس پھونس جلا کر اُڑایا جاتا تھا - جس سے ہوا گرم کر کے ہلکی کیجاتی تھی اور وہ (۲۰۰۰) فیٹ اونچا ہوتا تھا - پھر ہوا سرد ہو کر بھاری ہو جاتی تھی اور غبارہ جلد نیچے گر پڑتا تھا - اہل فرانس نے اس ترکیب کو پسند کیا "ڈاکٹر شارل" نے ہیڈروجن کی قوت سے ۱۷۸۳ء میں اُڑایا - پھر اُس میں نئی نئی تراش خراش ہوئی - "کی لوساک" نے اس فن میں شہرت حاصل کی اور سطح بحر سے (۲۳۰۰۰) فیٹ اونچا اُڑا ایسے لطیف کرۂ ہوا میں پہونچا جس سے دَورانِ خون میں شدت ہو گئی - سانس لینی دشوار ہوئی - یہاں تک کہ حرکتِ نبض کی فی دقیقہ ۱۲۰ ہو گئی - اور "ڈاکٹر گلیشیر" آخر ۱۸۶۱ء میں مابین ۳۶۰۰۰ - اور ۳۷۰۰۰ قدم کے اونچا اُڑا - حتیٰ کہ شدتِ سرما سے ۱۶° میں صفر کے نیچے پارہ آگیا اور اُس پر ایک قسم کی بیہوشی طاری ہو گئی - مختصر روز بروز نئی تراش خراش رہی - پھر ایسے مصالوں اور الیومنیم کی چادروں سے بنانے لگے جس سے ہوا نفوذ نہیں کر سکتی - اور اس کو ہیڈروجن یا کاربونک گیس سے بھرتے ہیں اور اُس میں ایک چھوٹی کشتی لگاتے ہیں جسمیں بیٹھتے ہیں - اور بارومیٹر سے پستی و بلندی کا غبارہ کی اندازہ کرتے ہیں - اگر نیچے آنا منظور ہوتا ہے تو رسی کھینچکر دروازہ کھول دیتے ہیں اور اُس سے تھوڑا گیس نکل جاتا ہے - جس سے غبارہ نیچے اُتر آتا ہے - اور اگر چاہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ نیچے لاویں یا دوبارہ بلند کریں تو، ریت کی تھیلیاں جو پاس لیکر بیٹھتے ہیں انکو پھینک دیتے ہیں جس سے غبارہ ہلکا ہو کر اوپر چڑھ جاتا ہے - یہ پہلی ایجادیں تھیں، جو اب بچوں کا کھیل ہیں - اب تو ایروپلین، اور زپلین، کی ایجادوں نے عقل کو

حیرت میں ڈالا ہے۔

۱۸۰۹ء میں آسٹریا کے ایک باشندے "کینیر" نے ایک کتاب شایع کی تھی اور اسکا نام رکھا تھا "عقابوں کے ذریعے سے غباروں کے اُڑانے کا نیا طریقہ" اس سے تھوڑی مدت بعد ایک جرمن حکیم نے اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھی جسکو قیصر جرمن کی گورنمنٹ نے پٹینٹ کرادیا۔

مگر ان سب ایجادوں سے پیشتر جبکہ "کینیر" کا ہنوز عالم ارواح میں وجود تھا اُس وقت ہامان وزیر فرعون نے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ ایک تابوت بنایا اور عقاب کے بچوں کو سکھانا اور تربیت کرنا شروع کیا۔ جب وہ خوب بڑھے اور قوی ہوے تو چاروں ستونوں میں تابوت کے اُن کو باندھا اور ہر سمت اوپر تابوت کے لکڑی لگائی اور اُس میں گوشت باندھا۔ عقاب کو بھوکا رکھا تھا اور پیر اُنکے لکڑی سے باندھے تھے۔ جب وہ عقاب گوشت دیکھتے بھوک سے اُسی کی طرف بڑھتے اور اپنے پروں سے گوشت کی طرف لپکتے تھے اُسی قدر تابوت اونچا ہوتا تھا۔ اور جس قدر تابوت اونچا ہوتا اُسی قدر عقاب کی کوشش اور بھوک بلند ہونے پر مجبور کرتی تھی۔ جب تمام روز اُڑے، فرعون نے ہامان سے پوچھا، کہو آسمان تک پہونچے؟

ہامان۔ آسمان اُسی طرح دکھائی دیتا ہے جیسے زمین پر سے معلوم ہوتا تھا۔

فرعون۔ اچھا زمین کو دیکھو۔

ہامان۔ اب زمین نہیں دکھائی دیتی صرف دریا اور پانی کی چمک معلوم ہوتی ہے۔

جب عقاب اتنا اونچا اُڑے کہ آفتاب بھی غروب ہوا (یعنی زمین آفتاب تک حائل ہوگئی) اور چمک دریا اور پانی کی بھی اب نظر نہیں آتی اُس وقت۔

فرعون۔ اچھا ہامان اب دیکھ آسمان کو۔ (معلوم ہوتا ہے یہ تابوت بند تھا جس سے رقیق ہوا کی اذیت نہ ہوئی تھی)

ہامان۔ (آسمان کو دیکھکر) اُتنا ہی دُور معلوم ہوتا ہے جتنا زمین پر سے دُور معلوم ہوتا تھا۔

جب تارے آسمان پر چمک گئے اب ہامان نے سر اُٹھا کر پھر دیکھا آسمان کو۔

فرعون۔ کیوں ہامان۔ اب آسمان پر پہونچے یا نہیں ؟

ہامان۔ اُسی طرح سے تارے معلوم ہو رہے ہیں جیسے زمین سے معلوم ہوتے تھے اور زمین اب سیاہ ہی معلوم ہو رہی ہے"۔ پس شدید ہوا چلی۔ جس سے تابوت ہوا پر قائم نہ رہ سکا اور نیچے زمین پر اُتر آیا۔ (مجمع البحرین)

جرمنی و آسٹریا کی کتابیں ناقابل تسخیر ہوں اور اسلامی خبروں پر ہنسا جاوے۔ یہ او نے کرشمہ ہے نئی روشنی کا۔ جرمنی نے عقاب کے طریقوں کو پیٹنٹ کر دیا اور اسلامی خبروں کا مذاق اُڑتا ہے۔ کیا یہی ہے سائنس کی ترقی۔

حضرت سلیمان کی نسبت خدا فرماتا ہے" اور سلیمان کے واسطے عاصف (ایک قسم کی ہوا) تھی جو انکو خدا کے حکم سے اُس زمین پر لے گئی جس میں ہم نے برکت دی تھی (سورۂ انبیاء) کتب اسلامی میں حضرت سلیمان کی سیر و سیاحت کو ہوا پر دیکھو۔

ابن المغازلی، شافعی، اور شاقب المناقب عیون المعجزات سید مرتضیٰ علم الہدیٰ و مناقب ابن شہر آشوب وغیرہ میں حدیث بساط کو پڑھو۔ حضرت رسولؐ کا بساطِ حضرت سلیمانؑ طلب کرنا اور اصحابؓ کو اپنے اور حضرتِ علیؑ کو بٹھا کر ہوا میں اُڑانا اور سیر و سیاحت کرانا بعد کونٹ زیلین کے طیارے اور "میجر بیدی ول" کے طیاروں کی ایجاد کے کیوں ناقابل قبول ہے؟ بساط عربی میں اُس شئے کو کہتے ہیں جو پھیلے اور منتشر ہو (دیکھو صحاح جوہری، قاموس) کیا ہوائی جہازوں کو بساط کہنا عربی میں صحیح نہیں، یا موجودہ اصطلاح میں بساطِ حضرت سلیمان کو طیارہ کہنا غیر صحیح ہوگا۔ ہرگز نہیں۔ ہوائی سفر کا جب کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا اُس وقت حضرت سلیمان کا طیارہ ایک ساعت میں ایک ماہ کا سفر طے کرتا تھا۔ اور اصحاب رسول خدا نے آسمان کی اُس وقت سیر کی تھی جبکہ فرانس و جرمنی میں یہ خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا۔ جس قدر سائنس کی ترقی ہوگی اُسی قدر اسلامی فلسفہ ثابت ہوتی جائے گی۔ دیکھو تفصیل اس مضمون کی ہماری کتاب فلسفۃ الاسلام میں۔

پھولوں کی سیر

آفتاب روز روشن کی حکومت ختم کرنے کے بعد مغرب کی طرف چلا ہی تھا کہ بیٹھے بیٹھے میرا دل گھبرا گیا۔ کمرے سے اُٹھا۔ کوٹ پہنا اور سڑک کی ایک جانب چل دیا۔ میں اسی طرح قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک پھاٹک نظر آیا۔ اندر گیا تو قدرت کا ایک باغ کھلا تھا۔

روشیں ہری ہری دوب سے آراستہ، پٹریاں مختلف رنگ کے پتھروں سے ساختہ غنچوں کا چٹکنا، پھولوں کا کھلنا، دل کو فرحت دماغ کو طراوت بخشتا تھا۔ جس طرف نظر پڑتی تھی عیش و کامرانی ہی نظر آتی تھی۔ ہر طرف سبزی ہی سبزی دکھائی دیتی تھی۔

باد صبا عجب ناز و انداز سے جھومتی جھامتی گلوں کے بند قبا کو وا کرتی تھی۔ کہیں گلاب کا تختہ کھلا تھا، کسی جا بیلا چٹک رہا تھا۔

غرض اُس باغِ پُر بہار کا لطف اُٹھاتا ہوا خراماں خراماں ایک روش سے دوسری روش پر پہونچا۔ یہاں سے ارادہ کیا کہ سامنے والی گھانس پر جو مخمل سے زیادہ نرم اور قاقم سے زیادہ گدگدی معلوم ہوتی تھی جا کر لیٹ رہوں۔ ابھی دو چار قدم ہی گیا تھا کہ صدا آئی۔

"اے انسان! آہستہ

آہستہ خرام بلکہ مخرام زیرِ قدمت ہزار جانست"

یہ سنتے ہی گھبرا کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی مگر کوئی شکل نظر نہ آئی۔ دل میں خیال کیا کہ یہ غیبی آواز ہے یا میری عقل کا دھوکا؟ اسی سوچ میں تھا کہ پھر وہی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ حواس یکجا کیے اور غور سے سننے لگا:-

صدا۔ "نادان! تو کس پھیر میں ہے۔ ذرا عقل سے کام لے۔ غضب خدا کا اشرف المخلوقات ہو کر قدم سنبھال کر رکھنا مشکل ہو گیا۔ کج رفتاری کی یہاں تک نوبت پہونچی کہ

پامال اک زمانہ ہے طرز خرام میں

شراب خودی کے نشہ میں تو ایسا مخمور ہوگیا کہ چشم بصیرت کو خیرباد کہ دیا۔ اور اندھوں کی طرح اس سبزۂ نورستہ کو اپنے قدموں کے نیچے کچلنے لگا۔ نادان! آنکھیں کھول اور دیکھ

اسکے پردے میں سکندر کی نہ ہو مٹی خراب   اس میں پوشیدہ کہیں دارا کی دارائی نہ ہو

آہ! جو خود ہی مٹ چکے ہوں، جو خود ہی برباد ہو چکے ہیں تو انکی خاک پر سبزے کے اُگنے کا بھی روادار نہیں۔ اُف۔ اس عمر دو روزہ پر یہ غرور اور اتنا گھمنڈ

شمع مغرور نہ ہو اپنی خود آرائی پر   رات بھر کی یہ تجلی ہے سحر کچھ بھی نہیں"

یہ سننا تھا کہ آہ سرد کھینچ کر زمین پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا اور قلب کو قدرے سکون ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ فرشتہ صورت بالیں پر کھڑے ہوے آہستہ آہستہ اپنے دامن سے ہوا دے رہے ہیں۔ اُنکو دیکھتے ہی میں کھڑا ہوگیا اور ایک گھبرائی ہوئی نظر اُنپر ڈالی۔ وہ میری یہ حالت دیکھکر فرمانے لگے۔

"اے خاکی پتلے! اتنا ہراساں نہ ہو۔ ہوش و حواس سنبھال۔"

میں۔ "بندہ نواز آپ کا نام؟"

جواب۔ "خرد"

میں۔ "خرد؟ حضرت مجھے آپ ہی کی تلاش تھی۔ بڑی محنت و کوشش کے بعد آپ ملے اب میرے ساتھ رہیے اور اس باغ کے طلسم کی حقیقت مجھ پر ظاہر فرمائیے۔"

خرد۔ "بصارت ایک بہشتی حور ہے اُسے ساتھ لے وہ تیری مدد کریگی۔"

یہ کہکر اُس نے تالی بجائی۔ تالی بجانا تھا کہ حور میرے سامنے موجود۔ بس دیکھتے ہی آنکھیں چندھیا گئیں۔ قریب تھا کہ میں اندھا ہو جاؤں کہ اُسنے اپنی طلسمی چھڑی سے میری آنکھوں کے پردوں کو چھوا۔ چھڑی کا لگنا تھا کہ آنکھیں حقیقت کی روشنی سے منور ہو گئیں اور پھر سیر کرنے لگا۔ غرض بصارت کا ہاتھ تھامے ہوے گلاب کے تختے کی طرف نکل گیا۔ جہاں میں بڑا سا پھول لگا تھا۔

وہ مجھے بہت پسند آیا۔ اُسکی دلفریب صورت پر فریفتہ ہوکر لپکا کہ اُسے توڑ کر اپنے گوشۂ دل میں جگہ دوں، مگر بصارت نے ڈانٹ کر کہا: "دیکھ! کیا کرتا ہے۔ باز آ!" لیکن میں نے اُس کا کہنا نہ مانا اور دوڑ کر پھول پکڑ لیا۔ پھول پکڑنا تھا کہ دو تین تیز کانٹے میری اُنگلیوں میں نشتر کا کام کر گئے۔ خون بہنے لگا۔ میں ابھی خون روکنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک غنچہ کھلکھلا کر ہنسا اور چٹک کر بولا۔

"اے آدم زاد! یاد رکھ۔ جس چیز میں ظاہری نمائش ہوتی ہے اُسکا باطن دیسا پاک اور صاف نہیں ہوتا۔ بُرائیاں نیش عقرب کی طرح اُسکے پہلو میں نہاں ہوتی ہیں۔ اِندرائن کے پھل کو دیکھ! ظاہر میں کیسا خوب صورت اور دلفریب ہوتا ہے مگر اُسکا باطن سم قاتل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ گُل پر نظر کر! دیکھنے میں کیسا خوشرنگ اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس خوبصورتی کے پردے میں بھی خار چھپا رہتا ہے۔ دھوکا، دغا، فریب، مکاری ان صورتوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یہی حال دنیا کا ہے۔ اس دہرِ ناپائدار میں بڑی بڑی شان و شوکت اور جاہ و حشمت کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ نونہالان چمن کی بڑی پُرکیف اور دلفریب مورتیں دکھائی دیتی ہیں مگر سب سے بیوفائی کی بو آتی ہے۔ سراسر دغا، فریب و مکاری ٹپکتی ہے۔

اے صورت پرست! کسی کا ظاہر مت دیکھ، بلکہ اُن کے دلوں پر نظر کر۔ پھر تجھے اس تصنع اور ظاہری نمائش کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اے بیخبر یاد رکھ کہ دنیا ایک سرسبز و شاداب اور فرحت بیز باغ ہے لیکن اُسکے ہر پھول اور ہر شاخ میں کانٹے کا ہونا بھی ضروری اور لابدی ہے"

وہ نورس کلی یہ کہتے کہتے سرد آہ بھر کر زمین پر گر پڑی۔ میں اُسکی نتیجہ خیز تقریر کو سُنکر دم بخود رہ گیا۔ اور اس طلسم کو نہ سمجھ سکا۔ آخر کار اپنے رہنما کے قدموں پر بدحواس ہو کر گر پڑا اور اُس سے غنچے کے گرنے کی حقیقت دریافت کی۔ بصارت نے مجھے زمین سے اُٹھایا ہی تھا کہ تین صورتیں اور نظر آئیں۔ ایک کی پیشانی پر عبرت، دوسرے کی ہوش، اور تیسرے کی پیشانی پر جواس لکھا ہوا تھا۔

میرے اُٹھتے ہی ہوش و حواس نے مجھے زنجیروں میں جکڑ کر گرفتار کر لیا۔ میں اُنکی اس حرکت پر بہت پریشان ہوا اور فریاد کرنے لگا۔ عبرت نے ہوش و حواس کو حکم دیا کہ اسے سنبھالو اور پھر بولی۔

"بے خبر! یہ ہستی، ہستیِ فانی ہے، موہوم ہے، اسکو قرار نہیں۔ دُنیا کے اسٹیج پر ہزاروں شکلیں نمودار ہوتی ہیں، اپنا اپنا جلوہ دکھا جاتی ہیں۔ لاکھوں نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن آخر کار گُم ہو جاتی ہیں۔ غنچہ جو زمین پر گرا تھا اُس نے دنیا کی بے ثباتی کا سچا ثبوت دیا تھا۔ تو کوتاہ عقل اُس سے سبق نہ حاصل نہ کر سکا۔ دیکھ! یہ تمام کارخانہ چشم زدن میں درہم برہم ہونے والا ہے۔ نہ یہ باغ رہے گا نہ یہ پودے، نہ یہ پھول رہیں گے نہ یہ سبزہ۔ انکی تمام سرسبزی و شادابی خاک میں مل کر رہ جائے گی۔ سیکڑوں گلہائے رنگیں اور لاکھوں غنچہ ہائے ناشگفتہ نذر صرصر ہو جائینگے یہ باغ جہاں بہار جھوم جھوم کے گلوں سے لپٹتی ہے، کلیاں فرطِ طرب سے کھلی جاتی ہیں، کل خزاں کے ہاتھوں ایسا لوٹ لیا جائے گا کہ نشان تک نہ ملے گا۔ یہ صاف صاف پٹریاں اور یہ خوشنما روشیں ٹُٹتے ٹُٹتے ایسی ملیامیٹ ہونگی کہ انکا پتہ بھی نہ لگے گا۔ آ۔ میں تجھے اس باغ کی حقیقی کیفیت سے آگاہ کروں۔"

یہ سنکر عبرت ایک جانب ہولی۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ وہ دونوں سپاہی مجھے مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے۔ غرض ایک جگہ جہاں چند جھاڑیاں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں ٹھہر گئی اور اُن سے یوں بولی۔

"لے تونہالو! ذرا اپنی کہانی سناؤ۔" یہ سنتے ہی ایک بڑا سا پھول پیدا ہوا اور سامنے آکر کہنے لگا "اے شاہزادی!

جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا   کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر

مگر کوئی اپنی اصلی حقیقت و سچے وجود کو نہ سمجھ سکا۔ میری ہستی بھی ایسے ہی وجود سے وابستہ ہے میرا جب نام و نشان بھی نہ تھا تو لوگ تمنی نگاہ سے میرے منتظر تھے، میرے وجود کے لیے بیقرار تھے

غرض میں عالم ہستی میں ایک غنچے کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ چنبیلی میری ماں ہے اسی کے آغوش میں رہکر بڑے شاہانہ طور سے پرورش پائی۔ اسی کے سرسبز گلشن کا ایک پھول ہوں۔ نرگس نے جو میری دایہ ہے، مجھے آنکھوں میں رکھکر پالا۔ ابر میرے نہانے کے لیے صاف شفاف پانی لاتا۔ بادِ سحر میرے جسم کو صاف کرتی۔ ہمیشہ بہار کے جھولوں میں جھولا کرتا۔ اور جب آفتاب گردشِ روزگار سے تنگ آکر پناہ لینے دوسرے ملکوں میں بھاگ جاتا تو میں مہتابی پر چاندنی بچھاکر سویا کرتا۔ سرو و شمشاد میری حفاظت کرتے۔ سنبل تازیانہ لیے ہوئے ادھر اُدھر ٹہلا کرتا اور گلچیں کے ظالم ہاتھوں سے مجھے محفوظ رکھتا۔ غرض اس طرح میری نشوونما ہوئی۔ بچپن ختم ہوا اور اب وہ زمانہ آیا جبکہ عالم شباب کی خوش آیند اور پُرمسرت رنگینیاں میری رگ رگ میں جوش پیدا کرنے لگیں۔ بہارِ حسن کی بدولت پھولا نہ سماتا تھا۔ تکبر و زعم کی وجہ سے سر نیچا نہ ہوتا تھا۔ سبزہ آغاز ہوتے ہی میرے جسم سے عطر کی لپٹیں آنے لگیں۔ غرض اب میری شگفتگی کے لیے بادِ سحر کا ایک ہلکا سا جھونکا درکار تھا۔ آج علی الصباح جبکہ میں سوکر اُٹھا اور اپنے پندارِ حسن میں مست تھا کہ ایک خفیف سا جھونکا میرے دامن کو پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ آہ! اُس وقت کا حال تجھ سے کیا بیان کروں، اب مجھے معلوم ہوا کہ میری زندگی کا یہ آخری دور ہے۔ میری ہستی چند ہی ساعت میں نیست و نابود ہونے والی ہے۔ اے شاہزادی! اب میرا اس چمن میں رہنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اول تو گلچیں کا خوف۔ اور اگر اس سے نجات بھی پائی تو بادِ سموم کے ہاتھوں سے کب بچ سکتا ہوں آخر ایک نہ ایک دن مٹی میں مل جاؤں گا۔"

یہ تقریر ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ کسی کے بُلانے کی آواز آئی۔ مُڑکر دیکھا تو سوسن بہ آوازِ بلند پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ہوش و حواس مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں لے گئے۔ بصارت و عبرت آگے آگے۔ میں خاموش۔ غرض وہاں پہونچے تو مجھے دیکھتے ہی اُس نے بہت سی کھری کھری باتیں سنائیں۔ خدا جانے کیا کیا زبان درازی کرتی رہی۔ میں اُسکی باتوں سے گھبراکر ایک طرف بھاگا۔ کہ عبرت نے مجھے روکا۔ اور ڈانٹ کر کہا:-

"بے وقوف! کیوں اپنے کو تباہ و برباد کرتا ہے؟ کیوں اپنی مٹی خراب کرتا ہے؟ اس عالم فانی کی زندہ مثالیں تیرے سامنے پیش کر دی گئیں لیکن اب تک تو نہ سنبھلا۔

راستہ چلنے میں آنکھیں بند، یہ غفلت تری　　　ہوش میں آ ہے تری رفتار میں دیوانگی

ارے ظالم! ان کلیوں کو دیکھ۔ تکبر و غرور کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کل تک ہی غنچے جامے میں پھولے نہ ساتے تھے، آج کیسے مرجھائے ہوئے ہیں؟ اے انسان! تو بھی انھیں کی طرح نیست و نابود ہو جائے گا، تیری رعنائی بھی سب خاک میں مل کر رہ جائے گی۔ افسوس! تو اپنی عمر دو روزہ کے لیے کیسے کیسے سامان مہیا کرتا ہے اور کیا کیا گھمنڈ کرتا ہے۔ اہلِ دول اپنی دولت فانی پر اتراتے ہیں۔ بادہ نخوت کے نشے میں کیسے سیہ مست ہو جاتے ہیں۔ کوئی اپنے علم پر غرور کرتا ہے، اور کوئی بہادری کے نشے میں چور رہتا ہے کہ ہم سپاہی ہیں، تلوار کے منھ چڑھتے ہیں، سینے کو سپر بناتے ہیں۔ مگر

ہو گئے لقمے زمیں کے موت سے کھا کر شکست　　　فوجِ دارا لشکرِ نوشیرواں کچھ بھی نہیں

امراء، روساء، بڑی بڑی حویلیاں اور محل تعمیر کراتے ہیں۔ ہر قسم کا سامان عیش مہیا کرتے ہیں، نرم گدوں اور گدگدی مسندوں پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ تاجدارانِ ملک مستحکم سے مستحکم قلعے تیار کراتے ہیں کہ غنیم قبضہ نہ کرنے پائے، ملک ہاتھ سے نجانے پائے۔ گویا عمر جاوداں کی رجسٹری انھیں کے نام ہوئی ہے۔ علما فضلا اپنے علم و فضل پر ناز کرتے ہیں۔ مصور اپنی فکر میں مرے جاتے ہیں اور نقل کو اصل کر دکھاتے ہیں کہ تصویر گویا اب بولا ہی چاہتی ہے۔ فصحا اپنی بڑیں غرق، کہ دم تقریر منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غرض "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت"۔ مگر مآل کار پر کسی کی نظر نہیں "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" کو سب بھول جاتے ہیں۔ نادان! آنکھیں کھول اور بقا و فنا کے باریک مسئلے پر غور کر تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ نہ سلاطین پیشیں کے دربار رہے، نہ قارون کا خزانہ۔ نہ بابا آدم رہے نہ بی بی حوا۔ دیکھ دنیا کی بے ثباتی کی کتنی پیاری تصویر ہے۔

یہ دنیا نہیں قابلِ اعتبار　　　بُرے ہیں زمانے کے میل و نہار

وہ گلشن کہ جس میں ہزاروں تھے پھول | وہاں دیکھیے تو جھے ہیں ببول
جہاں پہ چہکتے تھے مرغانِ باغ | وہ ہے مسکنِ کرگس و بوم و زاغ
جہاں کل جواہر کے انبار تھے | کروروں درم اور دینار تھے
وہاں کیا ہے اب خاک اور سنگ ہے | عجب کچھ زمانے کی نیرنگ ہے
سروں پہ تھے جنکے جواہر کے تاج | جو لیتے تھے شاہان سرکش سے باج
جو تھے تخت شاہی پہ مسند نشیں | وہ ہیں خواب میں آج زیرِ زمیں

اچھا دیکھ! آنکھیں بند کر۔ میں تجھ کو ابھی ایک عجیب غریب تماشا دکھاتی ہوں، اور دُنیا کی نئی نیرنگیوں کی سچی تصویر بناتی ہوں"۔

میں نے معاً اُسکے حکم کی تعمیل کی۔ پھر اُسنے آنکھ کھولنے کو کہا میں نے آنکھ کھول دی۔ آنکھ کھولنا تھا کہ عجیب منظر نظر آیا۔ یاس کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئیں۔ ناامیدی دُور سے بھیانک صورت دکھاتی، ہوا سے بوے حسرت آتی، ہر برگ و بار سے طلسمات کی سی کیفیت نظر آتی۔

میں اس حیرت افزا منظر کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا، اور ابھی خاموش تھا کہ دور سے سنسناہٹ کی آواز آئی۔ ہوش و حواس نے مجھے سنبھالا تو معلوم ہوا کہ بادِ سموم کی آمد آمد ہے۔ بس اس زور کا ایک جھونکا آیا کہ میں اُسکی شدتِ گرمی کی بدولت بے ہوش ہوگیا۔ آنکھ کھولی تو سوکھے ہوے درخت، مرجھائے ہوے پودے، دو چار ٹوٹی پھوٹی روشیں اور ٹیڑیاں نظر آئیں۔ نہ ہوش و حواس ہیں اور نہ عبرت۔ دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور خوفناک آواز سے عبرت! عبرت! پکارنے لگا۔ آخر مایوس ہوکر یہ شعر پڑھتا ہوا گھر واپس آیا۔

خاک کے پتلوں پہ توڑے ہیں انھیں دونوں نے ظلم | یہ زمیں یارب نہ ہو یہ چرخِ مینائی نہ ہو

سید سرور عالم مارہروی

سحرِ عید بھی ہے، جلوۂ خورشید بھی ہے، | جشنِ جمشید بھی ہے، رقص میں ناہید بھی ہے،
جمع سب عید کے ساماں ہیں مگر اے ہمدم! | سچ بتا اُن سے گلے ملنے کی اُمید بھی ہے؟

امیر علی زخم لکھنوی

چمکدار رات

دو تین سال ہوئے جب میں نواب سالار جنگ بہادر بالقابہ کی جاگیر کیلی میں تعلقدار تھا، اور بتقریب دورہ اُسی علاقہ تری کے دورے میں مصروف تھا، ایک مقام منیرآباد پر میرا کیمپ ہوا۔ یہ مقام نہایت خنک اور دلکش سبزیوں کا مخزن ہے۔ مشہور مقدس ندی تنگ بھدرا اس موضع میں سے گذری ہے۔ کنار رود کا سواد نہایت دلکش ہے اور خود ندی ایسے پیچ وخم سے رواں ہوئی ہے کہ " نظارہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست"۔ ایک رات منظر سے اثر پذیر ہو کے چند اشعار موزوں ہوئے تھے، وہ نذر الناظر ہیں :-

بنی ہیں چاند کی کرنیں جو نشترِ فصاد
رگِ جنوں سے ہوئی چھیڑ پھر مبارک باد

ضیائے صبح بھی دیکھی ہے پر یہ بات کہاں
ذرا تو چاندنی راتوں پہ آجکل ہے صاد

کنارِ رود ہی ہیں سبز پوش ٹیلے بھی
ہے عکس ماہ کا پانی میں صورتِ ہمزاد

ہیں کنج سبز درختوں کے مایۂ راحت
یہ گرمیوں میں ہیں جنت برائے آدم زاد

اگرچہ تابشِ موسم ہے ہم عنانِ خزاں
گریباں کا شگفتہ ابھی تلک ہے سواد

یہ تنگ بھدرا کی فیاضیوں کی برکت ہے
نہیں ہوا ہے جو شادابیوں میں کوئی فساد

عجب ندی ہے جہاں جس طرف سے گذری ہے
خزاں کے ہاتھ سے محفوظ ہو گیا ہے سواد

پہاڑیوں میں ہے روپ اسکا دید کے قابل
زبانِ حال سے دیتے ہیں سنگریزے داد

کہیں کتر کے چلی ہے کہیں ہے سیدھی چال
بتانِ حضرت کاشی کے سب چلن ہیں یاد

غضب ہے بنتی ہے ظالم شباب باراں میں
سنگار کرتی ہے سو سو طرح کے یہ ایجاد

سفید نور کی چادر سے ڈھانپتی ہے بدن
نثار کرتے ہیں موتی ہزار ابر و باد

کبھی تو جوش میں آبادیوں سے ملتی ہے
کبھی زراعتوں کو جا کے کرتی ہے برباد

حیا پرست ہے اب گرمیوں کے موسم میں　　دگر: موسم بارش میں ہے بڑی آزاد
بہار اس کی اگر چاندنی میں ہو مطلوب　　تو اہلِ ذوق ضرور آئیں پھر منیر آباد
نظارہ اس کا کریں ریلوے کے پُل پر سے　　تو دور تک، نظر آئے گی یہ ستم ایجاد
ضیاءِ مہ سے ہم آغوش دیکھ لیں اسکو　　یہ حُسن وعشق کی رسوائیوں کی ہے بنیاد
سبھی مناظرِ قدرت سے ہوتے ہیں خرسند　　گر وہ دل کہ ہے جن میں کسی حسین کی یاد
اُنھیں نہ ماہِ منوّر سے ہوتی ہے فرحت　　نہ اُنکو کرتی ہے ندی کی مہ جبینی شاد
ہے اُن کے پیشِ نظر صرف ایک ہی صورت　　اُسی سے رکھتے ہیں دنیائے دل کو وہ آباد
دو آتشہ نہ ہو جب تک بہار ہی کیا ہے　　جو گُل نہ ہو تو ہے بلبل کی رائگاں فریاد
نہ دلنواز ہو جب تک کہ چہرۂ زیبا　　ہے برق پاشیِ مہتاب مایۂ بیداد
خلاصہ یہ ہے نظر تو رہینِ منظر ہے　　مگر ہے حضرتِ دل کی طرف سے یہ ارشاد
صبا بنزدِ لبِ بسمل بگو کرم بنما　　بہار خیز طرب ریز شد مُنیر آباد

امین احسن رضوی بسمل

مجھے اپنے حال سے اے خدا، کہیں غفلتِ جَجَری نہ ہو
نظر آئی طور پہ جو، کہیں وہی آگ مجھ میں بھری نہ ہو!
مری آنکھ گو دہو بھیک کی، تری کائنات اگر ملے
جو نہ دے بصر نہ سہی، مگر مرا عار، کم نظری نہ ہو
نہ چمن بہار میں پھٹ پڑے، نہ زمیں سے ابر لپٹ پڑے
جو ترے جمالِ جلیل کو کبھی شوقِ پردہ دری نہ ہو
وہ پرند جو کہ ہے جمع دل کسی کنج باغ میں غنچہ سال
اُسے ناگوار قفس نہ ہو، گلۂ شکستہ پری نہ ہو!
گئی رُت بدل تو بلا سے تھی، کہ میں ہوں خمار میں ہاشمی
مرا روزِ عیش وہ رات ہے جسے خدشۂ سحری نہ ہوا

سید ہاشمی (فرید آبادی)

نظم

بتقریب تہنیت خطاب یابی شفاء الملک حکیم محمد عبدالرشید خاں صاحب رئیس اعظم لکھنؤ

(از نتیجۂ فکر منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی)

جو ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو ٹون ہال دہلی کے عظیم الشان جلسے میں پڑھی گئی۔

سرور و عیش کی محفل میں دھوم دھام ہے آج — شب وصال ہے ہجراں کا اختتام ہے آج
مراد دل کی بر آئی ہے شاد کام ہے آج — کہ اک حکیم زمانے میں نیک نام ہے آج
شفاء الملک کا سرکار سے ملا ہے خطاب — نہیں ہے دہر میں عبدالرشید خاں کا جواب
کیا ہے آپ نے حکمت کا مدرسہ جاری — جہاں میں علم کی تکمیل ہو گئی ساری
کچھ ایسی رکھتی ہے تاثیر انکی غمخواری — کہ نام سنتے ہی ہوتی ہے دور بیماری
سلوک آپکا سب سے جو ہے محبانہ — تمام ہند میں مشہور ہے شفاخانہ
عجب طریق سے طبی کلب بنائی ہے — کلب نہیں ہے یہ بزم ادب بنائی ہے
سبب ضرور ہے کیا بے سبب بنائی ہے — یہ انجمن بھی فضیلت طلب بنائی ہے
کوئی بھی آپکا حکمت سے کام خالی ہے — خیال آپ کا آئینۂ کمالی ہے
ہیں اپنے وقت کے مشہور آپ افلاطون — خدا کے فضل سے رتبہ ہے دہر میں افزوں
گورنمنٹ نے سوچا کہ اور تو کیا دوں — شفاء الملک کا بیشک خطاب ہے موزوں
عجب طریق اطبا کی قدردانی ہے — سخنوروں کے لیے دور کامرانی ہے
دعا خلیق کی ہے آپ کا بڑھے اقبال — عروس بخت سعادت دکھائے حسن و جمال
تمام عمر رہے زر سے ہاتھ مالا مال — سوال پرسش جو آئے تو قومیت کا سوال
ملے وہ دست شفا موجۂ نسیم نہیں — جہاں میں لوگ مسیحا نفس حکیم کہیں

اُف مری صبحِ جوانی بخیر انجام سے

حضرت نیاز فتح پوری کی ایک نظم "صبحِ جوانی کی ایک شام" کے عنوان سے ابھی جون ۱۶ء کے "نقاد" میں شایع ہوئی ہے۔ جو سر سے پانوں تک مرصع اور اپنے رنگ میں بے نظیر ہے۔ "نقاد" کی یہ خوش قسمتی قابل صد رشک ہے کہ اُسے ایسی پاکیزہ نظمیں دستیاب ہوتی رہتی ہیں۔ بلکہ اسی کے واسطے لکھی جاتی ہیں، اسی کے دامن سے وابستہ، اسی کے صفحات تک محدود اور بذریعہ رجسٹری محفوظ رہتی ہیں

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قبل اس کے کہ نیاز سند نفس نظم کی ثناخوانی میں رطب اللساں ہو، اسکے جدت طراز عنوان کی طرف ناظرین کرام کی توجہ منعطف کراتا ہے۔

"صبح پیری" اور "شامِ جوانی" تو آج تک سیکڑوں زبانوں پر آئے ہوں گے، ہزاروں قلموں سے نکلے ہوں گے، اور لاکھوں کان ان سے آشنا ہوں گے "صبحِ جوانی" نہ کسی کے زبان وقلم پر آیا ہوگا نہ کسی کے کانوں نے سُنا ہوگا۔ ازل سے یہ حضرت نیاز کے لیے اس طرح مخصوص کر رکھا گیا ہے جس طرح آپ کی ذاتِ خجستہ صفات نقاد علیہ الرحمۃ کے واسطے۔ صدق اللہ تعالےٰ، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء!

اب اس اچھوتے عنوان کی لاجواب نظم ملاحظہ ہو:۔

دردِ الفت سے ابھی ہستی مری بیگانہ تھی مجھ کو سامانِ مسرت، سوزشِ پروانہ تھی
بے اثر سی چیز بزمِ جلوۂ جانانہ تھی ہر ادا میری حضورِ حُسن گستاخانہ تھی

بے نیازی میں مری انداز بیباکانہ تھا
میرا ہر طرزِ عمل دنیا میں خود دارانہ تھا

دردِ الفت سے بیگانگی و یگانگت کچھ دل کے ساتھ زیادہ موزوں اور اچھی معلوم ہوتی ہے
گر خیر آپ کے ارشاد کے موافق "ہستی" ہی سے سہی۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
باید گفت اینک ماہ و پروین

دوسرا مصرعہ اپنے تمام ساتھیوں سے بیگانہ بلکہ ان کا مخالف ہے۔ شروع سے آخر تک تو عشق سے ناواقفی بے تعلقی بیان ہو رہی ہے مگر اس میں اثراتِ عشق کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب بے غمی کا عالم تھا، دردِ عشق سے بیگانگی تھی اور یہ ایک نامعلوم بات تھی کہ عشق کسے کہتے ہیں اور حسن کس شے کا نام ہے، تو پھر خوشی اور عیش و عشرت کا سامان کیوں سوزشِ پروانہ یعنی تپشِ عشق تھا؟ شاید "سوزشِ پروانہ" کے معنی کچھ اور ہوں جو باوجود غور و فکر کے نیازمند کے فہم کج میں نہ آسکے۔

قلب تھا اپنا ابھی بیگانۂ تفتیدگی
تھی نہ جانِ مطمئن کچھ واقفِ کاہیدگی
تھیں تمنائیں نہ اپنی درخورِ شوریدگی
تھی ابھی نہ باتِ دل میں خلوت آرمیدگی

اک سکوں تھا صرف جس سے دل مرا لبریز تھا
ایک فراغِ آرزو تھا جو نشاط انگیز تھا

چوتھے مصرعہ میں "خلوت" کے متعلق صرف اتنی عرض ہے کہ ایک بیکار سی لفظ معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کھینچ تان کے اعتراض سے بچا لی جائے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ موٹے موٹے الفاظ کی گراں باری کو، غریب و ناتوان اُردو کے سر کا تاج سمجھنے کی وبا روز بروز عام ہوتی جاتی ہے۔ اور عربی فارسی لیاقتوں کا انحطاط اس کرڑوے کریلے کو اور نیم (نیب) پر چڑھا رہا ہے۔

آہ وہ دن عازمِ مغرب ہوا جب آفتاب
مضطرب رنگینیاں تھیں اُس طرف زیرِ سحاب
ڈھلکی کرنیں جب سمٹ کر ہوگئیں رنگِ شہاب
تھی ابھر ملونیں سے منظر ایک آغوشِ نقاب

جتنی تاریکی زیادہ بڑھ رہی تھی شام کی

چاندنی آتی ہی پھیلی جا رہی تھی بام کی

"آہ" یہ لفظ بھی آج کل اور بہت سی لفظوں کی طرح بے معنی ہو گیا ہے۔ جس کا جہاں جی چاہتا ہے بے دھڑک بلا لحاظ استعمال کر دیتا ہے۔ نظم میں تو فیر ایسے الفاظ وزن پورا کرنے کا کام انجام دے دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ "ہمین" برائے بیت" اور اُن کے ناظم صاحب کو کم مشق کہ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اُس کی طرح اُن کا علاوہ خلا نظم و نثر میں بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

بوقتِ غروب، آفتاب کی کرنوں کے سمٹنے کو "رنگِ شہاب" فرمانا بھوپالی تجربہ سے تعلق رکھتا ہے!

چوتھے مصرعہ میں "آغوش" "خلوت" کی طرح محض بھرتی ہے، اور نطاقِ بیان کی تنگی نے "ایک" کو "آغوش" کے پہلو میں بٹھا کے مہلیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یعنی جلووں سے نقاب کی ایک اور صرف ایک آغوش مضطر تھی۔ آخر مصرعہ میں "بام" کی تخصیص محض قافیہ پیمائی ہے جب تک پہلے سے یہ نہ بیان کر دیا جائے کہ جنابِ شوق صاحب کے تھے پر جلوہ فرما تھے اُس وقت تک اعتراض سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اور "پھیلی جا رہی تھی" شاعر کی قادر الکلامی کی ایک اچھی مثال ہے۔

آہ میں کس سے کہوں وہ شام کیسی شام تھی　　اُف وہ کیسی برق تھی قائم جو رُوے بام تھی
اُس طرف طرحِ نقابِ رُخ جو بے آرام تھی　　اس طرف میری جوانی لرزہ بر اندام تھی
اُس طرف اُلٹا ہوا سے پردۂ روے حسیں
اِس طرف میری نگاہیں تھرتھرا کر گر پڑیں

"آہ" کی رسائی دیکھیے گا، اس بند کی بسم اللہ بھی اسی کے سایہ سے ہوتی ہے، دوسرا مصرعہ بھی وزن سے گرا جاتا تھا کہ یہیں "اُف" نے لپک کے سنبھال لیا۔

شاید ہمارے ہمہ داں شاعر کو یہ نہ معلوم ہو گا کہ اظہارِ تعجب کے لیے "آہ" موضوع ہے

نہ "اُف" اور "قائم بر روے بام" یا "بروے بام" کے بجاے، یہ "قائم روے بام" کی بھی ایک ہی رہی! ضرورتِ شعری نے جہاں "اُف" اور "آہ" کی بھرتی کی، وہاں "روے بام" سے حرفِ جر کی تخفیف بھی بول دی۔ بغیر اس عزل و نصب کے انتظامِ بیت کیونکر درست و چست، اور وزنِ فاعلاتن کس طرح پورا ہو سکتا تھا؟ واقعی شاعری اسی کا نام ہے۔

تیسرے مصرعہ میں طرحِ نقاب "آغوشِ نقاب" کی عدیل و رقیب ہے۔

تھی اسی کے حُسن سے لبریز آغوشِ حیات　　جس کے جلوے کے لیے تھی تنگ ساری کائنات
جس نگہ سے ایک دُنیا کو نہ مل سکتی نجات　　آہ اُس کا اب اسی جانب تھا روے التفات

اِس طرف بے اختیارانہ جو لب پر آہ تھی
اُس طرف بھی اِک نگاہِ اضطراب آگاہ تھی

"لبریز آغوش" کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب جہاں اُردو سے ناواقف ہیں وہاں فارسی استعمالات سے بھی ناآشنا ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ اُردو نثر ادا آغا صاحبان کا یہی وصف امتیازی ہے۔ یہ حضرات ابوالفضل اور دیگر متاخرین کی طرح نئی نئی خوش اسلوب ترکیبیں اور عمدہ عمدہ جدت طراز تشبیہیں تراشنا تو چاہتے ہیں، مگر اس کے واسطے علاوہ ذوقِ سلیم و طبعِ مستقیم کے اہلیت اور اساتذہ کے کلام پر عبور کی بھی اشد ضرورت ہے جس کے لیے یہاں اللہ میاں کا فضل ہی فضل اب نظر آتا ہے۔ پھر نتیجہ لامحالہ وہی ہونا چاہیے جو ابوالذہاب حضرت زاغ کو ہنس کی چال چلنے میں پیش آیا تھا۔

تیسرے مصرعہ میں اُسی ضرورتِ شعری سے ایک "تھی" گرا کے قادرالکلام شاعر نے سب مصرعوں سے اُسے الگ کر لیا ہے۔ چوتھے میں دیکھیے "آہ" پھر مصرعہ پورا کر رہی ہے۔ علاوہ اس خدمت کے یہاں ایک انوکھے معنی بھی پیدا کرتی ہے۔ یعنی افسوس! جس معشوق کے ساتھ حیات وابستہ ہے۔ اس کا روے التفات میری طرف ہے!! کتنا تاسف و حسرت کا مقام ہے، جس قدر افسوس و غم کیا جائے کم ہے!!!

وہ نگہ تھی اُسکی یا اک شعلۂ بے رنگ تھا ــــ یا مذاقِ ناوک اندازی تپش آہنگ تھا
آنکھ سے نشترِ نگاہِ ناز اک تیر نگ تھا ــــ جوشِ مے تھا جسپہ گویا آبگینہ تنگ تھا
روح میں میری بپا ہنگامۂ بیتاب تھا
خون تھا میری رگوں میں یا رواں سیماب تھا

نگاہ کو شعلۂ بے رنگ کہنا درست بلکہ خوب ہے۔ لیکن شعلہ کے مقابل اسے ناوک اندازی کا مذاق فرمانا نہ درست ہے نہ خوب، بلکہ ایک لغو بات ہے۔

تیسرے مصرعہ کا انداز ماسبق سے الگ ہوگیا تھا تو خیر لیکن مابعد سے بھی جو بالکل بے تعلق رہا تو "عندلیبے غراب ہم قفس" کا سا مضمون ہوگیا۔ چوتھا مصرعہ اپنی جگہ بے تکلف اور برجستہ تھا لیکن شاعر نہ اس نگینے کو جڑ سکا نہ اسکے لائق اسے انگشتری مل سکی۔ اس لیے اسکا بھی یہی حال ہے

شاہدے درمیانِ کوران است ــــ مصحفے درمیانِ زندیقاں

پانچویں مصرعہ میں "ہنگامۂ بیتاب" صرف قافیہ کو نباہ رہا ہے۔

آنکھ اُٹھی اُس کی درِ میخانہ یا وا ہوگیا ــــ وہ نگہ تھی یا تموّج مے میں پیدا ہوگیا
کیا کہوں کیا کر دیا اُس نے مجھے کیا ہوگیا ــــ تُند تھی مے ایک ہی جرعہ میں نشۂ ہوگیا
بادہ آشامِ نظارہ کیوں نہ پھر دیوانہ ہو
جب کسی کی اک نظر تکلیفِ صد میخانہ ہو

جس طرح آنکھ اُٹھنے سے درِ میخانہ کے وا ہونے کی تشبیہ درست وصحیح ہے اسی طرح مے میں تموّج پیدا ہونے کی تشبیہ محض نگاہ سے، غلط اور مہمل ہے۔

اخیر شعر میں بادہ آشام کو دیوانہ کہا گیا ہے لیکن بادہ آشام دیوانے نہیں ہوتے۔ مست سرشار، مدہوش وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دیوانوں اور مجذوبوں کی کچھ باتیں مستی و سرخوشی کے عالم میں مشابہ و یکساں ہو جایا کرتی ہیں۔

روح دیوانہ تھی اُس چشمِ فسونپرداز پر ــــ جان مے جاتی تھی مُٹھی اُس ادائے ناز پر

دل تھا یا رقصاں نظر کے رعشۂ پرواز پر آرزو لرزاں تھی ہر تارِ نگاہِ ناز پر

کیا کہوں اب میں وہ کیفیاتِ صہبا کے مزے

وہ عروجِ نشۂ حسنِ خود آرا کے مزے

آنکھ کو "نواپرواز" خدا جانے کس لحاظ اور کون سی حیثیت سے کہا گیا ہے۔ "آرزو لرزاں تھی ہر تارِ نگاہِ ناز پر" اس کا مطلب نیاز مند خاک نہ سمجھا۔ کسی شے کا کسی چیز پر لرزاں ہونے کا نہ تو کوئی محاورہ خیال میں آتا ہے، جیسے فلاں، فلاں پر لوٹ ہے یا دیوانہ ہے۔ جیسا خود پہلے مصرعہ میں فرمایا ہے، نہ اور کچھ اپنی موٹی سمجھ میں آتا ہے۔ اسی طرح چوتھا مصرعہ ہیچداں کے فہم و عقل سے بالاتر ہے۔ سچ یہ ہے کہ شاعر کی بلندی تخئیل تک تو ذہن پہونچتا ہی نہیں!

حسن تھا مستور جب تک عشق بھی مغرور تھا ہو گیا عریاں تو وہ ساحر تھا یہ مسحور تھا

اسکے جلوے میں نہاں اندازِ برقِ طور تھا وہ نگہ تھی اُسکی یا اک ارتعاشِ نور تھا

مسکراہٹ سی جو چشمِ یار میں آنے کو تھی

روح میری کپکپی ہو کر نکل جانے کو تھی

پہلے مصرعہ میں "بھی" اگرچہ برائے بیت ہے تاہم معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ تین مصرعوں تک تو حسن و عشق کا بیان تھا چوتھے میں اپنی امید کے خلاف نگاہ کی مدح سرائی ہونے لگی۔ آخری شعر میں آنکھ کی ایک خاص ادا پر (جسے مسکراہٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) روح کا کپکپی ہو کر نکل جانا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ "کپکپی ہو کر" سمجھ میں نہ آیا۔ بلند خیال، قادر الکلام شاعر نے لرزہ، لرزاں، رعشہ، ارتعاش، کپکپی اور تھرتھری، سب الفاظ موقع موقع سے استعمال کر ڈالے ہیں۔

اب سراپا حسن تھا میں یعنی سراپا درد تھا تھا لبوں پر نالۂ جانکاہ چہرہ زرد تھا

اس طرح اب میرا جوشِ بے نیازی سرد تھا وہ نظر گویا رمِ آہو تھی اور میں گرد تھا

اُف مری صبحِ جوانی بے خبر انجام سے ہو گئی مغلوب آخر اس طرح اک شام سے

چوتھا مصرعہ یہاں بھی تو بے پناہ معنیٰ سے ڈیڈ ہیٹ کی سیلنگ بنا ہوا ہے۔ یہ آخری بند تھا۔ نظم ختم ہو گئی۔ نیاز مند اپنے ناظرین سے اب رخصت ہوتا ہے۔

دشنام طلب "نیاز مند"

مسز اینی بسینٹ

مسز اینی بسینٹ نے ہندوستان میں جو شہرت و عظمت حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہر وہ شخص جو اخبار دیکھتا ہے مسز موصوفہ کے نام سے واقف ہے۔ چونکہ وہ ہندوستان میں اُن مشہور اور معزز خواتین میں ہیں جو انسانی بھلائی کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں اس لیئے اُن کے مختصر حالات ہدیۂ ناظرین الناظر کیے جاتے ہیں۔

مسز اینی بسینٹ ۱۸۴۷ء میں یکم اکتوبر کو بمقام لندن پیدا ہوئیں۔ اُن کی والدہ آئرش نسل سے تھیں اور ان کے باپ کا ننھیال آئرلینڈ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ لیکن ددھیال انگریزی نسل سے تھا۔ ان کے والد نے ۱۸۵۲ء میں جبکہ انکی عمر صرف پانچ سال کی تھی بعارضۂ دق انتقال کیا۔ ان کے والد ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ حالانکہ اُنکی ایک معقول آمدنی تھی، مگر چونکہ عالم شباب ہی میں انتقال ہو گیا جبکہ اُنھیں ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ اُن کے بیوی بچوں پر اس قدر جلد مصیبت آپڑے گی، اس لیے وہ زیادہ پس انداز نہ کر سکے۔

ان کے والد کے انتقال کے بعد ہی اُن کے بڑے بھائی کی (جن کی عمر اس وقت ، سال کی تھی) تعلیم کا سوال پیدا ہوا۔ اُن کے والد کے چند اعزا کا خیال تھا کہ تھوڑی سی ضروری تعلیم کے بعد کوئی تجارتی پیشہ سکھلا کر اُنھیں برسرکار کر دیا جائے۔ لیکن انکی والدہ نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اُنکی رائے تھی کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد بیرسٹری پڑھائی جائے۔ اس مخالفت کا اُن عزیزوں نے بہت بُرا مانا۔ اور امداد سے دست کشی اختیار کی۔ ایسی حالت میں اُنکی والدہ کو ذریعۂ معاش کی بھی فکر ہوگئی۔ خوش قسمتی سے اس موقعہ پر ایک متمول شخص کو کسی ایسی لیڈی کی ضرورت تھی جس کی نگرانی میں وہ اپنے لڑکے کو تعلیم اور تربیت دے سکے۔ چنانچہ انکی والدہ نے یہ خدمت اپنے ذمے لی اور ایک اتالیق کو اور مقرر کیا جو ان دونوں لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اس

طور پر ان کے بھائی کی ابتدائی تعلیم کا معقول انتظام ہوگیا اور دیگر اخراجات کے لیے بھی تھوڑا بہت بچ رہتا تھا لیکن گذراوقات کے لیے اس قدر رقم پورے طور پر کافی نہ ہوتی۔ اس لیے مسز موصوفہ کی والدہ نے ڈاکٹر ڈگن سے جو ہیرو اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ان کے والد کے بڑے دوست تھے یہ استدعا کی کہ وہ اپنے اسکول سے چند لڑکے انکی نگرانی میں تعلیم و تربیت کے لیے دیں۔ ڈاکٹر موصوف نے جو اپنے دوست کے انتقال کے بعد انکی بیوی بچوں سے ہمدردی کیا کرتے تھے اس شرط پر اس عرض کو منظور کیا کہ وہ ایک بڑا مکان لیں اور اسکول کے ایک ماسٹر کو بھی ساتھ رکھیں تاکہ لڑکوں کی خانگی تعلیم اچھی طرح ہو۔ انکی والدہ نے ان شرائط کو قبول کیا اور اس طرح پر دس سال تک کے لیے جب تک کہ ان کا لڑکا کالج میں داخل ہو تعلیم اور گذراوقات کا معقول انتظام ہوگیا۔ اتفاقاً ایک روز مسز موصوفہ اپنے کسی ہمسایہ کے یہاں ایک دن کے لیے مہمان گئیں، اُسی دن اتفاق سے ایک عالی خاندان متمول لیڈی اس ہمسایہ کے یہاں ملاقات کو آئی ہوئی تھی۔ وہ مسز اینی بسنٹ کی پیاری پیاری اور سمجھداری کی باتیں سنکر بہت خوش ہوئی اور انھیں ہونہار پاکر اُسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انکی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لے۔ چنانچہ وہ دوسرے روز انکی والدہ کے پاس آئی اور کہا کہ میں اپنی ایک بھتیجی کی خود تعلیم و تربیت کرتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم اپنی بچی کو بھی میرے پاس چھوڑ دو میں ہر طرح سے اسکی کفیل ہوں گی، اور یہ صرف تعطیل کے دن تمھارے پاس آیا کریں گی۔ انکی والدہ کو ان سے بہت محبت تھی اس لیے انھوں نے ان کی جدائی گوارا نہ کی اور لیڈی سے انکار کردیا۔ لیکن اس لیڈی کو ان سے اسقدر اُنس ہوگیا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً آیا کرتی اور گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھیں۔ انکی والدہ نے جب دیکھا کہ لڑکوں میں انکی مناسب تعلیم و تربیت نہیں ہوتی اور مسز موصوفہ کو اس لیڈی سے بہت محبت ہے تو اُنھوں نے چار ناچار اجازت دے دی۔ مسز موصوفہ اپنی سوانحعمری میں لکھتی ہیں:۔

"مس میرٹ نے نہ صرف اُنھیں تعلیم ہی دی بلکہ اُن میں ایک ذوق علمی بھی پیدا کردیا جو حقیقتاً ان کے اس قدر فضل و علم حاصل کرنے کا باعث ہوا۔"

وہ بیان کرتی ہیں کہ :—

مس میرٹ کا طریقۂ تعلیم نہایت دلکش تھا۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم میں بچوں کے یاد کرنے اور گرامر (قواعد) کے رٹنے کی مصیبت سے اس طرح پر نجات دلائی کہ وہ ان قصوں کو جو ہم کتابوں میں پڑھیں، یا اُن مقامات یا واقعات کو جو ہم سیر و تفریح میں دیکھیں ایک خط کی شکل میں لکھواتی تھیں۔ اور پھر ان میں جو ہجوں کی یا قواعد کی غلطیاں ہوتیں اُنکی اصلاح کر دیتیں اور جو الفاظ غیر موزوں یا عبارت بے ربط ہوتی وہ بھی سمجھا دیتیں اور ساتھ ہی ساتھ قوتِ مشاہدہ بڑھتی اور حُسنِ بیان اور ادائے خیالات کا طریقہ آتا جاتا تھا۔ اور تاریخ کی کتابوں کو وہ قصہ کہانی کے طور پر سناتی تھیں جو ذہن نشیں ہو جاتی تھیں اور پھر خود بیان کرنے کو کہتی تھیں۔ جغرافیہ نہایت خوشرنگ نقشہ کھینچکر اور ہر ملک کے دفتی کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر یاد کراتی تھیں۔ وہ بچوں کو کسی چیز کے بغیر سمجھے ہوے یاد کرنے کی سخت خلاف تھیں۔ بچے جو چیز یاد کرتے سب سے پہلے وہ یہ پوچھ لیتیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تربیت کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب کہیں کوئی فقیر بھیک مانگنے آتا اور بچے اُسے کچھ دینے کے لیے مس میرٹ سے کچھ مانگتے تو وہ اسکے جواب میں کہتیں کہ اگر تم ایک ہفتہ کے لیے شکر کھانا چھوڑ دو تو اس قدر رقم بچے گی۔ یہی تم اس غریب شخص کو دے سکتے ہو۔"

میرے خیال میں بچوں کے لیے اس سے بہتر ایثار کا سبق کچھ نہیں ہو سکتا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں مس میرٹ کو اپنی بھتیجی کے علاج کے لیے جرمنی اور فرانس جانے کی ضرورت ہوئی۔ اُنھوں نے مسز انی بیسنٹ کی والدہ سے انھیں بھی ہمراہ لے جانے کی درخواست کی۔ اُنکی والدہ نے اجازت دے دی۔ کچھ مہینے فرنچ اور جرمنی زبانیں سیکھ کر مسز موصوفہ مس میرٹ کے ساتھ فرانس کو روانہ ہوئیں۔ سات مہینے یہاں قیام کیا۔ اس عرصے میں تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اپنے پورے قیام فرانس میں مس موصوفہ نے ایک دفعہ بھی تھیٹر نہ دیکھا اور نہ محفلِ رقص میں شریک ہوئیں۔ اُن کا مقولہ ہے کہ "تھیٹر ایک دام ہے، جو شیطان احمقوں کو گرفتار کرنے کے لیے بچھاتا ہے"۔ فرانس کے بعد
پا

مہینے کے قریب جرمنی کی بھی سیاحت کی۔ اور ۱۸۶۲ء میں لندن واپس آگئیں۔ اس دوران سفر میں مقدس مقامات دیکھ کر مسز موصوفہ کا رجحانِ طبع جو مذہب کی طرف تھا اور بھی مستقل ہو گیا۔ لندن سے واپسی پر مس میرٹ نے مسز موصوفہ کی والدہ سے کہا کہ اب تعلیم دینے کا زمانہ ختم ہو گیا مناسب ہے کہ اب انھیں کسی مدرسے میں داخل کرا دیا جائے۔ چنانچہ وہ ایم.اے کی کے ایک اسکول میں بھیجدی گئیں۔ چونکہ ان میں ذوق علمی پیدا ہو ہی گیا تھا نہایت مستعدی اور محنت سے پڑھنا شروع کیا اور بہت جلد اس اسکول کی خواندگی ختم کر کے [illegible] شروع کی زیادہ تر توجہ مذہبی لٹریچر پر مبذول کی۔ مذہب سے رغبت ہونے کی وجہ سے انھوں نے ۱۸۶۱ء میں جبکہ انکی عمر ۲۰ سال تھی ایک نو عمر پادری مسٹر بسنٹ سے محض اس خیال سے شادی کر لی کہ ایک مذہبی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن ایک تلخ تجربے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ شادی سے قبل امور خانہ داری کے متعلق معلومات حاصل کیے جائیں۔ امور خانہ اور دیگر مشاہل زندگی بسر کرنے والے شخصوں کے فرائض اور ذمہ داریاں سمجھے بغیر شادی کرنا ایک مہلک و فاش غلطی ہے۔ جب ان پر سے ماں کا سایہ عاطفت جو کبھی فکر و رنج کو پاس نہیں آنے دیتا تھا دور ہو گیا اور مونس و غمخوار ہمجولیاں علٰحدہ ہو گئیں اور نہایت سخت اور بدمزاج شوہر سے سابقہ پڑا تو زندگی دوبھر ہو گئی۔ مسٹر بسنٹ شوہر کے اختیارات کو نہایت وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے اور زوجہ کو ایک مطیع و فرمانبردار خادمہ کی حیثیت سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اور خود کو گھر کا خود مختار حاکم تصور کرتے تھے۔ وہ اپنے تئیں خفیف سے خفیف معاملے میں بھی دخل دینے کا مجاز سمجھتے تھے۔ اور صفائی و پاکیزگی کا خیال وہم تک پہنچ گیا تھا۔ غصے کی یہ کیفیت کہ ذرا سی مرضی کے خلاف بات میں آگ بگولہ ہو جاتے۔ اور گھنٹوں میں ٹھنڈے ہوتے۔ غرض مسز موصوفہ نے اس خانہ داری کی زندگی کے نہایت کٹھن پانچ برس بمشکل تمام کاٹے۔ اس عرصے میں ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ایک مرتبہ اپنی زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی کا ارادہ کر لیا اور زہر کا پیالہ منھ سے لگا لینے ہی کو تھیں کہ بچوں کی محبت نے آ

گناہ عظیم سے روک لیا۔ آخرکار ۱۸۷۳ء میں اپنی والدہ کے گھر بیٹھ رہیں۔

۱۸۶۷ء ہی سے مسز موصوفہ نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے چند چھوٹے چھوٹے دلچسپ قصے لکھ کر فیملی ہیرلڈ میں بھیجے جو شایع کر دیے گئے۔ اور معاوضہ میں ۳۰ شلنگ ملے، جس پر اُن کے شوہر نے قبضہ کر لیا۔

مسز موصوفہ لکھتی ہیں کہ "مجھے یہ اُجرت ملنے پر سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ پہلی مرتبہ مجھے انگریزی قانون کی یہ خوبی معلوم ہوئی کہ زوجہ کی ذاتی آمدنی بھی اُسکے مالک یعنی شوہر کی ملکیت میں شامل ہے"۔

اسکے بعد اُنھوں نے ایک مذہبی پمفلٹ تصنیف کیا جس میں عیسائیت کے فرائض اور ذمہ داریوں کو نہایت متاثر پیرایے میں بیان کیا تھا۔

مسز موصوفہ اپنی والدہ کے یہاں علاوہ تعلیمی مشاغل کے گذرا وقات کے لیے سوزن کاری کیا کرتیں۔ اور وہ ایک کارخانوں کی ایجنسی بھی کر لی تھی۔ اس اثنا میں نارووڈ کے مجسٹریٹ کو ایک گورنس کی ضرورت ہوئی۔ مسز موصوفہ نے کوشش کر کے یہ ملازمت کر لی۔ اور اب بہت اطمینان سے بسر ہونے لگی۔ بمشکل تمام ایک سال کے قریب اس ملازمت پر گزرا ہوگا کہ انکی والدہ کی سخت علالت کی اُنھیں اطلاع ملی۔ یہ وہاں گئیں اور انکے آنے کے کچھ ہی روز بعد ۱۸۷۴ء میں وہ راہیِ ملک بقا ہوئیں۔ اس عرصے میں مجسٹریٹ کو گورنس کی ضرورت نہ رہی۔ ایک تو اپنی شفیق ماں کی جدائی، دوسرے ملازمت کا جاتا رہنا، ان پر مصائب کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ دو تین مہینے انھوں نے سخت پریشانی میں کاٹے اور جو کچھ اندوختہ تھا اُسپر گذارہ کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے چند مذہبی پمفلٹ لکھے اور مسٹر اسکاٹ کے نام سے، جو ایک نہایت رحمدل اور مہربان ہمسایہ تھے، شایع کیے۔ مطبع کے نام حق تصنیف فروخت کرنے سے جو چند پونڈ معاوضے میں ملے اُنھیں پر بسر اوقات کی۔ مسٹر اسکاٹ ایک نہایت خداترس آدمی تھے۔ اُنھوں نے مسز موصوفہ کے بچوں کی کفالت اپنے ذمے لی۔ اور

کسی طرح کی امداد سے دریغ نہ کیا۔ مسز موصوفہ دن بھر لندن کے عجائب خانے کی لائبریری میں کتب بینی میں صرف کرتیں اور شام کو جو کچھ مسٹر اسکاٹ کی فیاضی سے میسر آتا کھا کر سو رہتیں۔ مسز موصوفہ لکھتی ہیں کہ "یہ دن بھی کبھی نہ بھولوں گی۔ جب یہ دن مجھے یاد آتے ہیں تو بہت مسرت ہوتی ہے۔ کیونکہ انھیں ایام نے مجھے مصیبت زدوں کے ساتھ جو میری طرح زندگی کی جد و جہد اور کشمکش میں مبتلا ہوں، ہمدردی کرنا سکھلایا۔ اور میں خشک لبوں سے "میں بھوکا ہوں" کے کلمات بغیر بھوک کی تکلیف کو یاد کیے ہوئے نہیں سن سکتی۔ اور بغیر اس بھوک کی تکلیف کو دور کیے ہوئے خواہ اسی لمحے کے لیے کیوں نہ ہو، باز نہیں رہ سکتی۔"

۱۸۷۴ء میں نیشنل ریفارمر پرچے کے اسٹاف میں ایک جگہ خالی ہوئی جس پر مسز بسنٹ مقرر ہو گئیں۔ ۳۰ اگست کو انکا ایک بہت معرکۃ الآرا مضمون "ایزکس" کے مستعار نام سے شائع ہوا۔ اور ۱۸۷۵ء میں مذکورۂ بالا پرچے کی اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہو گئیں۔

۱۸۷۵ء میں اُنھوں نے مدنی اور مذہبی آزادی پر پہلا لکچر دیا۔ جبکی پبلک کے عام عقائد کے خلاف ہونے کی وجہ سے بہت مخالفت کی گئی اور لوگوں نے بہت شورش کی۔

اسی سال کے اختتام پر صوبہ جات میں لکچر دینے کے لیے دورہ کیا۔ سوانش میں جب ایک ہال میں لکچر دینے کی اجازت طلب کی گئی تو مالکِ ہال نے اس خیال سے کہ عوام پتھروں وغیرہ سے عمارت کو نقصان نہ پہونچائیں، نقد ضمانت طلب کی۔ اور کسی مقامی شخص کو صدارت کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ جس بات کا اندیشہ تھا آخر وہی پیش آئی۔ جہلاء نے عیسائیت کی تردید اور دہریت کی تلقین سن کر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ ہال کی کھڑکیاں وغیرہ جو بند کر دی گئی تھیں توڑ دی گئیں۔ اور ایک پتھر مسز بسنٹ کے سر پر لگا۔ ان لکچروں اور ایک امریکن ڈاکٹر نولٹن کے پمفلٹ کی (جو افراط نسل انسانی کے متعلق تھا) اشاعت کی بنا پر حکام نے جو پہلے سے مسز موصوفہ سے بدظن تھے انھیں گرفتار کیے جانے کا حکم دے دیا۔ لیکن دوسرے دن ضمانت پر رہا کر دی گئیں۔ پہلے کچھ جرمانہ اور سزا مقرر ہوئی مگر اپیل پر بالکل بری ہو گئیں۔

سنہ ۱۸۷۸ء میں مسٹر بسینٹ نے اس عذر پر کہ مسز بسینٹ دہریہ ہوگئی ہیں اور بچوں کو بھی اسی اعتقاد کی تلقین کریں گی، اپنے بچوں کو اُن سے لینے کی عدالت میں درخواست پیش کی۔ اور اُنھیں کے موافق فیصلہ دیا گیا۔ مسز بسینٹ کو بچوں کی علیحدگی بہت شاق گذری جسکا اُن کی تندرستی پر بُرا اثر پڑا۔ اس واقعہ کے بعد مسز بسینٹ نے دو پمفلٹ لکھے۔ ایک عیسوی مذہب کے نقائص اور کمزوریوں پر، دوسرا ہندوستان کے طرز حکومت کے غلط اصول پر۔ اِن پمفلٹوں کا یہ اثر ہوا کہ اہل انگلستان مسز موصوفہ سے اور زیادہ بدظن ہوگئے۔ اور اہل ہند کے دلوں میں انکے ساتھ ہمدردی اور محبت کی بنیاد قائم ہوگئی۔

سنہ ۱۸۷۹ء میں مسز بسینٹ نے لندن یونیورسٹی سے مٹریکلیشن کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے تین سال تک بی، ایس، سی، کا امتحان دیا۔ مگر قصداً فیل کردی گئیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ کینسنگٹن میں جو ٹیچر کا امتحان ہوتا تھا اور اس سے کہیں مشکل تھا اسے انھوں نے پہلی ہی مرتبہ بہت کامیابی کے ساتھ پاس کرلیا۔ اور جب انھوں نے بوٹینی (باغبانی) کی تعلیم حاصل کرنے کی درخواست دی تو اُسکے منتظم نے صرف اس خیال سے کہ اس میں اُس کی لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں اور ان کی شرکت سے شاید اُن کے عقائد خراب ہوں اجازت نہ دی۔

مسز موصوفہ کو بالطبع مظلوم اور غربا کے ساتھ محبت اور ہمدردی تھی۔ یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتی تھیں کہ اِن بے زبانوں کے حقوق پامال کیے جائیں۔ اور ان کے ساتھ چوپایوں کی طرح بیدردی سے سلوک کیا جائے۔ اس حقوق العباد کے اصول نے انھیں حکام کی نظروں میں اور بھی زیادہ مخدوش اور عام امن وامان کے لیے خطرناک قرار دے دیا۔ مسز موصوفہ نے مزدوری پیشہ لوگوں کی ایک متحد جماعت بناکر مالکان کارخانہ جات وغیرہ کے خلاف ایک زبردست قوت پیدا کرنے میں نہایت پُرزور کوششیں کیں۔ کہ اس اتفاق کی بنا پر وہ مالکان کارخانہ کو ہڑتال کردینے کی دھمکی دیتے اور معقول اجرت دینے پر مجبور کرسکتے ہیں اور اس اصول کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ ملک اور قوم کی ایک ایسی خدمت ہے جو مسز موصوفہ کی سوانحعمری میں ہمیشہ

سنہری الفاظ سے لکھی جائے گی۔

۱۸۸۸ء میں انھوں نے لینک ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا - جو صحیح معنوں میں فریادِ مظلوماں کی ترجمانی کرتا تھا اور انگلستان کی بے شمار بے زبان مخلوق کی زبان کا کام دیتا تھا۔ انکی خدا ترسی اور مظلوموں کی دادرسی صرف اپنے ملک و قوم ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک نے بھی ان کے دردمند دل میں جگہ پائی اور آپ نے ۱۸۹۳ء میں اپنے مذہب تھیاصوفی ...... Theosophy کی اشاعت کے لیے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ انکا مذہب بدھ اور ہندو فلاسفی سے بہت زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے انھوں نے ہندوؤں میں اپنی پرانی فلاسفی کے مطالعہ کی ترغیب دلائی۔ اور ہندوؤں اور مجوسیوں کی مقدس کتابوں کے بوسیدہ ذخائر باہر نکالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ ایک بے تعصب دل رکھتی ہیں۔ اور انھوں نے بارہا علی الاعلان اپنے لکچروں میں اسلام کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اور وہ اپنے مذہب کی خدمت کے علاوہ ہندوستانیوں میں حب وطنی اور احساس قومی کی خوبیوں کو خوابیدہ پاکر اُن کے بیدار کرنے کی سعی میں ہمہ تن مشغول ہیں۔

مسز موصوفہ قومی تعلیم اور قومی آزادی کی بہت حامی ہیں۔ بنارس کالج کا کھولا جانا اور ہندوؤں کا یونیورسٹی لینا انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ غریب ہندوؤں کی حمایت میں جو جو ایثار مسز موصوفہ نے کیے اور کر رہی ہیں اور جس طرح اُن کی خاطر انھوں نے اپنے ہموطنوں اور ہمقوموں کی مخالفت کی پروا نہ کی وہ ان لوگوں پر جو اخباری دنیا کے سیاح ہیں بخوبی روشن ہے۔ انھوں نے انھیں مقاصد کے لیے انگریزی میں دو اخبار بھی شایع کیے جو بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مقتدر تعلیم یافتہ اور محب وطن سب ان کے عقیدت مند ہیں۔ ان کو ہندوستان میں جو کچھ ہر دلعزیزی حاصل کی ہے وہ زیادہ تر اس بنا پر ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی ملکی تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انھیں تحریکات میں مشغول رہنے کے باعث اس مہینے میں لحاظ مصالح ملکی ان کو گورنمنٹ مدراس نے قانون تحفظ ہند کی رو سے نظربند

کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بہت بڑی پولیٹیکل رہنما ہیں اور ہندوستانیوں کی پولیٹیکل جماعت کی ایک بڑی قوت ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی تمام و کمال قوت کو صرف ایک ہی نصب العین یعنی ہندوستانی عورتوں کی تعلیمی و تمدنی بہبودی کی جانب متوجہ رکھتیں تو یقیناً اُسکے نہایت دیرپا اور شاندار نتائج برآمد ہوتے۔ اس طرح وہ بنی نوع انسان کے واسطے اور ہندوستان کے لیے بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھیں اور بلاشبہہ ان کے کاموں کا دائرۂ فیض موجودہ دائرے سے بہت وسیع ہوتا۔

سید عبدالجلیل بی اے (علیگ)

ہلال عید

نظر جو آیا لبِ ساغرِ شراب ہلال
ہوا ہے پیرِ فلک کو بھی میکشی کا خیال

ہلالِ عید نمایاں ہوا کہ اے رندو
کلیدِ میکدۂ عشق نے دکھایا جمال

مگر فلک پہ کوئی بحرِ سیم ہوگا رواں
کہ اُس کا پارۂ ساحل ہو آسماں پہ ہلال

جو داغ چہرے پہ دیکھئے تو رنگ زرد ہوا
مقابلِ رُخِ دلبر ہوا نہ بدر کمال

پھر اُسکے دل میں سمایا کہ ابروِ بت کی
برابری میں کروں اسلیے ہوا وہ ہلال

مگر وہ پشت خمیدہ یہ مہرو قدِ رعنا
کجی تھی دل میں کہ پیدا ہوا یہ اُسکو خیال

بری نظر سے جو دیکھا تھا ناخنِ دلبر
ہُوا ہے ناخنۂ دیدۂ فلک یہ ہلال

یہ ایک ہی نہیں تھی جو اُس بت نے
بنا کے تاروں سے ڈالا فلک کے بحر میں جال

یہ دیکھو لشکرِ انجم کا آج خیل و خدم
نگاہ کریں گے شہِ حسن کا یہ استقبال

ستارے صف میں کھڑے ہیں بنی ہے کاہکشاں
چمک رہی ہیں وہ شانے پہ تیغیں شکلِ ہلال

ہلالِ عید جھکا آسماں پہ تعظیماً — عصائے کاہکشاں لیکے چوبدار مثال
کسی کو نشترِ جاں اور کسی کو خنجرِ دل — کسی کے شیشۂ دل میں اسی نے ڈالا بال
کسی کو حلقۂ زلف اور کسی کو تیغِ نگہ — کسی کو تیرِ مژہ اور ابروے قتال
ہلالِ عید کسی کو تو ہے اشارۂ قتل — کسی کو ہے یہ کنایہ کہ رکھ امیدِ وصال
سپر ہے چرخ مہ نو ہے تیغ اسپہ گی — ستارے کانپ رہے ہیں زرعبِ جاہ و جلال
کمان ابرو نے تیرِ نگاہ مارا ہے — کہ نیمکش ہے نمایاں فلک پہ مثلِ ہلال
ریاضِ دہر میں طرفہ بہار آئی ہے — جو شاخِ گل ہے مہِ نو ستارے گل کی مثال
نہاں ہے پردۂ زنگار میں کوئی سفاک — دکھا رہا ہے جو ابرو کی تیغ مثلِ ہلال
اٹھا کے آنکھ سوے ماہِ نو ذرا دیکھو — اشارہ کرتا ہے انگشت سے سعید ہے فال
ہوا ہے قیصرِ جرمن جو دشمنِ تہذیب — یقیں ہے جلد حکومت کو اسکی آئے زوال
حضور جارج کو ہوگی نصیب فتح و ظفر — جہاں میں نورِ فلک ہوگا نیرِ اقبال
جو فوجِ ہند وطن لوٹے فاتح و منصور — خدنگِ رشک سے قیصر کا سینہ ہو غربال
ملے گی سلطنتِ ہند ہندوالوں کو — جہاں میں ہونگے کبھی وہ بھی صاحبِ اقبال

ہلال قیصرِ جرمن کو تیغ ہے لیکن
نشانِ فتح ہے افواجِ متحد کو ہلال

رائزادہ آفتاب

جفائے یار مرے حق میں کارساز ہوئی — نیاز مند سے دم بھر نہ بے نیاز ہوئی
گلا عبث ہے کسی کی غلط نگاہی کا — وہ جس طرح سے پڑی دل پہ دلنواز ہوئی
پیے پیے ہوے رندوں کو بیخودی کیسی — نگاہِ ساقیِ دلجو کرشمہ ساز ہوئی
چھپا نہ رازِ محبت برا ہو آنکھوں کا — نگاہِ شوق مری وجہِ امتیاز ہوئی

خدا کا شکر ہے باسط وہ بت سبھا تو
[illegible]

باسط۔ بسوانی

خریطہ بنام ای بیگل صاحب متعینہ ممالک یورپ

ڈیر بیگل - آداب عرض - آپ ہماری بحث کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے - اب فرمائیے مزاج شریف - ہٹ دھرمی سے اگر قطع نظر کی جائے تو اب انکار کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی کہ داڑھی اور عقل مختلف الاصل موجودات ہیں، ایک کا دوسرے سے مطلق تعلق نہیں - اور ایک کی فزونی کا لازمی نتیجہ دوسرے کا قصور نہیں ہوتا - وہ مصرعہ جسے آپ ہمیشہ طنزاً مسکراہٹ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے یعنی ع "بڑھا کی عقل اور داڑھی گھٹا کی" بالکل غلط ہے - اور کسی منطقی یا عقلی اصول کو ظاہر نہیں کرتا - ایک مرتبہ اور ہم دلائل و براہین عقلی و نقلی و واقعات تاریخی آپکے روبرو اس امید میں پیش کرتے ہیں کہ واقعات زمانہ کی روشنی میں نظر تعمق ڈالنے کے بعد آپ اپنے دعاوی کو واپس لیں گے اور ہماری اتباع کا عملی ثبوت آپکے چہرۂ مبارک کو مزین کریگا۔

عقلی نقطۂ نظر سے داڑھی ایک مادی چیز ہے جو ہمارے قوائے حسیہ سے محسوس ہو سکتی ہے برخلاف اسکے عقل ایک غیر مادی شے ہے جسکو ہمارے حواس خمسہ محسوس نہیں کر سکتے - البتہ اُسکے نتائج کو مشاہدہ کرنے کے بعد اُسکے وجود کو سبب ان مشاہدہ جات کا قرار دیتے ہیں - ان دونوں کا ایک ہی شے ہونا اس نہج پر کہ ایک سرے کا نام عقل اور دوسرے سرے کا نام داڑھی ہے، اور اگر ایک ہی جانب یہ شے زیادہ گھسیٹ لی جائے تو دوسرے کا نام معدوم ہو جائے۔ یعنی اگر عقل کی طرف کا سرا پکڑ کر گھسیٹا جائے تو انسان عقل مجسم بن جائے اگرچہ داڑھی غائب ہو جائے - یا اگر داڑھی کا کونہ پکڑ کر گھسیٹ لیا جائے تو عقل معدوم ہو جائے اور انسان ہمہ تن ریش ہو جائے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا - اور نہ کوئی عقل سلیم اسے قبول کر سکتی ہے۔

ہم اس دلیل کو بھی نہیں مان سکتے کہ عقل اور داڑھی کے وجود کا انحصار ایک ہی قوت پر ہے، چنانچہ اگر یہ قوت داڑھی کے نشو و قیام میں زیادہ خرچ کی گئی تو عقل کم ہو جائیگی

[illegible] صحت لفظ قبول کی ہے۔

یا اگر عقل کی فزونی مدنظر ہے تو ریش میں کمی کی جائے بلکہ ٹھوڑی صاف رکھی جائے۔ علم نفسیات یا علم الہیات کے کسی اصول سے اس مسئلہ کی تائید نہیں ہوتی۔ واقعاتِ و موجوداتِ دنیا اس رائے کی غلطی کو ثابت کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہوتی تو ہمارے سب داڑھی منڈے بھائی بلحاظ عقل کے لحاظ سے ارسطوے وقت و لقمان دوراں ہوتے۔ اور آپ کے ملک کے مادہ رو حضرات عقلِ مجسم کہلاتے۔ سر سید احمد مرحوم یا تلمیحی واقعات میں کیوں جائیے۔ مسٹر سورندرناتھ بنرجی، اور بابو امبکا چرن موزمدار پریسیڈنٹ لکھنؤ کانگریس اپنی عقل کی فزونی کو داڑھی کی بلاضرورت افزائش سے خدشہ میں نہ ڈالتے۔ اور صنفِ لطیف کا کیا کہنا۔ ہر ایک ان میں سے عقل کی پتلی ہوتی۔ دنیا اور اسکے واقعات انکے تحت حکومت میں ہوتے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ مقراضِ زباں پریشاں کن گتھیوں اور الجھاؤں کو تو آن کی آن میں کاٹ کر پھینکدیتی۔ تھوڑے سے رونے، پیٹنے، کوسنے، روٹھنے کے بعد جملہ اختلافات بین الاقوام نہایت آسانی سے طے ہو جاتے۔ حصہ بخرا، بھائی برادری، شادی بیاہ پھر ہونے لگتے اور یہ نوبت جو آج درپیش ہے ہرگز صورت نہ دکھاتی۔

اگر اس اہم مسئلے کے تاریخی پہلو کی جانب ذرا بھی توجہ کی جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ ہر ملک و ہر زمانے میں ارباب عقل و فہم ہمیشہ داڑھی کو نہایت عزت و آبرو کی نظر سے دیکھتے تھے اور بڑھنے دیتے تھے۔ محققین نے کمال جانفشانی سے دریافت کر لیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام مع داڑھی کے پیدا ہوئے تھے۔ یہ داڑھی انجناب کی ریش مبارک سے اسقدر مختلف ضرور تھی کہ وہ تمام چہرے پر حاوی ہونے کی وجہ سے ایک قسم کا سایہ سارے چہرے پر ڈالتی تھی۔ لیکن انجناب کی داڑھی نے چہرے کی وجاہت سے مغلوب ہو کر صرف ٹھوڑی کے بیچ کے حصے پر اکتفا کی ہے۔ اس موقع پر اس کا بھی تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو نافرمانی ہمارے جد اعلیٰ سے سرزد ہوئی تھی اسکی وجہ دراصل انکی زنگسار کی حماقت و نافہمی تھی جنکا چہرۂ مبارک بفضلہ داڑھی سے بالکل معرا تھا۔

حضرت انسان نے اپنے مورثِ اعلیٰ کا اتباع بلا چون وچرا اُسوقت تک کیا جب تک اُنکی شبیہ مبارک کی یاد حافظۂ انسانی میں تازہ رہی۔ لیکن مرورِ ایام کسی شے کو خواہ وہ مادّی ہو یا خیالی ایک حالت پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ یہ یاد ماند ہوتے ہوتے بالکل فراموش ہوگئی یہانتک کہ اُنکی صورت شکل تو درکنار وجود کے متعلق مباحث ہونے لگے۔ اور اگر گرگ کے پابند حضرات اسطرح اپنی اصل کو بھولے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو محض ایک خیالی ہیولیٰ ماننے لگے۔ اس کشمکش میں داڑھی بیچاری کو کون یاد رکھتا۔ بیچاری اس طرح غائب ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ"۔ رفتار کا بندیہ ہے کہ اپنے ساتھ کمزور ہمسائے کو بھی لے ڈوبی۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے۔ مونچھیں بیچاری مفت میں جان سے گئیں۔ اب انکا بھی پتہ نہیں۔

لیکن منطقی مباحث کا اثر تحریر و تقریر سے آگے نہیں بڑھتا۔ واقعاتِ دنیا حسب معمول ظہور پذیر و معدوم ہوتے رہتے ہیں۔ کٹھ حجت اُلجھتے اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ تاریخ عالم روشن حروف سے اربابِ نظر کو دکھلاتی ہے کہ قریب قریب ہر زمانے میں ایام جاہلیت سے لیکر اب تک داڑھی بہت احترام کی نظر سے دیکھی جایا کی ہے۔ اقوام کلٹک Celtic اور سالو Saxons میں داڑھی کی ہمیشہ عزت کی جاتی تھی۔ ہر شخص داڑھی بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اور بڑی داڑھی والے کی ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی تھی۔ داڑھی کا معمول سے زیادہ بڑھ جانا باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ باشندگان روم کے مذہبی و متبرک صحیفوں سے پورے طور پر ثابت ہے کہ داڑھی اُنکے ملک میں بہت قدر کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ لیوی Livy کے قول کے مطابق پادری اسکو ناقابل برداشت ذلت سمجھتے تھے کہ کوئی اجنبی شخص اُنکی داڑھی کو ہاتھ لگادے۔ چنانچہ پاپائے روم سنہ ۱۰۶۲ء تک داڑھی رکھنا اور بڑھانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور رومن کیتھولک پادری آج تک اسپر عمل پیرا ہیں۔

زمانے کی نیرنگیاں ملاحظہ ہوں کہ انھیں رومیوں نے جزیرۂ سسلی Sicily میں جس خوشی سے حجاموں کا خیر مقدم کیا ہے وہ انقلابِ خیالات کی مثال کی صورت میں آجتک

تاریخ میں محفوظ ہے۔ لیکن اس تغیر کے ساتھ اُنکی کسی قسم کی ترقی کا پتہ نہیں چلتا۔ اُس احترام کا جو کہ قدما کی نظر میں داڑھی کا تھا اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مشہور شاعر ہومر نے اپنی نظم الیڈ میں بڑے بڑے بہادروں اور جوانمردوں کو داڑھی دار بیان کیا ہے۔ مشکل سے کوئی ایسا واقعہ ملے گا جہاں کسی داڑھی منڈے نے کوئی کارنمایاں کیا ہو۔

یونانیوں میں اس تمغۂ مردمی کی بہت بڑی عزت ایک مدت تک رہی۔ بالآخر انقلاب روزگار کے ہاتھوں قطع و برید شروع ہوئی۔ اور وہاں بھی کٹوانے اور منڈوانے کے جھگڑے پیدا ہونے لگے۔ سکندر اعظم نے ایک حکم صادر کیا۔ کہ اُسکی فوج کا ہر سپاہی داڑھی منڈوائے۔ اور اس کا نفاذ بجبر تمام سپاہ پر کیا گیا۔ تاریخی لحاظ سے یونان میں اپنی قسم کا یہ پہلا حکم ہے۔ انجاب کی رائے ناقص میں یہ اسی نحوست کا نتیجہ تھا کہ اُسکو ہندوستان سے قبل از وقت بلا فتح کی تکمیل کیے ہوے واپس جانا پڑا۔ اور کیا عجب ہے کہ یہ قانون ہی اُسکی زہر خورانی کا باعث ہوا ہو۔ راست و دروغ ایں بر گردنِ انجانب۔

ٹیسی ٹس *Tacitus* کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ باشندگانِ جرمن میں ایک اس قسم کا قانون رائج تھا جسکے مطابق جرمن سپاہی کو داڑھی منڈوانے کا حق اُسی وقت حاصل ہوتا تھا جب کہ وہ کم از کم ایک دشمن کو ضرور قتل کر ڈالے۔ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی جاتی تو مجرم بہت بڑے اخلاقی جرم کا مرتکب خیال کیا جاتا تھا۔ دوست، آشنا، بھائی بند اُس سے تعلقات قطع کر لیتے تھے اور وہ برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔

جولیس سیزر *Julius Caeser* کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم باشندگانِ انگلستان بدن کے بالوں کو صاف کراتے تھے مگر داڑھی اور مونچھ کا ترشوانا سخت معیوب سمجھتے تھے سیکسنس *Saxons* (انگلستان کے پرانے باشندے) داڑھی کا بڑھانا مذہبی فرض خیال کرتے تھے اور بہت سختی کے ساتھ اس عقیدے پر کاربند تھے جب نارمنس *Normans* نے انگلستان کو فتح کیا اور وہاں بود و باش اختیار کی واڑھی

منڈانے کی رسم کو جو اُن میں رائج تھی بجبر نافذ کرنا شروع کیا۔ اور بیچارے سیکسن Saxons کی ہزاروں داڑھیوں کا خون ہو گیا۔ اہلِ جانب کی رائے میں نارمن کے یورپ سے نکالے جانے کی وجہ ریشِ مبارک سے بدتمیزی تھی۔ آپ سمجھیے اس قسم کی بدعقیدگی اور بدکرداری کا لازمی نتیجہ نحوست تھا۔ نہ معلوم کن منتوں سے داڑھیاں بڑھائی گئی ہونگی اور کس بے رحمی سے صاف کرادی گئیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ تھوڑے روز انگلستان میں مقیم رہنے کے بعد فاتح لوگ اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور جس سفاکی و بیباکی سے داڑھیوں کا خون کیا گیا تھا اُس سے دو چند بلکہ چہار چند خوف و اختلاجِ قلب کے ساتھ اُنکی عزت شروع کی۔ چنانچہ داڑھی کی پرداخت میں صنعت کو دخل دیا جانے لگا اور ہر فیشن اور قسم کی داڑھیاں نظر آنے لگیں۔ جس زمانے میں خاندان ٹیوڈر Tudor انگلستان میں حکمران تھا داڑھی کی بہار تھی۔ کہیں گل مچھے، کہیں سیدھی، کہیں خشخشی وغیرہ وغیرہ داڑھیاں ہر جانب دکھائی دیتی تھیں۔ ملک فرانس میں داڑھی کا احترام نئی قسم سے کیا جاتا تھا۔ فرامین شاہی جو بہت زیادہ ضروری سمجھے جاتے تھے اُنپر بجائے مُہر بادشاہ کی داڑھی کے چند بال چپکا دیے جاتے تھے۔ اس قسم کے فرامین کی سب سے زیادہ عزت ہوتی تھی۔ اس رواج کے ثبوت میں ہم سنہ ۱۲۱۲ء کے چارٹر کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اس رسم کا تذکرہ نہایت وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ داڑھی رکھانے کی رسم فرانس میں لیوس سیزدہم Louis XIII کے وقت تک جاری رہی۔ اس نے صفائی کا اعلان جاری کیا۔ چونکہ ملک میں الحاد و بیدینی روز بروز ترقی پکڑ رہی تھی لہذا رعایا نے مناسب طریقہ پر اس اعلان سے اختلاف نہیں کیا۔ اور تھوڑی ہی مدت کے بعد سارا ملک داڑھی مُنڈانے کی علت میں گرفتار ہو گیا۔

ملک ہسپانیہ میں قدیم الایام سے داڑھی کا بڑھانا اور اُسکی پرداخت بہت ضروری خیال کی جاتی تھی۔ یہ قدر و منزلت فلپ ثانی Philip IV کے وقت تک جاری رہی مگر اس بادشاہ کے آخری وقت میں ریش کا احترام رُو بزوال ہو چلا۔ اور بالآخر تھوڑی کی

صفائی رواجِ عام میں داخل ہوگئی۔

اہالیان ملک روس بھی اپنی چوکور، ہشت پہل، گول داڑھی پر ایک عرصہ دراز تک فخر کرتے رہے۔ پٹر اعظم Peter the Great نے اس رسم کی تخریب شروع کی اور ایک عرصہ تک اپنی رائے کا اختلاف کنایۃً ظاہر کرتا رہا۔ لیکن رعایا نے متعلق پروا نہ کی بالآخر اُس نے ایک حکم شاہی، داڑھی کی صفائی کی بابت جاری فرمایا۔ رعایا کے دلوں میں داڑھی کا اس قدر احترام اُس وقت تک قائم تھا کہ فرمان شاہی کی خلاف ورزی صراحۃً شروع کی۔ جابجا بلوے ہوگئے اور تمام ملک میں بدامنی پھیلنے لگی۔ اس اندیشہ ناک حالت کو فرو کرنے کی غرض سے گورنمنٹ روس نے ایک قانون وضع کیا جس کی رُو سے ہر شخص داڑھی رکھنے کا مجاز ہوسکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ ایک رقم بطور ٹکس کے سرکار میں سالانہ دیا کرے۔ ایک مدت تک یہ ٹکس جاری رہا بالآخر معاف کر دیا گیا۔

اگر ایشیا کی جانب توجہ فرمائیے تو یہاں بھی قریب قریب ایسی ہی حالت پائی جاتی ہے عربوں میں داڑھی کا احترام ضرب المثل ہے۔ قدیم الایام سے اب تک عزت و حرمت ریش مبارک کی باقی ہے۔ مذہب اسلام نے جس کا نشو و نما زمین عرب میں ہوا ہے داڑھی کے احترام و پرداخت کو عوام کی رائے کے مطابق ضروری عقائد مذہبی میں شامل کر لیا۔ یہاں تک کہ جہلا ریش مبارک کو نہ صرف تمغۂ مردی بلکہ نشان اسلام سمجھتے ہیں۔

اہالیان ملک ایران قدیم زمانے میں داڑھی کی بہت قدر کرتے تھے اور اپنے خیالات کی استعداد کے موافق اسکی منزلت افزائی کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ تاریخ کی گواہی سے ثابت ہوتا ہے کہ ریش مبارک سنہرے اور روپہلے تاروں سے گوندھی جاتی تھی اور اسکو عجیب و غریب طریقوں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خاص قسم کے عطر و تیل محض اسی غرض سے ایجاد کیے گئے تھے۔ ایک مدت تک یہ رسم رائج رہی۔ پھر وحشت کم ہونے پر داڑھی کی آراستگی میں سادگی عمل پذیر ہوئی۔ اور مبالغہ میں بھی کسی قدر کمی ہو گئی

لیکن قدر و منزلت اب تک باقی ہے۔ قریب قریب بالکل یہی حالت ازل سے (یعنی جب سے تاریخ رسم ورواج زمانہ پر روشنی ڈالتی ہے) وسط ایشیا کے ممالک میں بھی پائی جاتی ہے۔

باشندگان چین کو اس عطیۂ ربّانی کا دوسری اقوام کے مقابلے میں کم حصہ ملا ہے۔ لیکن وہ داڑھی کی کمی کی تلافی چوٹی کی لمبائی سے کر لیتے ہیں۔ داڑھی کو نجس نہیں سمجھتے کہ جس کی صفائی لازمی ہے، بلکہ بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن قدرت سے مجبوری ہے اُنکی ٹھوڑی میں اس قدر شوریت ہوتی ہے کہ داڑھی جیسی نازک پیداوار سرسبز نہیں رہ سکتی۔

ملک برما میں بھی داڑھی کی بہت عزت تھی۔ وہاں کے باشندے حجام کے نام سے ناآشنا تھے۔ لیکن اب بیس سال کے قریب سے حجاموں کے دھاوے نے اُنکی عادتیں خراب کر دی ہیں۔ چنانچہ وہاں بھی داڑھی منڈانے کی رسم جاری ہو چلی ہے۔

ہندوستان کے رسم ورواج کا تذکرہ بوجہ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہر ہندوستانی بھائی اُس سے واقف ہے۔ اور آپ کو بھی وقتاً فوقتاً اُن حضرات سے جو یہاں آتے رہتے ہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔

متذکرۂ بالا بحث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کے ممالک کے آزاد خیال حضرات نے داڑھی اور رہی سہی مونچھ کا صفایا کر کے ان متبرک اشیاء کے احترام وعزت میں بہت بڑی دست اندازی کی۔ آپ خیال فرمائیں ان حرکات کا نتیجہ بغیر ظہور پذیر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ سارے مردوں نے عورتوں کا روپ بھرنے کی کوشش کی۔ کیا یہ بات اوپر ہی اوپر چلی جائے گی۔ ایسے فعل کی نحوست سے خدا بچائے۔ آپ نے اس کا خیال نہیں کیا نتیجہ دیکھیے۔

میری رائے ناقص میں اس قصور کی تلافی بہت جلد ہونا چاہیے۔ اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ کے یہاں کے عوام، امرا و عقلا داڑھی چھوڑ دیں۔ جب یہ یکمشت دو انگشت ہو جائیگی اور سب لوگ مع بڑی بڑی داڑھیوں کے جمع ہو کر صلح کی گفتگو کریں گے ممکن نہیں کہ سب جھگڑے طے نہ ہو جائیں۔ اگر اخراجات خونریزی اور جانی نقصانات کا

خیال نہ کریں گے تو بھی داڑھی کا خیال کرکے لڑنے جھگڑنے سے باز رہیں گے۔

اب بھی اگر آپ کی سمجھ میں نہ آوے تو ہمارا کیا قصور ہے ذہانت اور لیاقت کا زور طبیعت کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ چنانچہ آج کل تُکبندی کی سوجھی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

بغلولیت کی دہر میں اب دھوم دھام ہے — ہر شخص کی زبان پہ حاجی کا نام ہے
غصے میں گرہاتے تھے زیتون کی چھڑی — ہنستے تھے آپ اور کہتے تھے کیا بدلگام ہے
حرکت چھڑی کی ہوتی ہوا میں تھی بیشتر — جس سے ہر اس شیروں کو اب تک مدام ہے
البتہ بے گناہ ہنسی میں کبھی رہے قدر — اسرافِ قوتِ جسدِ خوشخرام ہے
یورپ میں جا کے دیکھئے اُن طفلوں کے مزے — قربانی لاکھوں جانوں کی ہر صبح و شام ہے
جدت نے لوٹ پوٹ دیا ہے خیال کو — مبنی خیال ہی پہ یہاں کا نظام ہے
سمجھائیے جو جا کے کہ لڑنے سے فائدہ — بغلول کا سمجھ کے ہنسیں گے پیام ہے
معلوم ہے زمانے کو بغلول کے سپرد — اقلیم علم و فہم کا یاں انتظام ہے
فرصت کہاں اُنھیں کہ کریں جنگ کا خیال — منطق فلاسفی کی بحث صبح و شام ہے

اثیر۔ پرائیوٹ سکرٹری عالیجناب حاجی بلغ العلیٰ صاحب عرف حاجی بغلول۔ لکھنؤ

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں — جلد لے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں
بزم ساقی کا یہ کیا حال ہوا میرے بعد — خم کہیں ہے تو صراحی ہے کہیں جام کہیں
آہ کتنا وہ ترا پاس کے مجھے گرمِ نظر — ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انداز ہے کیا — قصد اُنکا کہیں جانے کا ہے پیغام کہیں
رنجِ بے سود سے حاصل ہو نہیں کاش نجات — مار ہی ڈالے ہیں وہ بتِ خودکام کہیں
مجھکو مشتاق لقا جان کے کہتا ہے وہ شوخ — بر نہ آئی ہو تری یہ ہوسِ خام کہیں

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت
آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

حسرت موہانی

ظفر علی خاں

یکے از اقوام جرائم پیشہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

(۴)

اس مضمون کو طول دینا منظور نہ تھا۔ بلکہ خیال یہ تھا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختصر تبصرہ لکھ کر "تاریخِ اشرار" کے بسیط میدان میں تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔ مگر اگست نمبر میں جو کچھ لکھا گیا اُس پر بعض خانگی تحریروں اور اخبارات کے مضامین میں ایسے طریقے پر ریویو کیا گیا ہے کہ ہمیں اس سلسلے کے ساتھ ساتھ احباب کی تحریروں اور معاصرین کے نوٹوں پر بھی کچھ لکھنا پڑے گا۔ چنانچہ سردست ہم دو باتوں کا جواب عرض کرتے ہیں :-

(۱) ایک عزیز دوست نے غالباً اُس گفتگو کی بنا پر، جو اُنکے مجمع احباب میں اس بحث پر ہوئی ہے اور ایڈیٹر صاحب وطن نے اپنے اخبار میں مضمون سابق کا وہ حصہ نقل کرتے ہوئے، جو ظفر علی خاں کے حالات سے متعلق تھا، اعتراض کیا ہے کہ باوجودیکہ ایڈیٹر زمیندار کی ان حالتوں سے ہم پوری طرح واقف تھے۔ لیکن اب تک ہم نے "جان بوجھکر دنیا کو مغالطے میں رکھا" اور اس سے قبل ہی کیوں یہ وہ نہ فاش کر دیا؟

واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف کو سب سے پہلی دفعہ ۱۹۰۲ء کے موسم برشکال میں ایڈیٹر زمیندار سے، جو اُس وقت "مترجم دفتر عدالت و کوتوالی" اور رسالہ "فسانہ" کے ایڈیٹری گونہ صفتین رکھتے تھے، ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور ایک سال سے کچھ زائد مدت تک یکجائی رہی۔ اس اثنا میں ایڈیٹر الناظر اپنے دوست کی عنایتوں اور محبتوں سے اس درجہ فیضیاب ہوتا رہا کہ ایک مستقل اور دیرپا رشتۂ مواخات قائم ہو گیا۔ اور فی الحقیقت راقم الحروف کے لیے زندگی کا وہ دور ایسا خوشگوار رہا ہے کہ استدادِ زمانہ اسکے نقوش کو کبھی محو نہیں کر سکتا۔

مگر جیسا کہ ستارۂ صبح مورخہ ۲۸ راگست میں خود ظفر علی خاں نے لکھا ہے "بڑے سے بڑے شخص میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں جنھیں تقاضائے فطرت وہ دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے"

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے بہت ہی قریبی تعلقات کے باعث اُن کا اخفا محال ہوتا ہے۔ ظفرعلی خاں کی عنایت ومحبت کا سکہ لوحِ دل پر نقش ہو جانے کے باوجود "قریبی تعلقات" کی بنا پر اُنکے معائب وکمزوریاں بھی ایڈیٹر الناظر پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہیں۔ راقم الحروف اُس وقت تک عمر کی اُس منزل پر نہیں پہونچا تھا جہاں انسان مشاہدات وتجربات کی بنا پر تدبر وتفکر کے بعد کوئی رائے قائم کرتا یا اصول عمل قرار دیتا ہے۔ نوجوانی کے عالم میں، زندہ دل اور اُمنگوں سے بھرے ہوئے احباب کی صحبت دنیا کی بہترین نعمت معلوم ہوتی تھی۔ اور اپنے سے زیادہ عمر والے، زیادہ قابل وطباع اور بڑی شخصیتوں والے لوگوں کی زندگی ہر طور قابل تقلید وپسند نظر آتی تھی۔ پھر بھی اُس تعلیم وتربیت کی بدولت جو ایک اسلامی خاندان کے محدود حلقے میں حاصل ہو چکی تھی، ناممکن تھا کہ رات کی تنہائی میں، یا خاموشی اور بیکاری کے لمحوں میں دودھ اور پانی کا فرق نظر نہ آتا۔ ظفرعلی خاں کی اعلےٰ علمی وادبی قابلیت، قومی وملی جوش، برادرانہ محبت وعنایت کے اعتراف میں کبھی بخل نہیں ہوتا تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کا تلون، طمع زر، بے اصولی، خود غرضی، اعلےٰ اخلاق سے محرومی اور مذہب سے عملی بیگانگی کو دیکھ دیکھ کر جی کڑھا کرتا تھا۔ چنانچہ بعض نہایت ہی عزیز دوست، جو قابلیت اور خوبیوں میں ظفرعلی خاں سے بلند تر رتبہ رکھتے تھے اور آج بھی اُنکے نام یہاں لکھدیے جائیں (جسے میں بغیر ضرورتِ خاص روا نہ رکھوں گا) تو اُنکی شہرت وعظمت سے ناظرین الناظر منکر نہ ہو سکیں گے، اس سے خوب واقف ہیں، اور میری زبانی اُسی زمانے میں اور اُسکے بعد بھی حقیقت حال سن چکے ہیں، اسی پر بس نہیں کیا بلکہ متعدد بار اور مختلف عنوانات سے خود ظفرعلی خاں کو اُنکے معائب پر متنبہ کر دیا، اور یہ ایسا جرم تھا جس پر ظاہر میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے مگر غالباً دل سے اُنھوں نے کبھی معاف نہیں کیا۔

لیکن وہ شخص جو لقد خلقنا الانسان فی کبد، اور اسکے ساتھ ہی الانسان مرکب من الخطاء والنسیان کی صداقت پر یقین رکھتا ہو اور پھر خود اپنی کثیر التعداد لغزشوں اور خام کاریوں پر بھی مطلع ہو، اسکی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ علی الاعلان اپنے واردات قلبی اور مشاہدات عینی کو ظاہر کرتا۔ اور نہ حقیقتاً ایسا کرنے کی ضرورت ہی کبھی واقع ہوئی۔

راقم الحروف نے معاملات قومی وملکی میں بہت ہی تھوڑے دن گذرے، عملی حصہ لینا شروع کیا ہے اور خود ظفرعلی خاں، ادبی خدمات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اب سے کچھ دنوں قبل ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔

بے شک گذشتہ چند سالوں کے اندر وہ پنجاب کے نمایاں اشخاص میں شمار ہونے لگے ہیں بلکہ

حقیقت حال یہ ہے کہ زمیندار کی وساطت سے پنجاب کے باہر ہندوستان کے دوسرے حصص میں بھی اُن کا کافی احترام ہوتا تھا۔ اور ایڈیٹر الناظر ان سب باتوں کو اب سے پہلے ہمیشہ اُسی نظر سے دیکھتا رہا ہے جیسے ایک عزیز دوسرے عزیز کی بلند اقبالی اور قدر و منزلت کو دیکھتا ہے۔

پنجاب کے اکثر اسلامی اخبارات افسوس ہے کہ ظفر علی خاں کے ورود لاہور سے قبل ہی اپنی سفیہانہ روش کے بدولت ملک و قوم میں کافی طور پر بدنام ہو چکے تھے (نا انصافی ہوگی اگر محترم معاصر وکیل کی استثنائی حالت کا بیان خاص طور پر اعتراف نہ کر دیا جائے) اس لیے جب ظفر علی خاں سے اور پیسہ اخبار و وطن وغیرہ سے لاہور میں جنگ زرگری شروع ہوئی ہے تو اگرچہ اُس وقت ان حالات کی اشاعت منشی محبوب عالم اور مولوی انشاء اللہ صاحبان کے بہت مفید مطلب ہو سکتی تھی لیکن میں کیا شاید کوئی شریف آدمی بھی اس میدانِ جنگ میں کو دنا پسند نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کا دُور سے تماشا دیکھنا بھی سخت تکدر و انقباض قلبی کا باعث ہوتا تھا۔ پھر بھی جب کبھی الناظر میں کچھ ظفر علی خاں کے متعلق لکھا گیا، تو، الناظر کے مطبوعہ اوراق کو اُٹھا کر آج بھی جس کا جی چاہے دیکھ لے ہمیشہ اس بارے میں احتیاط برتی گئی کہ اُنکے متعلق کوئی بات ایسی قلم سے نکل جائے جو بعد کو پشیمانی کا باعث ہو کیونکہ بیجا طرفداری اور برائی کو بھلائی کر کے دکھانا کبھی الناظر کا شیوہ نہیں رہا ہے۔

ظفر علی خاں کے متعلق رائے قائم ہو چکی تھی۔ اور نا قابل التردید شاہدات و تجربات کی بنا پر جو رائے قائم ہو اُس میں تزلزل کی کوئی وجہ نہیں تھی مگر جس وقت تک ظفر علی خاں قوم سے منحرف و برگشتہ نہیں ہوے تھے اور اپنی عدیم النظیر قابلیت اور غیر معمولی قوائے [illegible] سے قومی مفاد اور ملکی حقوق کی پامالی کے لیے کمربستہ نہیں نظر آتے تھے، اُنکی خطاؤں سے چشم پوشی اور اُنکی غلط کاریوں سے اغماض ممکن تھا۔

تصفیۂ کانپور کے وقت جو ہیجان مسلمانوں میں تھا اُس وقت سب سے پہلے اس کا خیال پیدا ہوا کہ مجمع احرار کے بعض افراد کے پوست کندہ حالات سپرد قلم کیے جائیں اور قوم و ملک کو اُس عظیم الشان خطرے سے آگاہ کر دیا جائے جو آپ نئے روپ میں اُنکی تخریب و بربادی کے درپے ہو رہا ہے۔ مگر وقت نے ساعدت نہ کی اور باوجودیکہ تاریخ اشرار (تاریخی نام) تجویز کر کے خاکہ بنا لیا گیا اور سب مواد فراہم کر لیا گیا تھا، عین وقت پر صحت نے جواب دے دیا اور ایسی کروہات دنیوی لاحق ہوئیں کہ آج تک اُن سے عہدہ برآ ہونے کا موقع نہ ملا۔

مسلم یونیورسٹی کے تصفیہ نے جو تحریک حال میں پیدا کر دی اس نے اُس زخم کہن کو تازہ

کر دیا، اور

ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے مجبور ہے

کے مصداق یہ دیکھ کر کہ جملہ مدعیان و حاملین حریت یا تو مجبوس و مجبور ہیں یا حق و صداقت کی تائید کرنے اور عفریت مصلحت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں فقدان ہمت کی وجہ سے معذور، اپنی بے مائگی اور بے حقیقتی کے اعتراف و احساس کے باوجود پتھروں سے سر ٹکرانے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور اسی سلسلے میں جب یہ اندیشہ ہوا کہ ظفر علی خاں کی لفاظی اور کمال انشاپردازی کہیں اُن جذبات حقارت و نفرت کو دبا نہ دے جو آج ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُنکے خلاف خود اُنکے طرز عمل نے پیدا کر دیے ہیں تو صرف اس لیے کہ نشان راہ بھولے بھالے لوگوں کو منزل مقصود کا پتہ دیتا ہے اور اس بیابان البہ فریبی میں جو لوگ گم گشتہ راہ ہو کر پھنس گئے ہوں انھیں کم سے کم ایک فرد، گو نہایت ہی ضعیف اور کمزور آواز میں سہی، یہ معلوم ہو جائے کہ قوم پروری اور وطن دوستی کا سرچشمۂ نور جان کر جس روشنی کی طرف اُن کی نگاہ منتظر ٹکٹکی لگائے ہوئے ہے وہ حقیقتاً ایک مہیب خطرناک درۂ کوہ کا چاک دامن ہے جسکی اصلیت، حقیقت خود آفتاب کے بعد ہی عالم آشکارا ہو جائے گی بس وہ خطرے سے آگاہ رہیں اور پو پھٹنے تک صبر و انتظار کریں۔

دنیا میں ایڈیٹر زمیندار کے سوا اور بھی "بڑے آدمی" ہیں۔ تاریخ عالم اُنکے کارناموں سے پُر ہے۔ خصوصاً ناموران اسلام کی عظمت و جلال کے سامنے تو ابھی بالکل ہی طفل ہیں۔ مگر کیا ستارۂ صبح اس دعوے کے ثبوت میں ناموران اسلام اور مشاہیر عالم کے زمرہ میں سے چند ایسے نام انتخاب کر کے پیش کر سکتا ہے جو ایک وقت اگر ناظم پاشا اور کمال پاشا کو گالیاں دیتے دیکر قوم کا فدائی اور ملک کا جاں نثار بنے ہوں، تو دوسرے وقت انھیں دشمنان ملت و وطن کے نقش قدم پر چلنے کو اپنے لیے موجب فلاح و نجات جانتے ہوں؟ اور اگر تاریخ میں ایسے کچھ شواہد ہوں تو کم سے کم راقم الحروف کو اور یقیناً ہر مومن و مسلم کو اُنکی عظمت سے یکسر انکار رہیگا۔

ستارۂ صبح اُن عزیز دوستوں کو جو کبھی دست و بازو سمجھے جاتے تھے الزام دیتا ہے کہ انھیں بعض مرموز مصلحتوں کی خون چکاں قربان گاہ پر ہماری (ایڈیٹر ستارہ صبح مراد ہے) استخوانہائے فرسودہ بھینٹ چڑھائی ہیں" اور یہ شاید اس بنا پر کہ خود ستارۂ صبح کے ناعاقبت اندیش ایڈیٹر نے اپنی مرموز مصلحتوں کی قربان گاہ پر ملک و قوم کے منافع کو بے دریغ چڑھا دینا گوارا کیا۔

ظفر علی خاں کے سب دوستوں میں اگر مصلحت شناسی ہی ہوتی تو پھر کیا دشواری تھی۔ ہر موا کے جھونکے پر ظفر علی خاں کی کشتی عمر کا بادبان جب رخ پلٹتا تو وہ سب کے سب بھی بلا مزاحمت امواج

پورب سے پچھم اور شمال سے جنوب کی طرف گھوم جاتے یا ایڈیٹر ستارۂ صبح کی طرح "رقص" کرنے لگتے۔ بغیہ مولانا عمادی خوب حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ ایک طرف "الصباح" کی حیثیت موجودہ قائم رکھنے کے لیے وہ اس بات کا اعلان فرماتے رہتے ہیں کہ ایڈیٹر الصباح کو ستارۂ صبح سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسری طرف "قوم پروری اور قوم فروشی" کے عنوان سے اسی اخبار میں ایک مضمون لکھتے ہیں اور اس بنیاد پر کہ "ستارۂ صبح میں ہندوستان کے مسئلہ استقلال اور عدم استقلال کی توثیق یا ابطال میں ایک حرف بھی مذکور نہیں"۔ ستارہ صبح اور اُسکے ایڈیٹر کو قابل الزام قرار دیتے ہیں پھر اسپر جب پرسش ہوتی ہے تو یہ حیلہ (؟) تراشتے ہیں کہ وہ مضمون نہیں تھا بلکہ بطور ایک اشتہار کے لکھوایا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دستخط سے پھر اعلان شایع فرماتے ہیں کہ عمادی کو ستارۂ صبح سے سروکار نہیں۔

مولانا — معاف کیجیے گا اگر میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ جمال ہمنشیں در تو اثر کرد۔ یا بقول بعض آپ پہلے ہی سے اس رنگ میں رنگے ہوے تھے۔ اب ذرا رنگ نکھر گیا ہے۔ افسوس! کس کس کو روئیے۔ ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ جہاں نگاہ اٹھا کر دیکھیے وہیں ڈھول کے اندر خول نظر آتا ہے۔ اور جس بلندی کو پشت پناہ بنایئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ریگ کے تودے سے زیادہ مستحکم نہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(۲) دکن کے احباب کو مضمون سابق کے آخری حصہ سے جس میں ڈیلی ڈیپوٹیشن کا ذکر تھا کسی قدر غلط فہمی واقع ہوئی اور متعدد دوستوں نے موجودہ نرخ مبادلہ پر نظر کر کے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اس معاملت میں ظفر علی خاں کو کچھ روپیہ اپنے پاس سے ملانا پڑا ہوگا۔ میں بوثوق کہتا ہوں کہ جو واقعہ میں نے بیان کیا ہے اس میں سرمو فرق نہیں ہے۔ پندرہ برس کی بات ہے اس وجہ سے میں بہ تفصیل نہیں بتا سکتا کہ اُس وقت مبادلہ کا نرخ کیا تھا اور اس معاملت میں کل کتنی رقم ظفر علی خاں کے تصرف میں آئی۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ایک رقم ضرور بچی تھی اور وہ نہ تو خزانہ سرکاری کو واپس دی گئی اور نہ ڈیوٹی فنڈ میں داخل کی گئی۔ ضرورت پڑیگی تو انشاء اللہ اس بیان کی تصدیق صرف خاص کے خزانۂ عامرہ اور بنگال بنک کی شاخ حیدرآباد کی معرفت کرادی جائے گی۔

اس دفعہ ضمنی بحث نے نفس مضمون کے لیے گنجایش نہ چھوڑی لیکن آیندہ نمبر میں ظفر علی خاں کی خود غرضی۔ بے اصولی اور اعلیٰ اخلاق سے محرومی کے متعلق ایک طولانی بیان شایع کیا جائیگا۔ اور یہ تحریر جو بجاے خود ایک پر درد داستان ہے چونکہ ایک ایسے بزرگ کی لکھی ہوئی ہے جنکا نام دنیاے ادب میں غیر معروف نہیں اور جو راقم الحروف کی عقیدت آگیں نگاہوں میں اس عہد کے بہترین انشا پردازوں میں ہیں۔ اس وجہ سے یقین ہے کہ ناظرین الناظر اُس سے پوری طرح لطف اندوز ہونگے اور ظفر علی خاں کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔ (باقی دارد)

نظرے خوش گزرے

راجہ غلام حسین بی اے ایڈیٹر "نیو ایرا" ۱۸ راگست کی شب کو، مسلم لیگ کے ایک جلسۂ شوریٰ سے معیت مسٹر رنگا آئر ایڈیٹر ایڈووکیٹ اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ سڑک پر یہ ناگہانی اور نادر الوجود حادثہ پیش آیا کہ ایک چھٹتے ہوئے گھوڑے کی ٹھوکر کھا کر سر کے بل گرے جس سے ایسے زخم شدید لگے کہ بالآخرہ ۲۰ راگست کو اس دار فانی سے رگرائے عالم بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خاقانی ہند ذوق مرحوم نے اپنے ایک شعر میں انسان زندگی کی منازل حیات وموت کا کیسا صحیح خاکہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

زندگی وموت کی یہ فلسفیانہ مگر نہایت ہی سادہ تعبیر اگرچہ کسی قسم کے شکوہ وشکایت یا ماتم والم کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن انسان جو ضعف وکمزوری کا پتلا ہے اور آرزوؤں اور تمناؤں کا بندہ، ممکن ہی نہیں کہ ایسے غم پرور اور دردناک مناظر سے متاثر نہ ہو، اور اپنی بے اختیاری ومجبوری کے احساس کے باوجود اضطراب وبےصبری کا اظہار نہ کرے۔

مسلمانوں میں جو قحط الرجال ہے اُسکے خیال سے ایسے نونہالان قوم کی مفارقت کیسے گوارا ہو سکتی ہے جو اپنی اعلیٰ قابلیتوں اور بے مثال اہلیتوں کی وجہ سے ملک وقوم کے مرکز بن گئے ہوں۔ لیکن یہ انتہائی حد درجے کی کم طالعی اور بدقسمتی ہے کہ ایک طرف اگر یہ جنس حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے کمیاب، اور ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے گراں قدر ہوتی جاتی ہے تو دوسری طرف گردشِ فلک یا قومی ادبار پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ "گر نتانی بستتم می رسد"

راجہ غلام حسین، یہی نہیں کہ انگریزی زبان کے بہترین انشا پرداز اور ایک بلند پایہ اخبار نویس تھے، بلکہ قومی درد۔ خلوص وجوش اور ملکی ترقی کی اُمنگ بھی اُن میں فطرت نے کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اُس پر مستزاد یہ تھا کہ زمانے کی روش کے برخلاف نمود ونمائش کے عوارض سے بھی وہ محفوظ تھے پھر انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے عام رجحان سے الگ اُن میں دین اسلام کی سچی محبت اور شریعتِ اسلامی کا حقیقی احترام بھی کافی حد تک موجود تھا۔ البتہ اپنے دورِ نوجوانی کے عہد میں وہ معاشرت و

تہذیب جدید کے زہرآلود اثر سے نہ بچ سکے تھے مگر رفتہ رفتہ فطری صلاحیت جو ناقص طریقِ تربیت تعلیم اور سوسائٹی کے مضر اثرات سے دب گئی تھی، عود کرتی آتی تھی اور توقع قائم ہو چلی تھی کہ کچھ روز کے بعد اُنکی زندگی ہر نہج سے نوجوان مسلمانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہو جائے گی۔ لیکن حسن دریغ خیالیم و فلک در چہ خیال، قوم کی آرزوئیں، اہلِ ملک کی تمنائیں اور احباب و ہوا خواہوں کی امیدیں سب کی سب منہ تکتی رہ گئیں اور بساطِ قومیت کا یہ زبردست و کارآمد مہرہ اجل کی زد میں آگیا۔

آں قدح بشکست آں ساقی نماند

ایڈیٹر الناظر کو راجہ غلام حسین کے دورانِ قیام لکھنؤ میں اُن سے بار بار ملنے کا اتفاق ہوتا تھا اور مرحوم کی خوبیوں نے ایسا گرویدہ بنا لیا تھا کہ اس حادثے سے دل کئی روز نڈھال ہو رہا ہے اور الناظر کے اس دفعہ تعویق نکلنے کا بہت کچھ یہی باعث ہوا ہے۔

مرحوم کے ورثاء میں اُنکی بوڑھی ماں، اُنکی نوجوان بیوہ اور ڈھائی سال کی بچی سب کی ہمدردی کی سزاوار ہیں۔ اور وہ شجر قومی جسکی عمر ابھی پانچ مہینے سے زیادہ نہیں یعنی اخبار نیو ایرا جو مرحوم کا فرزندِ معنوی کہا جا سکتا ہے، قوم کے ہر چھوٹے بڑے کی امداد و اعانت کا خاص طور پر مستحق ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ورثاء غلام حسین مرحوم کے مصائب و آلام میں بھی خواہانِ ملک و قوم پوری طرح شریک ہوں گے اور نیو ایرا کے قیام و ثبات کے لیے کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق جس تحریر کی اشاعت کا ماہِ گذشتہ وعدہ کیا گیا تھا، ہنوز اُسکی وصولیابی کا انتظار ہے۔ بلکہ جو قیمت اُسکی طلب کی گئی ہے اُسکے فراہم نہ کر سکنے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ہمیں اس سے قطع نظر کر کے نئے سرے سے کوشش کرنا پڑیگی۔ بہرحال آئندہ نمبر کا ناظرین انتظار کریں۔

اس سلسلے میں یہ خبر خوش، خاص دلچسپی سے سُنی جائے گی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے نصابِ تعلیم تیار کرنے کی غرض سے ایک محکمہ ترجمہ و تالیف قائم کیا گیا ہے جسکے منتظم اعلیٰ ہمارے مخدوم و محترم جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو (جو اس سے قبل ضلع اورنگ آباد کے مہتمم (انسپکٹر) تعلیمات تھے) مقرر ہوئے ہیں۔ اور ہمارے عزیز دوست مسٹر عبد الماجد بی اے مصنف فلسفہ جذبات و فلسفۂ اجتماع وغیرہ، قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے (سابق ایڈیٹر رسالہ لسان العصر لکھنؤ) اور پروفیسر سید الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی (مصنف علم المعیشت) اُسکی کارکن جماعت کے لیے منتخب

ہوے ہیں - اس محکمے کے مصارف کے لیے سر دست سولہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم دولت آصفیہ نے منظور کی ہے جسے چوالیس ہزار سے اسی ہزار روپیہ سالانہ تک وسعت دی جائے گی - ہم ان تجاویز کا بدل خیر مقدم کرتے ہیں اور ان تقرریوں پر جن سے بہترین نتائج کی توقع بندھتی ہے، اپنے سب احباب کرام کو دلی مبارکباد دیتے ہیں -

---

طب یونانی، جو فی الحقیقت طب اسلامی کہے جانے کی مستحق ہے جن بابرکت اصحاب کی بدولت اب تک اپنے فروغ و کمال کا مظاہرہ کرتی رہی ہے، اُن کی صف اول لکھنؤ کے اطباے جھوائی ٹولہ کے لیے مخصوص ہے -

حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم جو اپنے عہد میں یگانۂ روزگار اور بزم اطبا کے قابل ترین صدر تھے، اگرچہ اُنکی جگہ ہنوز خالی ہے پھر بھی اُنکے فرزندان نامور جناب حکیم عبدالرشید صاحب اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے دریاے فیض سے ایک عالم سیراب ہو رہا ہے اور "نئی روشنی" اور "سرکاری طب" کے گوناگوں مخالف اثرات کے باوجود طب اسلامی کی موجودہ قدر و منزلت بہت کچھ ان ہی اصحاب کی مستعدی و جفاکشی اور اپنے پیشے میں کمال و انہماک کے باعث ہے - گذشتہ تقسیم خطابات کے موقع پر حکیم عبدالرشید صاحب کو "شفاء الملک" کا لقب بخشا گیا ہے - جس پر عام طور سے اظہار پسندیدگی ہوا ہے - دہلی میں اس عزت افزائی پر مسرت و امتنان ظاہر کرنے کے لیے جو جلسہ منعقد کیا گیا تھا اس میں منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی نے ایک با موقع نظم پڑھی تھی - مکرم و محترم جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا نے اُسے بغرض اشاعت ہمارے پاس بھیجا ہے جو اس پرچے کے صفحہ ۱۶ پر درج کی جاتی ہے -

ایڈیٹر الناظر جملہ اطباے جھوائی ٹولہ کا عموماً اور اپنے مخدوم معظم جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا خصوصاً دیرینہ خاندانی تعلقات کی وجہ سے اور نیز ذاتی خصوصیات کی بنا پر غایت درجہ ممنون کرم ہے - اس وجہ سے باوجودیکہ خطابات کا وہ احترام اُسکے دل میں نہیں ہے جو عام طور پر لوگوں میں پایا جاتا ہے وہ اس موقع پر بدیں خیال اظہار طمانیت کرتا ہے کہ "حق بحقدار رسید"- اور امید رکھتا ہے کہ جناب شفاء الملک پہلے سے زیادہ شہر اور بیرونجات کے اُن کثیر التعداد غربا اور متوسطین کے حال پر التفات فرمائیں گے جو اُنکے آستانے پر جوق در جوق حاضر ہوتے رہتے ہیں -

تازہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو

مشاہیر یونان و روما یعنی حکیم پلوٹارک یونانی کی شہرۂ آفاق کتاب پیرلل لائیوز کا اُردو ترجمہ (حصہ اول) جس میں یونان و روما کے اولوالعزم مدبرین کے سوانحی حالات اور اُنکے بیش بہا خیالات درج کرکے ازراہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے۔ یورپ میں یہ کتاب اس درجہ عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کہ بڑے بڑے فلسفی۔ شاعر اور مدبرین سلطنت اس سے استفادہ کرنے پر فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں انگریزی زبان میں جس شخص نے اس کتاب کا ترجمہ کیا اُسے برٹش گورنمنٹ نے اسکے صلہ میں سر کا خطاب عطا کیا۔ اور حقیقت میں یہ کتاب ہے بھی اسی قابل کہ اسکی عزت و عظمت کیجائے۔ کیونکہ بہ قول مولوی عبدالحق صاحب کے "یہ منجملہ اُن چند کتابوں کے ہے جنھوں نے مغرب کو قعر مذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہنچا دیا"۔ "آپ اس کتاب میں حب وطن، کامل ایثار، بے نفسی و جاں نثاری اور اولوالعزمی کی ایسی زندہ اور سچی تصویریں دیکھیں گے کہ اُن کو پڑھ کر انسان بے خود ہو جاتا ہے اور اُس کا دل بے اختیار سچی خدمات کیلئے اُبلنے لگتا ہے"۔ اور خواہ کیسا ہی آدمی ہو، یہ ممکن نہیں کہ اس کے پڑھنے کے بعد وہ متاثر نہ ہو اور ان انسانی اعلیٰ خوبیوں کا دائمی اثر اُس کے دل پر نہ باقی رہے دنیا میں سیکڑوں آدمی ایسے گزرے ہیں کہ اس کتاب نے اُن پر جادو کا سا اثر کیا ہے اور اسکی بدولت اُنھیں حیات جاودانی حاصل ہوئی ہے"۔

سید ہاشمی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ جس جانکاہی، شوق اور محنت سے کیا ہے اُس کے لحاظ سے سکرٹری صاحب انجمن ترقی اُردو کی رائے ہے کہ "یہ اُردو ترجمہ بلحاظ طرز بیان، سلاست و اظہار مطالب انگریزی ترجمہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ لائق مترجم نے کتاب کے شروع میں ایک تاریخی مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے جو گویا یونان و روما کی قدیم تاریخ کا خلاصہ ہے اور یونان و روما کی قدیم سلطنتوں کے رنگین نقشوں سے بھی کتاب مزین کی گئی ہے

قیمت ۲/۸ مجلد ۳/-

دریائے لطافت۔ یہ لاجواب کتاب مشہور اُستادانِ فن سید انشاء اللہ خاں انشا اور مرزا قتیل کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو ایک دفعہ پہلے بھی مطبع آفتاب عالمتاب مرشدآباد میں طبع ہوئی تھی مگر اب نہیں ملتی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے اب مناسب ترمیمات و اختصار کے بعد اسے پھر شایع فرمایا ہے۔ اور شروع میں ایک دلچسپ اور لطیف دیباچہ خاص اپنے قلم سے اضافہ کیا ہے۔ اُن تمام اصحاب کے لیے جن کو اُردو زبان کے متعلق تحقیقات یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہو یہ نہایت عمدہ رہنما ہوگی اور اُردو کے کسی کتب خانہ کو اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ مصنفوں اور عام اہل قلم کے لیے یہ کتاب مختلف خصوصیات کے لحاظ سے سود مند کارآمد ہوگی۔ قیمت ۱/۸ مجلد ۲/-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

تذکرۂ شیخ علی حزیں

۷ جون ۱۹۱۷ء کو میں اپنے ایک دوست کے عقد میں شرکت کی غرض سے بمقام گوپی گنج گیا تھا۔ یہ مقام ضلع بھدوہی (اسٹیٹ بنارس) میں شامل ہے اور بنارس سے سولہ سترہ کوس کے فاصلے پر جانب گوشۂ جنوبِ مغرب واقع ہے۔ واپسی میں علی الصباح اسٹیشن بنارس چھاؤنی پر اُترا چند احباب بھی ساتھ تھے۔ عجب اتفاق کہ اس بڑے اور مشہور اسٹیشن پر اس وقت کوئی گاڑی یا اِکّہ نہیں ملا۔ دوستوں کی رائے ہوئی کہ شہر تک ٹہلتے ہوئے چلیں۔ شہر میں رام نگر پہونچنے کے لیے متعدد گاڑیاں اور بکثرت تکّے مل جائیں گے، یا دریا کی راہ بہ آسانی مکان پہونچ جائینگے الغرض ہم لوگ خراماں خراماں۔ فاطمان[۱] کی راہ سے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

اس وقت میرے ساتھیوں میں علاوہ دیگر احباب کے میرے چھوٹے بھائی محمد ہاشم علیخاں[۲] سلمہٗ اور حکیم محمد نعیم الدین صاحب بھی تھے۔ یہ صاحب حکیم محمد عطا کریم عطا سہسرامی مرحوم کے صاحبزادے ہیں، اور حکیم عطا مرحوم میرے کتبی یار تھے۔ فاطمان کے قریب پہونچ کر ان لوگوں نے شیخ علی حزیں کی قبر دیکھنے اور اُسپر فاتحہ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ قبرِ شیخ کی دید کا اشتیاق لیکر ہم فاطمان کے اندر داخل ہوا۔

---

[۱] بنارس کا ایک مشہور قبرستان ہے۔ [۲] میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔

مرقد شیخ علی حزیں کے آس پاس ہزار ہا پختہ و خام جدید و کہنہ قبریں موجود ہیں۔ اُنمیں کوئی قبر سنگِ مرمر کی سفید شفاف چمک رہی ہے۔ کسی قبر پر جرمن سلور کی خول چڑھی ہوئی ہے جسپر آفتاب کی شعاع پڑنے سے نظر کو خیرگی ہوتی ہے۔ بہت سی قبریں معمولی اینٹ پتھر کی مگر صدہا برس کی کہنہ ہیں، جنکو ہر سال ابرِ باراں کے چھینٹے دے دے کر گھٹا سے بھی کہیں زیادہ سیاہ بنا رکھا ہے۔ اکثر پُرانی قبروں کے سنگ تعویذ جا بجا سے ٹوٹ گئے ہیں۔ کسی کا نصف پتھر باقی ہے تو کسی کا پورا پتھر ندارد ہے۔ بعض بعض قبروں کو اونچے اونچے درختوں نے اپنے سائے میں لے رکھا ہے۔ کچھ قبریں گھانسوں نے اپنے دامن میں چھپالی ہیں۔ ان قبروں کا یہ منظر دیکھکر مجھے زیب النسا کا یہ شعر (جو اُنکی قبر پر کندہ ہے) یاد آگیا:۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا   کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

کچھ قبریں خام بھی تھیں، جن کا نشان اس طرح ملتا تھا کہ بعض مٹی کے ڈھیر زمین سے کچھ اونچے ہو کر بتلا رہے تھے کہ ہم بھی کسی غریب کی قبر ہیں۔ انھیں مٹی کے ڈھیروں سے ملے جلے بعض گڑھے زمین سے ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ نیچے بیٹھکر لاوارث قبر ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ یہ دیکھکر بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ

کوئی اتنا بھی نہیں پوچھنے والا انکا   کیا گذرتی ہے، کہو قبر میں سونے والو

جب ان قبروں سے گذرتا ہوا اُس اکیلی قبر کے پاس پہونچا جو مسجد و روضۂ فاطمان (فاطمہؑ) سے زیادہ قربت رکھتی تھی اور اُس میں تصورات و تخیلات کا بادشاہ میٹھی نیند سو رہا تھا۔ نہ شعر کی فکر، نہ مصرعہ کا خیال، نہ مضمون آفرینی کا جوش، نہ سخن سازی کے حواس۔ سنگِ قبر پر دو تین شعر جو کسی زمانے کے موزوں کیے ہوے تھے، کندہ ہیں۔ وہی بتلا رہے ہیں کہ شیخ علی حزیں نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، ڈیڑھ سو برس سے بھی چند سال پہلے اس تنگی قبر کے اندر مٹی کے فرش پر خوابِ استراحت میں مصروف ہیں۔ قبر پر ایک مٹی کا چراغ جو کبھی راتوں کو اُس قبر پر جل جھلنے کی خبر دے رہا تھا، اور کچھ مرجھائے ہوے پھول جو کہہ رہے تھے کہ ہم آج ہی کی رات اس

پر چڑھائے گئے ہیں پڑے تھے

ہم اور ہمارے تمام ساتھی قبر کے چبوترے پر جو بمقابلہ دوسری قبروں کے اونچا نہ تھا، جوتے اُتار اُتار کر چڑھ گئے ہمارے ساتھیوں نے بہت اشتیاق کی نظر سے قبر کا گوشہ گوشہ دیکھا اور فاتحہ خواں ہوے۔

فاطمان سے روانہ ہونے پر اثنائے راہ میں جہاں تک سُنے سُنائے حالات شیخ کے مجھے معلوم تھے میں نے سنا دیے مگر اس سے ان لوگوں کی پوری تشفی نہ ہوئی۔ بلکہ مفصل حالات شیخ کے سُننے کا شوق بڑھتا نظر آیا۔ لہٰذا ان لوگوں کا بڑھا ہوا اشتیاق دیکھ کر مجھے شیخ کے مفصل حالات کے دریافت کرنے کی تلاش و فکر ہوئی۔

کتاب مفتاح التواریخ جو میرے پاس موجود ہے، و نیز کتبہائے موجودۂ کتب خانۂ سرکار آقائیم بہادر[۱] و دیگر ذرایع سے شیخ کے حالات تلاش و کیجا کر رہا تھا کہ میرے مہربان حافظ شیخ امام الدین صاحب نے جو، جون کو میرے ساتھ تھے شیخ کی سوانح عمری فارسی، جس میں خود شیخ نے اپنی سرگذشت قلمبند کی ہے، مطبوعہ مسلم پریس دہلی ۱۹ ۱۳ہجری، کہیں سے عاریتاً لاکر مجھے دی۔ اگرچہ اُس سے مجھے مزید امداد نہیں ملی۔ کیونکہ کتب خانۂ سرکار آقائیم میں بھی یہی سوانحعمری شیخ کی مطبوعہ پریس مفاد بند بنارس ۱۳۰۱ھ موجود تھی اُس سے میں ضروری حالات کا اقتباس کر چکا تھا، تاہم میں حافظ جی کا مشکور رہوا۔

الغرض یہ حالات شیخ کے جہاں تک صحت و اختصار کے ساتھ ملے اختلافات رفع کر کے درج کیے۔

شیخ علی حزیں مغفور

ایک باکمال اہل سخن گذرے ہیں۔ انکی ذاتِ بابرکات آخری دَور میں فارسی شاعری کے لیے

---

[۱] عالیحضرت فیض ظہور مہاراج دہراج دویجراج سری مہاراجہ صاحب بہادر والی بنارس دام اقبالہ و اجلالہٗ

مایۂ فخر و ناز تھی۔ علاوہ کمالِ شاعری، و علم و فضل کے معززامرائے ایران و ذی عزت روسائے اصفہاں میں سے تھے اور نہایت نیک نفسی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ دنیا و لذاتِ دنیا کو ترک کر کے خلق اللہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ گوشے میں بیٹھکر یاد الٰہی کرتے تھے۔

نام شیخ علی: تخلص حزیں، مذہب شیعہ تھا۔ شیخ تاج الدین ابراہیم، معروف بہ شیخ زاہد گیلانی کے خاندان سے ہیں۔ نسب نامہ شیخ علی حزیں کا شیخ زاہد گیلانی تک یہ ہے

نسب نامہ[۱] شیخ علی حزیں بن ابیطالب بن عبداللہ بن علی بن عطاء اللہ بن اسمٰعیل بن اسحٰق بن نورالدین بن محمد بن شہاب الدین علی بن علی یعقوب بن عبدالواحد بن شمس الدین محمد بن احمد بن محمد بن جمال الدین بن شیخ تاج الدین ابراہیم معروف بہ شیخ زاہد گیلانی۔

شیخ زاہد گیلانی شیخ صفی الدین اردبیلی کے مرشد و خسر تھے۔ شیخ صفی الدین اردبیلی آذربایجان

---

[۱] نسب نامہ میں بہت زیادہ اختلاف پایا گیا۔ مفتاح التواریخ مطبوعہ ۱۸۹۴ء میں تحریر ہے کہ شیخ علی حزیں، شیخ زاہد گیلانی کی پندرہویں پشت میں ہیں، مگر سلسل نسب نامہ اس میں نہیں ہے۔ سوانح عمری شیخ مطبوعہ مسلم پریس دہلی ۱۳۰۹ہجری میں جو نسب نامہ درج ہے اُس سے اٹھارہویں پشت میں اور نسب نامہ مندرجہ کلیات حزیں مطبوعہ مطبع نامی منشی نول کشور ۱۲۹۳ہجری سے سترہویں پشت میں شیخ زاہد گیلانی تک سلسلہ ملتا ہے گر بظاہر اس میں یہ غلطی معلوم ہوتی ہے کہ (شیخ نورالدین محمد) اور (علی یعقوب) دو نام کو سوانحعمری مذکور میں چار نام اس طرح پر دکھایا گیا ہے کہ نورالدین بن محمد و علی بن یعقوب کلیات میں بھی (علی یعقوب کو دو نام علی بن یعقوب) لکھا ہے۔ تاریخ بنارس مولفہ حکیم سید مظہر حسن صاحب طبیب دربار بنارس مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں جو نسب نامہ تحریر ہے اُس میں شیخ علی حزیں کو ابن ابی طالب عبداللہ بن علی بن عطاءاللہ لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی طالب عبداللہ ایک شخص کا نام ہے مگر ایسا نہیں ہے، ابی طالب ابن عبداللہ صحیح ہے۔ سوانح عمری و کلیات سے صاف واضح ہے۔ اور اسکے تاریخ بنارس میں جہاں شیخ کے اجداد کا تذکرہ کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ شیخ ابی طالب، شیخ عبداللہ کے بیٹے تھے اور شیخ عبداللہ شیخ علی بن عطاءاللہ کے بیٹے تھے۔ سوانح عمری شیخ مطبوعہ مفاد ہند پریس بنارس ۱۹۰۱ء میں جو نسب نامہ درج ہے وہ مطابق تاریخ بنارس کے ہے۔

کے سجادہ نشیں اور شاہانِ صفویہ کے اجداد و حضرت امام موسیٰ کاظم کے اولاد سے تھے انکا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ کاظمؑ سے اکیسویں پشت میں ملتا ہے۔ بادشاہانِ صفوی اسی خاندان سے تھے اسی وجہ سے صفوی کہلائے۔

شیخ صدرالدین اردبیلی شیخ صفی الدین اردبیلی کے صاحبزادے اور شیخ زاہد گیلانی کے نواسے تھے۔ یہ نہایت نیک اور صالح تھے۔ انکی نیکی و پرہیزگاری تیمور شاہ جیسے ذی حشم بادشاہ کو انکے مکان پر لے گئی۔ جب تیمور شاہ نے پوچھا کہ میں تمھاری کون سی خدمت کروں تو شیخ صدرالدین نے کہا کہ اُن اسیروں کو جنھیں تم روم سے لائے ہو رہا کردو۔ تیمور شاہ نے انکی یہ درخواست قبول کی جس وجہ سے وہ احسان مند قومیں شیخ صدرالدین کی معتقد ہوگئیں اور انکا اعتقاد انھیں تک نہیں رہا بلکہ اُن قوموں کی اولاد نے شیخ صدرالدین کی اولاد کا بہت عرصہ تک ساتھ دیا۔

کتاب مفتاح التواریخ میں تاریخ وفات شیخ صفی الدین اردبیلی اس طرح تحریر ہے:۔

آنکہ سلطان اولیا بودہ | درۃ التاجِ اصفیا بودہ
وانکہ دریاے فیضِ عرفان است | جدِّ شاہانِ ملکِ ایران است
صاحبِ اردبیل شیخ صفی است | کاشفِ نکتۂ خفی و جلی است
ماہ عاشورہ دو واز دہم | بود کاں قطب شد بچرخ نہم
روز تکفین او دو شنبہ گو | صاحبِ خلد سال رحلتِ او

شیخ علی حزیں کے اجداد شہر استارا کے رہنے والے تھے۔ شیخ شہاب الدین شہر استارا سے لاہجان میں کہ عمدہ ترین شہر گیلان سے ہے آئے اور قیام پذیر ہوئے۔

شیخ کے دادا شیخ علی بن عطاء اللہ ایک ذی علم و مشہور شخص تھے۔ خان احمد خاں بادشاہ

---

[1] سوانح عمری شیخ مطبوعہ مصنفہ بربیل شہ۱۸۳۱ ہجری میں یہ نام شیخ جمال الدین علی بن عطاء اللہ تحریر ہے مگر دوسرے نسخوں میں یہ نام صرف علی بن عطاء اللہ تحریر ہے۔

بادشاہ گیلان نے ان سے کچھ پڑھا تھا۔ اس لیے بادشاہ انکی قابلیت علمی کی کمال تعظیم کرتا تھا۔

شیخ علی بن عطاء اللہ کے صرف ایک بیٹے تھے شیخ عبداللہ جنھوں نے کُل علوم و فنون کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور تقوی کے باعث تارک دُنیا ہو کر تھوڑی سی آمدنی پر بسر کرتے تھے۔ شیخ عبداللہ کے تین فرزند شیخ عطاء اللہ و شیخ ابیطالب و شیخ ابراہیم تھے۔ شیخ عطاء اللہ فرزند اکبر تھے جو لاولد مرے۔ شیخ ابراہیم جو سب سے چھوٹے تھے خوشنویسی میں ہفت قلم تھے۔ شیخ ابیطالب (شیخ علی حزیں کے والد) بھی نہایت خوشنویس تھے ستر جلد کتابیں انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی انکے کتب خانے میں موجود تھیں۔

شیخ ابیطالب بعد تحصیل علم ضروری بیس برس کی عمر میں بغرض صحبت علماے عراق اصفہان میں آئے اور آقا حسین خوانساری سے درس لینے لگے۔

بحالت قیام اصفہان انکی شادی حاجی عنایت اللہ اصفہانی کی لڑکی سے ہوئی جو شیخ علی حزیں کی والدہ تھیں۔ جب سے شیخ ابیطالب کی شادی حاجی عنایت اللہ کی لڑکی سے ہوئی شیخ ابیطالب اصفہان میں رہنے لگے۔

بتاریخ ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۰۳ ہجری روز دوشنبہ شیخ علی حزیں اصفہان میں پیدا ہوے جب چار برس کے ہوے تو ملا شاہ محمد شیرازی نے جو اُس وقت کسی ضرورت سے وارد اصفہان تھے بسم اللہ کرائی۔ آٹھ برس کی عمر میں ملا حسین قاری اصفہانی سے قرآن مجید پڑھا۔ دو برس میں قرآن مجید ختم کر کے فارسی کی چند کتابیں نظم و نثر پڑھیں۔ پھر رسالہ صرف و نحو وغیرہ حفظ کر کے چند رسالے منطق کے پڑھے۔

طبیعت موزوں ذہن رسا پایا تھا۔ شعر گوئی کی طرف رجوع ہو گئے۔ ہرچند انکے اُستاد منع کرتے تھے مگر انکا میلان طبع انکو چھوڑنے نہ دیتا تھا۔ جو کچھ یہ موزوں کرتے تھے پوشیدہ

تاریخ حزیں مطبوعہ ۱۸۳۱ء میں تاریخ پیدائش شیخ ۲۶ جمادی الاول ۱۱۰۳ھ تحریر ہے جو غلط ہے۔ ملاحظہ ہو کلیات حزیں مطبوعہ مطبع نامی نولکشور ۱۲۹۳ ہجری صفحہ ۱۰ و مفتاح التواریخ صفحہ ۵۲۴۔

رکھتے جاتے تھے

چند روز کے بعد فرطِ محبت سے انکے والد نے خود پڑھانا شروع کیا۔ کئی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اسی درمیان میں اپنے والد کے ہمراہ لاہجان اپنے چچا شیخ ابراہیم کے پاس گئے۔ اور ایک سال تک وہاں مقیم رہ کر، اپنے والد کے ایماسے، اپنے چچاسے رسالہ خلاصۃ الحساب پڑھا۔ پھر وہاں سے واپس آنے پر حاجی محمد طاہر اصفہانی و حکیم شیخ عنایت اللہ گیلانی سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اسکے بعد انکے والد نے بخواہشِ تربیت، شیخ خلیل اللہ طالقانی کے سپرد کیا۔ تین برس تک انکی خدمت میں رہ کر مستفید ہوے۔ یہ بزرگ، شیخ کو شعرگوئی سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود حکم دیتے تھے کہ کچھ سناؤ۔ تخلص حزیں انھیں کا عطیہ ہے۔

جب خلیل اللہ طالقانی نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو شیخ بہاؤالدین گیلانی سے درس لینے لگے اور فرطِ شوق و ذکاوت سے مختلف فنون وعلوم کی کتابیں، جنکو پڑھانہ تھا، مطالعہ کیا کرتے تھے اور مواضعِ مشکلہ کو اپنے والد سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سی کتابیں جو پڑھی نہ تھیں حل ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طاعت وعبادت کا بھی شوق بڑھتا جاتا تھا۔ مگر باوجود کثرتِ مشاغل و وظائف کے شیخ کو صحبتِ شعرا و شغلۂ شعر و سخن سے کمال دلچسپی رہا کرتی تھی۔

ایک روز انکے والد کے پاس چند شعرا جمع تھے۔ انکے والد نے جو انکی مخفی شاعری کا حال جانتے تھے انکو بھی بلوایا۔ شعرائے حاضرین میں سے کسی نے ملا محتشم کاشی کا یہ شعر پڑھا

اے قامتِ بلند قداں در کمندِ تو   رعنائی آفریدۂ قدِ بلندِ تو

انکے والد نے انکی طرف متوجہ ہو کر کہا مجھے علم ہے کہ تم کو شاعری کا شوق ہے اگر ہو سکے تو اس طرح میں چند شعر موزوں کرو۔ شیخ نے اُسی وقت ایک مطلع موزوں کیا۔ جب انکے والد کی انپر دوبارہ نظر پڑی اور وہ سمجھے کہ یہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ادب و حجاب مانع ہے تو پڑھنے کی جازت دی۔ شیخ نے فوراً یہ مطلع سنایا۔

صید از حرم کشد خمِ جعدِ بلندِ تو   فریاد از تطاولِ شکینِ کمندِ تو

حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے احسنت آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اسی اثنا میں شیخ نے دوسرا شعر سنایا

شد رشکِ طور از ادنت کوے عاشقاں   بنشیں کہ باد خُردہ جاناں سپند تو

الغرض اسی طرح تھوڑے تھوڑے غور و تامل میں دوسرے اشعار موزوں کرکے سنائے۔ حضار نے بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ اس طرح فی البدیہہ اشعار موزوں کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ انکے والد نے بہت خوش ہو کر کہا اب میں نے اجازت دی تم شعر کہا کرو مگر اسقدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ وقت ضائع ہو۔

اُسی زمانے میں شیخ کو چند احباب کی صحبت میں گھوڑا دوڑانے کا شوق ہوا۔ ایک روز چند دوستوں کے ساتھ گھوڑا دوڑا رہے تھے کہ گھوڑے سے گر پڑے اور داہنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ایک سال تک اصلاح میں نہ آئی۔ شیخ نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ اُسی وقت ایک مثنوی ساقی نامہ لکھا جس کا ابتدائی شعر یہ ہے

خدایا توئی آگہ از راز و بس   بہشت از تو دارند پاکان ہوس

من و مستی و کنج میخانۂ   بہ آزادیم خطِ پیمانۂ

واقعات کے دیکھنے ہوئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے تحصیل علم و حصول فیض صحبت علما کے لیے بہت دور دراز کے سفر اختیار کیے اور شدید جسمانی تکلیفیں گوارا کی ہیں۔

اب تک شیخ نے تنہا گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا والدین کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے تھے کہ بغرض تحصیل علم دار العلم شیراز کے دیکھنے کا اشتیاق ہوگیا۔ والدین سے اجازت سفر کے خواستگار ہوئے۔ الفت پدری، جو خداوند عالم نے ہر ذی روح میں خلقی پیدا کی ہے، کبھی اسکی مقتضی نہیں کہ نور نظر کو، آنکھوں کے سامنے سے، دم بھر کے لیے بھی اوجھل ہونے دے مخصوص ایسے لائق اور ہونہار بیٹے کو۔ لیکن انکے والد نے جو خود ایک ذی علم و قابل شخص تھے اور اپنے بیٹے کو بہرِ علم کا ماہر تا بدار بنانا چاہتے تھے دل پر نہایت جبر گوارا کرکے اجازت دے دی۔

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد — ۴ہ ر

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — ؏ہ
- میڈیکل جورسپروڈنس — ے
- عربوں کا فن تعمیر — ۴ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق — ۱۲ر
- کتاب الشفعہ — ۱۲ر
- لکچر — ۸ر
- شرح قانون شہادت — ے

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد — ے
- نشاط عمر — عہ ر
- عصائے پیری — ۱۲ر
- اقبال دلہن — ۸ر
- حسن معاشرت — عہ
- بچوں سے دو دو باتیں — ۱۲ر

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر — ے
- وکیل نسواں — ۸ر

منشی سعید احمد
- آثار اکبری — ۱۲ر
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۴ر

مولوی عبد الرزاق
- نظام الملک طوسی — صہ
- البرامکہ — ے

حافظ عبد الرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ؏ہ
- الصدیق — عہ ر
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند — ۱۲ر

پروفیسر شہباز مرحوم
- کلیات نظیر اکبرآبادی — ۱۲ر
- زندگانی بے نظیر — ؏ہ

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابو البشر — ؏ہ
- حقائق اسلام — ۱۲ر
- اثبات واجب الوجود — عہ ر
- قوت خیال — ۴ر
- اصول خانہ داری — ۱۲ر

منشی حسین الدین خاں ہوش
- جمیلہ خاتون — ۳ر
- قومی گیت — ۵ر
- زنانہ خطوط — ۵ر
- لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم — ۱۲ر
- تاثیر صحبت — ۱۲ر
- حوران جنت — ۴ر
- رفیق مرزا — ۴ر
- تاثیر شفق — ۳ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز — عہ ر
- وکرم اروسی — عہ ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأة — عہ ر
- المدنیة والاسلام — ؏ہ

پروفیسر نواب علی
- تذکرة المصطفیٰ — ؏ہ
- معارج الدین — ؏ہ

مہاشے پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم — ۵ر
- مہاتما بدھ — ۱۰ر
- خدا اور روح — ۱۲ر
- مارٹن لوتھر — ۸ر
- سیرة المستورات — ۱۲ر
- بچوں کی کہانیاں — ۴ر

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المعلمین — ۶ر
- معیار الاخلاق — ۶ر
- تنقید لطیف — ۵ر
- تربیت اولاد — ۴ر

سید رفیع موہانی
- تاج ونشان — ۱۲ر
- دستار وکلاہ — ۸ر
- گنج شائگان — ۱۲ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۴ر
- شمع وشاعر — ۴ر
- بلال — ۱ر
- شکوہ — ۲ر
- جواب شکوہ — ۳ر
- نالۂ یتیم — ۳ر
- فریاد امت — ۳ر

نیاز فتح پوری
- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
- عائشہ صدیقہ — ۱۲ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ر

منشی پریم چند
- پریم پچیسی — ۱۲ر
- سیر درویش — ۳ر

سیماب اکبرآبادی
- بنت الرسول — ۵ر
- جام کوثر — ۵ر
- بہشتی جوہر — ۱۲ر

ارشد تھانوی
- حسن تخیل — ۱۲ر
- بیاض ارشد — ۸ر

سید ابراہیم عجمی
- جاپان — ۸ر
- جنگ روس وجاپان — ۸ر

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ؏ہ
- روزنامہ باتصویر — ے
- روزنامہ بلاتصویر — ؏ہ
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر وقہر — ۸ر
- رسول کی عیدی — ۲ر
- پیاری ہتکڑی — ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ۱۰ر
- نگاما خاتون — ۲ر
- اسلام کا انجام — ۱۴ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — عہ ر
- میلاد نامہ — عہ ر
- کرشن بیتی — ۱۲ر
- اردو دعائیں — ۶ر
- فلسفۂ شہادت — ۲ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۸ر
- جگ بیتی — ۶ر
- بچوں کی کہانیاں — ۶ر
- اسرار — ۴ر
- کم تو مت — عہ ر
- سیر دہلی — ؏ہ

مولوی مصباح الدین
- الہارون — ؏ہ
- محاربۂ فرنس و پرشیا — عہ ر
- مصباح الادب — ۸ر

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) — ے
- حسن سرورہ — ے
- دیول دیوی — ؏ہ
- گورا — ۸ر
- نیل کا سانپ — ؏ہ
- جعفر وعباسہ — ۸ر
- اختر حسینۂ بنگال — ۸ر

مولانا راشد الخیری
- منازل السائرہ — ۱۲ر
- شام زندگی — عہ ر
- الزہرا — ۱۲ر
- سات روحوں کے اعمالنامے — ۴ر

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس — ؏ہ
- اقصائے مغرب — ؏ہ

مولوی معین الدین
- اورنگ زیب — عہ
- بدمزاج شوہر — ۱ر
- رانکہ بیگم — ۱ر

سلطان حیدر جوش
- ابن مسلم — ؏ہ
- نواب فرید — عہ ر
- اتفاقات زمانہ — ۱ر
- مساوات — ۱ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ

منشی امیر مینائی مرحوم
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- خیابان آفرینش
- خطوط منشی امیر احمد

مولانا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی
- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین
- عصر قدیم
- حروب صلیبیہ
- تاریخ سندھ
- قرۃ العین
- تاریخ یہود
- ملکہ زنوبیہ
- الحکم بالرفاعیہ
- آغائی صاحب
- سکینہ بنت حسین
- مخدرات (مجلد)
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- زوال بغداد
- غیب دان دلہن
- حسن بن صباح
- افسانۂ قیس
- مقدس نازنین
- قیس و لبنیٰ
- ایام عرب
- حسن انجلینا
- منصور موہنا
- شہید جفا
- دلکش
- دلچسپ ناول
- میوۂ تلخ
- [illegible]
- شوقین ملکہ
- ملک العزیز ورجنا
- یوسف و نجمہ
- زیاد و حلاوہ
- رویۃ الکبریٰ
- فلورا فلورنڈا
- زمانہ اور اسلام
- فردوس بریں
- آغا صادق کی شادی
- بدر النساء کی مصیبت
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- خوفناک محبت
- الفانسو
- فلپانا
- فاتح مفتوح
- ہندستان کی موسیقی
- سرسید کی دینی [illegible]

مسٹر انیس احمد
- اجرہ کی کامیابی
- بحری جنگ

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- طلسمی فانوس
- طرحدار لونڈی
- میٹھی چھری
- کایا پلٹ

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو
- بچھڑی دلہن
- کرم دھم
- پی کہاں
- کامنی
- جام سرشار
- خدائی فوجدار
- فسانۂ آزاد
- سیر کہسار

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- عالم خیال
- سیکفرڈ لوسی
- (مجموعہ نظم)
- حسن — [illegible]
- بہار — برسات (حصہ ۲)

جلال مرحوم
- مضمونہائے دلکش
- نظم نگارین
- افادۂ تاریخ
- رسالہ تذکیر و تانیث

مرزا رسوا بی اے
- امراؤ جان ادا
- لیلیٰ مجنوں
- نوبہار

جوالا پرشاد برق
- مرنالنی
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- پرتاپ
- معشوقۂ عرب
- بروگ
- اتھیلو
- روہنی

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر
- اورنگ زیب

خواجہ عشرت
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو

مولانا عبد الشکور
- اسد الغابہ
- علم الفقہ

علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام حصہ ۱
- " حصہ ۲
- فن ہیئت
- فن کیمسٹری

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ
- مرقع اودھ

مسٹر عبد الماجد
- فلسفۂ جذبات
- فلسفۂ اجتماع
- غذائے انسانی
- فلسفہ کی تعلیم
- زود پشیماں

مسٹر حسین قدوائی
- ذکر طیب محمد عربی
- مشیر
- عرض حال
- جذب دل
- حاکم و محکوم

مطبوعات الناظر پریس
- قواعد اردو
- کلیات محسن
- محاربات صلیبی
- رموز فطرت
- ازواج الانبیاء
- تسخیر فرانس
- واقعات کربلا
- الاحسان
- سلاطین ترکی مترجم
- حیات نظامی
- جمیلہ دشینیہ
- سیکفرڈ لوسی
- اتفاقات زمانہ
- شوکیہ
- نادان خداپرست
- مصنوعی شوہر
- زود پشیماں
- نوبہار
- خوان دعوت
- کنولا
- واقعات انیس
- جمیلہ کی ناکامیابی
- جواہر التفاسیر
- خیالات [illegible]
- خواب [illegible]
- [illegible]

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۱ جلد ۱۶ — یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء

لال شربت - لال شربت - لال شربت

قیمت فی شیشی بارہ آنہ ۱۲/ محصولڈاک چار آنہ ۴/



قیمت فی شیشی بارہ آنہ ۱۲/ محصولڈاک چار آنہ ۴/

لال شربت

اگر آپ اپنے بچون اور عزیزونکو تندرست رکھنا چاہتے ہین تو
پلاوین کلیجہ کی کمزوری۔ کھانسی اور لاغری کو دور کرنا چاہتے
ہین تو لال شربت پلاوین بچے سے ضعیف تک کو
دوا یکسان فائدہ کرتی ہے پینے مین شیرین اور رنگ سرخ
ہونے کیوجہ سے بچے خاصکر بہت ہی خوشی سے پیتے
ہین آپ بھی اپنے بچون اور عزیزونکو پلا کر آزمائش کر لیجیے۔ قیمت فی شیشی بارہ آنہ ۱۲/
محصولڈاک چار آنہ ۴/ تین شیشی کی قیمت دو روپیہ ۲/ محصولڈاک دس آنہ ۱۰/

ڈاکٹر ایس کے برمن ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰ جلد ۱۶ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء

محبت

(از خامۂ مولانا آزاد صدیقی رحمانی۔ مدرسۂ سیفیہ منڈو)

(۱) عالم خیال

ہر چیز کی بنیاد سب سے پہلے عالمِ خیال میں پڑتی ہے۔ اور وہیں اسکا نقشہ تیار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ اسکی تعمیر بھی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب خیالی وجود مکمل ہو جاتا ہے اور اسکے خط و خال پر نگاہ گڑ جاتی ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل اُسکی دلفریب صورت کا والہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر وہی خیال محتبس بخاراتِ ارضیہ کی طرح دماغ کے طبقۂ ارض کو متزلزل کرتا ہوا عالمِ محسوس میں ایک ہنگامہ، ایک شورش، پیدا کر دیتا ہے۔ محبت کا بیج اسی عالم میں اُگتا ہے۔ اور پہلے پہل اسکی نشو و نما بھی یہیں ہوتی ہے۔ اس زمانے میں انسان مستانہ وار الفت و محبت کے ترانے گاتا ہے۔ نہ خواہ مخواہ وارفتگی اور بیخودی میں ہر وقت اسکے تذکرے

کرتا ہے۔ نہ بجینی رہتی ہے نہ اضطراب، نہ کہیں سر ٹکراتا ہے، نہ کسی کے در پر جبہہ سائی کرتا ہے نہ مجنوں کی طرح لیلیٰ محبوب کے کُتے کو چومتا چاٹتا ہے۔ نہ فرہاد کی طرح خود کشی کر لیتا ہے۔ مگر پھر بھی اکثر سراپا نقشِ تصویر دیکھا جاتا ہے اور بسا اوقات عالمِ تصور میں چکر کھاتا رہتا ہے۔ دل ہی دل میں کچھ بول لیتا ہے اور پھر خاموش ہو جاتا ہے۔ کچھ سوچتے سوچتے پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں اور آثارِ ملال چہرے سے صاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی سراپا امید دیکھا جاتا ہے تو کسی وقت مایوسی کے عالم میں سراپا تحیر بھی پایا جاتا ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے انداز طبیعت یہ بتاتا ہے کہ اُسکی دلی خواہش کیا ہے؟ یہ کہ کسی غیر کو اسکی خبر نہ ہو۔ کوئی اُسکو اس حالت میں دیکھ نہ لے۔ کسی پر اُسکے خیال کا اظہار نہ ہو۔ کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جس سے رازِ محبت طشت ازبام ہو جائے اور لوگوں کی نظر میں ہلکے ہو جائیں۔

مگر یہ اُس سرزمین کی حالت ہے جہاں کے لوگ ایسے خیالات کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے ہوں ورنہ عالمِ احساس اور عالمِ محسوس میں آنی فرق ہوتا ہے۔ اور دماغ اپنی خدمت سے اچھی طرح فارغ بھی نہیں ہوتا ہے کہ زبان عالمِ ذکر میں اعلان کر دیتی ہے۔

(۲) عالمِ ذکر

اس دور میں پھر خاموشی ٹوٹ جاتی ہے، اور خاموش طبیعت سرگرمِ فغاں ہو جاتی ہے۔ دل اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایک قصۂ محبوب ہوتا ہے، جسکی ہر وقت تلاوت و تکرار کی جاتی ہے اور ہر در و دیوار کو چھیڑ کر یہ کہانی سنائی جاتی ہے۔ اگر جی لگتا ہے تو اسی تذکرے میں، اور دلچسپی ہوتی ہے تو اُسکی یاد میں۔ ہر چیز حُسنِ محبوب کے آگے ہیچ ہے۔ اور ساری خوبیاں اُسکی ایک ادا کے مقابلے میں لاشئے ہیں۔ چاند داغدار نظر آتا ہے، اور لالہ بیاہ و زرد دکھائی دیتا ہے۔ پھول کی پنکھڑیوں پر اُبھری ہوئی رگیں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ اور سارنِ [illegible] کے سامنے

اُنکی نزاکت کی کوئی قیمت نہیں معلوم ہوتی۔ سرو شمشاد کو قدِ یار سے تشبیہ دینی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ نرگس کو چشم محبوب کا متحیر بتایا جاتا ہے۔ حوران جنت کی تضحیک کی جاتی ہے۔

مگر اس وقت تک محض الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں، اور بجز اظہار محبت اور تذکرۂ محبوب کے کوئی اور خاص امر نہیں ہوتا ہے۔ عالم انسانوں کی طرح سوتا جاگتا، کھاتا پیتا ہے۔ اور ضروریات زندگی و لوازم حیات کی تکمیل میں اگر منہمک نہیں تو مشغول ضرور رہتا ہے۔

(۳) عالم اضطراب

اس دور کے بعد بقول مرزا غالب

پھر بہار آئی چمن میں داغ دل آئے ہوئے	پھر مرے داغِ جگر آتش کے پرکالے ہوئے

ایک نیا جن سوار ہو جاتا ہے۔ اور حالت بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچ جاتی ہے۔ کہ اب نیند حرام ہو گئی ہے۔ کھانا اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کپڑے اگر ضرورت سے زیادہ میلے اور کثیف ہو گئے ہیں تو اسکی پرواہ نہیں ہے۔ مال ومتاع تباہ وبرباد ہو رہا ہے تو کوئی غم نہیں ہے۔ ضروریات زندگی، لوازم حیات، اسباب مادیہ سے بالکل وحشت ہو رہی ہے تو اسکا لحاظ نہیں ہے۔ ہر وقت ایک اضطراب ہے، ایک بےچینی ہے، جو کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیتی ہے۔ ہاں دنیا میں کوئی جگہ قیام کی اگر نظر آتی ہے تو وہ کوچۂ محبوب ہے۔ کسی مقام پر ٹھہرنے کو جی چاہتا ہے تو وہ دریار ہے۔ گل گلزار آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہیں۔ بادِ سحر کی لپک باد سموم کی لپٹ سے بھی زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔

الحاصل دنیا کی ہر نعمت زحمت ہے اور ہر اچھی چیز بری ہے۔ نہ کسی سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے نہ کسی کی صورت پر نظر ڈالنا خوش آتا ہے۔ اگر منظور دل ناشاد ہے تو یہ ہے کہ بار بار منزلِ یار کی زیارت اور طواف کریں، اور کوئی چیز رخِ محبوب اور نگاہِ شوق کے درمیان حاجب نہ بنے۔ اگر آنکھوں کو دیدار ہو تو اسی کا، کانوں میں آواز پہونچے تو اُسی کی، ہمکلامہ ہو تو اُسی سے ہو تا ہے [illegible]

میں اگر کسی کا خیال پیدا ہو تو اسی کا ہو۔ ہمارے حیات، ہمارے جذبات، ہمارے قویٰ پر حکومت ہو تو اسکی ہو۔ اور دنیا میں کسی کے غلام ہوں تو اسی کے ہوں۔

گویا یہ وہ درجہ ہے جہاں پہونچکر محب فنا فی المحبت یا فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے اور بجز جلوۂ یار ساری چیزیں بے حقیقت، بے کیف اور لاشئ محض نظر آتی ہیں۔

(۴) عالم بیخودی

اس رنگ کا چڑھ جانا شرط ہے، پھر وہ وقت بھی اجل ناگہانی کی طرح سر ہی پر موجود ہو جاتا ہے کہ بے وصال یار ایک سکنڈ کا گذرنا قیامت ہو جاتا ہے اور زندگی دوبھر ہو جاتی ہے رات دن سیماب وار نہ کسی پہلو اور کسی کروٹ چین نصیب ہے نہ کسی خیال پر دل جمتا ہے۔ ایک لقاء محبوب کی تصویر ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ اور معمولی سے معمولی انتظار پر عالم مایوسی میں جی جان سے گذر جانا بہتر جانتا اور بے وصال محبوب کے مرمٹنے کو جینے پر ترجیح دیتا ہے۔ گویا اس دور میں دل مایوس کے لیے معمولی سی معمولی مایوسی بھی کوہ یاس بلکہ نا امیدی کا بادل بنجاتی ہے جسکو وہ اپنے اوپر ٹوٹتا ہوا دیکھکر اپنی جان خود اپنے ہاتھوں خیال یار پر نثار کر دیتا ہے۔

فرہاد کی جان اسی دھندلی مایوسی نے، کہ اب وصل شیریں ممکن نہیں، گنوادی۔ اور خود رسول اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ذات مبارک نے، چند دنوں وحی کے بند ہو جانے کی وجہ سے کئی مرتبہ عالم یاس میں پہاڑ پر چڑھ کر اپنے کو گرا کر جاں بحق ہو جانے کا قصد فرمایا، مگر ناموس اکبر نے ہر مرتبہ روک لیا اور اس خیال سے باز رکھا۔

الحاصل یہ وہ مقام الفت ہے جہاں پہونچکر بہت جلد اسکی قسمت کا آخری فیصلہ ہو جاتا ہے اور کامیابی اور ناکامیابی کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔

(۵) مشکوریت یا مردودیت

اب پانچواں دور کیا شروع ہوتا ہے، سرکار حسن سے جو کچھ اسکے لیے عالم محبت میں

مقدر ہوتا ہے اُسکا اظہار ہو جاتا ہے اور آثار و احوال کی زبان سے اعلان کرا دیا جاتا ہے کہ تمہاری سعی مشکور، یا تمہاری دیوانگی مردود ٹھہرائی گئی۔ پھر دنیا مشاہدہ کر لیتی ہے کہ زید دُنیا سے ہمیشہ کے لیے نامراد اُٹھا اور دل کی حسرت دل ہی میں لیگیا۔ اور بکر بامراد ہو کر اپنے مطلوب و محبوب تک پہونچ گیا۔ اگرچہ فانی محبوب کے لیے ایک نہ ایک روز ضرور فنا ہے مگر

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے　　حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(۶) انکشافِ حقیقت

ممکن اور بہت ممکن ہے۔ کسی کو دھوکا ہو کہ یہ محض تھیوری ہے، مگر نہیں۔ یہ حقیقت ہے اُس شغف اور طلب کی جسکے پیچھے انسان کا ہر فرد بسترِ خواب سے اُٹھکر بساطِ زمیں پر رات کے مختلف حصوں تک دوڑتا رہتا ہے۔ کسی کو علم سے محبت ہوتی ہے، کسی کو دولت سے۔ کسی کو عزت کی طلب ہوتی ہے اور محض اعزاز ہی اُسکا مطلوب محبوب ہوتا ہے۔ کسی کو حسن صبیح و ملیح سے الفت ہے تو کسی کو دلبرانہ انداز سے۔ مختصر یہ کہ کوئی دنیاوی اشیاء کا محب ہے تو کوئی دنیاوی اشیاء کے خالق کا۔ پس بغیر لحاظ اسکے کہ مطلوبات و محبوبات مختلف ہیں نفس طلب اور محبت میں سب شریک ہیں۔ لہذا لوازم محبت میں بھی برابر ہونگے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ عوالم خمسہ کے ادوار میں زید جو حسن و ادا کا محب ہے، چکر کھائے۔ اور بکر جو علم و دولت، عزت و تمکنت، یا خدا کا طالب ہے، اس سے بری رہے۔ کیونکہ محبت کا دیوتا جہاں کہیں بھی جس رنگ میں پایا گیا ہے اسنے اپنے جاں نثاروں سے ہمیشہ بھینٹ اور قربانی چاہی ہے۔ اور اسکے پرستار ہمیشہ اسکے قربانگاہ امتحان میں پورے اترے ہیں۔ اس وقت ان پاکباز نفوس کی کوئی مثال ہمارے محدود معلومات میں نہ ہو نہ سہی۔ مگر خدا غریقِ رحمت کرے، انکے واقعات اب بھی صفحات تاریخ پر ہماری رہبری کیلئے موجود ہیں پس اگر کسی کو اس سے انکار ہے تو ہم اُسکے اس دعوے کے اعتراف کو تیار نہیں۔ کہ ہمکو اس سے دلی محبت اور ہمارے دل میں اُسکی سچی طلب ہے۔ کیونکہ محبوب عالم کا یہ ایک عام اعلان ہے

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بسے　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

پاک زندگی بسر کرنے کے طریقے

(بادشاہ یودھشتر اور یاکشا کا مکالمہ)

یاکشا۔ وہ روح جو پاکیزہ نہ ہوئی ہو کس طرح ترقی پذیر ہو سکتی ہے؟ اور اُس زمانے میں جبکہ روح کی پاکیزگی عمل میں آتی ہوتی ہے، اُسکے ساتھی کون ہوتے ہیں؟ روح کو اپنی حالت اطمینان پر کون پہونچاتا ہے؟ روح کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے؟

یدھشتر خود شناسی۔ ضبط نفس۔ اور دوسری صفات ربانی۔ راستی، اخلاق، اور مذہبی فرائض۔ روح کی بنیاد سچائی یا علم محض پر ہے۔

یاکشا۔ کون چیز انسان کو صاحب علم بناتی ہے؟ کس چیز کے ذریعے سے انسان وہ درجہ حاصل کرتا ہے جو بہت بڑا ہے؟ کس طرح ایک انسان دو کے بجائے ہو سکتا ہے؟ اور اے بادشاہ کیسے کوئی شخص فہم حاصل کر سکتا ہے؟

یدھشتر۔ کلام الٰہی[1] کے پڑھنے سے انسان صاحب علم بن سکتا ہے؟ درویشانہ رہبانیت سے انسان وہ رتبہ حاصل کر سکتا ہے جو بہت بڑا ہے۔ عقل سے ایک آدمی دو کے بجائے ہو جاتا ہے۔ اور بزرگوں کی خدمت کرنے سے آدمی کو عقل ملتی ہے۔

یاکشا۔ برہمنوں کی خوبی وفضیلت کس چیز سے ہے؟ کون سا عمل اُنکو زاہد و عابد بناتی ہے؟ برہمنوں کی انسانی صفت کیا ہے؟ اور اُنکے کون سے افعال اُنکی ناپاکی کا سبب ہوتے ہیں؟

یدھشتر۔ ویدوں کا مطالعہ اُنکی فضیلت کا باعث ہے۔ اُنکی درویشانہ رہبانیت اُنھیں زاہد و عابد بناتی ہے۔ اُنکا فوت ہو جانا اُنکی انسانی صفت ہے اور بد زبانی اُنکی ناپاکی کا باعث ہوتی ہے۔

یاکشا۔ چھتریوں کی فضیلت کا سبب کیا ہے؟ اُنکے کون سے اعمال عابدوں کے

[1] خدا کا کلام

سے ہیں؟ اُنکی انسانی صفت کیا ہے؟ اور کون سے اعمال اُنھیں ناپاک بناتے ہیں؟

یدہشتر۔ اُنکی فضیلت کا باعث تیر اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ قربانیوں کے مراسم اُنھیں عابد بناتے ہیں۔ خوف زدہ ہو جانا اُنکی انسانی صفت ہے۔ اور حفاظتِ ملک سے انکار کرنا اُنکو ناپاک بناتا ہے۔

یاکشا۔ کاشتکاروں کے لیے سب سے قیمتی چیز کیا ہے؟ بیج بونے والے کے لیے سب سے گراں بہا کون سی چیز ہے؟ اور جننے والوں کے لیے سب سے بیش بہا کون چیز ہے؟

یدہشتر۔ کاشت کار کے لیے سب سے قیمتی چیز بارش ہے۔ بونی کرنے کے واسطے سب سے بیش قیمت چیز بیج ہے۔ جننے والوں کے لیے سب سے بیش بہا چیز بچہ ہے۔

یاکشا۔ وہ کون شخص ہے جسکے حواسِ خمسہ پوری طرح کام دیتے ہوں؟ جسکو عقل دی گئی ہو؟ جسکو دنیا میں عزت ہو اور جسے سب لوگ پسند کرتے ہوں۔ مگر باوجود جان رکھنے کے پھر بھی وہ زندہ نہ شمار ہو؟

یدہشتر۔ وہ شخص جو دیوتاؤں، مہمانوں، نوکروں، بیبیوں اور خود اپنے آپ کو کوئی نذر (قربانی) نہ دے وہ اگرچہ سانس لیتا ہو مگر زندہ نہیں ہے۔

یاکشا۔ زمین سے بھی بھاری کیا چیز ہے؟ آسمان سے اونچا کون ہے؟ ہوا سے تیز تر کون ہے؟ اور گھانس سے کیا چیز بڑھکر ہے؟

یدہشتر۔ زمین سے بھی زیادہ بھاری "ماں" ہے۔ آسمان سے بھی زیادہ اونچا باپ ہے ہوا سے تیز تر عقل ہے اور گھانس سے بڑھکر زائد ہمارے خیالات ہیں۔

یاکشا۔ وہ کون ہے جو اپنی آنکھ سوتے میں نہیں بند کرتا؟ وہ کون ہے جو پیدا ہونے کے بعد حرکت نہیں کرتا؟ وہ کون ہے جو دل نہیں رکھتا اور وہ کون ہے جو اپنے ہی زور میں پھولتا ہے؟

یدہشتر۔ مچھلی وقتِ خواب آنکھیں نہیں بند کرتی۔ انڈا پیدائش کے بعد حرکت نہیں کرتا

پتھردل نہیں رکھتا۔ اور دریا اپنے ہی زور میں بہوتا ہے۔
یاکشا۔ مالک خانہ کا دوست کون ہے؟ جلا وطن کا دوست کون ہے؟ بیمار کا دوست کون ہے؟ اور قریب المرگ کا دوست کون ہے؟
یدہشتر۔ مالک خانہ کی دوست اُسکی بیوی ہے۔ غیر ملک میں جلاوطن کے دوست اُسکے ساتھی ہیں۔ بیمار کا دوست حکیم ہے اور قریب المرگ آدمی کی دوست خیرات ہے۔
یاکشا۔ وہ کون ہے جو اکیلا سفر کرتا ہے؟ وہ کون ہے جو اپنی پیدایش کے بعد دوبارہ پیدا ہوتا ہے، سردی کا علاج کیا ہے؟ اور سب سے بڑا کھیت کون ہے؟
یدہشتر۔ آفتاب اکیلا سفر کرتا ہے۔ چاند دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ ٹھنڈک کا علاج آگ ہے۔ اور زمین سب سے بڑا کھیت ہے۔
یاکشا۔ نیکی، شہرت، دنیا، اور مسرت کی سب سے اونچی جائے پناہ کون ہے؟
یدہشتر۔ نیکی کی سب سے اونچی جائے پناہ فیاضی ہے۔ شہرت کی سخاوت۔ دنیا کی سچائی اور مسرت کی جائے پناہ خوش کرداری ہے۔
یاکشا۔ انسان کی روح کیا ہے؟ وہ کون سا دوست ہے جو انسان کو دیوتاؤں نے بخشا ہے؟ انسان کا خاص مددگار کون ہے؟ اور اُسکی خاص جائے پناہ کہاں ہے؟
یدہشتر۔ انسان کی رُوح بیٹا ہے۔ دیوتاؤں نے جو دوست اُسکو بخشا ہے وہ بیوی ہے۔ اُسکے خاص مددگار بادل ہیں۔ اور خاص جائے پناہ سخاوت۔
یاکشا۔ سب سے زیادہ قابل تعریف کون چیز ہے؟ سب سے زیادہ قیمتی کونسی املاک ہے؟ سب سے بڑا منافع کیا ہے۔ اور مسرت کی تمام قسموں میں سب سے اچھی کون ہے؟
یدہشتر۔ سب سے قابل تعریف چیز کمال ہے۔ سب سے بیش قیمت املاک علم ہے۔ سب سے اعلیٰ منافع صحت ہے اور سب سے عمدہ مسرت قناعت ہے۔
یاکشا۔ دنیا میں سب سے بڑا فرض کیا ہے؟ وہ کون سی نیکی ہے، ہمیشہ بارآور

ہوتی ہے۔ وہ کون شے ہے جو اگر قبضے میں رکھی جائے تو افسوس نہیں کرنا پڑتا؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ اتحاد میں کبھی فرق نہیں آتا؟

یدہشتر۔ سب سے بڑا فرض ایذا رسانی سے پرہیز کرنا ہے۔ ویدکی تینوں کتابوں میں جو مراسم لکھے ہوئے ہیں اُنکی بجا آوری ہمیشہ پھل دیتی ہے۔ عقل اگر قبضے میں ہے تو رنج نہیں اُٹھانا پڑتا۔ اور نیکوں کے ساتھ اتحاد میں کبھی فرق نہیں آتا۔

یاکشا۔ وہ کون چیز ہے جسکا ترک کرنا انسان کو پسندیدہ بناتا ہے؟ وہ کون شے ہے جسکے ترک کردینے سے رنج نہیں اُٹھانا پڑتا؟ وہ کون چیز ہے جسکے ترک کرنے سے آدمی غنی ہو جاتا ہے؟ اور وہ کون چیز ہے جسکے ترک کرنے سے آدمی خوش ہوتا ہے؟

یدہشتر۔ تکبر کے ترک کرنے سے آدمی پسندیدہ بنجاتا ہے۔ غصے کے ترک کردینے سے افسوس نہیں اُٹھانا پڑتا۔ خواہش کے ترک کردینے سے آدمی غنی ہوتا ہے اور طمع کے ترک کردینے سے آدمی خوش رہتا ہے۔

یاکشا۔ درویش کی علامت کیا بتائی گئی ہے؟ سچا ضبط کیا ہے؟ خطابخشی کیا چیز ہے؟ اور شرم کیا چیز ہے؟

یدہشتر۔ اپنے مذہب پر قائم رہنا درویشی ہے۔ ضبط نفس سب سے سچا ضبط ہے۔ غصے کا برداشت کرنا خطابخشی ہے۔ اور تمام نالائق باتوں سے بچنے کے معنی شرم ہیں۔

یاکشا۔ اے بادشاہ! علم کسے کہتے ہیں؟ آرام کیا ہے؟ رحم کون چیز ہے؟ اور سادگی کے کیا معنی ہیں؟

یدہشتر۔ سچا علم الوہیت کا ہے۔ سچا آرام دل کا ہے۔ سب کی مسرت کی خواہش کو رحم کہتے ہیں اور دل کا عدل سادگی ہے۔

یاکشا۔ وہ غنیم کون ہے جو مدافعت پذیر نہیں؟ آدمی کے لیے ناقابل علاج مرض کون ہے؟ کس قسم کا آدمی ایماندار کہلاتا ہے؟ اور کون بے ایمان؟

یدہشتر۔ غضب ایک ناقابل مدافعت غنیم ہے۔ حرص ناقابل علاج مرض ہے۔ وہ شخص ایمان دار ہے جو کل مخلوق کا بہی خواہ ہو۔ اور بے ایمان وہ کہلاتا ہے جو بے رحم ظالم ہے۔

یاکشا۔ اے بادشاہ! جہالت، غرور اور کاہلی کے کیا معنی ہیں اور رنج سے کیا مراد ہے؟

یدہشتر۔ اپنے فرائض سے ناواقفیت اصلی جہالت ہے۔ اپنے آپ کو عالم ہستی کا کوئی کارآمد رکن یا اہم فرد سمجھنا غرور ہے۔ اپنے فرائض کو ادا نہ کرنا کاہلی ہے۔ او جہالت سے مراد رنج ہے

یاکشا۔ استقلال کسے کہتے ہیں اور تحمل کیا چیز ہے۔ اصلی غسل کیا ہے اور خیرات کیا ہے؟

یدہشتر۔ اپنے مذہب پر قائم رہنا استقلال ہے۔ حواس کو اختیار میں رکھنا سچا تحمل ہے دل کو تمام برائیوں سے صاف کر ڈالنا اصلی غسل ہے اور کل مخلوقات کی حفاظت کرنا خیرات ہے۔

یاکشا۔ کس آدمی کو صاحب علم سمجھنا چاہیے اور کسے منکر جاننا چاہیے؟ جاہل کون کہا جائے گا؟ خواہش کسے کہتے ہیں اور اسکے ماخذ کون ہیں اور حسد کیا ہے؟

یدہشتر۔ وہ شخص جو اپنے فرائض کو جانتا ہے صاحب علم کہے جانے کا مستحق ہے۔ منکر وہ ہے جو جاہل ہو اور جاہل وہ ہے جو منکر ہو۔ اشیائے مقبوضہ خواہش کی پیدا کرنے والی ہیں اور دلی رنج کے سوا حسد کسی چیز کا نام نہیں۔

یاکشا۔ غرور کیا ہے اور فریب کیا ہے؟ دیوتاؤں کی بخشش کیا ہے اور شرارت کیا ہے؟

یدہشتر۔ احمقانہ جہالت غرور ہے۔ مذہبی دستور قائم کرنا فریب ہے۔ ہماری سخاوت کا پھل دیوتاؤں کی بخشش ہے اور دوسروں کو برا کہنا شرارت میں داخل ہے۔

یاکشا۔ نیکی، منفعت، خواہش، سب ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ پھر ایسی متضاد چیزیں کیسے متفق رہ سکتی ہیں؟

یدہشتر۔ اگر ایک بدی اور نیکی ایک دوسرے سے متحد رہ سکتی ہیں، تو یہ تینوں بھی جن کا تو نے ذکر کیا ہے متفق رہ سکتی ہیں۔

یاکشا۔ اے بھارت کی نسل کے سانڈ! وہ کون انسان ہے جو دائمی عذاب میں مبتلا کیا گیا؟

یدہشتر۔ جو شخص کسی غریب برہمن کو اس وعدے پر بلائے کہ اُسے کچھ بخشے گا اور پھر کہے کہ اُسکے پاس کوئی چیز دینے کو نہیں ہے، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہتا ہے۔ وہ شخص بھی دوزخ میں رہے گا جو وید وں، کلام آلٰہی، برہمنوں، دیوتاؤں، اور پرستش کے واسطے جو مراسم بتائے گئے ہیں اُنکو جھٹلائے۔ اور وہ بھی ہمیشہ دوزخ میں رہے گا جو باوجود مالدار ہونے کے بخشش نہیں کرتا۔ یا لالچ کی وجہ سے خود یہ کہکر مستفیض نہیں ہوتا کہ اُسکے پاس کچھ نہیں ہے۔

یاکشا۔ کس نسل میں پیدا ہوتے، کون سے عمل، اور کس چیز کے مطالعہ سے، کوئی شخص برہمن بن سکتا ہے؟ ٹھیک ٹھیک جواب دو۔

یدہشتر۔ سنو یاکشا! برہمن بننے کا سبب نہ تو کسی نسل میں پیدا ہونا ہے نہ کسی چیز کا مطالعہ ہے نہ کوئی علم حاصل کرنا۔ بلاشبہ محض اعمال انسان کو برہمن بنا سکتے ہیں۔ عمل میں ہر شخص کو اور خصوصاً برہمن کو ہمیشہ احتیاط رکھنا چاہیے۔ وہ شخص جسکے طرز عمل میں خرابی نہیں پیدا ہوتی خود کبھی خراب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ شخص جس کا عمل تباہ ہوگیا ہے خود بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ معلم اور شاگرد غرض جو کوئی کلام آلٰہی کا مطالعہ کرے اگر حقیقتاً بُری عادتوں میں مبتلا ہے تو مثل ایک اَن پڑھ اور بدنصیب کے خیال کیا جاے گا۔ وہی شخص صاحب علم ہے جو اپنے مذہبی فرائض ادا کرتا ہے۔ وہ شخص بھی بدنصیب ہوگا اور بہ مشکل شودر سے علٰحدہ سمجھا جاے گا جس نے چاروں وید پڑھے اور پھر بھی اُسکا عمل درست نہ ہوا۔ صرف وہی شخص برہمن کہا جاے گا جو اگنی وتر بجا لائے اور اپنی خواہش کو قابو میں رکھے۔

یاکشا۔ اُس شخص کو کیا فائدہ ہوتا ہے جسکی گفتگو پسندیدہ ہو؟ اُس شخص کو کیا نفع ہوتا ہے جو ہمیشہ انصاف سے کام کرے؟ اُسکو کیا منفعت ہے جسکے بہت سے دوست ہوں؟ اور اُسکو کیا ملتا ہے جو نیکی کا پیرو ہے؟

یدہشتر۔ جو شخص پسندیدہ گفتگو کرتا ہے اُسکو سب پسند کرتے ہیں۔ جو شخص انصاف پر عمل کرتا ہے اُسکو ہر چیز اُسکی خواہش کے مطابق ملتی ہے۔ وہ شخص دنیا میں خوش رہتا ہے جسکے

بہت سے دوست ہوں۔ اور وہ جو نیکی کا پیرو ہے دوسرے عالم میں مسرت حاصل کرتا ہے۔

یاکشا۔ کون شخص سچے طور پر خوش ہے۔ سب سے زیادہ عجیب چیز کیا ہے، طریقت کیا ہے؟ خبر کیا ہے؟۔

یدہشتر۔ سچی مسرت اُس شخص کو حاصل ہے جسے خواہ پانچویں چھٹے دن ہی اپنے گھر میں اپنی مختصر ہانڈی پکانا پڑے مگر وہ کسی کا قرضدار نہ ہو۔ اور اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ روزانہ بیشمار ہستیاں ماما (موت کے دیوتا) کے گھر جاتی ہیں پھر بھی جو پیچھے رہ جاتی ہیں وہ اپنے آپ کو غیر فانی تصور کرتی ہیں، پھر اس سے عجیب تر کون چیز ہو سکتی ہے؟۔ دلیل سے آدمی کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہونچتا۔ رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ایک رشی بھی ایسا نہیں جسکی رائے میں غلطی کا احتمال نہ پایا جاتا ہو۔ مذہب اور فرائض کی حقیقت غاروں میں چھپی ہوئی ہے۔ بس طریقت وہی ہے جسپر بڑے لوگ چل چکے ہیں۔ یہ جہالت سے معمور دنیا مثل ایک دیگچی کے ہے، آفتاب آگ ہے اور شب و روز ایندھن ہیں، مہینے اور موسم لکڑی کی ڈوئی ہیں۔ زمانہ باورچی ہے کہ وہ ان چیزوں کی مدد سے تمام مخلوق کو اُس دیگچی میں پکا رہا ہے! یہ ہے خبر۔

یاکشا۔ اے دشمنوں کے زیر کرنے والے! تو نے میرے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دیے ہیں۔ اب یہ بھی بتا دے کہ صحیح معنیٰ میں انسان کون ہے اور کون انسان حقیقتاً ہر قسم کی دولت کا مالک ہے؟

یدہشتر۔ انسان کے نیک عمل کی اطلاع آسمان پر جاتی ہے اور دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ جب تک یہ اطلاع قائم رہتی ہے اُسوقت تک وہ آدمی انسان کہلاتا ہے اور وہ شخص ہر قسم کی دولت کا مالک کہا جاتا ہے جسکے لیے پسندیدہ و ناپسندیدہ، خوشی و غم، ماضی و مستقبل سب یکساں ہو۔

(ترجمہ) "آلودۂ عصیاں"

"بہت ایسے ہیں کہ بے نام ونشان جاتے ہیں"

اڑکے ذرے طرفِ بادِ وزاں جاتے ہیں
پھول گر گر کر صفتِ ریگِ رواں جاتے ہیں

سر اُٹھاتے ہیں لبِ آب جو دَم بھر کو حباب
بنکے تابوت وہ پیشِ نگراں جاتے ہیں

شام سے نکلے ستارے جو چمک کر سرِ چرخ
صبح دیکھا تو وہ کھاتے وہ خزاں جاتے ہیں

کھیلنے کے گئے دن اور جوانی نہ رہی
باغِ دنیا سے یوں ہی طفل وجواں جاتے ہیں

عہدِ پیری جو میسر ہو تو رونے میں کٹے
یعنی آنکھوں کی ضیا، تابِ تواں جاتے ہیں

وہ طبیعت ہے پسِ مرگ نہ جودت باقی
جان کے ساتھ ہے نیرنگ جہاں جاتے ہیں

نام رہتا ہے کسی کا تو کسی کا کچھ کام
بہت ایسے ہیں کہ بے نام ونشاں جاتے ہیں

کچھ نہ معلوم ہوا ہم کو کہ آئے ہیں کہاں
اور معلوم یہ کیا ہو کہ کہاں جاتے ہیں

سوزِ دل اور غمِ فرقت کے بھی شکوے نہ رہے
دمِ آخر ستم وجورِ بتاں جاتے ہیں

جسکو دیکھا کسی غم کا اُسے کشتہ پایا
لیکے سینوں میں غرض دردِ نہاں جاتے ہیں

لیکن اچھے وہی رہتے ہیں بہرحال سفیر
یاں سے جو فارغِ ہر سود و زیاں جاتے ہیں

سفیر (کاکوروی)

موسم برسات

برسات کا موسم ہے۔ اُجڑے ہوئے چمن ہرے بھرے ہوگئے ہیں۔ پھول کھلے ہوئے ہیں اور دل تنگ غنچے قوتِ نامیہ کے جوش سے باندازِ بیتابانہ کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں کہ عندلیبان چمن میں ایک غلغلہ پیدا ہوگیا ہے۔ بلبلوں کے چہچہے سنکر دوسری منھ بند کلیاں بھی عجیب بے اختیاری سے مسکرا رہی ہیں۔ کوئل دیوانہ وار ہر سمت کو کُوکتی پھرتی ہے پپیہا "پی کہاں، پی کہاں" کی رٹ لگا رہا ہے۔ جابجا طاؤس رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ بھونرا زرد زرد پھولوں کا رس لیتا ہے۔ شکر خورہ نازک نازک شاخوں پر جھولا جھولتا ہے۔ ساونی کے درختوں کی نازک شاخیں مستانہ وار ہرے سبزے کو جھک جھک کر بوسے دیتی ہیں اور وفورِ شوق سے بار بار اُسکے گلے لگ جاتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے شبنم کے قطرے نونہالانِ باغ کی مختلف رنگ پتیوں پر کچھ ایسے بھلے نظر آتے ہیں، گویا اُنکو موتیوں کا رٹا اُور زیور پہنا دیا گیا ہے۔ بجلی کی چمک کندن کا کام کرتی ہے۔ چاروں طرف سبزہ لہلہاتا ہے۔ دیکھیے وہ سامنے والی جھیل کیسی کیسی دلفریب لہریں لے رہی ہے۔ کوکابیلی کے پھول سطحِ آب پر کچھ ایسی خوبصورتی سے تیرتے ہیں کہ جی خوش ہوا جاتا ہے۔ دریائی جانور جھیل کے اِرد گرد چکر لگا لگا کر بڑے ذوق و شوق سے اپنی اپنی زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہ رہے ہیں۔ اس وقت جھیل کی بہار قابلِ دید ہے۔ بھورے بھورے ابر کے ٹکڑے ہوا کے گھوڑوں پر سوار آ جا رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی ہے۔ بجلی چمک چمک کر کسی حسین مہ جبین کے چمکدار چہرے کی طرح نظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ تارا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ چاند رہ رہ کر اپنے نورانی چہرے کو ابر کی نقاب سے نکالتا اور زمین کو منور کرکے پھر نقاب پوش بنجاتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے جھیل میں اپنی آڑی ترچھی شعاعیں ڈال کر اور طرح طرح کے کرشمے دکھا دکھا کر آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ساون

کی ہلکی ہلکی ہوائیں نازک بدن و کمسن حسینوں کی طرح اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہیں۔ درختانِ چمن اپنی نئی جوانی کی امنگ اور شباب کی ترنگ سے بالکل بدمست ہو رہے ہیں۔ گھنیرے درختوں کی شاخیں آپس میں گلے مل مل کر شوخیاں کر رہی ہیں۔ جو لوگ گلگشت چمن میں مصروف ہیں۔ وہ قدرت کی اس بہار کو دیکھکر بار بار مرحبا! مرحبا!! کہہ اُٹھتے ہیں۔ ساقی شیشۂ ساغر ہاتھ میں لیے ہوے شراب خواروں کو جام پر جام دے رہا ہے۔ نشۂ مے کے متوالے پیڑ کھا رہے ہیں اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں:۔

کر دے سرشار مجھے جی بھر کے　　　دے صراحی پہ صراحی بھر کے
واہ کیا جوبن پہ ہے حسنِ عروسانِ چمن　　　ناز کرتی پھرتی ہے بادِ بہاری اِن دنوں
جا بجا سبزہ، ہوائیں سرد، نہریں موجزن　　　کیا گلستاں میں ہے لطفِ بادہ خواری اِن دنوں

اعجاز بیگم (مینپوری)

جب سے دیکھی ہے نگاہِ باغباں بدلی ہوئی　　　پاتے ہیں تیری ہوا سے گلستاں بدلی ہوئی
دردِ دل پنہاں ہوا اتنا کہ پیدا ہو گیا　　　میری خاموشی تھی اک طرزِ فغاں بدلی ہوئی
سادگی سے میں فریبِ عیش ہی کھاتا رہا　　　تو بہار اپنی تھی اک شکلِ خزاں بدلی ہوئی
ہے یہ اندیشہ کہیں دل کو نہ ہو جانے خبر　　　آنکھ دیکھی ہے تری او دلستاں بدلی ہوئی
ہے عبث اس دور میں یاروں سے یاری کی امید　　　جب یہ ظاہر ہے کہ ہے رسمِ جہاں بدلی ہوئی
ہو سکا وہ لطفِ جاناں پہ مجھے کیا اعتبار　　　دیکھتا ہوں تیری نیت آسماں بدلی ہوئی
غیر سے تم کیا ملے بدلا ہمارا رنگِ بست　　　اور تمہاری بھی ہے صورت مہرباں بدلی ہوئی
کیا ہوئی مہر و محبت کیا ہوئے قول و قرار　　　یہ نظر بدلی ہوئی اور یہ زباں بدلی ہوئی!
ہیں ترقی کے بہت شاکی زمانِ حال کو　　　پر وہی ماضی کی ہے یہ داستاں بدلی ہوئی
ہمنے دینداروں میں تو دیکھے ہیں صدہا اختلاف　　　پر نہ دیکھی کچھ رہ و رسمِ جہاں بدلی ہوئی
ہے مجھے وحشت تصرف ہاے بیجا کا گلہ　　　کس قدر ہے ان دنوں اُردو زباں بدلی ہوئی

وحشت (کلکتہ)

ڈراما

ڈراما یونانی لفظ ڈراؤ سے ماخوذ ہے، جسکے معنی "عمل کرنا" یا "کمل کرنا" ہیں۔ لیکن اصطلاحاً ڈراما اس مفہوم کو محتوی ہے کہ "انسانی افعال، اقوال اور زندگی کے نمونے مخصوص افراد کے ذریعے سے مسلسل واقعات و گفتگو کے ساتھ دکھائے جائیں۔"

ڈراما کی دو قسمیں ہیں ٹریجڈی اور کمیڈی۔ ارسطا طالیس ٹریجڈی کی تعریف میں کہتا ہے "چند سنجیدہ اور مسلسل افعال کی نقل، جنکی ترتیب رحم و عبرت کے اثرات پیدا کرتی ہے اور روحانی جذبات کو اُبھارتی ہے۔" ٹریجڈی انسانی فطرت کی اندرونی، پاکیزہ اور سرگرم قوتوں سے تعلق رکھتی ہے اور اُن لوگوں کے لیے ہماری ہمدردی اور دلسوزی حاصل کرتی ہے جو زندہ مثال بنکر ہمارے سامنے آئے ہیں اور گویا وہ حقیقی طور پر اس زندگی میں حصہ لے رہے ہیں جو اُنکو دردِ غم اور مصیبت میں مبتلا کر رہی ہے۔ برخلاف اسکے کمیڈی زندگی کے عام نتائج سے بحث کرتی ہے اور بنی نوع کی مضحکہ انگیز غلطیاں اور بے وقوفیاں ظاہر کر کے تماشائیوں کا دل بہلانا اُس کا کام ہے۔

ٹریجک نظموں کو ضمیر کے لیے غیر معمولی متوجہ کُن اور موثر سمجھا جاتا ہے۔ کمک نظموں کا شمار اُن تفریحوں میں ہے جو انسان کو لغویت اور بیہودہ بگلیوں میں مشغول رکھتی ہیں۔ کمیڈی میں اداسی، افسردگی اور حزن و ملال کا وجود نا متعارف ہے۔ اسی طرح ٹریجڈی میں شگفتگی، شادمانی اور عیش و مسرت سے کوئی واقف نہیں ہوتا۔

ٹریجڈی تنازع للبقا کا غمناک مرقع ہمارے روبرو پیش کرتی ہے۔ تقدیر کے ساتھ جنگ کرتا ہوا ایک انسان ہمیں نظر آتا ہے، اور ایک بیکس کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سنگدل بنی نوع کی سفاکی اور بیدردی کو صبر و استقلال کے ساتھ انگیز کرتا ہے۔ لیکن کمیڈی اُس مجبور انسان کو ایک آزاد

اور خود مختارانہ حالت میں نمایاں کرتی ہے۔

اگر ڈراما کی قدیم تاریخ کا مسئلہ محض قیاس پر چھوڑ دیا جائے تو ایک شخص سادگی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ڈراما کی نمود ایک حد تک اُس میلان طبع پر مبنی ہے جو ہر انسان میں عام طور پر پایا جاتا ہے، دوسروں کے اقوال و افعال کا باہم تذکرہ کرنا اور اُن سے دلچسپی لینا حقیقۃً انسان کی فطرت ہے۔ موجودہ زمانہ کی نہایت تعلیم یافتہ جماعتوں سے لیکر اُن تاتاری اقوام تک، جو اس امر کا زندہ نمونہ ہیں کہ ساری دنیا کبھی کس رنگ میں تھی، یہ طریقہ رائج ہے۔ جب دو شخص آپس میں ملتے ہیں تو اپنے یا اپنے دوستوں کے حالات بیان کرنے کے سوا گفتگو کا مستقل موضوع اور کیا ہوتا ہے۔ بہرکیف افسانہ گوئی اور نقالی سے انسان کو خاص وابستگی ہے، یہ وابستگی بچپن کے ابتدائی زمانے سے محسوس ہوتی ہے، اس کے بغیر تعلیم و تربیت ناممکن ہے۔ کیا بچے صدہا کھیل اس قسم کے نہیں کھیلتے جن میں وہ اپنے بزرگوں کے افعال و اقوال کی نقل کرتے ہیں؟ وحشی قومیں جنکو "فرزندان نیچر" کہا جاتا ہے اپنی تفریح کے جس قدر ذرائع رکھتی ہیں وہ بالعموم اُنکے طبعی مشاغل "جنگ و شکار" کی نقالی میں محدود ہیں۔

پیرس کے مہذب اور تربیت یافتہ افراد سے لیکر آسٹریلیا کے درندہ صفت وحشی باشندوں تک کرۂ ارض کی تمام اقوام میں کچھ ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ڈراما سے مشابہ ہیں اور عملی زندگی کی قائم مقامی کرتی ہیں۔ اگرچہ ان وحشی اقوام میں جو نقالی کے نمونے پائے جاتے ہیں وہ نہایت بے اسلوب اور نامرغوب ہیں لیکن اصول کی بنا پر اُن میں وہی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک بہترین ڈراما کی روح ہیں۔

چینی زبان کو ایک نہایت قدیم ڈراما کی ملکیت کا امتیاز حاصل ہے جو ایک خیالی اور فرضی قصے پر مبنی ہے، اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ ہندوستان کو اپنے قدیم ناٹک ڈراما کے لیے یونان کا منت پذیر ہونا پڑا ہے یا نہیں۔ ڈراما کے متعلق انسان کی فطری دلچسپیاں دیکھتے ہوئے کوئی ایسا ماخذ مشکل سے بتایا جا سکتا ہے جس سے یونانی ڈراما جو تمام یورپ کی ڈرامیٹک نظموں کا مورث اعلیٰ

سے ماخوذ ہو۔ چنانچہ ڈراما کی باقاعدہ تصنیف سے پہلے یونانی فنِ تمثیل سے بخوبی آشنا تھے۔ اور چند مخصوص مذہبی افسانوں کے متعلق وہ نمایاں طور پر ایکٹ کرتے تھے۔ یونانی لٹریچر کا مشہور مورخ اوتفرائڈ مولر کہتا ہے کہ "ڈلفی کے ایک شریف نوجوان نے اپالو[1] اور ڈرگین (سانپ) کی

[1] سورج کا دیوتا، نغمہ و سرود، شعر و سخن اور فصاحت و بلاغت کا مالک ہے، اپالو، زیوس اور لیٹونا کا فرزند اور ارٹیمس دیوی کا برادر حقیقی تھا۔ جزیرۂ ڈیلاس میں اُسکی ولادت ہوئی جہاں اُسکی ماں اس لیے چلی گئی تھی کہ زیوس کی طاقتور بیوی ہیری کے رشک و حسد سے محفوظ رہے۔ زیوس نے اپنے برقی آلات سے اپالو کے فرزند اسکیولاپئیس کو ہلاک کر دیا تھا، یہ برقی آلات قوم ککلوپس نے تیار کیے تھے جن کی پیشانی پر ایک آنکھ ہوتی تھی، اس بنا پر اپالو نے اس قوم کے تمام عفریتوں کو قتل کر ڈالا، زیوس نے ناراض ہو کر اور اُسے دیوتاؤں کے منصب سے محروم کر کے آسمان سے جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی کے زمانے میں وہ تھسلی کے بادشاہ ایڈمٹس کی بھیڑیں چراتا رہا اور اس لحاظ سے چرواہوں کا دیوتا بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنے بربط کے سُروں سے ٹرائے کی شہرپناہ کھڑی کر دی، اور اپنے تیر سے پائتھن نامی اژدہے کو ہلاک کر دیا۔ وہ کوہ پارناس کی چوٹی پر نغمہ و سرود اور شعر و سخن کی دیویوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ روشنی، آفتاب اور تمام خوبصورت شاندار چیزوں کا دیوتا مانا جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے اُس کے بُت میں سر کے چاروں طرف روشنی کی کرنیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ نغمہ و سرود کی حیثیت سے اس کے ہاتھ میں بربط ہوتا ہے۔ تاریخ، رقص، سوانگ وغیرہ کی نو دیویاں اس کے پاس استادہ ہوتی ہیں۔ دیوتا اس کی بربط نوازی سے بہت مسرور ہوتے ہیں اور دیویاں اُس کے گیتوں کو خوش الحانی سے گاتی ہیں۔ وہ وبائی امراض کا پیدا کرنے والا بھی سمجھا جاتا ہے جو اکثر روئے زمین پر پھیلتے ہیں اور جب آفتاب کی حرارت زور پر ہوتی ہے تو زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ اُس نے انسان کو پیشین گوئی کا علم سکھایا جسکے شکریہ میں ڈلفی کا مندر اس کے لیے مخصوص کیا گیا۔ وہ جنگ و شکار کا دیوتا بھی ہے جس کی بنا پر اُس کے ہاتھ میں تیر و کمان ہوتے ہیں

جنگ اور اسکی مفروری اور جلا وطنی کا روپ بھر کر زیوس[1] اور ہیری[2] کی شادی[3] کا تماشا ایک بڑے مذہبی تیوہار میں دکھایا گیا۔ ایک دوسرے قدیم مورخ کا بیان ہے کہ "الیوزنیس مسٹریز کا جس میں ڈیمیٹر[4] کے واقعات میں مذہبی پیشواؤں اور انکی مستورات نے ایکٹ کیا" بیکس کی پرستش میں بھی اس قسم کی نقالیاں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ جب ایتھنز کے چیف مجسٹریٹ

---

[1] زیوس (مشتری) اسٹیرنس اور ریا کا فرزند ہے۔ اس کا باپ اپنے کل فرزندوں کو نگل گیا تھا لیکن جب زیوس کی باری آئی تو چونکہ یہ اپنی ماں کو زیادہ عزیز تھا اس نے زیوس کی جگہ کپڑے میں پتھر لپیٹ کر دے دیا جسے اسٹیرنس نگل گیا۔ زیوس کی عمر سال ہی بھر کی تھی کہ اسکے باپ کو دشمنوں کا سخت مقابلہ کرنا پڑا لیکن زیوس نے خاص طور پر اس جنگ میں حصہ لیکر اپنے باپ کو دشمنوں سے بچا لیا۔ زیوس نے اپنی ماں کے کہنے پر ایک دن باپ سے درخواست کی کہ وہ اسکے نگلے ہوئے بھائیوں کو اگل دے۔ اور اس کے بعد باپ کو تخت سے اتار دیا۔ زیوس کی بارگاہ کوہ المپس کی بلند چوٹی پر تھی اور وہیں دوسرے دیوتا بھی رہتے تھے۔ المپس کی چوٹی گھنے بادلوں سے ڈھکی رہتی تھی اس لیے دیوتا انسانی نگاہ سے مخفی تھے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ ان بادلوں کے اوپر ان کے دیوتاؤں کا مسکن ہے جہاں ہر وقت دھوپ رہتی ہے اور جہاں عالم فانی کے زلزلوں اور طوفانوں کی دسترس نہیں۔ یونانیوں میں زیوس کا بت اس طرح بنایا جاتا تھا کہ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں آسمانی آلۂ حرب، داڑھی لانبی، لباس زرد رنگ کا نعلین زریں، اور اس کے قرب میں ایک عقاب ہوتا تھا۔ اہل کریٹ زیوس کے بت میں کان نہیں بناتے تھے اور اس سے یہ مراد تھی کہ وہ کسی کا طرفدار نہیں۔

[2] ہیری دیوی اسٹیرنس اور ریا کی دختر ہے وہ جزیرہ ساموس میں پیدا ہوئی اور عالم بالا کی سب سے زبردست دیوی مانی جاتی تھی۔ یونانی شعرا نے ہیری کی جو تعریف کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی صورت سے جاہ و جلال اور حسن و جمال نمایاں تھا۔ ہیری ایک تخت زریں یا ایک طلائی رتھ میں سوار ہوتی تھی جس میں مور جتے ہوتے تھے۔ اس کے سر پر ایک زریں تاج ہوتا تھا جس پر سوسن اور گلاب کے پھول لگے ہوتے تھے۔ (حواشی ۳ و ۴ بر صفحہ آیندہ)

کی حسین بیوی کی جو ملکہ کے خطاب سے ممتاز تھی ڈینائسس کے ساتھ سنجیدہ اور مخفی طور پر منگنی ہو جانے کے بعد شادی اور اُسکے پبلک جلوس کا وقت آیا تو ایک شخص نے دیوتا کا پارٹ ادا کیا۔

ہیلو کوپنیس کے باشندوں کا یہ دستور تھا کہ ڈینائسس کی پرستش وہ ابتدائے موسم بہار میں

حاشیہ صفحہ ۱۹ ؁ زیوس کی بہن بھی تھی اور بیوی بھی تھی۔ ہیری بڑی مشکل سے شادی پر رضامند ہوئی تھی۔ سامو میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس شادی کی رسمیں ادا ہوئی تھیں۔ ساکنان ارض و سما اس شادی میں شریک تھے۔ چلونی دیوی نے شادی میں شریک ہونے سے انکار کیا تھا جسپر ہرمس نے اُسے کچھوے کی شکل میں بدل کر ہمیشہ کے لیے بے زبان بنا دیا۔ زیوس چونکہ اور دیویوں اور فانی عورتوں کے ساتھ بھی اختلاط رکھتا تھا اس لیے ہیری اُس سے رشک کے سبب سے اکثر جھگڑا کرتی تھی اور آسمان پر ہر وقت غبار چھایا رہتا تھا۔

؁ ڈیمیٹر، اسٹیرلیس اور ہسٹیا کی دختر اور فصل کاشتکاری کی دیوی تھی۔ یہ دیوی پروسرپائن کی ماں تھی جسے، تحت الثریٰ کا دیوتا پلوٹو اپنے مسکن کی طرف اُڑا لے گیا تھا جبکہ وہ سسلی کی وادی "اینا" میں پھول چُن رہی تھی۔ ڈیمیٹر نے تمام دن سسلی میں اپنی بیٹی کی جستجو کی اور رات ہو جانے پر کوہ اِٹینا کے شعلوں سے دو مشعلیں روشن کرکے تلاش جاری رکھی۔ آخرکار ہیکیٹ یا دیوی سے اُسکی ملاقات ہوئی جس نے تمام واقعات سے اُسے آگاہ کیا۔ یہ سنتے ہی ڈیمیٹر ایک رتھ میں سوار ہوئی جسے دو سانپ کھینچتے تھے، اور عالم بالا پر زیوس کی بارگاہ میں پہونچی۔ زیوس اُس کی بیٹی کو واپس دلانے پر رضامند ہوا لیکن اُس نے کہا کہ اگر پروسرپائن نے پلوٹو کے محل میں کچھ کھایا پیا نہ ہوگا تو واپس مل سکے گی، لیکن بدقسمتی سے پروسرپائن نے ایک انار کے دانے کھا لیے تھے جو اُس نے الیسیا "یونانی عالم ارواح" کے میدان سے توڑ لیا تھا اور اُسے پھر زمین پر آنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن زیوس کو ڈیمیٹر کے حزن و ملال پر ترس آیا اور اُس نے حکم دیا کہ پروسرپائن سال میں چھ مہینے اپنی ماں کے پاس رہا کرے جب ڈیمیٹر اپنی بیٹی کی تلاش میں تھی اُسے شدت سے تشنگی محسوس ہوئی۔ چنانچہ وہ ایک ضعیفہ کے خسخانے میں گئی اور پانی مانگا، ضعیفہ نے اُسے پانی اور جَو کا دلیا دیا۔ جب وہ کھا رہی تھی تو ضعیفہ کا (بقیہ برصفحہ ۲۱)

زیادہ مبارک سمجھتے تھے اس موقع پر پہلے وحشیانہ گیت گائے جاتے تھے جنکا نام ڈتھیرمب تھا اور جو بالعموم شراب کے خمار میں برجستہ تصنیف ہوتے تھے۔ ان گیتوں کے ساتھ قربانی میگساری اور دیگر مختلف رسوم کی ادائگی ہوتی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) فرزند سیلو اُس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اسپر ڈیمیٹر نے ناخوش ہوکر تھوڑا سا دلیا لڑکے کے چہرے پر پھینکا جس کے لگتے ہی اُس کی شکل چھپکلی کی سی ہوگئی۔ جب ڈیمیٹر اپنی بیٹی کی تلاش سے فارغ ہوکر زمین پر آئی اُس نے دیکھا کہ زمین کا حال تباہ ہوگیا ہے کیونکہ اُسکی عدم موجودگی میں لوگوں نے کاشتکاری موقوف کردی تھی۔ خاصکر اٹیکا بالکل ویران ہوگیا تھا۔ ملک اٹیکا کے شہر الیوزز میں سیلیوس بادشاہ تھا جس کے بیٹے کا نام ٹرپٹولیمیوس تھا۔ چونکہ اثنائے سفر میں سیلیوس نے ڈیمیٹر کی بہت مدارات کی تھی اس لیئے ڈیمیٹر نے بار احسان سے سبکدوش ہونے کے لیے اس کے بیٹے کو فن زراعت کی تعلیم دی۔ ڈیمیٹر نے اُسے ہل جوتنا، بیج بونا، فصل کاٹنا، روٹی پکانا اور پھل اُگانا سکھایا اور اُسے ایک رتھ بھی دیا جسے سانپ لے چلتے تھے اور اُسے بنی نوع کی تعلیم و تربیت کا حکم دیا۔ اُس وقت تک صرف جڑوں اور پھلوں سے اوقات بسر ہوتی تھی مگر ٹرپٹولیمیوس نے ڈیمیٹر کی تعلیم کے مطابق گیہوں کی کاشت کو رواج دیا۔ ڈیمیٹر کی یاد میں شہر الیوزز کے باشندے عیدیں مناتے تھے لوگ ان عیدوں کو الیوزینین مسٹریز (شہر الیوزز کے راز) کہتے تھے، کیونکہ وہ ہمیشہ مخفی طریقے سے منائی جاتی تھیں۔ جو لوگ ان عیدوں میں شریک کیے جاتے تھے وہ مرید کہلاتے تھے۔ نئے شرکا سے حلف اٹھوائے جاتے تھے کہ وہ ان عجیب و غریب رسموں کا جو عیدوں کے موقع پر ادا ہوتی تھیں کسی سے ذکر نہ کریں گے۔ ڈیمیٹر کا بت کشیدہ قامت اور شاندار بنایا جاتا تھا۔ اُس کے سنہرے بالوں میں اناج کا ہار آویزاں کیا جاتا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک درانتی اور بائیں میں ایک مشعل بنائی جاتی تھی۔ اس کے نام پر بہت سے مندر بنائے گئے تھے اور بہت سی عیدیں منائی جاتی تھیں۔ موسم بہار میں کاشتکاروں کی طرف سے قربانیاں پیش کی جاتی تھیں اور شہد و شراب کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔

تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح میں گیتوں کے مشہور مصنف آرین نے ان وحشیانہ برجستہ ڈتھیرمبس میں ایک نئی ایجاد کا "غمناک ترانہ" کے نام سے اضافہ کیا۔ "یہ چند گلو نوازوں کے باہم ملکر گانے کا" باقاعدہ گیت ایک مخصوص طائفے نے گایا (جس نے غالباً بکیس کے رقاصوں کا روپ بھرا تھا) اور قربان گاہ کے آس پاس جس پر ایک گوسفند کی قربانی کی گئی تھی رقص کیا۔ یہی ٹریجیڈی کی اصلیت ہے جسکے لغوی معنی "گوٹ سانگ" (گوسفند کا گیت) ہیں کیونکہ یونانی میں ٹریگس (گوسفند) اور اوڈ (گیت) کا مترادف ہے۔ اور انھیں دو الفاظ سے یہ لفظ مرکب ہے جسکی صورت کسی قدر کثرتِ استعمال نے تبدیل کردی ہے۔ یہ پرجوش گیت علی العموم آخر گرما یا موسم بہار کے تہواروں میں گائے جاتے تھے اور وہ سرما کی خوفناک طاقت کے مقابلہ میں بکیس کی کشاکشِ حیات کا زمانہ ہوتا تھا اس لیے ان گیتوں میں خاص طور پر بکیس کے حزن و ملال کا ذکر کیا جاتا تھا جسکی وجہ سے ٹریجیڈی کا لفظ غمناک نظموں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اور اب تو لٹریری تصرفات نے اس مفہوم کو اور بھی زیادہ وسیع کردیا ہے۔

یہ افسانہ ہے ٹریجیڈی کی آفرینش کا۔ اسکے چند ہی روز بعد اسکی حقیقت اچھی طرح منکشف ہوگئی جب اسکیلس، سوفکلس اور یوریپڈیس جیسے پانچویں صدی قبل مسیح کے زبردست ڈرامانے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ پیشتر صرف ایک ہی ایکٹر تمام افسانے کا ایکٹ کرتا تھا لیکن اسکیلس نے ایک اور ایکٹر بڑھا کر ڈراما کے قالب میں ایک نئی روح پھونکدی۔ ابتک ٹریجیڈی ایک بچے (گر طاقتور بچے) کے مانند تھی۔ لیکن اسکیلس نے اُسے ہونہار شباب عطا کیا۔ سوفکلس نے چند مفید باتوں کے ساتھ ایک تیسرے ایکٹر کا اضافہ کیا۔ اور یوریپڈیس نے دلچسپ تمہیدیں، عنوان اور دیگر مضامین شامل کرکے ٹریجیڈی کو بالکل مکمل کردیا۔

ٹریجیڈی کی طرح کمیڈی نے بھی بکیس کی پرستش ہی میں جنم لیا، لیکن صحیح روایات کی بناء پر اُسکی نمود بالکل مختلف اور جدا طریقے سے ہوئی ہے اور وہ تہوار بھی دوسری قسم کے تہوار تھے جن میں وہ ظہور پذیر ہوئی۔ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے ٹریجیڈی تقریباً موسم سرما کے تہواروں میں

پیدا ہوئی جبکہ نیچر (دیوتا) کی قوتیں سرما کی قہرمانی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور مار رہی تھیں اور مرگ و حیات کی کشاکش کا یہ درد انگیز سماں لوگوں کے پیش نظر تھا اور اُنکے دل رنج و غم سے لبریز تھے - برخلاف اسکے کمیڈی اُس وقت نمایاں ہوئی جبکہ نیچر کی شاندار کوششیں بارآور ہو چکی تھیں یعنی فصلوں کی دِرو شروع ہو چکی تھی اور جابجا اناج خرمن کیا جا رہا تھا - یہ وہ زمانہ تھا کہ چاروں طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی تھی۔ کمیڈی لحاظ اپنے ماخذ کی سادگی کے ٹریجیڈی سے بالکل مختلف اور غیر مشابہ ہے - ان تہواروں کے موقع پر یہ دستور تھا کہ اپنے فیاض دیوتا کی عطا کی ہوئی شراب سے اچھی طرح سرشار و بدمست ہو کر خوش اعتقاد پرستاروں کا ایک شاندار جلوس دیہات میں گشت کیا کرتا تھا۔ اُن کے ساتھ دیوتا کے متعلق ایک (فحش) تصویر بھی ہوتی تھی اور ایک نغمہ طراز طائفہ آزاد بکیں کے تشکر و ستایش کے گیت بلند سُروں میں گاتا جاتا تھا - دیوتا کی پرستش کے متعلق ضروری رسوم ادا کر کے وہ وحشیانہ اور سیاہ کارانہ عیاشی میں مصروف ہو جاتے تھے - گانے والوں کی یہ حالت تھی کہ جب کسی تماشائی کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو نہایت فحش اور تمسخر انگیز الفاظ میں اُسکو مخاطب کرتے تھے - اور ان باتوں کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہی اور کمیڈی کا سنگ اساس ہیں - کمیڈی عام طور پر سوسیرین کی طرف منسوب کی جاتی ہے جو میگرا کا باشندہ تھا۔ مگر آخر میں اکیریا واقع اٹیکا میں سکونت پذیر ہو گیا تھا - ایک روایت کے مطابق سوسیرین پہلا شخص تھا جس نے انعام حاصل کرنے کے لیے جو انجیروں کی ایک ٹوکری اور شراب کی ایک صراحی پر مشتمل تھا اکیریا کے ایک گانے والے طائفے کا مقابلہ کیا - لیکن دوسرے بیان کے مطابق سوسیرین پہلا شخص تھا جس نے ۵۸۰ یا ۵۶۴ قبل مسیح میں اس دلچسپ موضوع کے لیے کچھ ضابطے اور قاعدے وضع کیے اور باقاعدہ کمیڈی کی بنیاد ڈالی - یونانی اس قسم کی مینوشی اور عیش پرستی کی صحبتوں کو جن کا اوپر ذکر ہوا کومس کہتے تھے - اور اس بنا پر کمیڈی کے معنی "ریولرس سانگ (عیش پرستوں کا گیت) ہیں - کمیڈی کی وجہ تسمیہ یہ بھی بتائی جاتی ہے

کہ یونانی میں "کومی" گاؤں کو کہتے ہیں اور یہ لوگ دیہات میں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے گشت کرتے تھے اس لیے کمیڈی کے معنی "کومی - اوڈ" (گاؤں کا گیت) سمجھنا چاہیے -

کمیڈی کو فن کی حیثیت سے مکمل ہونے میں ٹریجیڈی سے زیادہ عرصہ درکار ہوا - وہ اُس وقت تک اپنی قدیم حالت میں باقی رہی جبکہ یونان کے مشہور کمیڈین ارسٹوفنیس نے اس موضوع پر کلک فرسائی کی -

موجودہ زمانے میں کمیڈی کی تین قسمیں تجویز کی گئی ہیں - قدیم، متوسط، جدید - قدیم کمیڈی میں جن اشخاص سے افسانے کو تعلق ہوتا تھا وہ صحیح تشخصات اور صحیح ناموں کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے - متوسط کمیڈی میں واقعات کی صحت تو قدیم کمیڈی کی طرح لازمی رکھی گئی تھی لیکن جن لوگوں کے متعلق وہ واقعات ہوتے تھے اُنکے نام تبدیل کر دیے جاتے تھے - جدید کمیڈی میں نام اور واقعات دونوں فرضی ہوتے ہیں - مگر یہ ضروری ہے کہ آئین ہستی اور قوانین قدرت کے اعتبار سے اُنکو فرضی نہ کہا جائے -

اس موقع پر قدیم تھیٹروں (تماشا گاہوں) کے متعلق چند لفظ کہنا غالباً بےمحل نہ ہوگا - یہ عمارتیں نہایت وسیع، شاندار اور نصف دائرہ کی صورت میں ہوتی تھیں، جسکے قاعدے پر اسٹیج ہوتا تھا اور محیط میں قطار پس قطار (ایمفی تھیٹر کی طرح) تماشائیوں کی نشست کا انتظام کیا جاتا تھا - ایکٹر روپ بھرنے کے لیے ہمیشہ ایسی پوشاک پہنا کرتے تھے جو اُس شخص کے لیے موزوں ہوتی جس کا اُنھیں پارٹ کرنا ہوتا - ان بھیس بدلنے کی پوشاکوں میں لبوں کے پاس ایک قرنا بھی ہوتی تھی جسکے ذریعے سے ایکٹروں کی سریلی آوازیں زیادہ ملند ہوکر عظیم الشان وسیع عمارت کے ہر گوشے تک پہونچ جاتی تھیں -

اہل روم اپنے ڈراما کے متعلق جو عموماً کمیڈی پر مبنی ہے یونانیوں کے مقروض احسان ہیں - سنہ مسیحی شروع ہونے کے بعد بھی عرصے تک یونانی اور رومی ڈراما کا رواج رہا اور اُس نے دنیا کے ہر حصے میں بے انتہا مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل کرلی - لیکن آخر میں

یہ ڈرامے اس قدر فحش اور مخربِ اخلاق ہونے لگے تھے کہ مسیحی مذہب کے پیشواؤں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی جائے جو تھیٹروں میں جاتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کی پیشگاہ سے بھی تھیٹروں کی ممانعت میں وقتاً فوقتاً فرمان نافذ ہوتے رہے، لیکن تھیٹر کی دل آویزیوں نے لوگوں کو ایسا مسحور کر رکھا تھا کہ چرچ اور سلطنت دونوں کی تنبیہ اُن کے لیے ناکافی اور غیر موثر ثابت ہوئی۔ مجبور ہو کر رہنمایاں ملت نے اس جذب وجنون کا دوسرا علاج تجویز کیا۔ چنانچہ یونان کے قدیم ڈراما کی طرح مسیحی دنیا کا ڈراما بھی مذہب ہی سے متفرع ہوا ہے۔ سب سے پہلا ڈراما جو یروشلم کی بربادی کے چند ہی روز بعد تصنیف ہوا ایک مذہبی موضوع پر مبنی ہے اور اُسکے بعض اجزا یونان میں بصورت مستزاد (ایمبس) اب بھی موجود ہیں۔ یہ ڈراما ازکیل نامی ایک یہودی کی طرف منسوب ہے۔

سید ظہور احمد وحشی (شاہجہانپوری)

بے رخی ہے نہ کچھ ادائی ہے — یہ بھی اک شانِ دلربائی ہے
سائلِ زخمِ تیغ ہوں قاتل — سر مرا کاسۂ گدائی ہے
وہ بتِ ماہرو سراپا حُسن — ہمہ تن شانِ کبریائی ہے
آئینہ خانۂ دو عالم میں — اُن کو منظور خود نمائی ہے
میرا غربت میں کون تھا ہمدرد — بیکسی تھی کہ ساتھ آئی ہے
کعبۂ دل کو بت کریں تسخیر — یہ تری شانِ کبریائی ہے
ساتھ دینے لگا ہے دل کا جگر — شاید اسکی بھی موت آئی ہے
دشت کچھ قیس کی نہیں جاگیر — ہم نے بھی اُسکی خاک اُڑائی ہے
درد کا نام کیوں کریں بدنام — اس میں لذت بھی ہم نے پائی ہے
انوری مر نہ جائے تو کیا ہو — کوئی امید بھی بر آئی ہے

(منصب) یتیم حسن انوری (گورکھپوری)

بابر کی آمد

(۱)

ہندوستان کی حالت آب و ہوا کے اثر نے افغان فاتحوں کو ہندوستان میں کمزور کر دیا تھا۔ وہ قوت جس نے پہاڑی افغانوں کو ہندوستان کے سرسبز و زرخیز حصص میں کامیاب کیا تھا، بالکل زائل ہو چکی تھی، فاتحوں کی وہ جماعت جس کے روز افزوں اتحاد نے اہل ہند کا ناک میں دم کر رکھا تھا، آپس کی لڑائی میں پڑ گئی تھی۔ ہر فریق مملکت کی شراب میں مست اور حکومت کے خواب میں مدہوش اپنی برتری کی کوشش میں تھی۔ وہ وقار نوبی اور اعزاز ذاتی جو ایک فاتح قوم کا جوہر تھا کم ہو چلا تھا، اور مذہبی اصول و نکات حکمرانی جو مغربی ایشیا سے سیکھے گئے تھے، حرم شاہی میں غیر مسلم عورتوں کی کثرت اور ایسے نومسلموں کی زیادتی سے جن کو دولت کی طمع نے مسلمان کیا تھا، نام کو بھی باقی نہ تھے۔ اُس وقت دہلی کی وہ عظیم الشان سلطنت جس کو ایبکؒ، التمشؒ، بلبنؒ، علاء الدینؒ نے یہ عظمت دی تھی، لودیوں کے ایک مغرور و خود پرست حکمران ابراہیم لودی کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

آزادی سب کو بھاتی ہے۔ کیا امریکہ کے غلام، کیا افریقہ کے حبشی اور کیا قرطاجنہ کے مظلوم و رومیوں کے ہاتھوں برباد کیے ہوئے باشندے، سبھی نے موقع پا کر آزادی کی کیا کچھ کوشش نہیں کی؟ اس لیے بالکل قدرتی بات تھی اگر اُس وقت مرکزی حکومت کی باگ ڈور ڈھیلی پا کر ہر ایک بڑے صوبے میں سمند حکومت خودمختاری کے تراپے بھرنے لگا۔ بڑے صوبوں پہ کیا منحصر ہے، بدنظمی اور طوائف الملوکی کی حدیاں تک ہوگئی کہ چھوٹے چھوٹے صوبے، غیر مشہور دضلاع، حتّٰی کہ شہروں اور قلعوں تک کے سرداروں نے خودمختاری کا گیت الاپنا شروع کیا!

یہ صحیح ہے کہ کھوئی ہوئی عظمت اور گذشتہ جبروت کو پھر حاصل کرنے کی کوشش چودھویں

صدی عیسوی کی ابتدا میں اُس وقت کی گئی جب اُس زبردست تصادم کے بعد جو تیمور اور شاہانِ تغلق کے درمیان ہوا تھا، سید اور اُنکے بعد لودیوں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تاہم خاندانِ سید کو تو بالکل ناکامیابی ہوئی۔ البتہ پنجاب کے حکمران بہلول کے ہاتھ میں عصائے حکومت دیا گیا، تو افغانوں کی حکمرانی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تھوڑے دنوں کے واسطے پھر روشن ہوگیا بہلول لودی ۱۴۵۱ء میں سریرآرائے سندِ حکومت ہوا۔ فوراً ہی دہلی کے نواح کے شہروں اور ضلعوں میں انتظام شروع کیا گیا۔ اور قریب چوتھائی صدی کی سخت جنگ کے بعد خودمختار و باعظمت جونپور کو دہلی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ جونپور کے فتح ہونے سے مملکتِ دہلی کی سرحد بہار کے صوبے سے جا ملی۔ خوش قسمتی سے فاتح باپ کا بیٹا بھی فاتح ہوا۔ ۱۴۸۸ء میں سکندر نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے باپ کی اُس آرزو کو جسے وہ بلا پوری کیے چل بسا تھا اُس نے پورا کیا۔

نہ صرف بہار اُس نے فتح کیا جہاں سلطان حسین شاہ جونپور پناہ گزیں تھا، بلکہ دھول پور، گوالیار اور چندیری کے راجپوتوں نے بھی اطاعت اختیار کی۔ اور اس طرح سکندر کی مملکت جس میں پنجاب، دوآب، جونپور، اودھ، بہار، ترہٹ، راجپوتانے کا کچھ حصہ اور بندیلکھنڈ شامل تھے سلطنتِ دہلی کی گذشتہ عظمت و وسعت کی یاد دلانے لگی۔

لودیوں نے کچھ تو بلاشرکت غیرے حکمرانی کرنے کے لیے اور کچھ بعض اور وجوہ سے صوبوں کی حکومت اور دیگر اہم عہدے اپنے ہی اہل ملک یعنی افغانوں کو دیے تھے لیکن افغان اپنی خلقی عادت کے موافق اِن عہدوں کو اپنا حق خیال کرتے، جنکو اُنھوں نے، اُنہیں کے خیال کے موافق، بادشاہ کی عنایت اور مراحمِ خسروانہ سے نہیں بلکہ اپنی ہی تلوار کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ افغان کچھ قدرۃً آزادمنش ہوتے ہیں۔ اُنھیں غیرمناسب اظہارِ برتری ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اور وہ کسی باجبروت دربار کے مقررہ و تکلیف دہ اداب کو ذرا بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ اُن کا سردار اُن کا مہربان دوست اور ہوشیار سپاہی ہونا چاہیے۔

لیکن کسی پُرغرور سر کے سامنے نظر نیچی کرنا اُنکی شان کے خلاف ہے۔ سکندر کے بعد بدقسمتی سے حکومت کی ہونے اُسکے لڑکے ابراہیم کے سر میں خودپرستی و خودبینی کا خیال پیدا کر دیا۔ ۱۵۱۷ء میں وہ بادشاہ ہوا۔ بڑے بڑے افغان سرداروں کو حکم دیا کہ وہ دربار میں دست بستہ خاموش اُسکے حضور میں کھڑے ہوا کریں۔ اسی زمانے میں ان آئے دن کے احکامات سے عاجز آ کر کچھ بااثر سرداروں نے ابراہیم کے بھائی جلال کے ساتھ جو جونپور کا گورنر تھا اور حکومت کا دعویدار ہوا تھا ایک ناکامیاب کوشش ابراہیم کو نیچا دکھانے کی کی۔ لیکن ابراہیم نے بجائے اسکے کہ مہربانی و مراعات سے اُن شکست خوردہ سرداروں کو رام کرے، اُنکو ذلیل کر کے قابو میں لانا چاہا۔ آزادی پر جان دینے والے افغان بھلا کیوں ایسی ذلت برداشت کرتے۔ بےچینی پھیلنے لگی اور بجا بجا بلوے ہونے لگے۔ اسپر لطف یہ کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ کو ابراہیم نے چند سربرآوردہ افغان سرداروں کے خون سے بجھانا چاہا!

نتیجہ یہ ہوا کہ بےچینی اور بھی بڑھ گئی؛ مشرقی اضلاع اودھ، جونپور اور بہار، جہاں افغان بااثر تھے دریا خاں کے زیرِ حکومت خودمختار ہو بیٹھے۔ اِدھر پنجاب میں دولت خاں نے جسکے مورثوں نے ستر سال قبل خاندان لودی کو حکمران بنایا تھا، چند بارسوخ سرداروں کے بیگناہ مارے جانے کی خبر پاکر، علمِ بغاوت بلند کر دیا۔

مغرور ابراہیم کی ظالمانہ حرکات کی انتہا یہاں تک پہونچی کہ اسی کا چچا علاء الدین لودی بھاگ کر کابل پہونچا اور خاندان تیموریہ کے خلف الصدق بابر سے مدد کا طالب ہوا۔

(۲)

بابر ایک ایسے شخص کے لیے جس نے لڑکپن ہی سے میدان جنگ میں زندگی گزاری ہو، جس نے طرح طرح کی تکالیف اور قسم قسم کے مصائب کا استقلال سے مقابلہ کیا ہو، یہ دعوت پیام امید سے کم نہ تھی۔ فرغانہ کی موروثی حکومت کے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں بار بار کی ناکامیابیوں نے اُسکو ادھر سے ناامید کر دیا تھا اس لیے اُسکی بجلی نہ رہنے

والی طبیعت کے واسطے کام کی ضرورت تھی۔

ایشیا کے دو زبردست منگول و ترک فاتحوں چنگیز و تیمور کا خون بابر کی رگوں میں تھا اور اگر ایک طرف تاتاریوں کی بہادری و جنگ آزمائی اُس میں تھی تو دوسری جانب ایرانی تہذیب و شائستگی بھی تھی۔ منگولوں کی جفاکشی اور ترکوں کی ہمت اور مردانگی کے ساتھ اُس نے غیر متحد اہل ہند پر حملہ کیا اور گو وہ خود کسی عظیم الشان بادشاہت کا معمار نہیں بلکہ محض ایک خوش قسمت جنگ آزما تھا، تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اُس عظیم و شان دار عمارت کا سنگ بنیاد اُسی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا جسکو اُسکے پوتے اکبر نے درجۂ تکمیل کو پہونچایا۔

بابر کی اُس زندگی کے جس کا ایک ایک لمحہ ہمت، جفاکشی اور استقلال کا سبق دیتا ہے آخری بارہ سال ہندوستان و کابل میں گزرے۔ اس سے قبل لڑکپن و جوانی کا زمانہ اُسنے اپنی موروثی سلطنت کے حاصل کرنے کی ناکامیاب کوششوں میں گزارا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی عمر کے چھتیسویں سال اُس نے وسط ایشیا کی سلطنت کا دل سے خیال نکال ڈالا۔ اور ہندستان کی زرخیز سرزمین، مالدار شہروں، غیر متحد اور ہمیشہ برسرپیکار باشندوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ پنجاب کی سرزمین نے، جو ہمیشہ حملہ آور کی مہمان نوازی کیلیے ہمیشہ تیار رہی ہے، بابر کو بھی چار بار اپنے ہاں مہمان رکھا اور پانچویں بار جو ہندوستان میں بابر نے قدم رکھا تو پھر اپنی زندگی بھر نہ واپس جا سکا۔ پانچ سال تک وہ ہندوستان میں رہا اور ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

تاریخ میں بابر کا نام اُسکی ہندوستان کی فتوحات کے باعث اب تک زندہ ہے لیکن اُسکی سبق آموز زندگی کے حیرت انگیز کارناموں کا زریں باب اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ فرغانہ کی سلطنت کے حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول تھا۔ اُسکی زندگی کے خود نوشت حالات سبق آموز ہونے کے علاوہ تاریخی معلومات اور اپنے مخصوص طرز تحریر کے باعث آج بھی خاندان مغلیہ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ بابر صرف جنگ آزما سپاہی ہی نہ تھا بلکہ اُس کا مذاقِ زبان دانی بھی اعلیٰ تھا، وسطِ ایشیا کی لٹیں یعنی فارسی زبان کا

وہ شاعر تھا اور اپنی مادری ترکی زبان میں بھی نظم و نثر دونوں میں سادہ اور موثر طرز تحریر کا موجد تھا۔

اُس زمانے میں ترکی بادشاہوں اور شاہزادوں میں گو تلوار چلانا، نشانہ لگانا، مردانہ و شاہانہ مشاغل تھے تاہم ایک اچھی غزل کی تصنیف یا خط نستعلیق کی تحریر بھی اُن کا خاص شغل تھا۔ علم و ذکاوت، برجستہ شاعری، حسب موقعہ فارسی امثال کا استعمال، خوش خلقی و خوش گلوئی، یہ بابر کے زمانے میں ایسی چیزیں تھیں جنکی اتنی ہی قدر ہوتی تھی جتنی کہ بہادری، جرأت، محنت و جفاکشی اور سپاہ گری کی۔

بابر کے خودنوشت حالات اُٹھا کر دیکھیے۔ کیسے ہی المناک حالات کیوں نہ لکھے جا رہے ہوں، کیسی ہی مصیبت انگیز داستان کیوں نہ بیان کی جا رہی ہو، لیکن آپ کو حسب موقع اشعار ضرور نظر آئیں گے۔ اندوہ و غم، رنج و الم، فکر و مصیبت کے نرغے میں بھی اُسکے سکون قلب و اطمینانِ خاطر کا یہ حال تھا کہ داستان الم نظم کی جاتی تھی۔ پھر جس آزادیِ طبع سے اپنی خوبیوں کے ساتھ ہی ساتھ بُرائیوں و عیوب کا اظہار کیا گیا ہے وہ اُن لوگوں کے لیے جو اپنے حالات خود لکھنا چاہتے ہیں ایک سبق ہے۔

زمانے کی نیرنگی کا ذکر ہی کیا۔ نظامِ عالم کا قوام ہی کچھ اس طور سے بنا ہے کہ آج تختِ حکومت پر جابرانہ حکومت کرنے والے پیرِ فلک کے یک اشارۂ انگشت سے کل دوسرے دن دربدر ٹھوکریں کھاتے نظر آتے ہیں۔ شاہجہاں کا پیارا بیٹا دارا، جو بطور خود شاہجہاں کی علالت میں انتظام مملکت کرتا ہم کو نظر آتا ہے، اِس فلک کج رفتار کی ایک چشم فسوں ساز و غارت گر نے اُسی کو دہلی کے گلی کوچوں میں کس ذلت سے چکر کھلایا ہے! تاہم اس چند روزہ دنیا میں جو جیسا کر جاتا ہے اُسی حیثیت سے اُس کا نام یاد کیا جاتا ہے۔ سکندر کا نام سنکر اُسکی فتوحات ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں، صلاح الدین کا ذکر ہوتے ہی ہم کو اُسکی فاتحانہ لڑائیوں کا خیال آجاتا ہے، چنگیز و ہلاکو خاں کا خیال کرتے ہی اُنکی سفاکانہ دست برد، اُنکی انسانیت سے دور بے رحمیاں یاد آجاتی ہیں۔ اسی طرح گو بہادر اور جنگ آزما بابر کے خاندان سے حکومت نکل گئی، منگول کا لفظ

بخارا کی گلیوں، سمرقند کے نواح اور مرو کے محلات میں ایک بے معنی لفظ ہو گیا ہے، وہ وسط ایشیا کا ترک جو کسی زمانے میں روسیوں کے نام سے نفرت کرتا تھا آج اُن کا غلام نظر آتا ہے۔ خاندانِ تیموریہ کے آخری حکمراں نے ہماری ہی یاد میں رنگون میں بحالتِ جلاوطنی جامِ موت پیا، کچھ ہی سال قبل غیر مفتوح چنگیز خاں کی اولاد نے زار کے افسروں کی اطاعت اختیار کی اور گو آج بابر کے خاندان کی عظمت اور شان و شکوہ خواب میں بھی نہیں نظر آتی تاہم اُس کے غیر فانی حالات، اُسکے سبق آموز واقعات جنکو وہ خود ہی سادہ اور نیچرل طرز تحریر میں قلمبند کر گیا تھا آج بھی تغیر پذیر زمانے کے سامنے اپنی عظمت، اپنی شان، اپنے استقلال اور اپنی محنت و جفاکشی کو بیان کر رہے ہیں۔ اُس کا زمانہ گذر گیا، وہ کابل کے ایک پُر فضا باغ میں گہری نیند سو رہا ہے لیکن دنیا اور حباب آسا اور سیماب صفت عالم اُس سے سبق حاصل کر رہا ہے!

(باقی آیندہ) **یوسف الزمان** (آسیونی)

ترجمہ رباعیاتِ خیام

(۱)

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما | کاے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانۂ مے | زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

ترجمہ

غفلت طلبی یہ آہ! کچھ ٹھیک نہیں | پی ہوش کی تا کجا یہ خوابِ زشیں
رہ جائے بھری ہوئی یہ حسرت دل ہیں | پیمانۂ عمر ہی نہ بھر جائے کہیں۔

(۲)

بر سینۂ غم پذیرِ من رحمت کن | بر جان و دلِ اسیرِ من رحمت کن
برپاے خرابات روِ من بخشاے | بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن

ترجمہ

اس سینۂ غم پذیر پر رحمت کر اس جان و دلِ اسیر پر رحمت کر
یہ پانوں کہ رہروِ خرابات ہیں بخش اس دست پیالہ گیر پر رحمت کر

(۳)

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من ایں حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من و تو چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

ترجمہ

اسرارِ ازل کو جانتا تو ہے نہ میں یہ حرفِ معما نہ پڑھا تو ہے نہ میں
پردے سے یہ گفتگو ہے میری تیری جوں ہی کہ یہ پردا اٹھا "تو ہے نہ میں"

(۴)

آورد باضطرابم اول بوجود جز حیرتم از حیات چیزے نفزود
رفتیم باکراہ و ندانیم چہ بود زیں آمدن و بودن و رفتن مقصود

ترجمہ

دنیا میں تھا ایک اضطراری آنا حیرت کے سوا یہاں نہ کچھ بھی جانا
لوٹا گئے بجبر پھر اُلٹے پاؤں کیا جانے یہ کس لیے تھا آنا جانا

(۵)

اول بخودم چو آشنا می کردی آخر ز خودم چرا جدا می کردی
چوں ترکِ منت نبود از روزِ نخست سرگشتہ بعالمم چرا می کردی

ترجمہ

پہلے تو بنایا آشنا تو نے مجھے پھر کر دیا آخر کو جدا اپنے سے
جب روزِ ازل سے میں نہ تھا غیر کوئی کس واسطے دنیا میں پھرایا تو نے

(باقی آیندہ)

سید لطف علی (گیلانی)

مسٹر محمد علی کا خط

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الناظر بابت ۱۵ اگست ۱۹۱۳ء)

گزشتہ نمبر میں عدم گنجایش کے سبب اس بحث پر کچھ نہ لکھا جا سکا۔ اب اُسکی تلافی کی جاتی ہے

(۸) سید سجاد حیدر صاحب کو جب اس میں کامیابی نہ ہوئی کہ مسٹر محمد علی مسئلۂ یونیورسٹی میں راجہ صاحب کے ہم آہنگ ہوں تو اس آہوے وحشی کی گرفتاری کے لیے ایک دوسرا اور مضبوط تر جال بچھایا گیا۔ یعنی مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی خادم الخدام انجمن خدام کعبہ کو جنھیں مسٹر محمد علی کے "مرشد" ہونے کا امتیاز حاصل ہے، آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے گمراہ "مرید" کو قیصر باغ پارٹی کی راہِ طریقت پر چلنے کی تلقین کریں۔ چنانچہ مولانا نے اپنے "شفقت ناموں" کی وساطت سے اور نیز اپنے معتمد اور وفادار تبیع مسٹر احسان الرحمن قدوائی بی اے کے ذریعے سے پیام بھیجکر مسٹر محمد علی کو راہِ راست پر لانے کی باقاعدہ کوشش کی۔ صاحب موصوف اپنے پیر و مرشد کی تلقینات کو رد تو نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک جملۂ شرطیہ کی آڑ میں پناہ لیکر وہ اپنے ضمیر کی ملامت سے بچ گئے۔ اور اسی پیام کے ہاتھ اُنھوں نے ایک مفصل تحریر لکھکر راجہ صاحب کی خدمت میں بھیجدی جسکے متعلق اُنھیں یہ بالکل بجا شکایت ہے کہ

"اُس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ بلکہ رسید تک سے میں مشرف نہیں کیا گیا"

مسلمانانِ ہندوستان کے سب سے بڑے "لیڈر" کو اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ قیصر باغ کے زریں بال پر والے دیوتاؤں کا رنگِ رخ کتنی جلدی بدل جاتا ہے اور وہ کتنی آسانی سے اُنکی اعلیٰ خدمات کو بھلا سکتے ہیں۔

(۹) مسٹر محمد علی کا یہ خیال ٹھیک نہیں ہے کہ

جو رزولیوشن شوکت علی صاحب کے اور میرے متعلق پاس کیا گیا وہ غیر ضروری تھا!

جس طرح کہ اپریل ۱۶ء کے جلسے میں ابتداءً مسٹر محمد علی سے مشورہ کیا گیا تھا اور جسکے متعلق اُنھوں نے پوری معاملہ فہمی کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا ہے کہ

"اصل مدعا مشورلے نہ تھا بلکہ مجھے اپنی رائے سے متأثر کرنا مقصود تھا"

اسی طرح اس موقع پر بھی مسٹر محمد علی کی خدمات کا اعتراف اور اُنکی حالت بےبسی پر اظہار رنج و افسوس اتنا ملحوظ خاطر نہ تھا جتنا اپنا ہم آہنگ بنانے کے لیے اُنکی "ذریات" کو رہین منت کرنا اور اُنکے جذبات و احساسات کو تسلی و تشفی دینا - یہ اور بات ہے کہ مسٹر محمد علی کی "ذریات" مجموعاً اس دام فریب کا شکار نہ بنی - تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ جلسے کی کارروائیوں میں اسکا بہت کچھ اثر نمودار ہوتا رہا - اور کم سے کم یہ نتیجہ ضرور قابل اطمینان کہا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ راجہ صاحب محمود آباد ہی مسئلۂ یونیورسٹی کے اس طرح پر تصفیہ ہونے کے اصلی اور کلیتہً ذمہ دار تھے لیکن مجمع احرار کی طرف سے سارا جوش و خروش کارفرمایان علیگڈھ کے خلاف صرف ہوتا رہا اور راجہ صاحب بدستور معتمد علیہ بنے رہے۔

(۱۰) راجہ صاحب نے ۱۵ اکتوبر ۱۵ء کو یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے جلسۂ علیگڈھ میں اُس احتجاجی مراسلت کے جواب میں جو جلسہ چھوڑ کر چلے جانے والے اراکین ایسوسی ایشن کی طرف سے مولانا ابوالکلام اور خواجہ عبدالمجید صاحب لیکر گئے تھے، کہا تھا کہ

"اگر میرے اوپر معاملہ چھوڑا جائے تو میں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ خواہ مجھے سولی پر چڑھا دیا جائے یا پھانسی دی جائے مگر مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ میں مسلمانوں کو ذبح ہوتے دیکھوں اور میں کسی حالت میں مسلمانوں کا بدخواہ نہ ہوں گا" ....

"اور اگر میری نسبت ایسا خیال ہو کہ میں نے کسی قسم کی بدیانتی (ووٹ شمار کرنے کے تصفیہ میں) کی ہے تو میں اسی وقت ہمیشہ کے لیے کرسی صدارت چھوڑنے پر تیار ہوں"

ملاحظہ ہو مطبوعہ روداد جلسہ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن منعقدہ علیگڈھ ۱۵ اکتوبر ۱۵ء

زیر دستخط سید جالب دہلوی آف ہمدرد

مگر مسٹر محمد علی اس بارے میں کچھ اور لکھتے ہیں :-

"حالتِ موجودہ تو ظاہر ہے کہ ہمارے مخالفین پر ہماری آزادی اصول میں جس طرح گراں تھی اُسی طرح فروع میں بھی گراں تھی (یا ہے اور رہے گی؟) اور باتباع اُنکے ارباب حل وعقد علیگڈھ نے بھی کچھ کوشش نہ کی کہ فونڈیشن کمیٹی نے جن فروعی اُمور میں آزادی کو برقرار رکھنا چاہا تھا اُسے محفوظ رکھا جائے۔"

× × × × × × × ×

"ایک سال ضایع کرنے کے بعد .... آج فونڈیشن کمیٹی کو پھر مدعو کیا جارہا ہے اور عام خیال ہے کہ اب فروعی آزادی کو بھی خیرباد کہنے کا عزم بالجزم ہے اور قوم کے دیرینہ خواب کی اس طرح تعبیر کی جائے گی کہ جس طرح کی یونیورسٹی ایک دوسری قوم نے بظاہر اپنی قومی ضروریات وخصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھ کر لینا قبول کی ہے اُسی طرح کی یونیورسٹی ہم بھی علانیہ خلاف اپنی قومی ضروریات وخصوصیات کے قبول کر لیں۔ کہاں ۱۱ و ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کے مطالبے اور دعوے تھے اور کہاں آج کی ہمتیں اور ارادے ہیں .... سنا جاتا ہے کہ آپ اسپر مُصر ہیں اور اربابِ حل وعقد علیگڈھ سے زیادہ اس فیصلے کے لیے کوشاں ہیں۔

\+ + + + + + + +

لوگوں کا خیال ہے کہ آنجناب نہایت سرگرمی سے مسلمانوں سے نہ صرف ۱۱ و ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء و ۲۶ و ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرانا چاہتے ہیں بلکہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کے فیصلے کے بھی خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ آپ علانیہ فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں لکھنؤ سے دس ہزار آدمی اپنی رائے کے موافق رائے دینے کے لیے لے آؤں گا۔"

۱۰ اپریل ۱۹۱۷ء کے جلسۂ علیگڈھ سے قبل "ہماسو ہاوس" میں جو جلسۂ شوریٰ منعقد ہوا تھا اور جس میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی تھی کہ ایک ایک کرکے احرار کی مخالف جماعت کے

بقیہ افراد کو اپنا ہم آہنگ بنا لیا جائے یا بدرجۂ آخر کم سے کم اُنکو سکوت اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے اُس نے اور نیز مذکورۂ بالا اقتباسات نے اب اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ مُسلم یونیورسٹی کے بارے میں راجہ صاحب کی روش ورائے کیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء اور اپریل سنہ ۱۹۱۶ء کے واقعات اگرچہ راجہ صاحب کے رجحان و خواہش کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے بالکل کافی تھی تاہم احرار کی ایک جمعیت کو امید اصرار رہا کہ آیندہ راجہ صاحب اس بارے میں قوم کے مطالبات و ضروریات کے خلاف کوشش نہ کریں گے۔ چنانچہ ہم نے یہاں تک سنا تھا کہ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء کے جلسے میں جو عارضی اور نیم تام فتح جمعیت احرار کو حاصل ہوئی تھی اُس نے راجہ صاحب کو چونکا اپنی غرض پر متنبہ کر دیا ہے اس بنا پر وہ مزید کارروائی خاتمۂ جنگ و مسٹر محمد علی کی واپسی تک ملتوی کریں گے۔ لیکن جس طرح دفعۃً اور نہایت ہی قلیل مہلت میں اپریل سنہ ۱۹۱۷ء کا جلسہ طلب ہوا ہے اور جو فیصلہ اس جلسے کی طرف سے صادر کیا گیا ہے اُسکی نوعیت بتا رہی ہے کہ مجمع احرار کی قوتوں کو منتشر اور بے سود بنانے اور بالآخر اُسکو شکست دینے کے لیے یہ سکون و خاموشی بھی بظاہر صرف ایک چال تھی۔ جو موقع سے اور حالاتِ گرد و پیش کو دیکھکر خوبصورتی سے چلی گئی اور کامیاب رہی مگر احرار کی اس شکست نے (جو خود اس گروہ کے بعض ممتاز اصحاب کی بدولت نصیب ہوئی ہے) قوم کے عام افراد کو آیندہ اور شاید ہمیشہ کے لیے اس حقیقت سے روشناس کر دیا ہے کہ موجودہ حالت میں مستبدین و احرار میں سے کوئی ایک بھی کامل اطمینان و اعتماد کے مستحق نہیں ہیں رہے راجہ صاحب، سو وہ اب صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ متحدہ ہندوستان کے "مسلمہ لیڈر" ہیں اور کم سے کم اُس وقت تک رہیں گے جبتک کہ ہم اہل ہند اُن کمزوریوں اور بداخلاقیوں کا شکار رہیں جو جدید تمدن اور مغربی تعلیم کا بدترین ثمرہ ہیں — البتہ ایک جماعت ہے بے حقیقت و بے راہ، یہی ہے جو راجہ صاحب کے اُن دعاوی کو جو اکتوبر ۱۹۱۵ء کی تقریر میں کیے گئے تھے اور اُنکے اُس رویہ کو جو بعد میں اپریل سنہ ۱۹۱۷ء تک ظاہر ہوا ہے باہدگر کلیۃً متناقض جانتی ہے اور اپنے تئیں اسی روشنی میں اُنکے متعلق رائے قائم کرنے پر مجبور پاتی ہے۔

علیگڈھ کے گذشتہ جلسے میں راجہ صاحب محمود آباد اور پرنس حمید اللہ خاں صاحب نے جو حصہ لیا ہے اُس نے غالباً اربابِ بصیرت کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا ہوگا کہ ہماری قومی تحریکات کی بنیادیں جو آج ایسی کمزور اور کھوکھلی نظر آرہی ہیں اُسکے ذمہ دار دراصل ہم ہی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے راجہ صاحبان و نواب صاحبان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیسی ہے؟ ہم نے بزرگوں کی کتابوں میں پڑھا ہے اور اسی پر ایمان رکھتے ہیں کہ جن افراد کی مذہبی اخلاقی حالت ایسی ہو جیسی کہ عموماً ہمارے ہاں طبقۂ امراکی ہے اُن کی رہنمائی ہماری نجات کا باعث نہیں بن سکتی ع او خویشتن گم ست کرا رہبری کند۔

مگر ان باتوں کا علم ہونے اور ان خرابیوں سے پوری پوری واقفیت رکھنے کے باوجود بھی محض آسان پسندی کی بنا پر اور اس آرزو و امید میں کہ ہماری قومی تحریکات جلد سے جلد بارآور ہو جائیں، ہم بے تکلفانہ اُن امرائے دولت کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اُنھیں کے بخشش و کرم پر ہماری قومی تحریکات کی زندگی اور خود ہمارے تمام حوصلہ و عزائم کا دار و مدار رہ جاتا ہے۔ جس کا لازمی اور واقعی نتیجہ وہی ہونا چاہیے جو آج ہر روز پیش آتا ہے یعنی یہ روسا اُس مالی امداد کے معاوضے میں جو ہم غلطی یا نادانستگی سے اُن سے حاصل کرتے ہیں ہمارے معاملات میں پیش پیش ہو جاتے ہیں اور بالآخر ہمیں قعر مذلت میں گرا دیتے اور خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بنا دیتے ہیں۔

جملہ قومی تحریکات کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہو جائیگا کہ انکی منزل بہ منزل ترقی میں یہ انحطاط آفریں عمل نمایاں طور پر موجود ہے، لیکن ان تجرباتِ تلخ کے باوجود آج بھی ہم اس راہ عمل پر چلنے کے لیے تیار ہیں! اور سب سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہے کہ وہ اصحاب جو آج احرار کے غلط نام سے موسوم کیے جاتے ہیں اور جو اربابِ ثروت اور خطاب یافتہ لوگوں کی مذمت و حقارت میں اپنی تحریر و تقریر سے ممتاز حصہ لے رہے ہیں خود وہ اپنی تجویزات و تحریکات کے [illegible]

یہ صحیح ہے کہ دنیا کے کاروبار روپے کے بغیر نہیں چل سکتے اور روپیہ آسانی اور فراوانی کے ساتھ اسی طبقے سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن غالباً اس حقیقت کے اعتراف کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ روپے سے زیادہ دماغ و عقل اور عملی قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر کسی تحریک کے بانیوں کے پاس یہ اشیا موجود ہیں تو اُسکے لیے زمین کا ہر ذرہ سونا چاندی اُگلنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

ہمارے احباب ایک طرف اگر کسی امیر و رئیس سے مایوس و نا امید ہو کر آئین حریت کے پاس و لحاظ سے اُسکا دامن چھوڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں تو افسوس ہے کہ دوسری طرف وہ کسی دوسری، ویسی ہی زریں ہستی کے آگے جبہہ سائی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ تجربے کے بعد ظاہر ہوگا کہ یہ بُت بھی پتھر کا جسم اور غیر متحرک اعضا کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔

میں اپنے دوستوں سے خصوصاً اُن سے جنکے جوش ملی اور خلوص دلی کا مجھے پورا پورا یقین ہے یہ خواہش کرونگا کہ وہ ایک دفعہ تو کم سے کم اس روش کے خلاف پوری آزادروی اور صحیح اصول عمل کے مطابق کام کرنے کی کوشش کریں۔ تاکہ جو نتائج روبرآر ہوں اُنکی روشنی میں سابقہ طریق کار سے موازنہ کیا جا سکے۔ اس قسم کے تجربے کے لیے میں اُس قومی تحریک کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتا ہوں جو "مسلم لیگ" کے نام سے موسوم ہے اور جسکی موجودہ حالت سے آج اس جماعت کا کوئی متنفس مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آل انڈیا مسلم لیگ ایک زمانے تک ہز ہائینس آغا خاں کے حیطۂ اقتدار میں رہی اور اب کچھ عرصے سے راجہ صاحب محمودآباد کے تصرف میں ہے۔ آغا خانی دور میں مولوی عزیز مرزا صاحب کے انہماک و مشغولیت کے بدولت "لیگ" کچھ نہ کچھ کام کرتی تھی مگر مسلمانوں کی بدبختی سے عزیز مرزا صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور اُنکی الم پرور موت لیگ کے لیے "آن قدح بشکست و آں ساقی نماند" کا پیام لائی۔ سید وزیر حسن صاحب جو اُس وقت سے لیگ کے سکرٹری ہیں اپنے پیشے کی مصروفیت کے بدولت اس خدمت کے قطعاً اہل نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب سے دفتر لیگ اُنکے سپرد ہوا ہے جسم لیگ سے روح عمل

یکسر خارج ہو گئی ہے۔

گذشتہ اجلاس لیگ میں راقم الحروف نے جب اس کا مطالبہ کیا کہ لیگ کی، رپورٹ (جسکی منظوری کی سفارش کی جاتی تھی) پیش کی جائے تو یہ معلوم کرکے تمام ہوا خواہان ملک کو سخت مایوسی ہوئی کہ باوجودیکہ لیگ کے دفتر پر پانچ چھ سو روپیہ ماہانہ سے زیادہ روپیہ خرچ ہو رہا ہے اور سکرٹری صاحب کو متعدد معقول تنخواہ پانے والے ماتحتین دیے گئے ہیں لیگ کی مختصر رپورٹ بھی مرتب نہیں ہوسکی۔ آنریبل مسٹر محمد علی جناح صدر جلسہ نے سکرٹری صاحب کی عدیم الفرصتی کا عذر پیش کرکے اُس وقت مباحثے کو اگرچہ ختم کردیا۔ مگر وہ اصحاب جو لیگ کی اس حالت سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے اسکو کافی نہیں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سال رواں میں تمام اسلامی اخبارات نے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھیں لیگ کے اصولوں سے کوئی اختلاف نہیں اور جو سید وزیر حسن صاحب اور راجہ صاحب کی خدمات قومی وملکی کا اندازہ نسبتہ اشتہار دینے اور اعتراف کرنے میں دریغ نہیں کرتے لیگ کی اس حالت کے خلاف نہایت زبردست صدائے احتجاج بلند کی اور ہمارے مرحوم دوست راجہ غلام حسین صاحب نے اس بحث پر جو قابل قدر مضامین اپنے اخبار نیوایرا میں لکھے اُنکا کم سے کم یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ سکرٹری صاحب لیگ نے ایک طرف تو پبلک سے لیگ کے ضوابط وآئین میں اصلاح کرنے کے متعلق تحریری رائیں اور تجویزیں طلب کیں اور دوسری طرف لیگ کے پریسیڈنٹ جناب راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں اپنا استعفا بھیجدیا۔

یہ استعفا پریسیڈنٹ صاحب کی طرف سے بعض ممبران کونسل کے پاس اظہار رائے کی غرض سے بھیجا گیا ہے اور اس بات کی پوری کوشش ہوگی کہ کونسل کے ممبر اسکو منظور نہ کریں بلکہ اُلٹے سید صاحب کی خوشامد کریں کہ وہ اپنا استعفا واپس لے لیں۔

اب یہ اس نئی جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک شخص کو اس کام کے لیے پیش کرے اور جلسۂ عام میں جو چند مہینے بعد بمقام کلکتہ ہونے والا ہے اس بات کا پورے زور

کے ساتھ مطالبہ کرے کہ سید صاحب کا استعفا پیش ہو کر منظور کیا جائے۔

راجہ صاحب محمود آباد سے ہمکو شکایت نہیں کہ وہ اپنے دوست کو اس عہدے سے کیوں دست بردار نہیں ہونے دیتے اور اُنکی اس خواہش کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سکرٹری صاحب کا استعفا بجائے اسکے کہ جملہ ممبرانِ کونسل کی خدمت میں بھیجا جاتا صرف منتخب اصحاب کو اُسکی اطلاع دی گئی جنکی طرف سے راجہ صاحب کو اپنی ہم آہنگی کی پوری توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ اگر سید صاحب مستعفی ہوگئے تو راجہ صاحب بھی صدارت سے مستعفی ہو جائیں گے۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ جو لوگ کام نہیں کر سکتے یا نہیں کرنا چاہتے انکا استعفا قوم کی سر آنکھوں پر۔ ہمیں ایسے سوقرا اور دولتمند پریسیڈنٹ اور ایسے نامور اور عدیم الفرصت سکرٹری کی جگہ صرف کام کرنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

(۱۱) مسٹر محمد علی نے اس خط کے آخر میں راجہ صاحب سے بعض سوالات کے جوابات طلب کیے تھے۔ جن میں دو باتیں خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہیں۔ مسٹر محمد علی تو چونکہ راجہ صاحب کو سالارِ قوم جانتے اور اپنے عقیدے کے مطابق جمہور مسلمانانِ ہند کی رائے و خیالات کا راجہ صاحب کو بہترین نمائندہ اور رہنما سمجھتے تھے اس لیے اُنکو یہ دیکھکر اگر سخت حیرت ہوئی تو کچھ بیجا نہیں کہ علیگڈھ پارٹی سے جو جمہور کی خواہشات پامال کرنے کے لیے ایک روایتی شہرت حاصل کر چکی ہے، راجہ صاحب نے ساز کر لیا۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں پہلے تنہا علیگڈھ کالج کو چھوڑنا گوارا نہ تھا اب اُنکو کالج معہ شئے زاید یعنی مسلم یونیورسٹی بھی حوالے کر دینے میں دریغ نہیں۔ چنانچہ وہ دریافت کرتے ہیں کہ

"کیا علیگڈھ کالج کے اربابِ حل و عقد پر آپ کو اعتماد ہے کہ وہ یونیورسٹی کو مناسب طور پر چلا سکیں گے؟

"اگر آپ کو ان حضرات پر اعتماد ہے تو آپ اب تک کیوں ان سے اس قدر کشیدہ رہے ہیں اور کیوں علیگڈھ کالج کے معاملات میں آپ نے اُس سرگرمی کا جسکی آپ کے ہر جاننے والے کو آپ سے توقع تھی اب تک اظہار نہیں فرمایا۔ اور کیوں انتخاب صدر کا نوٹس کے والد میں

آپ کی جانب سے ارباب حل وعقد علیگڈھ کی اس قدر مخالفت یا اُنکی جانب سے آپ کی اور
آپکے ہمخیال اصحاب کی مخالفت ہوئی۔"

"اگر واقعی آپ کو ان حضرات پر اعتماد نہیں ہے تو پھر کس جماعت سے توقع ہے کہ باوجود ان
حضرات کی مخالفت کے وہ یونیورسٹی کو حسب منشا آپ کے اوجھوڑ کے چلا لیگی۔"

راجہ صاحب کو چونکہ خط وقت پر نہیں ملا اس لیے اُنھیں اُسکے جواب دینے کی زحمت گوارا کرنا نہ پڑی ہوگی ورنہ شاید انکے جوابات پر بھی ہم تبصرہ کرسکتے۔ مگر حالات کو پیش نظر رکھکر راجہ صاحب کی طرف سے جو جواب مسٹر محمد علی کو بھیجا جانا چاہیے تھا وہ غالباً اس قسم کا ہوگا کہ مجھکو علیگڈھ کے ارباب حل وعقد پر اگرچہ اعتماد نہیں ہے۔ لیکن چونکہ میں جانتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کی منتظم جماعت میں علیگڈھ کے ارباب حل وعقد کے علاوہ میرے ہمخیال اصحاب کی جماعت کثیر بھی ہوگی اس لیے بے اعتمادی کے باوجود مجھے اس میں عذر نہیں کہ مسلم یونیورسٹی کا انتظام علیگڈھ والوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں علیگڈھ کے معاملات میں عملی حصہ لینا چنداں ضروری نہیں تصور کرتا کیونکہ میرے لیے مسلم لیگ کا میدان عمل کیا کم ہے۔ رہا انتخاب کا جھگڑا، وہ ایک اصولی بحث تھی۔ اور چونکہ میاں محمد شفیع صاحب نے اُن اصولوں کو تسلیم نہیں کیا جو میں نے بحیثیت مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ کے مسلمانوں کے سیاسی حالات کے متعلق کانگریس کے نمایندوں کے ساتھ طے کیے تھے۔ اس لیے مجھے اُن کی اعزاز واہمیت گوارا نہ تھی۔ ارباب علیگڈھ میرے مخالف نہیں اور نہ میں اُنکا مخالف۔ نتیجہ یہ کہ وہ بنا کام کیے جاتے ہیں اور میں اپنی مصروفیتوں میں منہمک ہوں۔ البتہ کبھی کبھی اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ علیگڈھ میں جو میرا اقتدار قائم ہو چکا ہے اسکا مظاہرہ بھی کیا جائے۔ مگر چونکہ گذشتہ سال اسی مسئلۂ انتخاب صدارت میں میری خوشنودی مزاج کا خیال نہیں کیا گیا اور علیگڈھ والے مجھ سے فرنٹ رہے اس لیے میں نے اسکا مناسب علاج تجویز کرلیا ہے۔ چنانچہ آپ کو جو یہ خبر ملی ہے کہ میں نبی اللہ صاحب کو علیگڈھ کالج کا سکرٹری بنانا چاہتا ہوں اور اُنکی مالی امداد کے لیے آمادہ ہوں، یہ بھی میری جدید تجویزات کا ایک شعبہ ہے۔ میں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے

بلکہ مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں ارباب علیگڈھ کی ہم آہنگی کرکے پھر اپنے گذشتہ رسوخ و اقتدار کی بنیاد بھی زیادہ مستحکم کرلی ہے،

مسٹر محمد علی نے سید نبی اللہ صاحب کے متعلق استفسار کرتے ہوئے ضمناً اس حقیقت پر بھی راجہ صاحب کی توجہ منعطف کرادی ہے کہ

"نہ اُنھوں نے (یعنی سید نبی اللہ صاحب نے) نہ سید وزیر حسن صاحب نے سرگرمی و محنت کا باوجود لکھنؤ میں ایک مقتدر قومی جماعت کا رکن ہونے اور مخالفت کے ایک بڑی حد تک مفقود ہونے کے اب تک کافی ثبوت دیا"

سید نبی اللہ اور سید وزیر حسن صاحبان نے سرگرمی و محنت کا اگر ثبوت نہیں دیا تو اسکا سبب حقیقی وہی ہے جسے مسٹر محمد علی انکی سرگرمی و محنت کے لیے باعث تحریص و ترغیب سمجھتے ہیں یعنی مخالفت کا مفقود ہونا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ مزاحمت و مخالفت ہی تمام سرگرمیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور کم سے کم مسٹر محمد علی کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس نہایت ہی بدیہی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ ہر حال ان ہر دو اصحاب کے لیے یہ کچھ کم طغرائے امتیاز نہیں کہ قوم کے چھوٹے سے بڑے تک اُن کی بے عملی اور سکون و جمود کی قصیدہ خوانی میں دریغ نہیں کرتے اور پھر بھی یہ اصحاب "مطلب از جانی جنبد" کی مثال جہاں ہیں وہاں سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں۔

سید نبی اللہ صاحب کو تو خیر اب شہر لکھنؤ کی پدرانہ سرپرستی سے فرصت نہیں۔ اس لیے کسی قومی مسئلہ میں زیادہ دلچسپی لینے سے وہ عذرخواہ ہوں تو برا ماننے کی بات نہیں۔ رہے سید صاحب سو وہ قطعاً اسکے لیے تیار نہیں کہ قومی کاموں کے لیے اپنے پیشے کے کاموں کا ہرج کریں یا اپنی تفریح میں خلل انداز ہوں لہذا اُنکا استعفا حاضر ہے۔ آپ خواہ اُسے قبول کیجیے یا اگر اسکی دہی کی آپ کو پرواہ ہو تو وعدہ کیجیے کہ آیندہ آپ کی زبان و قلم سے کبھی ایک حرف شکایت نہ نکلے گا۔

مسٹر محمد علی کی قید نظربندی سے آزادی کا مسئلہ پیش ہے۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کی تشریف آوری ہندوستان کا اعلان ہو چکا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل۔ آل انڈیا کانگریس کی کونسل

کے منفردہ اور مشترکہ جلسے الہ آباد میں منعقد ہونے والے ہیں۔ مسٹر محمد علی اور اُنکے ساتھ ساری قوم ۲۵، ۲۶ اکتوبر کے اجتماع الہ آباد کی اہمیت کے لحاظ سے ان جلسوں کی کارروائی پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ مگر ہمارے سید صاحب کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ اُنھیں سال بھر کی مسلسل فکر معاش کے بعد ایک مہینے کی عدالتی تعطیل نے آزادانہ سیر و تفریح کا موقع دیا ہے اور وہ یہ خیال کر کے کہ

در سال دگر کے خورد زندہ کہ ماند

لکھنؤ سے سیدھے خطۂ جنت نظیر کشمیر کی ہوا خوری کو چلے جاتے ہیں۔ آپ اور آپ کے ہمخیال سرگرمی و محنت کے متلاشی ہیں۔ حالانکہ ایک کامیاب وکیل اپنے پیشے کی مسلسل سرگرمی و محنت کے بعد سکون و آرام کا مستحق اور خواہاں ہوتا ہے۔ اندریں صورت آپ کے لیے اور نیز سید صاحب کے لیے اور اس سے بڑھکر یہ کہ بدنصیب قوم کے لیے سب سے بہتر اور مفید صورت یہی ہے کہ آپ سید صاحب کا استعفا منظور کرلیں اور اب کے انتخاب کے وقت اس بات کو پیش نظر رکھیں بلکہ پہلے سے قول و قرار لے لیں کہ جو صاحب اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کی ہمت رکھتے ہوں وہ آیندہ پیشے کے انہماک کا عذر نہ کریں اور کم سے کم اپنے عہدہ کی میعاد تک قومی و ملکی ضروریات پر ذاتی راحت و آرام کو قربان کرنے کے لیے تیار رہیں۔

مسٹر محمد علی کے خط کا یہ تبصرہ اب ختم پر آیا۔ مگر ہنوز وہ سب کچھ نہیں لکھا گیا ہے جو ہمیں اس سلسلہ میں گروہ احرار سے خصوصاً اور ساری قوم کے ارباب فہم سے عموماً عرض کرنا ہے۔ اسکے لیے آیندہ نمبر سے ہم ایک جداگانہ عنوان کے تحت جگہ نکالیں گے اور ہمیں یقین ہے کہ ناظرین کرام اور جملہ بہی خواہان ملت الناظر کے آیندہ نمبروں کو پوری توجہ سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ منزل سخت ہے، راہ دور دراز و پر پیچ، اور رہرو نسبتاً ماندہ و شل۔ تاہم جو فرصت اس وقت حاصل ہے ممکن ہے کہ کل اس سے بھی محروم ہو جائیں۔ پس جو کچھ دل میں ہے اُسے زبان قلم پر جاری ہو کر اُن لوگوں تک پہونچ جانا چاہیے۔ جنکے ساتھ قوم و ملک کی بہترین امیدیں وابستہ ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

مدرسۂ الٰہیات کانپور

مسلمانوں کو خدمتِ دین سے عزیز تر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اور دینی خدمات میں شاید اشاعتِ مذہب سے عظیم تر کوئی فرض نہیں۔ لیکن پراگندہ حال مسلمانانِ ہند، جنکے دین و دنیا کے سب ہی کام ابتر و برباد ہیں، اب تک اس فرض کی ادائی کے لیے بھی کوئی باقاعدہ نظم نہیں رکھتے۔ ہندوستان کی جملہ مجالس اسلامی اپنی بنا قائم کرتے وقت اسے ضروری جانتی ہیں کہ اس اہم ترین خدمت کو بھی اپنے نظامِ عمل میں داخل رکھیں۔ مگر بعض مستثنیات کو چھوڑکر، عموماً مجالس یا تو رفتہ رفتہ مقرر کردہ راہِ عمل کو یکسر نظرانداز کردیتی ہیں، یا دوسرے نسبتاً کم اہم مگر زیادہ مقبول شعبہ ہائے کار کے ہجوم میں اس ضروری مقصد سے غافل و بے پروا ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خاص مقصد کے متعلق اگر ہندوستان کی تمام اسلامی مجالس کی کارروائیوں پر نظرِ احتساب ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن سب کی مجموعی کوشش سے سالانہ اتنے نامسلمان بھی مذہبِ حق کی پیروی اختیار نہیں کرتے جتنے مسلمان سال بسال جدید تہذیب و تمدن کے اثرات سے نامسلمان ہو جایا کرتے ہیں۔ حاصل اس سب کا یہ ہے کہ آمد و صرف کا اگر مجموعی حساب لگایا جائے تو شاید یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ موجودہ رفتار سے ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں چند صدیوں کے بعد (خاکم بدہن) ایک بھی مسلمان نہ رہے گا۔

ان حالات کا صرف ایک علاج تھا۔ اور الحمدللہ کہ کانپور کے مسلمان تاجرانِ چرم کے جوشِ دینی کے بدولت اُس کا سامان فراہم ہو رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اُنھوں نے "داعیانِ اسلام" کی ایک کثیر اور منضبط جماعت تیار کرنے کے لیے کانپور کے مدرسۂ الٰہیات کو مخصوص کر دیا ہے۔ یہ مدرسہ جیسا کہ اکثر اصحاب کو معلوم ہوگا تقریباً دس سال سے قائم ہے اور اگرچہ ابتدا سے یہی مقصدِ اعظم اُس کا نصب العین رہا ہے تاہم درمیان میں چند سال تک اس کا نظم و نسق بعض ایسے اسباب کی بنا پر جنکی تفصیل بالکل غیرضروری ہے حصولِ مدعا کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب مقامِ شکر ہے کہ ہمارے مکرم محترم جناب مولانا آزاد سبحانی صاحب پھر وہاں پہونچ گئے ہیں اور اُنھوں نے پوری مستعدی اور ہمہ تن انہماک و استغراق کے ساتھ مدرسہ کی تنظیم و تنسیق کے ایسے اصول پر کام شروع کر دیا ہے کہ بہترین نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ہم تفصیل کے ساتھ اس مدرسہ کے نظام اور منتظمین مدرسہ کی تجویزات پر تو پھر کسی وقت لکھیں گے، سردست مدرسہ کا مطبوعہ نصابِ تعلیم یہاں اس امید پر شائع کرتے ہیں کہ وہ بزرگانِ ملت جو دلِ دردمند اپنے پہلوؤں میں اور ہونہار اولاد اپنے گھروں میں رکھتے ہیں، اگر اپنی اولاد کو اس اعلیٰ ترین خدمتِ دینی کے قابل بنانا چاہتے ہوں تو نصابِ مجوزہ سے وہاں کی تعلیم کا اندازہ کرکے اپنی اولاد کو اس درسگاہ میں داخل کرادیں۔ مدرسۂ الٰہیات کے بارہ میں جملہ دریافت طلب امور کے متعلق مولانا آزاد سبحانی پرنسپل مدرسہ الٰہیات کانپور سے مراسلت کی جائے۔

نصاب الٰہی کبیر عربی

دو حیثیتوں میں، بحیثیت علم وفن، بحیثیت کتاب وطریقۂ درس

النصاب الٰھی الکبیر العربی

من حیث العلوم والفنون

(۱) علم الدّین، یعنی فلسفۂ دین مطلق، بمقابلہ لادینی والحاد،

(۲) علم الکتاب (قرآن کریم) بطرز حاوی جامع مباحث و رموز قدیمہ وجدیدہ، خصوصاً اعتراضات مذاہب مقابل اسلام بطریق رد وتنقید،

(۳) علم السنۃ، (حدیث وسیرت) بطرز اقتصار، بمباحث دقائق اصولیہ خصوصاً اعتراضات وشکوک مخالفین،

(۴) علم الادیان، یعنی علم عقائد واحوال مذاہب، بطریق موازنہ واستخراج نتائج۔

(۵) علم الاسلام، (کلام) یعنی فلسفۂ اسلام مطلق (بدون تعرض مسائل جزئیہ وتفصیلیہ) بمقابلہ مذاہب غیر،

(۶) علم تاریخ الدین، یعنی مخصوص تاریخ مذہب ومذاہب باختصاص مذاہب عظیمہ، بطریق استخراج نتائج وتقدیم بحث تاریخ مطلق، وتفصیل اخص تاریخ اسلام،

(۷) علم جغرافیۃ الدین، یعنی مخصوص جغرافیۂ مذہب ومذاہب نظریہ تخصیص نظریۂ اسلام تقدیم بحث جغرافیہ مطلق،

(۸) علم تمدن الدین، یعنی علم نشو وارتقاء مذہب، باختصاص نظریۂ اسلام، تقدیم بحث مطلق تمدن انسانی،

(۹) علم حقیقت، (تصوف) بطرز تطبیق بین الحقیقۃ والتمدن، بین الحقیقۃ والفلسفۃ بین الحقیقۃ والدین وموازنۃ بین علم الحقیقۃ اسلام وعلم الحقیقۃ مذاہب غیر،

(۱۰) علم الدعوۃ، یعنی علم ماہیت اصول دعوۃ، خصوصاً دعوۃ دینیہ، وبالاخص دعوۃ اسلامیہ، متضمن تاریخ الدعوۃ والداعیین،

(۱۱) الالسنہ، سنسکرت، بھاشا، انگریزی، عبری، سنسکرت وبھاشا بقدر کفایت لازم، انگریزی وعبری اختیاری

(۱۲) مشق المناظرۃ والخطابۃ والانشاء، مناظرہ، مخصوص بمسائل مذہبیہ خلافیہ اصولیہ، ہر ہفتہ کیبار، خطابت، محدود بہ مضامین علمی مذہبی ہر ماہ دوبار، انشا، بلا تحدید وتعیین اوقات، عند المواقع والضرورۃ،

النصاب الالٰہی الکبیر العربی

من حیث الکتب وطرق التعلیم

علم	طریق التعلیم	کتب
(۱) علم الدین	(درس)	(الدین) وانتخابات کتب ذیل۔ نقد المحصل، التشریع وفلسفہ الدین فی نظر العقل، المبدأ والمعاد، تطبیق الدیانۃ،
(۲) علم الکتاب (القرآن)	(درس، املا)	(القرآن الکریم) باعانت تفاسیر قدیمہ وجدیدہ وانتخابات کتب عہد واناجیل اربعہ، کتب توراۃ، ساتیر، ژند وپاژند، وید اربعہ گیتا وغیرہ
(۳) علم السنۃ (حدیث وسیر)	(درس، املا)	(تیسیر الاصول) (الطریق المحمدیۃ السیرۃ النبویہ) وانتخاب کتب سیر و احادیث، مغازی الرسول، شفاء عیاض، ابطال کارلائل وغیرہ
(۴) علم الادیان،	(درس)	(الادیان) وانتخابات کتب ذیل:۔ کیفیۃ انتشار الادیان، الملل والنحل شہرستانی، الملل والنحل ابن حزم، دبستان مذاہب، کتب عقائد مذاہب مختلفہ،
(۵) علم الاسلام (کلام)	(درس)	(الاسلام) وانتخابات کتب ذیل، الفقہ الاکبر، الابانۃ، الاقتصاد، اساس التقدیس، کشف الادلۃ، شرح مقاصد، شرح التجرید، تہافۃ الفلاسفۃ، لوائح الانوار، رسالۃ التوحید، الاسلام فی عصر العلم، الحصون، عقیدۃ الاسلام۔
(۶) علم تاریخ الدین،	(درس)	(عصر الدین) وانتخابات کتب ذیل التاریخ العام، تشعب الامم بعد الطوفان، سر تطور الامم، طبقات الامم، تاریخ الحضارۃ، تاریخ الامم الاسلامیہ، الفتوحات الاسلامیۃ
(۷) علم جغرافیۃ الدین،	(درس)	(عالم الدین) وانتخابات، النسجۃ الازہریۃ، جغرافیۂ عمومیہ،
(۸) علم تمدن الدین،	(درس)	(الدین) وانتخابات الحضارۃ، روح الاجتماع، الانسان والدنیا، الانسان الطبعی، التمدن الحدیث، التمدن الاسلامی۔
(۹) علم الحقیقۃ (تصوف)	(درس، املا)	(الحقیقۃ) وانتخابات فصوص، عوارف، احیاء، المعارف الدینیہ، جامع الاصول، المذہب الروحانی،
(۱۰) علم الدعوۃ،	(درس)	(الدعوۃ والدعاۃ)

نظرے خوش گزرے

عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں جو محکمۂ تالیف و اشاعت قائم ہوا ہے، گذشتہ مہینے اُسکے ذکر میں لکھا گیا تھا کہ مولوی عبد الحق صاحب اس محکمہ کے منتظم اعلیٰ مقرر ہوے ہیں، اور خیال تھا کہ اورنگ آباد کی انسپکٹری کی خدمت سے وہ سبکدوش ہو جائیں گے۔ مگر اب یہ اطلاع ملی ہے کہ صاحب موصوف اپنے عہدہ سابقہ پر بدستور کام کرتے رہیں گے۔ اور اس جدید خدمت کی انجام دہی کی غرض سے ہر مہینے کچھ دن بلدہ حیدر آباد میں بسر کیا کریں گے۔ جسکے لیے دو سو روپیہ ماہوار کا الاؤنس اُنکو ملتا رہے گا۔ ہمیں اس انتظام سے بدیں وجہ خاص مسرت ہوئی کہ انجمن ترقی اُردو کا دفتر جہاں ہے وہیں رہے گا۔ مسٹر عبد الماجد وغیرہ کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سید ہاشمی صاحب فریدآبادی کا تقرر بھی عہدہ مترجمی پر عمل میں آیا ہے۔ جسکے لیے عزیز موصوف کی خدمت میں دلی مبارکباد عرض ہے۔ بعض اخبارات میں سید نذیر ہاشمی کا نام چھپ جانے کی وجہ سے ہمیں اس خبر کی جو اطلاع ملی تھی اُسکے باور کرنے میں کسی قدر تذبذب تھا، لیکن اب اس خبر کی پورے طور پر تصدیق ہو گئی ہے۔

سالانہ قومی میلوں کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ اب کی سال کلکتہ ان اجتماعی مظاہروں کا مرکز بنایا گیا ہے اور آبادی کی کثرت، دولت کی فراوانی اور تعلیم و احساس کی افزونی کے باعث کلکتہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے شہروں پر جو تفوق حاصل ہے اُسکے لحاظ سے امید قوی ہے کہ کل جلسے کامیاب رہیں گے۔ کانگریس کے لیے مسز اینی بیسنٹ، اور مسلم لیگ کے واسطے مسٹر محمد علی صدر منتخب ہو چکے ہیں۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت سنا جاتا ہے کہ آنریبل اے کے فضل الحق کرچی سابق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کو پیش کی جانے والی ہے۔ مگر اب تک اسکا تصفیہ نہیں ہوا ہے۔ اس اثنا میں مسٹر شوکت علی کا نام بھی صدارت کانفرنس کے لیے پیش کر دیا گیا ہے، جسے ارباب علیگڈھ کبھی منظور نہیں کر سکتے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ سر آشوتوش مکرجی ہی صدر منتخب ہونگے۔

انتخاب صدارت کے متعلق، کانگریس نے جو ضابطہ قرار دے رکھا ہے، اگر مسلم لیگ اور محمڈن کانفرنس و دیگر مجالس ملکی و قومی بھی اسی قسم کا یا بالکل یہی ضابطہ اپنے قانون اساسی میں اضافہ کر لیں تو پھر بے ضابطگی، خود رائی و استبداد کی شکایات عام جاتی رہیں۔ اگرچہ کانگریس کی ضلعی اور صوبجاتی شاخیں جس قدر منضبط ہیں بقیہ مجالس میں سے کسی کو یہ بات حاصل نہیں ہے، تاہم تکمیل نظام کی غرض سے یا محض نمایش کے لیے جو ماتحت مجالس قائم ہیں اُنھیں سے باقاعدہ مشورہ طلب کرنا چاہیے۔ بلا کچھ تعجب نہیں اگر اس ذریعے سے ماتحت مجالس کا نظام

درست کرنے میں بھی کافی مدد ملے۔

کانفرنس اور لیگ کے کارفرما اگر چاہتے ہوں کہ قوم کی کثیر التعداد جماعت ان تحریکوں سے پوری دلچسپی لینے لگے اور وہ مدد دے جسکے نہ ملنے کا تقریروں اور نیز تحریروں میں اکثر رونا رویا جاتا ہے تو اُنھیں بھی اپنے دروازے قوم کے لیے فراخ کرنا چاہیے۔ اور اگر آپ چاہیں کہ روپیہ تو دیں عام افراد قوم، اور اقتدار و اختیار سب آپ کے ہاتھ میں رہے، تو اگرچہ اب تک ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی ایسا ہونا ممکن ہے لیکن یہ واضح رہے کہ ان تحریکات سے قوم کو حقیقی دلچسپی نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ آیندہ ہوگی۔ کانگریس کے لیڈروں میں بھی بہت سخت اختلافات موجود ہیں، جنکا تلخ تجربہ ابھی حال ہی میں ہو چکا ہے۔ لیکن کیا کانگریس کے منتظمین کو اُسی قسم کی شکایت عام افراد ملک سے ہے جیسی کہ لیگ اور کانفرنس کے ارباب حل و عقد کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے؟ لیگ کے ایک تنخواہ یاب کارکن نے کچھ عرصہ ہوا اس بات کی شکایت کی تھی کہ لیگ کے ارکان چندہ نہیں دیتے، اور دھمکی دی تھی کہ ان نادہندوں کے نام شایع کر دیے جائیں گے۔ اس سے قطع نظر کیجیے کہ اس کارکن کا فعل جائز تھا یا ناجائز، اگر غور فرمائیے کہ کیا یہ صورتِ حالات قابل اطمینان کہی جا سکتی ہے؟ گر نادہند ارکین لیگ آپ سے صاف کہہ دیں گے کہ آپ کو اطمینان ہو یا نہ ہو جب تک لیگ کے معاملات میں ہماری آواز کو بار نہیں ملتا، ہمارا روپیہ ہمیں کاٹتا نہیں کہ ہم اُسے منتظمین لیگ کے اسراف کے لیے وقف کر دیں۔ خصوصاً اس لیے کہ ہم عموماً بڑی محنت اور جاں فشانی کے بعد یہ روپیہ پیدا کرتے ہیں، اور ہمارے ذاتی مصارف بیشتر اوقات ہماری آمد سے متجاوز رہتے ہیں۔

اسی سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اپنے محترم دوست مولوی عبدالحق صاحب سے یہ دریافت کریں کہ کلکتے میں اُردو کانفرنس یا انجمن ترقی اُردو کے جلسے کا کیا انتظام ہو رہا ہے۔ کانفرنس کے متعلق جو تلخ تجربہ گذشتہ سال ہو چکا ہے اُسکی بنا پر کچھ امید افزا توقعات قائم نہیں ہو سکتیں، اور اگر وہ ارباب کلکتہ جن کی نمایش کے لیے محض منتظمین انجمن کی غلط امیدوں کی بنا پر گذشتہ سال لکھنؤ میں ہمیں اپنی جان ضغطے میں ڈالنا پڑی تھی۔ اس دفعہ بھی کچھ سامان خود مہیا کر سکتے ہیں تو پھر ہم بھی اُردو کانفرنس کا تماشہ دیکھنے کو حاضر ہوں گے۔

انجمن ترقی اُردو عملاً ابھی طفولیت کی حالت میں ہے۔ اسلیے اُسکے پاس مسئلہ انتخاب صدر کے متعلق کوئی ضابطۂ عمل نہیں ہے، اگرچہ فی الجملہ ہماری یہ دلی خواہش ضرور ہے کہ اُسکا نظام زیادہ کامل، زیادہ مستحکم اور زیادہ کشش رکھنے والا ہو۔ الناظر، بمبئی و دوسرے پرچوں میں "انجمن ترقی اُردو کے نظام" پر جو کچھ لکھا گیا تھا اُسکے متعلق یہ تو ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایک حیدرآبادی معاصر اُسپر تنقید و تبصرہ لکھنے کے آرزومند ہیں لیکن یہ خبر نہیں کہ خود مولوی عبدالحق صاحب کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ کیونکہ ادھر کئی مہینے سے عثمانیہ یونیورسٹی کے معاملات میں صاحب موصوف کو جو انہماک رہا ہے غالباً اُسکی باعث وہ ہمیں کوئی مفصل خط معاملات انجمن کے متعلق نہیں لکھ سکے۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ انجمن کا جلسۂ سالانہ ۱۹ء کانفرنس کے ساتھ اب کی کلکتہ میں ہوگا۔ اُسکے لیے کسی مسند نشین کا انتخاب بھی ابھی سے کرنا چاہیے۔ ہم دفتر انجمن کو توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں بعجلت ممکنہ کارروائی شروع کر دی جائے۔

قوت مردی کے لیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہوکر علاج سے تنگ آگئے ہوں تو آخر میں اب ایک بار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ

آتشک نگرہ گولیوں کا

استعمال فرمائیں۔ اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں گئی ہوئی اور ہاتھوں سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتیں از سرنو عود نہ کر آئیں تو ہمارا ذمہ! صاحبو! اس بات میں زمانہ کے معزز اصحاب تعریف فرما رہے ہیں لاکھوں کی تعداد میں سرٹفکیٹ موجود ہیں، مردوں عورتوں کو یکساں مفید ہیں اور نباتات سے مرکب قیمت بھی بہت کم۔ فی بکس بتیس گولیوں کا صرف

ایک روپیہ

آزمائش شرط ہے۔ یک مشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپے کی دوا زیادہ ملے گی

وید شاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

شیخ اجازت پاتے ہی خوشی خوشی اصفہان سے روانہ ہوکر بعد قطع منازل و طے مراحل ....
شیراز میں داخل ہوئے اور شیخ محمد مسیح فسائی سے کہ جو آقا حسین خوانساری کے شاگرد
تھے درس لینے لگے۔

کئی سال تک شیراز میں مقیم رہ کر چند کتابیں شیخ محمد مسیح فسائی سے پڑھیں۔ اور جب
تک شیخ محمد مسیح زندہ رہے دوسرے سے درس نہیں لیا۔ بعد وفات شیخ محمد مسیح فسائی کے
چند کتابیں مولوی لطف اللہ شیرازی و باقر صوفی سے پڑھیں۔

عرصہ دراز تک شیراز میں مصروفِ تحصیل علم رہنے کے بعد شیراز سے روانہ ہوکر
محال بیضیائے فارس آئے۔ اگرچہ یہاں بجز چند قریہ معمورہ کے شہریت بالکل نہیں رہ گئی تھی
مگر اس مقام کو خوبی آب و ہوا سے ممتاز، مکانات و شکارگاہ سے دلچسپ پایا۔ چند روز
وہاں قیام کیا اور وہاں کے علما و فضلا کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔

محال بیضیائے فارس سے روانہ ہوکر اردکان فارس گئے۔ وہاں عبدالکریم اردکانی
سے کہ عابد و عالم تھے علم نجوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، چندے صحبت رہی۔ وہاں سے
پھر شیراز واپس آئے۔ چند روز شیراز میں قیام کرکے شہر فسا ہوتے ہوئے شہر گازرون کی
طرف روانہ ہوئے۔ شہر گازرون میں پہونچکر معلوم ہوا کہ عارفِ ربانی شیخ سلام اللہ سولستانی
جنکا سلسلۂ مشائخ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، دنیا سے کنارہ کش ہوکر
پہاڑ میں گوشہ نشیں ہیں، اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے ایک گانوں میں ٹھہر گئے
وہاں کے رہنے والوں سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ مگر شیخ
کو اُن سے اعتقاد خاص تھا۔ تقدیر راہبر ہوئی، حضوری حاصل ہوگئی۔ چند روز حاضر باشی
کے بعد شیخ نے یہ تمنا ظاہر کی کہ بقیہ زندگی اسی مقام پر بسر کروں مگر اُنھوں نے اجازت
نہ دی۔ اور رخصت کیا۔ شیخ کا قول ہے کہ اس وقت تک مجھے جسقدر توفیقِ سعادت و خیر
میسر ہوئی ہے اُنھیں بزرگ کی برکت اور نظر اشفاق کا نتیجہ ہے۔

شہر گازرون سے روانہ ہو کر شہر سولستان و شہر جہرم و خطۂ لار ہوتے ہوئے بندر عباس آئے اور بقصد مکۂ معظمہ جہاز پر سوار ہوئے۔ خوبیٔ قسمت سے جہاز ہی پر بیمار ہو گئے۔ جب جہاز ساحلِ عمان پر پہونچا ابھی جہاز سے اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اکثر مسافر جنگل میں پڑے رہ گئے۔ شیخ بھی اُسی حالتِ علالت میں پڑے رہے۔ جب صحت ہوئی تو زمانۂ حج گذر چکا تھا۔ وہاں سے واپس ہو کر جزیرۂ بحرین آئے۔ یہاں سے ساحل فارس بندر معمورۂ کنگ میں آکر شیراز چلے آئے۔

اس سفر میں شیخ نے ملک فارس کی اچھی طرح سیر کرلی۔ اب انکے دل میں یہ سمائی کہ دنیا و لذاتِ دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں کسی مقام پر جہاں گوشہ و پانی ہو، گوشہ نشینی اختیار کروں اور خلق خدا سے کنارہ کش ہو کر جو کچھ خدا دے اُسی پر قناعت کروں، لیکن کل امر مرہونِ باوقات ہیں۔ اُس وقت شیخ کا یہ خیال پورا نہ ہو سکا۔ انکے والد کی تحریر بڑے اصرار کی ملی جسکے دیکھتے ہی شیخ کا دل بیچین ہو گیا فوراً بہ ارادۂ اصفہان شیراز سے روانہ ہوئے۔

اصفہان میں پہونچکر والدین کی قدمبوسی حاصل کی، بھائیوں سے ملے۔ شیخ کے والدین نے چاہا کہ انکی شادی کر دیں مگر شیخ نے اپنے اشغالِ علمی کو مانع سمجھکر انکار کیا اور تجرد و فارغ البالی کو انسب سمجھا۔

سنہ ۱۱۲۷ ہجری میں انکے والد شیخ ابیطالب نے دنیا سے رحلت کی اور دو سال کے بعد انکی والدہ نے بھی جنت کا راستہ لیا۔ اب گھر میں بجز ایک ضعیفہ جدۂ مادری اور دو بھائیوں کے کوئی نہ رہ گیا۔ انکے چچا شیخ ابراہیم جو لاہجان میں انتظام جاگیر کرتے تھے وہ پہلے ہی مر چکے تھے۔ شیخ ان صدموں سے بہت مغموم رہا کرتے تھے۔ اور انکے دل میں دنیا کی طرف سے غفلت اور گوشہ نشینی کی رغبت بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن جب پسماندگاں کی بیکسی پر غور کرتے تو مجبور ہو جاتے تھے۔

کل جاگیر و علاقہ شیخ کا صوبۂ گیلان میں تھا۔ انکے چچا کے مرجانے اور کسی شخص کے منتظم

نہ ہونے سے اُسکی آمدنی میں جسپر اُنکے تمام اخراجات کا دارمدار تھا، روزافزوں کمی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس اطراف میں جہاں جاگیر و علاقہ تھا روس کا قبضہ ہوگیا اور وہ ذریعۂ آمدنی کا قطعی جاتا رہا۔ اس کثرتِ حزن وملال میں بجز شغلۂ شعر و سخن کوئی دمساز و دلنواز نہ تھا جو دم بھر بھی انکا غم غلط کرتا۔

چرخ ستمگار اس پر بھی خاموش نہ بیٹھا یعنی شیخ اسی رنج وغم میں مبتلا تھے کہ ایران کے تنزل کا زمانہ شروع ہوچکا تھا۔ افغانیوں نے میرویس خاں قندھاری کو سردار بنا کر ایران پر حملہ کیا۔ میرویس خاں اصفہان پہونچا اور شاہ نواز خاں حاکم اصفہان کو قتل کرکے مالکِ خزانہ بن بیٹھا۔ شاہ حسین صفوی ابن سلیمان صفوی سے جسکی فوج ایک مدت سے آرام طلبی کی عادی ہو رہی تھی تدارکِ انسداد و قرار واقعی نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ میرویس خاں کا انتقال ہوگیا اُسکے بعد اس کا بیٹا محمود خاں قندھاری اسکا جانشین ہو کر کرمان و یزد میں پہونچا اور قتل و غارت کرتا ہوا اصفہان میں آیا۔ یہاں بھی لوٹ اور غارتگری شروع کردی۔

اسی لوٹ میں اہل شہر کے ساتھ شیخ کا بھی تمام مال واسباب و کتب خانہ جسمیں قریب ایک ہزار جلد کتابیں تھیں لُٹ گیا۔ شیخ کے دونوں بھائی و جدۂ مادری کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ شہر کے لوگ ہر گوشے سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ یکم محرم ۱۱۳۵ھ ہجری کو شیخ بھی بتغیر لباس اصفہان سے نکلکر قریب کے ایک گاؤں میں پوشیدہ ہو رہے۔

۱۵ر محرم ۱۱۳۵ھ ہجری کو شاہ محمود قندھاری نے شاہ حسین صفوی کو قید کر کے تمام شہر پر اپنا قبضہ کرلیا۔ شیخ یہ خبر سنکر اُس گاؤں سے روانہ ہوئے اور خوانسار میں چلے گئے۔ خوانسار سے خرم آباد جو لرستان فیلی کا دارالحکومت تھا پہونچے۔ یہاں علی مرداں حاکم خرم آباد کے ہاں جو شیخ کا شناسا تھا مقیم ہوئے۔ علی مرداں بوجہ علم و فضل کے شیخ کی بہت عزت و احترام کرتا تھا۔

بوجہ صدماتِ متواترہ و ہجوم رنج و محن شیخ کے قوائے دماغی بیکار ہوگئے تھے اور کوئی معلومات

صفحۂ خاطر پر نہ رہ گئی تھی - ایک سال اسی حالت میں گذری - جب صحت ہوئی تو خرم آباد کے معززین و علما سے ملے اور صحبتِ احباب سیرِ مقامات میں بسر ہونے لگی -

شاہ طہماسپ ثانی پسر شاہ حسین صفوی بعد قیدِ پدر بخیال تدارک فاغنہ آذربائیجان میں مقیم تھا کہ آمدِ لشکر روم کی خبر معلوم ہوئی - شاہ طہماسپ مع لشکر قزلباش فوجِ روم سے برسرپیکار ہوا - روم کی جماعت کثیر ہونے کے ماسوا فوجِ روم کو برابر مدد پہونچتی جاتی تھی، اس وجہ سے شاہ طہماسپ روم کی فوجِ ظفر موج کو روک نہ سکا -

سپہ سالارِ روم نے خرم آباد پر حملہ کرنا چاہا - علی مرداں حاکم خرم آباد نے یہ خبر سنکر چاہا کہ خود شہر کو غارت اور خراب کرکے اور رعایا کو ساتھ لیکر کسی پہاڑ پر چلے جائیں کیونکہ فوج روم کا مقابلہ کرنا اور اسپر فتحیاب ہونا مشکل ہے - شیخ نے بنظرِ ہمدردی یہ رائے دی کہ ایسے شہرِ رشکِ ارم کو اپنے ہاتھوں خراب کرکے خلق اللہ کو پریشانی میں ڈالنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو سرِ ہلاکت رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ تمام لوگ متفق و مستعد ہو جائیں اور دشمن کو روکنے کی کوشش کریں - اس رائے کو سب نے پسند کیا اور باہم عہد و پیمان ہونے کے بعد سب نے مسلح ہو کر حصار و قلعہ کو مستحکم کیا رومیوں نے آذربائیجان سے چل کر ہمدان پر حملہ کیا اور بعد جنگِ عظیم ایرانیوں سے ہمدان لیلیا اور بہت سے معزز نامی اشخاص کو گرفتار کرلیا - اُن قیدیوں میں کچھ احبابِ شیخ کے بھی تھے - جبکہ شیخ غیروں کے ساتھ ہمدردی و احسان کرنے کے عادی تھے تو اپنے دوستوں کو قید میں دیکھنا انکی حمیت اور ہمدردی کے کب شایان شان تھا جس وقت شیخ نے اپنے دوستوں کا قید میں جانا سنا بیچین ہو گئے - اپنی جگہ پر خاموش نہ بیٹھ سکے - نہتر آدمیوں کو ہمراہ لیکر روم کے لشکر کی طرف روانہ ہوے - لشکر روم میں اکثر معززین کرمان شاہاں بھی تھے اور وہ لوگ شیخ کے قدیم شناساؤں میں تھے - شیخ نے اُن لوگوں کے ذریعے سے تمام قیدیوں کو رہائی دلوائی اور مقام محفوظ میں پہونچا کر آپ خرم آباد چلے آئے -

شیخ اُن لوگوں کو پہونچا کر آپ خرم آباد آئے مگر اب خرم آباد کو بھی سپاہِ روم کے خوف سے

خالی نہ پایا۔ اس لیے وہاں سے روانہ ہوکر بصرہ آئے۔ بصرے آنے پر خیال آیا کہ حج کا زمانہ قریب ہے۔ فوراً بصرے سے روانہ ہوکر بندادآئے۔ یہاں جہاز بقصد حج کھل رہا تھا سوار ہو گئے۔ چالیس روز کی مسافت طے کرکے جہاز ساحل یمن پر پہونچا۔ع۔ تقدیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی۔ شیخ اس مرتبہ پھر بیمار ہوگئے۔ اور زمانۂ حج گذرگیا۔ شیخ نہایت افسوس کے ساتھ اُسی حالتِ بیماری میں واپس ہوکر بصرہ و لرستان فیلی ہوتے ہوے خرم آباد آئے۔

شیخ بحالتِ بیماری خرم آباد میں مقیم تھے کہ احمدؔ پاشا ابن حسن پاشا سردار روم کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اور یہاں کے لوگ بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ شیخ بوجہ علالت مع چند خدمتگاروں کے وہیں رہ گئے تھے کہ احمدؔ پاشا مع فوج ظفرموج شہر میں داخل ہوگیا اب شیخ نے تنہا رہنا مناسب نہ سمجھا اور لشکر روم میں چلے گئے۔

سردار روم نے اپنی طرف سے ایک شخص کو وہاں کا حاکم مقرر کرکے وہاں سے مراجعت کی۔ شیخ بھی اُنھیں کے ہمراہ روانہ ہوے۔ بسبب ضعف و بیماری کرمان شاہاں میں آکر رہ گئے۔ جب بخوبی صحت ہوگئی تو کرمان شاہاں سے روانہ ہوکر بغداد پہونچے اور بغداد سے کربلاے معلّٰی و نجف اشرف میں تین سال مقیم رہے۔ یہاں سے بقصد مشہد و خراسان روانہ ہوے۔ مگر جنگ کا زمانہ تھا۔ تمام راستہ مخدوش ہورہا تھا مشہد نہ جاسکے پھر کرمان شاہاں میں چلے آئے۔ یہاں سے آذربائیجان آئے مگر یہاں بھی آب و دانے نے رہنے نہ دیا اردبیل و گیلان ہوتے ہوے شہر استارا میں جو کسی وقت شیخ کے اجداد کا وطن تھا، آئے۔

اُسوقت شہر استارا میں یحییٰ خاں حاکم تھا، بوجہ قابلیت علمی شیخ کی بہت قدر کی اور قیام کے لیے مُصر ہوا۔ شیخ اُسکے اصرار سے چند روز استارا میں مقیم رہے۔ یہاں شیخ کے چند ہمراہی طاعون میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوگئے اس وجہ سے شیخ وہاں سے روانہ ہوکر مازندراں آئے۔

جب شاہ طہماسپ فوج روم سے برسرپیکار تھا، افغانوں نے موقع پاکر سرحد خراسان

تک قبضہ کر لیا تھا۔ کچھ حصے کے مالک تو افغان ہو گئے تھے بقیہ حصہ خراسان پر ملک محمود سیستانی حاکم نیمروز جو شاہی نمکخوار تھا، بادشاہ سے منحرف ہو کر قابض ہو گیا اور خود صاحب سکہ و خطبہ ہو کر مشہد میں مقیم تھا۔ بادشاہ طہماسپ میں قوتِ محاربہ باقی نہیں رہ گئی تھی جو ملک محمود کو اسکی خودسری کی سزا دے سکتا۔ بادشاہ اسی فکر میں تھا کہ ایک جماعت استرآبادی اور چند دیگر گروہ آ آ کر لشکر شاہی میں شامل ہوئے۔ جب بادشاہ کی طرف جمعیت کافی ہو گئی تو شاہ طہماسپ اور ملک محمود میں مقابلہ ہوا۔ چند روز تک خونریز جنگ ہوتی رہی بالآخر ملک محمود قید ہوا اور قید میں ہلاک کر دیا گیا۔

جو گروہ اس جنگ میں شاہی لشکر کے مددگار اور شاہ طہماسپ کی فتح میں ساعی ہوئے اُن میں سے ایک گروہ کا سردار نادر قلی بیگ بھی تھا۔ آدمی شجاع و بہادر تھا۔ جب شاہ طہماسپ نے اس جنگ میں اسکی کارگذاریاں دیکھیں تو یہ خیال کر کے کہ شاید اسکی بدولت ایران کی زوالی حالت میں ترقی کی صورت پیدا ہو، نادر قلی کو خراسان کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ تقدیر راہبر تھی، رفتہ رفتہ موردِ الطاف شاہی ہو کر بہت بڑے مرتبے پر پہونچ گیا۔ یہاں تک کہ طہماسپ قلی خاں خطاب پایا۔ تمام ملکی انتظامات اُسکے ہاتھ میں دے دیے گئے اور اُس کو پورا استقلال ہو گیا۔ طہماسپ قلی خاں کی روزافزوں ترقی و سرفرازی دیکھ دیکھکر دوسرے امرا و ارکین دل ہی دل میں بُرا مانتے تھے۔ طہماسپ قلی خاں بھی اُن امرا و ارباب مناصب سے صفائی نہ رکھتا تھا، بلکہ اُن لوگوں کو خارِ راہ سمجھتا تھا۔

جب بادشاہ طہماسپ مشہد میں مقیم تھا، شیخ مازندراں سے روانہ ہو کر استرآباد ہوتے ہوئے مشہد آئے اور بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے بخیال اُنکے علم و فضل کے بہت عزت کی۔ شیخ ارکین سلطنت میں شامل ہو کر بادشاہ کے حضور میں رہنے لگے۔

لہ نادر قلی، امام قلی گڈریے کا بیٹا تھا۔ ۱۱۰۰ہجری میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں بہت غریب شخص تھا۔ ایک عرصہ تک لٹیروں کے گروہ میں رہ کر لوٹ مار سے گذر اوقات کرتا رہا۔

ماہ صفر ۱۱۴۲ ہجری میں اشرف خاں افغان محمود شاہ قندھاری کا چچازاد بھائی فوج لیکر خراسان کی طرف متوجہ ہوا۔ بادشاہ طہماسپ طہماسپ قلی خاں معہ دیگر امراء و ارکین فوج موجودہ مشہد لیکر بقصد مقابلہ روانہ ہوے۔ بادشاہ نے شیخ کو بھی ہمراہ چلنے کا حکم دیا۔ مجبوراً منزل اول تک شیخ ہمراہ رہے مگر معذرت کر کے عقب لشکر بالمینان روانہ ہوتے رہے۔ شیخ کو شہر سبزوار سے تپ آنے لگی۔ اعفان میں پہونچکر ٹھہر گئے۔ جب افاقہ ہوا تو شہر سارا مازندران میں آئے یہاں سے چند روز کے بعد طہران چلے گئے۔

اشرف خاں افغان بعد شکست فارس کی طرف بھاگا۔ طہماسپ قلیخاں مع فوج اُسکے عقب میں مامور ہوا۔ شیراز میں پہونچکر افغان و طہماسپ قلیخاں میں پھر جنگ ہوئی وہاں بھی افغان کو شکست ہوئی۔ پندرہ روز کے بعد خطۂ لار میں پہونچا وہاں سے بھی شکست کے بعد قندھار اور قندھار سے بلوچستان پہونچا۔ ہر جگہ اسکے ہمراہی کم ہوتے جاتے تھے بلوچستان میں پہونچنے پر صرف دو تین ہمراہی باقی رہ گئے تھے۔ پسر عبداللہ بلوچ نے اشرف خاں افغان کو قتل کر کے اُسکا سر مع ایک وزنی ہیرے کے جو اُسکے بازو پر تھا طہماسپ شاہ کے پاس بھیجدیا۔

طہماسپ قلی خاں اشرف خاں افغان کو شکست دیکر فارس سے روانہ ہوا۔ عربستان و لرستان فیلی ہوتا ہوا اقلیم علیشکر میں آکر حاکم ہمدان و لشکر روم سے برسر پیکار ہوا اور فتح پائی۔ وہاں سے آگے بڑھا آذربائیجان پہونچکر رومیوں سے جنگ کی۔ تبریز کو رومیوں کے قبضہ سے چھوڑا لیا اور آب ارس کے ایک طرف قبضہ کر کے حکام مقرر کر دیے اور دوسری طرف امرائے روم سے صلح کر لی۔ قلعۂ ہرات خالی پاکر دشمن قابض ہو گئے تھے طہماسپ قلیخاں اُنکی طرف متوجہ ہوا اور قلعہ ہرات پر جا کر قبضہ کیا۔

شیخ طہران سے روانہ ہو کر اصفہان آئے۔ بادشاہ طہماسپ اُس وقت اصفہان میں موجود تھا۔ چھ ماہ تک بادشاہ کے حضور میں رہے۔ اس درمیان میں شیخ نے بادشاہ سے

چند مفید باتیں کہیں اور بارہا ایسی رائے دی جو باعثِ بقائے ملک و دولت تھی مگر موافق نہ پڑی[1]

نواحِ ہمدان میں کچھ لوگ خودسر ہو گئے اور قلعہ درست کیا تھا۔ بادشاہ طہماسپ انکی سرکوبی اور بقیہ[2] آذربائیجان کو چھڑانے کی غرض سے اصفہان سے روانہ ہوا۔ شیخ کو بھی ہمراہ لینا چاہا مگر شیخ سامانِ سفر درست نہ رہنے کا عذر پیش کر کے رہ گئے اور وہاں سے شیراز چلے آئے۔ چند روز شیراز رہ کر لار ہوتے ہوئے بندر عباس پہونچے اور انگریزی جہاز پر سوار ہو کر جدہ آئے اور ایک قافلہ کے ساتھ جدہ سے مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ ایک مدت کی تمنا (حج بیت اللہ شریف) پوری ہوئی۔

بادشاہ طہماسپ اصفہان سے روانہ ہو کر نواحِ ہمدان میں پہونچا۔ وہاں احمد پاشا سردار روم سے جنگ عظیم کے بعد صلح کر لی۔ احمد پاشا بغداد چلا گیا۔

اُدھر تو بادشاہ کا بہادر سپہ سالار طہماسپ قلیخاں جنگ اور دشمنوں کی سرکوبی میں مصروف تھا اِدھر یہ ضعیف العقل بادشاہ، طہماسپ قلیخاں کے مفتوحہ و مقبوضہ مقامات کھو رہا تھا۔

طہماسپ قلیخاں نے صلح ہمدان کو، جو بادشاہ نے احمد پاشا سے کی تھی نامنظور کر دیا۔ اور اسی نقص کی وجہ سے طہماسپ شاہ کو تخت سے اتار کر اُسکے بیٹے عباس کو جو صرف چند ماہ کا تھا بادشاہ نامزد کر لیا۔ پھر آپ بطور نائب سلطان انتظام سلطنت میں مصروف ہوا۔

۱۱۴۵ ہجری میں جب شیخ بعد حصول شرف حج بیت اللہ شریف بندر عباس میں واپس آئے

---

[1] اگرچہ وہ مفید باتیں جو شیخ نے کہی تھیں معلوم نہیں ہوئیں کہ کیا تھیں مگر صورت حال سے یقین ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو وہ باتیں طہماسپ قلی خاں کے خلاف تھیں جس وجہ سے شیخ کی طرف سے بھی طہماسپ قلیخاں مکدر تھا۔ اور اُسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کو عمر بھر کے لیے ایران چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

[2] یہ وہی بقیہ آذربائیجان ہے جسکی نسبت طہماسپ قلیخاں نے سرداران روم سے مصالحت صلح کر لی تھی۔

[3] ملاحظہ ہو تاریخ ایران مولفہ منشی حسینی مدرس مطبوعہ ۱۸۴۲ء مطبع اردو اخبار پریس دہلی۔

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- سیدلکن جو رنی ودونس
- عربوں کا فن تعمیر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- اشاعت عمر
- عصائے پیری
- اقبال دلھن
- حسن معاشرت
- بچیوں سے دو دو باتیں

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر
- وکیل نسواں

منشی سعید احمد
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- حیات صالح

مولوی عبد الرزاق
- نظام الملک طوسی
- البرامکہ

حافظ عبد الرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند

پروفیسر شہباز مرحوم
- کلیات نظیر اکبرآبادی
- زندگانی بے نظیر

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابو البشر
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- قوت خیال
- اصول خانہ داری

منشی حسن الدین خوش
- جمیلہ خاتون
- قومی گیت
- زنانہ خطوط
- لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم
- تاثیر صحبت
- حوران جنت
- رفیق مرزا
- ناصح مشفق

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ
- المدنیۃ والاسلام

پروفیسر نواب علی
- تذکرۃ المصطفیٰ
- معارج الدین

مہاشے پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم
- مہاتما بدھ
- خدا اور روح
- مارٹن لوتھر
- سیرۃ المستورات
- بچوں کی کہانیاں

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المعلمین
- معیار الاخلاق
- تنقید لطیف
- تربیت اولاد

سید رفیع موہانی
- تاج ونشان
- دستار وکلاہ
- گنج شائگان

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا
- شمع وشاعر
- بلال
- شکوہ
- جواب شکوہ
- نالۂ یتیم
- فریاد امت

نیاز فتح پوری
- ایک شاعر کا انجام
- عائشہ صدیقہ
- جذبات بھاشا

منشی پریم چند
- پریم پچیسی
- سیرہ روش

سیماب اکبرآبادی
- نبت الرسول
- جام کوثر
- بہشتی جھومر

ارشد تھانوی
- حسن تخیل
- بیاض ارشد

سید ابراہیم عجمی
- جاپان
- جنگ روس وجاپان

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ با تصویر
- ” بلا تصویر
- روزنامچہ
- تسخیر مہر وقمر
- رسول کی عیدی
- پیاری ہتکڑی
- اتالیق خطوط نویسی
- گلا گھونٹ
- اسلام کا انجام
- بیوی کی تعلیم
- انتخاب توحید
- میلاد نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں
- فلسفۂ شہادت
- غدر دہلی کے افسانے
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- جگ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- اسرار
- کم ٹو موت
- سیر دہلی

مولوی مصباح الدین
- الہاردن
- محاربہ فرنس وپرشیا
- مصباح الادب

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل)
- حسن سرور ”
- دیول دیوی
- گورا
- نیل کا سانپ
- جعفر وعباسہ
- اختر وحسینہ کامل

مولانا راشد الخیری
- منازل السائرہ
- شام زندگی
- الزہرا
- ستارۂ صبح کے آنسو

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس
- قصائے مغرب

مولوی معین الدین
- اورنگزیب
- بہ مزاج شوہر
- راکھ ئیکم

سلطان حیدر جوش
- ابن مسلم
- نواب فرید
- اتفاقات زمانہ
- مساوات

مشہور مصنفین لکھنؤ

منشی امیر مینائی مرحوم
- صنمخانۂ عشق — ے
- مرآۃ الغیب — ۱۲ر
- خیابان آفرینش — عہ
- خطوط منشی امیر احمد — ۸ر

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی — عہ
- ابو بکر شبلی — عہ
- خواجہ معین الدین — ۶ر
- عصر قدیم — ۸ر
- حروب صلیبیہ — ۶ر
- تاریخ سندھ — ۱۲ر
- قرۃ العین — ۱۰ر
- تاریخ یہود — ۱۰ر
- ملکہ زنوبیہ — ۳ر
- الحکم بالرفاعیہ — ۳ر
- آغائی صاحب — عہ
- سکینہ بنت حسین — ۶ر
- مخدرات (مجلد) — عہ
- تذکرہ مشاہیر عالم — ۸ر
- زوال بغداد — ۸ر
- غیب دان دلہن — عہ
- حسن بن صباح — ۶ر
- فسانۂ قیس — ۳ر
- مقدس نازنین — عہ
- قیس و لبنیٰ — ۸ر
- ایام عرب — ۸ر

- حسن انجلینا — ۸ر
- منصور موہنا — ۸ر
- شہید وفا — ۵ر
- دلکش — ۹ر
- دلچسپ کابل — ۸ر
- سیف و قلم — ۴ر
- ماہ ملک — عا
- شوقین ملکہ — ۸ر
- ملک العزیز ورجنا — ۸ر
- یوسف و نجمہ — ۸ر
- زیاد و حلاوہ — ۸ر
- رومتہ الکبریٰ — ۸ر
- فلورا فلورنڈا — عا
- زمانۂ اسلام — ۳ر
- فردوس بریں — ۵ر
- آغا صادق کی شادی — ۱۰ر
- بدر النساء کی مصیبت — ۳ر
- حسن کا ڈاکو — ۸ر
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- خوفناک محبت — ۸ر
- الفانسو — ۱۲ر
- فلپانا — ۸ر
- فاتح مفتوح — ۸ر
- ہندوستان کی سوتیلی — ۸ر
- سسرال کی دنیا برسی — ۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین — ۶ر
- حاجی بغلول — ۸ر
- پیاری دنیا — ۱۰ر
- طلسمی فانوس — عا
- طرحدار لونڈی — ۸ر
- میٹھی چھری — ۲ر
- کایا پلٹ — ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- آتشو — ۶ر
- بچھڑی دلہن — ۸ر
- کرم دھم
- پی کہاں — ۶
- کامنی — ۸ر
- جام سرشار — عہ
- خدائی فوجدار — عا
- فسانۂ آزاد — للعہ
- سیر کہسار — صہ

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق — ۸ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- عالم خیال — ۶ر
- سیکفرڈ لوسی (مجموعۂ نظم) — ۲ر
- حسن — سانس اینڈ ڈیلیپ — ۶ر
- بہار — برسات (دعہر) — ۸ر

جلال مرحوم
- مضمونہائے دلکش — عہ
- نظم نگاریں — عہ
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث — ۶ر

مرزا رسوا بی اے
- امراؤ جان ادا — ۲ر
- لیلیٰ مجنوں — ۸ر
- نوبہار — ۲ر

جوالا پرشاد برق
- دنیا النبی — ۱۰ر
- ماہ جبیں — ۱۰ر
- بنگالی دلہن — ۱۲ر
- پرتاب — ۶ر
- شررقہ غرب — ۶ر
- بروک — ۵ر
- ہیملو — ۶ر
- اہنی — ۹ر

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر — صہ
- اورنگ زیب — صہ

خواجہ عشرت
- زبان دانی — ۴ر
- اصلاح زبان اردو — ۴ر

مولانا عبدالشکور
- اسد الغابہ — عہ
- علم الفقہ — للعہ

علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام حصہ اول — عہ
- ” حصہ دوم — ۱۲ر
- فن ہیئت — ۸ر
- فن کمیشری — ۶ر

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن — ۸ر
- شباب لکھنؤ — ۸ر
- مرقع اودھ — ۶ر

مسٹر عبدالماجد
- فلسفۂ جذبات — عہ
- فلسفۂ اجتماع — عہ
- غذائے انسانی — ۲ر
- فلسفہ کی تعلیم — ۲ر
- زود پشیماں — ۸ر

مشیر حسین قدوائی
- ذکر طیب محمد عربی — ۱۰ر
- شمشیر — ۸ر
- عرض حال — ۱ر
- جذب دل — ۶ر
- حاکم و محکوم — ۴ر

مسٹر انیس احمد
- ابرو کی کامیابی — ۶ر
- بحری جنگ — ۸ر

مطبوعات الناظر پریس
- قواعد اردو — عا
- کلیات محسن — ۸ر
- محاربات صلیبی — عہ
- رموز فطرت — عا
- ازواج الانبیاء — ۸ر
- تسخیر فرانس — ۸ر
- واقعات کربلا — ۸ر
- الاحسان — ۶ر
- سلاطین ترکی — ۴ر
- حیات نظامی — ۴ر
- بلبل و شبنم — ۳
- سیکفرڈ لوسی — ۲ر
- انقلابات زمانہ — ۱ر
- شوکیہ — ۱ر
- نادان خدایت — ۱ر
- مصنوعی شہر — ۲
- زود پشیماں — ۸ر
- زہار — ۸ر
- خوان دعوت — عہ
- کنولا — عا
- واقعات انیس — عا
- جمیلہ کی ناکامیابی — ۸ر
- جواہر التفاسیر — ۸ر
- خیالات آسمان — ۱۲ر
- خواب شگفتہ — عہ
- نشتر — عہ

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۱۱ جلد ۱۷ یکم نومبر سنہ ۱۹۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰ جلد ۱۲ یکم نومبر سنہ ۱۹۱۷ء

عالمِ خیال

(ایک غیر فلسفی نقاد کی نظر سے)

دنیا کی ترقیات نے جس درجہ انسانی عقل کو جلا دی ہے اُسکی غیر محدود قوتیں اور مخفی استعدادات اُسی تناسب سے ترقی کرتی رہی ہیں۔ آج وہ سمندر، پہاڑ، آگ، پانی، ہوا، اور زمین جیسی متضاد اور عظیم الشان ہستیوں کے بڑے حصے پر کامل قبضہ و اقتدار رکھتا ہے اور کچھ ہی دن جاتے ہیں جبکہ آسمان کے تارے اُسکے حلقۂ غلامی میں داخل ہو جائیں گے۔

گذشتہ صدی کے حیرت انگیز انکشافات اور موجودہ جنگ کے محیر العقول کارنامے دنیا کی بڑی سی بڑی پُرشوکت و جبروت ہستی کو انسان کے آہنیں عزم کے سامنے ایک ذرۂ حقیر کی برابر بھی مرتبہ نہیں دیتے اور اگر رفتار ترقی یہی جاری رہی اور مشیت الٰہی کو انسانی اقتدار کی تکمیل ہی منظور ہو تو کوئی شبہ نہیں کہ آج سے ایک صدی بعد دنیا کی صورت پہچان نہیں پڑیگی، اور آج کے علما و فضلا اُس دورِ کمال میں طفل مکتب نظر آئینگے۔

یقین ہوتا ہے کہ اگر انسان کا اقتدار یوں ہی ترقی پاتا رہا تو بالیقین وہ ایک روز ارض و سما کی تمام قوتوں سے زیادہ قوی، زمین و آسمان کی تمام طاقتوں سے زیادہ زبردست طاقت ہو جائے گا۔ مگر کیا ان تمام چیزوں پر انسان کا اقتدار اُسکی عظمتِ کامل کا ثبوت ہے؟ کیا اس سے زیادہ بلند، اس سے رفیع و اہم کوئی اور منزل نہیں؟

جن امور کی طرف میں اب تک اشارہ کر رہا تھا اُن میں سے غالباً سب مادی ہیں اور اسی وجہ سے انسان کے مطمح نظر یا انتہائے عروج کی دلیل نہیں۔ دنیا کچھ اور بھی چاہتی ہے جو یقیناً اس سے بھی زیادہ بلند و بالا ہے! اور دنیا کی تمام مادی ترقیات اُس مقصد اعظم کے سامنے ایک بے حقیقت اور جزوی شے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ کیا ہے؟ عالم خیال۔

موجودہ علوم و فنون کی روشنی میں اگر آپ اس امر کی جانچ کرنا چاہیں کہ انسان نے اس وقت تک قوتِ خیال کو کس حد تک ترقی دی ہے تو جہاں ایک طرف آپ کامیابیوں اور کامرانیوں کا انبوہ وافر پائیں گے وہیں دوسری طرف مایوسیاں بھی ایسی ہی سخت اور حوصلہ شکن ہیں کہ مایوس امیدوں کا سہارا نہایت ہی دشوار ہو جاتا ہے

. . . .

احسن ہمیشہ سے ایک طباع و ذہین لڑکا ہے۔ موقع ملنے پر وہ شرارت سے باز ہی نہیں رہ سکتا۔ اور ہر وقت ایک نئی تفریح کی فکر میں رہتا ہے۔ بارش صبح سے نہایت شدت سے ہو رہی تھی اور اب تک کہ دوپہر ہونے آئی بوند نہیں تھمی ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ سامنے سے واحد آتا ہے اور احسن یکبارگی اُس کا استقبال بڑے تپاک اور گرمجوشی سے کرتا ہے۔

"واحد دوست! آج تو تم اس پانی میں لوٹتے! ذرا کپڑوں پر مٹی لگی ہوتی، کپڑے بھیگے ہوئے، ہاتھ منھ پر کیچ بھری ہوئی، اور جوں ہی تم اُٹھ کے یہاں آنا چاہتے کہ ایک دم

سے پاؤں پھیلتا، اور دھم سے گر پڑتے! ہاہاہا! بھئی کس زور سے قہقہہ پڑتا؟ کیوں تیار ہو نا؟
"تم لاکھ کہو، میں ایسا نہ کروں گا!"

مگر باوجود اس شدید انکار کے ہم دیکھتے ہیں کہ واحد خود پانی میں کود پڑتا ہے۔ سارے کپڑے اُسکے خراب ہو جاتے ہیں اور جوں ہی وہ گھبرا کے اُٹھتا ہے؛ فوراً پھسلتا ہے، اور وہ بے قابو ہو کر گر جاتا ہے۔!

کیا انسانی ارادوں کی شکست اور قوتِ خیال کی فتح کی اس سے زیادہ واضح مثال چاہتے ہو؟ ہپناٹزم اور مسمرزم کے ادنیٰ کرشمے جو بالعموم شعبدوں کے حقیر نام سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ عالم خیال کی صناعیاں ہیں اور چشم بصیرت کے لیے اُنکی ظاہری قوت سے اُنکی باطنی اور مخفی استعدادات کی ایک زبردست شہادت ملتی ہے:

ہم روز سنتے ہیں کہ وزارت حال نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تجارت کے فلاں اصول کو وہ کبھی تسلیم نہیں کریں گے، اس لیے کہ ایسا کرنے سے لڑائی کا خطرہ یقینی ہے اور سلطنت اس وقت جنگ و جدل کی تاب نہیں لاسکتی۔ لیکن مسلسل و متواتر دلائل نے جو بصورتِ وفد، تقریر، و تحریر اُنکے کانوں تک پہونچایا، آخر اُنکی رائے کو بدل دیا۔ اور مخالفت کے بجائے حمایت کا دَور شروع ہو گیا۔

یہی تو روز کی باتیں ہیں کہ بعض طبعیتیں جو کسی قدر غم آشنا اور الم دوست ہوتی ہیں وہ گھنٹوں اور پہروں اپنی تکلیف روحانی کے خیال کے قیام و بقا کے لیے گردابِ خیالات میں خاموش پڑی رہتی ہیں اور اُن خیالات پریشاں سے لطف اُٹھاتی ہیں۔ ذاتی تجربے کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ بعض ایسے افراد بھی ہیں جو قطعاً ناممکن اور ناقابل یقین باتوں کے متعلق سوچا کرتے ہیں اور اس طرح سوچتے رہتے ہیں کہ گویا یہ سب واقعات ہوا ہی چاہتے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ وہ سب خیالات خوشگوار اور بامزہ ہی ہوں، نہیں، بلکہ سخت تکلیف دہ اور نہایت اندوہ گیں تخیل بھی اُنکے لیے ایسا ہی بامزہ ہے جیسا کہ فردوسِ بریں کی سیر۔

تصوف، جس نے تمام عالم کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ عالم خیال کے بحرِ بے پایاں کا زیادہ جلی اور غالباً (اکثر کے نزدیک) گلی پہلو ہے۔ اس کے اثر کا یہ حال ہے کہ آج بھی دنیا کی تین چوتھائی آبادی صوفی مشرب بتائی جاتی ہے۔ کشف و کرامت اُسکے پہلو بہ پہلو ہیں عالم بالا کی سیر کا دعوےٰ مسز اینی بسینٹ سے لیکر ادنیٰ تھیا سوفسٹ بھی کر سکتا ہے ـــــ کم سے کم امکان کا تو ہر شخص قائل ہے۔ اور ملائکہ و انبیاء سے استفادہ کاملین و بزرگان فن کے علاوہ ہمارے زمانے کے بھی اکثر بزرگوار فرمایا کرتے ہیں ـــــ کم سے کم فرما سکتے ہیں، وباللہ التوفیق۔

پھر اس سے بھی کچھ بڑھ کر، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ضعیف ولاغر اور ہر وقت اپنے خیالات میں مستغرق رہنے والا انسان کچھ عرصے تک اس عالم خیال میں بالکل ہی کھو جانے کے بعد دنیا میں آتا ہے اور دنیا والوں کی تمام صفات ملی و عادات طبعی کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ دنیا اُسکی آواز کو حقیر اور اُسکی طلب کو بے اثر سمجھتی ہے۔ گر وہی چار قرن کے بعد تمام ملک اپنے خیالات و محسوسات کو نئی قوت کے سامنے عاجزانہ پیش کرتا ہے اور مذہبِ جدید کے ساتھ تمام ملک کے خیالات و حالات بھی نئے ہو جاتے ہیں! (بدھ مذہب)

اس سے بھی زیادہ روشن اور زبردست مثال اُس مذہب کی ہے جسکی بنیاد اُس سرزمین پر ہوئی جس کا تعلق دنیا کے کسی حصے سے نہ تھا اور جسکے خیالات دنیا کے تمام اقوام سے بدتر، طبائع ناقابل اصلاح اور غیر صلاحیت پذیر، پھر کیا ہوا؟ ـــــ ہدایت کی آواز نے ایک برقی رو کی طرح تمام ملک کے خیالات میں نہ صرف سفید و سیاہ کا فرق کر دیا بلکہ عملاً اُنکے معیارِ تخیل کو اس درجہ بلند اور وقیع بنا دیا کہ بلا استثنا، تمام عالم نے اپنے سے زیادہ قوی خیال اور زبردست قوت کی اطاعت قبول کی، اور ایک گمنام صحرا تمام دنیا کے خیالات پر حکومت کرنے لگا! انقلابات کے یہ وہ آخری مناظر ہیں جن سے آگے ترقی انسانی دماغ میں نہیں سما سکتی۔ (مذہب اسلام)

ابتدائی حصے میں اُن مادی فتوحات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنکا علم تقریباً ہر شخص کو ہے، اور جنکی عظمت ہر قلب محسوس کرتا ہے، جنکا فائدہ ہر آنکھ دیکھ رہی ہے اور جنکے متعلق آیندہ کی توقعات اور بھی زیادہ خوش آیند، دلکش و منور شکل میں ہر دماغ سوچا کرتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت جن مثالوں کا ذکر ابھی ہم نے ختم کیا ہے اگر اُنکا مقابلہ اُن مادی ترقیات سے کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ریل و تار، فن معیشت و تجارت، برقی قوت اور ہوا پر اقتدار حاصل ہونا اُن کمالات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو عالمِ خیال کے غیر محدود میدان میں حاصل ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

موجودہ جنگ یورپ نے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ جن کاموں پر ہم فخر و مباہات کرتے ہیں، جنکی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں، جو قوم اور ملک کی میراث تسلیم کی جاتی ہیں، وہ امن و مسرت کے حق میں ایک مصیبت و لعنت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اُنکا وجود ارتقائے تمدن کے حق میں مہلک اور معاشرت کے لیے سم قاتل سے کم نہیں، اور حقیقی ترقی اور بلند حوصلگی کا جولاں گاہ اگر کوئی ہے تو "عالمِ خیال"۔

ہم نے جن مثالوں کا عنوانِ بالا کے تحت میں ذکر کیا ہے وہ ایک فلسفی عالم کی نظر میں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں، وہ جانتا ہے کہ جن واقعات کا ذکر قوتِ خیال کا کرشمہ قرار دیا گیا ہے وہ سب کے سب قوتِ خیال کے ماتحت نہیں ہیں اور نہ کوئی فلسفی اپنے مطالعے میں محض خیالات کا جائزہ لینا اور اُنپر رد و قدح، غور و پرداخت کرنا اپنا منتہائے آخر سمجھتا ہے۔ لیکن ایک فلسفہ سے ناواقف شخص بھی یہی سمجھتا ہے کہ پچھلی مثالیں محض عالمِ خیال اور قوتِ خیال کی نہ تھیں بلکہ خیال، ارادہ، اور روح یا روحانیت کے افعال کا ایک ایسا مجموعہ تھیں جنکو ایک دوسرے سے علٰحدہ کرنا، اُن میں سے ہر ایک کے حدود قائم کرنا، اور اُن حدود پر کامل اقتدار حاصل کر لینا انسانی کامیابی کا وہ عظیم الشان اور درخشاں کارنامہ ہوگا جسکے نقوش گو ہم کو اس مادی عالم میں نظر نہ آئیں، لیکن دنیا کے موجودہ کارناموں کا اُس سے

مقابلہ کرنا خود نوع انسانی کی عظمت و استعداد سے انکار کرنا ہوگا ـــــ اور یہ ایک ایسا گناہ ہے جسکا کفارہ نہیں !

لیکن باوجود اس قدر دماغ سوزی کے دل یہ ہی چاہتا ہے کہ عالم خیال کو واقعیت میں مدغم کرنے سے احتراز کیجیے اور غالب کا شعر پڑھیے اور بار بار پڑھیے

ہستی کے مت خیال میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے !

نورالرحمن (بچھراونی)

نغمۂ شاعر

ٹینی سن کا اخذ شدہ تخیل

(۱)

کھل چکا تھا جو بہت دیر برس کر بادل
نظر آتا نہ تھا اب سطحِ فلک پر بادل

نورپاشی تھی عیاں مہر کی تابانی سے
دہرِ زریں تھی شعاعوں کی درخشانی سے

تازگی چھائی ہوئی منظرِ دنیا پہ تھی
یا تجلی کی تری رخِ زیبا پر تھی

حسنِ فطرت کا پرستار، حقیقی شاعر
ناظرِ جلوۂ انوارِ حقیقی "شاعر"

دیکھکر وقت کی کیفیتِ لطف انگیزی
ہوگیا مائلِ جذباتِ ترنم ریزی

آیا کھیتوں کی طرف شہر کی گلیوں میں سے
جیسے آتی ہے مہک اَدھ کھلی کلیوں میں سے

اِک جگہ دیکھ کے خاموشی و تنہائی کی
اُسکے جذبات نے محسوس پذیرائی کی

بیٹھکر چھیڑ دیا نغمۂ شیریں اُس نے
کردیا موجِ ہوا کو اثر آگیں اُس نے

ہنس بدلی کے برابر جو اُڑا جاتا تھا
اک چمکتا ہوا تارا سا نظر آتا تھا

شعرستانہ اُسے مائلِ پرواز ہوا
وہ بھی وارفتۂ شیرینیِ آواز ہوا

تو چنڈول ہوا ایسا کہ پاس آ بیٹھا		کششِ نغمہ تھی بے خوف و ہراس آ بیٹھا

(۲)

"سانپ" مشہور جو ہے اپنی سَم آگینی میں		پیچھے جھاڑی کے تھا خاموش، قلم آگینی میں
ہو گئے تھے اثرِ نغمہ سے مسحور طیور		یعنی تاثیرِ ترنم سے تھے مخمور طیور
تھی ابابیل غذا کے لیے سرگرمِ شکار		ذوقِ موسیقی میں وہ بھول گئی عزمِ شکار
شکرا ڈوبا ہوا تھا حیرت و خاموشی میں		صید تھا پنجوں میں اور وہ تھا فراموشی میں
وہ بہارِ چمنستاں۔ جسے بُلبُل کہیے		ابدی عاشقِ حسنِ ازلِ گُل کہیے
آج محسوس کیا اُس نے گدازِ الفت		سوزِ موسیقی تھا اُس کے لیے سازِ الفت
نہ رہا یاد اُسے نالۂ موزوں اپنا		ہوا معلوم کہ کچھ بھی نہ تھا افسوں اپنا
بارہا باغ میں گو نغمہ سرائی کی تھی		زمزمہ سنجی و آشفتہ نوائی کی تھی
مگر اِس نغمۂ دلکش سے تھی محروم ہنوز		نہ تھا اندازِ تاثر ہی یہ معلوم ہنوز
کیونکہ یہ عالمِ فانی کا ترانہ ہی نہ تھا		خواب آلودہ زمانے کا فسانہ ہی نہ تھا

تھا تعلق اسے اُس عالمِ بیداری سے
روحیں جب ہوتی ہیں آزاد گرانباری سے
ارشد (تھانوی)

کیا کریں خُو سے کہ مجبور ہیں پینا ہے ضرور		ورنہ حسرت رمضاں کا یہ مہینا ہے ضرور
عمر ہی کیا ہے۔ وہ کمسن ہے ابھی نامِ خدا		اُنپہ مرنا ہو تو کچھ دن ہمیں جینا ہے ضرور
بیخودی بزمِ خرابات میں ہے وجہِ سکوں		اِک مگر کشمکشِ ساغر و مینا ہے ضرور
شوق جسکا نہیں ممکن دلِ ناداں کے بغیر		اُسکے دیدار کو بھی دیدۂ بینا ہے ضرور
تیری شوخی سکھے دیتی ہے کہ اے غمزۂ یار		تو نے دل آج کسی غیر کا چھینا ہے ضرور
ترکِ مے سے ہمیں انکار نہ ہوتا۔ لیکن		اب جو ناصح کو ہے اصرار تو پینا ہے ضرور
تیری گفتار سے ظاہر ہے کہ اے حسرت زار		دل ترا دردِ محبت کا خزینا ہے ضرور

(حسرت موہانی)

عکس سیرت

بارہا دوستِ ہوس در کمر یار زدم ۔۔۔ ہیچ در دست نیفتاد مگر چیز نیست

ایک صدا۔ کون کہتا ہے ہم میں سیرت اور کیرکٹر نہیں۔ ہم سیرت میں شہرۂ زمانہ ہیں بلکہ نیک سیرتی ہمارا خاندانی شیوہ ہے۔ ہم اُس کنبے میں سے ہیں جو اور باتوں کے علاوہ سیرت میں ایک خصوصیت ہی نہیں بلکہ ایک ممتاز شہرت بھی رکھتا ہے۔

اثر۔ مکرمنا! آپ یہ کس کو سنا رہے ہیں اور آپ کا مخاطب کون ہے؟ کیونکہ بظاہر کوئی مدمقابل دکھائی نہیں دیتا۔ خیر باشد۔ آخر یہ منادی کیوں ہو رہی ہے؟

دوسری صدا۔ آپ کو معلوم بھی ہے یہ کون صاحب ہیں؟ یہ رکن ہیں اُس خاندان کے اور ممبر ہیں اُس کنبے کے جو اس زمانے میں ایک خاص شہرت اور خاص عزت و امتیاز رکھتا ہے اور جس کے احترام و اکرام پر ایک ہی دو کو نہیں، صدہا کو ناز اور رشک ہے۔

اثر۔ جب تک میں کچھ اور نہ سن لوں، اور آپ ذرا تفصیل سے کام نہ لیں، میں اپنی طبیعت پر ان باتوں کے قبول کرنے کے واسطے زور نہیں ڈال سکتا۔ کیونکہ رفتہ رفتہ میرا یہ مذہب ہو چلا ہے کہ ہمارے بلند و بالا کی صدائیں بہت کچھ بے مطلب بھی ہوا کرتی ہیں۔

پھر دوسری صدا۔ آپ نے بھی کچھ تنگی طبیعت اور سوزان دماغ پایا ہے۔ آپ تفصیل کے بعد یقین کریں گے کہ دنیا میں ابھی صداقت اور مروت کی منڈیاں پائی جاتی ہیں جب اس پر صدہا شہادتیں زندہ موجود ہیں تو شک کرنے کی کیا وجہ؟

اثر۔ مجھے شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ایسا ہی ہوگا۔

دوسری صدا۔ ذرا ٹھہر جائیے میں آپ سے بھی انکی ملاقات کرائے دیتا ہوں۔ داشتہ آید بکار۔ دنیا میں کبھی نہ کبھی کام پڑ ہی جاتا ہے۔

اثرؔ۔ آپ کی مہربانی۔ میں تو اپنے تئیں اس قابل نہیں جانتا کہ خود کو بڑے بڑے چوکھٹوں کے قابل ثابت کرسکوں۔ میں کیا اور میری بضاعت کیا؟ من آنم کہ خود دانم۔

تیسری صدا۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ حضرت مروت پناہ سے اگر آپ کی بھی علیک سلیک ہو جائے تو زہے نصیب۔ بڑی ہی خوبی کے آدمی ہیں۔

اثرؔ۔ بہت اچھا۔

یہ سلسلۂ گفتگو ابھی بند نہیں ہوا تھا کہ ایک شمالی دریچہ کھلا اور ایک خوش پوش خدمتگار باہر نکلا۔

خدمتگار۔ حضورِ انور ابھی باہر تشریف لاتے ہیں ذرا دم لیجیے۔

بشیرؔ۔ میں تو کل شام کو بھی ہو گیا تھا۔ مجھے حضور سے ایک ضروری کام ہے۔ اگر آج بھی موقعہ نہ ملا تو میرا بڑا ہرج ہوگا۔

خدمتگار۔ آپ ذرا آ جائیے۔ ابھی حضور تشریف لاتے ہیں۔

ظہیرؔ۔ مجھے بھی ایک ضروری عرض کرنا ہے۔

خدمتگار۔ جلدی کیا ہے۔ ابھی آپ تشریف لاتے ہیں۔ لو وہ تشریف لے ہی آئے خود بدولت ایک آرام چوکی پر بیٹھ گئے۔ خدمتگار نے فرشی حقہ پیش کیا۔ ملنے والے لوگ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ بیٹھتے گئے۔

خود بدولت۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ جو صاحب میاں بشیر کے داہنے بیٹھے ہیں وہ کون ہیں؟ انھیں آج ہی دیکھتا ہوں۔

خدمتگار۔ یہ صاحب بھی حضور کی ملاقات کو آئے ہیں، شاعر ہیں ناظم ہیں۔ اثرؔ تخلص کرتے ہیں۔

خود بدولت (مصافحہ کرکے) بڑی مہربانی کی جو تشریف لاکر مشکور کیا۔

اثرؔ۔ اگرچہ مجھے کوئی کام تو نہیں تھا مگر اوصاف سُن کر میں بھی دشن کو حاضر ہو گیا اگر قبول افتد زہے عز و شرف۔

سیرت

بارہا دستِ ہوس در کمر یار زدم　　ہیچ در دست نیامد دگر چیزے نیست

ایک صدا۔ کون کہتا ہے ہم میں سیرت اور کیرکٹر نہیں۔ ہم سیرت میں مشہور ہی نہیں بلکہ نیک سیرتی ہمارا خاندانی شیوہ ہے۔ ہم اُس کنبے میں سے ہیں جو اور باتوں کے علاوہ سیرت میں ایک خصوصیت ہی نہیں بلکہ ایک ممتاز شہرت بھی رکھتا ہے۔

اثر۔ مگر آپ یہ کس کو سنا رہے ہیں اور آپ کا مخاطب کون ہے؟ کیونکہ بظاہر کوئی مدمقابل دکھائی نہیں دیتا [illegible] یہ منادی کیوں ہو رہی ہے؟

دوسری صدا۔ آپ کو معلوم بھی ہے یہ کون صاحب ہیں؟ یہ [illegible] ان میں اس خاندان کے اور ممبر ہیں اُس کنبے کے جو اس زمانے میں ایک خاص شہرت و خاص عزت و امتیاز رکھتا ہے اور جس کے احترام و اکرام پر ایک ہی دو کو نہیں [illegible] ہے۔

اثر۔ جب تک میں کچھ اور نہ سن لوں، اور آپ ذرا تفصیل سے کام نہ لیں، میں اپنی طبیعت پر ان باتوں کے قبول کرنے کے واسطے زور نہیں ڈال سکتا کیونکہ [illegible] مذہب ہو چلا ہے کہ بام ہائے بلند و بالا کی صدائیں بہت کچھ [illegible]

پھر دوسری صدا [illegible]

[illegible]

[illegible] ہی کرنے لگا، ایک موہوم سی بات ہے۔

بشیر۔ جناب تو لکھ دیں اثر کی ذمہ داری قدرت پر ہے۔

خود بدولت۔ بہت اچھا۔ آپ ذرا ٹھہریں، میں لکھے دیتا ہوں۔

سر ہوا ہوں۔ میرے والد اور
پوشیدہ نہ ہوگا۔ مجھے سردار اکرم الدین
ان سے پرانا رابطہ ہے۔

سے کچھ قرضہ لینا چاہتا ہوں۔

سے کی ضرورت نہیں۔ میرا نوکر (وارث) آپ کو
ے گا۔
خاص مہربانی ہے۔ مگر میں آپ کی تحریر چاہتا ہوں۔

خود بدولت۔ بہت اچھا۔ خط ہی لکھے دیتا ہوں۔" خود بدولت یہ کہہ کر اندر تشریف
لے گئے۔ اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد باہر آئے۔

خود بدولت۔ میاں بشیر یہ چٹھی لو، بڑے زور سے سفارش کر دی ہے۔ اگر بوٹے کریم کو منظور ہے تو تمہارا صاحبزادہ ضرور ہی کامیاب ہوگا۔ مگر جس طرح صاحب بہادر کہیں اسی طرح عمل کرنا۔ اور آج ہی شام کو یہ چٹھی پہونچا دینا۔

بشیر (شکریہ کے ساتھ) بہت اچھا۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔

خدمتگار۔ میاں بشیر! حضور تو روز دس پانچ چٹھیاں گھسیٹ ڈالتے ہیں۔ یہ توفیض کا دروازہ ہے۔ اور صاحب لوگ بھی ان کی تحریریں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ خدا حضور کو باایں فیض و مروت سلامت باکرامت رکھے۔

بشیر۔ آمین آمین۔ ثم آمین۔

خود بدولت۔ میاں ظہیر! آپ بھی اپنی چٹھی لے لیں۔

خود بدولت۔ شاکر! (خدمتگار) آپ کے واسطے چائے لاؤ۔ ہاں بشیر اور ظہیر بھی پئیں گے۔

اثر۔ جناب یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔

خود بدولت۔ تکلیف کیا۔ ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ کچھ نیا تردد نہیں کرنا ہے۔

اثر۔ نوازش۔

بشیر۔ میں تو کل بھی خدمت میں حاضر ہوا اگر جناب زنان خانے میں تشریف رکھتے تھے۔

خود بدولت۔ مجھے آپ نے اطلاع کیوں نہ کی میں فوراً آجاتا۔

بشیر۔ یہ جرأت تو نہ ہو سکی۔

خود بدولت۔ مکرم من! ایں خانہ خانۂ تست۔

بشیر۔ نوازش۔

خود بدولت۔ فرمائیے۔ کیا ارشاد ہے؟

بشیر۔ آپ جانتے ہیں میں ایک بے وسیلہ آدمی ہوں اور یہ بھی جناب پر بخوبی روشن ہے کہ میرے غریب خاندان اور آپ کے معزز خاندان کا پرانا رابطہ ہے۔ گو ہمیں ہمیشہ سے ایک نیازمندانہ دعویٰ اور خلوص رہا ہے مگر پھر بھی ایک واسطہ تو ہے۔ اب زمانے کی دستبرد سے حالت زبوں ہے۔ مسٹر فوکس بہادر کے نام ایک چٹھی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میرا لڑکا امسال انٹرنس پاس کر چکا ہے۔ شاید وہ اس کی ملازمت کا کوئی بندوبست کر سکیں۔

خود بدولت۔ بے شک میری واقفیت مسٹر موصوف سے ہے۔ اور آپ کے خاندان سے بھی رابطہ ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں سفارش لکھنے کے بعد یہ امید رکھنا کہ دوسرا اسے منظور ہی کرے گا، ایک موہوم سی بات ہے۔

بشیر۔ جناب تو لکھ دیں اثر کی ذمہ واری قدرت پر رہی۔

خود بدولت۔ بہت اچھا۔ آپ ذرا ٹھہریں، میں لکھے دیتا ہوں۔

ظہیر۔ میں بھی اسی قسم کا مطلب لیکر در دولت پر حاضر ہوا ہوں۔ میرے والد اور جناب کے اخی معظم کی پگڑیاں بدلی ہوئی تھیں آپ سے تو پوشیدہ نہ ہوگا۔ مجھے سردار اکرم الدین صاحب کے نام ایک سفارشی چٹھی چاہیے۔ آپ کا اُن سے پُرانا رابطہ ہے۔

خود بدولت ۔ کام کیا ہے؟

ظہیر۔ میں ایک جائداد کی کفالت پر اُن سے کچھ قرضہ لینا چاہتا ہوں۔

خود بدولت ۔ صرف یہی بات؟

ظہیر۔ ہاں جناب صرف یہی بات۔

خود بدولت ۔ بہت اچھا۔ چٹھی لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا نوکر (وارث) آپ کو ساتھ لیے جاتا ہے اور زبانی کہدے گا۔

ظہیر۔ یہ تو خاص مہربانی ہے۔ مگر میں آپ کی تحریر چاہتا ہوں۔

خود بدولت ۔ بہت اچھا۔ خط ہی لکھے دیتا ہوں۔ خود بدولت یہ کہکر اندر تشریف لے گئے۔ اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد باہر آئے۔

خود بدولت ۔ میاں بشیر یہ چٹھی لو۔ بڑے زور سے سفارش کر دی ہے۔ اگر مولائے کریم کو منظور ہے تو تمہارا صاحبزادہ ضرور ہی کامیاب ہوگا۔ مگر جس طرح صاحب بہادر کہیں اُسی طرح عمل کرنا۔ اور آج ہی شام کو یہ چٹھی پہونچا دینا۔

بشیر (شکریہ کے ساتھ) بہت اچھا۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔

خدمتگار ۔ میاں بشیر! حضور تو روز دس پانچ چٹھیاں لکھوا ڈالتے ہیں۔ یہ توفیض کا دروازہ ہے۔ اور صاحب لوگ بھی ان کی تحریریں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ خدا حضور کو باایں فیض و مروت سلامت باکرامت رکھے۔

بشیر۔ آمین آمین۔ ثم آمین۔

خود بدولت ۔ میاں ظہیر! آپ بھی اپنی چٹھی لے لیں۔

ظہیر۔ جناب نے ذرا زور سے لکھ دیا ہوگا؟

خدمتگار۔ حضور جب لکھا کرتے ہیں تو زور ہی سے لکھا کرتے ہیں۔ میاں ظہیر یہ کیا کہا؟ حضور کی تو یہ عادت ہی نہیں۔

ظہیر (تشکریہ کے ساتھ) نوازش۔

اثر۔ میں بھی سلام عرض کرتا ہوں؟

خودبدولت۔ اچھا۔ آپ جاتے ہیں۔ حضرت کبھی کبھی نوازش فرمایا کیجیے۔ اگرچہ مجھے شعر شاعری کا مذاق تو نہیں مگر جب کبھی آپ پھر آئیں گے تو دو چار شعروں کی سفارش بھی ضرور کروں گا۔

اثر۔ انشاءاللہ۔ خودبدولت اندر تشریف لے گئے اور حاضرین بھی باری باری چلتے ہوئے۔ اثر، بشیر اور ظہیر اتفاق سے ایک ہی راستے سے نکلے۔ چونکہ بشیر اور ظہیر کو بھی شعر شاعری کا کچھ چسکہ تھا اس واسطے راہ میں مزید ربط وضبط کی باتیں ہونے لگیں۔

بشیر۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ حضرت اثر کی بھی زیارت ہوگئی۔

اثر۔ تسلیم۔ فقس علی ہذا۔

ظہیر۔ کیوں جناب انگریزی تو جانتے ہیں۔

اثر۔ ہاں کچھ شُد بُد۔

ظہیر۔ خودبدولت نے دونوں چٹھیاں انگریزی میں لکھی ہیں، اور ہم دونوں فارسی خواں ہیں۔ کیا آپ کی رائے میں یہ اچھا نہ ہوگا کہ لفافے کھول کر آپ سے پڑھوا لیں؟

اثر۔ یہ کیوں کرتے ہو۔ جو لکھا ہوگا اچھا ہی لکھا ہوگا۔ لفافے بند ہیں، ممکن ہے کہ کھلنے میں لفافہ پھٹ جائے۔

ظہیر۔ صرف اس واسطے کہ جس قسم کی سفارش ہو میں بھی اُسی نہج پر گفتگو کروں۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

بشیر۔ میں تو یہ صلاح نہ دوں گا۔

اثر۔ میرا بھی آپ سے اتفاق ہے۔

ظہیر۔ میری یہ رائے نہیں۔

اثر۔ بہت اچھا۔ میں آپ کی اجازت سے پڑھ دوں گا۔ مگر اس کا الزام مجھ پر نہ ہوگا۔ کیونکہ دوسرے کی چٹھی پڑھنا دیانت اور تہذیب کے خلاف ہے۔

ظہیر۔ بہت خوب۔ مجھ ہی پر ذمہ داری سہی۔

اثر۔ مگر لفافہ آپ ہی کھولیں۔ یہ جرأت میں نہ کروں گا۔

ظہیر۔ بہت اچھا۔ میں ہی کھولتا ہوں۔ یہ لو۔

حضرت اثر انگریزی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ پڑھنے کے ساتھ ہی اُنکے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ ایک دفعہ نہیں، دو تین دفعہ چٹھی پڑھی۔ اب نہ کچھ مُنھ سے بولتے ہیں نہ سناتے ہیں۔ کچھ ہکا بکا سے رہ گئے۔

ظہیر۔ مولانا! مطلب تو سنا دیں۔

اثر۔ بھئی الفاظ سنانے کا ذمہ دار ہوتا ہوں مطلب کسی اور سے سن لینا۔

ظہیر۔ کیا آپ انگریزی صرف پڑھ ہی سکتے ہیں اور مطلب نہیں سمجھا سکتے؟

اثر۔ مکرم بندہ۔ سُناؤں تو کیا سناؤں؟ میری حالت دگرگوں ہے۔

ظہیر۔ یہ کیوں؟ آخر اس میں لکھا کیا ہے؟

اثر۔ لکھا ہے خاک۔

ظہیر۔ پھر بھی؟

بشیر۔ حضرت اثر تو ایسے متأثر ہوئے ہیں کہ بولتے ہی نہیں۔ الٰہی چہ سرّاست؟

اثر۔ دل نہیں چاہتا کہ ایک لفظ بھی مُنھ سے نکالوں۔ یہ ہے ہمارے لیڈروں ہمارے امیروں، محترموں اور ہمارے ممتاز لوگوں کی سیرت اور عکس سیرت! کس ذمہ داری اور کس محبت اور کس زور و شور سے چٹھی لکھ کر دی، اور مضمون یہ!

ظہیر۔ آخر کچھ کہو گے بھی۔ سیدھے مطلب کیوں نہیں سنا دیتے۔ بلا سے کچھ لکھا ہو۔
اثر۔ پھر سنا ہی دوں؟
ظہیر اور کیا۔
اثر۔ لو سنو۔ اور خود اپنی قسمت اور اپنے مربی کی مروت کا فیصلہ کرو۔
"میرے محترم خان بہادر۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے۔ میرے اور آپ کے جو تعلقات ہیں، اگر میں باوجود ان تعلقات کے بھی آپ کو کسی آزمایش میں ڈالوں تو میرے لیے آپ کے مقابلے میں یہ ایک نازیبا حرکت ہی نہیں ہوگی بلکہ ایک قابل نفرت فعل۔
حامل فرامیاں ظہیر مجھے تنگ کرتا ہے۔ میں اُسے یہ چٹھی دیتا ہوں۔ وہ آپ سے کچھ قرضہ مانگتا ہے اور جائداد کو کفالت میں رکھتا ہے۔ قرضہ دینے کے واسطے ایک اچھے اعتبار کی ضرورت ہے میری رائے میں یہ شخص کوئی اعتبار نہیں رکھتا ایک لنگاڑا سا آدمی ہے مگر چونکہ وہ مجھے مجبور کرتا ہے۔ اس واسطے میں اُسے یہ چٹھی دیتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے قرضہ مانگتا تو میں تو نہ دیتا۔
اگر قرضہ دو بھی تو برادرِن! پوری ضمانت لینا۔ اور میں تو اسکے خلاف ہوں۔
آج تو کسی روز کا وعدہ کرکے رخصت کر دینا اور پھر کچھ دنوں تک کوئی ایسی کڑی شرط لگا دینا کہ میاں ظہیر پھر نہ آئیں۔ میری چٹھی پھاڑ دینا۔
آپ کا رقعہ پرسوں مجھے ملا تھا۔ آپ مجھے کیا سمجھاتے ہیں۔ میں نے اس خوبصورتی سے اُسے ٹال دیا کہ پھر تو شاید وہ آپ کے گلوگیر نہ ہو۔ زیادہ سلام۔
آپ کا صادق بھائی ایچ ایم۔ ٹی۔ ۳۱ مارچ ۱۷ء"
ظہیر تو سنکر حیران سا ہی نہیں رہ گیا، بلکہ مارے غصے کے آگ بگولا ہو گیا اور لگا ملا جیاسنانے۔
اثر۔ دیکھو میاں ظہیر! اب یہ موقع نہیں۔ تمہارے مربی کا عکس سیرت تو یہ پڑا۔ اب تمہیں حوصلہ کرنا چاہیے۔ اس کا اثر صرف یہ ہونا چاہیے کہ تم آئندہ ایسے لوگوں پر اعتبار نہ کرو۔

اور یہ چٹھی کام میں نہ لاؤ اور نہ اپنے خود بدولت کو جاکر کوئی ملامت کرو۔ کیونکہ اس میں اچھائی نہیں۔ گلو گیر کمینہ مباش۔

بشیر۔ حضرت یہ میری رام کہانی بھی پڑھ دو۔

اثر۔ کیا ان مایوسیوں اور ندامتوں کا میں ہی مبلغ ہوں۔

بشیر۔ خیر۔ آپ پر کیا الزام ہے؟" بشیر کی چٹھی کھولی گئی۔ مضمون یہ تھا:۔

"مائی ڈیر فوکس! دیسی لوگوں کی عجب حالت ہے۔ جانتے نہیں کہ کہاں موقعہ سفارش کا ہوتا ہے اور کہاں نہیں ہوتا۔ میں آپ سے بارہا ظاہر کر چکا ہوں کہ ہماری سفارشی چٹھیاں محض نمائشی ہوتی ہیں۔

حامل ہذا کا بیشک ہمارے خاندان کے ساتھ پرانا تعلق ہے مگر صرف اس وجہ سے میں آپ کو تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر اسکے لڑکے کے واسطے جو انٹرنس پاس ہے آپ کچھ قیمت پر کر سکیں تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ خواہ مخواہ کسی اور کا حق مار کر کوئی موقعہ نکالیں۔ آپکا دوست۔ ایچ ایم۔ ٹی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۱۲ء"

بشیر نے سنتے ہی اثر کے ہاتھ سے چٹھی لے لی اور پھاڑ کر چلتے پانی میں پھینک دی۔ ظہیر بھی بشیر ہی کے نقش قدم پر چلا۔ یہ قصہ یوں پاک ہوا۔

در عشق تو باختیم دل و دیں		چیزے بمن ایں قمار نگذاشت

اثر۔ میاں بشیر و میاں ظہیر! یہ ہے ہماری قوم کے لیڈروں اور ممتاز افراد کا حال۔ یہ ہے انکی سیرت اور کیرکٹر کا اثر اور عکس۔ جس قوم کے ممتاز افراد میں اخلاقی جرأت نہ ہو، جنکے اقوال و افعال کی یہ قیمت اور یہ کیفیت ہو اُس قوم کی قیمت اور احترام بھی معلوم۔

ظہیر۔ اگر ہم کسی سے یہ قصہ بیان کریں تو شاید اُسے یقین نہ آئے۔ کیونکہ خود بدولت کا نام اس یقین دلانے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اُنکی کفالت ابھی بہت کچھ دینی اور معتبر ہے۔ مگر اندرونی حالت یہ ہے!

بشیر۔ حضرت اثر! ان لوگوں میں یہ بھی جرأت نہیں کہ صاف جواب دیں۔ بھلا انھیں کون سی مجبوری ہے جو اس قسم کی چالبازیاں کرتے ہیں؟ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر فوکس اور خان بہادر اکرم الدین کو خود بدولت پر کیا کچھ اعتبار ہوگا۔ کیونکہ کوئی شریف بھی اس کمینہ پن کی عزت نہیں کر سکتا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اثر۔ یہی تو ہماری قوم اور ہمارے ملک میں کمی ہے اور اسی کی بدولت تو ہماری یہ درگت ہو رہی ہے۔ جب یہ لوگ طرۂ خطاب و القاب پرست و فاخر ہو کر باتیں بناتے ہیں اور جب انکے منھ سے لیڈری کے نشئے میں دنیا بھر کے الفاظ نکل جاتے ہیں اسوقت اگر ان کے ایسے مواعید اور کرتوتوں کو بالمقابل رکھا جائے تو کون بشر انکے نمایشی اقوال و افعال سے مطمئن ہو سکتا ہے۔

بشیر۔ کوئی ان سے پوچھے تو سہی کہ اس بات کی ضرورت ہی کیا۔

اثر۔ یہ انکی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔ بات یہ ہے کہ "ہاں" اور "نہیں" کی فلسفی سے یہ لوگ واقف ہی نہیں ہوتے۔ "نہیں" کہنا جانتے ہی نہیں، اور "ہاں" میں کوئی صداقت کوئی عظمت اور کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سیرت اور کیرکٹر کی پہلی پہچان "ہاں" اور "نہیں" کی حکومت ہے۔ یا یوں کہیے کہ دوسرے الفاظ میں "ہاں" اور "نہیں" کا صحیح عمل ہی ایک صحیح سیرت اور مضبوط کیرکٹر ہے۔

ظہیر۔ قصہ کوتاہ، قوم کا شیرازۂ معاملات از سرتا پا بگڑ رہا ہے فیصدی پچانوے کا یہی رونا ہے۔ اور ممتاز لوگوں کی سیرت کا تو کچھ حال نہ پوچھو۔

بشیر۔ اس میں کلام نہیں۔

اثر۔ آپ کی وہ تعریفیں اور صدائیں کہاں گئیں؟

بشیر۔ ہم آپ سے شرمندہ اور نادم ہیں۔

ظہیر۔ خیر اسکا ذکر نہ کرو۔

اثر۔ نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا۔ اچھا سلام علیکم۔

راقم (شرم شرم شرم) بقلم پنجابی

سلطان الشہید حضرت میر مسعود قدس سرہ العزیز

خدا کی دین کا کیا پوچھنا۔ موسیٰ آگ لینے جائیں پیمبری مل جائے۔ آرمینا کے ایک لنگڑے چرواہے کو وہ چاہے ہفت اقلیم کا بادشاہ بنا کر دکھائے، اور کارسیکا کے ایک باشندے کو تاج خسروانی پہنا کر جزیرہ سنٹ ہلنا میں ایک پنجرے میں مقید دکھائے یہ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں اور بوالعجبیاں۔ لوگ چالیس چالیس اور پچاس پچاس برس ریاضتوں میں گزار دیتے ہیں ہنوز کشود کار نہیں ہوتی۔ محض ایک درویش کی صدائے شیئاً للہ کی ضرب ایسی کاری لگتی ہے کہ حضرت عطارؒ دوکان کا مال خدا کی راہ میں لٹا کر ما سوا اللہ کو بھول جاتے ہیں اور جملہ عالم انکی نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ سلطان ابراہیم ادہم کو قصر شاہی کی چھت پر شتر گم کردہ مسافر کی گفتگو اگر عالم ناسوت ولاہوت و باہوت پر حکمرانی دلاسکتی ہے، اور امام عبداللہ بن مبارک ایک کنیز کے عشق ظاہری میں شرالہ خوری کے بعد عارف باللہ کے مرتبہ کو پہونچ جاتے ہیں تو موجب حیرت و تعجاب کیا؟ دیکھو! مصر کے اس انیس سالہ نوجوان نے بادۂ وطنیت سے سرشار ہو کر بے حس، و سرد مہر یورپ کے قلب کو کیسا گرما دیا تھا، محض دس بارہ برس عملی زندگی میں رہ کر ایک مردہ قوم کے قالب میں لرزش حیات کی تازہ روح پھونک کر خود تو راہیِ عدم ہوا البتہ مصریوں کو حیاتِ نو دے گیا۔ اگر آج حضرتِ انور بے لیبیا کے لق و دق صحرا میں جنود آسمانی کا کھوج لگا کر اہلِ ایطالیہ کا قافیہ تنگ کرسکتے ہیں تو عین پانچویں صدی ہجری میں ایک نوخیز و نو آموز بچے نے چودہ برس کے سن میں وہ وہ کارنمایاں کر دکھائے تھے جنکی یاد اب تک پژمردہ دلوں میں نئی روح پھونکنے کو کافی ہے۔ وہ کون؟ ضلالت و گمراہی کو دُور کرنے والا، حق کی راہ میں سر کٹانے والا، علائق دنیاوی سے پاک حرص و طمع سے مبرا، بے لوث و بے لاگ، اسلام کا سچا خادم، متقی و پرہیزگار، عابد و زاہد،

با عمل صوفی، سید سالار مسعود غازی نور اللہ مرقدہ۔

زہے طالع اُس شہر کے جہاں کی سرزمین سے ایسے لعل بدخشانی و دُر یگانی کا ظہور ہو، زہے قسمت اُس زمانے کی جس زمانے میں ایسا گوہر یکتا کتم عدم سے معرض ظہور میں آئے۔ اجمیر کی اندھیر نگری میں اس ضلالت رم و جود کا ظہور رجب کی پہلی تاریخ کو ہوا۔ یعنی عفیفہ روزگار ستر معلّی خواہر سلطان محمود سبکتگیں کے بطن سے سید الشہدا میر مسعود غازی تولد ہوے۔ جناب کے والد کا اسم گرامی میر سید ساہو سالار بن عطاء اللہ تھا جنکو سلطان محمود غزنوی نے مظفر خاں حاکم ہر فرخ کی مدد کے لیے ایک جرار لشکر کی سرکردگی پر مامور کرکے ہندوستان روانہ کیا تھا۔ جس وقت حضرت ساہو سالار مظفر خاں کے پاس پہونچے تو بہت کچھ دشمنوں کا قلع قمع ہو چکا تھا جو دو چار راجہ یا زمینداران حلقۂ اطاعت میں آنے سے باقی رہ گئے تھے انکو مطیع و منقاد بنا کر میر ساہو اجمیر میں قیام پذیر ہو گئے۔ جب اطمینان حاصل ہو گیا تو غزنی سے انکی زوجہ محترمہ بی بی ستر معلّی روانہ ہوکر اجمیر میں ان سے آملیں جہاں حضرت سید الشہدا پیدا ہوے۔ کچھ عرصے کے بعد بمتابعت فرمان سلطانی انکو قلعہ کابر کی تسخیر کے لیے کشمیر کی سمت روانہ ہونا پڑا۔ کیونکہ وہاں کے باشندوں نے فرصت پاکر تمرد و طغیان پر کمر باندھی تھی۔ چنانچہ میر ساہو نے پہونچتے ہی انکو ایسی شکست فاش دی کہ سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور حلقہ بگوشی پر آمادہ ہوکر اپنے قصوروں کی معافی کے خواستگار ہوے۔ انکی خبر جس وقت سلطان محمود غزنوی کو ہوئی تو اُس نے بصلۂ حسن خدمات کابر کا خطہ سید ساہو سالار کو تفویض کر دیا۔ یہیں حضرت میر مسعود غازی کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کیا گیا اور انھوں نے یہیں رہ کر مدارج عرفانی طے فرمائے۔ فن سپہ گری و قواعد لشکر کشی سے واقفیت کلی حاصل کر لی تھی اور ہمہ اوقات نشۂ وحدت میں سرمست رہتے تھے حسن اتفاق سے سلطان محمود غزنوی بعزم تسخیر سومناتھ وارد ہندوستان ہوا۔ خبر پاتے ہی حضرت میر ساہو سالار جنکے سفینہ صفا کو ہنوز کی آسایش طلب خود غرضی آب و ہوا نے گدر نہیں ہونے دیا تھا،

فوراً اپنے نوعمر بیٹے کو مع چند ہزار سپاہ آزمودہ کار کے پادشاہ اسلام اور آقائے نامدار کی خدمت میں روانہ کردیا۔ حضرت میر مسعود زہد و تقویٰ سے آراستہ، کفر و ضلالت دور کرنے والی شمشیر آبدار زیب کمر کیے، کلمۂ حق ورد زبان، اس شان سے سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بہادری و شجاعت کے ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ سلطانی فوج کے پرانے آزمودہ کار رو باراں دیدہ افسر لوہا مان گئے۔ فتح سومناتھ کے بعد سلطان محمود اپنے ہمراہ ان کو غزنی لے گیا لیکن وہاں چندے قیام کے بعد حضرت مسعود کو دربار محمودی چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا۔ اصل یہ ہے کہ سبب کچھ بھی نہ تھا محض بات کا بتنگڑ بن گیا تھا۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت سلطان محمود سومناتھ کے سب سے بڑے بت کو لیکر غزنی روانہ ہوا تو ہند کے راجاؤں نے عقب سے چند نمائندے سلطان کی خدمت میں اس غرض سے روانہ کیے تھے کہ وہ دربار محمودی میں اذن حاصل کرکے ان لوگوں کی طرف سے یہ عرضیہ پیش کریں کہ اگر سلطان ان کے بت کو واپس دے دیوے تو اس بت کا ہم وزن سونا وہ پیشکش کرینگے۔ حسن میمندی کو پہلے سے گانٹھ لیا تھا۔ جب بھرے دربار میں یہ عرضداشت پیش ہوئی تو حسن میمندی نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ "ہمارا کچھ ہرج نہیں ہے ایک رقم کثیر خزانۂ شاہی میں آتی ہے۔ پتھر کا بت ہے احمقوں کو لیجانے دو۔" سلطان محمود بھی نیم رضامند ہوگیا۔ ایک طرف میر مسعود بیٹھے ہوئے تھے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور سیف زبانی سے کام لیکر عرض کیا "بڑے افسوس کی بات ہے کل روز قیامت میں ایک طرف آذر ہوگا جس کو 'بت تراش' کا لقب دیا جائے گا اور دوسری جانب سلطان محمود جس کو 'بت فروش' کے لقب سے یاد کریں گے" کلمۂ حق سن کر سلطان نے بت واپس کرنے سے یک لخت انکار کردیا۔ حسن میمندی کے یہ بات لگ گئی۔ خیر اس وقت تو پی گیا لیکن اب خفیہ درپے آزار رہنے لگا اور نیش زنیاں شروع کردیں۔ شدہ شدہ یہ خبر سلطان محمود کے کانوں میں پڑی۔ اس نے میر مسعود کو تخلیے میں بلا کر سمجھایا کہ بیٹا! کچھ دنوں کے لیے اپنے باپ کے پاس ہو آؤ انھوں نے بہت دنوں سے تمھیں دیکھا بھی نہیں ہے مشتاق دیدار

ہو رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت میر مسعود غزنی سے رخصت ہو کر کاہلر پہونچے۔ وہاں نخلانہ بیٹھا گیا۔ چندے قیام کرکے ایک لشکر فداکاروں اور راہِ خدا میں سر کٹانے والوں کا ہمراہ لیکر شرک و ضلالت و گمراہی کو دور کرنے کی خاطر روانۂ ملتان ہوئے اور وہاں فتنہ و فساد کی آگ کو بجھاتے اجودھن (پاک پٹن) پہونچے۔ اجودھن سے دلی کے راجہ کی آنکھ بچا کر قنوج پہونچ گئے یہاں چند روز فوج و لشکر کی آراستگی میں گزر گئے۔ جب کیل کانٹے سے فوج آراستہ ہوگئی تو دلی کے فتح کی ٹھانی۔ راستے میں سرکشوں کی سرکوبی کرتے دلی کے سامنے خیمہ زن ہوگئے۔ مقابل میں راجہ جیپال جس نے دلی کے تخت کو بچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا لشکر ڈالے پڑا تھا۔ ایک ماہ تک چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی لیکن کوئی فیصلہ کن جنگ نہ ہونے پائی بالآخر وہ دن بھی آگیا۔ حسن اتفاق سے چند امرائے دولتِ محمودیہ حسن میمندی وزیر سلطنت کی بدخوئی و کینہ پروری کے باعث عاجز آکر ہندوستان چلے آئے تھے اور وہ اسی روز میر مسعود کے لشکر سے آملے۔ گویا یہ کمک غیبی تھی جو عین گھمسان کے معرکے میں پہونچ گئی۔ ان میں سے ملک ہی تجھیار و میر سیف الدین و سید عزیز الدین و ملک دولت و میاں رجب زیادہ سربرآوردہ تھے۔ سرفروشان راہِ حق نے ابھی کمریں بھی نہ کھولی تھیں کہ شمشیر بکف ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور مردانگی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اسی معرکے میں میر سید عزیز الدین نے شربت شہادت نوش کیا اور حضرت میر مسعود کی پیشانی مبارک پر ہرگوپال پسر راجہ جیپال کے گرز سے ضرب آئی اور کئی دندان مبارک بھی شہید ہوگئے۔ بایں ہمہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ راجہ جیپال اور اُسکے لشکری میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ جیپال جس کی رگوں میں راجپوتی خون تھا اس نے ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے سے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا رشتۂ حیات منقطع کر دے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اس نے آگ میں پھاند کر جان دے دی۔ میر مسعود غازی کی جگہ اگر کوئی اور ہوا و ہوس کا بندہ، شہرت کا دلدادہ بہت بادشاہت کے بت کی پرستش کرنے والا، اور دنیاوی لذائذ سے متمتع ہونے والا ہوتا تو دلی کے تخت پر قابض ہو کر اپنی حکومت کا ڈنکہ بجوا دیتا۔ سکہ اپنے نام سے جاری کرتا اور خطبہ پڑھواتا، لیکن

وہاں تو دوسری ہی لو لگی ہوئی تھی - حق اور محض حق کی اشاعت ملحوظ خاطر تھی - ناقوس برہمن سے صدائے وحدت نکلوانی تھی - کرشن کی بانسری عرصے سے نہ بجی تھی - لوگ فریب کاریوں میں پڑ کر ظاہر پرست بن بیٹھے تھے - اُس لگانہ صفت مالک الملک لاشریک لہ کی مملکت میں بہت سے خود ساختہ حکمراں شریک کر دیے گئے تھے - انکو اپنے نور باطن و قوتِ ظاہری سے کتم عدم کو پہونچانا مقصود دلی تھا - جو شخص محرم راز ہو چکا تھا اور جسکی رسائی مقامات ارجمند تک ہو چکی تھی اُسکے لیے یہ فانی و طمع کارو عارضی جاہ و جلال و حکومت کی وقعت کیا ہو سکتی تھی - فوراً فتح دلی کی عرضداشت پیشگاہِ سلطانی کو روانہ کر کے سلطان محمود کے نام سے سکہ جاری کرا دیا اور خطبہ میں بھی اسی بادشاہ اسلام کا نام پڑھا جانے لگا - فتح کے بعد چھ مہینے انتظام کی درستی میں لگ گئے - بعدازاں حضرت سالارِ قافلۂ اسلام کو صوبۂ اودھ کے زیرنگیں لانے کا خیال پیدا ہوا - گو سب سے عظیم شہر انکے قبضۂ اقتدار میں آ ہی گیا تھا یعنی قنوج، تاہم اب غزواتِ اسلامی کو اور وسعت دیکر مشرقی ہند کے تاریک کدوں میں روشنیِ اسلام کے پھیلانے کا انھوں نے عزم فرمایا - چنانچہ دلی سے روانہ ہو کر میرٹھ میں قدوم میمنت لزوم آئے اور وہاں سے شہر قنوج میں قیام فرمایا جو اسوقت اسلامی لشکر کی بڑی چھاؤنی بنا ہوا تھا - لیکن قنوج کو آگے کی فتوحات کا مرکز ....

بنانے سے فاصلہ زیادہ پڑتا تھا، کمک و سامانِ رسد بآسانی پہونچنا دشوار تھا - اس لیے قصبۂ ستر کھ کو اس سعادت کے لیے منتخب فرما کر وہاں قیام پذیر ہو گئے - اور یہاں سے مختلف سمتوں کو افسروں و سرخیلوں کو روانہ کر کے دور دراز کے مقامات کو تسخیر کرنا شروع کیا - حضرت سلطان الشہید کے ہمراہ زیادہ تر آپ کے اعزا و اقربا تھے یا سردارانِ قبائل کابل اور انکے ہمراہی جنکو شوقِ اسلام پرستی کشاں کشاں لے آیا تھا - جن میں سے تقریباً سب نے راہِ حق میں جان دی اور شربتِ شہادت نوش کر کے حیاتِ جاودانی مول لی - جن کے مزارات و مقابر اب تک مرجعِ خلائق بنے ہوئے ہیں اور خوش عقیدہ لوگ کیا ہندو اور کیا مسلمان منتیں مان کر شیرینی و چادریں چڑھاتے ہیں، اور اُنکی مرادیں بر آتی ہیں - سب سے قبل حضرت سید الشہدا نے میر سیف الدین اپنے چچا کو بہرائچ سر کرنے

کو روانہ فرمایا اور انھوں نے بہرائچ، اُسکے ملحقات و دیگر مقامات کو فتح کرکے علم اسلامی اُس نواح میں نصب کیا۔ بعد ازاں ملک بھی بختیار کو کانور کی طرف چند سربازوں کو ہمراہ کرکے رخصتی کا اذن دیا۔ جنھوں نے کانور تک کے کل قصبوں اور دیہات کو فتح کرکے قصبہ مذکور میں شہادت پائی تیسرا لشکر سترکھ سے جنوب کی جانب میر حسن عرب کی زیر کمان قصبۂ بھریہ و اکارسی کو مغلوب کرنے کی تاکید فرما کر رخصت کیا۔ اور انھوں نے وہاں راہ حق میں سر دیا۔ چوتھا لشکر ظفر پیکر سید عزیز الدین کی سرکردگی میں گوپامئو کی طرف روانہ فرمایا اور سید موصوف نے گوپامئو و مضافات کو فتح کرکے اپنا مدفن قصبۂ مذکور کو قرار دیا۔ بعد ازاں ملک افضل کو مع اُنکے اعوانکے بقصد فتح بنارس روانہ فرمایا۔ اور وہ بزرگ وہاں تک جا وہاں کو سدھارے۔ اور ملک عمر وطول کو بسواڑے کی طرف فتح کرنے کو روانہ فرمایا جن کا مقبرہ قصبۂ بجنور میں موجود ہے۔ ان بزرگوں کے رفقا اور ہمراہیوں کے مزارات اکثر قصبات میں موجود ہیں مثلاً کسمنڈی میں سالار ہاشم کا مزار ہے بدوسرائے و کنتور کے درمیان سالار قاسم مدفون ہیں۔ اکثر شہدا قصبۂ سدھور میں بھی اپنی حق پژوہی کی داستاں سرائی کر رہے ہیں۔ گو نظروں سے نہاں ہیں۔

اس اثناء میں حضرت میر مسعود کی مادر شفقہ بی بی ستر معلّٰی کا انتقال ہوگیا اور آپ کے پدر بزرگوار میر ساہو سالار اُنکی نعش کو غزنی روانہ کرکے بیٹے کو دیکھنے سترکھ تشریف لے آئے یہاں میر موصوف اُس وقت پہونچے ہیں جب مفتوح مقامات کے باشندوں نے سلطان محمود غزنوی کی وفات کی خبر وحشت اثر سنکر چار طرف سے سرکشی و طغیان شروع کر دیا تھا۔ حضرت میر ساہو گو کبر سنی کی وجہ سے ضعیف ہوگئے تھے تاہم دست و بازو میں جوانی کے وہی دم خم باقی تھے۔ فوراً تلوار نیام سے نکال کر معاندان اسلام کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ تا آنکہ مانکپور کے آگے تک اپنی شمشیر زنی کا سکہ بٹھا کر سترکھ واپس ہوئے۔ یہاں چند ماہ بھی قیام نہ کرنے پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہکر جاں بجاں آفریں تسلیم ہوئے۔ اور آپ کا مزار پُر انوار اسی قصبہ میں قرار پایا جو اب تک موجود ہے۔ اور وہاں غالباً بیساکھ کے مہینے میں سالانہ میلہ بھی ہوتا ہے

لیکن افسوس کہ اب تک وہی پرانا ڈھچر قائم ہے۔ نئے خیالات کی جِلا اُسپر نہیں ہونے پائی نہ اُنکو کسی مفید تحریک کا موجب بنایا گیا۔ فی زمانہ قصبۂ سترکھ مردم خیز ہو رہا ہے۔ اگر وہ لوگ کسی بردست قومی تحریک کا اسے آلہ بنا دیں تو بیجا نہ ہوگا۔

چار ماہ کے بعد پھر ایک حرکت تمرد کی اقوام مفتوحہ و زمینداران دیہات و مواضعات میں موجزن ہوئی۔ جس میں سے خاص کر بہرائچ کے علاقے میں زیادہ سرگرمی کا اظہار ہوا۔ چنانچہ حالات پر واقف ہو کر میر سیف الدین حاکم بہرائچ نے حضرت میر مسعود غازی کی خدمت میں عرضداشت روانہ کرکے استمداد چاہی۔ حضرت میر جو ہر وقت سرفروشی کے لیے تیار رہتے تھے۔ اور اب کہ پدر بزرگوار بھی راہی ملک بقا ہو چکے تھے فوراً لشکر جرار لیکر بہرائچ کو روانہ ہو گئے اور تیرھویں رجب المرجب کو موضع جوگی پور میں پہونچ کر طبل جنگ بجوا دیا اور گھما گھمی کی لڑائی ہونے لگی۔ اعدا نے میر سیف الدین کو نرغے میں لے لیا تھا۔ حضرت میر مسعود نے فوراً میر نصر اللہ کو چند سواران نامدار لیکر یلغار کرنے کا حکم دیا اور خود آپ چبوترے پر کھڑے ہو کر جنگ کا معائنہ کرنے اور جنگ بازوں کے کرتب دیکھنے لگے۔ جنگ بڑا زور پکڑ گئی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ میر کارواں کے رفقا ایک ایک کرکے شربت شہادت پیتے جا رہے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے سالار سیف الدین ملک جاودانی کو سدھارے۔ اُنکے بعد میر نصر اللہ کو توال کی باری آئی اور بالآخر میاں رجب بھی پشت بہ زمین ہو گئے۔ حضرت نے سب کو اپنے دست مبارک سے دفن فرمایا۔ پریشانی کے آثار ذرا بھی چہرے پر نمایاں نہ تھے۔ جب دفن سے فراغت پائی تو خود اسپ صبا رفتار پر سوار ہو۔ ہاتھ میں صف شکن تلوار لے۔ فاتحہ اخلاص پڑھ کر تیر قضا بنکر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور سیکڑوں کو تہ تیغ بیدریغ کیا۔ لشکر اعدا میں تہلکہ مچ گیا۔ اسلامیوں کے پژمردہ دلوں میں شگفتگی آئی۔ ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمنوں کے پیر اُکھڑ گئے اور سب خستہ و پریشان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ لیکن کامل طور پر منتشر نہ ہونے پائے تھے۔ بعد فتح حضرت سید الشہدا قیام گاہ کو تشریف لائے۔ شکرانے کی دو رکعت نماز ادا کی۔ دوسرے

روز خیمہ میں تشریف فرما تھے کہ دشمنوں میں سے کسی کا تیر ایسا کاری سینۂ مبارک پر لگا کہ اُس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور حضرت کا وہیں مزار بنایا گیا۔ لیکن ابتدا میں قبہ نہ تھا۔ سلطان محمد تغلق کا جب اس طرف گذر ہوا تو اُس نے مزار مبارک پر قبہ بنوا دیا۔ اس وقت ایک بدعت یہ رائج ہو گئی ہے کہ نیزے اور چھڑیاں ہر سال مزار مبارک پر چڑھتی ہیں۔ صاحب اخبار الاخیار کا بیان ہے کہ یہ بدعت حضرت سید سالار مسعود غازی کے شہید ہونے کے چار سو برس بعد رواج پذیر ہوئی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک ہندو راجہ نے منت مانی تھی کہ اگر اُسکے اولاد پیدا ہو گی تو وہ ایک بڑا بھاری جھنڈا مع سونے یا چاندی کے پنجہ و پرچم زرنگار کے مزار مبارک پر چڑھائے گا۔ چنانچہ اُسکی مراد پوری ہوئی اور اُسکا دامنِ امید اولادِ نرینہ سے پُر ہوا۔ اُس نے ایک بہت بڑا علم مزار مبارک پر چڑھایا۔ اُسکی دیکھا دیکھی یہ رسم تمام شمالی ہند میں رائج ہو گئی۔ ہندوستان مراسم پرستی کے لیے شہرۂ آفاق تو ہے ہی۔ کس کس بدعت کو رویا جائے۔ کہیں آویزۂ قبہ کے کلس پر پھینک کر دعا کے مستجاب ہونے کی فال لیجاتی ہے، اور کہیں منت ملنے ہوئے بچوں کے بال تراش کر ضعیف العقیدہ لوگ اپنی وہم پرستیوں کو تسکین دیتے ہیں۔

حضرت سید مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب جناب امیر تک ابن حنفیہؒ کے ذریعہ سے پہونچ جاتا ہے۔ وہ صحیح النسب سادات علوی میں سے تھے۔ اسلامی دنیا میں وہ مختلف ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں مثلاً اطراف اودھ میں اُنکو 'غازی میاں' یا 'بالے میاں' کہتے ہیں کہیں 'بالا پیر' یا 'ہٹیلا پیر' کے نام سے لوگ پکارتے ہیں۔ دلی کے جوار میں 'پیر سلیم' اور خراسان میں 'رجب سالار' کے لقب گرامی سے مشہور ہیں۔

یوں تو مسلمانوں میں اعاظم سپہ سالار و شجاع فخر روزگار و یکتائے زماں جنرل بہت سے گذرے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے فی سبیل اللہ اپنی گردنیں کٹوائی ہیں اُن میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جن کو حضرت غازی مسعود سے ہمسری کا شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ قرن اول کے مسلمانوں کی شان جناب میں نمایاں تھی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جس طور سے حضرت خواجہ اجمیری

کو ہندوستان کی روحانی سلطنت کی فرمانروائی عطا ہوئی ہے اسی طرح سے شہدائے ہند کی سرغنائی اور پیشوائی کا فخر حضرت میر مسعود کو بارگاہِ ایزدی سے تفویض ہوا ہے۔ گو سات سو برس کا زمانہ گزر چکا ہے اس وقت تک گھر گھر غازی میاں کی نیاز سال میں ایک بار ضرور دی جاتی ہے لیکن اب زمانہ ہے ایسی رسومات میں تازہ روح پھونکنے کا۔ اصل غایت تو تھی قومی بزرگوں کی یاد قائم رکھنے کی اور آیندہ آنے والی نسلوں کو ہمت دلانے کی۔ وہ ثواب برائے نام حاصل ہوتی ہے البتہ سال میں ایک بار یا ہر ماہ میں مٹھائی منگا کر بچوں کو تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اور یہ رسم محدود رکھی ہے طبقۂ اناث میں، مرد ان میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہی طریقہ ہیرو ورشپ کا رکھا گیا ہے، انکو اپنی قوم کے بڑے بڑے لوگوں کے مجسمہ قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مبادا وہ بھی بمرور ایام ان مجسموں کی پوجا کرنے لگیں اور شرک کے مرتکب ہوں۔ یورپ میں یاد قائم رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی بڑے قومی یا مذہبی پیشوا کے نام پر دن کو نامزد کر دیتے ہیں اور اُس روز بڑے بڑے شاندار ڈنر ہوتے ہیں۔ لکچر دیے جاتے ہیں۔ بزرگوں کی سوانح عمریاں اور اُنکے کمالات و اوصاف و حالات اور کارگزاریاں بیان کرکے نوجوانوں کے قلوب پر اثر ڈالا جاتا ہے انکی ہمتوں اور عزموں کو اُکسایا جاتا ہے۔ اس وقت اکثر مقامات پر مذہبی تقریب کے انعقاد میں یہ طریقہ برتا جانے لگا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ایک دن حضرت میر مسعود غازی شہید کے نام سے نامزد کر دیا جائے اور اُس دن اُن شہدائے اسلام کی اس طرز نو پر یاد تازہ کر لی جایا کرے جو خدا کی راہ میں گردنیں کٹوا کر عمر جاوداں کے مزے لے رہے ہیں۔ عزیز (آسیونی)

ہجومِ شوق ہے دل میں مگر خاموش رہتے ہیں	چھپایا تھا یہ تم سے راز ہم نے آج کہتے ہیں
خدا جانے یہ اپنا حال کیا ہے ہجرِ جاناں میں	نہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں
خموشی کی عجب یہ گفتگو ہے وصل میں باہم	نہ کہتے ہیں وہ کچھ ہم سے نہ ہم کچھ اُن سے کہتے ہیں
نہ دکھلائے خدا دشمن کو بھی دوری کے یہ صدمے	جو ہم اُن سے بچھڑ کر آج کل مجبور سہتے ہیں
مقرر بے ادب ٹھیرینگے لیکن کیا کریں حسرت	رہا جاتا ہے حالِ دل اگر خاموش رہتے ہیں

حسرت موہانی

آنسو بھرا دامن

دنیا جہان میں رسم ورواج ہے کہ عید بقرعید کے سعید اور مسعود موقع پر دوست احباب اپنے اپنے متعارف اور روشناس رفقاے محبت کے ہاتھ گلے میں مبارک سلامتی کے ہار پھول ڈالتے ہیں۔ اور اس تحفۂ مسرت کو مایۂ عیش وعشرت جانتے ہیں۔

مگر اُنھیں اپنے نشۂ خوشی کے وفورِ سرور میں دوسرے کے دیدہ و دل کے لہولہان ہو جانے کی کیا پروا۔ اُنھیں تو اپنے مزے سے غرض، اپنے کام سے کام۔ اُنکے گوشۂ چشمِ التفات کی اِدھر نظر بھی نہیں ہوتی۔ کہ کسی حریصِ حُسنِ معاشرت کے دل اور آنکھ پر کیا بن گئی۔ اور کیوں ہو۔ اُنکی خودی بیخودی کی مولدت یا رنوازیاں تو صرف اُنھیں کے لطف ملطف کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں، کسی غیر کے دھڑکتے اور دُکھتے دل کی دردمندی کیا جانیں۔ چنانچہ کل کسی مستِ مئے عید کے ایک عید کارڈ نے میری غربت آشنا وحشت کے ساتھ بھی بدسلوکی کیوں کہوں، کفرانِ نعمت ہے، سہرو دبستاں کا سلوک کیا۔ دیوانہ ہوئے بس است۔ سارا عالم یاورفتگاں آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اور دُنیا تیرہ وتاریک ہو گئی۔

قسمت کی تہیدستی اور زندگی کی بیچارگی نسیم وطن کے اُن ٹھنڈے اور گرم جھونکوں کا اور تو خیر مقدم کیا کر سکتی تھی۔ بھرا ہوا دل اُمنڈ آیا۔ برسوں کا رونا روتی دھوتی آنکھوں میں جو دو چار بوند قطرے خشک لب دل کے خون پانی بنے رہے سہے باقی تھے آنسوؤں کے ساتھ بہ کر چھلک آئے۔ اور دامنِ یاس وحسرت کو مچل مچل کر ہنگامۂ محشر کی شوخیوں اور گرمجوشیوں کا عرصۂ وسیع بنا دیا۔

غریب کوتاہ ہاتھیں طبیعت کی تشنہ کام تنگ ظرفیاں بھی ملگجے تانگے کی صبا ونسیم کا سہارا لے کے اُٹھیں اور اُن پھولوں موتیوں کی بری بھگوئی چادر سے اپنی سوگوار حسرتوں کی اشک شوئی کرنے لگیں۔ آنسو بھرے دامن و آستیں کو بجائے قبر پوش مرحوم دیکھے گور گڑھے پر ڈالا اور دو چار لمبے لمبے ٹھنڈے ٹھنڈے دم سانس لیے کھینچے۔ سوزشِ نہاں کی آتش مدفون کو دہکایا سلگایا اور جلتی ہوئیں۔

آہ - دنیا میں آنکھیں روتی بھی ہیں اور دل ہنستے بھی ہیں، مگر یہ نہیں کہ جو آندھی بارش آئے طوفان اُٹھا دے - ندی نالے بہا دے - جو جھونکا لگورا چلے خواہ نسیمِ نکہت کا ہو یا موجِ صرصر کا جبر و قدر کے لُنجے اپاہج غریبوں فقیروں کی ہر مڑھی جھونپڑی کا ٹمٹماتا جھلملاتا چراغ بُجھا کے دم لے۔

میں وہ چراغ ہوں جسکو فروغِ ہستی نے　　قریبِ صبح کے روشن کیا بُجھا بھی دیا

نظم عید

سنتے ہیں ہر خوشی کے لیے یہ ضرور ہے　　سینے میں دل ہو دل میں سکوں صبر سے مزید
گھر ہو وطن ہو دوست ہوں خاطر ہو مطمئن　　گلشن ہو آشیانہ ہو اور ہو گلوں کی دید
جب یہ نہیں تو عیش و مسرت سب ایک ہیں　　فرقت میں ذکرِ وصل بھی ہے کلفتِ شدید
آئے جو عید بھی تو پیام وعید ہو　　دنیا کی ہر خوشی غمِ پنہاں کی ہے کلید
مردہ دلوں کو مژدۂ فرحت سے کیا غرض　　اُنکی بلا سے عید قریب آئے یا بعید
دل ہی نہیں کہ جس سے گلے مِلکے شاد ہوں　　کس کی نگاہِ لطف کو دکھلائیں شوقِ دید
کنجِ قفس میں کون ہے بلبل کا ہمنفس　　پھولوں کو کیا پڑی جو سنائیں نویدِ عید
یہ بھی پتہ نہیں کہ کہیں تھا بھی آشیاں　　اتنا ہوا چمن کو لُٹے عرصۂ مدید
دامانِ دل پہ نکہتِ گُل نیشِ خار ہے　　موجِ نسیمِ صبح قیامت کی ہے نوید
یادِ نفس کی آمد و شد ہے پیامِ غم　　جو سانس ہے وہ مرگِ مفاجات کا برید
شمعِ حیات ظلمتِ شب کے فروغ سے　　مہماں ہے کوئی دم کی سحر تک کی کیا امید
کم مائگی سے ایک متاعِ کمال بھی　　دل کی طرح ہے ہر کس و ناکس کی زر خرید
مونس ہے کوئی اور نہ کوئی ندیم ہے　　اک درد مند ہے تو یہی مسلکِ مجید
لازم ہے ہر بشر کو ہر حال خوش رہے　　ہر مجمعِ نشاط کا ہو ہمدم فرید
ہر بزم میں شریک مرنجاں مرنج ہو　　غربت کی ہر خزاں میں منائے بہارِ عید
اس واسطے دعا ہے کہ بیدل ہر ایک دوست　　بے لطف زندگی کے تو یوں رات دن جدید

جب تک ہے نصیب رہے دل کو خرمی
اللہ عمر بھر کے دنوں کو کرے سعید

یوں باغِ زندگی میں پھلے پھولے نخلِ دل
گلشن بھی ہنسکے کہدے کہ ھَل مِن مزید

پائے بہار بھی تو سعادت نسیم ہو
جو گُل کھِلے وہ سہرے کی لڑیوں کا ہو مرید

دیکھے جدھر چلادے ہراک دل کی آرزو
تارِ نظر ہو رشتۂ اقرب من الورید

کیفِ شباب عمر میں یوں مستِ عیش ہو
ہر شب شبِ برات ہو ہر روز روزِ عید

ابوالبیان بیدل
(شاہجہاں پوری)

دعوائے ہمسری میں حوالات ہو گئی
شکوہ انکی سی مساوات ہو گئی

ممکن ہے اس میں لگے نظر آفتابِ حشر
تاریخ گزٹ میں فردِ خطابات ہو گئی

بیرسٹری میں خدمتِ قومی ہوئی معین
پہلے سے بیش بیش رجوعات ہو گئی

انعام نقد مدِ مقابل نے دے دیا
بیکار ووٹروں کی مدارات ہو گئی

دیکھا جہاں ہجوم بزرگانِ قوم کا
سمجھے کہ آج سیرِ مزارات ہو گئی

پوچھو نہ کچھ مجالسِ ملت کا اژدہام
تسلیم ہم کو کثرتِ اموات ہو گئی

مدت سے شیخ جی کی زیارت کا شوق تھا
آج اُن سے میکدے میں ملاقات ہو گئی

حور و قصور دیکھیے اب کس کے کام آئیں
تکلیفِ زہد خوگرِ لذات ہو گئی

ساقی ترے تصرفِ باطن کو مرحبا
دو دن میں خانقاہ خرابات ہو گئی

ہو مژدۂ حیاتِ ابد اہلِ یاس کو
اُمیدِ مرگ نذرِ محالات ہو گئی

اُس چشمِ فتنہ بار کے قربان جائیے
خود اُن کی بزم مورد آفات ہو گئی

رسوا کیا درازیٔ چادر نے آپ کو
سعی حجاب کاشفِ حالات ہو گئی

جز قولِ بے عمل نہ ہوا ہم سے کچھ پیش
عمر عزیز صرفِ خرافات ہو گئی

ظفر علی خاں

یکے از اقوام جرائم پیشہ

(۵)

گذشتہ مضمون میں ایک تحریر پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اب اُسکے ایفا کا وقت ہے لیکن اس تحریر کی نقل کرنے سے پہلے چند واقعات صورتِ حالات کو ناظرین کے ذہن نشین کرنے کے لیے بطور تمہید بیان کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

میرے عزیز ترین دوست اور صحیح معنوں میں مخدوم محترم مولوی سید محفوظ علی صاحب بی اے رئیس بدایوں ایک نہایت ہی دیندار متقی اور راسخ العقیدہ بزرگ ہیں۔ آپ نے ۱۸۹۵ء میں علی گڈھ سے بی اے پاس کیا۔ علی گڈھ کے ممتاز گریجویٹوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین۔ منشی بشیر الدین۔ مولوی ولایت اللہ اور خود ظفر علی خاں سب آپ کے ہم سبق تھے اور سبھوں نے ساتھ ہی بی اے کی ڈگری لی۔ میر محفوظ علی صاحب کئی سال تک ابتداءً ریاست خیرپور سندھ میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے اور جب وہاں سے علیحدہ ہوئے تو حیدرآباد آئے۔ یہاں سے سٹرا بیین کی معرفت گورنمنٹ آف انڈیا کے ملازم ہو کر بربرہ (سومالی لینڈ۔ افریقہ) پہونچے۔ جہاں آپ کی حیثیت ایک چھوٹے موٹے گورنر سے کم نہ تھی۔ قطع نظر اس اعزاز اور معقول تنخواہ کے چونکہ آپ کا تعلق پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے تھا، احباب متوقع تھے کہ آپ کی یہ ملازمت آئندہ ترقی و عروج کا زینہ ثابت ہوگی۔

حیدرآباد میں ظفر علی خاں اور میر محفوظ علی صاحب ساتھ رہتے تھے اور یک جان و دو قالب کے پورے مصداق تھے۔ یہ روابط کسی کے لیے راز نہیں ہیں اس لیے کہ دکن ریویو کے واسطہ سے ایک عالم اُن سے واقف ہے۔ لہذا یہاں اُنکی تفصیل بالکل ضروری نہیں۔

البتہ ایک بات خاص طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں جو عام طور پر بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے اور جو میر صاحب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ سید محفوظ علی صاحب مضمون نگاری یا دوسری ادبی خدمات سے ہمیشہ کوسوں دُور رہتے تھے لیکن مبدأ فیاض نے اُن کے دماغ کو ادب و شاعری کے لیے ایسا موزوں بنایا تھا کہ اگر وہ اس سید ان کے مرد بنا چاہتے تو انشا پردازی میں آج اُنکا کوئی مثیل و نظیر نہ ہوتا۔ آپ کی صحبت سے ظفر علی خاں کو جس قدر فیض پہونچا اُسکے لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ایڈیٹر زمیندار کو زبان اُردو پر جو قدرت حاصل ہے وہ محض آپ ہی کے طفیل ہے۔ باشندگانِ پنجاب میں آج ظفر علی خاں کی سی نثر لکھنے والا دوسرا نہیں اور انکی نظم میں بھی جو صفائی شستگی اور روانی ہے اُسکی مثال نہ ملے گی۔ اور یہ سب اسی سید یا ایونی کے بدولت ہے۔ شاہانِ مغلیہ کے آخری دَور میں دہلی کے بادشاہ گر سید مشہور ہوئے تھے۔ ہمارے میر صاحب بادشاہ نہیں بنا سکتے ہیں تو شاعر اور انشا پرداز بنا دیتے ہیں۔

راقم الحروف کو جو ٹوٹی پھوٹی چند سطریں جوڑنا آتا ہے یہ بھی سب اسی سید زادے کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔ گو نا احسان شناسی ہوگی اگر یہاں اس بات کا اعتراف نہ کیا جائے کہ میر محفوظ علی صاحب کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر الناظر، خود ظفر علی خاں کا بھی اس بارے میں بہت ممنون ہے۔

سید محفوظ علی کے ساتھ ظفر علی خاں نے جو سلوک کیا ہے اُسکی تفصیل خود میر صاحب کے الفاظ میں ناظرین پڑھیں اور اندازہ کریں کہ جس شخص کے یہ کارنامے ہوں، خود غرضی اور بے اصولی میں اُسکا کیا درجہ ہونا چاہیے۔ وہو ہذا :—

مندرجۂ بالا سطور لکھکر کاتب کے حوالے کر دی گئی تھیں، اُسکے بعد سید محفوظ علی صاحب کی تحریر نکالکر دینا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ گوہرِ نایاب جسے دس برس سے بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا، لاپتہ ہے۔ اور بہت تلاش کرنے پر بھی افسوس ہے کہ نہ ملا گذشتہ

نمبر میں بریں امید یہ مضمون ملتوی رکھا تھا کہ کاغذات کے جس انبار میں یہ خط اور بعض دیگر قیمتی وثائق پچھلے چند سال میں کئی بار نقل مکان کرنے کی وجہ سے رل گئے تھے اُسکی از سرِ نو جانچ کی جائے گی تو یہ خط مل جائے گا۔ مگر ہنوز اس جستجو کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس لیے مجبوراً اُس تحریر میں جو واقعات مندرج تھے اُنکو اپنے الفاظ میں لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر اگر وہ خط ضائع نہیں ہوا ہے اور تلاش سے مل گیا تو ناظرین اُس سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

واقعات حسب ذیل ہیں:۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں ظفر علی خاں بحصول رخصت اپنے وطن گئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رخصت کوئی سیاسی اہمیت رکھتی تھی یا محض ذاتی ضرورتوں کی بنا پر لی گئی تھی۔ مگر جب وہ حیدرآباد واپس آئے تو اُنکو اپنے عہدے پر واپسی کا حکم نہیں ملا۔ اس واقعہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ ظفر علی خاں کے والد (مرحوم) منشی سراج الدین صاحب نے جو اُس وقت اخبار زمیندار نکال رہے تھے، اپنے اخبار میں بھی اس ناانصافی کی طرف گورنمنٹ نظام کو توجہ دلائی۔ مگر مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم ریاست حیدرآباد نے انکی تحریر پر بھی اعتنا نہ کی۔ اور ظفر علی خاں کو اپنی ملازمت سے مایوسی ہوگئی۔

اس سے متاثر ہوکر اُنھوں نے اپنے دوستِ قدیم میر محفوظ علی صاحب کو یاد کیا جو اُس زمانے میں برہ میں تشریف رکھتے تھے اور حیدرآباد سے برہ پہونچے۔ یہاں پہونچکر میر محفوظ علی صاحب کو آزادانہ زندگی اختیار کرنے پر ایسے شد و مد کے ساتھ اکھیڑ دیے اور اُنھیں بمبئی چلکر تجارت کرنے پر اس حد تک آمادہ کیا کہ مہینہ ہی بھر کے بعد جب ظفر علی خاں برہ سے ہندوستان واپس آنے لگے تو اُنکی رائے کے مطابق میر محفوظ علی صاحب نے بھی رخصت حاصل کی اور انکے ساتھ ہو لیے۔

اور بمبئی آکر کاروبار کی طرح ڈالی۔ ظفر علی خاں کے پاس گو روپیہ نہ تھا مگر باتوں اور اسکیموں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان اصحاب نے بمبئی کے ایک اور دوست کو شریک بنا کر "ٹائمس بلڈنگ" کا ایک حصہ کرائے پر لیا۔ اور TheOccidental & Oriental Trading Co کے نام سے تجارت شروع کی اور اسی تقریب سے دکن ریویو کا دفتر بھی حیدرآباد سے بمبئی

منتقل کرلیا گیا۔ میر محفوظ علی صاحب ابتداءً رخصت پر آئے تھے بعد چندے ظفر علی خاں کے مشورے سے اس میں مزید توسیع کرائی گئی۔ اور جب رخصت کا وقت بھی نہ رہا تو اپنے حبیب ورفیق کی رائے سے میر صاحب نے بالآخر استعفا بھی دے دیا۔ چند ہی روز بعد قسمت نے پلٹا کھایا اور مولوی عزیز مرزا مرحوم ہوم سکرٹری کے عہدے پر سرفراز ہوے۔ ظفر علی خاں کے وہ پہلے بھی مربی خاص تھے۔ چنانچہ اب پھر وہ برسر اقتدار ہوے تو اُنھوں نے ظفر علی خاں کو مجلس وضع آئین و قوانین کی رجسٹراری کا عہدہ نذر کیا اور تار دیکر طلب فرمایا۔ ظفر علی خاں نے بلا پس وپیش بلکہ میر محفوظ علی صاحب کے مشورہ و اجازت کے بغیر فوراً اسے منظور کرلیا۔ اور غریب میر محفوظ علی کو بانالاؤ خاں بمبئی کی گلیوں میں جوتیاں چٹخانے کے لیے چھوڑ کر خود حیدرآباد کا راستہ لیا۔ میر صاحب کاروبار کا نہ تو کوئی تجربہ ہی رکھتے تھے نہ حقیقتاً اُن میں وہ تجارتی ولولہ ہی تھا جو ہمارے پنجابی دوستوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ تاہم چونکہ معقول سرمایہ لگا چکے تھے، جسکا بیشتر حصہ ظفر علی خاں کی اولوالعزمیوں کے بدولت تجارت کے بجاے دراصل محض ظاہری طمطراق کی نذر ہوا تھا۔ اور ملازمت سے بھی مستعفی ہو چکے تھے اس لیے مجبوراً کچھ دنوں اسی کاروبار کے پھیر میں پڑے رہے۔ اور ناکامی و محرومی کے باوجود بھی شماتتِ ہمسایہ کے خوف سے گھر کا رُخ نہ کر سکے۔ ان نہایت ہی ناموافق حالات میں خدا جانے کتنوں نے خودکشی کرکے جانیں دے دی ہیں لیکن الحمدللہ کہ ہمارے محترم دوست کو مذہب حقہ کے غلبہ نے اس سخت مصیبت سے تو نجات دلادی تاہم وہ تجارت باختہ و دل شکستہ ہوکر اور دنیاوی تجربوں کی اُمنگ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہکر بالآخر کچھ عرصے کے بعد پاؤں توڑ کر گھر آبیٹھے۔ خیر سے گھر میں کافی جائداد موجود تھی ورنہ شاید عزت کی زندگی بھی نصیب نہ ہوتی۔"

میر محفوظ علی صاحب نے عین اُسی زمانے میں جبکہ وہ بہ قولِ خود، بمبئی کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے، وہ خط لکھا تھا جسکا خلاصہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اور جو واقعات کہ الناظر کے اس ڈیڑھ صفحے میں لکھے گئے ہیں اُنھیں میر صاحب نے پورے بیس صفحے پر پھیلایا تھا اور

ساری روداد ایسے موثر اور دردناک پیرائے میں لکھی تھی کہ ایڈیٹر الناظر تو خیر میر صاحب کا دیرینہ اور قلبی نیاز مند ہے گر جب کبھی کسی غیر نے بھی اس خط کو دیکھا تو وہ ظفر علی خاں کی بے اصولی اور بے وفائی پر اظہار نفرین کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور شاید میر صاحب کے کثیر التعداد احباب میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کو ان واقعات کا ہماری طرح علم ہو اور وہ اُنکی موجودہ خانہ نشینی اور عزلت پسندی کو اسی بدنصیب واقعہ کا نتیجہ نہ جانتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میر محفوظ علی صاحب جیسے ہونہار اور لائق شخص کو ایڈیٹر ستارۂ صبح نے دنیا سے کھو دیا۔ اور یہ ایسا ظلم صریح ہے جسکی پاداش سے وہ کبھی محروم نہ رہیں گے ـــــ میر صاحب کے تحمل۔ نیکی اور عالی حوصلگی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ظفر علی خاں نے اُنکی زندگی برباد کردی اور اُنکی تمام امیدوں اور اُمنگوں کو خاک میں ملا دیا تھا لیکن جب اس ظالم دوست نے قدموں پر سر رکھدیا اور معذرت خواہی کی تو میر صاحب نے معاف کردیا اور صرف زبان سے نہیں بلکہ جیسا بعد کو اُنکے عمل سے ثابت ہوا اُنھوں نے دل سے اس واقعہ کو بُھلا دیا۔ راقم الحروف کو اس کا پورا احساس ہے کہ جب میر صاحب کی نظروں سے یہ سطور گذریں گی تو باوجود اُس غایت شفقت ومحبت کے جو ایڈیٹر الناظر کے ساتھ اُنکو ہے وہ یقیناً حد درجہ ناخوش ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص قوم و ملک کے ساتھ دشمنی برتے وہ کسی رحم کا مستحق نہیں۔ اور یہی عذر کو میں میر صاحب کی خدمت میں اپنی بریت کے لیے پیش کروں گا۔

ناظرین الناظر عموماً اور دیگر احباب خصوصاً اس نہایت ہی ناخوشگوار بحث سے اُکتا گئے ہوں گے اور میں اُنکو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایڈیٹر الناظر کے لیے بھی یہ بحث کسی طرح خوش آیند نہیں ہے گر ایسی صورت میں کہ ایک طرف ہمارے بعضے رہنمایان قومی نمودار ہوتے ہیں وہ سب کے سب اپنی پیتل اور تانبے کی جنس کو سونے اور چاندی کا مال بتاتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے اہل وطن اور برادران قومی اس قدر باطل پرست اور لاپروا ہیں کہ وہ تجربے کے بعد بھی نیک و بد کے

امتیاز اور کھرے کھوٹے کی شناخت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ سوا اسکے چارہ نہیں کہ ہر ڈھول کا پول کھول کر بتایا جائے اور ہر جعلی سکے کو کاٹ کر دکھا دیا جائے۔

ظفر علی خاں کے انداز طبیعت اور طرز عمل کا آپ ان واقعات سے کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں اسلیے آیندہ نمبر میں یہ تذکرہ ختم کر دیا جائے گا۔ البتہ یہاں ایک دفعہ اور خدا کرے یہ آخری دفعہ ہو، پھر اُس شخص کا ذکر کرنا پڑتا ہے جسکی قوت انشاپردازی اور کمال ادب کے معترف ہونے کے باوجود، ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ وہ انگریزی داں نوجوان نہیں بلکہ ایک عربی داں مولوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مُلّا عمادی نے اُن سطور کو پڑھکر جو ستمبر نمبر میں اُنکے متعلق لکھی گئی تھیں، ہمیں اطلاع دی تھی کہ جو کچھ اُنھوں نے ایڈیٹر ستارہ صبح کی تائید میں لکھا تھا، وہ اگرچہ محض اس سبب سے لکھا تھا کہ اس وقت ظفر علی خاں کے متعلق حسن ظن باقی تھا مگر اب کہ اُن کی حالت معلوم ہو چکی ہے وہ آج تک اُس تحریر کے لیے اپنے تئیں نفریں کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند کریم اُنکے اس گناہ کو معاف کرے۔

ندامت و انفعال کے اس اظہار نے ہمیں بھی کسی قدر متزلزل کر دیا تھا اور شاید جو کچھ ہم نے گذشتہ دفعہ لکھا تھا اُسکی تلافی اس دفعہ کسی دوسرے طریقے پر کرتے۔ مگر تھوڑے دنوں میں خبر ملی کہ الصباح کا چراغِ زندگی گل کر کے عمادی صاحب دفتر ستارہ صبح تک جا پہنچے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

کسی "ذات" نے عرصہ ہوا ایک نظم لکھی تھی جسکا ایک شعر یہ تھا:

بھولے سے بھی کبھی سچ بولو تو توبہ کر لو
راست گفتار کبھی لائقِ اکرام نہیں

عمادی صاحب نے اگر اسی کا بیڑا اُٹھایا ہے تو ہم آیندہ اُنکا نام بھی زبانِ قلم پر لانا گناہ سمجھیں گے۔

(باقی دارد)

عمر خیام کا پیام

تو فخر ہمی کنی کہ مے می نہ خوری
صد کار کنی کہ مے غلام ست اورا

سعدی از دست خویشتن فریاد!

پسر نوح با بداں بنشست خاندان نبوتش گم شد

یوں تو فی الحقیقت مسلمانان ہند کی حالت ایک عرصے سے صد درجہ عبرت انگیز و حسرت آگیں نظر آتی تھی لیکن ماہ گذشتہ میں بعض واقعات ایسے نمودار ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق کم سے کم ہمارے دل میں نہایت یاس افزا خیالات پیدا ہو چلے ہیں۔

الناظر کے گذشتہ پرچوں میں گروہ احرار کے بعض نامور افراد کی مصلحت آشامیوں اور ملت فروشیوں پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ بجائے خود کس قدر حوصلہ شکن ہے؟ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب وہ لوگ ہیں جو علوم دینیہ سے بے بہرہ اور تہذیب جدیدہ کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے اسلامی تعلیم کو اگر پوری طرح یا بالکل نہ سمجھ سکے اور عملاً اسکے تتبع اور پیروی سے قاصر ہے تو چنداں محل شکایت نہیں۔ اگرچہ خود انھوں نے جس شد و مد سے دو ر استبداد کی مخالفت اور سابقہ رہنمایان قوم کی پردہ دری کی تھی اور جس بلند آہنگی کے ساتھ حریت و جمہوریت کے متعلق اپنے دعاوی باطلہ پیش کیے تھے انکے لحاظ سے ہماری بازپرس بے موقع نہیں کہی جا سکتی۔ مگر آج جن واقعات پر تبصرہ کرنا — نہیں نہیں ماتم کرنا اور خون رونا ——— ہے وہ ایسے اصحاب اور ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو یقیناً ہم جہلا کے نزدیک اب تک مسلمانوں کے ملجا و ماوی ہیں اور جو مشرقی تمدن کے آج بھی پشت پناہ سمجھے جاتے ہیں۔

فرنگی محل کا دار العلم والعمل نہ صرف ہندوستان کی وسیع مملکت میں بلکہ دیگر بلاد اسلامیہ میں بھی ایک خاص منزلت و عظمت حاصل کر چکا ہے۔ خصوصاً حضرت مولانا عبد الحی صاحب مرحوم و مغفور کا نام نامی تو علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت، تدوین و ترویج کی تاریخ میں ہمیشہ زریں حروف سے ثبت رہے گا۔ لیکن مقام صد حیرت و تاسف ہے کہ نیرنگی زمانہ نے اس عظیم الشان مرکز دینی کو بھی اُن

اثرات سے محفوظ و مصئون نہیں چھوڑا جو آج تہذیبِ جدید کی منڈیوں میں گرم بازاری کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

انجمن مؤید الاسلام کی بنیاد اب سے بہت سال پہلے اُنھیں مبارک ہاتھوں نے رکھی تھی جو علوم اسلامیہ کی ترتیب و اشاعت اور مذہب حقہ کی خدمت و حفاظت کے لیے مدۃ العمر وقف رہے تھے۔ اور اس بنا پر موجودہ دورِ ابتلا و آزمایش میں مسلمانوں کو اس مجلس سے اگر کوئی توقع ہوسکتی تھی تو یہ ہوسکتی تھی کہ اُسکے بابرکت اعضا و ارکان الحاد و بیدینی، انتشار و افتراق کے پے بہ پے حملوں کا مقابلہ کرنے اور شیرازۂ ملت و جمعیتِ قومی کے مستحکم و استوار بنانے میں وہی حصہ لیں گے جو وارثینِ انبیاء اور مقتدایانِ دینِ مقدس کے شایانِ شان ہوگا۔ مگر حال ہی میں اس محترم و موقر جماعت نے اپنے احقاقِ حق کی جو نمود و نمایش فرمائی اور جس طریقے پر یگانوں اور بیگانوں دونوں کو رنج و تمسخر کا موقع دیا اُس نے یہی نہیں کہ مسلمانوں کی ہزاروں امیدوں اور لاکھوں آرزوؤں پر پانی پھیر دیا بلکہ اُنکی نامرادی اور محرومیِ قسمت کو عالم آشکارا کر دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

ہندوستان کے علما و مشائخ اب تک عموماً قومی و ملکی معاملات سے جس طرح بے سروکار نظر آتے تھے وہ بجائے خود کچھ کم تشویش انگیز نہ تھا۔ کیونکہ اُنکی علیحدگی اور بیگانگی کی روش نے جمعیتِ اسلامی کو شتر بے مہار بنا دیا اور ایسے لوگوں کے دستِ قدرت میں ہماری عنانِ رہبری اور سرداری دیدی جو کسی طرح اس منزلتِ عظمیٰ کے اہل و سزاوار نہیں ہیں۔ لیکن کون جانتا تھا کہ وہ جنکی ہدایت و رہنمائی کی ہم راہ تکتے تھے جب میدانِ عمل میں قدم رکھیں گے اور مسند آرائے بزم سیاست ہوں گے تو اُنکے دل و دماغ اور رجحان و رائے پر اغیار کا قبضہ و تسلط ہوگا اور اُنکے جیب و داماں تفکر و تدبر سے یکسر عاری نظر آئیں گے۔

کہیں کہیں نہ عدو دیکھکر مجھے محتاج یہ اُنکے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

ان تمہیدی اشارات کے بعد، ہم اُن واقعات و حالات سے بحث کریں گے جو انجمن مؤید الاسلام کی جدید تحریک کے بدولت پیش آئے ہیں تاکہ ناظرین کرام اور دیگر صاحبان بصیرت کو

معلوم ہو کہ بدقسمتی اور کم طالعی کس کس رنگ میں ہماری بربادی و تخریب کے سامان فراہم کر رہی ہے اور ہندوستانیوں کا مستقبل کیسی کیسی تاریکیوں اور مایوسیوں سے گھرا ہوا ہے۔

گذشتہ تین سال سے جو ہیبتناک و عظیم الشان جنگ یورپ میں ہو رہی ہے اُسکے ناگزیر و نامرو نتائج نے جہاں خود یورپ میں عجیب عجیب انقلابات نمایاں کر دیے ہیں وہاں اِس دُور اُفتادہ سرزمین کے رہنے والوں کو بھی متأثر کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ اور اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں کہ بے شمار مال لُٹانے اور بے حساب خون بہانے کے بعد اہلِ ہند بالکل حق بجانب ہیں اگر وہ اُن حقوق و اختیارات کا اس زور و شور کے ساتھ مطالبہ کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں جو بارگاہِ فطرت کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کو اصولاً اور دنیا کی سفید رنگ اقوام کو عملاً حاصل ہیں۔ ہندوستانیوں کے یہ مطالبات انصاف و حق پسندی پر مبنی نہ ہوتے تو شاید ایسی فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ انگلستان کے وزرا و مدبرینِ سلطنت اُنکے حق بجانب ہونے کو تسلیم نہ کرتے اور نہ غالباً اُنکی بیش بہا خدمات و امداد کا ایسی بلند آہنگی اور وضاحت کے ساتھ اعتراف ہی کیا جاتا۔ لیکن اسکے باوجود خود اس ملک میں اور نیز انگلستان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو نہیں مانتی کہ ہماری قربانیاں اُس حُسنِ سلوک کی مستحق و سزاوار ہیں جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں اور نہیں چاہتی کہ ہمارے مطالبات اُس حد تک پورے ہوں کہ ہم زندہ اور باوقعت اقوامِ عالم کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں۔

ہندوستانیوں کی طلبِ صادق جب اس پیمانے پر پہونچ گئی کہ باوجود شدید ترین فرقہ وار اختلافات کے اس مقصدِ اعظم کی خاطر ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں کے تعلیم یافتہ رہنما متحد و یکدل ہو گئے اور اُنھوں نے اپنی اپنی مرکزی سیاسی مجالس کی طرف سے ایک مشترکہ مطالبہ متفقہ آواز کے ساتھ پیش کیا تو وزرائے برطانیہ اور حکومتِ ہندوستان کو بھی توجہ کرنا پڑی۔ اور بالآخر وزیرِ ہند نے دار العوام میں اعلان کر دیا کہ اصولاً حکومت کو اہلِ ہند کے اس مطالبۂ جائز سے اتفاق ہے اور اس بارے میں حکومتِ ہند اور اہلِ ہند کے نمایندوں سے مشاورت کرنے کی غرض سے کہ کس حد تک

مطالبہ کی تکمیل کی طرف قدم بڑھانا ممکن ہے اور کونسی اصلاحات نظام حکومت میں جاری کیجا سکتی ہیں جن سے آیندہ چل کر اہل ہند کا یہ مقصد دلی اور مدعاے سیاسی بر آئے، وہ خود بنفس نفیس ہندوستان کا سفر کریں گے۔

مسٹر مانٹیگو نے یہ اعلان کرکے جہاں ہندوستانیوں کے اضطراب اور بے چینی میں قرار و سکون پیدا کر دیا وہیں اُس فریق کے مقابل گویا طبل جنگ بھی بجوا دیا جو ہندوستانیوں کے مطالبات سے ہمیشہ مخالفت کرتا رہا ہے اور جسکے حلوے مانڈے میں ایسے ہر قدم سے فرق پڑنے کا اندیشہ ہے جو اُن مطالبات کی تکمیل کی طرف بڑھایا جائے۔ چنانچہ اس خود غرض و بد باطن جماعت کی طرف سے مسٹر مانٹیگو اور اُنکے مقصد سفر کے خلاف اس اثنا میں جو زہر اُگلا گیا ہے اور جس شد و مد کے ساتھ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ وزیر ہند کا سفر ملتوی ہو جائے اُس سے واقف ہونے کے بعد کسی کو اس طبقے کے مرکوز ذہنی اور مدعاے حقیقی کا اندازہ کرنے میں غلطی ہونا ممکن نہیں —— مگر والے بر حال دشمناں کہ یہ سب تدابیر بے سود ثابت ہوئیں اور وزیر ہند یا وزارت برطانیہ پر ان لوگوں کی ہرزہ سرائیوں اور ریشہ دوانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔

لیکن ایک ہوشیار، مستعد اور باتدبیر حریف کبھی محض ایک جانب سے حملہ پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ضرر رسانی کی جتنی راہیں اُسکی فکر و عیاری پیدا کر سکتی ہے ہر جانب سے وہ تیر اندازی اور شعلہ باری کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے جب اُس نے دیکھا کہ انگلستان کے باثر علاوہ ازیں نامور اخباروں اور دارالعوام کے معزز اراکین سے لیکر دارالامرا کے مقتدر بزم نشینوں تک کی امداد و اعانت کے باوجود اُس سرزمین پر فتح و نصرت کے کوئی آثار ظاہر نہ ہوے تو اُس نے خاص ہندوستان کے مختلف فرقہ ہاے آبادی اور متعدد باسوخ و اقتدار اصحاب کو طرح طرح پر اُن مطالبات کی مخالفت پر آمادہ کرنا شروع کیا اور اس بات میں ہمارے اہل وطن اور برادران قوم کی غلط فہمی، سادہ لوحی، بد باطنی اور غرضمندی کے بدولت اُنھیں اس حد تک کامیابی ہوگئی ہے کہ آج چہار طرف سے دلائل و براہین، اسلوب و انداز اور صور و مظاہر کے اختلاف کے ساتھ

اُن مطالبات سے مخالفت کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو اس گروہ کے مطمحِ نظر اور مقصدِ قیام ہندوستان کے منافی ہیں اور جنکے ذریعے سے اہلِ ہند اپنے پیدائشی اور فطری حقوق حاصل کرنے کی آئینی طور پر کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں جہاں نسل و رنگ کا امتیاز، قوم و ملت کا فرق، معاشرت و منافع کا اختلاف اپنی پوری جمعیت کے ساتھ ہر وقت نفاق و انتشار پیدا کرنے کے لیے موجود رہتا ہے کسی ایسی باقاعدہ، منضبط اور موثر تحریک کا نشو و نما پایا نا کچھ تعجب انگیز نہیں جو اتفاق و اتحاد کو مٹانے اور یکجہتی و یکدلی کو برباد کرنے کی غرض سے جاری ہوئی ہو۔ اور جیسا کہ اربابِ بصیرت نظارہ کر رہے ہیں آج یہی بلکہ اس سے بڑھ کر نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔

امپیریل کونسل کے ۱۹ ممبروں نے جو یادداشت حکومتِ ہند کی وساطت سے ملکِ معظم کی خدمت میں بھیجی تھی اور گذشتہ دسمبر میں لیگ اور کانگریس نے جو مشترکہ اصلاحی تجاویز منظور کی تھیں اُنکی مخالفت پہلے بھی بعض اشخاص اور جماعتوں کی طرف سے ہوئی تھی اور ہو رہی تھی۔ مگر صدائے مخالفت ایسے مدھم سروں میں نکلتی تھی اور ایسے آزمودہ جوانب سے اُٹھتی تھی کہ ہر شخص مخالفت کی ماہیت و نوعیت پر خندہ کرتا تھا اور اُسپر کوئی التفات کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر وزیرِ ہند کے اعلان کا جب سے حال معلوم ہوا ہے اور اغیار کی بااثر اور منظم جماعت نے اپنی مخالفت کی مشین کو حرکت دی ہے ان صداؤں میں بھی ایک قسم کا برقی اثر نمودار ہونے لگا ہے جسکی وجہ سے مرض متعدی ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ قوت کے ساتھ ہندوستانیوں کے لیے وبالِ جان بننے کو تیار ہو گیا ہے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ مخالفین ہوم رول کی فہرست میں زمینداروں خان بہادروں، لیڈری سے محروموں اور ناموری کے نودولتوں کے ساتھ ساتھ اب ایسے اصحاب اور طبقہ جات بھی نظر آ رہے ہیں جنکی طرف کبھی یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کی مجلس مؤید الاسلام نے بھی جسکے ساتھ سیاسی کارناموں سے دنیا ہنوز ناواقف ہے اس نازک مگر ہنگامہ زا موقع پر اپنے وجود کو محسوس کرانے کی ضرورت سمجھی

اور اشارہ پاکر میدان سیاسی میں دفعۃً آدھمکی۔ اور اس خیال سے کہ کہیں اس بدعت پر کسی طرف سے الزامی یا اختلافی فتوےٰ نہ صادر ہو جائے اس مجلس کے منتظمین نے اُن ناگفتنی واقعات کو ایک بہانہ قرار دیدیا جو اہل ہند کی بدنصیبی اور مسلمانوں کی بدقسمتی سے اضلاعِ بہار میں گذشتہ عید الضحیٰ کے ایام میں پیش آئے۔ اور ہندوؤں کے تعصبِ جہل نے مسلمانانِ ہند کے احساسات و جذبات کی اشتعال انگیزی کے لیے جو سامان فراہم کیا تھا اُسکی آڑ پکڑ کر ایک ایسی روش اختیار کی جس کا خمیازہ معلوم نہیں آیندہ ہمیں کیا بھگتنا پڑے گا۔

مجلس مؤیدالاسلام کے محترم اراکین علی الخصوص جناب مولوی عبدالباری صاحب جو غالباً اس مجلس کے صدر بھی ہیں، اب سے پیشتر سمجھا جاتا تھا کہ معاملہ فہمی، حریت پسندی اور ملکی و قومی ہمدردی کے لحاظ سے دیگر علماے ہندوستان کے مقابلہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن دیگر رہنمایانِ قومی کی طرح افسوس ہے کہ مسلمان اس در سے بھی مایوس و ناکام پھرے۔

ہمارے علماے کرام کا سکون و جمود اور قومی و ملکی معاملات سے اُنکی بے التفاتی و بے تعلقی جس قدر افسوسناک اور رنجیدہ تھی حق یہ ہے کہ میدان سیاسی میں وہ جیسے بے موقع در آئے اور دستِ غیر کو جس طرح اُنھوں نے اپنی سیاسی تحریک کا رہنما بنانا گوارا کیا یہ اُس سے بھی زیادہ اندوہناک و الم آگیں ہے۔

سب جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی تحریک زندہ و قائم نہیں رہ سکتی جب تک اُسکی حمایت تواتر و استقلال کے ساتھ نہ کی جائے۔ اور کھیتی کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکتی اگر کاشتکار زمین کو کھاد اور پانی سے بار بار تقویت و قوت نہ پہونچاتا رہے۔ حضرات علماے کرام بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہو سکتے کہ مواظبت و مزاولت کے بغیر کوئی عمل حصولِ مدعا میں کامیاب نہیں ہوتا۔ لیکن مجلس مؤیدالاسلام اور اُسکے محترم صدرنشین کو افسوس ہے کہ کامرانی کی اسی لازمی و ضروری شرط سے قطعاً بے اعتنائی رہی جس نے اس بات کو اچھی طرح باور کرا دیا کہ اس تمام مظاہرہ و مخاصمت کی غایت اسکے سوا کچھ نہ تھی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی اکثریت نے جو مطالبات پیش کیے ہیں اور

اور جنکے حصول کی وہ مسلسل سعی کرتے رہے ہیں وہ اُن سے اگر یکسر محروم نہ ہو جائیں تو کم سے کم اُنکی راہ میں سخت مؤثر رکاوٹیں تو پیدا ہی ہو جائیں۔

لکھنؤ سے باہر کے جو چند مولوی صاحبان مجلس مؤید الاسلام کی دعوت پر لبیک کہکر اُٹھ کھڑے ہوے اور ۳۱ راکتوبر کے جلسہ کی شرکت کے لیے راجہ صاحب جہانگیر آباد کے مہمان بنے کہ اُنھیں کا روپیہ اس اجتماع کی ضیافت اور دیگر مصارف کا کفیل بتایا جاتا ہے اُن میں سے بعض کو تو لکھنؤ پہونچکر اور نوعیتِ حالات پر مطلع ہو کر نہایت ہی مایوسی ہوئی۔ چنانچہ ہمارے کرم محترم مولوی عبد القادر آزاد سبحانی شیخ الالٰہیات کانپور نے جو جمعیت علما کی تنظیم و تاسیس کے متعلق بڑی بڑی امیدیں باندھکر تشریف لائے تھے ہمارے سواجہہ میں مولوی عبد الباری صاحب سے اس بارے میں باسلوب مختلف دیر تک گفتگو کی اور ہر دفعہ کوشش فرمائی کہ کسی نہج سے کوئی مستقل نظام قائم کرنے پر آمادگی ظاہر کی جائے مگر چونکہ اس اجتماع کا منشا اُن مطالبات کا جنکی ترتیب میں مشورہ دینے کے لیے علمائے کرام اور دیگر اعیانِ ملت کو اذنِ عام دیا گیا تھا کوئی حقیقی اور مستقل مقصد بجز اسکے نہ تھا کہ مولوی صاحبان اپنی شخصیت و استحقاق نیابت قومی کا مظاہرہ فرمائیں اور اُنکو زیر بارِ کرم بھی بنا سکیں جنکی خاطر سے ان اصحاب محترم نے خارزارِ سیاست میں قدم رنجہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی تھی۔

اب اگر اُن مطالبات پر ایک نظر ڈالی جائے جن کا ابتدائی مسودہ مجلس مؤید الاسلام کے ذی فہم منتظمین کو خدا جانے کہاں سے ہاتھ لگ گیا تھا، اگرچہ جن میں بعد کو کافی حد تک ترمیم و اضافہ ہو گیا ہے تو اصولاً اور لفظاً ان میں کوئی بات ایسی نہیں جسکے خلاف کوئی مسلمان ایک حرف بھی زبان و قلم سے نکال سکے۔ لیکن علمی نقطۂ نظر سے دکھیا جائے تو نا ممکن ہے کہ ایک دفعہ ہر سمجھدار آدمی کے چہرے پر آثار تبسم نمودار نہ ہو جائیں۔ اور اُن لوگوں کی جدتِ طبع اور نازک خیالی کی داد دیے بغیر نہ رہا جائے جن کی فکر رسا اور دماغِ روشن نے سب سے پہلے ان مطالبات کا خاکہ تیار کیا تھا۔ خصوصاً دفعہ ۴ جس میں کونسلوں اور بورڈوں کے جملہ مسلمان ممبروں کے متعلق خواہش کی گئی ہے کہ باوجود مسلمانوں کی کثرت رائے سے منتخب ہو جانے کے اُنکی نمایندگی و نیابت

اُس وقت بلکل قابلِ تسلیم نہ ہو جب تک کہ علمائے کرام و مجتہدین عظام کی جانب سے اُنکو الٰہیت بہ نیابت کی سند نہ حاصل ہو جائے ۔ تاہم ہمیں اس نہایت ہی غیر معتدل اور موجودہ حالات میں ناقابلِ عمل مطالبہ کی تائید میں بھی دریغ نہ ہوتا اگر اس بات کا اطمینان دلایا جا سکتا کہ ہمارے علمائے کرام اب حقیقتاً اُن عوارض و امراض کا دفعیہ چاہتے ہیں جو ہماری ساری قوم میں عموماً اور تعلیم یافتہ اصحاب میں خصوصاً مذہب سے بے اعتنائی اور اسلام کی اخلاقی و تمدنی تعلیم سے بیگانگی کی صورت میں نمودار ہیں اور جنکی وجہ سے اندیشۂ قوی ہے کہ ارضِ ہندوستان آگے چلکر (خدانخواستہ) توحید و رسالت کی روشنی سے یکسر محروم ہو جائے گی اور مسلمانانِ ہند (ناکم بدہن) یورپ کے عیسائیوں، چین کے بدھ مت والوں اور ہندوستان کے زردشتیوں کے مانند ایک ایسی قوم بنجائیں گے جس میں روحانیت اور للہیت کا کوئی وجود باقی نہ رہے گا۔

پھر کیسے افسوس و حسرت کا مقام ہے کہ وہ بزرگانِ ملت جو یوں تو کبھی اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نکلنا اور تعلیم و تعلّم یا دیگر خالص مذہبی مباحث کے سوا دنیا کے کسی دھندے میں پڑنا پسند نہیں فرماتے تھے، آج جبکہ ہندوستان کے آئینی جد و جہد کرنے والوں کی سالہا سال کی جانکاہی و محنت کے بعد کچھ مفید نتائج و آثار مرتب ہوتے نظر آتے ہیں دفعتہً اُٹھتے ہیں اور یک قدم وہ تمام منازل طے کرنا چاہتے ہیں جن میں کی ہر منزل بجائے خود سیاسیات کی دشوار گذار راہ میں بمنزلہ ایک ہفتخواں کے ہے ـــــ اور بلا پس و پیش اور بغیر کافی غور و مشاورت کے ایسی تجاویز اور مطالبات پیش کرنے میں باک نہیں رکھتے جن کا حصول با دنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ حالات کے لحاظ سے محال بلکہ ناممکن ہے اور جنکے بدولت گمانِ غالب یہ ہے کہ دوسروں کے بنے ہوئے کام بگڑ جائیں گے یا دوسروں کی جو آرزوئیں بر آنے والی ہیں وہ مبدل بہ یاس و ناامیدی ہو جائیں گی۔

کہا جائے گا، جیسا کہ مؤتمر الاسلام کے جلسہ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ہم بندگانِ دنیا حضرات علما کے واجبی ادب و احترام میں کوتاہی کرتے ہیں مگر بزرگانِ فرنگی محل معاف فرمائیں اگر ہم

اس حقیقت کے اظہار کی جرأت کریں کہ جلسہ میں جو واقعات انکی مرضی و وقار کے خلاف پیش آئے ہیں انکی تمام ذمہ داری خود حضرات علما کے نہایت ہی ناواجب اور غیر دور اندیشانہ طرز عمل پر عائد ہوتی ہے اگر وہ اپنے اُن حدود سے اس نازک محل پر تجاوز نہ فرماتے جو سالہا سال کے تواتر نے اُنکے لیے معین کردی ہیں اور اُس میدان عمل میں اچانک نہ کود پڑتے جو خود اُنھیں کی دیرینہ بے التفاتی کے باعث انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے لیے مخصوص ہوگیا ہے تو دنیاداروں کا اس کثرت کے ساتھ اُنکی مجلس میں بار ہی کیوں ہوتا؟ یہ صحیح ہے کہ شاملین جلسہ میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو خاص طور پر مدعو نہیں کیے گئے تھے، لیکن پھر بھی ایسے بہت سے اصحاب موجود تھے جنکو مجلس موید الاسلام کی طرف سے دعوت شرکت دی گئی تھی ـــــ اور ان میں سے بعض بزرگ خاص اسی جلسہ کی شرکت کی غرض سے اپنا قیمتی وقت و روپیہ صرف کرکے اور سفر کی زحمت گوارا فرماکر باہر سے تشریف لائے تھے۔ ایسی صورت میں جو روش حضرات علما کی طرف سے اختیار کی گئی، کون ایسا ہے جو اُسے سزاوار تحسین یا قرین مصلحت کہے گا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ دوست و دشمن جس کسی نے ان حالات کو سنا غیرت و شرمساری سے سر جھکا لیا اور اُس قوم کی حرماں نصیبی پر اظہار تاسف و رنج کیا جسکے یہ اصحاب مقتدایان دینی اور پیشوایان مذہبی کہے اور مانے جاتے ہیں۔

ناظرین کرام حیران ہونگے کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں۔ اور خود ہمیں بھی حیرانی ہے کہ ہم نے فرنگی محل میں کیا کیا دیکھا تھا ـــــ واقعات کی پوری تفصیل کی تو گنجائش نہیں۔ البتہ اختصار کے ساتھ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس جلسہ میں کیا ہوا اور کیونکر ہوا۔

اس جلسہ کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ ۳۱ر اکتوبر بروز چہارشنبہ کو بعد مغرب ہوگا۔ باہر کے بزرگ جن میں چند علما کے سوا بعض دیگر اصحاب مثل ڈاکٹر انصاری۔ مسٹر عبد المجید خواجہ نواب اسحاق خاں و حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے تھے، چہارشنبہ کو دن ہی میں کسی وقت پہونچ گئے تھے اور مقامی حضرات مثل سید نبی اللہ۔ نواب ذوالقدر جنگ۔ مولوی محمد نسیم۔ سید وزیر حسن

کے بعد مغرب پہونچے۔ معلوم ہوا کہ مولوی عبدالباری صاحب کے کسی عزیز کا انتقال ہوگیا ہے جسکی وجہ سے جلسہ وقت معینہ سے کسی قدر دیر میں شروع ہوگا۔ اور یہ بھی سنا گیا کہ سہ پہر کو جلسہ میں پیش ہونے والی تجاویز کی ترتیب کی غرض سے سبجکٹ کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جسمیں یہ طے پاگیا ہے کہ جو امور خالص مذہبی ہیں اُنکے تصفیہ میں صرف گروہِ علما کی رائے کو دخل ہوگا۔ البتہ ایسے امور جو مذہبؔ سیاست دونوں سے مشترکہ تعلق رکھتے ہوں گے اُنکے بارے میں گروہِ علما و غیر علما ہر دو کو غور و بحث کی اجازت ہوگی۔ یہاں تک کسی کو اعتراض نہ تھا اور یقین کامل ہے کہ اگر جلسہ شروع ہونے کے بعد اس قرارداد پر عمل کیا جاتا تو خواہ جلسہ کی منظور کردہ تجاویز سے کسی کو اختلاف رہتا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ نہ تو جلسہ ہی درہم برہم ہوتا اور نہ مخالف رائے رکھنے والوں میں سے کوئی شخص حضرات علما کی بے ضابطگی و بے قاعدگی کے متعلق حرفِ شکایت زبان پر لاتا۔ مگر جلسہ کی ابتدا ہی یوں کی گئی کہ مولوی عبدالباری صاحب کے زینتؔ افروزِ بزم صدارت ہونے کے بعد ایک مولوی صاحب نے مختصر سی تمہیدی تقریر کے بعد بیان کیا کہ علمائے کرام نے چند تجاویز منظور فرمائی ہیں جو آپ حضرات کو سنا دی جائیں گی۔ مگر پیشتر اسکے کہ منظور کردہ تجاویز پڑھی جائیں حکیم اجمل خاں صاحب نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس تقریر کے منشا پر اظہار تعجب فرماکر صاحب صدر سے دریافت کیا کہ آیا یہ وہی جلسہ ہے جسکے لیے ہم لوگ طلب کیے گئے تھے یا اصل جلسہ وہ تھا جو سہ پہر کو سبجکٹ کمیٹی کے نام سے ہو چکا ہے۔ اس بارے میں متعدد تقریریں علما و غیر علما کی جانب سے ہوئیں اور بالآخر مولوی عبدالباری صاحب کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اصل جلسہ یہی ہے۔ لیکن باوجود اسکے علما کی جانب سے اصرار ہوتا رہا کہ جو تجاویز وہ منظور فرما چکے ہیں وہ قطعی ہیں اور اب اُنکو یہاں پیش نہ کیا جائے گا۔ سید وزیر حسن۔ حاذق الملک بہادر۔ مسٹر عبدالمجید خواجہ۔ ڈاکٹر انصاری۔ نواب اسحاق خاں وغیرہ نے بار بار اسکی کوشش کی کہ حضرات علما سبجکٹ کمیٹی کی قرارداد کے مطابق کارروائی کریں۔ مگر سب بے سود ہوا۔ درمیان میں ایک صاحب جو علما کی تجاویز کے حقیقتاً مؤید تھے۔ تقریر کرنے کے لیے کھڑے کر دیے گئے۔ جنھوں نے ہوم رول پر لکھر دینا شروع کر دیا۔ مگر

اسے بخت و اتفاق سمجھیے یا یہ کہیے کہ اُن پر کچھ ایسی سراسیمگی طاری ہوئی کہ اُنکی تقریر کا رجحان حامیانِ ہوم رول کی موافقت کی جانب ظاہر ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب خاموش کر کے بٹا لیے گئے۔ اس بے نتیجہ بحث و تکرار نے جلسہ کا بہت سا وقت ضایع کر دیا تھا۔ اور ہر شخص بجاے خود حیران و متاسف تھا کہ یہ بارگاہِ علما ہے یا رندان قدح خوار کی محفل کہ جس نے ایک ساغر چڑھایا مست ہو کر پگڑی اُچھالنے لگا۔ جہاں باستثناء چند مخصوصین کے کہ اُنھوں نے مصلحتاً یا بربناے صداقت و دیانت مجمع کی عام خواہش کی تائید فرمائی (مولانا سلیمان صاحب کی زبان سے تو یہاں تک نکل گیا کہ وہ ہوم رول کے طرفدار ہیں) بیشتر صاحبانِ جبہ و دستار ہیں سے بقول ایک اسلامی معاصر کے

"ہر شخص اپنے کو بجاے خود ایک چھوٹا سا معبود سمجھے ہوے تھا، اور اس زعم میں بیٹھا ہوا تھا کہ قوم کے وہ مسلمہ سرگروہ جو دور دراز مقامات سے تشریف لائے تھے سواے پرستش کرنے کے اور کسی لب کشائی کا حق نہیں رکھتے"

یہی حالت کچھ دیر تک قائم رہی اور معلوم نہیں کہ کب تک قائم رہتی اگر تضیع اوقات اور مزید مزرگی طبع کے اندیشے سے تنگ آ کر اڈیٹر النّاظر نے یہ درخواست نہ کر دی ہوتی کہ جب علما کو کچھ کہنا سننا منظور ہی نہیں تو پھر جلسہ ملتوی کر کے سب کو رخصتِ واپسی کیوں نہ دی جائے۔ مولوی عبد الباری صاحب نے جو غالباً ایسے ہی کسی موقع کے منتظر تھے اسے بہت غنیمت جانا اور اس درخواست التواء کو بہانہ قرار دے کر فوراً اُٹھ کھڑے ہوے اور جلسہ برخاست کر دیا۔ اب بعض لوگوں نے پھر التجا و منت شروع کی اور چاہا کہ جلسہ کی کارروائی جاری رہے۔ مگر برخاستگی کا اعلان سنتے ہی حضراتِ مجتہدینِ لکھنؤ باہر تشریف لے آئے اور اُنھیں کے ساتھ ہم بھی اُٹھ آئے۔

اسکے بعد معلوم ہوا کہ لوگ دیر تک بیٹھے رہے۔ مولوی عبد الباری صاحب اُٹھ گئے اور پھر باصرار بلائے گئے۔ مگر بجز اسکے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ جلسہ کی برہمی کا الزام کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کے سر تھوپا جاتا رہا۔ جلسہ میں مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل اور دوسرے مدارس اور کالجوں کے طلبا کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ جن میں سے کسی نے علما کی شانِ الوہیت

کے خلاف شاید کوئی فقرہ کہ دیا۔ اس کی سزا بھی اُن رہنایان قومی پر عائد ہوئی جنکی موجودگی ہی کے کے باعث اغلب یہ ہے کہ حضرات علما نے اپنی تجاویز کو غور وبحث کے لیے پیش کرنا خلافِ مصلحت تصور فرمایا۔ بعدازاں اُن چند صحاب سے جو دہلی وعلی گڈہ سے زحمتِ سفر برداشت کرکے تشریف لائے تھے وعدہ کیا گیا کہ دوسرے دن پھر یہ جلسہ ہوگا۔ اُس میں آپ کو اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے گا۔ غرضکہ جلسہ اور وہ اصل جلسہ جسکی شرکت کے لیے دعوت دی گئی تھی اور جسکی نیابت علماے کرام فرمانا چاہتے تھے یوں بخیر و خوبی کہیے یا بصد حسرت و حرماں، بغیر کسی نتیجہ پر پہونچے ہوے اور مطالبات و تجاویز علما پر بلا کسی قسم کی گفت و شنید ہوے تمام ہوا۔ دوسرے دن ایک مختصر سی جاعت نے جس میں مولویوں یا مولوی نما صورتوں کی اکثریت یقینی تھی دو اجلاس کیے اور پھر ایک اور اجلاس اُس سے بھی مختصر تیسرے روز ہوا اور جو قرار دادیں اُن اجلاسوں میں منظور ہوئیں وہی آج اخبارات کے ذریعہ سے شایع ہو رہی ہیں اور وہی سارے ہندوستان کے علما کے نام سے مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کے سامنے پیش ہونگی۔

غیرت و ندامت، خجالت و انفعال کی کوئی حد نہیں رہتی اور سارے بدن میں رعشہ اور لرزہ کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب حمایت مذہبی اور تحفظ دینی کا نام لے لیکر کیا گیا ہے۔

ے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است ملکہ خودمی شود از صحبتِ ناداں بدنام

حضرات علماے کرام و بزرگان فرنگی محل کو اُس وفد پر جو وزیر ہند اور وسیرلے کے پاس علماے ہندوستان کی نیابت میں حاضر ہوگا اور نیز اُن مطالبات پر جو بقا و تحفظِ شعائر اللہ کے نام سے پیش کیے جائیں گے بجاے خود جس قدر نازش و افتخار ہو لیکن ہم سیہ بختوں کے نزدیک یہ کل کارروائی سرتاسر غلط بلکہ یک گونہ اسلام اور غلامان اسلام کے لیے باعث ننگ و عار ہے۔ پھر اگر حضرات علما کو یہی کرنا تھا جو اُنھوں نے کیا یا وہ اپنی الوہیت و ربوبیت کے گھمنڈ میں ارباب دنیا

کی مشاورت سے کلیۃً مستغنی تھے، جیسا کہ اُس ساری رو داد سے معلوم ہوتا ہے تو بجائے اسکے کہ وہ رو حق و صداقت سے جدا ہو کر ایسی بے عنوانیوں کو جائز رکھتے یا تعلیم یافتہ جماعت کے معزز رہنماؤں کو اس طرح اپنے جلسہ میں بلا کر ٹھکراتے بہتر ہوتا کہ وہ اپنے ہمخیال مولویوں اور مدرسۂ نظامیہ کے طالبعلموں کا ایک خانگی جلسہ کرتے اور اپنی مرضی کے مطابق ہی بلکہ اس سے زیادہ وسیع الاثر مطالبات منظور فرما کر وزیر ہند کے پاس لے جاتے۔ مگر اُس صورت میں یقیناً یہ خانگی جلسہ "علماے ہندوستان" کی نیابت کا حق ادا نہ کر سکتا۔ جو اس تحریک کے اصلی بانی کی خواہشات اور شاید خود حضرت خادم الخدام انجمن خدام کعبہ کی شان مرکزیت کے خلاف ہوتا حالانکہ اس جلسہ کی حقیقت و اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خاص فرنگی محل کے وہ دونوں بزرگ جلسہ میں شریک نہیں ہوے جنکے نام نامی فرنگی محل کے فتووں پر ثبت ہوتے ہیں اور جو علم و فضل، عمر و تجربہ کے لحاظ سے فرنگی محل میں سب پر فائق سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی جناب مولوی عبدالمجید صاحب و جناب مولوی عبدالحمید صاحب۔ رہے باہر کے علما سو اُن میں سے بھی جلسہ میں چند ہی صورتیں نظر آتی تھیں اور وہ بھی زیادہ تر اسی صوبہ کے بزرگ تھے۔

ہم جلسہ میں ایسے وقت پہونچے تھے کہ بجز دنیا داروں کی ایک جماعت کے وہاں کوئی نہ تھا۔ اور علماے کرام و مجتہدین عظام میں سے جو اصحاب شریک جلسہ ہوے سب ایک ایک کر کے ہمارے سامنے تشریف لائے۔ اور آنکھیں ہر دفعہ اُن مقدس بزرگان ملت کی جستجو میں جو مشاہیر و ممتاز علما کی صف اول میں مسند نشیں ہونے کے بجا طور پر سزاوار ہو سکتے ہیں اور ہر بار محروم و ناکام ہو کر جھک گئیں۔ حضرات مجتہدین اہل تشیع کی تعداد تو انگلیوں کے شمار سے زائد نہ تھی۔ اور ان میں بھی کوئی صاحب پنجاب، بنگال یا کسی دوسرے صوبہ کے نہ تھے۔ بلکہ اگر ہماری یاد غلطی نہیں کرتی تو سب لکھنؤ ہی کے بزرگ تھے۔ رہے علماے اہل سنت سو اُن میں بھی بیرونی اصحاب کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس تک پہونچے گی۔ ہاں مدرسۂ نظامیہ کا ہر طالبعلم اور فرنگی محل کا ہر بچہ اگر علما میں شمار ہو سکتا ہے تو یقیناً اُنکی کافی تعداد جلسہ میں موجود تھی۔ البتہ

مجلس مویدالاسلام کے نائب معتمد صاحب اسکی تلافی کے لیے ایک کالی دفتی کا فائل ضرور ساتھ لیے تھے جس میں ہمدردی کے پیغاموں اور اُن مطالبات سے اتفاق رائے ظاہر کرنے والی تحریروں کا غالباً ایک انبار لگا ہوگا اور ہم دنیاداروں کے مرعوب کرنے کے لیے یہ کسی طرح ناکافی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ہماری قومی و ملکی مجالس ایسی ہی تحریری رایوں کے بل پر جیسے من گھڑت اور خود ساختہ جلسے کرلیا کرتی ہیں اور ان جلسوں پر ہم لوگ جس قدر اعتماد و اعتبار رکھتے ہیں اُسکے لحاظ سے علما کی اس مجلس کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کردینے کو تیار ہوجاتے اگر آنکھوں نے وہ نہ دیکھا ہوتا جو فرنگی محل کی ایک محلسرا میں پیش آیا۔

یہ امر جداگانہ ہے کہ علمائے کرام کی جو عظمت و منزلت ہمارے دل میں ہے اور جس عقیدت و ارادت کی نظر سے ہم اپنے مقتدایانِ دین کو ہمیشہ دیکھتے رہے ہیں اُسکی بنا پر ہماری توقعات اور تمنائیں یقیناً بہت بلند و رفیع تھیں اور اب واقعات پیش آمدہ نے محرومی و ناکامی کی جو صورت پیش کی ہے تو اُسکے مدارج بھی پستی و ذلت میں بلندیِ توقعات اور رفعتِ تمنا سے وہی مناسبت رکھتے ہیں جو زمین کو آسمان سے یا ذرہ کو آفتاب سے ہے۔

جلسۂ علما کی روداد تمام ہوئی۔ اب صرف چند باتیں اور عرض کرنا ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جو مطالبات مجلس مؤید الاسلام نے منظور کیے اور وزیر ہند کی خدمت میں پیش کیے ہیں اُنکے ممکن العمل یا اثیر الحصول ہونے کی بحث سے قطع نظر کرکے بزرگان فرنگی محل کو یہ غور فرمانا چاہیے تھا کہ نہایت وسیع پیمانہ پر تبادلۂ خیالات اور غایت درجہ بحث و غور کیے بغیر اور ملک کے کثیر التعداد تعلیم یافتہ اصحاب کو سرِ راہ یا پس پشت ڈال کر امورِ سیاسی میں اس طرح دفعتہً دخل انداز ہوجانا شرعاً جائز و مباح ہو تو ہو مگر مصلحت انجامی اور دور اندیشی کے یقیناً منافی تھا۔ اور باوجود ان محرکات اور مشوروں کے جو اس وفد اور مطالبات کی بنا ہیں حضرات علما کو قطعاً اس وقت خاموش اور بے تعلق رہنا چاہیے تھا کہ اُنکا وقار و اعتبار اس سے گراں تر قیمت رکھتا ہے۔

(۲) اگر اس راہ سے سرتابی ممکن نہ تھی تو جلسہ یا تو خالص مولویوں کا طلب کیا جاتا

یا دنیا داروں کی طلبی بھی ضروری تھی تو کل کارروائی ایسے طریقہ پر کرنا چاہیے تھی جو ایک مقتدر اور ذی وقار جماعت کے شایان شان ہو سکتی۔ بلکہ فی الاصل جلسۂ علما کی کارروائیاں ایسی متانت، سنجیدگی، عالی حوصلگی، بلند نظری، استقامت رائے، اور اسلامی اصول حریت و رواداری کے ساتھ عمل میں آتیں کہ دنیا داروں اور خمخانۂ مغرب کے میگساروں کے لیے بہترین نمونہ بنتیں اور قابل تقلید و تتبع قرار پاتیں۔

(۳) ہوم رول کی تحریک سے اختلاف حقیقی بنا پر تھا یا موجودہ نائبین قومی کے طرز عمل سے واقعی شکایت تھی تو دوسروں سے خیر جو کچھ بھی ہماری توقعات ہوں مگر حضرات علما کی ذات باصفات سے تو آج تک یہی امیدیں وابستہ تھیں کہ اعلاء کلمۃ الحق میں وہ کسی سے مرعوب و متاثر نہ ہونگے۔ اس جلسہ میں ارباب سیاست کی تعداد اگرچہ مولوی صاحبان اور اُنکے ارادتمند حاشیہ نشینوں کے مقابلے میں بدرجہا زائد تھی لیکن حق و صداقت کو قلت ہواخواہان کا کیا ڈر ہو سکتا ہے اور اگر ہمارے مقتدایان دینی پوری اخلاقی جرأت کو کام میں لاتے اور اپنے مافی الضمیر سے اُس جلسہ کو پوری وضاحت کے ساتھ اور مدلل طریقہ پر مطلع کرتے تو یقین واثق ہے کہ خود اُسی جلسہ میں بہت سے اصحاب اپنی خطاوں کا اعتراف کرتے اور شاید ہوم رول کی حمایت سے توبہ کر لیتے۔

(۴) بعض لوگوں کا خیال ہے اور شاید ایک حد تک یہ صحیح بھی ہو کہ حضرات مجتہدین شیعہ کو علما کی اس کارروائی میں بہت کچھ دخل تھا۔ مقصد جلسہ سے جناب مولانا ناصر حسین صاحب کی گہری دلچسپی اور وسیع ہمدردی کا تو ہمیں بھی پتہ لگ گیا تھا۔ مگر علما کی رہبری میں اُنھوں نے کس قدر حصہ لیا، اسکے متعلق ہنوز تحقیقات تکمیل کو نہیں پہونچی۔ اگرچہ یہاں یہ صاف عرض کر دینا چاہیے کہ فرقۂ شیعہ میں مسئلہ امامت اور مجتہدین کی تابعیت کو جو اہمیت ہے اُسکے لحاظ سے مولانا ناصر حسین صاحب و دیگر مجتہد صاحبان کو جو اُس جلسہ میں تشریف رکھتے تھے، اپنے فیصلہ کے ناطق اور مختتم ہونے پر جس قدر اصرار ہو اُسے بیجا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن علماے اہل سنت

جانتے ہیں کہ اُنکے مقلدین ومتبعین باوجودیکہ احترام علما اُنکا ایک مقدس فرض ضرور ہے۔ شرعاً علما سے اختلاف کرنے اور اُنکے سامنے اظہار رائے کرنے کے پورے مجاز ہیں۔ چنانچہ خود اُسی جلسہ میں نواب محمد اسحاق خاں صاحب آنریری سکرٹری علیگڈھ کالج نے جناب مولوی عبدالباری صاحب کو خلافتِ راشدہ کے اُس مشہور واقعہ کی طرف توجہ بھی دلائی تھی۔ جب ایک ضعیفہ نے خود حضرت خلیفۂ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دورانِ خطبہ میں ٹوک دیا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضؓ نے مسندِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد اپنے سب سے پہلے خطبہ میں پیروانِ اسلام کو اجازتِ عام عطا فرمادی تھی کہ خود سردارِ امت اگر (نعوذ باللہ) راہ صواب چھوڑ دیں تو ہر مومن ومسلم کو اُنکی رائے سے انحراف بلکہ اُنکی اصلاح کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہی مسلمانوں کی حریت و آزادی کے اساس وبنیاد ہیں اور اسی بنا پر جلسۂ علما سے یہ مطالبہ قطعاً جائز تھا کہ وہ اپنی منظور کردہ تجاویز کو ظاہر فرماکر حاضرینِ مجلس کو آزادانہ اظہار رائے کا موقع دیں۔ اور اسی سے انکار کے بدولت حقیقتاً جلسۂ علما کی اہمیت ووقعت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ جسکے لیے آج ہمنے یہ صفِ ماتم بچھائی ہے۔

من انچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

خاتمہ پر یہ لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے ذریعہ الناظر میں ہوم رول کی بحث چھیڑنا یا خود اس مسئلہ کی تائید یا مخالفت کرنا ہمارا مطمع نظر نہیں ہے۔ وہ ایک خاص سیاسی بحث ہے جسکے لیے الناظر کے سوا دیگر جرائد زیادہ موزوں ہیں ہم جو کچھ الناظر میں لکھتے ہیں اُسکی غایت صرف اسقدر ہوتی ہے کہ قوم کے اخلاق کو ایک نہ ہر یلا تمدن جس طرح برباد کر رہا ہے اُس سے متنبہ کیا جائے اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح چونکہ ابتدا سے الناظر کا مقصد خاص رہا ہے اس لیے ناگزیر ہے کہ اس سلسلہ میں کبھی کبھی ضمناً کسی خاص سیاسی مسئلہ کا بھی ذکر آجائے، کیونکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے ان دونوں کا کسی نہ کسی حد تک تعلق پایا جاتا ہے۔

نظرے خوش گزرے

دسمبر کے قومی جلسوں کا زمانہ بالکل سر پر آگیا ہے۔ مگر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور اُسکے شعبۂ علمیہ کی طرف سے اس وقت تک اعلان نہیں ہوا کہ اُنکے اجلاسوں کی صدارت کون بزرگ فرمائیں گے۔ کانفرنس کی صدارت کے لیے سر آشوتوش مکرجی منتخب کیے گئے تھے مگر اس سبب سے کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی کے کمیشن میں ایک رکن بنا دیے گئے ہیں اُنھوں نے اس عزت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ مسٹر حیدری ہوم سکرٹری دولتِ آصفیہ اُنکی جگہ منتخب ہونگے۔ یہ انتخاب اُس دلچسپی کے لحاظ سے جو جناب ممدوح کو مسلمانوں کی تعلیم سے ہے اور نیز اُس گراں بہا امداد کی بنا پر جو اُنکے عہدِ اقتدار میں خود کانفرنس اور انجمن ترقی اُردو کو ملی ہے بالکل موزوں ہوگا۔ دکن کے اسلامی کالج کو جو بیش قرار عطیہ سرکار نظام سے ملا ہے اور خاص حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام بھی بہت کچھ صاحب ممدوح کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہم خوش ہوتے اگر اُنکے انتخاب کا اعلان ابتک ہو چکا ہوتا۔

مگر انجمن ترقی اُردو کے دفتر سے تو ہنوز ارکان شوریٰ کے پاس اس قسم کی کوئی تجویز بھی نہیں بھیجی گئی ہے۔ اور ہم یقیناً بالکل حق بجانب ہونگے اگر اپنے محترم دوست مولوی عبدالحق صاحب کو بصد ادب و اصرار اس فروگذاشت کی طرف توجہ دلائیں۔

انجمن ترقی اُردو کے نظام پر جو مضامین ہم نے اسی سال لکھے تھے اُنکا منشا بجز اسکے کچھ نہ تھا کہ دیگر مجالس قومی کی غلط کاریاں اور ناکامیاں منتظمین انجمن کے لیے عبرت بخش اور سبق آموز ہوں۔ یہ ہمارے نظام کی خرابی ہی کا نتیجہ ہے کہ آنریری سکرٹری صاحب اور اُنکے چند ذاتی دوستوں کے سوا انجمن ترقی اُردو کے کاموں سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اور ناممکن ہے کہ ترقی اُردو کی سی مفید و اہم تحریک ان حالات میں اُس حد تک بارآور ہو جو یقیناً جملہ ہی خواہانِ اُردو کا انتہائی مقصد ہونا چاہیے۔

بھوپال سے ہمارے دوست منشی محمدؐ امین صاحب ایڈیٹر ظل السلطان نے ہم سے دریافت کیا تھا کہ کیا انجمن ترقی اُردو بھی سال میں ایک ہی رات کے لیے بیدار ہوتی ہے؛ ہم یہ تو نہیں کہ سکتے اس لیے کہ ذاتی واقفیت کی بنا پر جانتے ہیں اور اس کا بارہا اعتراف کرچکے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب کس ذوق و انہماک کے ساتھ کرخاموش کام کرنے والوں میں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ انجمن کے کارکُن ہنوز اُس راہ کے آشنا نہیں جسے آج دنیا کی کانفرنسیں اور انجمنیں اپنی نجات اور کامیابی کا ذریعہ جانتی ہیں۔

ہمارے دوست قاضی عبدالغفار صاحب جو ہمدرد کے بند ہوجانے کے بعد کلکتہ کے اخبارات ترجمان وصداقت میں کام کرتے رہے ہیں، اب اپنا علیحدہ اخبار نکالنے والے ہیں۔ اور آنریبل مسٹر فضل الحق۔ آنریبل مسٹر ابوالقاسم۔ آنریبل سید رضا علی۔ اور ڈاکٹر انصاری جنتا کا ایک دستخطی اعلان ہمیں وصول ہوا ہے جس میں اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ اس اخبار کے لیے جس کا نام غالباً "عہدِ جدید" ہوگا، درد مندان قوم قاضی صاحب کو فراہمی سرمایہ میں امداد دیں۔ جسکی دو صورتیں تجویز کی گئی ہیں:۔

(۱) جو صاحب پسند کریں ڈی نچر خریدیں۔ فی ڈی نچر دس روپیہ قیمت ہے۔ اور دس سال کے بعد اس کا روپیہ واپس کردیا جائے گا۔

(۲) جو صاحب عطیہ یا قرض حسنہ کے طور پر امداد کرنا چاہیں وہ اس طریقہ پر اس قومی کام میں شرکت فرماسکتے ہیں۔

دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مکاتیب شبلیؒ کی پہلی جلد سال گذشتہ میں شایع ہوئی تھی۔ حال ہی میں اُسکی دوسری جلد شایع ہوئی ہے جسکی قیمت جلد اول کے مانند عہ ہے۔ اسکا تفصیلی ریویو انشاءاللہ آیندہ پیش کیا جائے گا۔

قوت مردی کیلیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ آگئے ہوں تو آخر میں اب ایک بار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ آتنک نگرہ گولیوں کا استعمال فرمائیں اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں۔ گئی ہوئی اور ہاتھوں سے کھوئی ہوئی جملہ قوتیں از سر نو عود نہ کر آئیں تو ہمارا ذمہ۔

صاحبو! اس باب میں زمانہ کے معزز اصحاب تعریف فرما رہے ہیں، لاکھوں کی تعداد میں سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ مردوں اور عورتوں کو یکساں مفید ہیں اور نباتات سے مرکب۔ قیمت بھی بہت کم۔ فی بکس تیس گولیوں کا صرف

ایک روپیہ

آزمائش شرط ہے۔ یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپے کی دوا زیادہ ملے گی۔ پتہ

وید شاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد — للعہ

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — صہ
- میڈیکل جورس پروڈنس — ے
- عربوں کا فن تعمیر — ۴/

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق — ۴/
- کتاب الشفعہ — ۴/
- تکبیر
- شرح قانون شہادت — ے

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد — سے
- نشاط عمر — عہ
- عصائے پیری — ۱۲/
- اقبال وطن — ۸/
- حسن معاشرت — عہ
- بچیوں سے دو دو باتیں — ۱۲/

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر — سے
- وکیل نسواں — ۸/

منشی سعید احمد
- آثار اکبری — ۴/
- حیات خسرو — ۱۲/
- حیات صالح — ۴/

مولوی عبد الرزاق
- نظام الملک طوسی — عمہ
- البرامکہ — ے

حافظ عبد الرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — عہ
- الصدیق — صہ
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند — ۸/

پروفیسر شہباز مرحوم
- کلیات نظیر اکبرآبادی — ۴/
- زندگانی بے نظیر — ۸/

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابو البشر — ۸/
- حقائق اسلام — ۴/
- اثبات واجب الوجود — عہ
- قوت خیال — ۴/
- اصول خانہ داری — ۱۲/

منشی حسن الدین خاں خوش
- جمیلہ خاتون — ۳/
- قومی گیت — ۵/
- زنانہ خطوط — ۵/
- لیڈی اکبر علیہ خانم — ۱۲/
- تاثیر صحبت — ۱۲/
- حوران جنت — ۴/
- رفیق مرزا — ۴/
- ناصح مشفق — ۳/

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز — عہ
- وکرم اروسی — عہ

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ — عہ
- المدنیۃ والاسلام — ۸/

پروفیسر نواب علی
- تذکرۃ المصطفیٰ — ۴/
- معارج الدین — ۸/

مہاتمے پرکاشند یو
- حضرت محمد صلعم — ۵/
- مہاتما بدھ — ۱۰/
- خدا اور روح — ۱۲/
- مارٹن لوتھر — ۸/
- سیر المستورات — ۱۲/
- بچوں کی کہانیاں — ۴/

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المعلمین — ۷/
- معیار الاخلاق — ۶/
- تنقید لطیف — ۵/
- تربیت اولاد — ۴/

سید رفیع موہانی
- تاج ونشان — ۴/
- دستار و کلاہ — ۸/
- گنج شائگان — ۴/

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۴/
- شمع و شاعر — ۴/
- بلال — ۱/
- شکوہ — ۲/
- جواب شکوہ — ۳/
- نالۂ یتیم — ۳/
- فریاد امت — ۳/

نیاز فتح پوری
- ایک شاعر کا انجام — ۱۲/
- عائشہ صدیقہ — ۱۲/
- جذبات بھاشا — ۱۲/

منشی پریم چند
- پریم پچیسی — ۱۲/
- سیر درویش — ۲/

سیماب اکبرآبادی
- بنت الرسول — ۵/
- جام کوثر — ۵/
- بہشتی جوہر — ۱۲/

ارشد تھانوی
- حسن تخیل — ۱۲/
- بیاض ارشد — ۸/

سید ابراہیم عجمی
- جاپان — ۸/
- جنگ روس و جاپان — ۸/

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ۴/
- روزنامہ با تصویر — ۴/
- ″ بلا تصویر — ۱/
- روزنامچہ — ۲/
- تسخیر مہر و قہر — ۱/
- رسول کی عیدی — ۱/
- پیاری بکری — ۱/
- آثار تین مطبوعہ دہلی — ۱/
- گانا خاتون — ۱/
- اسلام کا انجام — ۱/
- بیوی کی تعلیم — ۱/
- انتخاب توحید — ۱/
- میلاد نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں — ۱/
- فلسفۂ شہادت — ۱/
- غدر دہلی کے افسانے
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- جگ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- اسرار — ۱/
- کم ٹوموت
- سیر دہلی

مولوی مصباح الدین
- الہاروں — ۸/
- محاربہ ... — صہ
- مصباح الادب — ۴/

حکیم محمد علی خاں
- عبرت کامل — ہے
- حسن سرورہ — ۸/
- دیول دیوی — ۸/
- گورا
- نیل کا سانپ — ۸/
- جعفر و عباسہ — ۱/
- اختر حسینہ نکال — ۲/

مولانا راشد الخیری
- منازل السائرہ — ۴/
- شام زندگی — صہ
- الزہرا — ۱۲/
- سات روحوں کے اعمال نامے — ۲/

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس — ۸/
- افسانۂ مغرب — ۸/

مولوی معین الدین
- اورنگ زیب — صہ
- بد مزاج شوہر — ۱/
- راکھ یتیم — ۱/

سلطان حیدر جوش
- ابن سلیم — ۸/
- نواب محمد — صہ
- انتقامات زمانہ — ۱/
- مساوات — ۸/

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ

منشی امیر مینائی مرحوم

صنمخانۂ عشق	سے
مرآۃ الغیب	۱۲ر
خیابانِ آفرینش	ہر
قصیدۂ منشی امیر احمد	ہر

مولانا عبدالحلیم شرر

جنید بغدادی	عہ
ابو بکر شبلی	عہ
خواجہ حسین البصری	۴ر
مصر قدیم	ہر
حسن بن صباح ملیسیہ	عا
تاریخ سندھ	۱۲ر
فردوس بریں	۱۰ر
تاریخ یہود	۱۰ر
ملکۂ زنوبیہ	۳ر
الحکم بالرقاعیہ	۳ر
آغائی صاحب	عہ
سکینہ بنت حسین	۴ر
مخدرات جلیلہ	مہ
تذکرۂ مشاہیر عالم	ہر
زوال بغداد	ہر
نعیبۂ فتن	عہ
حسن بن صباح	۶ر
افسانۂ قیس	۳ر
مقدس نازنین	عہ
عیش بیگی	ہر
ایام عرب	ہر
حسن انجلینا	۸ر
منصور موہنا	۸ر
شہید وفا	۵ر
دلکش	۹ر
دلچسپ کابل	ہر
میوۂ تلخ	۴ر
ماہ ملک	عا
شوقین ملکہ	ہر
ملک العزیز ورجنا	ہر
یوسف و نجمہ	ہر
زیاد و حلاوہ	عا
رومۃ الکبریٰ	ہر
فلورا فلورنڈا	عا
زمانۂ اور اسلام	۳ر
فردوس بریں	۵ر
آغا صادق کی شادی	۱۰ر
بدر النساء کی مصیبت	۳ر
حسن کا ڈاکو	ہر
دربار حرامپور	۱۰ر
خوفناک محبت	ہر
الفانسو	۱۲ر
فلپانا	ہر
فاتح مفتوح	ہر
ہندوستان کی موسیقی	۴ر
سرسید کی دنیا ترقی	۲ر

مسٹر انیس احمد

ارجمند کی کامیابی	۶ر
بحرۂ جنگ	ہر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین	۶ر
حاجی بغلول	۸ر
پیاری دنیا	۱۰ر
طلسمی فانوس	عا
طرحدار لونڈی	۸ر
نشیلی چھری	۴ر
کایا پلٹ	۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پی کہاں	۶ر
بچھڑی دلہن	۸ر
کرم دھم	۶ر
پی کہاں	۶ر
کامنی	ہر
جام سرشار	عہ
خدائی فوجدار	عا
فسانۂ آزاد	سے
سیر کہسار	عمہ

منشی احمد علی شوق

ترانۂ شوق	۸ر
قاسم و زہرہ	۱۲ر
عالم خیال	۸ر
سکینۂ مولوی	۴ر
(مجموعۂ نظم)	
حسن ـ ناتمام ـ شیدائیہ	
بہار ـ برسات	

جلال مرحوم

مفید الشعراء	۶ر
نظم نگارین	عہ
افادۂ تاریخ	۸ر
رسالہ تذکیر و تانیث	۶ر

مرزا رسوا بی اے

امراؤ جان ادا	۱۲ر
لیلیٰ مجنوں	مہ
نو بہار	۲ر

جوالا پرشاد برق

مرنالنی	۱۰ر
مار آستین	۱۰ر
بنگالی دلہن	۱۲ر
پرتاپ	۶ر
معشوقۂ عرب	۶ر
بروگ	۵ر
اتھیلو	۲ر
روہنی	۸ر

منشی محمد حنیف مرحوم

اکبر	صہ
اورنگ زیب	عہ

خواجہ عشرت

زبان دانی	۴ر
اصلاح زبان اردو	۴ر

مولانا عبدالشکور

علم الفقہ	عہ

علامہ سید احمد

حمایت الاسلام حصہ ۱	عہ
حمایت الاسلام حصہ ۲	۱۲ر
فن ہیئت	۸ر
فن کمیسٹری	۶ر

منشی احمد علی مرحوم

تاریخ تمدن	ہر
شباب لکھنؤ	ہر
مرقع اودھ	۶ر

مسٹر عبدالماجد

فلسفۂ جذبات	صہ
فلسفۂ اجتماع	عہ
غذائے انسانی	۲ر
فلسفہ کی تعلیم	۲ر
زود پشیمان	۸ر

مسٹر حسین قدوائی

ذکر طیب محمد عربی	۱۰ر
مشیر	۸ر
عرض حال	۱ر
جذب دل	۲ر
حاکم و محکوم	عمہ

مطبوعات الناظر پریس

قواعد اردو	م
کلیات محسن	ہر
محاربات صلیبی	صہ
رموز فطرت	عا
ازواج الانبیا	ہر
تسخیر فرانس	۸ر
واقعات کربلا	ہر
الاحسان	۸ر
سلاد جنجی بی برجم	۴ر
حیات نظامی	۴ر
جمیل و ثمینہ	۳
سیکفرن لوسی	۲ر
اتفاقات زمانہ	۱ر
شوکیہ	۱ر
نادان خداپرست	۱ر
مصنوعی شوہر	۲ر
زود پشیمان	۸ر
نو بہار	۲ر
خوان دعوت	عہ
کنولا	عا
واقعات انیس	عا
جمیلہ کی ناکامیابی	ہر
جواہر التفاسیر	ہر
خیالات آئیاتی	ہر
خواب گنگا	ہر
نشتر	ہر

الناظر بک ایجنسی ـ لکھنؤ

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۱۰۲ جلد ۱۷ یکم دسمبر ۱۹۱۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰۲ جلد ۱۷ — یکم دسمبر ۱۹۱۷ء

ملک چین کی شادیاں

فلکیوں (جیسا کہ چین والے اپنے کو کہا کرتے ہیں) کی معاشرت پر روح اور عالم ارواح کے متعلق انکے خاص خیالات کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے - بلکہ زیادہ موزوں ہوگا اگر کہا جائے کہ انکی معاشرت انکے خیالات کا آئینہ ہے - انکی پُرجوش تمنا اولاد ذکور کی مذہبی جوش کی سرحد تک پہونچی ہوئی ہے - پُرانے یہودیوں کی طرح وہ صرف یہی نہیں سمجھتے تھے کہ بڑے کنبہ والا آدمی بہت خوش نصیب ہے بلکہ اُنکا ایمان ہے کہ گذشتہ لوگوں کی ارواح اولاد ذکور کے ہاتھ سے بطور نذر و نیاز کوئی تحفہ پاکر محظوظ ہوتی ہیں - آبا و اجداد کی پرستش انکے مذہب کا ایک لازمی اور دلچسپ رُکن ہے - انھیں خیالات کے ذریعہ سے قدیمانہ روش کو برقرار رکھنے کے لیے نوجوانوں کو تعلیم دی جاتی ہے کہ بیاہ کرنا اور بچوں کو پرورش کرنا ایک متبرک فرض ہے - بادی النظر میں یہ تعلیم ضروری اور اچھی معلوم ہوگی لیکن بدقسمتی سے یہ بھی اُن وجہوں میں سے ایک وجہ ہے جو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہیں - والدین اپنی کُل اولاد سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بلالحاظ

اپنی تندرستی و صحت کے بیاہ کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ پادری گرے اپنی مشہور کتاب تاریخ چین' میں ایک معزز خاندان کے ایک نوجوان کا حال لکھتا ہے کہ اُسکے والدین کو اطبا سے جب یہ اطلاع ملی کہ وہ اب کچھ دنوں کا مہمان ہے تو فوراً اسکی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تاریخ مقررہ پر دُلھن بہت تزک و احتشام سے گھر لائی گئی۔ رسم ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ لوگ دولھا کو اُٹھا کر بستر علالت پر لے گئے جہاں وہ چند گھنٹے کے بعد مرگیا۔

اب چین والے بہت کمسنی میں شادی کر لیتے ہیں۔ گو یہ بات اُنکے رسوم قدیمہ اور صحیفۂ مراسم کے خلاف ہے۔ اُنکی کتابوں میں لکھا ہے کہ انسان بیس برس کی عمر سے پہلے سن رشد کو نہیں پہونچتا ہے۔ اُسکے ادراک کی نشو و نما ناکمل رہتی ہے۔ اس قول کی صداقت ہم پر اُسوقت واضح ہو جاتی ہے جب ہم یونیورسٹیوں کے اس عمر کے انڈر گریجوایٹوں کو خیال کرتے ہیں۔ اُنکے ہاں تیس برس کی عمر پختہ سمجھی جاتی ہے۔ چالیس میں انسان اوسط درجے کا حاکم ہو سکتا ہے اور پچاس برس میں بڑی ذمہ داریوں کے عہدوں پر مامور ہونے کے لائق۔ کوئی عورت ۱۴ برس سے پہلے بیاہ نہیں کر سکتی مگر ۲۳ برس تک بن بیاہی رہنا بھی اُسکے لیے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ والدین کے لیے بچوں کی شادی کا سامان کم سنی ہی میں کرنا ایک عام بات ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ دو دوستوں نے آپس میں عہد و پیمان کر لیا یا قسمیں کھائیں کہ اگر دونوں کے اولاد ہوئی تو اُنکو آپس میں بیاہ دینگے۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ اس قسم کا عہد و پیمان ہمارے ملک (انگلینڈ) میں بالکل عنقا ہے۔ مگر یہ واقعہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمکو نہایت معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مشہور عالم الٰہیات مسٹر ویٹرٹن نے اپنے عزیز دوست کی لڑکی سے شادی کی جس سے وہ اُسکی پیدایش کے قبل ہی منسوب ہو چکا تھا۔ دونوں نے اس بیاہ سے نہایت خوش زندگی بسر کی۔ گر مسز ویٹرٹن (اہلیۂ ویٹرٹن) ایک آدھ ہی سال کے بعد انتقال کر گئیں۔

مندرین جس صوبے کا حاکم ہوتا ہے وہاں کی کسی عورت سے بیاہ نہیں کر سکتا۔ یہ قانون اس لیے نافذ کیا گیا تاکہ ایک خاندان اُس ضلع کے دوسرے خاندانوں پر بیجا قدرت حاصل نہ کرے۔

اگر وہ اس قانون کا لحاظ نہ کرکے دوسری بیوی کر بھی لے تو یہ شادی ناجائز قرار دی جاتی ہے اور وہ شخص اُتنی دُرّے کھانے کا سزاوار ہوتا ہے۔ آیا وہ واقعی اس طرح کی سزا پاتا ہے یا نہیں؟ میں نہیں کہوں گا۔ شاید اس حکم کی وقعت تعمیل سے زیادہ اُسکی عدم تعمیل میں ہے۔ اور سرکاری افسروں کی حالت اسقدر تباہ ہے کہ وہ اس سے نکل بھاگنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتا ہے۔ نقال، سپاہی، ملاح، اور غلام کو اپنے پیشے کی عورتوں کے سوا، اوروں سے شادی کرنے کی ممانعت ہے۔ عورت یا مرد اپنے کسی عزیز کے ایام غم کے اندر بیاہ نہیں کرسکتے۔ شادیاں ہر مہینے میں ہوا کرتی ہیں مگر سال کا آٹھواں مہینہ عموماً لگن کا مہینہ کہلاتا ہے۔ جب یہ زمانہ آتا ہے تو کتابیں شادی کے گیتوں سے بھری ہوئی دوکانوں کے اندر دکھائی دیتی ہیں۔ چین والے "شادیاں آسمان پر ہوتی ہیں" کے مسئلہ کے بہت قائل ہیں اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ بڑے تقدیر پرست ہیں۔ اور اسی لیے انکو یقین ہے کہ والدین اپنے بچوں کے بیاہ کا انتظام کرنے میں خواہش آسمانی کے تابع ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب والدین لڑکے کی دُلھن کا بندوبست کر چکتے ہیں، تو لڑکی والے انجام میں (شاید غربت کی وجہ سے) امروز فردا کرتے ہیں۔ منگیتر بے چین ہو جاتا ہے اور اُسکے نزدیک اگر نفس الواقع کوئی معقول وجہ توقف کی نہیں پائی جاتی ہے تو وہ قانون کو ہاتھ میں لے لیتا ہے اور زبردستی لڑکی کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دوسری نظیر ہے "گرفتاری کی شادی" کی رسم قدیم کی۔ لڑکے کے چند عزیز یا دوست اسکے ہمراہ ہوتے ہیں تاکہ وقت پر مدد دے سکیں۔ مگر اس ... لگنے کی رسم کو اُسکو خود اپنے ہاتھ سے کرنا لازمی ہے، اس لیے وہ اپنی منسوبہ کے گھر کے پیچھے چھپکر گھات میں بیٹھا رہتا ہے جوں ہی لڑکی باہر نکلتی ہے (ممکن ہے کہ پہلے سے کہی سنی بھی ہو) ووں ہی لڑکا اُسکو اپنے قبضے میں لاکر گھر کی راہ لیتا ہے۔ کوئی، سوائے والدین یا بھائی کے مداخلت نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی لطف آمیز کراہت کے ساتھ، اس لیے کہ منگنی تو ہو ہی چکی تھی۔ لڑکے کا لیجانا کوئی

ناجائز فعل قرار نہیں پا سکتا۔

بعض حالت میں لڑکی کے نکل جانے کا صرف اشارہ بیدل والدین کو صلح پر آمادہ کر دیتا ہو دلھن کے گھر میں داخل ہونے پر رسم کے مطابق شادی رچائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ یہ ہو کہ کہیں غلطی سے دوسری لڑکی بدل نہ جائے خاص کر اُن حالتوں میں جہاں کل گفتگو متعلق شادی شاطہ کے ذریعے سے طے پاتی ہے۔ لڑکے کا ایسے موقع پر بہت خبردار رہنا از بس ضروری ہے۔ اس قسم کی غلطی سے مقدمہ چلنے کا اور پھر سخت سزا پانے کا اندیشہ ہے۔

اگرچہ قاعدہ سے چین کے اعلیٰ گھرانوں میں شادیاں سینٹ کے ذریعہ سے ہوا کرتی ہیں دولھا اکثر اپنی بیوی کو شادی کے دن سے پہلے کبھی نہیں دیکھتا ہے۔ مگر ہر قاعدہ کے ساتھ استثناء کا ہونا لازمی ہے۔

عشق کی شادیاں، اور جنکو ہم لوگ "فراری شادی" کہتے ہیں، بالکل معدوم نہیں ہیں۔ اکثر سنا گیا ہے کہ لڑکیاں جنکی منگنی ہو چکی ہے کسی دوسرے دولھا کے ساتھ فرار ہو گئیں۔ وہ لڑکا خواہ ہمسائے کا ہو جس سے پہلے ہی آنکھ لڑ گئی تھی، جس کا پہلے ہی جادو چل گیا تھا اور یہ دل دے چکی تھی۔ یا قرابت کا۔ لیکن افسوس! اُنکی گرفتاری کا نتیجہ جیلخانہ ہے۔

یہ خیال کرنے کے بعد کہ شادیاں کس بُری طرح ہوا کرتی ہیں کوئی تعجب نہ ہوگا اگر امن امان آرام و عافیت کو اُن گھروں سے ہم مفقود پائیں۔ متعدد بیویوں کی موجودگی سے (غربا اس سے بری ہیں) جو رشک و حسد اور شکر رنجیاں پیدا ہوتی ہیں اُن سے قطع نظر کرکے بھی اتنا ضرور ہے کہ ایسے زن و شوہر جو قبل شادی کے بالکل اجنبی تھے ہرگز امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ زندگی خوشی کے ساتھ بسر کریں گے۔ غریب عورتوں کو بہت سی مصیبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ وہ اپنے خاوند و آقا کے تابع رہتی ہیں جو اکثر بڑے خوفناک ظالم ہوا کرتے ہیں۔ ملک کے بعض حصوں میں مرد "زم" (زن مُرید) کہلانے سے اس قدر خوف کھاتے ہیں کہ اپنی بیویوں کو مجمع عام میں محض اس غرض سے مارتے ہیں کہ اُنکے ہمسایہ اور احباب سمجھیں کہ وہ گھر کے زبردست مالک ہیں۔

Tesuit لوگوں کا ایک پادری جو چین میں کئی سال تک رہا ہے اور جسکو وہاں کے لوگوں کے حالات و اطوار معائنہ کرنے کے خاص مواقع حاصل تھے۔ لکھتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک عورت کو خون میں نہائے ہوئی اور قریب المرگ دیکھا - دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اُسکے شوہر نے اُسکو اس لیے مارا ہے کہ اُسکے ذہن میں یہ گمان پیدا ہوا تھا کہ شاید اُسکے ہمسائے اُسپر اس لیے ہنستے ہیں کہ اب تک بیوی کو کیوں نہیں مارا — رشک و حسد اور سازشوں کے بارے میں مسٹر گرے قول متذکرۂ بالا کی تصدیق کرتے ہیں اور لکھتے ہیں "میں نے کثرت سے گھروں میں جگر خراش مناظر دیکھے ہیں - ایک رقیب کے باطل اتہام پر چینی شوہر اپنی بیوی کو گھر سے بدر کر دیتا یا کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالتا ہے۔"

چند نوجوان عورتوں میں ان خوفناک مظالم کا احساس اس درجہ ہوا ہے کہ وہ قابل ستایش دلیری کے ساتھ کھلے بند زوجیت کی قید میں آنے سے انکار کرتی ہیں - یہی پادری صاحب فرماتے ہیں کہ نواحِ کنیٹن میں صرف ایک گلی کے چار ایسے گھروں سے واقف ہوں جہاں کی عورتیں بیاہ کرنے سے قطعی انکار کرتی ہیں - کوئی راہبہ ہو جاتی ہے کوئی خودکشی کر لیتی ہے مثلاً ڈنکونگ کے عہد سلطنت میں پندرہ لڑکیوں نے جنکی منگنی ہو چکی تھی ایک جگہ اکٹھا ہو کر آپس کے مشورہ سے مرجانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اپنے گاؤں کے پاس والی ندی میں جو دریائے کینٹن کی شاخ ہے سب مل کر کود پڑیں - اُنکی قبریں فوچون کے نزدیک مزارِ دوشیزگاں کے نام مشہور ہیں - ۱۸۷۳ء میں اسی طرح چند لڑکیوں نے عمدہ ترین لباس میں آراستہ ہو کر رات کی اندھیری میں اپنی اپنی جان کا خاتمہ کر ڈالا - بہت ممکن ہے کہ اس تیس برس میں یورپین اقوام کے میل جول اور پادریوں کے اثر سے کچھ حالت بدلی ہو لیکن اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ تیس برس پہلے جب جیسئٹ پادری نے اپنا تجربہ قلمبند کیا تھا، چینی عورتوں کی حالت قابل افسوس تھی اسکے خاص الفاظ یہ ہیں :—

چین کی عورتوں کی حالت بہت رحم کے قابل ہے - رنج، محتاجی، تحقیر اور ہر طرح کی

مصیبتیں اور ذلتیں انکے ساتھ گہوارے سے قبر تک لگی رہتی ہیں۔ انکی پیدائش ہی خاندان کے لیے باعث تحقیر ذات سمجھی جاتی ہے۔ اور آسمانی لعنت کی بین علامت۔ اگر اسی وقت انکی گردن گھونٹ نہ دی گئی تو بھی عمر بھر وہ خوار و ذلیل اور بنی نوع انسان سے خارج تصور کی جاتی ہیں اور انکے ساتھ سلوک بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے۔"

ملکیوں کے ملک میں (جہاں شادی اور موت دونوں موقعوں کے اخراجات اکثر بیچارے غربا کو پیس ڈالتے ہیں) امداد باہمی کا اصول نامعلوم نہیں ہے۔ اگر کوئی خاندان اتنا سرمایہ مہیا نہیں کر سکتا کہ حیثیت کے مطابق شادی کا سرانجام کر سکے تو ایک انجمن قائم ہوتی ہے اور وہ اس بار کو اپنے اوپر لے لیتی ہے۔ اس خاندان کا دوست یا عزیز جسکو خاص دلچسپی ہے لوگوں کے آگے ٹوپی لے جاتا ہے۔ اگلے زمانے میں انگریزوں اور اسکوٹ کے ہاں کی پینی ویڈنگ بھی اسی اصول یعنی باہمی امداد پر ہوا کرتی تھیں۔ چین کے اعلےٰ طبقے کے لوگوں میں کم از کم چھ نمایاں رسوم شادی کے متعلق ہیں۔ گر غربا میں یہ کم ہیں۔ سب سے پہلی بات شادی کی نسبت طے کرنا ہے یہ شاطہ کے ذریعہ سے طے ہوتی ہے جس کا ذکر ابھی آگے آئیگا۔ دوسری لڑکی کا نام، اسکی پیدائش کا دن اور مہینہ۔ اُسکے والدین سے دریافت کرنا تیسری لڑکی کے والدین نجومیوں سے شادی کے نحس یا سعد ہونے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ چوتھی، نسبت پختہ کرنے کی غرض سے لڑکے کی طرف سے تحائف بھیجے جاتے ہیں۔ پانچویں، شادی کی تاریخ کا مقرر ہونا اور چھٹی دلھن کو جلوس کے ساتھ دولھا کے گھر پہونچانا۔ یہ سب گویا اصل شادی کی رسوم کے دیباچے ہیں۔ ان رسموں کی تعمیل میں سر مو فرق نہیں ہو سکتا۔ دونوں سمدھیوں کے درمیان جو مراسلات ہوتے ہیں اُنکے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ چین والے بھی مہذب اور شائستہ خطوط نویسی میں کسقدر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مثلاً جب باپ سے لڑکی کا نام دریافت کیا جائے تو اسکو اس قسم کے الفاظ میں جواب دینا چاہیے:۔

"میں نے الطاف نامے کو عزت کے ساتھ قبول کیا۔ میری لڑکی کا انتخاب جو آپ نے اپنی بہو بنانے کے لیے کیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میرے غریب اور مٹے ہوئے خاندان کی اُسکی حیثیت سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ میری لڑکی اجہل اور احمق ہے اور مجھ میں اُسکی اچھی پرورش و پرداخت کی صلاحیت نہ تھی مگر ایسے موقع پر آپ کے حکم کی تعمیل میں ہماری عزت ہوگی۔ آپ دوسرے صفحہ پر لڑکی اور اُسکی ماں کا نام اور سالِ ولادت درج پائیں گے۔"

جب تحائف بھیجے جا چکتے ہیں اور تاریخ شادی کے تعین سے بھی خبر ہو جاتی ہے تو وہ ان الفاظ میں جواب دیتا ہے :-

"آپ کے آخری ارادے سے آگاہی ہوئی۔ آپ کی مرضی ہے کہ یہ شادی ہو ہی کر رہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میری لڑکی میں وہ صاف حمیدہ نہیں ہیں۔ اُس نے حسب خواہ تعلیم نہیں پائی۔ مجھے خوف ہے کہ شاید وہ بالکل نکمی ثابت ہو۔ مگر چونکہ سال موافق ہے اس لیے منھ موڑنے کی بات نہیں۔ آپ کا تحفہ سرآنکھوں پر۔ تاریخ معینہ سے بالکل اتفاق رکھتا ہوں۔ مناسب تیاریاں کرنے کا خیال رکھوں گا اور تسلیم بجالاتا ہوں۔"

یونیم خوشی کے لگ بھگ جو زمانہ گذرتا ہے وہ دُلھن، اُسکے اعزا اور اُسکی سہیلیوں کے لیے غم و الم کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسکو بار بار ظاہر کرنا چاہیے کہ والدین کی جدائی کا رنج اُسکی برداشت سے باہر ہے۔ ایسی جدائی سے موت بہتر ہے۔ اور جب ہم لوگ چینی بیویوں کے مصائب پر نظر ڈالتے ہیں تو اُنکا یہ غم کچھ بجا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کے اظہار محبت کے لیے دس پندرہ دن الگ کر دیے جاتے ہیں اور کبھی پورا مہینہ۔ یہودیوں کے ہاں بھی اسی قسم کی رسم تھی جیسا کہ اُنکے صحیفہ کے اس جملہ سے ظاہر ہوگا۔

"اور وہ اپنی گرفتاری کا لباس اپنے بدن سے اتارے گی۔ اور تیرے گھر میں رہکر ایک مہینہ ماں باپ کی جدائی پر آنسو بہائے گی۔"

برات سے ایک رات پہلے دُلھن کی خواصیں اس زور سے چیختی چلاتی ہیں کہ اُنکی آواز ہمسایہ کے مشاغل میں خلل انداز ہوتی ہے۔ کسی نیک ساعت میں لڑکی کا باپ جہیز کا کُل سامان دولھا کے گھر بھیجدیتا ہے۔ اس میں نمایش سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اُسکی فیاضی کو دیکھیں۔ یہ چیزیں سرخ جامہ والے آدمیوں پر جلوس کے ساتھ جاتی ہیں۔ برات کے دن دولھا کے گھر میں ایک دعوت کا سامان ہوا کرتا ہے۔ کھانے کے کمرہ کے پورب اور پچھم میزیں لگائی جاتی ہیں۔ شراب کے چار پیالے جو عموماً کدو کے چھلکے کے بنے ہوتے ہیں، دروازے کے پاس ایک میز پر سج دیے جاتے ہیں۔ اُنکے نام "ہاکین" یا جامِ وصل ہیں۔ صحن میں ایک میز پر دولھا کے لیے عمدہ سے عمدہ کھانے رکھے جاتے ہیں۔ ملاقات کے کمرہ میں نوشاہ آکر باپ کے آگے سر جھکاتا اور دو زانو ہوکر چھ مرتبے سر گراتا ہے اور باپ سے ایک پیالہ اس شراب کا اور ان الفاظ میں دُلھن کے لانے کا حکم پاتا ہے:۔ "صاحبزادے، جاؤ! اور بیوی کو ڈھونڈھ لاؤ۔ دیکھو ہر کام میں ہوشیاری اور عقلمندی سے کام لینا"۔

زمانہ ہوا کہ لڑکا خود دُلھن کو ڈھونڈھنے جاتا تھا۔ جلوس کا آگے بڑھکر استقبال کرتا تھا۔ مگر ایسا اب شاذونادر ہوتا ہے وہ صرف پالکی بھیجدیتا ہے۔ (باقی آیندہ)

محمد بذل الکریم (علیگ)

(ترجمہ)

عجیب لذت محبت میں آ رہے ہیں مجھے — میں چھیڑتا ہوں اُنھیں وہ ستا رہے ہیں مجھے
یہ مدعا ہے کہ مرجائیے یہ بھی توڑ کے سر — وہ کوہکن کا فسانہ سُنا رہے ہیں مجھے
نہیں ہے نیند بھی جب سے یہ خواب دیکھا ہے — کہ سو رہا ہوں میں اور وہ جگا رہے ہیں مجھے
الٰہی حشر تلک اب میں نہ ہوش میں آؤں — وہ اپنے گیسوئے مشکیں سُنگھا رہے ہیں مجھے
جِلا رہے ہیں کسی کو کسی کو مارتے ہیں — وہ اپنے حُسن کی قدرت دِکھا رہے ہیں مجھے
جو میری جان کے خواہاں ہیں خود چلے آئیں — فرشتگانِ اجل کیوں ستا رہے ہیں مجھے
اک آدمی ہوں - نہ میں شمع ہوں نہ پروانہ — حضور کسلیے آخر جلا رہے ہیں مجھے
بتائیں اُنکی نہیں قابلِ ملال قسم — وہ کس رہے ہیں مجھے آزما رہے ہیں۔

فلسفۂ تاریخ

تاریخ کے لغوی معنی نہایت ہی صاف اور سادے ہیں "گذشتہ واقعات کو نثر میں بیان کرنا" تاریخ ہے۔ لیکن اگر کوئی موہوم اور غلط واقعہ تاریخ کے رنگ میں بیان کیا جاوے تو وہ ہرگز تاریخ کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی صحیح اور بالکل درست واقعہ نظم میں تحریر کیا جائے تو وہ تاریخ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فی زمانا بہت سے واقعات اور صحیح واقعات نظم میں موجود ہیں لیکن ہم اُنکو تاریخ نہیں کہ سکتے۔ کیونکہ نظم کا مبالغہ آمیز ہونا بدیہی ہے اور تاریخ کو مبالغہ سے کوئی سروکار نہیں۔ بطور مثال کے، اور بیان کو بیّن اور واضح کرنے کے لیے آپ شاہنامہ کو لے لیں۔ یہ ضخیم کتاب تاریخ کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اور اصل میں اسکا مقصد بھی بعض تاریخی واقعات کا بیان کرنا تھا۔ لیکن یہ کتاب نظم میں ہے اور بالآخر مبالغہ آمیز ہونے کی وجہ سے تاریخ کے لقب سے ملقب نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح برٹن صاحب کی لکھی ہوئی سوانحعمری قیصر اغسطس (جو روما کا ایک عظیم بادشاہ گذرا ہے) اپنے طرزِ تحریر اور مبالغہ آمیز ہونے کی وجہ سے تاریخ کے پایہ کو نہیں پہونچ سکتی۔ لیکن صرف واقعات کو تحریر کر دینا ہی "اصلی تاریخ" نہیں ہے۔ بعض بعض جنتریوں میں ہر تاریخ کے مقابلہ میں کوئی نہ کوئی گذشتہ واقعہ لکھا ہوا آپ کو ملے گا۔ تو کیا ہم جنتری کو تاریخ کہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تاریخ اُسی وقت تاریخ کہے جانے کی مستحق ہے جب کہ اُس میں واقعات کے پہلو بہ پہلو اخلاقی، تمدنی، اور اقتصادی حالات بھی نہایت تشریح کے ساتھ بیان کیے گئے ہوں۔ اور مختلف اوقات میں سوسائٹی کے زوال اور ترقی کے حالات کا تذکرہ بھی موجود ہو۔ مثلاً اگر یورپ کی تاریخ لکھی جائے تو اُس میں یہ بھی شامل ہو کہ سترہ صدی عیسوی میں یورپ کی تمدنی اور اخلاقی حالت کیا تھی اور یہ حالت ۱۸ صدی کے اخیر میں ترقی پذیر ہو کر کیا سے کیا ہو گئی۔ یہ ترقی کن اسباب اور وجوہ پر مبنی تھی۔ اور یورپ کن واقعات سے متاثر

ہو کر اس قدر سرعت اور تیزی کے ساتھ ترقی کر کے سب سے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہونچ گیا۔
وحشیوں میں کسی قسم کی تاریخ کی موجودگی محال ہے۔ کیونکہ انکو خانہ جنگیوں کی وجہ سے سوشل واقعات کو تحریر کرنے کا خیال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ انکی عقل ابھی ترقی کے اُن مدارج پر نہیں پہونچی جبکہ اس قسم کا خیال پیدا ہو سکے۔ اور ایسا ہونا کسی وقت تک محال ہے جب تک کہ مختلف افراد انسانی سے اُنکی یگانگت اور میل جول قائم نہ ہو جائے۔ اور اگر اُن میں خانہ جنگی قائم رہی تو ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اسکے برعکس بعض ایسے ممالک بھی موجود ہیں جو اگرچہ ترقی کر گئے ہیں، لیکن اُن میں تاریخ مرتب کرنے کا مصالحہ موجود نہیں۔ بعض میں ذات پات کے قیود اور دیگر ممالک میں اسی قسم کے اور وجوہ تاریخی مصالحہ کے جمع ہونے سے مانع رہے اور اُنکی عمدہ اور مشرح تاریخ نہ لکھی جا سکی۔

"اصلی تاریخ" کا زمانہ چار ہزار سال ہوئے کہ شروع ہوا۔ جبکہ سب سے پہلے پُرانا عہد نامہ تحریر کیا گیا۔ اسکے بعد سے تہذیب کی روشنی بحر روم کے ساحل پر طلوع ہو کر جوں جوں بڑھتی گئی تاریخ کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔ سب سے پہلے یونانیوں نے اس نئی روشنی سے فائدہ اُٹھا کر اپنے ملک کی تاریخ لکھی۔ اور ایک نئے طرز تحریر کی بنیاد ڈالی۔ یونانیوں کے بعد جب رومیوں نے ترقی کر کے یونان پر قبضہ کر لیا تو جہاں اور چیزیں اُنکو ورثہ میں ملیں وہاں علم تاریخ بھی اُنکے ہاتھ لگا اور آخر تک وہ یونانیوں ہی کے قائم کردہ اصولوں کی پیروی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ نئے سائنٹفک انکشافات نے نئے طرز تحریر کی بنیاد ڈالی۔ اور بعدہٗ ایک نیا تاریخی زمانہ شروع ہوا۔
پُرانے طرز تحریر میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ واقعات کے متعلق تحقیق کرنے کی اس قدر زیادہ پروا نہیں کی جاتی تھی۔ اُس زمانے کے تاریخ نویسیوں کی اصل غرض، و غایت انسانی جذبات کو بھڑکانا ہوتا تھا۔ اور یہ طرز اُس وقت کے لیے ضروری اور موزوں بھی تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں یونان، جہاں تاریخ نے نشو و نما پائی، ایران کے مقابلے میں سدم آرا تھا۔ اور ہر ممکن کوشش یونانیوں کو جوش دلانے کے لیے کی جاتی تھی۔ تاکہ وہ ایران جیسے زبردست دشمن کے مقابلہ کے لیے

طیار ہو جائیں اور مفتوح ہو کر ایرانی جہالت کا شکار نہ بنجائیں۔ اس ہونہار قوم کے سر آوردہ اشخاص نے حتی الوسع رزمیہ نظموں اور قصوں سے قوم کو جوش دلا کر ایرانیوں کے قہار لشکر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور بالآخر شکست فاش دیکر اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ ان واقعات اور کوششوں کا اثر تاریخ کے طرز تحریر پر بہت ہی گہرا پڑا۔ اور چونکہ یہ طرز رفتہ رفتہ بہت ہی قائم پسند ہو گیا تھا۔ جس شخص نے جو کچھ لکھا اسی رنگ کو مدنظر رکھکر۔ حتیٰ کہ ہیروڈوٹس نے بھی اپنی تاریخ اسی طرز اور رنگ میں لکھی۔ لیکن یہ طرز دیرپا نہ تھا۔ زمانہ جوں جوں کروٹیں بدلتا گیا اسکا متقاضی ہوا کہ صحیح اور محقق واقعات اسکے سامنے پیش کیے جائیں۔ لیکن مرصع نگاری کے طرز کا ایکدم سے معدوم ہو جانا محال تھا۔ چنانچہ جب صحیح واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی یہ رنگ نہ جاتا تھا نہ گیا۔ ہیروڈوٹس کے بعد تھوسوڈیڈیز نے جنگ پلوپونیس کے واقعات کو نہایت ہی تحقیق کے ساتھ تحریر کیا۔ لیکن رنگ وہی جادوبیانی یا مرصع نگاری کا اختیار کیا۔ اور ہم اس مشہور مورخ کی تاریخ کو اسی رنگ میں رنگین پاتے ہیں۔ اس مرصع نگاری کے طرز کو اس مورخ کے بعد تمام مورخین نے اختیار کیا۔ اور اسی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ اور پیروی کرتے رہے۔ مشہور انگریزی مورخ گبن اور اس یونانی مورخ کے درمیان میں تاریخ کے طرز تحریر میں کسی قسم کا تغیر و تبدل واقع نہ ہوا۔ اور درمیان میں جو رومی مورخ ہوے اُنھوں نے بھی اس میں کچھ تبدیلی نہ کی بلکہ اسی کو نہایت عمدہ جان کر یونانیوں کے قائم کردہ اصولوں کی پیروی کرتے رہے۔

اسکے بعد اسلامی عروج اور عربی فتوحات کا تاریخ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ اُس وقت کی تاریخ کے طرز تحریر کا ہم ایک بالکل ہی نیا رنگ پاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہر طرف ترقی ہی ترقی کا شور و غوغا تھا اور مختلف قسم کی ایجادات اور انکشافات ہو رہے تھے۔ اسکے بعد سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں جنگ صد سالہ کے زمانے میں تاریخ کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں علم تاریخ بالکل مفقود ہو گیا تھا۔ اور کوئی تاریخ لکھنے کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ ایسے زمانے میں جبکہ ہر شخص گذشتہ واقعات کو محض قصہ۔ کہانی اور

گزشتہ لوگوں کو جنگلی، ناتعلیم یافتہ اور وحشی خیال کرتا تھا۔ گذشتہ تاریخ کا لکھا جانا بالکل ناممکن تھا۔ ڈاکٹر جانسن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "ڈیماستھنز کے زمانہ کے اہل اثینیہ Athens بالکل وحشی اور جنگلی تھے"۔ جب گذشتہ واقعات کے متعلق یہ خیالات ہوں تو صحیح اور عمدہ تاریخ کا لکھا جانا بالکل محال بلکہ ناممکن ہے۔ اس اخلاقی کمزوری اور تعصب کی وجہ سے گذشتہ واقعات کو اصل روشنی میں دیکھنے سے اُس زمانے کے لوگ قاصر تھے۔ اور اسی کا یہ بُرا نتیجہ ہوا کہ ان صدیوں میں تاریخ مفقود ہوگئی۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہی۔ ایک نہایت ہی عظیم تغیر ہوا اور جسوقت انگلستان اور جرمنی میں علمی اصلاحات کا دور دورہ شروع ہوا، لوگوں میں گذشتہ واقعات کو نظرِ تعمق سے دیکھنے کی عادت پیدا ہو چلی۔ اور وہ لوگ جو یونانیوں کو ایک زمانے میں وحشی اور جاہل خیال کرتے تھے اور اپنے زمانے کو اُس زمانے پر ترجیح دیتے تھے اب انھیں یونانیوں کو مہذب اور تعلیم یافتہ خیال کرنے لگے اور اُنکی نظروں میں یونانیوں کی وہ عزت قائم ہوگئی جو اُنکے شایانِ شان تھی۔ یونان کے گذشتہ واقعات نہایت ہی عمدہ اور اچھی طرح پڑھے گئے۔ اور اُنکے متعلق ہر ممکن تحقیق کی گئی۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ علمی تحقیقات میں بھی تغیرات واقع ہو چکے تھے۔ زمانہ سلف میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کثرتِ دولت و مال و منال ہی تمام بُرائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہ محقق ہو چلا تھا کہ یہ تمام بُرائیاں کثرتِ دولت کے سبب سے نہیں بلکہ دولت کے غیر مساوی طریقہ پر تقسیم ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی تھیں۔

بہرحال اسی طرح کی علمی تحقیقات سے فائدہ اُٹھا کر تاریخ کا بنظرِ تعمق مطالعہ کیا گیا اور تمام واقعات تحقیق کی روشنی میں لائے گئے۔ اثینیہ کی جمہوریت اور اسپارٹہ کی بشرط سلطنتوں کے متعلق تحقیقات کی گئی۔ رومہ کے پلیبیوں (عام لوگ) اور بڑے پٹیشیوں (روساء جنکے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی یا جو اسکے قابل سمجھے جاتے تھے) کی خانہ جنگیوں کے متعلق تحقیقات کر کے رومہ کی سلطنت کے جمہوریت سے شخصیت کی طرف تبدلات و تغیرات کے واقعات اپنی اصلی روشنی میں دیکھے گئے۔ اور یہ خیال جو دلوں پر منقش ہو گیا تھا کہ رومی اور یونانی محض خیالی لوگ تھے

بالکل مٹا دیا گیا۔ اور ہر واقعہ تحقیق اور تصحیح کی روشنی میں دیکھا گیا۔ اس تحقیق کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ نویسی کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہو گیا جو محقق نگاری کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کا اصل منشا علاوہ واقعہ نگاری کے اُن باتوں کا بھی دریافت کرنا ہے جو ترقی اور تنزل کا باعث اور سبب ہوتی ہیں۔ اور اُن حالات کے متعلق تفتیش کرنا جو ایک سوسائٹی کے رد و بدل کا سبب ہو سکتی ہیں۔ اس قسم کی تاریخ کے تحریر کرنے میں جادو بیانی کی زیادہ پرواہ نہیں کی جاتی ہے بلکہ واقعات کے نہایت ہی تحقیق کے ساتھ لکھنے اور سوسائٹی کے اُن خاص قوانین اور اصول کے دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن میں مقید ہو کر وہ تغیر پذیر ہوا کرتی ہے۔ اسکے برعکس گذشتہ زمانہ میں صرف واقعات کو بیان کرنا تاریخ تھا۔ تاریخ میں ان واقعات سے جو اثر سوسائٹی کے آئندہ حالات پر پڑتا ہے شامل نہ تھا۔ اور نہ تحقیق سے کوئی غرض اور پرواہ تھی۔ صرف جادو بیانی سے کام تھا اور اسی وجہ سے ہم گذشتہ زمانہ کی تاریخ نویسی کے طرز کو مرصع نگاری کے لقب سے ملقب کر سکتے ہیں۔ بہرحال اس طرح تاریخ نویسی کے دو طرز ہو گئے۔

(۱) مرصع نگاری۔ واقعات کو جادو بیانی کی لپیٹ میں تحریر کرنا۔ تحقیق سے کچھ سروکار نہ رکھنا۔ بلکہ واقعات کو صرف سطحی نظر سے دیکھکر اُنکا اثر نہ دریافت کرنا اور نہ ترقی و تنزل کے اسباب دریافت کرنا۔ یہ طریقہ عہد عتیق میں رائج تھا۔ اب بالکل متروک اور مذموم سمجھا جاتا ہے۔

(۲) محقق نگاری۔ نہایت تحقیق اور تفتیش سے کسی واقعہ کو درج کرنا اور اُن واقعات سے سبق حاصل کرکے اُن قوانین کو دریافت کرنا جو ایک سوسائٹی کے تنزل اور ترقی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس میں سوسائٹی کے حالات نہایت تشریح کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اور موجودہ واقعات سے آئندہ واقعات کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے۔ ایک سلطنت کے زوال اور ترقی کے علل اور وجوہ دریافت کیے جاتے ہیں۔ اس میں جادو بیانی سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا۔ یہ طریقہ آج کل رائج اور عام پسند ہے۔

محمد حسین علوی۔ تیرگانوی (متعلم بی۔ اے کلاس)

ترجمۂ رباعیات خیامؔ

(سلسلۂ اشاعت گذشتہ)

مدیاب کہ از روح جدا خواہی رفت (۶) در پردۂ اسرار خدا خواہی رفت
خوش باش ندانی ز کجا آمدۂ مے نوش ندانی کہ کجا خواہی رفت
اس روح سے جبکہ ہو جدا جائے گا (ترجمہ) در پردۂ اسرار خدا جائے گا
خوش رہ نہ یہ جان تو کہاں سے آیا پی مے جہاں جائے گا چلا جائے گا
روزیست خوش و ہوا نہ گرم است نہ سرد (۷) ابر از رخ گلزار ہمی شوید گرد
بلبل بزبان پہلوی با گل زرد فریاد ہمی زند کہ مے باید خورد
کیا دن ہے بہار کا ذرا دیکھ بہار (ترجمہ) دھوتا رخ گلزار سے ہے ابر غبار
بلبل ہے لگاتار یہ فریاد کناں اس وقت تو ہے پھول کے پینے کی بہار
پندے دہمت اگر بہ من داری گوش (۸) از بہر خدا جامۂ تزویر مپوش
عقبےٰ ہمہ ساعتست و دنیا یکدم از بہر دمے ملک ابد را مفروش
رکھتا ہے اگر کان تو سن لے یہ سخن (ترجمہ) یہ جامۂ تزویر خدا را نہ پہن
کچھ فکر وہاں کی کر ہے دنیا چندے کس واسطے عقبےٰ کا ہوا ہے دشمن
خواہی کہ ترا زبیت اسرار رسد (۹) مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غم رزق مخور کین ہر دو بوقت خویش ناچار رسد
ہو غیب سے تربیت اگر ہے منظور (ترجمہ) آزار نہ دے کسی کو حتے المقدور
مت موت کا سوچ کر غم رزق نہ کھا ہونگے یہ دونوں وقت پر اپنے ضرور

(باقی آئندہ)

سید لطف علی (ناگرامی)

التربیت فی الحجاب

پردہ محض اسی وجہ نظرِ حقارت سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ حریت انسان کے منافی ہے، اگر قوم حجاب سے شدت کو جدا کر دے تو پردہ عورات کے لیے نہایت ضروری ہے۔ لیکن اسی قدر جتنا اسلام نے حکم دیا ہے، جو لوگ اسپر اعتراض کرتے، اسکو ہدفِ ملامت بناتے ہیں، وہ حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے، اسپر اعتراض کرتے ہیں، اگر حقیقت میں پردہ پہ نظرِ غائر ڈالی جائے، تو معلوم ہو جائے گا، کہ پردہ بالذات کوئی شے نہیں، بلکہ دراصل پردہ نام ہے قانونِ تحفظِ عصمت وعفت کا۔

ہم کو اس وقت پردہ کے حسن وقبح پہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ ہم یہاں اسکے محاسن یا معائب کا اظہار کریں گے، لیکن، ہاں! ہم یہ ضرور لکھیں گے، کہ پردہ اسی وقت سے عورتوں کا دامنگیر ہوا جب مسلمان اسلامی تعلیم سے دور ہوتے جاتے تھے، اور ہر شخص خود غرضی ونفس پرستی میں مبتلا تھا۔ لیکن ہم اس سے بھی انکار نہیں کرینگے، کہ جن واضعان نے اِسکو ایجاد کیا، وہ بڑے فقیہ ومستند تھے، اور ضرورتِ زمانہ سے واقف، مگر اُس وقت عورتوں کے ساتھ ایسی سختیوں کے برتاؤ نہ کیے جاتے تھے، جن کا قرونِ وسطی سے آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ انکو، ان حقوق سے بھی محروم رکھا جانے لگا، جو شرعِ اسلامی نے انکو دیے تھے، دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ "عورتیں عملاً اپنی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں، اور یہ انکا خلقی ضعف ہے" لیکن، ہمارے خیال میں یقینِ قطعی نہیں، قوانینِ معاشرت میں، عورتیں مَردوں کے مساوی قرار دی گئی ہیں (جو وہ پردہ سے، بجود حقیقت یادگارِ استبداد ہے) ہر وہ طبیعت جس میں، احترامِ حقوق، اور لذۃ حریۃ کا شعور موجود ہے، ایک خاص نفرت کرتی ہے۔

جب یہ امر مسلمہ ہے، کہ عورتوں کی تربیت قومی ترقی کے لیے ضروری ہے، تو اب یہ سوال

پیدا ہوتا ہے، کہ انکو کس قسم کی تربیت دی جائے، آیا اُنکے لیے مردوں جیسی تربیت مناسب ہے، یا کسی دوسری قسم کی؟

ہمارا مقصد، اس صحبت میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کا ہے، اور انشاءاللہ ہم ہر پہلو پر مفصل بحث کریں گے۔

ہم، مسئلۂ اولیٰ میں سوائے اسکے، کہ عورتوں کی تربیت مردوں جیسی ہونی چاہیے کوئی دلیے صواب نہیں دیکھتے۔ خواہ وہ تربیت جسمی ہو۔ کیونکہ عورتوں کو بھی صحت بدنی کے لیے ریاضتِ جسمانی (ورزش) کی ویسی ہی احتیاج ہے، جیسی مردوں کو۔ جب ابتدا سے ان کو صحت کی جانب متوجہ کیا جائے گا، اور انکو ریاضت کے فوائد سمجھائے جائیں گے تو ان امراض سے محفوظ رہیں گی، جو سُستیِ اعضا، و تعطل کے باعث عارض ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ نوامیس طبعیہ علی التوازُن ورزش کے محتاج ہیں، اور اس میں ذرہ بھر بھی فرق آنے سے انکا نظام منتشر ہو جاتا ہے۔ جو امراض قوت کو غیر ضروری مواقع پر استعمال کرنے سے عارض ہوتے ہیں، اتنا ضرر نہیں پہونچاتے، جتنا وہ امراض پہونچاتے ہیں جو قوت کے صرف کرنے اور اُسکے عوض غذائے مقویہ نہ دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ عورتیں جو ابتدا ہی سے آلام و مشقات برداشت کرتی ہیں، کیسے مردوں کے اس بار کی متحمل ہو سکتی ہیں، جو اُنپر تمام عمر بار زر کی طرح محمول رہتا ہے، حالانکہ یہ بار طاقتور، صحیح الجسم، مرد بھی نہیں اُٹھا سکتے۔

۲- خواہ وہ تربیت ادبی ہو۔ کیونکہ قدرت نے عورت کو آداب و اخلاق نوع کا محافظ بنایا ہے، پس یہ جس طرح چاہتی ہے، انکو ڈھالتی ہے۔ اور چونکہ اولاد کے اخلاق و آداب کی اچھائی و برائی، انھیں کے اختیار میں ہوتی ہے، اس لیے انکی تربیت، مردوں کی تربیت ہے۔ اگر عورت کے اخلاق عمدہ ہونگے، تو اس سے عائلہ کے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام قوم میں اسکا اثر پھیلتا ہے اور عائلہ کے ذریعہ کُل قوم مہذب و متمدن ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور عام ہے "صالحہ عورت صالح مرد سے زیادہ نافع ہوتی ہے۔ اور طالحہ عورت، طالح مرد سے زیادہ مضر"

۳- خواہ وہ تربیتِ عقلی ہو، یعنی اس قدر علوم و فنون حاصل کرنا، جس سے انسان موجوداتِ عالم سے خوب واقف ہو جائے، خواہ، اسکا تعلق نفس ہو، یا اسکے گرد و پیش کی اشیا، جس سے وُہ ہر چیز کے ضرر سے محفوظ رہے، اور منافع سے مستفید ہو۔ پس عورتوں کو علم حاصل کرنے کی ضرورت مَردوں کے مساوی ہے۔

اگر عورتیں، اپنے وہ اوقات، جنکو وہ محض لغو اور بیکار گفتگو میں ضائع کرتی ہیں، مطالعۂ کتب میں خرچ کریں، اور اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت میں صرف، تو اُنکے فضل و کمال اور توجہ سے مسلمان ترقی کی جانب تبادر ہونگے، اور ہم پھر اپنی قوم کو اسی منزلِ اعلیٰ وارفع پر دیکھیں گے، جہاں ہمارے اسلاف تھے، اور جہاں اب بھی اُنکی روحیں موجود ہیں۔

عورتوں کو تربیتِ عقلی دینے کا صرف یہی مقصد نہیں ہے کہ وہ نئی نئی زبانیں سیکھیں، کتابیں پڑھیں اور لکھیں، بلکہ مقصدِ عظیم و وحید تو یہ ہے کہ وہ اصول علوم طبیعی و اجتماعی اور تاریخی سے بہرہ اندوز ہوں، حرکات کائنات اور احوالِ امم سے واقف ہوں، کیونکہ تربیتِ اولاد کے لیے ان اصولوں کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی قوانینِ صحت اور وظائف اعضا کے مبادی سے واقفیت کی۔

اس تربیتِ صالحہ میں عورتوں کو علم کی جانب ترغیب و تشویق دلانا، سب سے زیادہ اہم بات ہے، تاکہ وہ اپنے مدارس کی مدتِ تعلیم پوری کریں۔ بعد کو اُنکے لیے کسی معلم و اتالیق کی ضرورت نہیں۔

ان سب تربیتوں کے ساتھ ہی مدارس میں اُس تربیت کی بھی ضرورت ہے جو اُس کا حُسن ہے اور حیاتِ ازدواجی کی روح۔ مدرسوں میں عام طور پر اس ضروری تربیت کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اور بہت کم طالبات مدارس میں تعلیم پانے کے بعد خانہ داری کے انتظامات کو عمدگی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتی ہیں، بلکہ تعلیم کے بعد وہ جادۂ اقتصاد سے ہٹ جاتی اور شوہر کے لیے بلا ثابت ہوتی ہیں۔ اور وادیٔ حیات کی چند روزہ منزل انکے لیے کٹھن ہو جاتی ہے۔

تفنن طبع کے لیے، جنس لطیف کو فنون لطیفہ کی تعلیم بھی دینی چاہیے، جس سے وہ رنج وغم اور امورِ خانہ داری کی کوفت میں محفوظ ہو سکے، اور صحت پر کسی قسم کا کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔

لیکن ہم جانتے ہیں، کہ ہمارے برادرانِ وطن، لڑکیوں کو موسیقی سکھانے کے سخت مخالف ہیں، اور اسے حشمت ووقار کے منافی سمجھتے ہیں، حالانکہ کارزارِ حیات میں شغلہ فرحت بخش، اس سے بڑھکر، اور کوئی نہیں۔ لیکن ہر شخص اسکے فوائد عظیم سے کہاں واقف! مگر جو جانتے ہیں اور اسکی حقیقت سے واقف ہیں، وہ ان دشمنانِ علم وعقل کی جہالت پر افسوس کرتے ہیں۔ افلاطون نے موسیقی کی کیا خوب تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے:-

موسیقی شئے جامد میں جان ڈالنے والی چیز ہے۔ اس سے افکار میں بلندی، اور تخیل میں ترقی ہوتی ہے۔ موسیقی، نفس میں فرحت، اور روح میں سُرور پیدا کرتی ہے، اور اسکو پستی ونکبت سے نکال کر اوجِ کمال کی طرف راغب کرتی ہے، جو عوالِ ادب انسانی سے ہے۔

اسی طرح فن تصویر، جسکے فوائد علم سے زیادہ ہیں، کیونکہ کسی چیز کا علم ہمکو صرف اُسکے حالات وحقائق پیش کرتا ہے، لیکن۔ تصویر کے ذریعہ ہم اُسکی اکمل شکل ظاہر کر سکتے ہیں جس سے وہ علم حد یقین تک پہنچ جاتا ہے۔ پس جس چیز کی حقیقت کو ہم جاننا چاہتے ہیں، سب سے پہلے لازم ہے کہ اُسکی شکل اپنے پیش نظر رکھیں، تاکہ جو کچھ ہمکو منکشف ہو تصویر کے ذریعہ اسکا یقین کُلی ہو جائے۔ اور جب ہم کسی چیز کی تصویر دیکھ لیتے ہیں، تو ہم اس کو اُس سے ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی تربیت ہے، جسے ہم لڑکیوں کے واسطے چاہتے ہیں۔ اور جسے ہم اجمالاً بیان کر چکے یہی وہ تربیت ہے، جو اگر عورتوں کو دی جائے تو عائلہ کے لیے اسباب راحت، اور تربیت اولاد کے لیے صالح ماں بنا سکتی ہے۔!

جب لڑکیوں کی تربیت ان وسائل نمو، قوائے جسمانی وملکات عقل سے پوری ہوگئی، اور اُنکی عمر (۱۴) یا (۱۵) برس کی ہوگئی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ وہ کیسے زندگی بسر کریں آیا پردہ میں رہیں یا آزاد ہو جائیں؟

مسئلۂ حجاب نسواں کے متعلق، اکثر حضرات کا خیال ہے، کہ عورتیں پردہ میں اچھی طرح ترقی کرسکتی ہیں، اور پردہ میں اُنکی تربیت عمدگی کے ساتھ ہوسکتی ہے!

لیکن، ہمارے خیال میں، اِس نقیض و اختلاف کا سبب فہم معنی تربیت کا اختلاف ہے۔

متقدین کے نزدیک تربیتِ نسوانی کے معنی یہ ہیں کہ لڑکیوں کو چند (یعنی ۳-۴) برس کمسنی میں پڑھوانا چاہیے۔ یعنی وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ لڑکیاں ورق، دوورق کی تلاوت سے جس کا نام ظرفا نے (جلدالمحار) رکھا ہے، علم و ادب میں منتہی ہوجاتی ہیں۔ مگر ہم، اس اعتقاد کے سخت مخالف ہیں، اور ہمارا خیال ہے کہ تربیت ایک مدت قلیل تک مدرسہ میں رہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو صرف ایک بنیاد ہے، جس سے وہ آیندہ ترقی کرنے کے قابل ہوجاتی ہیں!

وہ لڑکا، جو (۱۴-۱۵) برس کا ہوتا ہے، سوائے نظریاتِ عامہ وسائل کلیہ کے جن کو جمل مختصرہ میں یاد کرلیتا ہے، اور کچھ نہیں جانتا، اور یہ محض استعدادِ علم وادب پیدا کرنے کے لیے ہیں، اس سے کوئی شخص عالم یا ادیب نہیں کہلایا جاسکتا۔ بلکہ اُس وقت کہلائے گا، جب عملی طور سے انکو کام میں لائے، اور اُسکا علم تجربہ و مشاہدہ سے مستحکم ہوجائے!

اسی وجہ سے کوئی عاقل متنفس اپنے کو اُس وقت تک "طبیب" نہیں کہہ سکتا جب تک وہ ایک زمانہ تک تجربہ نہیں کرلیتا، اور کوئی شخص سند حاصل کرتے ہی "وکیل" نہیں کہلایا جاسکتا!

بعینہٖ یہی حال آداب و اخلاق کا ہے۔ کون شخص ایسا ہے جو فوائد ضبطِ قہر اور شہواتِ نفسانی سے واقف نہیں! مگر کون ایسا ہے جو بلا تکلف اُسپر عمل کرسکتا ہے، کیونکہ غصہ اور عقل میں نسبتِ تباین ہے۔ اچھے سے اچھے عاقل بھی کبھی نہ کبھی مغلوب الغضب ہوجاتے، اور عقل و انسانیت کے خلاف ان سے واقعات کا ظہور ہوتا ہے۔

اگرچہ غصہ، دفعِ مضرت ومخالفت، کے لیے، فطرتِ انسانی میں ودیعت ہے، لیکن اسکی بھی ایک حد ہوتی ہے، اور جس سے ہم تربیتِ ناقصہ کے باعث گذر جاتے ہیں!

اسی طرح، شہواتِ نفسانی، میدانِ ضبط میں عقل پرغالب آجاتے ہیں، اور عقیل وفہیم بھی

اندھے ہوکر، حیوانیت کا نمونہ بنجاتے ہیں، اور فہم و ادراک کے دامن پر بدنما دھبہ لگا دیتے ہیں۔
پس معلوم ہوا، کہ حوادث کا مشاہدہ، اور معلوماتِ احوالِ انسانی، اور میل جول، نتیجِ علم و ادب ہیں، ان سے نفوس کریمہ کو ترقی ہوتی اور وہ لوگوں کی اچھی و بُری حالتوں کو دیکھکر عبرت حاصل کرتے، اور حرکاتِ دنیہ چھوڑکر خصائل و شمائل علیہ اختیار کرلیتے ہیں۔ ہربٹ اسپنسر "تربیتِ عقلی" کے متعلق کہتا ہے:۔

"جو تربیت انسان کو دوسروں کی معلومات کا محتاج رکھتی ہے، محض بیجا زور ہے۔ کیونکہ صرف کتابیں پڑھکر افکار اغیار معلوم کرنے سے اُسوقت تک کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک خود اپنے تجارب سے مستقل رائے قائم نہ کرے۔"

اسی طرح "اڈمان ڈیولن" کہتا ہے:۔

"مطالعہ حوادث، اور سیرِ وجود، ہمکو بتلا رہا ہے، کہ جن اقوام کی ہمت انتہائی درجے کی بڑھی ہوئی تھی، وہی لباسِ حیاتِ ابدی ہیں۔ ورنہ ہمت نام ہے ضبطِ قہر، و شہوات نفسانی پر قدرتِ کاملہ کا۔ اور جہاں تک ہو سکے، انسان اخلاقِ کریمہ پر ثابت قدم رہے۔ اور یہ تمام باتیں تربیتِ عملی سے پیدا ہوتی ہیں، وعظ و نصیحت کی سماعت سے نہیں۔ کیونکہ طبیعتِ انسانی بُرائی کو جلدی، اور اچھائی کو بڑی دشواری قبول کرتی ہے۔ اس وجہ سے انسان محض وعظ و ناصحین و مرشدین سے اچھے خصائل نہیں اختیار کرسکتا، بلکہ ایک کان سنتا، اور دوسرے کان اُڑا دیتا ہے۔! دراصل مربی، اور معلم ہی اسکی طبیعت کو شمائلِ حسنہ کا خوگر بنا سکتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تجربہ اور عمل اساسِ علم و ادب ہیں،!
مگر پردہ عورات کو اس منبعِ نفیس میں آنے سے روکتا ہے۔ کیونکہ جو عورت پردہ دار ہو اور سوائے گھر کی چار دیواری اور محجوبیت کے، مشاہدۂ عالم نہیں کرسکتی! اور زندگی ہی میں کفن پوش، و قبر میں زندگی بسر کر رہی ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ وہ زندہ دل، باخبر اور عالم انسان بنسکے؟

عورتوں کو صرف چند سال مدرسہ میں بٹھانا، کافی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مدرسہ سے فارغ ہو کر اُنکو اپنے رشتہ داروں کی معیت میں سیر و سیاحت کرنی چاہیے۔ آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ، تاریخ فطرۃ کا مطالعہ ہے، اور اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عمدہ معلم نہیں! اس سے یادِ سلف تازہ ہوتی ہے، اور گذری ہوئی عظمتوں کا مرقع آنکھوں میں پھر جاتا ہے! عظیم الشان محلوں اور قلعوں کے نشانات منہدمہ کا مشاہدہ جیسا زبردست سبق عبرت ہے، کوئی بتلادے، کسی کتاب سے ایسی تعلیم حاصل ہو سکتی ہے؟

اُن شاندار تہ خانوں کی خاموش آہیں، اور شاہی حرم سراؤں کی غیر مسموع، پُر درد نالے، انسان کی فانی ہستی کو جس آسانی سے مفہوم کراتے، اور اخلاقی تعلیم دیتے ہیں، کیا کوئی کتاب دے سکتی ہے؟

ریشمی دامنوں کے مچلنے کی جگہ، آج، عبرت آمیز ہوا کے سناٹے، اور نغمہائے حیوانی کے انبار، ! نغمہائے چنگ و رباب کے بجائے، شورِ زاغ و زغن کی سماعت، کچھ نہ پوچھیے کیسی تاریخ ہیں، اور کیا سبق دیتی ہیں! آثارِ قدیمہ کے حصاراتِ الم زا، اپنی دیواروں کی خستہ حالی و شکستہ دلی کی خاموش تصویریں دکھا کر "کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام" کی جیسی زبردست تعلیم دیتے ہیں، کوئی ہے ایسا معلم جو کل نفس ذائقۃ الموت، اور، وھو علیٰ کلِ شئی قدیر کی تعلیم دے سکے؟

ویران مقامات کے کانٹے جب دامنِ قلب میں چبھتے، اور لطیف روح جب دار الفنا کی خار زار جھاڑیوں میں اُلجھتی، اور انجامِ حیات یاد دلاتی ہے۔ کوئی آئے، اور بتلائے، کیا کوئی اخلاقی کتاب انسان کو اخلاقِ حسنہ کی ایسی تعلیم دے سکتی ہے؟

برگ درختان سبز در نظرِ ہوشیار،　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار!

لیکن کون ہے، جو اس پر عمل کرتا، اور اس فلسفہ کو سمجھتا ہے، اگر حقیقت میں ہم کو دنیا میں رہکر کچھ بننا ہے تو اس فلسفہ پر عمل کرنا، اور ان مقدس ہستیوں کو عالمِ حوادث کی سیر، اور تاریخ فطری کے مرقعات کا

کی خواہش، تو اپنی اس خانہ بر اندازی کو چھوڑ دو، اور تعلیم و تربیت نسواں کی جانب افراط و تفریط سے علٰحدہ ہو کر، اسلام کے جادۂ اعتدال و صراطِ مستقیم پر، سرگرمِ خرام حقیقت میں ہم کو منزلِ مقصود تک پہونچا دے گا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سید ابو الخیر مودودی
تاج محل۔ بھوپا

عشق

عشق کیا چیز ہے؟ اک جوہرِ پنہانی ہے
وجہِ پاکیزگیٔ فطرتِ انسانی

یہی احساس میں کرتا ہے لطافت پیدا
یہی کرتا ہے خیالات میں رفعـ

دل سے جذباتِ خودی کو یہ مٹا دیتا ہے
روح کو نازک و شفاف بنا

نرم ہو جاتی ہے انساں کی طبیعت اس سے
دُور ہو جاتا ہے اندازِ شقاوت ا

ایسی کچھ رکھتا ہے اندازِ گداز و رقت
قلب بنجاتا ہے تصویرِ گداز و

اسی جذبے سے تو انسان سنبھل جاتا ہے
راحت و رنج کا معیار بدل جا

خواہشِ شعر کا موضوعِ حقیقی یہ ہے
ذوقِ نغمات کی موسیقیِ فط

یہ تناسب جو ہر اک شے میں نظر آتا ہے
عشق ہی حسن کی صورت میں بکھر

یہ نہ ہوتا تو نہ تہذیب جہاں میں ہوتی
نہ یہ آرائش و ترتیب جہاں میر

خندہ و گریہ ہے موقوف گل و شبنم پر
یہ وہ قوت ہے مسلط ہو جو کل

ہے کہیں نام کشش اسکا محبت ہے کہیں
یہ مجازی ہے کہیں اور حقیقت

آرشدہ

ظفر علی خاں

یکے از اقوام جرائم پیشہ

(بسلسلۂ ماہ گذشتہ)

(۶)

مرزا غالب مرحوم نے، جنکے متعلق ڈاکٹر شیخ محمد اقبال جیسے فلسفی کی، رائے یہ ہے کہ انکے اشعار محض جودت طبع اور خیال آرائی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ انکے ہر شعر کا یا کم از کم اکثر اشعار کا تعلق اُن حالات سے ہے جو مرزا کے عہد میں پائے جاتے تھے، اور اُن واقعات سے جو اُنکے مشاہدہ میں آتے تھے یا اُس دَور میں پیش آتے تھے، اپنی ایک غزل کو اس معنی خیز بیت سے شروع کیا ہے:-

دولت بغلط نبود، از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

اسکے آخری مصرعہ کو کسی زمانہ شناس نے موجودہ زمانے کے حالات پر نظر کرکے اب یوں بدل دیا ہے

مُسلم نتوانی شد، ناچار کرشاں شو

ظفر علی خاں نے مرزا کی ہدایات پر جس خوبی سے عملدرآمد کیا ہے اور اس سے جس قدر تمتع اُٹھایا ہے اُسکا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں قیام لاہور کے زمانے میں ایڈیٹر زمیندار کی مالی حالت کے صحیح اندازہ لگانے کا موقع حاصل رہا ہو، یا جنھوں نے ۱۹۰۸ء کے بعد ۱۹۱۲ء میں کرم آباد کی سیر کا افتخار حاصل کیا ہو- ہمیں افسوس ہے کہ دونوں مواقع حاصل نہیں رہے- تاہم ایک دفعہ یہ جان لینے کے بعد کہ جتنی اشیاء شکر سے بنتی ہیں وہ میٹھی ہوا کرتی ہیں، ہم لاہور سے دُور رہنے اور کرم آباد کی زیارت سے دوبارہ شرف اندوز نہ ہونے کے باوجود بھی صورتِ حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

پھر ایک طرف جب یہ چشم دید واقعہ پیش نظر ہوتا ہے کہ ظفر علی خاں، جو دفتر عدالت دکوتوالی کے صدر مترجم کے ممتاز عہدے پر فائز تھے، افسانہ دوکن ریویو کی اڈیٹری کے باعث ایک ذمہ دار اخبار نویس کی حیثیت بھی رکھتے تھے، الفاروق جیسی بیش بہا اسلامی تاریخ کا انگریزی ترجمہ کرچکے تھے اور ڈاکٹر نشی کانت کو مکہ مسجد میں جاکر مسلمان بھی بنا لائے تھے، خود اسلامی تعلیم سے عین اُسی زمانے میں جبکہ یہ تمام اسباب واقع ہو رہے تھے، اتنے بیگانہ تھے کہ جب اُنکے ایک دیندار دوست صلوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائی میں خدائے مسلماناں کے حضور میں سربسجدہ ہوتے تو بسا اوقات یہ مہذب، متین اور تعلیم یافتہ ہستی اُس متقی اور نیک بندے کی پیٹھ پر ایک کے سوار ہوجایا کرتی اور قاآنی کے الفاظ میں "بوزینہ بہ ببر" کی مجسم تصویر بنجاتی۔ اور دوسری طرف اخبار زمیندار کے ذریعہ سے ظفر علی خاں کی (لاہور میں) مسجد نوازی اور (بمبئی میں) اسلامی شعائر کی نگہداشت کی خبریں موصول ہوتی ہیں تو مرزا غالب کے پیرانہ کلمات کی صداقت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل کی گنجایش ہی باقی نہیں رہتی۔ ساتھ ہی ساتھ جب یہ خبر پہونچتی ہے کہ ہوا کا رُخ بدلنے کے ساتھ ہی ظفر علی خاں بھی بدل گئے اور نماز جمعہ کی فرضیت اُنکے دماغ سے اُسی طرح ساقط ہوگئی جس طرح پیشتر خود نماز کی فرضیت تھی، تو بادلِ ناخواستہ اُس ترمیم کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے جو آخری مصرعہ میں کی گئی ہے۔

ایک موقع پر کہا گیا ہے کہ "ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو"۔ اور ہم بھی اسے بصدقِ دل مانتے اور اسی پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہر معصیت و جرم کو جائز قرار دینے کے لیے یہی ایک مصرعہ پشت پناہ بن سکتا ہے تو اُن بیچاروں نے کیا قصور کیا تھا جن پر سب وشتم کرنے کے لیے کبھی زمیندار کے صفحات وقف رہا کرتے تھے۔ زمیندار کے کالموں کو جنگ طرابلس کی ابتدا سے لیکر ظفر علی خاں کے نظربند ہونے تک بارہا سطر بہ سطر جانچا ہے۔ اور اس بات پر حیرت و استعجاب۔ نہیں نہیں۔ افسوس و رنج۔ کا اظہار کیا ہے کہ یہ اخبار جو ہندوستان کے ایک بڑے مرکز سے شایع ہوتا ہے اور ایک لائق ہندوستانی گریجویٹ کی اڈیٹری میں نکلتا ہے

بیرونی سیاسیات کا اسقدر فریفتہ و دلدادہ ہے کہ ہندوستان کے اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی معاملات اُسکے دائرۂ عمل سے یکسر خارج ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی مضمون پر کبھی کچھ بحث بھی ہوتی ہے تو پھر اسلامی لیڈروں کی پگڑی اُتارنے اور اُنپر گالیوں کی بوچھار کرنیکے سوا دوسرا مشغلہ نظر نہیں آتا۔ یہ نظربندی سے پہلے کی اخبار نویسی تھی۔ یا اب شملہ کی ٹھنڈی ہوا اور آبِ خنک کے بدولت یہ عالم ہے کہ "سیاسیات" کا شغل "دُور از کار" نظر آنے لگا۔ بلکہ "نقوخیرا" کی وساطت سے ملک کے بہترین نمایندوں کی متفقہ خواہشات پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالے جانے لگے۔

طرابلس کی لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے 'زمیندار' میں ہندوؤں کے خلاف جو مضامین نکلتے تھے اُنکی سفاہت، غلاظت اور عفونت ایسی نہ تھی کہ اربابِ ذوقِ سلیم کے دل و دماغ اُس سے مکدر نہ ہو جایا کرتے ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

کہکر لوگ اپنا دل بہلا لیتے ہوں اور 'زمیندار' کی ادبی دلکشیوں سے متاثر ہوکر محض اپنی ارادت و عقیدت کی بنا پر اسے حد سے بڑھے ہوئے غلو اور تعصب سے تعبیر کر لیتے ہوں۔ لیکن حیرانی و تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب ۱۹۱۳ء کے آخر میں دفعتہً ولایت سے ایڈیٹر زمیندار کا برقی پیام پہونچا کہ امسال قربانیِ گاؤ موقوف کر دی جائے۔ عقائد کی یہ تبدیلی شاید جائز قرار پا جاتی اگر 'ستارۂ صبح' کے نمودار ہوتے ہی برادرانِ وطن کے ساتھ پھر وہی اگلی شوخیاں نہ شروع ہو جاتیں۔ لاہوری سنسر کے زہرکش قلم کی عنایت سے، اگرچہ بعض دفعہ 'ستارۂ صبح' کی محو شدہ سطریں غلیظ اور بدبودار مواد سے بہت کچھ پاک ہو جاتی تھیں، پھر بھی اُنکی عفونت کا اثر باقی رہ جاتا تھا اور "جائز نکتہ چینی" یا خوش وقت طبعوں کی تہ میں جو کچھ ہم تک پہونچتا تھا اُس سے راقم کے اندرونی جذبات اور دلی رجحان کا پورا پتہ چلتا تھا۔

---

(۷)

اب سے بیس سال پیشتر، ہندوستانی اخبارات (خصوصاً اُردو کے) چونکہ عموماً ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے جنھیں جدید تعلیم سے زیادہ بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں ملا تھا اور اکثر وہی لوگ اس شریف پیشہ کو اختیار کرتے تھے جنکے لیے کسب معاش کے دوسرے دروازے ناقابلیت کی بنا پر یا ذرائع کے محدود ہونے کی وجہ سے بند ہوجایا کرتے تھے۔ اس لیے اکثر اڈیٹروں نے اپنے اخبار کو فروغ دینے کا آسان نسخہ یہی سمجھ رکھا تھا کہ باہم گالی گلوچ اور طعن وتشنیع کی ہولی کھیلیں اور جہاں تک بس چلے فرقہ وار نزاعات کی آگ کو اپنی تحریروں سے مشتعل کرتے رہیں جسکی نظیریں آج بھی آسانی سے پیش کی جاسکتی ہیں اگرچہ بحمداللہ کہ صورتِ حال بہت بہتر ہوگئی ہے۔

اور یہ وہ قابلِ افسوس حالت تھی جسپر خود اڈیٹر زمیندار نے بارہا نوحہ خوانی کی اور جب تک زمیندار کا دفتر کرم آباد میں رہا ظفر علی خاں کے متعلق یہ حسنِ ظن قائم تھا کہ وہ اس بدمذاقی کی اصلاح میں نمایاں حصہ لیں گے۔ مگر کچھ دنوں بعد جب زمیندار لاہور سے شایع ہونے لگا تو ظفر علی خاں نے بھی آسان پسندی کی بنا پر، یا زیادہ سرسبز میدان پاکر اسی روش کو اپنا شعار بنالیا اور وہ قلم جو پہلے ادبی مضامین اور علمی مباحث کے میدان میں اپنی رفتار کی شوخیوں سے اربابِ نظر کے دلوں کو مسخر کیا کرتا تھا خوش پوش لاحیوں اور زہرپاش نفرت انگیزیوں کے لیے وقف کر دیا گیا۔ زمیندار کے صفحات نے رجعت پسندوں کی ہجو خوانی میں جو فصیح وبلیغ مضامین پیش کیے ہیں اس سے زیادہ بلند بانگ اشتہار ظفر علی خاں کی حریت نوازی کا ناممکن تھا۔ اور صاحبانِ بصیرت" کے لیے قطعاً محال تھا کہ بیڑیے کی کھال میں اس عیار گوسفند کی شناخت کرسکتے۔ لیکن کیا اس برہنگی کے عالم میں بھی فریب کھانا ممکن ہے جبکہ اڈیٹر ستارۂ صبح شملہ کی بلندی پر سے بیک زقند ساری طے کردہ منزل کو پھاند کر پھر اسی مقام پر پہونچ گیا ہے جو رجعت پسندوں کی آخری جائے پناہ ہے۔

• 'ستارۂ صبح' اور اُسکے اڈیٹر کی موجودہ روش بھی گذشتہ تجربات کی بنا پر لائق اعتماد نہیں ہے۔

اور عامۂ مسلمین کی طرح ہمیں اندیشہ ہے کہ عمالِ حکومت بھی زیادہ دنوں اس دامِ فریب کا شکار نہ رہیں گے۔ مرزا غالب جیسے رمزشناسِ حقیقت کی رائے ہے کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مَرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر زریں پوش رہبرانِ قومی کی طرح استواری و استقامت کے گراں بہا جواہر سے آج اخبار نویسوں اور قومی رفارمروں کی جماعت بھی یکسر تہی دامن نظر آتی ہے اور ظفر علی خاں کی ساری زندگی تو گویا تلوّن اور غیر مستقل مزاجی کی ایک مسلسل داستان ہے جسکا ہر صفحہ دوسرے صفحہ سے اس قدر متناقض ہے جس قدر شاہنامہ واسوختِ امانت سے، یا بوستاں چرکین کے دیوان سے۔

تلون اور غیر مستقل مزاجی کو بھی شاید معاف کیا جا سکے مگر ستم یہ ہے کہ دیانت وراستی، ہمت و خودداری، غیرت و حیا بھی جو بہترین خصائص انسانی میں شمار ہوتے ہیں اور جنکے بغیر دنیا کا کوئی انسان اس قابل نہیں ہو سکتا کہ تعلیم یافتہ اور مہذب سمجھا جائے ہمارے دوستوں کے قانونِ اخلاق اور ضابطۂ عمل سے یکسر خارج ہیں۔ اور یہ وہ حالت ہے جسپر آج ہر سچے بہی خواہِ قوم کو شب و روز نوحہ کرنا چاہیے۔

یہ تذکرہ حسب وعدہ ختم کیا جاتا ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ستارۂ صبح کے ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر کی داستان سے الناظر کا کوئی نمبر خالی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن الناظر کے پیش نظر اور بہت سی ضروری بحثیں بھی ہیں جنکا التوائے مزید گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسکے علاوہ جب وہ خود ایک مستقل رسالہ اسی موضوع پر شایع کرنے کی توقع ظاہر کرتے ہیں تو وہ مقصد تو بذریعہ اَولیٰ حاصل ہی ہو جائے گا جو صاحب ممدوح کے پیش نظر ہے۔

ان مضامین سے ظفر علی خان کی اصلاح یا قوم کی واقفیت میں کوئی اضافہ چاہے ممکن نہو لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلا ہے کہ ستارۂ صبح میدانِ قوم فروشی سے پسپا ہو گیا اور مطالباتِ ملکی کے خلاف اُسکا خروج کم سے کم عارضی طور پر موقوف رہا۔ فالحمد للہ۔

نظرے خوش گزرے

تذکرۂ شیخ علی حزیں اس نمبر میں ختم ہوگیا ہے۔ سرورق وغیرہ زیر طبع ہیں۔ جو صاحب ان اوراق کو بصورتِ کتاب جمع کریں، منیجر صاحب الناظر سے سرورق طلب کرلیں۔ اگر اسی مہینے کے اندر اطلاع مل جائے تو شاید جنوری نمبر کے ہمراہ پہونچ سکے۔

جنوری سے انشاء اللہ العزیز اسٹینلی لین پول کی مشہور کتاب "مورس ان اسپین" کا ترجمہ مسلمانانِ اندلس کے نام سے مسلسل شایع ہوا کرے گا۔ اس کتاب کا ترجمہ تاریخ اندلس کے نام سے مولوی حامد علی صاحب صدیقی نے کیا تھا، مگر بسبب اسکے کہ صاحب ممدوح نے عربی کی اصلی تاریخوں سے امداد نہیں لی اور محض انگریزی کتاب کو اُردو لباس پہنانے پر اکتفا کیا اس کے ناموں میں فرق عظیم ہوگیا ہے۔ جسکی وجہ سے وہ ترجمہ جیسا چاہیے معتبر نہیں ہے۔ مکرم ومحترم جناب مولوی عبد الغنی صاحب بہاری (علیگ) مددگار صدر محاسب ریاست حیدرآباد نہ صرف عربی کے فاضل ہیں بلکہ جن لوگوں نے یوزاسف وبلوہر اور نعمت عظمٰی کو مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ بحیثیت اُردو زبان کے انشا پرداز ہونے کے مولانا ممدوح کیا منزلت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبد الغنی صاحب اُس مختصر گروہ میں بھی خاص طور پر ممتاز ہیں جو عربی وانگریزی دونوں میں مہارتِ تام اور خود اپنی زبان میں ادائے خیالات واظہارِ مطالب کی پوری دستگاہ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا کے اس ترجمہ کی اشاعت ضروری سمجھی گئی۔ یورپ میں ایسی کتابیں بہت ہیں جنکے متعدد ترجمے ایک ہی زبان میں ہوے۔ خود ہمارے یہاں بھی اسکی نظیریں ملتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی لاجواب کتاب "ازالۃ الخفا" کا ترجمہ عرصہ ہوا اخبار وطن کی طرف سے شایع ہوا تھا۔ مگر یہ ترجمہ اسقدر غلط اور مہمل تھا کہ کتاب کے مطالب کو اُردو خواں ناظرین کے ذہن نشین کرنے کے بجاے اُلٹے اُنکو ضلالت وگمراہی میں مبتلا کرتا تھا چنانچہ

ہمارے مکرم جناب مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر انجم نے اسے از سرِ نو ترجمہ کرنا شروع کیا۔ کتاب کا ایک جزو مع متن کے شایع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکا ہے اور بقیہ اجزا ابھی غالباً جنگ کے بعد شایع ہو سکیں گے۔

گذشتہ نمبر میں جو خیال ظاہر کیا گیا تھا اُسکی تصدیق ایجوکیشنل کانفرنس کے تازہ اعلان سے ہو گئی۔ یعنی جناب مسٹر حیدری صاحب ہوم سکرٹری ریاست حیدرآباد دکن اس سال کے جلسہ کی صدارت فرمائیں گے۔ یہ انتخاب توقعات کے عین مطابق ہے اور عموماً پسند کیا جا رہا ہے۔

مگر ہمارے دفتر انجمن ترقی اُردو نے باوجود مسلسل تحریک کے اب تک کروٹ نہ لی۔ الولد لسر لابیہ کا اصول نوعِ انسانی کے افراد سے گذر کر مجامع تک پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس لیے انجمن ترقی اُردو، جو ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ یا بچہ ہے غالباً مجبور ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے دورِ استبداد کی پوری نقل اتارے۔ ہمیں جو انجمن ترقی اُردو کا نظام درست کرانے کی مسلسل فکر ہے اُسکا سبب یہی ہے کہ ہم اس سنتِ استبداد کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے جو بنا اب سے پچاس سال قبل ڈالی تھی وہ اُس زمانہ کے لحاظ سے نہایت مناسب سہی مگر اب تو قطعاً فرسودہ اور ناقابلِ اعتماد ہے۔ منتظمین انجمن ترقی اُردو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے مسلک سے ہمیشہ اختلاف ظاہر کرتے رہے ہیں اس لیے اب جبکہ امتحان و آزمایش کا وقت ہے کیا ہم یہ توقع کرنے میں حق بجانب نہیں کہ اُنکے دامن استبداد و مطلق العنانی سے آلودہ نہ ہوں گے۔ انجمن کی موجودہ روش پر ہم کوئی قطعی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتے مگر یہ یقینی ہے کہ منتظمین انجمن کا طرزِ عمل اُس معیار کے مطابق نہیں ہے جسکی ہمیں ایک حریت پسند اور حامیِ جمہوریت جماعت سے امید کرنا چاہیے۔

ہم اب تک ایجوکیشنل کانفرنس۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور ندوۃ العلما کے اراکین و منتظمین کی خرابیوں پہ نوحہ کرتے رہے ہیں، اور شاید ہمارے احباب سمجھتے ہوں گے کہ تعلقاتِ ذاتی کی بنا پر ہم منتظمین انجمن ترقی اُردو کے طرزِ عمل کو نظر انداز کر جائیں گے۔ لیکن ہم اُنھیں اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ انجمن

کی تنظیم و اصلاح کے بارہ میں الناظر کی صداے احتجاج کو انشا ء اللہ تعالیٰ کوئی مروت و محبت
روک سکتی ۔ البتہ چونکہ ہمیں اپنے مکرم محترم مولوی عبد الحق صاحب کے متعلق ذاتی واقفیت
اس بات کا پوری طرح علم ہے کہ وہ انجمنوں اور اجتماعی مجالس کی عملی کارروائیوں کا کوئی تجربہ
رکھتے ۔ اور نیز یہ کہ جس سرزمین پر عرصۂ دراز سے اُنکا قیام ہے وہاں کی آب ہوا اور حالات گرد
کوئی بھی جمہوریت اور حریت کے موافق نہیں ۔ اس لیے اُس حد تک ہم مولوی صاحب ممدوح
و مطلق العنان رہنے دینا چاہتے ہیں کہ انجمن کے کاموں کو نقصان نہ پہونچے اور اس تحریک کو
عام بنانے میں دشواری نہ ہو ۔ لیکن بحالت موجودہ ہم اپنے دوست سے یہ عرض کرنے کو مجبو

ایں رہ کہ تو میروی بترکستان ست

گذشتہ مہینہ میں اُردو کا ایک اور محسن دست اجل کی وساطت سے اُٹھ گیا ۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون
خان صاحب مولوی محمد اسمعیل میرٹھی جنھوں نے ماہ نومبر میں پچھتر سال کی عمر میں وفات پائی طرز جدید کی شاعر
لحاظ سے مولانا حالی مرحوم کے بعد سب سے بہتر شاعر تھے ۔ انکی نظمیں کتب درسی کے ذریعہ سے ملک بھر میں پھ
چکی ہیں اور اس زمانہ کا کوئی لکھا پڑھا دیا مشکل سے ہوگا جو مولوی صاحب ممدوح کے کلام سے فیضیاب نہ ہوا
مرحوم جس دور کے بزرگ تھے افسوس ہے کہ وہ قریب خاتمہ کے پہونچ گیا ہے صرف چند نفوس اور باقی ہیں ۔ خدا اُنکو
زندہ و سلامت رکھے ۔ آمین ۔

دہلی میں ، ویسرائے اور وزیر ہند کی حضوری کے لیے پراونشل مسلم لیگ کا وفد اپنی نشستگاہ سے
لگتا ہے بارگاہ ملاقات کے قریب مسٹر عبد المجید خواجہ بیرسٹرایٹ لا علیگڈھ کو ضیق النفس کا دورہ شروع ہوتا ہے اور وہ
مجبور ہو جاتے ہیں کہ شرکت وفد سے معذوری ظاہر کریں ۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر خواجہ قصداً شرکت وفد سے اس بنا پر محترز
کہ لیگ کے ایڈریس میں سے وہ جملے نکالدیے گئے تھے جو مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی کی نظر بندی کے متعلق تھے ۔ ا
دوسروں کا کیا ذکر ہے ہمارا عزیز معاصر نیو ایرا اس طرز عمل کی داد دیتا ہے ۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ جو لوگ اس وقت دا
سے رہے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ مسٹر خواجہ کو ایک نہایت بدنما الزام کا مورد بنا رہے ہیں یعنی اُن میں اتنی اخلاقی جرأت نہ
کہ جب اراکین وفد کے درمیان ان فقرات کے نکالنے پر قیل و قال ہو رہی تھی تو وہ اُسی وقت صاف صاف کہدیتے
کہ یہ فقرے نکلے تو بندہ بھی نکلا ۔

تو سنا کہ ایران میں تغیر حکومت ہو گیا ہے، بادشاہ طہماسپ قید کر لیا گیا، طہماسپ قلی خود متصرف ہو گیا۔ یہ خبر سنکر شیخ دو ماہ تک بندر عباس میں مقیم رہے۔ وہاں سے روانہ ہو کر اصفہان آئے مگر اصفہان کو جائے اقامت نہ پایا۔ وہیں لار آئے لار آنے پر معلوم ہوا کہ لار کا حاکم سابق گرفتار ہو گیا اور خان معظم کی طرف سے حاکم جدید مقرر ہو گیا ہے۔

بحکم خان معظم، محمد خاں بلوچ سردار فارس مقرر کیا گیا اُسنے باتفاق رائے حاکم شیراز خطۂ لار کا قصد کیا۔ جب محمد خاں بلوچ کی فوج شہر جہرم میں پہونچی اور عبد الغنی حاکم جہرم سے جو شیخ کا دوست تھا کوئی معاملہ طے نہیں ہوا تو نوبت جنگ کی پہونچی۔

اُدھر تو جہرم میں جنگ ہو رہی تھی، اُدھر لار کے لوگوں میں غضب کی شورش پھیل گئی آخر کار بلوہ ہو گیا اور بلوائیوں نے حاکم لار کو مع چند غلاموں کے قتل کر ڈالا۔ طرفداران خان معظم نے اس بلوے کو باشارۂ شیخ سمجھا۔ سردار فارس جو شہر جہرم کو محصور کیے ہوے تھا، اس بلوے کی خبر سنتے ہی حاکم شیراز کو معہ فوج جہرم کے محاصرہ پر چھوڑ کر خود لشکر گراں کے ساتھ خطۂ لار میں آ گیا۔ اور شہر میں قتل عام شروع کر دیا۔ شہر والے اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے اُنھیں کے ساتھ شیخ بھی نکل گئے اور بندر عباس چلے آئے۔

احمد پاشا بعد جنگ ہمدان بغداد کی طرف چلا گیا تھا اور خان معظم نے صلح کو جو بادشاہ نے رومیوں سے کی تھی نامنظور کر دیا تھا۔ جب یہ خبر روم میں پہونچی تو روم سے توپال پاشا سپہ سالار روم مع فوج کثیر کے امداد کے لیے بھیجا گیا اور بعد جنگ عظیم کے خان معظم کو شکست ہوئی۔ لیکن خان معظم نے چند روز میں پھر فوج جمع کر کے ۱۱۴۶ھ ہجری میں جنگ کی اور فتح پائی توپال پاشا مارا گیا اور بغداد شریف میں مقبرہ حضرت امام ابو حنیفہؒ میں دفن ہوا۔

لے طہماسپ شاہ کے تخت سے اُتارے جانے کے بعد طہماسپ قلی خاں کا لقب خان معظم ہو گیا۔

ٹے تاریخ بنارس مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں توپال پاشا کا مارا جانا ۱۱۴۲ھ ہجری میں لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تذکرہ شیخ مطبوعہ مسلم پریس دہلی ۱۳۱۹ھ ہجری کے صفحہ ۶۵ سطر ۹ میں ۱۱۴۶ھ "است اربعین وماتہ بعد الالف" تحریر ہے۔

جب شیخ نے ایران کی یہ حالت دیکھی تو دوسری ولایت چلے جانے کا قصد کر لیا جہاز سندھ کی طرف جا رہا تھا۔ ۱۰ رمضان المبارک سنہ ۱۱۴۶ ہجری کو اُسی جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوے۔ غرۂ شوال سنہ ۱۱۴۶ ہجری کو جہاز ساحل ٹھٹھہ پر جو سندھ کا صدر مقام ہے پہونچا۔ شیخ کا خیال تھا کہ یہاں کوئی شخص مجھے نہ پہچانے گا مگر اُسی روز ایک گروہِ تجار نے کہ فارس میں شیخ کو دیکھا تھا، پہچان لیا۔

خان معظم توپال پاشا کو مار کر جب اس مہم سے فتحیاب واپس آیا تو سنا کہ شاہ عباس یعنے وہ لڑکا جو بادشاہ کہلاتا تھا فوت ہو گیا تختِ ایران خالی ہے۔ اسی درمیان میں تقریب نو روز سنہ ۱۷۳۶ء تمام امرا و سرداران ایران نے جمع ہو کر خان معظم سے استدعا کی کہ آپ بادشاہت ایران قبول فرمایئے، مگر خان معظم نے بظاہر انکار کیا۔ جب امرا و اراکین نے بمنت و سماجت تمام اصرار کیا۔ اُس وقت خان معظم جو مذہب شیعہ ترک کر کے سُنی ہو چکا تھا اس شرط پہ بادشاہت قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ مذہب امامیہ موقوف کر دیا جائے اور سب لوگ سُنی رہیں تاکہ ایک مذہب ہو جانے سے تمام مسلمانوں میں سلوک اور موافقت پیدا ہو۔ اگرچہ یہ شرط تمام قوم کی مرضی کے موافق نہ تھی اور نادر شاہ کے مرنے کے بعد وہ لوگ پھر شیعہ ہو گئے مگر اس وقت اس انقلاب کا اقرار کیا گیا اور خان معظم سنہ ۱۱۴۸ ہجری مطابق سنہ ۱۷۳۶ء میں بلقب نادر شاہ بادشاہِ ایران مقرر ہوا۔

شیخ چند روز ٹھٹھہ میں رہے وہاں سے بسواریِ کشتی خدا آباد میں جو سندھ کا ایک قریہ ور

---

[1] تاریخ بنارس میں شیخ کا حج سے سنہ ۱۱۴۵ ہجری میں بندر عباس واپس آکر تغیر ایران کی خبر سننا۔ اور شیخ کا یہ اوضاع ایران دیکھکر بلاد سندھ کی طرف جانا اور ٹھٹھہ میں غرۂ شوال سنہ ۱۱۴۰ ہجری کو پہونچنا لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ بنارس صفحہ ۴۰۲ سطر ۸ و صفحہ ۴۰۲ سطر ۲ و ۱۴۲ لغایت ۱۹۔ اس جگہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب شیخ سنہ ۱۱۴۰ ہجری میں بمقام ٹھٹھہ (سندھ) آ گئے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ سندھ میں آنے کے بعد پھر شیخ کو ایران جانا میسر نہیں ہوا تو پھر سنہ ۱۱۴۵ ہجری میں حج کے بعد بندر عباس کیونکر پہونچ گئے جو تغیر ایران کی خبر سنی۔ [2] ملاحظہ ہو تاریخ ایران مطبوعہ سنہ ۱۹۲۵ء اردو اخبار پریس دہلی

ٹھٹھ سے چند روز کی مسافت پر واقع ہے، آئے۔ اور خدا آباد سے سواری کشتی روانہ ہوکر تین روز کے بعد شہر بھکر میں پہونچے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے اور خراسان کے تجار اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر مفارقت ایران اور انکی بے سرو سامانی نے جو اِن کو ہردم بے چین و بیقرار رکھتی تھی یہاں بھی نہ رہنے دیا اور بھکر سے روانہ ہوکر ملتان گئے

ملتان بہت لانبا چوڑا شہر نہیں ہے لیکن یہاں کے لوگ متمول زیادہ ہیں۔ یہاں بھی تنہائی و ناکامی سے طبیعت پریشان رہی جی نہ لگا۔ بہزار خرابی چند روز تک ملتان میں مقیم رہ کر اپنے ہوش پریدہ و حواس رمیدہ کو یہ ندا دیتے رہے۔

مطرب سماع برکش و ساقی شراب دہ　　ایام را رجال و فلک را جواب دہ

زمانۂ قیام ملتان میں بموسم گرما دریائے سندھ میں سیلاب آیا اور تمام صحرا و عمارات و مکانات پر پانی چڑھ گیا آمدورفت بذریعہ کشتی ہوتی رہی۔ جب سیلاب کم ہوا وبائی بیماریاں پھیل گئیں اور پانچ چھ مہینے تک یہ بلائیں ملتان پر نازل رہیں۔ شیخ بھی تپ میں مبتلا ہوگئے۔ اُسی زمانہ سختی میں شیخ ملتان سے روانہ ہوکر لاہور آئے۔ لاہور دریائے انڈس کے (جو کشمیر سے آکر لاہور سے گذرتا ہوا ملتان جاتا ہے) کنارے پر ہے اور بوجہ دارالقیام شاہان مغلیہ کے نہایت خوشنما اور بے نظیر شہر ہے۔ ایک تو علالت دوسرے تکلیف مسافت۔ شیخ لاہور میں پہونچ کر نہایت ناتوان ہوگئے تھے جب صحت ہوئی تو کچھ ایسے وجوہ پیش آئے۔ جنکے باعث شیخ کو لاہور سے روانہ ہونا اور بلا خواہش و قصد دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں ایک سال کے قریب مقیم رہے۔

ایران کی محبت کہیں آرام سے نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ رہ رہ کر نشتر کی طرح دل میں چبھکر تڑپا دیا کرتی تھی۔ کابل و قندھار کی راہ سے خراسان چلے جانے کا مصمم ارادہ دل میں ٹھان کر شیخ دہلی سے پھر لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔

اِدھر تو شیخ خراسان کی تمنا میں دہلی سے روانہ ہو رہے تھے اُدھر تقدیر انکی تمنا پر ہنستی تھی۔ کیونکہ ملک ہند کی زمین شیخ کو اپنی گود میں قیامت تک سُلائے رکھنے کے لیے آغوش آرزو

کھول چکی تھی۔ الغرض [1] ۱۱۴۹ھ ہجری میں جب شیخ لاہور پہونچے تو یہ خبر سنی کہ نادرشاہ کی فوج بارادۂ تسخیر و واپسی قندھار قندھار میں موجود ہے۔ یہ خبر سنکر شیخ نے اپنی بدنصیبی پر سخت تاسف کیا اور لاہور میں ٹھہر کر منتظر رہے کہ معاملۂ قندھار طے ہو اور راہ میں امن ہو جائے تو خراسان روانہ ہوں، مگر راہ میں امن ہوا کیا وہ شورش جو قندھار میں پھیل رہی تھی سیلاب کی طرح پنجاب کی طرف بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُس بڑھتے ہوئے سیلاب نے تمام پنجاب کو گھیر لیا۔ علی الخصوص لاہور خاص میں آمدِ نادرشاہ سے غضب کی ہلچل مچ گئی۔

جب نادرشاہ اطراف لاہور میں پہونچ گیا تو شیخ بخوفِ نادر لاہور سے روانہ ہو کر پھر دہلی آئے اور دو تین خدمتگاروں کو لیکر گوشہ نشینی اختیار کی۔

۱۱۵۱ھ ہجری میں نادرشاہ دہلی میں آیا اور محمد شاہ بادشاہ دہلی سے سخت جنگ ہوئی۔ بالآخر نظام الملک آصفجاہ کی کوشش سے صلح ہوئی اور نادرشاہ مع فوج بتاریخ ۸ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ ہجری مطابق ۸ مارچ ۱۷۳۹ء شہر میں آکر قلعہ شاہجہان آباد میں اُترا اور محمد شاہ کا مہمان ہوا۔ دوسرے تیسرے روز جب بھنگیڑ خانے والوں نے یہ مشہور کر دیا کہ نادر مارا گیا: تو ۱۱ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ ہجری کو نادرشاہ نے دہلی میں قتل عام کا حکم دیا۔ اور ۶ محرم ۱۱۵۲ھ ہجری مطابق ۱۴ اپریل ۱۷۴۳ء

[1] تاریخ بنارس میں لکھا گیا ہے کہ ۱۱۴۵ھ ہجری میں شیخ لاہور سے دلی گئے اور ۱۱۴۶ھ ہجری میں پھر بہ ارادۂ واپسی خراسان دلی سے لاہور آئے تو ۱۱۴۸ھ میں یہ خبر معلوم ہوئی کہ قندھار میں لشکر قزلباش موجود ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ نادرشاہ نے ۱۱۴۶ھ میں قندھار کا قصد کیا۔ تیسری جگہ لکھا ہے کہ نادرشاہ قندھار ۱۱۴۹ھ ہجری میں آگئے۔ ملاحظہ ہو تاریخ بنارس مطبوعہ ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۴۰۴ سطر ۱۹ و ۲۰ و صفحہ ۴۰۵ سطر ۱ و ۲ و صفحہ ۴۱۱ سطر ۱۷ و صفحہ ۴۱۲ سطر ۱۵۔ اس جگہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ (۱) جب ۱۱۴۵ھ میں شیخ حج کے بعد بندر عباس پہونچے اور تغیر حکومت ایران کی خبر سنی تو پھر ۱۱۴۵ھ میں لاہور سے دلی کیونکر آئے (۲) اور جب ۱۱۴۹ھ میں نادر کی فوج قندھار میں آئی تو شیخ نے ۱۱۴۶ھ یا ۱۱۴۸ھ میں لاہور پہونچکر یہ خبر کیونکر سُن لی کہ قندھار میں نادرشاہ کا لشکر موجود ہے۔

کو نادرشاہ ایران کی طرف واپس روانہ ہوا۔
مفصل حال نادرشاہ کے دہلی آنے کا یہ ہے کہ نادرشاہ نے جب افغانوں کو قندھار سے نکالا تو تمام افغان کوہستانی کابل میں پھیل گئے اُس وقت کابل میں سلطنتِ ہند کی طرف سے صوبہ دار رہتا تھا۔ اسلیے نادرشاہ نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پاس ایلچی بھیجا کہ آپ بھی اپنے صوبہ کے نام افغانوں کے نکال دینے کے لیے حکم بھیجدیں جس میں دونوں جانب سے دباکر افغانوں کو قرار واقعی گوشمالی دی جائے۔
وہ ایلچی نادرشاہ کا راستے ہی میں مارڈالا گیا۔ یہاں اُن دنوں عیش وعشرت کا کچھ ایسا غل بلند ہو رہا تھا کہ ایلچی کے قتل کی خبر کسی کے کان تک نہ پہونچی۔ چند روز کے بعد نادرشاہ نے پھر خط لکھا مگر اُسکا بھی جواب ندارد۔ آخرکو نادرشاہ نے خود ہندوستان کا قصد کیا۔ یہاں کانوں میں ایسی غفلت کی روئی بھری ہوئی تھی کہ بجز ناچ گانے کے کسی دوسری خبر کی واز ہی نہیں سنائی دیتی تھی۔ کابل و لاہور کے حاکموں کی جو عرضیاں آتی تھیں وہ بھی بغیر ملاحظہ پڑی رہتی تھیں۔ بادشاہ کو انکے ملاحظہ کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ یہاں تک کہ نادرشاہ نے کابل کو گھیرلیا۔ کابل کے حاکم نے نہایت اضطراب کے ساتھ عرضی لکھی۔ جسوقت وہ خریطہ محمد شاہ بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا بادشاہ مہتاب باغ میں ناچ دیکھ رہا تھا، سُرور بھی بڑھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے عرضی لیکر اُسکا گوشہ شراب میں ڈبویا اور کہا

این دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

امیر الامرا نظام الملک آصفجاہ کی دانائی و تجربہ کاری کو اہلِ دربار مانے ہوئے تھے اسلیے نادرشاہ کی آمد کی خبر سنکر آصفجاہ کو بلوایا ادھر نادرشاہ نے کابل فتح کرکے پھر محمد شاہ کو خط لکھا۔ یہاں دربار میں یہ اُلجھن پڑی تھی کہ کئی خط اور کئی ایلچی آچکے ادھر سے جواب نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھا جائے۔ اور لکھا بھی جائے تو اس میں القاب کیا لکھا جائے کیونکہ نادرشاہ کوئی خاندانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ نادرشاہ کا لشکر دریائے اٹک

اُتر آیا۔ یہ خبر سُنکر اب یہاں بھی کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ خان دوراں مقابلے کے لیے مع فوج روانہ کیا گیا۔ برہان الملک کی طلبی کے لیے اودھ آدمی بھیجا گیا۔

خان دوراں فوجِ شاہی لیکر دہلی روانہ ہوا مگر اس سستی و آہستگی کے ساتھ روانہ ہوا کہ دو مہینے میں دہلی سے کرنال تک جو چالیس کوس کے فاصلے پر ہے پہونچا۔ شاہی فوج براتیوں کی طرح نہر کے کنارے پڑی تھی اور برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا۔ جسدن اودھ سے برہان الملک آکر لشکر شاہی میں شامل ہوا اتفاق سے اُسی دن نادرشاہ بھی قریب آگیا مگر یہاں کسی کو خبر نہ ہوئی۔

چند گھسیارے زخمی و بدحواس دوڑے ہوے آئے کہ ہم جنگل میں گھانس کھودنے گئے تھے، نادری قراولوں نے کئی آدمیوں کو گرفتار کرلیا، ہم لوگ بھاگ کر یہاں تک پہونچے۔ اِدھر یہ تذکرہ ہی تھا کہ چند قزلباش برہان الملک کے ڈیرے پر ہاتھ مار گئے۔ یہ خبر سُنکر برہان الملک فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور فوج لیکر لڑنے کو روانہ ہوگیا۔ خان دوراں کو جو یہ خبر ملی تو وہ بھی اپنی فوج لیکر برہان الملک کی فوج سے آملا۔ اُدھر سے نادرشاہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ولایتی فوج کو تین طرف سے حملے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہندوستانی عیش پرورد فوجیں پریشان ہوگئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے خان دوراں بھی زخمی ہوا۔ خانِ دوراں کے زخمی ہوتے ہی لشکر میں شکست کی ہوا اُڑ گئی۔ اب صرف برہان الملک اپنے چند رفیقوں کے ساتھ میدان جنگ میں رہ گیا اور جواں مردی سے ہاتھی پر بیٹھا ہوا تیر مار رہا تھا کہ ایک ایرانی فوج نے چار طرف سے گھیر لیا۔ ایک سپاہی گھوڑا دوڑا کر ہاتھی کے پاس آیا۔ اور گھوڑے سے اُتر کر رسا تھام کر ہودج میں جا بیٹھا۔ برہان الملک نے بموجب دستور ایران اپنے کو گرفتار سمجھکر کمان ہاتھ سے رکھدی۔ ایرانی سپاہی ہاتھی کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے نادرشاہ نے جرم بخشی کرکے عنایت فرمائی۔ اُس وقت برہان الملک نے موقع پاکر مصلحت آمیز گفتگو شروع کی اور نادرشاہ کو اس بات پر رضامند کیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیکر یہیں سے

واپس تشریف لے جائیں۔ نادرشاہ رضی ہوگیا۔ برہان الملک نے اس حال سے بادشاہ کو اطلاع دی اور آصفجاہ کو رقعہ لکھا کہ تم آکر اسکا فیصلہ کر لو۔ محمد شاہ نے فوراً آصفجاہ کو روانہ کیا۔ برہان الملک آصفجاہ کو ہمراہ لیکر نادرشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بعد گفتگو یہ طے پایا کہ دو کروڑ روپیہ لیکر یہیں سے ایران کو مراجعت فرمائی جائے۔ نادرشاہ دو کروڑ روپیہ لیکر ایران واپس چلے جانے پر رضامند ہو گیا۔ آصف جاہ نے واپس آکر بادشاہ کے حضور میں کل حال بیان کیا۔ دوسرے روز محمد شاہ اور نادرشاہ سے ملاقات کی ٹھیری۔ ادھر بادشاہ بڑے تزک و احتشام سے روانہ ہوا اُدھر سے نادرشاہ نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لیے بھیجا۔ وہ راہ میں آکر ملا اور بادشاہ کے ہمرکاب ہوکر نادرشاہ کے پاس لے گیا۔ نادرشاہ لب فرش تک استقبال کے لیے آیا۔ اور اپنے مسند پر نہایت تعظیم سے بٹھایا۔ آپس میں باتیں شروع ہوئیں۔ پانے کا دَور چلنے لگا۔ تھوڑے عرصے کے بعد بادشاہ نے ہنسی خوشی مراجعت کی۔

خان دوران کے زخمی ہوکر انتقال کرنے کے بعد اس لقب و منصب کو برہان الملک اپنا حق سمجھے ہوئے تھا۔ مگر نظام الملک آصفجاہ کے خطاب و خلعت پانے کا حال سنا تو آتش حسد سے جلکر نادرشاہ سے کہا کہ حضور نے یہ کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے کو چھوڑکر صرف دو کروڑ روپے پر رضامند ہوگئے یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے۔ شہر یہاں سے چالیس کوس کے فاصلے پر ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں۔ یہ سنکر نادرشاہ خوش ہوگیا اور اُسی وقت آصفجاہ کو بلا کر کہا کہ تم ٹھہر جاؤ اور اپنے بادشاہ کو بھی بُلا لو۔ آصفجاہ نے کہا کہ عہد نامے میں تو یہ شرط نہ تھی۔ نادرشاہ نے جواب دیا کہ ملک و سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہمیں کوئی تعرض نہیں ہے فقط ایک مرتبہ ہم اور ملنا چاہتے ہیں۔

امیر الامرا نظام الملک آصفجاہ نے ناچار پھر بادشاہ کو اطلاع دی اور بادشاہ کو مجبوراً پھر نادرشاہ سے ملنا پڑا۔ نادرشاہ نے بادشاہ کو عزت و احترام کے ساتھ الگ خیمہ میں اُتروایا

ادھر تو نادر شاہ نے بادشاہ اور آصفجاہ کو یہاں روک لیا، اُدھر اپنے ایک سردار کو فرمان دیکر شہر میں بھیجدیا۔ اُسنے جاتے ہی قلعہ دار سے کنجیاں لیلیں۔ اور تمام کارخانوں پر قبضہ کرلیا دوسرے دن نادر شاہ محمد شاہ کو لیکر دہلی آیا اور قلعہ شاہجہاں آباد میں اُترا۔

دو تین روز کے بعد ایک نیا شگوفہ کھلا یعنی بھنگیڑ خانے سے دفعتًا یہ خبر اُڑی کہ محمد شاہ رنگیلے نے نادر شاہ کو مروا ڈالا۔ یہ خبر ہوا کی طرح شہر بھر میں پھیل گئی۔ اس خبر کے مشہور ہونے کے ساتھ ہی بڑا غضب یہ ہوا کہ نادری سپاہی ایک ایک دو دو جو گلی کوچوں میں بے تکلف پھر رہے تھے لوگوں نے اُنھیں بے وارثہ سمجھکر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر شاہ کو یہ خبر معلوم ہوئی اُس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ سب اپنی جگہ پر قائم رہیں اگر کوئی چڑھ کر آئے تو جواب دیا جائے ورنہ پیشقدمی نہ کی جائے۔ رات بھر یہی حالت رہی۔ صبح تک کئی سو ایرانی سپاہی کٹ گئے۔ مگر اراکین دربار دہلی چپکے بیٹھے تماشا دیکھا کیے۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ صبح اُٹھکر نادر شاہ نے پوچھا تو وہی حال سُنا۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ اُسی وقت سوار ہو کر شہر دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ دیکھکر اب بھی یہ طوفان تھم جائے۔ مگر طوفان تھما کیسا اہل شہر نے اُس پر بھی پتھر برسائے بلکہ بندوقیں چلائیں۔ نادر شاہ نے شہر کے گشت میں یہ بھی دیکھا کہ جابجا ایرانیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھکر آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قتل عام کا حکم دے دیا۔ اور آپ روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں تلوار کھینچ کر بیٹھ گیا۔ نادری سپاہیوں نے گلیوں میں خون کے پرنالے بہا دیے، گھروں میں آگ لگا دی۔ نادر کا غصہ خدا کا قہر تھا۔ بادشاہ اور تمام امرا بیٹھے یہ حالت دیکھ رہے تھے مگر دم نہ مار سکتے تھے۔ دوپہر کے قریب جب شہر میں کہرام مچ گیا، تعداد مقتولین کی شمار سے باہر ہو گئی تو سب نے آصفجاہ سے رجوع کی۔ آصفجاہ نے گلے میں تلوار ڈالی اور سر برہنہ کیے نادر شاہ کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ نادر شاہ نے نظر اُٹھائی تو آصفجاہ کو روتا پایا۔ پوچھا کہ چہ می خواہی؟ آصف جاہ نے کہا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ تا ز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

درنے شعر ہا کر سر جھکا لیا۔ تلوار میان میں کی اور کہا کہ بریش سفید ت بخشیدم۔ اُسی وقت
یرانی نقیب شہر میں امان امان پکارتے ہوئے دوڑے۔ واہ رے نادری حکم۔ جس نے
بہاں سے نقیب کی آواز سُنی وہیں تلوار روک لی اور دم بھر میں امن ہو گیا۔ سلطنت کے
ا روبار کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہو گئیں۔

نادرشاہ کو دہلی میں ارکین سلطنت کی حاسدانہ کارروائیوں کی بدولت دونوں ہاتھوں
سے لوٹنے کا موقع ملا۔ اُس نے اور اُسکے ہمراہیوں نے بیشمار زر و جواہر و زیورات یعنی وہ کُل
دولت جو بابر شاہ کے وقت سے شاہان مغلیہ جمع کرتے آئے تھے سمیٹی۔ یہاں تک کہ تخت طاؤس
ی جو شاہجہاں نے ساڑھے چھ کرور روپے کی لاگت میں تیار کرایا تھا نہ چھوڑا۔ سونے
باندی کے چکی کے پاٹ ڈھلوا ڈھلوا کر اونٹوں پر لدوا دیے۔ غرضکہ دہلی سے اس قدر دولت
درشاہ کے ہاتھ لگی کہ وہ حیران تھا کہ اسکو کیا کروں۔ چنانچہ کُل فوج کو تین ماہ کی تنخواہ پیشگی دیدی
ور سال بھر تک فارس کے باشندوں سے کوئی محصول نہیں لیا۔ اور صرف اسی قدر کثیر دولت
ہی پر نہیں اکتفا کیا بلکہ محمد شاہ کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی بھی کرنے کے بعد ۱۶ محرم ۱۱۵۲ھ
لو دہلی سے ایران کی طرف واپس روانہ ہوا۔

جب شیخ نے دہلی میں نادرشاہ کا آنا سنا تو شیخ کو بیحد تشویش پیدا ہوا نا چار علی قلی خاں کے
مکان میں چھپکر اپنی جان بچائی۔ اُسی زمانے میں شیخ نے ایک قصیدہ اہل ہند کی مذمت میں
لکھا تھا جسکی وجہ سے شعرائے شاہجہان آباد کو شیخ کے ساتھ مخالفت پیدا ہو گئی۔ اس وجہ سے
شیخ نے دہلی میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور تین سال کئی ماہ تک دہلی میں رہ کر بہ ارادۂ بنگال
دہلی سے روانہ ہو کر بنارس آئے۔ اور بنارس میں چندے قیام کرکے عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے
عظیم آباد میں کئی سال مقیم رہے، وہاں کے علما و روٴسا سے ملے۔ ایک روز شہر کی سیر
و نکلے تو دیکھا کہ شہر کے اُتر جانب دریائے گنگ اور دکھن جانب ندی جلا واقع ہے۔ شیخ کی

نظر میں ملتان کے سیلاب کی تصویر پھر گئی۔ خیال گذرا کہ کسی وقت اگر دریا اور ندی دونوں جوش زن ہوئے تو شہر عظیم آباد جو دونوں کے درمیان میں ہے غرقاب ہو جائیگا۔ پس ایسی جگہ رہنا مصلحت نہیں ہے۔ اسلیے عظیم آباد سے روانہ ہو کر بنارس چلے آئے گر بنارس آنے پر بھی شیخ کی یہی تمنا رہی کہ ایران واپس چلا جاؤں لیکن خاک بنارس نے کچھ ایسے مضبوط قدم کرڈے کہ پھر ایران جانا کسی طرح ممکن و میسر نہ ہوا اور بہت سے موانعات پیش آتے گئے۔ جب شیخ کو کامل یقین ہو گیا کہ خاک نہر مجھے ایران نہ جانے دیگی میری قبر کی جگہ ہندہی میں ہے تو شیخ نے ہر طرف سے سیر و سیاحت ترک کرکے بنارس کو اپنا مسکن دائمی قرار دیا اور راجہ بلونت سنگھ سابق والی بنارس سے زمین لیکر روضۂ فاطمان[1] (فاطمہ) بنوا کر رہنے لگے۔ جس مقام پر فاطمان ہے پہلے وہ مقام صحرا میں شمار ہوتا تھا۔ سادہ در روضۂ فاطمہؓ و مسجد و شہ نشین و باغ وغیرہ جملہ عمارتیں متعلقہ فاطمان شیخ کی بنوائی ہوئی ہیں جو ابتک موجود ہیں۔ مسجد فاطمان ۱۱۶۷ھ ہجری میں تعمیر ہوئی ہے۔ تاریخ تعمیر مسجد شیخ کی لکھی ہوئی یہ ہے۔

جبہ بر خاک نہ دریں مسجد　　　کز برائے عبادت است اینجا
ہر تاریخ این بنا ہاتف　　　گفت - درگاہ حاجت است اینجا

۱۱۶۷ھ

راجہ بلونت سنگھ سابق والی بنارس کو جو علما و فقرا کو بہت دوست رکھتے تھے شیخ سے خلوص خاص تھا۔ اسلیے شیخ کی نہایت عزت کرتے تھے اور کبھی کبھی خود شیخ کی قیام گاہ پر جایا کرتے تھے۔ شیخ بھی راجہ ممدوح سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے اور راجہ کی ترقی عمر و دولت کے لیے دعاگو رہتے تھے۔ راجہ ممدوح اپنے صاحبزادے راجہ چیت سنگھ کو جو اس وقت بہت صغیر سن تھے کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ شیخ بہت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اور اپنے چاندی کے کھٹولے پر جسپر کسی کو نہ بیٹھنے دیتے تھے بٹھا لیا کرتے تھے اور رخصت کے وقت دعا کے ساتھ کچھ بطور تحفہ از قسم جواہرات و اشرفی وغیرہ کے دیا کرتے تھے بعد وفات شیخ جب حساب کیا گیا تو قریب چالیس ہزار روپے کی اشیا عطیات شیخ سے نکلیں۔

بنارس کے قیام میں شیخ کے اخراجات معمولی نہ تھے بلکہ مثل امرا و شاہزادگان اخراجات

[1] روضۂ حضرت سیدۃ النسا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو اب فاطمان مشہور ہو گیا ہے۔

رہا کرتے تھے۔ فاطمان کی تمام عمارتیں شیخ نے اپنے صرف سے بنوائیں مگر کسی کو آمدنی کا حال معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے آتی ہے۔ اس جگہ اکثر لوگ مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دستِ غیب خیال کرتے ہیں بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ کا خدمتگار مسمیٰ رمضانی جن تھا اُسی کے ذریعہ شیخ کے تمام اخراجات ہوا کرتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ جب بنارس آئے تو بنظر علم وفضل بخیال عزت ایران شیخ کے قیام گاہ پر گئے۔ دروازے پر پہرہ دیکھکر شیخ سے کہا کہ ع درِ درویش را درباں نباید۔ شیخ نے ازراہِ استغنا فی البدیہہ جواب دیا کہ ع بباید تا سگِ دنیا نیاید۔

شیخ کی طبیعت فن شعر گوئی میں ایسے تبحر او رملکہ رکھتی جسکا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے شیخ کے ہندوستان آنے پر بڑے بڑے شعرا اپنے عمدہ عمدہ کلام بغرضِ اصلاح سناتے تھے مگر شیخ اپنی تہذیب و متانت سے سب کی تعریف کیا کرتے تھے۔ زیادہ اصرار ہونے پر اس طور سے الفاظ کو تبدیل کر دیا کرتے تھے جس سے حسن کلام دوبالا ہو جاتا تھا۔ کسی شاعر نے بظاہر اصلاح کی غرض سے یہ شعر سنایا گر باطن میں بخیال اظہار کمال اپنے نزدیک چوٹی کا شعر پڑھا تھا۔

خجل از روے حبابم کہ دریں ظرفِ تنک　　انچہ در کیسۂ خود داشت بدریا بخشید

شیخ نے باعتبار مضمون آفرینی تعریف کی جب اُنکا اصرار ہوا تو صرف دو لفظ بدلکر لطفِ شعر کو دوبالا کر دیا

خجل از چشم حبابم کہ دریں ظرف تنک　　اُنچہ در کاسۂ خود داشت بدریا بخشید

نجالت کا تعلق چشم سے ہے نہ کہ رُوے' اور کیسہ کے دینے سے کاسہ والے کا دینا زیادہ قابل تعریف ہے۔

ایک روز کسی شاعر نے شیخ کے سامنے اپنا یہ شعر پڑھا

سیہ چوڑی بدستِ آں نگارِ نازنیں دیدم　　بشاخ صندلی پیچیدہ مارِ عنبریں دیدم

شیخ نے کہا کہ اس طوالت کی کیا ضرورت ہے اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ

سیہ چوڑی بادستِ آں نگارے　　بشاخ صندلی پیچیدہ مارے

سنا جاتا ہے کہ مرزا رفیع الدین سودا کا کلام شیخ کو بہت پسند آیا۔ جب شیخ ایران سے

ہندوستان میں آئے تو لوگوں سے پوچھا کہ شعرائے ہند میں اندنوں کوئی صاحبِ کمال بھی ہے؟ لوگوں نے سوداؔ کا نام بتایا۔ سوداؔ نے جب سنا تو خود شیخ سے ملنے اُنکی قیام گاہ پر گئے اطلاع کرائی کہ سوداؔ حاضر ہے شیخ نے جواب دیا کہ سودا کا یہاں کیا کام ہے بازار میں جائیے اور کلوخِ طفلاں کھائیے۔ اُس وقت سوداؔ نے کہلایا کہ مرزا رفیع الدین متخلص بہ سوداؔ حاضر ہے۔ یہ سنکر شیخ نے بلوا لیا اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ سوداؔ نے کہا کہ میں تو حضور کے کلام کا مشتاق ہوکر آیا ہوں۔ شیخ نے یہ شعر پڑھا

یک صید نیا سود زمانے بہ زمینے　　تاثیر توزہ کرد کمانے بہ کمینے

سوداؔ نے تعریف کر کے فی الجملہ سکوت کیا اور یہ شعر پڑھا

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں　　ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

اُسوقت تک شیخ اُردو کے محاورہ (تڑپنے) سے ناواقف تھے پوچھا (تڑپے ہے) چہ معنی دارد؟ سوداؔ نے کہا اہلِ ہند طپیدن را تڑپنا میگویند۔ شیخ نے سوداؔ سے شعر مکرر پڑھوایا۔ دوبارہ سننے پر نہایت محظوظ ہوئے اور سوداؔ سے بغلگیر ہوکر کہا تم نے تو قیامت کر دی ایک مرغ قبلہ نما رہگیا تھا تم نے اُسکو بھی نہ چھوڑا۔

شیخ کا خادم رمضانی جو بنارس میں شیخ کے ساتھ تھا اور کہا جاتا ہے کہ جن تھا بظاہر رمضانی خدمتگار بنا رہتا تھا، نہایت ذی علم و قابل شخص تھا شیخ کے کلام موزوں کا جواب اکثر موزوں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ نے کہا "رمضانی کسان نمی آیند" رمضانی نے فوراً جواب دیا حضور، "تا کسان پیش کساں می آیند"۔ ایک روز شیخ حجرے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے جب وظیفہ سے فارغ ہوئے رمضانی سے پوچھا کہ "از شب چہ قدر گذشتہ باشد؟" رمضانی نے جواب دیا کہ "زلفش بکمر رسیدہ باشد"۔ الغرض رمضانی اور شیخ میں اس قسم کے سوال جواب اکثر ہوا کرتے تھے ایک روز ایک رئیس کی ملاقات کو آئے۔ شیخ نے اپنے باغ کا لیمو بطور تحفہ رمضانی سے منگوایا اور رمضانی کو حکم دیا کہ پوست جدا کر کے لاؤ۔ رمضانی نے لیمو لا کر رئیس سے پوچھا کہ حضور

کو ترش پسند ہے یا شیریں؟ رئیس نے ہنسکر کہا کہ ایک ہی تو لیمو ہے، پھر ترش و شیریں کی تفریق کیسی؟ رمضانی نے جواب یا کہ آفتاب کی طرف کا حصہ شیریں ہے اور دوسری جانب کا ترش۔ رئیس نے جب دونوں جانب چکھا تو واقعی ایک طرف شیریں اور دوسری جانب ترش تھا۔

شعرا اور رؤسا جو شیخ سے ملنے آتے تھے شیخ ازراہِ استغنا اُنکی تعظیم نہ کرتے تھے۔ کیونکہ شیخ کو کسی سے کچھ طمع نہ تھی۔ ایک چاندی کے کھٹولے پر جو اپنے لیے مخصوص بنا رکھا تھا بیٹھے رہتے تھے اور اُسپر کسی کو بیٹھنے نہ دیتے تھے۔

جس وقت شیخ بنارس میں مقیم تھے۔ بنارس میں مُلّا عبداللہ معروف بہ مُلّا محمد عمرؔ متخلص بہ عاشق بناری شاگرد مولوی سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی بھی موجود تھے ان دونوں صاحبوں میں سلسلہ ارتباط و محبت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مُلّا محمد عمرؔ روزانہ شیخ کی قیام گاہ پر جایا کرتے تھے اور جو کچھ تصنیف کرتے تھے شیخ کو سنایا کرتے تھے اور شیخ جو کچھ موزوں کیا کرتے تھے وہ مُلّا کو سنایا کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی طرح میں دونوں صاحب طبع آزمائی فرماتے تھے۔ چنانچہ شیخ و مُلّا کی ہمطرح غزلیں درج ذیل ہیں

غزل شیخ علی حزیں

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد ... در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

آہ از دلیکہ تنہا با داغ او چو لالہ ... در خوں نشستہ باشد چوں باد رفتہ باشد

خونش بہ تیغ حسرت یارب حلال بادا ... صیدے کہ از کمندت آزاد رفتہ باشد

از آہ و درد تا کے سازم خبر دلت را ... روزے کہ کوہ صبرم برباد رفتہ باشد

رحمست بر اسیرے کز گرد دام الفت ... با صد امید داری ناشاد رفتہ باشد

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی ... گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

پر سوز از حزیں است امروز کوہ و صحرا
مجنوں گذشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

غزل مُلّا سابق بنارسی

جانش چناں بحسرت ناشاد رفتہ باشد کز ہجر بردل او بیداد رفتہ باشد
فریاد دار رحم است بربیدلے کہ اورا باپاس جان شیریں برباد رفتہ باشد
از خارزار امکاں ہرکس کہ چید داماں چوں سرو زیں گلستاں آزاد رفتہ باشد
بدحال زار صیدے رحمت کو بحسرت در دام جاں سپارد صیاد رفتہ باشد
اے وائے بر غریبے با یک جہاں تمنا در وقت جاں سپردن از یاد رفتہ باشد
سابق بسوز آورد ایں مصرع حزینم
مجنوں گذشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

ایک روز شیخ سے کسی نے پوچھا گیپا کرا مےگویند؟ اتفاق سے ملا محمد عمرؒ بھی اُسوقت موجود تھے۔ شیخ نے کہا کہ از ملا بپرس۔ مُلا نے کہا گیپا پلاؤ کی ایک قسم ہے اور صرف یہی کہکر ہنیں خاموش ہوے بلکہ اسکی مفصل کیفیت مع ترکیب تیاری بیان کردی شیخ نے متعجب ہوکر پوچھا کہ آپ نے کھایا ہے؟ مُلا نے کہا میں نے کھایا تو نہیں ہے مگر اُسکی کیفیت مجھے معلوم ہے۔ شیخ نے کہا کل میں آپ کو گیپا کھلاؤں گا۔ دوسرے دن شیخ نے مُلا کو گیپا کی دعوت دی اور مُلا کے ساتھ بہت لوگوں کو مدعو کیا۔

شیخ کا کلام اُنکے مرنے کے بعد جس قدر دستیاب ہوا وہ "کلیاتِ حزیں" کے نام سے مطبع نامی منشی نولکشور در سنہ ۱۲۹۳ ہجری میں چھپا ہے۔ کلیات میں علاوہ غزلیات کے قصائد مثنویات و رباعیات وغیرہ بھی ہیں اور کچھ حصہ نثر کا ہے جس میں شیخ نے اپنے اور اپنے اساتذہ کے حالات درج کیے ہیں۔ چند اشعار شیخ کے کلیات مذکورسے انتخاب کرکے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

باد صبا فسانۂ زلف تو ساز کرد پیغام آشنا شب مارا دراز کرد
گردید قسمتم زازل عشق شعلہ خو ساقی مرا بجرعۂ جانگداز کرد
افزوں شد از بہار خطت شور عاشقاں نیرنگ باغ نالۂ مرغاں دراز کرد

گویا لبالب از مے عجز و نیاز بود — پیمانۂ کہ چشم تراست ناز کرد

کمشا ے لب بقصۂ راز نہاں حزیں

نتواں حدیثِ شوق بعمرِ دراز کرد

از شورِ نالہ ام دلِ جاناں خبر نداشت — آن شاخِ گل ز مرغ خوش الحاں خبر نداشت

بیہودہ سینہ بر در و بام قفس زدیم — صیاد ما زحالِ اسیراں خبر نداشت

شوریدہ را بزیرِ قدم خار و گل یکیست — سیل از بلند و پست بیاباں خبر نداشت

ہرگز نمیگرفت کسے را حریف خویش — صبرِ من از تغافلِ جاناں خبر نداشت

در موجِ خیز فتنہ حزیں آرمیدہ ام

آبِ گہر ز شورشِ طوفاں خبر نداشت

بر ہر زمیں کہ جلوہ کُنی آسماں کُنی — می زیبدت کہ ناز بکون و مکاں کُنی

ہر جا کشائی از پے دل زلفِ پرشکن — مرغانِ سدرہ راہمہ بے آشیاں کُنی

بتکیں شود غزالِ نگاہت بیک نظر — اے کاش جیبِ بختِ مرا سرمہ داں کُنی

اے عندلیب با تو مرا حقِ صحبت است — خواہم کہ خاکِ تربتِ ما گلفشاں کُنی

گردد طرازِ دامنِ دستِ جنوں حزیں

خونابۂ کہ از رگِ مژگاں رواں کُنی

اکثر کلام شیخ کے دوسرے نسخوں میں ملتے ہیں مگر کلیات میں نہیں طبع ہیں۔ چنانچہ ذیل کی غزل جو شیخ نے اپنے حسبِ حال لکھی ہے تاریخ بنارس میں درج ہے۔

چشم کشودہ است در فیضِ نوبہار — از داغ ریختست دلم طرح لالہ زار

منت خدائے را کہ بعون عنایتش — منت پذیر نیستم از خلق روزگار

مرہونِ منتے نیم از فیضِ بحر و بر — ممنونِ قطرۂ نیم از ابرِ نوبہار

ہمت براں سراست کہ خرگہ بروں زند — از تنگنائے عرصۂ ایں نیلگوں حصار

در کودکی کہ بود دلم مائلِ ہنر | جوشید ذوقِ شعر ز طبعِ گہر نثار
ہر مصرعم ز زلفِ رسا دلفریب تر | ہر نقطہ ام بہ شوخیِ خالِ عذارِ یار
حسنِ بلاغت و نمکِ گفتگوے من | شورے فگند در دلِ عشاقِ بیقرار
صوفی بجا نقادہ سر اُمید گفتہ ام | مطرب بہ ساز بزم ز شعرم کشیدہ تار
ہر صفحہ را ز سنبل و ریحاں چمن چمن | مرغولہ زیرِ خامۂ من ریخت یادگار
معنی بہ حشمتے کہ بود بحرِ پُرشکوہ | لفظش بجودتے کہ بود موجِ جوئبار
پیرایۂ قبول و صفاے نفس تبسم | لطفِ اشارت و نمکِ عاشقی بکار
شرمندۂ منست گہرہاے آبگوں | پروردۂ منست سخنہاے آبدار
گاہے گہر بخاطرِ آیندگان رسم | تا در گذرگہ و سخن ماست پائدار
اکنوں نماندہ است بدل ذوقِ گفتگو | کوتاہی از من و کرم از آفریدگار

خامش حزیں کہ نامہ بپایاں رساندۂ
وقت است خامہ را فگند دستِ رعشہ دار

شیخ نے بحالتِ قیامِ بنارس، بنارس و اہلِ بنارس کی شان میں باعتبارِ مذاقِ شاعری فرمایا ہے

پری رخانِ بنارس بصد کرشمہ و رنگ | پے پرستشِ مہدیو چوں کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند | زہے شرافتِ سنگ و زہے لطافتِ گنگ

ایران سے شیخ کے کسی دوست نے شیخ کو خط لکھا کہ کیا اب بنارس ہی میں رہو گے وطنِ مالوف کو نہ آؤ گے تو شیخ نے اُسکے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا | ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

جب شیخ بنارس میں مقیم تھے تو اسی اثنا میں سید غلام حسین خاں ابن سید ہدایت علی خاں طباطبائی مولف سیر المتاخرین بنارس میں آئے اور حسب سفارش ڈاکٹر فلرٹن صاحب، صاحب کلاں کی مصاحبت میں مامور ہوئے۔ یہ بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے

علم و تقویٰ کی وجہ سے شیخ ان سے بہت خوش رہتے تھے۔ اتفاقاً سید غلام حسین خاں کے والد بیمار ہو کر دنیا سے رحلت کر گئے۔ ۲ رجادی الثانی ۱۱۸۹ھ ہجری کو جب سید غلام حسین خاں نے یہ خبر سنی اور اپنے وطن حسین آباد مونگیر بغرض انتظام جاگیر جانے کا قصد کیا تو شیخ نے اُن سے کہا کہ میری عمر کے خاتمہ کا اب بہت تھوڑا زمانہ رہ گیا ہے بہتر ہوتا کہ تم اُس وقت یہاں موجود رہتے۔ مگر سید غلام حسین اشد ضرورت کی وجہ سے نہ رُک سکے اور اپنے وطن چلے گئے۔ وہاں جا کر سند جاگیر جو ان کے والد سید ہدایت علی کے نام تھی، مہاراجہ شتاب رائے منتظم ریاست مرشد آباد کی سرکار سے اپنے نام تبدیل کرائی اور انتظام جاگیر میں ایک سال تک مصروف رہے بنارس نہ آسکے۔

اِدھر شیخ علی حزیں نے بعمر ۷۷ سال بتاریخ ۱۱ رجادی الاول ۱۱۸۰ھ ہجری بمقام فاطمان (بنارس) دُنیائے دوں کو چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور جو قبر پختہ شیخ نے اپنی زندگی میں اپنے لیے بنوا رکھی تھی اُسی میں دفن ہوئے۔ قبر سنگی ہے محرم و شبہائے رمضان المبارک میں شیعہ اصحاب جمع ہوتے ہیں اور مجلس عزا ہوتی ہے۔

شیخ کے سنگ قبر پر جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ لوح قبر پر "یا محسن قد اتاک المسیٔ" کے بعد شیخ کا نام ان لفظوں میں تحریر ہے۔ "العبد الراجی رحمۃ ربہ محمد المدعو بہ علی ابن ابیطالب الجیلانی" ہر دو پہلو میں یہ دو شعر ہیں جو شیخ نے پہلے سے کہہ کر سنگ قبر پر کندہ کرانے کا حکم دے رکھا تھا۔

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم   ہمیدانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم   سر شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

اور پائین قبر میں یہ شعر ہے:۔

روشن شد از وصال تو شبہائے تارِ ما   صبحِ قیامت است چراغ مزارِ ما

کتاب مفتاح التواریخ میں شیخ کی تاریخ وفات یوں درج ہے:۔

تہی گشت ہیہات روئے زمیں   ز شیخ محمد علی حزیں ۱۱۸۰

ایک قطعہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی لکھا ہے مگر اس میں ایک عدد کم ہوتا ہے۔

علامۂ عصر و شاعرِ خوب | افسوس کہ از جہاں بدر خاست
تاریخ وفات او نوشتم | از فوتِ حزیں حزیں دل ماست

تاریخ از مولوی محمد عبدالغفور خاں نساخ

پئے سال ترحیل و فوتِ حزیں | نوشتم غمِ جاودانِ حزیں

قبرستانِ فاطمان میں شیخ کی قبر کے بعد رفتہ رفتہ مسلمانان شہر کی ہزار ہا قبریں پختہ وہ اندر احاطۂ فاطمان ہوگئی ہیں اور ہوتی جارہی ہیں خصوصاً شیعہ اصحاب کی قبریں بہت ہیں۔ الفٹ صاحب کمشنر بنارس کی بی بی ہندوستانی تھیں وہ بھی یہیں دفن ہیں اور اخراجا مجلس وغیرہ کے لیے کچھ جائداد بھی وقف کی ہے۔ کمشنر صاحب کے حکم سے پھاٹک احاطۂ فاطمان کا تیار ہوا ہے اس پر یہ اشعار کندہ ہیں:-

صاحب کلاں بہادر میدان سروری | افراخت ایں بنا کہ باوج سما رسید
باب کرم کشاد کہ تاریخ سالِ او | دروازۂ عظیم زہر سو ندا رسید

ذی مقدرت شیعہ اصحاب صدہا روپیہ دیکر احاطۂ فاطمان کے اندر قبر کی زمین مول لیتے ہیں عشرۂ محرم کے روز مرد عورتوں کا بہت بڑا مجمع ہوتا ہے اور یہ مجمع صرف احاطۂ فاطمان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ دُور تک سڑکوں اور گلیوں میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ شہر کے زیادہ حصے تعزیوں کے یہیں دفن ہوتے ہیں۔

عاصی

غلام حسین خاں حنفی آفاق بنارسی

(رام نگر۔ بنارس)

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- سید کن جو رنق دونس ے ر
- عربوں کا فن تعمیر ۱۴ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- تکملہ ۸ر
- شرح قانون شہادت ے ر

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- نشاء عمر عہ ر
- عصائے پیری ۱۱ر
- اقبال وطن
- حسن معاشرت عہ
- بچوں سے دو دو باتیں ۱۴ر

مولوی افتخار عالم
- حیات النذیر ے ر
- وکیل نسواں ۸ر

منشی سعید احمد
- آثار اکبری
- حیات خسرو ۱۲ر
- حیات صالح ۴ر

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی
- البرامکہ ے ر

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند

پروفیسر شہباز مرحوم
- کلیات نظیر اکبرآبادی
- زندگانی بے نظیر

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابو البشر
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- قوت خیال
- اصول خانہ داری

منشی حسن الدین خاں ہوش
- جمیلہ خاتون ۴ر
- قومی گیت ۵ر
- زنانہ خطوط ۵ر
- لیڈی اکبر علیم خانم ۱۲ر
- تاثیر محبت ۱۲ر
- حوران جنت ۴ر
- رفیق مرزا ۴ر
- ناصح مشفق ۴ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ
- المدنیۃ والاسلام

پروفیسر نواب علی
- تذکرۃ المصطفیٰ
- معارج الدین

مہاشے پرکاش دیو
- حضرت محمد صلعم ۵ر
- مہاتما بدھ
- خدا اور روح ۱۲ر
- مارٹن لوتھر ۸ر
- سیرۃ المستورات ۱۲ر
- بچوں کی کہانیاں

خواجہ غلام الحسنین
- دستور المعلمین ۷ر
- معیار الاخلاق ۶ر
- تنقید لطیف ۵ر
- تربیت اولاد ۴ر

سید رفیع سوہانی
- تاج و ختائی
- دستار و کلاہ
- گنج شائیگان

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا ۴ر
- شمع و شاعر ۴ر
- بلال ۱ر
- شکوہ ۲ر
- جواب شکوہ ۲ر
- نالۂ یتیم ۲ر
- فریاد امت ۳ر

نیاز فتح پوری
- ایک شاعر کا انجام ۱۲ر
- عائشہ صدیقہ ۱۲ر
- جذبات بھاشا ۱۲ر

منشی پریم چند
- پریم پچیسی ۱۲ر
- سیر درویش ۴ر

سیماب اکبرآبادی
- بنت الرسول ۵ر
- جام کوثر ۵ر
- بہشتی جھومر ۱۲ر

ارشد تھانوی
- حسن تخیل ۱۲ر
- بیاض ارشد ۸ر

سید ابراہیم عجمی
- بیابان ۸ر
- جنگ روس و جاپان ۸ر

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ باتصویر
- " بلاتصویر
- روزنامچہ ۸ر
- تسخیر مہر و قمر
- رسول کی عیدی ۲ر
- بیاری ہتکڑی ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۱۰ر
- گانا خاتون ۲ر
- اسلام کا انجام
- بیوی کی تعلیم ۱۲ر
- انتخاب توحید
- میلاد نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں ۲ر
- فلسفۂ شہادت ۲ر
- غدر دہلی کے افسانے ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۸ر
- جگ بیتی ۶ر
- بچوں کی کہانیاں ۶ر
- اسرار
- کم تو موت
- سیر دہلی

مولوی مصباح الدین
- الہارون
- محاکمہ حسن و پرشیا
- مصباح الادب

حکیم محمد علی خاں
- عبرت الکامل
- حسن سرورہ
- دیول دیوی
- گورا
- نیل کا سانپ
- جعفر و عباسہ
- اختر حسینہ بنگال

مولانا راشد الخیری
- منازل السائرہ
- شام زندگی
- الزہرا ۱۲ر
- ساتوں روحوں کے اعمالنامے ۶ر

مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس
- قصائے مغرب

مولوی معین الدین
- اورنگ زیب
- بد مزاج شوہر ۱ر
- زالکہ بیگم ۱ر

سلطان حیدر جوش
- ابن مسلم
- نواب محمد
- اتفاقات زمانہ ۱ر
- مساوات ۱ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ

منشی امیر مینائی مرحوم
- صنم خانۂ عشق ۔ ے ر
- مرآۃ الغیب ۔ ۱۲ر
- خیابانِ آفرینش ۔ ۸ر
- خطوط منشی امیر احمد ۔ ۸ر

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی ۔ عہ
- ابوبکر شبلی ۔ عہ
- خواجہ حسن البصری ۔ ۶ر
- عصر قدیم ۔ ۸ر
- عہد صلیبیہ ۔ ۶ر
- تاریخ سندھ ۔ ۱۲ر
- قرۃ العین ۔ ۴ر
- تاریخ یہود ۔ ۱۰ر
- ملکہ زنوبیہ ۔ ۴ر
- الحکم الرفاعیہ ۔ ۴ر
- آغائی صاحب ۔ عہ
- سکینہ بنت حسین ۔ ۴ر
- غدرات (مجلد) ۔ ۶ر
- تذکرۂ مشاہیر عالم ۔ ۸ر
- زوال بغداد ۔ ۸ر
- نعیب کی عین ۔ عہ
- حسن بن صباح ۔ ۶ر
- افسانۂ قیس ۔ ۴ر
- مقدس نازنین ۔ عہ
- قیس و لبنیٰ ۔ ۸ر
- ایام عرب ۔ ۸ر

- حسن انجلینا ۔ ۸ر
- منصور موہنا ۔ ۸ر
- شہید وفا ۔ ۵ر
- دلکش ۔ ۹ر
- دلچسپ کالج ۔ ۸ر
- میوۂ تلخ ۔ ۴ر
- ماہ ملک ۔ ۶ر
- شوقین ملکہ ۔ ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۔ ۸ر
- یوسف و نجمہ ۔ ۸ر
- زیاد و حلاوہ ۔ ۶ر
- رویۃ الکبریٰ ۔ ۸ر
- فلورا فلورنڈا ۔ ۶ر
- زمانہ اور اسلام ۔ ۲ر
- فردوس بریں ۔ ۵ر
- آغا صادق کی شادی ۔ ۱۰ر
- بدر النساء کی مصیبت ۔ ۳ر
- حسن کا ڈاکو ۔ ۸ر
- دربار حرام پور ۔ ۱۰ر
- خوفناک محبت ۔ ۸ر
- الفانسو ۔ ۱۲ر
- فلپانا ۔ ۸ر
- فاتح مفتوح ۔ ۸ر
- ہندوستان کی موسیقی ۔ ۱۲ر
- سرسید کی دینی کتابیں ۔ ۲ر

مسٹر انیس احمد
- اجرہ کی کامیابی ۔ ۶ر
- بحری جنگ ۔ ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۔ ۶ر
- حاجی بغلول ۔ ۸ر
- پیاری دنیا ۔ ۱۰ر
- فلسفی ظریف ۔ ۸ر
- طرحدار لونڈی ۔ ۸ر
- میٹھی چھری ۔ ۴ر
- کایا پلٹ ۔ ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو ۔ ۶ر
- پچھڑی دلہن ۔ ۸ر
- گورکھ دھندا ۔ ۶ر
- پی کہاں ۔ ۶ر
- کامنی ۔ ۸ر
- جام سرشار ۔ عہ
- خدائی فوجدار ۔ ۸ر
- فسانۂ آزاد ۔ لعہ
- سیر کہسار ۔ عہ

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق ۔ ۸ر
- قاسم و زہرہ ۔ ۱۲ر
- عالم خیال ۔ ۸ر
- سیکنڈ لوسی (مجموعہ نظم) ۔ ۴ر
- حسن ۔ نازنین شبنم ۔ ۶ر
- بہار ۔ برسات (مجموعہ) ۔ ۶ر

جلال مرحوم
- مفتونہائے دلکش ۔ عہ
- نظم نگارین ۔ عہ
- افادۂ تاریخ ۔ ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۔ ۶ر

مرزا رسوا بی اے
- امراؤ جان ادا ۔ ۱۲ر
- لیلیٰ مجنوں ۔ ۸ر
- نوبہار ۔ ۲ر

جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۔ ۱۰ر
- مار آستین ۔ ۱۰ر
- بنگالی دلہن ۔ ۱۲ر
- پرتاب ۔ ۶ر
- معشوقۂ عرب ۔ ۶ر
- بروگ ۔ ۵ر
- آتھیلو ۔ ۶ر
- روہنی ۔ ۸ر

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر ۔ عہ
- اورنگ زیب ۔ عہ

خواجہ عشرت
- زبان دانی ۔ ۴ر
- اصلاح زبان اردو ۔ ۴ر

مولانا عبدالشکور
- اسد الغابہ ۔ عہ
- علم الفقہ ۔ للعہ

علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام ۔ عہ
- ” حصہ ۲ ۔ ۱۲ر
- فن ہیئت ۔ ۸ر
- فن کیمسٹری ۔ ۶ر

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن ۔ ۸ر
- شباب لکھنؤ ۔ ۸ر
- مرقع اودھ ۔ ۶ر

مسٹر عبدالماجد
- فلسفۂ جذبات ۔ عہ
- فلسفۂ اجتماع ۔ عہ
- غذائے انسانی ۔ ۲ر
- فلسفہ کی تعلیم ۔ ۲ر
- زود پشیماں ۔ ۸ر

مسٹر حسین قدوائی
- ذکر طیب محمد عربی ۔ ۱۰ر
- نشتر ۔ ۸ر
- عرض حال ۔ ۱ر
- جذب دل ۔ ۴ر
- حاکم و محکوم ۔ ۴ر

مطبوعات الناظر پریس
- قواعد اردو ۔ ۶ر
- کلیات محسن ۔ ۴ر
- محاربات صلیبی ۔ ۸ر
- رموز فطرت ۔ ۶ر
- ازواج الانبیا ۔ ۸ر
- تسخیر فرانس ۔ ۸ر
- واقعات کربلا ۔ ۸ر
- الاحسان ۔ ۸ر
- ملا ابن جوزی ترجمہ ۔ ۴ر
- حیات نظامی ۔ ۴ر
- جیب و شبینہ ۔ ۳ر
- سیکفرن لوسی ۔ ۲ر
- انقلابات زمانہ ۔ ۱ر
- شوکیہ ۔ ۱ر
- نادان خدا پرست ۔ ۱ر
- مصنوعی شوہر ۔ ۲ر
- زود پشیماں ۔ ۸ر
- نوبہار ۔ ۲ر
- خوان دعوت ۔ ۶ر
- کنولا ۔ ۶ر
- واقعات انیس ۔ ۶ر
- جمیلہ کی ناکامیابی ۔ ۸ر
- جواہر التفاسیر ۔ ۸ر
- خیالات آئینی ۔ ۴ر
- خواب شگفتہ ۔ ۴ر
- نشتر ۔ ۴ر

الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ